کلیاتِ پریم چند

14

مُرتبہ

مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

کلیاتِ پریم چند

14

پچاس افسانے

مرتبہ

مدن گوپال
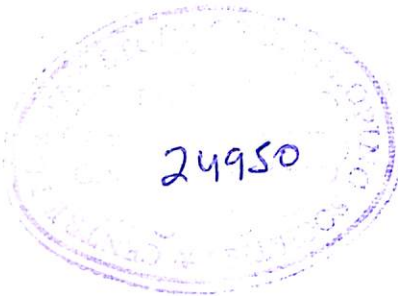
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)
ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

Kulliyat-e-Premchand-14

Edited by : Madan Gopal

Project Assistant : Dr. Raheel Siddiqui

سنہ اشاعت : اپریل، جون 2003 شک 1925

پہلا اڈیشن : 1100

قیمت : -/157

سلسلہ مطبوعات : 1085

کمپوزنگ : پرنس گرافکس، نئی دہلی

ISBN. 81-7587-002-8

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر.کے.پورم، نئی دہلی 110066

طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈز، 1397 پہاڑی املی، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-110006

پیش لفظ

ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن منظرعام پر آئیں۔ قومی اردو کونسل پریم چند کی تمام تحریروں کو "کلیات پریم چند" کے عنوان سے 22 جلدوں میں ایک مکمل سِٹ کی صورت میں شائع کررہی ہے۔ ان جلدوں میں پریم چند کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبار اصناف یکجا کیے جارہے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

ناول : جلد 1 سے جلد 8 تک، افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک،
ڈرامے : جلد 15 و جلد 16، خطوط : جلد 17،
متفرقات : جلد 18 سے جلد 20 تک، تراجم : جلد 21 و جلد 22

"کلیاتِ پریم چند" میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے اہم کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حسبِ ضرورت پریم چند کے ماہرین سے بھی ملاقات کرکے مدد لی گئی ہے۔

کلیات کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ سن اشاعت اور اشاعتی ادارے کا نام شائع کرنے کا التزام بھی رکھا گیا ہے۔

"کلیات پریم چند" کی یہ جلدیں قومی اردو کونسل کے ایک بڑے منصوبے کا نقش اوّل ہیں۔ اس پروجکٹ کے تحت اردو ادب کے ان ادبا و شعرا کی کلیات شائع کی جائیں گی جو کلاسیکی حیثیت اختیار کرچکی ہیں۔ پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے کی اس پہلی کاوش میں کچھ خامیاں اور کوتاہیاں ضرور راہ پاگئی ہوں گی۔ اس سلسلے میں قارئین کے مفید مشوروں کا خیر مقدم ہے۔

اگر پریم چند کی کوئی تحریر/ تحریریں دریافت ہوتی ہیں تو آئندہ ایڈیشنوں میں انھیں شامل کیا جائے گا۔

اردو کے اہم کلاسیکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کے انتخاب اور ان کی اشاعت کا فیصلہ قومی اردو کونسل کے ادبی پینل نے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی سربراہی میں کیا۔ ادبی پینل نے اس پروجکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کرکے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری رہنمائی کی۔ قومی اردو کونسل ادبی پینل کے تمام ارکان کی شکرگزار ہے۔ "کلیات پریم چند" کے مرتب مدن گوپال اور پروجکٹ اسسٹنٹ ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح "کلیاتِ پریم چند" کی بھی پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند،
نئی دہلی

فہرست

پیش گفتار

منشی پریم چند کا شمار اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان سے پہلے پریوں کے قصے اور طلسمی واقعات پر مبنی کہانیاں ہوتی تھیں۔ ہریجنوں اور کسانوں کے ساتھ ظلم اور بے انصافی، بے جوڑ شادیاں اور لوٹ کھسوٹ کے واقعات جو سماج کو گھن کی طرح سے کھائے جارہے تھے، ان کا ذکر ادب میں اس لیے نہیں ہوتا تھا کیونکہ ادیبوں کا کام سماجی اصلاح نہیں بلکہ ادبی تفریح اور ادب کو اعلیٰ معیاروں پر پیش کرنا تھا۔ سماجی واقعات کے بارے میں صرف اخبارات لکھتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی مرضی کے مطابق ہے اور اللہ کی مرضی کے خلاف انسان کا دخل ممکن نہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب سماجی بیداری کی لہر اٹھ کھڑی ہوئی تو لامحالا ادیب بھی اس بیداری سے متاثر ہوئے۔ پریم چند نے خاص طور سے ان اثرات کو قبول کیا اور کہا کہ تفریح مہیا کرانا بھانڈوں اور نقادوں کا کام ہے۔ مصنف کا فرض ہے کہ ادب کو سیاسی سماجی اور مذہبی اصلاحات کا ذریعہ بنائے۔ جب ادیب ہاتھ میں قلم اٹھائے تو اسے احساس ہونا چاہیے کہ وہ سماج کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالے گا اور سوتے ہوؤں کو جگائے گا۔ اگر وہ یہ کام نہیں کرسکتا تو وہ ناکام مصنف ہے۔

پریم چند کی پہلی کہانی کا عنوان تھا "دنیا کا سب سے انمول رتن"۔ یہ کہانی اور اس دور کی چار اور کہانیوں (شیخ مخمور، یہ میرا وطن ہے، صلۂ ماتم، عشق دنیا اور حب وطن) کو سوز وطن مجموعہ میں زمانہ پریس نے اپریل 1908 میں نواب رائے کے نام سے

شائع کیا۔

پریم چند کے اپنے الفاظ میں، "اس وقت ملک میں تقسیم بنگال کی شورش برپا تھی اور کانگریس میں گرم دل کی بنیاد پڑ چکی تھی"۔ ان پانچوں کہانیوں میں حب وطن کا ترانہ گایا گیا تھا۔ دیباچے میں لکھا تھا۔ "ہر ایک قوم کا علم ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے۔ جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے ہیں اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینے میں صورت۔ ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشے میں متوالے ہورہے تھے۔ اس زمانے کی ادبی یادگار بجز عاشقانہ غزلوں اور چند سفلہ قصوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے جب قوم کے نئے اور پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاح تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے کے قصص و حکایات زیادہ تر اصلاحی اور تجدیدی کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھایا ہے اور حب وطن کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر اُبھارنے لگے۔ کیوں کر ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں اور یقین ہے کہ جیوں جیوں ہمارے خیال رفیع ہو جائیں گے اس رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب وطن کی عظمت کا نقطہ جمائیں"۔ سوز وطن کا اشتہار اگست 1908 میں زمانہ میں شائع ہوا۔ اشتہار شاید مصنف نے آپ ہی لکھا تھا، یہ تھا۔

"سوز وطن سوز وطن سوز وطن"۔

"زمانہ کے مشہور اور مقبول مضمون نگار منشی نواب رائے کی تازہ ترین اور بہترین اردو زبان میں حسن و عشق، وصل و فراق، عیاری و مکاری، جنگ و جدل وغیرہ کی بہت سی داستانیں موجود ہیں اور ان میں بعض بہت ہی دلچسپ ہیں۔ مگر ایسے قصے جن میں سوز وطن کی چاشنی ہو، جن میں حب وطن ایک ایک حرف سے ٹپکے، اس وقت تک معدوم تھے۔ اس کتاب میں پانچ قصّے لکھے گئے اور سب دردِ وطن کے جذبات سے پُر ہیں۔ ممکن ہے کہ انھیں پڑھ کر ناظرین کے دل میں وطن کی الفت کا پاک جذبہ موجزن

ہو جائے۔ بیانیہ نہایت لطیف اور دلکش ہے اور اندازِ بیان رقت آمیز۔ سائز چھوٹا، لکھائی چھپائی عمدہ، کاغذ اعلیٰ قسم کا سودیشی قسم اول اور نیز معمولی سودیشی کاغذ پر۔ قیمت چار آنہ قسم دوم معمولی سودیشی کاغذ پر قیمت تین آنہ۔ چھ جز کی کتاب اس قیمت پر مفت ہے"۔

فرمائش بنام منیجر زمانہ، نیا چوک، کانپور۔

سوز وطن کے تبصرے آریہ گزٹ، سوراجیہ، ہندوستان وغیرہ میں شائع ہوئے۔ فروری 1909 میں نواب رائے نے سوزِ وطن کی ایک کاپی ہندی کے مشہور رسالہ سرسوتی کے ایڈیٹر کو تبصرہ کے لیے بھیجی۔ ایڈیٹر مہاویر پرساد دویدی نے لکھا "اس کتاب کی رچنا اردو کے مشہور ادیب نواب رائے نے کی ہے۔ قیمت 4 آنہ، ملنے کا پتہ بابو وجے نرائن لال نیا چوک کانپور"۔ یہ وجے نرائن لال نواب رائے کے ہم عمر اور سوتیلی ماں کے بھائی تھے اور نواب رائے کے گھر پر ہی رہتے تھے۔ مصنف نواب رائے کا پتہ اس طرح پبلک کے سامنے آگیا۔

سوزِ وطن زمانہ پریس میں چھپی تھی۔ غلطی سے زمانہ پریس کے نام کو کتاب پر نہیں دیا گیا۔ اس وقت کے قانون کے تحت یہ ایک جرم تھا۔ پولیس نے تفتیش شروع کردی، اور انھیں پتہ چلا کہ کتاب کا مصنف نواب رائے ایک سرکاری ملازم ہے جس کا اصل نام دھنپت رائے ہے۔ اطلاع حکام تک پہنچی۔ ضلع کے کلکٹر نے دھنپت رائے کو طلب کیا اور جیسا پریم چند نے "اپنی کہانی" میں لکھا ہے۔ دھنپت رائے سے سوزِ وطن کی ہر کہانی کے بارے میں جانکاری حاصل کرکے کہا کہ ان سب کہانیوں میں Sedition (بغاوت) بھرا ہے۔ اگر تم مغل راج میں ہوتے تو تمھارے ہاتھ کاٹ دیے جاتے۔ شکر ہے برٹش سرکار ہے۔ جتنی کاپیاں پڑی ہیں ان کو کلکٹر کے حوالے کردو"۔ دھنپت رائے کو تاکید بھی کی گئی کہ آگے سے لکھنا بند کرو۔ اگر لکھو تو سرکاری محکمے کی اجازت لے کر۔

ادھر نواب رائے کے افسانوں کی شہرت اور اُدھر یہ پابندی۔ ایک قصہ "آتش کدۂ گناہ" زمانہ کے دفتر میں پڑا تھا۔ دیانرائن نگم نے اس کے مصنف کا نام نواب رائے کے بجائے "افسانہ کہن" لکھا۔ یہ مارچ 1910 کے زمانہ میں چھپا۔ اپریل 1910 کے شمارے میں ایک اور افسانہ چھپا۔ عنوان تھا "سیر درویش" اس پر مصنف کا نام نواب رائے ہی دیا گیا، مگر اپریل اور مئی کی قسطوں پر کوئی نام نہیں۔ صرف جملہ حقوق محفوظ لکھا

گیا۔ اگست 1910 کے شمارے میں ایک قصہ چھپا "رانی سارندھا" مصنف کا نام نہیں دیا گیا۔

سرکاری حکم کی تعمیل سے بچنے کے لیے دھنپت رائے نے ایک نیا قلمی نام اختیار کیا۔ یہ تھا پریم چند۔ اس کے نام سے شائع ہونے والی پہلی کہانی تھی "بڑے گھر کی بیٹی"۔ یہ دسمبر 1910 کے زمانہ کے شمارے میں شائع ہوئی۔ نام میں کچھ جادو تھا۔ یہ قصہ دنیا بھر کی زبانوں سے ٹکر لے سکتا تھا۔ کیونکہ اس نام کو دیانرائن نگم نے ہی تجویز کیا تھا، یہ نام صرف زمانہ کے لیے ہی محدود تھا۔ ایک نیا رسالہ ادیب نکلا تھا اس کے ایڈیٹر تھے ان کے دوست پیارے لال شاکر میرٹھی۔ اس میں مصنف کا نام اس طرح لکھا جاتا تھا۔ "د۔ر" (دھنپت رائے)

پریم چند کے افسانے بہت مقبول ہوئے۔ دھوم مچ گئی۔ اردو سے ہندی میں ترجمے ہوئے اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ان کے ترجمے شائع ہونے لگے۔ پریم چند نے سوچا پچیس افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کیا جائے، وہ افسانے تھے، مامتا، وکرما دتیہ کا تیغہ، بڑے گھر کی بیٹی، رانی سارندھا، راج ہٹ، راجہ ہردول، نمک کا داروغہ، عالم بے عمل، گناہ کا اگن کنڈ، بے غرض محسن، آہ بیکس، آلہا، خون سفید، صرف ایک آواز، اندھیر، بانکا زمیندار، تریا چرتر، سوت، شکاری راج کمار، کرموں کا پھل، مناؤن، مرہم، اماوس کی رات، غیرت کی کٹار، منزل مقصود۔ افسانے مقبول تھے مگر پبلشروں کا قحط تھا۔ کوئی شائع کرنے کو تیار نہ تھا۔ پریم چند نے فیصلہ کیا کہ اسے زمانہ پریس سے شائع کرایا جائے۔ دیانرائن سے شرکت کی بات کی۔ اگر نقصان ہوا تو آدھا آدھا۔ زمانہ پریس کو پیشگی درکار تھی مگر مینیجر نے مطلع کیا کہ ان کو رسالہ سے ملنے والی رقم پیشگی رقم سے زیادہ ہے۔ خیر خط و کتابت شروع ہوئی۔ یکم اکتوبر 1913 کو پریم چند نے دیا نرائن نگم کو لکھا "غالباً پریم پچیسی اب شب بلا تک نہ چھپ سکے گی ...... اگر آپ کا پریس اتنا وقت ہی نہ نکال سکے تو میں بدرجہ مجبوری یہ التماس کروں گا کہ یا تو میرے 72 روپے عطا فرمائیں یا پریم پچیسی کے 4½ جزو چھپے ہوئے ریل کے ذریعے میرے پاس بھیج دیں۔ غالباً میں ان درخواستوں میں غیر معقولیت سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ میں کسی دوسرے پبلشر کو ڈھونڈوں گا۔ صرف دیباچہ اور ٹائیٹل کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ بھی نہ ہو سکا تو شہد اور

گھی لگا کر ان اوراق پریشاں کو چاٹوں گا اور سمجھوں گا کہ زرخود میخورم، یا میوۂ در محنت خود میخورم۔ بہرحال آپ جو کچھ فیصلہ کریں جلد کریں اور مجھے مطلع فرمائیں۔ قیامت کے انتظار میں بیٹھنے سے تو یہی بہتر ہے کہ جو کچھ اس وقت ملتا ہے مل جائے''۔

اگلے ہی مہینے: ''آپ میری کتاب (جلد اوّل) جلدی سے چھپوا دیجیے تاکہ اس کی قدردانی دیکھ کر دوسرے حصے میں ہاتھ لگے اور کچھ منافع بھی ہو۔ کیا کہوں آپ نے مجھے اچھالنے میں کوئی کسر نہیں رکھی، خوب اچھالا، مگر میں ہی قسمت کا لنڈورا ہوں کہ پرواز نہیں کر سکتا بلکہ نیچے گرنے کے لیے ڈرتا ہوں''۔ بعد میں پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھا کہ پریم پچیسی میں نے اپنے خرچ پر زمانہ پریس سے چھپوائی تھی۔

پریم پچیسی دو حصوں میں شائع ہوئی تھی۔ حصہ اول کو چھپنے میں دو سال لگ گئے۔ یہ 1914 میں شائع ہوئی۔ پریم پچیسی کی کاپیاں تبصرہ کے لیے ارسال کی گئیں۔ اشتہار چھپوائے گئے۔ کاپیاں اعلیٰ ادیبوں اور نقادوں کو بھی بھیجی گئیں تاکہ ان کی رائے آئے اور ان کا رسائل میں دیے جانے والے اشتہاروں میں استعمال کیا جاسکے۔ الناظر لکھنؤ کے ستمبر 1915 کے شمارے میں ایک اشتہار شائع ہوا جس میں ڈاکٹر محمد اقبال کی رائے درج ہے۔ علامہ اقبال نے مصنف کو تحریر فرمایا تھا ''آپ نے اس کتاب کی اشاعت سے اردو لٹریچر میں ایک نہایت قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے نتیجہ خیز افسانے جدید اردو لٹریچر کی اختراع ہیں۔ میرے خیال میں آپ پہلے شخص ہیں جس نے اس راز کو سمجھا ہے اور سمجھ کر اس سے اہل ملک کو فائدہ پہنچایا ہے۔ ان کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف انسانی فطرت کے اسرار سے خوب واقف ہے اور اپنے مشاہدات کو ایک دلکش زبان میں ادا کرسکتا ہے''۔

منشی جی کی کہانیاں اردو میں مقبول تو تھیں مگر کتابی صورت میں یہ بکتی نہیں تھیں۔ 2/ مارچ 1917 کو پریم چند نے دیانرائن نگم کو لکھا ''پریم پچیسی حصہ دوم میں ذرا سرگرمی فرمائیے۔ جلدی ختم ہو جائے۔ ابھی بہت کچھ چھپوانا ہے۔ اگر پہلی منزل میں اتنا رُکے تو پھر اتنی لمبی زندگی کہاں سے آئے گی۔ تعطیل گرما کے پہلے ختم ہو جانا ضروری ہے''۔

پریم پچیسی حصہ دوم کے بارے میں امتیاز علی تاج کو لکھا کہ ''اس کے چھپوانے

کا کام شروع کر دیا ہے۔ اور یہ یکم جولائی 1917 تک پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا"۔
زمانہ کے مدیر نے لکھا "یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ منشی پریم چند کے افسانوں نے پبلک میں کتنی شہرت حاصل کی ہے۔ یہ امر تسلیم ہے کہ صاحب موصوف کے زبردست اور عظیم قلم نے اپنے جادو بھرے قصوں میں اخلاقی اوصاف، حب وطن و حسن و عشق کی بولتی چالتی تصویریں اور ان کے نہایت پاکیزہ پہلو کو نرالے ڈھنگ میں دکھائے ہیں۔ پریم پچیسی حصہ دوم میں ایسے دلچسپ اور پُر اثر قصے درج کیے گئے ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شائقین جو منشی پریم چند صاحب کے جادو نگار کا نتیجہ دیکھنا چاہتے ہیں قیمت ایک روپیہ"۔

پریم پچیسی کا حصہ اول 1914 میں شائع ہوا تھا حصہ دوم 1918 میں۔ ایک سال بعد پریم چند نے نگم کو لکھا کہ "آپ کے منیجر کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم پچیسی حصہ دوم کی کل 119 جلدیں نکلی ہیں۔ اس حساب سے تو شاید کتاب میری زندگی میں بھی نہ نکل سکے گی"۔

اس ناامیدی کے برعکس وہ پریم بتیسی کی اشاعت کے لیے تیار تھے۔ دو حصوں میں بتیس قصے تھے: سر پُر غرور، راجپوت کی بیٹی، نگاہِ ناز، بیٹی کا دَھن، دھوکا، پچھتاوا، شعلۂ حسن، اناتھ لڑکی، پنچایت، سوت، بانگِ سحر، مرضِ مبارک، قربانی، دفتری، دو بھائی، بازیافت، بوڑھی کاکی، بینک کا دیوالا، زنجیر ہوس، سوتیلی ماں، مشعلِ ہدایت، خنجر وفا، خوابِ پریشاں، راہِ خدمت، حج اکبر، آتما رام، ایمان کا فیصلہ، فتح، دُرگا کا مندر، خونِ حرمت، اصلاح اور جگنو کی چمک۔ اگست 1919 میں نگم کو لکھا کہ "ذرا منیجر صاحب زمانہ سے دریافت کر کے مطلع کریں کہ بتیسی کی چھپائی فی جز کتنی ہوگی۔ اس معاملے میں مجھے امید ہے کہ آپ کے امکان میں جتنی رعایت ہوگی اس سے دریغ نہ فرمائیں گے"۔ تین مہینے بعد "پریم بتیسی کے مضامین کی ترتیب بھیجتا ہوں کتاب شروع کر دیجیے"۔

کچھ ہی دنوں بعد پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھا "پریم بتیسی حصہ اول چھپ رہی ہے۔ غالباً دو مہینے میں تیار ہو جائے گی۔ کیا آپ پریم بتیسی کا حصہ دوم اپنے اہتمام (دارالاشاعت) سے شائع نہیں کر سکتے۔ بازارِحسن تو ابھی معلوم نہیں کب تک تیار ہو۔ اس اثنا میں اگر بتیسی حصہ دوم آپ شائع کر سکیں تو خوب ہو۔ کچھ قصے آپ ہی کے

دونوں پرچوں میں نکلے ہیں بقیہ میں دے دوں گا۔ کوئی دس جزو کی کتاب ہوگی"۔ امتیاز علی تاج پریم بتیسی حصہ دوم کی اشاعت کے لیے تیار ہوگئے۔ پریم چند نے 30 ستمبر 1919 کو لکھا "حصہ دوم کے لیے میں نے کون کون سے قصے تجویز کیے تھے۔ ان کی فہرست مجھے بھیج دیجیے۔ مجھے یاد نہیں آتا"۔ "مسطر 21 سطروں کا ہونا چاہیے (کیونکہ) اسی پر حصہ اول چھپ رہا ہے۔ کاغذ میں نے حصہ اول کے لیے بیس پاؤنڈ کا لگایا ہے اگر آپ بھی یہی کاغذ لگائیں تو دونوں حصوں میں یکسانیت آجائے اور تب قیمت بھی یکساں رکھی جائے گی۔ گھٹیا کاغذ لگانا بے جوڑ ہوگا"۔ 16 دسمبر 1919 کے خط میں "کاغذ برا نہیں ہے۔ اس پر چھپنے دیجیے۔ چھپے ہوئے فارم رد کر دینے سے نقصان ہوگا۔ میرا کاغذ ان سے کہیں بہتر ہے۔ لیکن مضائقہ نہیں۔ سستا کاغذ رہے گا تو کتاب بھی ارزاں ہوگی۔ مسطر یہی رکھا جائے مگر کاتب کو تاکید کر دی جائے کہ مکالمے ہمیشہ نئی سطروں سے شروع کیا کرے"۔ چار مہینے بعد 22 اپریل 1920 کو "معلوم نہیں کاغذ دستیاب ہوا یا نہیں۔ میرے ہندی پبلشر کلکتہ سے آپ کے پاس ہر قسم کا کاغذ سُبھتے کے ساتھ بھیجنے پر آمادہ ہیں۔ نصف قیمت پیشگی درکار ہوگی۔ اگر آپ اسے منظور فرمائیں تو کاغذ آجائے گا"۔ 16 جون 1920 "سن کر خوشی ہوئی کہ کاغذ آگیا اور پریم بتیسی کی کتابت مکمل ہوگئی اب تو اسے چھپوا بھی ڈالیں۔ حصہ اول بھی غالباً آخر جولائی تک تیار ہوجائے گا۔ جولائی تو کیا اگست آخر تک۔ حصہ اول ابھی تک دیانرائن نگم صاحب کی بے توجہی کے سبب معرض التوا میں پڑا ہوا ہے۔ مگر امید ہے کہ حصہ دوم کا شائع ہونا تازیانے کا کام دے گا۔ اور یہی میری غرض تھی"۔

دیانرائن نگم کو کاغذ کے دستیاب ہونے میں مشکلات تھیں۔ پریم چند نے 10 دسمبر 1920 کو لکھا "پریم بتیسی کا ٹائٹل ابھی لگایا یا نہیں؟ اب تو للّٰہ دیر نہ کیجیے۔ جیسا کاغذ ملے اچھا یا بُرا بڑھیا یا گھٹیا، براؤن، کالا، پیلا، نیلا، سبز، سرخ، نارنگی، لیکن ٹائٹل ہیچ چھپوا دیجیے اور کتاب کی چھ سو جلدیں (قسم اول 500، قسم دوم 100) لاہور بھجوا دیجیے"۔ دس دن بعد "بتیسی کا پیکٹ ملا۔ ٹائٹل دیکھ کر رُو دیا۔ بس اور کیا لکھوں۔ کتاب کی مٹی خراب ہوگئی۔ آپ نے بہتر کاغذ نہ پاکر وہ کاغذ استعمال کرلیا ہوگا۔ غالباً کتاب کی تقدیر میں اس طرح بگڑنا لکھا تھا۔ خیر فی الحال چلنے دیجیے۔ لاہور والوں سے کہہ دوں گا کہ وہ ٹائٹل بدل ڈالیں۔ آپ کے یہاں بھی اچھا کاغذ ملتے ہی ٹائٹل بدلنا پڑے گا۔ کچھ نقصان

ہو گا مگر غم نہیں"۔

پریم چند نے دیانرائن نگم کو پھر لکھا "پریم بتیسی ابھی تیار ہوکر نہیں آئی۔ ٹائٹل پیج میں زیادہ تردد اور جلدیں تیار ہونے کی امید نہ ہو تو آپ اس کی سات سو جلدیں بغیر ٹائٹل کے لاہور دفتر کہکشاں کو روانہ کردیں۔ وہ اپنا ٹائٹل چھپوا کر لگالیں گے اجرت مجھ سے وضع کرلیں گے"۔

پریم بتیسی کے دیباچے میں پریم چند نے لکھا "میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ پریم پچیسی کئی سال ہوئے شائع ہوا تھا۔ جہاں تک معاصر اخباروں کا تعلق ہے انھوں نے میری ناچیز کاوش کی داد دی لیکن شائقین پر اس کا بہت کم اثر ہوا۔ پہلا اڈیشن ختم ہونے میں کم و بیش پانچ سال لگ گئے۔ یہ قدردانی بہت حوصلہ انگیز تو نہ تھی۔ لیکن مصنف کو تصنیف کے سوا چارہ نہیں۔ اس لیے یہ دوسرا مجموعہ پریم بتیسی کے نام سے اردو پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ پہلے مجموعہ کی نسبت اس کا زیادہ چرچا ہو۔ یا سارا تومار اشاعت کے گودام ہی میں پڑا سڑے۔ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہوچکا۔ اب صرف یہی آرزو ہے کہ ایک منتخب مجموعہ پریم چالیسا یا پریم پچاسا کے نام سے اور نکل جائے۔ بس یہی زندگی کا ماحصل ہوگا اور اسی پر قناعت کروں گا"۔

پریم بتیسی حصہ دوم کے بارے میں امتیاز علی تاج کو 30 اکتوبر 1920 کو لکھا "پریم بتیسی دیکھا، باغ باغ ہوگیا۔ مجھے یہ مجموعہ نہایت پسند آیا۔ کتابت اور جلی ہوتی تو بہتر ہوتا، تب قیمت اور زیادہ رکھنی پڑتی فی الجملہ کتاب خوب چھپی ہے۔ اور میں اس کے لیے آپ کا تہہِ دل سے ممنون ہوں۔ دیکھیں پبلک اس کی کیا قدر کرتی ہے۔ پہلا حصہ بھی شاید اس ماہ میں تیار ہوجائے۔ میں نے زمانہ کو لکھ دیا ہے کہ آپ کے یہاں پانچ سو کتابیں بھیج دیں"۔

اپنے دوست دیانرائن نگم کے زمانہ پریس سے اتنے پریشان تھے کہ جب زمانہ پریس کے منیجر نے پریم چند کو لکھا کہ پریم پچیسی کے دونوں حصے ختم ہوچکے ہیں اور انھوں نے دوسرے ایڈیشن کے لیے اصرار کیا تو پریم چند نے امتیاز علی تاج کو (14 ستمبر 1920) لکھا کہ "میں نے عہد کر لیا ہے کہ زمانہ کی گردش میں نہیں پڑوں گا، اگر آپ اسے نکال سکیں تو بہتر ہے"۔

پریم چند کے افسانوں کے ترجمہ ہندی اور دوسری زبانوں میں بھی چھپنے لگے، ہندی میں تو ان کا خاص استقبال ہوا۔ پریم چند کے ایک دوست منن دویدی گجپوری تحصیلدار نے پریم چند سے کہا کہ وہ ہندی میں بھی لکھیں۔ ہندی کے مشہور رسالے سرسوتی دسمبر 1915 میں پریم چند کی پہلی کہانی ''سوت'' شائع ہوئی۔ اردو میں اسی عنوان سے یہ پریم بتیسی میں شامل کی گئی۔

ہندی میں پریم چند کے افسانوں کی دھوم مچ گئی۔ جہاں اردو میں ناشروں کا قحط تھا وہاں ہندی کے ناشروں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ جون 1917 میں ان کا پہلا ہندی مجموعہ ''سپت سروج'' ہندی پستک ایجنسی گورکھپور نے شائع کیا۔ اس میں سات کہانیاں (بڑے گھر کی بیٹی، سوت، سجنتا کا ڈنڈ، پنچ پرمیشور، نمک کا داروغہ، اپدیش اور پریکشا) شامل تھیں۔ اس کے دیباچے میں گجپوری نے لکھا:

''اردو سنسار کے ہندو مہارتھیوں میں پریم چند جی کا استھان بہت اونچا ہے۔ انیک ناموں سے آپ کی پستکیں اردو سنسار کی شوبھا بڑھا رہی ہیں۔ اردو پتروں نے آپ کی رچناؤں کی مکت کنٹھ سے پرشنسا کی ہے۔ ہرش کی بات ہے کہ ماتر بھاشا ہندی نے کچھ دنوں سے آپ کے چت کو آکرشت کیا ہے۔ پریم چند نے اُسے پوجنارتھ ناگری مندر میں پرویش کیا اور ماتا نے اسے ہردلے سے لگا کر اپنے اس لیش شالی پُتر کو اپنایا ہے۔ اس پرتبھا شالی لیکھک مہانُوبھاو نے اتنی جلدی ہندی سنسار میں اپنا نام کر لیا ہے کہ آشچریہ ہوتا ہے۔ آپ کی کہانیاں ہندی سنسار میں انوکھی چیز ہیں۔ ہندی پتر پتریکائیں آپ کے لیکھوں کے لیے لالائت رہتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا وِچار ہے کہ آپ کی گلپیں ساہتیہ مارتنڈ رویندر بابو کی رچناؤں سے ٹکر لیتی ہیں۔ ایسے وِدوان اور پرسدّھ لیکھک کے وشیہ میں لکھنا اناوشیک اور انوچت ہوگا''۔

اگلے سال بمبئی کے ہندی گرنتھ رتناکر نے نو قصوں کو ''نوندھی'' کے عنوان سے مجموعہ شائع کیا۔ قصے تھے: راجہ ہردول، رانی سارندھا، مریادا کی بیدی، پاپ کا اگنی کنڈ، جگنو کی چمک، دھوکا، اماوس کی رات، پچھتاوا، ممتا۔ اسی سال گورکھپور کی ہندی پستک ایجنسی نے تیسرا مجموعہ پریم پورنا شائع کیا۔ اس میں پندرہ افسانے شامل کیے گئے۔ افسانے تھے: ایشوریہ نیائے، شنکھ ناد، خون سفید، غریب کی ہائے، دو بھائی، بیٹی کا دھن، دھرم

سنکٹ، درگا کا مندر، سیوا مارگ، شکاری راج کمار، بلیدان، بودھ، سچائی کا اپہار، مہاتیر تھ۔

جہاں پریم بتیسی کی 1920 میں اشاعت کے بعد آٹھ سال تک اردو کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا وہاں انھیں آٹھ سالوں میں ہندی میں پریم پچیسی (اردو کی کتاب سے مختلف افسانے تھے)۔ ٹالسٹائی کی 22 کہانیاں، بڑے گھر کی بیٹی، نمک کا داروغہ، لال فیتہ، بینک کا دیوالہ کے علاوہ پریم پرسون (گیارہ قصے)، پریم دوادِشی (12 قصے)، پریم پرتکیا (19 قصے)، پریم پرمود (17 کہانیاں)، اگنی سمادھی (8 قصے) اور شانتی شائع ہوئے۔

29 اگست 1928 کے خط میں پریم چند نے نگم کو لکھا تھا، ''اپنی کہانیوں کے ایک مجموعہ کو میں نے یہاں خود چھپوانا شروع کیا ہے۔ دس فارم چھپ گئے ہیں۔ شاید ایک فارم اور ہو۔ اس کا نام رکھا ہے خاک پروانہ۔ اس میں چودہ کہانیں ہیں۔ کپتان، خاک پروانہ، ملاپ، بڑے بابو، فکر دنیا، ستیاگرہ، تالیف، مستعار گھڑی، نغمۂ روح، عجیب ہولی، دعوت، مزار آتشیں، خودی، نادان دوست۔ زمانہ کے اکتوبر نومبر 1928 شمارہ میں اشتہار تھا اور فروری 1929 میں تبصرہ۔ (دوسرے گیلانی پریس کے ایڈیشن میں علاحدگی اور تحریک شامل کر دی گئیں)۔

اسی سال (1928 میں ہی) خواب و خیال کے نام سے ایک مجموعہ لاہور کے لاجپت رائے اینڈ سنز نے شائع کیا۔ اس میں مندرجہ ذیل چودہ کہانیاں تھیں۔ نوک جھونک، دست غیب، لال فیتہ، موٹھ، شطرنج کی بازی، مایۂ تفریح، نخل امید، فلسفی کی محبت، فتح، عبرت، خودی، دعوتِ شیراز، شدھی، ستی۔

اسی سال ایک اور مجموعہ، انڈین پریس الہٰ آباد سے چھپوایا۔ یہ تھا فردوسِ خیال، اس میں بارہ افسانے تھے : نزولِ برق، بھوت، توبہ، ڈگری کے روپے، تہذیب کا راز، بھاڑے کا ٹٹو، راہِ نجات، سوا سیر گیہوں، لیلیٰ، عفو، مریدی، نیک بختی کے تازیانے۔ 23 اپریل 1930 دیانرائن نگم کو لکھے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان افسانوں کا ہندی سے اردو میں ترجمہ پریم چند نے خود کیا۔

آٹھ سال قبل ستمبر 1920 میں پریم چند نے تاج صاحب کو ایک قصہ بھیجا تھا۔ عنوان تھا ''دفتری''۔ اسی خط میں تاج کو مطلع کیا کہ یہ قصہ پریم چالیسی کا پہلا قصہ ہوگا۔ مگر چالیسی کی اشاعت نو سال بعد ہو سکی۔ اور یہ نہ تو زمانہ پریس سے، نہ ہی دارالاشاعت

سے بلکہ اسے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور سے شائع کیا۔ اس کے ناشر سعید مبارک علی نے خود پریم چند سے لکھنؤ میں ملاقات کی اور سوزِ وطن اور پریم چالیسی، خانہ پروانہ اور کربلا کی اشاعت کے لیے اجازت مانگی اور یہ بھی پوچھا کے صفحے میں کتنی سطریں ہوں۔
پریم چالیسی کے بارے میں اب مزید معلومات نہیں ہے۔ بس یہی معلوم ہے کہ پریم چالیسی 1930 میں دو حصوں میں شائع ہوئی۔ اس میں شائع ہوئے قصے یوں ہیں۔ حصہ اول میں : چوری، قزاقی، انتقام، رام لیلا، دین داری، سہاگ کا جنازہ، داروغہ کی سرگزشت، خانۂ برباد، کشمکش، الزام، منتر، انسان کا مقدس فرض، استعفیٰ، کفارہ، دیوی، قوم کا خادم، ترسول، مندر، بُھنی، آنسوؤں کی ہولی۔ حصہ دوم میں : مجبوری، چکمہ، ابھاگن، حسرت، دیوی، جنت کی دیوی، سزا، دو سکھیاں، ماں، بیوی سے شوہر، پوس کی رات، جلوس، لیلیٰ، حرز جاں، مزار الفت، عفو، جہاد، امتحان، بند دروازہ۔

مارچ 1934 نرائن دت سہگل نے لاہور سے تیرہ کہانیوں کا مجموعہ آخری تحفہ شائع کیا۔ قصے تھے : جیل، آخری تحفہ، طلوع محبت، دو بیل، ادیب کی عزت، ڈیمانسٹریشن، نجات، شکار، آخری حیلہ، قاتل، وفا کی دیوی، برات، ستی۔

اردو گھر دہلی سے 1936 میں زادِ راہ شائع ہوئی۔ اس میں پندرہ کہانیاں تھیں : آشیاں برباد، ڈامل کا قیدی، قہر خدا کا، بڑے بھائی صاحب، لعنت، لاٹری، خانۂ داماد، فریب، زیور کا ڈبہ، وفا کی دیوی، زادِ راہ، مس پدما، حقیقت، ہولی کی چھٹی۔

اپنی وفات سے تین سال پہلے پریم چند نے "میرے بہترین افسانے" (جو کتاب منزل کشمیری گیٹ، لاہور 1933 نے شائع کی تھی) کے دیباچہ میں لکھا تھا: "میرے دوست مدت سے مصر تھے کہ میں اپنی کہانیوں کا ایک ایسا نمائندہ مجموعہ منتخب کردوں جس کے مطالعہ سے لوگ زندگی کے متعلق میرے نظریات معلوم کرسکیں۔ یہ انتخاب اس مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں میں نے محض ان کہانیوں کو چنا ہے جنھیں میں پسند کرتا ہوں اور جنھیں جدا جدا نوعیت کے نقادوں نے بھی سراہا ہے"۔ یہ کہانیاں ہیں : راہِ نجات، منتر، مہاتیرتھ، پنچ پرمیشور، رانی سارندھا، دو بیل، شطرنج کی بازی، ستی، پرائشچت، سجان بھگت۔

عصمت ڈپو دلی نے پریم چند کی وفات کے بعد 1937 میں دودھ کی قیمت شائع

کیا، اس میں نو کہانیاں ہیں : عصمت، گسم، وفا کا دیوتا، اکسیر، عیدگاہ، سکون قلب، ریاست کا دیوان، دودھ کی قیمت، زاویہ نگاہ۔

پریم چند نے 19 مارچ 1935 کو حسام الدین غوری کو لکھا تھا ''واردات چھپ رہا ہے''۔ اس میں تیرہ افسانے ہیں : گلی ڈنڈا، مفت کرم داشتن، بدنصیب ماں، انصاف کی پولس، بیوی، مالکن، شکوہ شکایت، روشنی، معصوم بچہ، سوانگ، شانتی، قاتل کی ماں، غم نداری، بُز بخر۔

دودھ کی قیمت کے بعد پریم چند کے قصوں کا کوئی مصدقہ مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ 1978 میں میں نے تیس قصوں کا ایک مجموعہ مکتبہ جامعہ کو اشاعت کے لیے دیا تھا۔ کاپی رائٹ کی وجہ سے یہ کئی سال تک شائع نہیں ہو سکا۔ تب میں نے اسے واپس لے کر سٹار پبلشر کو دے دیا کچھ سال بعد پتہ چلا کہ وہ مسودہ گم ہو گیا۔ اس میں بہت سی وہ کہانیاں تھی جو گوئنکا کے اپراپتیہ ساہتیہ میں پیش کی گئی ہیں۔

پریم چند کی وفات سے قبل اردو اور ہندی میں ان کی لگ بھگ پچاس تصانیف شائع ہو چکی تھیں۔ تاریخ وار فہرست پیش ہے۔ (1) سوز وطن، (2) سیر درویش، (3)روٹھی رانی، (4) پریم پچیسی (حصہ اول)، (5) سپت سروج، (6) نوندھی، (7) پریم پورنما، (8) پریم پچیسی (حصہ دوم)، (9) پرم بتسی (حصہ اول)، (10) پریم بتیسی (حصہ دوم)، (11) پریم پرتما، (12) نمک کا داروغہ، (13) پنچ پرمیشور، (14) پریم پچیسی (ہندی)، (15) ٹالسٹائے کی کہانیاں، (16)پریم پرسون، (17) بینک کا دیوالہ، (18) پریم دوادشی، (19) پریم پرتگیا، (20)پریم پرمود، (21) شانتی، (22) اگنی سمادھی، (23) خاک پروانہ، (24) خواب و خیال، (25)فردوس خیال، (26) پریم چترتھی، (27) پریم تیرتھ، (28) پانچ پھول، (29)سپت سُمن، (30) سمر یاترا، (31) پریم چالیسی (حصہ اول)، (32)پریم چالیسی (حصہ دوم)، (33)پریم گنج، (34) پریرنا، (35) سروسریشٹھ کہانیاں، (36) میرے بہترین افسانے، (37) پنچ پرسون، (38) آخری تحفہ، (39) نوجیون، (40)پریم پی یوش، (41) مرتک بھوج، (42)نجات، (43) مان سروور (حصہ اول)، (44)مان سروور (حصہ دوم)، (45)زادِ راہ، (46)دودھ کی قیمت، (47) واردات، (48)دیہات کے افسانے، (49) جیل، (50)گرامیہ جیون کی کہانیاں۔

افسانوں میں مذکورہ بالا نمبر 2، 3، 13، 17، 30، 34، 41، 42 وغیرہ شاید ایسی کہانیاں تھیں جنھیں صرف ایک کہانی کے طور پر پیش کیا گیا۔ کچھ دو یا تین، چار، پانچ، چھ، سات، نو، بارہ، پندرہ، سترہ کہانیوں کے مجموعہ بھی تھے۔

وفات کے تھوڑا پہلے پریم چند نے مان سروور کے عنوان سے دو مجموعے شائع کیے تھے۔ ان میں 53 قصے تھے۔ اس کے بعد ان کے بڑے بیٹے شری پت نے ایک مجموعہ "کفن" شائع کیا جس میں بارہ قصے تھے۔ اس کے علاوہ 150 قصے ہندی اور اردو کے رسالوں میں تلاش کر انھیں مان سروور کے اگلے چھ حصوں میں شائع کیا۔ پھر 1962 میں پریم چند کے چھوٹے بیٹے امرت رائے نے 56 کہانیوں کو زمانہ اور دوسرے اردو ہندی رسالوں سے اکٹھا کر کے گپت دھن کے دو حصوں میں شائع کیا۔ اس کے کئی سال بعد شری پت رائے نے سولہ کہانیاں پیش کیں۔ کمل کشور گوئنکا نے ان سولہ کے علاوہ سولہ اور قصے ڈھونڈ نکالے۔ انھیں پریم چند کے 'اپراپیہ ساہتیہ' میں شائع کیا۔

مان سروور (آٹھ حصے) کفن، گپت دھن (دو حصے) اور پریم چند کے اپراپیہ ساہتیہ میں شائع ہوئے افسانوں کے علاوہ دو کہانیاں قاتل اور بارات اردو میں پریم چند کے نام سے چھپی ہیں اور یہی دونوں کہانیاں شیورانی دیوی کے مجموعے ناری ہردے میں بھی چھپی ہیں۔ میں نے 1959 میں امرت رائے کو خط لکھ کر پوچھا بھی تھا (شیورانی دیوی حیات تھیں) ایسا کیوں؟ جواب نہیں آیا میرا خیال ہے یہ کہانیاں پریم چند کی ہی ہیں۔ اردو کا متن تو انھیں کا ہے۔

مان سروور (حصہ چار) کی "سمسیا" وہی افسانہ ہے جو مان سروور (آٹھ) میں "وشم سمسیا" کے عنوان سے ہے۔ گوئنکا کے پریم چند کا اپراپیہ ساہتیہ میں روئے سیاہ وہی کہانی ہے جو اسی کتاب میں پرتگیا کے عنوان سے ہے۔ گوئنکا کے اپراپیہ ساہتیہ میں "پرتشٹھا کی ہتیا" وہی افسانہ ہے جو گپت دھن میں "عزت کا خون" کے عنوان سے شامل ہے۔ اسی طرح "بہنی" بھی دوبار شامل ہوگئی ہے۔ مان سروور حصہ دوم کی "نیائے" وہی افسانہ ہے جو گپت دھن میں "نبی کا نیتی نرواہ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ "لال فیتہ" اور "وفا کی دیوی" کسی ہندی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ تقریباً 100 ہندی کہانیاں ہیں جن کا اردو ترجمہ نہیں شائع ہوا ہے۔

کچھ محقق بمبوق اور پلشم کے نام سے شائع شدہ کہانیوں کو پریم چند کی کہانیاں سمجھتے ہیں میرے خیال میں یہ ٹھیک نہیں۔ پلشم مشہور فلمی ایکٹرس مینا کماری کے نانا پیارے لال شاکر میرٹھی کا قلمی نام تھا جنھوں نے دیانرائن نگم کے ساتھ کام کیا تھا اور بعد میں ادیب کے مدیر بنے۔ بمبوق کے نام سے ایک ادیب زمانہ میں لکھتے تھے مگر وہ اپنے نام کے ساتھ ایم ایس سی بھی لکھتے تھے۔ نیرنگ خیال میں ایک خواتین انیس فاطمہ بن بمبوق کے نام سے لکھتی تھیں۔ جب بمبوق کی کہانیاں شائع ہوئیں اس وقت پریم چند بہت مقبول تھے ۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس نام سے افسانے لکھتے۔ یہاں یہ لکھنا بھی واجب ہوگا کہ ایک دوسرے پریم چند بھی تھے۔ جنھوں نے اپنے مجموعوں کو لاہور سے چھپوایا تھا۔ یہ اپنے نام کے بعد ایم.اے. لکھتے تھے جبکہ منشی پریم چند صرف بی.اے. ہی تھے۔ ایک محقق کے مطابق ان کے اس نام سے 17 مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ راقم الحروف نے کچھ مجموعوں کو عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں دیکھا ہے۔

کچھ محققین نے داراشکوہ کا دربار کو افسانوں میں شامل کرنا چاہا ہے۔ یہ ستمبر 1908 میں لاہور کے ماہ وار رسالہ آزاد میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ نہیں انشائیہ ہے۔ پریم چند تاریخی واقعات کو موضوع بناکر افسانے ضرور لکھتے تھے جیسے امتحان، نزول برق، دل کی رانی، زنجیر ہوس، مگر ان سب میں وہ ڈرامائی کیفیت پیدا کردیتے تھے۔ داراشکوہ کا دربار میں مغل بادشاہ شاہ جہاں کے فرزند عظیم کی زندگی کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تو مضمون ایسے ہی ہے جیسے پریم چند کا کراوم ویل پر مضمون۔ اسے اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا جارہا ہے۔ ایسا ہی ایک اور مضمون ہے بھرت۔ اسے بھی افسانوں کی فہرست میں نہیں رکھا گیا ہے۔

ابتدائی دور سے پریم چند کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ رابندرناتھ ٹیگور کی کہانیوں کے اردو ترجمے کیے تھے اور شائع کرائے تھے۔ ان کی تفصیل دستیاب نہیں ہے ٹالسٹائی کی بیس سے زیادہ کہانیوں کے ترجمے بھی کیے۔ کچھ کہانیاں بچوں کے لیے ہیں۔ جیسے جنگل کی کہانیاں یا کتے کی کہانی۔ ان کہانیوں کو بھی پریم پچاسا میں شامل نہیں کیا گیا۔

1907 میں نواب رائے کا شائع ہونے والا ایک قصہ تھا روٹھی رانی۔ یہ ہندی

سے ترجمہ تھا۔ اس کے آخر میں لکھا تھا "ماخوذ و ترجمہ از ہندی نواب رائے" اس قصہ کے مصنف تھے منشی دیوی پرساد ساکن جودھپور، جن کے والد اجمیر کی درگاہ کے نائب رہ چکے تھے۔ دیوی پرساد فارسی اور ہندی کے مصنف تھے ریاست جودھپور میں ہندی کو سرکاری زبان بنوانے میں سرگرم تھے۔ تقریباً ساٹھ ہندی کتابوں کے مصنف تھے۔ مغل بادشاہوں اور راجستھان کے مہاراجاؤں پر کتابیں لکھی تھیں۔ ایک کتاب کا عنوان تھا "روٹھی رانی"۔ منشی دھنپت رائے جو نواب رائے کے نام سے رسائل میں لکھتے تھے (اور آگے چل کر پریم چند بنے) اس کتاب سے متاثر ہوئے اور اس کا اردو ترجمہ کرکے اسے زمانہ کے اپریل تا اگست 1907 کے شماروں میں شائع کرایا۔ مدیر دیانرائن نگم نے اسے قصہ کا خطاب دیا ہے۔ اور اسے ایک کتابچہ کی شکل میں بھی چھاپ کر زمانے کے دفتر سے فروخت بھی کیا تھا۔ اس کے ٹائٹل پر بھی لکھا تھا، "ایک قصہ"۔ میں نے یہ معلومات اپنی کتاب پریم چند لٹریری بایوگرافی میں پیش کی تھی۔ امرت رائے نے روٹھی رانی کو ایک ناول قرار کرکے منگلاچرن میں شائع کیا۔ حالانکہ زمانہ میں کوئی ناول شائع نہیں ہوا۔ میں بھی دیانرائن نگم کی طرح روٹھی رانی کو قصہ مانتا ہوں اور اسے پریم پچاسا میں شامل کیا ہے۔

پریم پچاسا کی چھ جلدوں میں ایک درجن سے زائد افسانے ایسے ہیں جو بنگالی، انگریزی اور روسی کے افسانوں کے ترجمے ہیں۔ پریم چند کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ حیرانی اس بات کی ہے کہ ایک میٹرک پاس اسکول ماسٹر بندیل کھنڈ کے جنگلوں میں بسے، گاؤں یا چھوٹے قصبوں میں اسکول کا معائنہ کرنے والا کہاں سے ڈکنس، ہاتھرن اوسکر وائلڈ، ٹیگور کو تلاش کرکے پڑھتا اور افسانے لکھتا تھا۔ ان افسانوں کے ترجموں کو پریم چالیسا میں شامل کیا ہے کچھ لفظ بہ لفظ ترجمہ ہیں۔ انگریزی کی کتابوں کے علاوہ وہ روسی اور فرانسیسی مصنفوں کی کتابوں کے انگریزی ترجمے پڑھتے، اگر ان کہانیوں سے متاثر ہوتے تو ان کے پلاٹ کو لے کر اردو میں کہانی لکھ ڈالتے تھے۔ مگر یہ ذکر نہ کرتے کہ یہ افسانے کہاں سے ماخوذ ہیں۔ عام طور پر ترجموں کے اختتام پر نواب رائے یا د۔ر۔ (دھنپت رائے) لکھتے تھے مگر اصل مصنف کا نام نہیں دیتے تھے۔ "سگِ لیلیٰ" میں کرداروں کے نام وہی ہیں جو اصل افسانے میں ہے مگر یہ افسانہ کس کا لکھا ہے اس کی کوئی جانکاری نہیں۔ کبھی ماحول

بدیشی ہوتا کبھی ہندستانی، چارلس ڈکنس کی ایک کہانی کے کردار سے متاثر ہوکر "اشکِ ندامت" لکھی اس کے کردار بدیشی ہیں۔ کبھی کبھی بنگلہ کہانیوں کے ہندی ترجمے کو لے کر اسے اردو میں لکھ ڈالتے۔ جیسے دھوکے کی ٹٹی، خوفِ رسوائی، اپنے فن کا استاد، قاتل، یہ بالکل ترجمے نہیں تھے بنگلہ (ہندی ترجمے) تھیم کو لے کر لکھتے تھے۔ اور ان کہانیوں کو صرف اردو رسائل میں ہی چھپواتے تھے۔ رتن ناتھ سرشار کی سیر کہسار کو ہندی میں پروت یاترا کے نام سے لکھا۔ یہ کسی اردو مجموعے میں شائع نہیں ہوا۔ پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھا تھا کہ اشکِ ندامت اور آبِ حیات کے بعد وہ ترجمہ نہیں کریں گے۔ حقیقت برعکس ہے انھیں جب کوئی افسانہ اچھا لگتا تھا تو اس کے بنا پر افسانہ لکھ کر رسائل کو بھیج دیتے۔ ایک بار قبول کیا کہ انھوں نے Eternal City کے ایک جزو سے متاثر ہوکر ایک کہانی "وشواس" لکھی ہے۔ ایک روسی فنکار کنیپن سیو جنھوں نے پریم چند کا ہندی میں مطالعہ کیا تھا۔ مجھے 1950 میں بتایا تھا کہ پریم چند کی ایک کہانی گورکی کی کہانی سٹی آف ییلوڈیول کا ترجمہ سا تھا۔ ایک اور کہانی چیخوف کی کہانی کا۔ ایک افسانہ تھا قیدی۔

امتیاز علی تاج کو 3 جولائی 1919 کو لکھا "کل میں نے چمپا کو خاص طور سے پڑھا۔ مصنف نے خوب لکھا ہے۔ اگر کوئی ہندو صاحب ہیں تو خیر اور اگر مسلمان صاحب ہیں تو ان کی قلم کی داد دیتا ہوں۔ قصہ خوب بنایا گیا ہے۔ سری کانت کا کیریکٹر قابل تعریف ہے۔ میں نے اس قصہ کو ہندی میں ترجمہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے"۔

دسمبر 1942 میں راقم الحروف نے پریم چند کے فرزند شری پت رائے سے پیشکش کی تھی کہ پریم چند کے افسانوں کو ایک سلسلے میں شائع کریں (میری خط و کتابت ڈاکٹر شیام سنگھ ششی کی کتاب "پریم چند کے مدن گوپال" ہندی میں شائع ہوچکی ہے) مگر یہ ممکن نہ ہوسکا۔ بعد میں ایک دو ناشروں سے غیر رسمی بات ہوئی۔ کوئی اشاعت کے لیے تیار نہ ہوا۔ پریم چند کی پیدائش کے ایک سو سال بعد ان کی بہت تقریبیں ہوئی ہیں مگر اس طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ اب قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے جس اسکیم کو اپنایا ہے اس کے تحت دیگر تنقیحات کے علاوہ ان کے تمام افسانوں کو پریم پچاسا کی چھ جلدوں میں پیش کیا جارہا ہے۔

کلیات کی ان جلدوں میں وہ تمام قصے شامل ہیں جو پریم چند نے پہلے اردو میں

لکھے اور وہ بھی جن کی تخلیق پہلی بار ہندی میں اور ان کی حیات میں اردو میں بھی شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ وہ تمام قصے بھی ہیں جو صرف ہندی میں شائع ہوئے اور جنھیں پہلی بار اردو کے قارئین کے لیے پیش کیا جارہا ہے۔ کونسل نے ان قصوں کو ترجمہ کے بجائے انھیں اردو رسم الخط میں پیش کیا ہے۔ کونسل کا یہ بھی فیصلہ تھا کہ ان کے تمام ناولوں، مضامین اور قصوں کو تاریخ وار پیش کیا جائے۔

پریم چند کے اردو ہندی افسانوں کا تقابلی مطالعہ میں نے 1957 میں کیا تھا اور دو حصوں میں ایک فہرست تیار کی تھی جس میں یہ بتایا گیا کہ کون سا افسانہ کب اور کہاں ہندی، اردو میں شائع ہوا اور کس مجموعہ میں شامل ہے۔ اس کی ایک کاپی گوینکا لے گئے تھے دوسری میرے پاس ابھی تک محفوظ ہے لیکن آج تک شائع نہ کرا سکا۔ 1962 میں امرت رائے نے صرف 224 ہندی افسانوں کی فہرست پیش کی تھی اس کے سات سال بعد ڈاکٹر جعفر رضا نے ایک فہرست تیار کی تھی پھر رادھا کرشن نے اور شیلس زیدی نے بھی ایک فہرست شائع کی، مگر کسی بھی فہرست میں مکمل اور مستند جانکاری نہیں۔

پریم چند بعض اوقات قصہ کا عنوان بدل دیتے تھے۔ ایک کہانی تھی دوا اور دارو۔ اس کا نام بدل کر کپتان کر دیا۔ شامتِ اعمال کو بدل کر خاکِ پروانہ کر دیا۔ موت اور زندگی کی جگہ امرت، حسن و شباب کو بدل کر کشمکش کر دیا گیا، ہندی میں آگا پیچھا، سکونِ قلب کو بدل کر شانتی۔ زمانہ میں شائع کہانی معمہ کو بدل کر سمسیا کردیا۔ ایک مجموعے میں وِشم سمسیا بھی اسی کا نام رکھا۔

قارئین کو مد نظر رکھتے ہوئے پریم چند کرداروں کے نام بھی بدل دیتے تھے۔ کہکشاں میں ایک افسانہ حج اکبر شائع ہوا تھا اس میں کردار تھے۔ صابر حسین، شاکرہ نصیر عباسی جب یہ ہندی میں شائع ہوا تو کردار تھے۔ رودر منی، سکھدا، کیلاسی، دو بھائی (جو زمانہ میں شائع ہوئی تھی) کے کردار تھے کرشن، بلدیو، واسودیو، یشودھا، رادھا۔ اس پر دوستوں نے اعتراض کیا۔ ایڈیٹر کو خط لکھ کر صفائی پیش کی۔ جب یہ کہانی ہندی رسائل میں چھپی تو کرداروں کے نئے نام تھے۔ شیودت، کیدار، کلاوتی، مادھو وغیرہ۔ ایک کہانی آتما رام کے متعلق کہکشاں کے مدیر امتیاز علی تاج کو لکھا۔ ''یہ اس قدر ہندو ہوگئی ہے کہ کہکشاں کے لائق نہیں آپ خود ہندو سہی مگر آپ کے ناظرین تو ہندو نہیں''۔

کرداروں کے نام بدلنے کی وجہ سے اور ترجمہ میں ترمیم کی وجہ سے ہندی اور اردو میں قصوں کے تقابل میں کافی دقتیں پیش آتی ہیں کچھ رسالوں کو چھوڑ کر باقی کی زندگی پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ سید علی اکبر اکبرآبادی نے 1910 میں آگرہ سے ادیب نکالا جو صرف ایک سال چلا پھر نوبت رائے نظر نے اسی نام سے الہ آباد سے شائع کیا۔ یہ تین سال چلا۔ لکھنؤ سے برج نرائن چکبست نے 1918 میں صبح امید نکالا۔ 1926 میں ان کی وفات ہوئی۔ سدرشن نے لاہور سے چندن نکالا جو کچھ ہی سال چلا۔ زمانہ ہی صرف ایک ایسا رسالہ تھا جو 1902 سے لے کر 1945 تک شائع ہوا۔ کہکشاں، تہذیب نسواں، پھول اور شاہکار کچھ سال کے بعد بند کر دیے گئے۔ مگر زمانہ کی فائلیں کچھ لائبریریوں میں دستیاب تو ہیں مگر سب شمارے مشکل سے ملتے ہیں۔ کچھ شماروں سے صفحات بھی غائب ہیں۔ زمانہ کے علاوہ دوسرے کم عمر رسالوں کی فائلوں کے بارے میں میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ کچھ پُرانے رسالوں کی فائلیں جنھیں میں نے پچاس سال پہلے دیکھی تھی اب غائب ہیں۔ آج ادیب، العصر، کہکشاں، عصمت، ذخیرہ، نیرنگ خیال، صبح امید، ہمدرد، آزاد، تہذیب نسواں، پھول، ہزار داستان کے شماروں کی عدم موجودگی میں سارے قصص کی نقل اور ترتیب اور حواشی میں ساری تفصیلات دینے کا کام بھی آسان نہیں ہے۔

جب پریم چند نے عدم تشدد کے بعد سرکاری نوکری سے استعفیٰ دیے دیا تو ان کی آمدنی کا اہم ذریعہ افسانے ہی تھے۔ ناول سے انھیں بہت کچھ نہیں ملا، نہ ہی افسانوں کے مجموعوں سے۔ ان کی حیات میں شاید ہی کسی اردو کتاب کا دوسرا تیسرا ایڈیشن نکلا ہو بہت سے ناشروں نے انھیں رائلٹی بھی نہیں دی۔ 1941 میں مجھے سید گیلانی صاحب نے بتلایا تھا کہ پریم چالیسی کی بہت سی کاپیاں پڑی تھیں اور انھوں نے شری پت رائے کو لکھا تھا کہ لاگت کی رقم دے کر وہ ان کاپیوں کو لے جائیں۔

پریم چند کے زیادہ افسانے ہندی میں شائع ہوتے پھر ان کا ترجمہ رسائل یا اخبار میں شائع ہوتا۔ پریم چند کوشش کرتے کہ افسانے کو اردو اور ہندی رسائل کو ایک ساتھ ہی بھیجیں۔ اردو سے ہندی اور ہندی سے اردو میں ترجمہ خود کرتے یا کسی شاگرد یا دوست سے کروا کر رسالوں کو بھیج دیتے تھے۔ ایک بار نگم کو لکھا کہ ترجمۂ اقبال ورما سحر

ہتگامی سے کروالیں۔ کبھی کبھی ان کے ہندی کے افسانوں کا اردو میں ترجمہ بغیر اجازت کر دیا جاتا جو اصل افسانے سے مختلف ہوتا۔ اکتوبر 1922 کو دیانرائن نگم کو ایک خط میں لکھا ”زمانہ کے لیے ایک مضمون لکھا۔ اس کا ہندی ترجمہ کلکتہ کے ایک رسالے میں نکلا تھا۔ میں نے مضمون صاف کیا مگر ہندی میں نکلنے کے تیسرے دن ہی اس کا ترجمہ لاہور کے پرتاپ میں نظر آیا...... حالانکہ لاہوری ترجمہ بالکل بھدا ہے مگر قصہ تو وہی ہے۔“ یہی کیفیت کچھ اور قصوں کی بھی ہو سکتی ہے۔

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ پریم چند کو افسانہ نگاری میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اردو ہندی رسالوں سے فرمائش آتی رہتی تھیں۔ پریم چند قصہ لکھتے۔ رسالہ کو بھیج دیتے، یہ چھپ جاتا، رسالہ کی کاپی آتی، اسے دیکھتے۔ کبھی دوست اور احباب پڑھنے کے لیے لے جاتے اس کی تعریف ہوتی اور پریم چند بھول جاتے کون لے گیا۔ عام طور پر واپس بھی کوئی نہ کرتا تھا، مگر انھیں تو اس کی اشاعت اور معاوضہ کی فکر تھی معاوضہ آیا بات ختم ہوگئی۔ جب نئے مجموعے کی اشاعت کی بات شروع ہوتی تب دماغ پر زور ڈالا جاتا۔ اگر قصہ یاد آگیا اور قصہ دستیاب نہیں ہوا تو ایڈیٹر کو نقل کے لیے لکھتے۔ اگر قصہ یاد نہیں رہا تو اسے اس مجموعے میں شامل نہیں کیا جاسکا۔ اور جب یاد آگیا تو اس کی نقل یا اس کی کاپی کروا کر کسی دوسرے رسالے کو بھیج دیتے اور پھر بعد کے مجموعے میں شامل کر لیتے۔ ایک دو مثال پیش کرنا چاہوں گا۔

جون 1910 کے زمانہ میں ایک قصہ چھپا شکار، جب پریم پچیسی یا پریم بتیسی کے لیے قصے اکٹھے کر رہے تھے تو اس کا دھیان نہیں آیا، اکتوبر 1931 میں اسے چندن میں شائع کروایا اور اسے آخری تحفہ میں شامل کیا گیا۔ ایک اور کہانی تھی ملاپ، یہ زمانہ جون 1913 میں شائع ہوئی تھی۔ پندرہ سال بعد اسے خاکِ پروانہ میں شامل کیا گیا۔ ایک افسانہ دونوں طرف سے زمانہ مارچ 1911 میں شائع ہوئی۔ کسی مجموعہ میں نہیں ہے۔

عام طور پر پریم چند کے قصے 10، 15 صفحات کے ہوتے تھے مگر کچھ قصے ایسے بھی ہیں جن کی ضخامت 50، 60 صفحات ہیں، روٹھی رانی، دو سکھیاں وغیرہ۔ کچھ کہانیاں اتنی چھوٹی ہیں کہ کہانی لفظ کا استعمال زیب نہیں دیتا۔ جیسے بانسری (یہ صرف 8 یا 10 لائنس کی کہانی ہے) کہکشاں لاہور کے جس شمارہ میں یہ کہانی چھپی تھی اس کی فہرست

میں لکھا تھا بانسری۔ (کہانی مصنف پریم چند) گیلانی الکٹرانک پریس کے مالک سید مبارک شاہ گیلانی نے 1941 میں راقم الحروف کو بتلایا تھا کہ جب پریم چالیسی چھپ رہی تھی تو انھوں نے پریم چند کو ایک خط لکھا کہ فارم چھپ رہا ہے۔ دو صفحے خالی ہیں، کچھ لکھ دیجیے اور پریم چند نے دو صفحے کی کہانی لکھ دی۔ شاید اس کہانی کا عنوان تھا، دیوی۔ ایک دوسری تھی قوم کا خادم۔ بند دروازہ وغیرہ اسی صف میں آتے ہیں۔ اس مجموعہ میں ایک اپورن کہانی بھی شامل ہے جسے ڈاکٹر گوینکا نے ڈھونڈھ نکالا ہے۔

ایک دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ وفات سے دس پندرہ سال پہلے پریم چند نے لگ بھگ بیس افسانے لکھے جن کا تعلق ان کے بچپن یا معلّمی کے زمانے کے تجربات سے ہے۔ قزاقی، بڑے بھائی صاحب، چوری، گلی ڈنڈا، میری پہلی رچنا، ہولی کی چھٹی، جیون سار، میری کہانی، آپ بیتی، ڈھپورسنگھ، لال فیتہ، مفت کرم داشتن، لاٹری، دفتری، شکوہ و شکایت، نغمۂ روح وغیرہ۔

ان مضامین کو اور پریم چند سے انگریزی بنگلہ یا روسی سے ترجمہ کو اس مجموعہ میں شامل کرنے پر اعتراض ہوسکتا ہے مگر پریم چند کے لڑکوں نے خود انھیں افسانوں کے مجموعوں میں شائع کیا ہے۔ اس لیے ان ترجموں کو پریم پچاسا میں شامل کیا گیا ہے۔ ایک درجن طنزیہ کہانیاں ہیں جن کا مرکزی کردار موٹے رام شاسٹری ہے۔ اس کو لے کر عزت ہتک کا دعوا بھی ہوا تھا۔

پریم چند کے افسانوں کی پہلی تخلیق سوز وطن کی پانچ کہانیوں کا موضوع تھا حب الوطنی۔ اسے برٹش سرکار نے باغی قرار دیا اور انھیں حکم ہوا کہ وہ بغیر اجازت لکھنا بند کردیں اور اگر لکھیں تو باقاعدہ اجازت لے کر۔ ان دنوں پریم چند بنڈیل کھنڈ میں دورہ کرتے تھے یہاں بندیلوں اور راجپوتوں کی شادی کے قصے سنتے تھے۔ ہندستان کے قدیم بہادروں کے قصوں کو قلم بند کرنا اور عوام میں ذرا اعتماد پیدا کرنا حب الوطنی کا دوسرا پہلو تھا۔ انھوں نے کرشمۂ انتقام، راجا ہردل، رانی سارندھا، وکرما دتیہ کا تیغہ، گناہ کا اگن کنڈ وغیرہ کتنے ہی قصے لکھے۔

سیاسی حالات کے ساتھ ہی پریم چند نے سماجی مذہبی اقتصادی حالات کا بھی جائزہ لیا اور عوام کے مسائل کو سمجھنے اور انھیں حل کرنے کی کوشش کی۔ سماج مذہب

اور گھر کی کمزوریوں اور توہمات سے پردہ اٹھایا تاکہ عوام انھیں دور کرنے کے لیے کمر کسیں۔

1918 میں پریم چند نے نگم کو لکھا کہ ان کی معراج زندگی تھی ایک اچھے اخبار کی ایڈیٹری جو کسانوں کا حامی اور مددگار ہو۔

پریم چند کی پیدائش گاؤں میں ہوئی تھی تا زندگی دیہاتی زندگی سے ان کا نزدیک کا رشتہ رہا۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں گاؤں کے مسائل کو خصوصی اہمیت دی اور ان کو اپنے قصوں کا موضوع بنایا۔ کسانوں، مزدوروں اور پچھڑے طبقوں جیسے دھوبی، کرمی، نائی، چمار کی پریشانیوں پر گہرائی سے غور کیا۔ انھیں پرکھا اور محسوس کیا کہ ایک طرف تو تھی ان کی نیکی اور سچائی کی زندگی اور دوسری طرف تھی مہاجنوں، مذہب کے ٹھیکداروں، زمیندار کے اہلکاروں اور سرکاری حکاموں کی زبردستی اور مکاری اور بے ایمانی۔ کسان کی زندگی میں جدوجہد ہے، محنت ہے اور فاقہ مستی ہے۔ اپنے افسانوں میں پریم چند نے ان کا سچا اور صحیح نقشہ پیش کیا۔ ان کے کردار جیتے جاگتے انسان ہیں جو آج بھی گاؤں اور شہر کی گلیوں میں چلتے پھرتے ہیں۔ مصنف کا فرض ہے کہ غربت اور امیری کے درمیان فرق کو دور کیا جائے۔ ادب کو زندگی اور اصلاح کا ذریعہ بنائے۔ اردو ادب میں پریم چند نے ہماری معاشرتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی۔ ان کے افسانوں میں ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کے مسائل اور دشواریوں کی سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔ خانہ داری کے مختلف پہلو ان کے کرداروں اور سیاسی بیداری کی تحریک میں کندھے سے کندھا ملا کر شرکت پیش کی ہے۔ پریم چند سماج اور گھر کی کمزوریوں پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں جیسے گھاس والی، مالکن، سبھاگی، سہاگ کی ساڑی، بڑے گھر کی بیٹی، آشیاں برباد، قاتل کی ماں، ستی، علاحدگی، سمر یاترا، اجلاس، ان افسانوں میں کتنی ہی مثالیں ہیں جہاں عورتیں دشواریاں کا سامنا کرتی ہیں۔

پچھڑے لوگوں کا ایک طبقہ ہے ہریجنوں کا جنھیں آج دلت کہا جاتا ہے۔ غریبوں کے ہمدرد پریم چند ان پر ظلم و ستم کی صحیح دردناک تصویر پیش کرتے ہیں۔ جیسے ٹھاکر کا کنواں، طلوع محبت، نیچ ذات کی لڑکی، نجات، دودھ کی قیمت، جرمانہ وغیرہ ان کے کتنے ہی قصے ہیں جنھیں پڑھ کر رونا آتا ہے اور ان کے لیے ان کی سخت مخالفت بھی

ہوئی۔ ایک طبقے نے انھیں نفرت کا پرچارک تک کہا۔

پریم چند ہندو مسلم اتحاد کے بڑے علم بردار بھی تھے۔ ان کے لیے دیہات کی زندگی اور روایات، باہمی محبت اور رواداری کا نمونہ تھی۔ فرقہ وارانہ نفرت کی فضا ہندستان کے دیہات میں بالکل نہیں ہے۔ پریم چند کے کتنے ہی کردار (ہندو مسلم) کندھے سے کندھا ملا کر چلتے ہیں۔ پنچایت میں ہندو مسلم شریک ہوتے ہیں۔ پریم چند اور امن پسندی برادرانہ برتاؤ کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

کتنے ہی قصوں میں جیسے پنچایت، قربانی، سفید خون، سجان بھگت، سواسیر گیہوں، بانکا زمیندار، پوس کی رات، ہولی کی چھٹی، پچھتاوا، بانگ سحر، بیٹی کا دھن، اندھیر، مشعلِ ہدایت میں دیہاتی زندگی کے روشن پہلو پیش کرتے ہیں۔ ان میں دیہاتی فضا پیش کی گئی ہے۔ دیہات کے الفاظ اور محاورات جو صرف بول چال میں زبان پر ہوتے تھے پریم چند نے ادب میں داخل کر کے انھیں اپنی سلیس اور عام فہم پُر لطف زبان اور دلکش اچھوتے انداز بیان میں پیش کیا۔ یہی پریم چند کی قوت تخلیق کا راز ہے کسانوں اور پچھڑے طبقوں کے دکھ درد کی کہانی پڑھ کر قارئین مصنف کے ساتھ مسکراتے ہیں۔ قہقہے لگاتے ہیں یا سینے پر ہاتھ رکھ کر آنسو بہاتے ہیں۔

پریم چند قصے کیسے لکھتے تھے۔ اس بارے میں ان کے ایک خط کو پڑھیے جسے انھوں نے فروری 1934 میں نیرنگ خیال کے ایڈیٹر کو لکھا تھا:

"میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر محض واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اسی میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔ زمین تیار ہونے پر میں کیرکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں۔ لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔

میں جب تک کوئی افسانہ اول سے آخر تک ذہن میں نہ جما لوں لکھنے نہیں بیٹھتا۔ کیرکٹروں کا اختراع اس اعتبار سے کرتا ہوں کہ افسانے کے حسبِ حال ہوں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پُر لطف واقعہ پر رکھوں۔ اگر افسانے

میں نفسیاتی کلائمکس موجود ہوں تو خواہ وہ کسی واقعہ سے تعلق رکھتا ہو میں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ ابھی میں نے ہندی میں ایک افسانہ لکھا ہے جس کا نام ہے "دل کی رانی"۔ میں نے تاریخ اسلام میں تیمور کی زندگی کا ایک واقعہ پڑھا تھا جس میں حمیدہ بیگم سے اس کی شادی کا ذکر ہے۔ مجھے فوراً اس تاریخی واقعہ کے ڈرامائی پہلو کا خیال آیا۔ تاریخ میں کلائمکس کیسے پیدا ہو۔ اس کی فکر ہوئی۔ حمیدہ بیگم نے بچپن میں اپنے باپ سے فنِ حرب کی تعلیم پائی تھی اور میدانِ جنگ میں کچھ تجربہ بھی حاصل کیا تھا۔ تیمور نے ہزارہا ترکوں کو قتل کردیا تھا۔ ایسے دشمنِ قوم سے ایک ترک عورت کس طرح مانوس ہوئی؟ یہ عقدہ حل ہونے سے کلائمکس نکل آتا ہے۔ تیمور وجیہہ نہ تھا۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ اس میں ایسے اخلاقی و جذباتی محاسن پیدا کیے جائیں جو ایک عالی نفس خاتون کو اس کی طرف مائل کرسکیں۔ اس طرح وہ قصہ تیار ہوگیا۔ کبھی کبھی سنے سنائے واقعات ایسے ہوتے کہ ان پر افسانہ کی بنیاد آسانی سے رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن کوئی واقعہ محض لچھے دار اور چست عبارت میں لکھنے اور انشا پردازانہ کمالات کی بنیاد پر افسانہ نہیں ہوتا۔ میں ان میں کلائمکس لازمی چیز سمجھتا ہوں اور وہ بھی نفسیاتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ افسانے کے مدارج اس طرح قائم کیے جائیں کہ کلائمکس قریب تر آتا جائے۔ جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے تو میں اس موقعہ سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی کیفیت افسانے کی روح ہے۔

میں سست رفتار بھی ہوں۔ مہینے بھر میں شاید میں نے دو افسانے سے زیادہ نہیں لکھے۔ بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا۔ واقعہ اور کیریکٹر تو سب مل جاتے ہیں لیکن نفسیاتی بنیاد بمشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہوجانے پر افسانہ لکھنے میں دیر نہیں لگتی۔ مگر ان چند سطور سے افسانہ نویسی کے حقائق نہیں بیان کرسکتا۔ یہ ایک ذہنی امر ہے سیکھنے سے بھی لوگ افسانہ نویس بن جاتے ہیں۔ لیکن شاعری کی طرح اس کے لیے بھی اور ادب کے ہر شعبہ کے لیے کچھ فطری مناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے پلاٹ بناتی ہے۔ ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے، تاثر لاتی ہے ادبی خوبیاں جمع کرتی۔ نادانستہ طور پر آپ ہی آپ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ ہاں قصہ ختم ہوجانے کے بعد میں اسے خود پڑھتا ہوں۔ اگر اس میں مجھے کچھ ندرت، کچھ جدت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ

حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس پیدا ہوتا ہے تو میں اسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہوگیا۔ حالانکہ فیل اور پاس دونوں افسانے شائع ہو جاتے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس افسانے کو میں نے فیل سمجھا تھا اسے احباب نے بہت پسند کیا اس لیے میں اپنے معیار پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا"۔

پریم چند نے "میرے بہترین افسانے" کے دیباچہ میں لکھا تھا، ان کے قصوں کی تعداد تین سو ہے۔ ان افسانوں کو "کلیات پریم چند کی چھ جلدوں (جلد 9، جلد 10، جلد 11، جلد 12، جلد 13 اور جلد 14) میں پیش کیا گیا ہے۔

مدن گوپال

وفا کا دیوتا

منشی ہوری لال کی بیوی کا جب انتقال ہوا۔ وہ ایک طرح دنیا سے کنارہ کش ہوگئے ہیں۔ یوں روزانہ کچہری جاتے ہیں۔ اب بھی ان کی وکالت بُری نہیں ہے۔ یار دوستوں سے مراسم بھی رکھتے ہیں۔ میلوں تماشوں میں بھی جاتے ہیں۔ مگر اس لیے نہیں کہ ان مشاغل سے انھیں کوئی خاص دلچسپی ہے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ انسان ہیں اور انسان ایک مجلسی حیوان ہے۔ جب ان کی بیوی بقید حیات تھی، اس وقت کچھ اور ہی عالم تھا۔ کسی نہ کسی بہانے سے آئے دن احباب کی دعوتیں ہوتی رہتی تھیں۔ کبھی گارڈن پارٹی ہے، کبھی جنم اشٹمی ہے، کبھی ہولی۔ مہمان نوازی میں گویا ان کو مزہ آتا تھا۔ آپ سے محض رسمی ملاقات ہے، لیکن اُن کے گھر چلے جایئے تو چائے اور پھلوں سے آپ کی خاطر کیے بغیر نہ رہیں گے۔ دوستوں کی مدد کے لیے ہمیشہ تیا اور انتہا درجہ زندہ دل۔ ان کے قہقہے گراموفون میں بھرنے کے قابل ہوتے تھے۔ اولا سے محروم تھے لیکن کسی نے انھیں ملول نہیں دیکھا۔ محلّے کے سارے بچّے اُن کے بچّے تھے، اور بیوی بھی بالکل ہم مزاج۔ آپ کتنے ہی دل گرفتہ ہوں۔ اس دیوی سے ملاقات ہوتے ہی آپ کے خون میں ایک تازہ روانی آجائے گی۔ خدا جانے اتنے لطیفے اور ضرب المثل کہاں سے یاد کر لیے تھے، بات بات پر کہاوتیں کہتی تھی۔ اور جب کسی کو بنانے پر آجاتی تھی تو رُلا کر چھوڑتی تھی۔ خانہ داری میں تو اس کا ثانی نہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے عاشق تھے۔ ان کی محبت کی تازگی میں زمانہ کے اثرات سے کوئی فرق نہ آتا تھا۔ کچہری سے چھٹی پاتے ہی وہ شخص دیوانوں کی طرح بھاگتا تھا۔ آپ کِتنا ہی اصرار کریں، مگر اس وقت ایک منٹ کے لیے بھی راستے میں نہ رُکتا تھا۔ اور اگر کبھی منشی جی کے آ۔۔ میں دیر ہو جاتی تھی، تو وہ جاں نثار بیوی چھجّے پر کھڑی ان کا راہ دیکھتی رہتی تھی۔ بیس سال تک یہی کیفیت رہی۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ ان کی محبت روز بروز زیادہ جاذب، اور لطیف ہوتی جاتی تھی۔ دونوں

کی طبیعتیں اس قدر مل گئی تھیں کہ جو بات ایک کے دل میں آتی، وہی دوسرے کے دل میں منعکس ہو جاتی تھی۔ یہ نہیں کہ ان میں اختلاف نہ ہوتا تھا۔ بہت سے مسائل میں ان کے خیالات مختلف تھے۔ اور اپنے دعوے کی تائید اور دوسرے کے دعوے کی تردید میں ان میں خوب مباحثے ہوتے تھے۔ کوئی باہر کا آدمی سُنے تو سمجھے کہ دونوں لڑ رہے ہیں، اور اب معاملہ میدانِ عمل میں آنے والا ہے۔ مگر اُن کے مباحثے دماغ سے ہوتے تھے۔ دل دونوں کے ایک تھے۔ دونوں سیر چشم، دونوں خندہ رو، صاف گو بے لوث، غیبت یا عیب جوئی سے کوسوں بھاگنے والے۔ گویا عالم علوی کے باسی ہوں۔ چنانچہ بیوی کا انتقال ہوا، تو کئی مہینے لوگوں کو اندیشہ رہا کہ کہیں یہ حضرت خودکشی نہ کر بیٹھیں۔ ہم لوگ ہمیشہ ان کی دلجوئی کرتے رہتے۔ کہیں انھیں تنہا نہ بیٹھنے دیتے۔ رات کو بھی کوئی نہ کوئی ان کے ساتھ رہتا تھا۔ دیوانوں کا غم کھانے والے دوسرے نکل ہی آتے ہیں۔ احباب کی بیویاں تو ان پر جان دیتی تھیں۔ ان کی نظروں میں تو وہ فرشتوں سے بھی بڑھ کر تھے۔ ان کی مثال دے دے کر اپنے شوہروں سے کہتیں۔ اسے کہتے ہیں محبت۔ ایسا مرد ہو تب عورت اس کی کیوں نہ غلامی کرے، جب سے بیوی مری ہے غریب نے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ کبھی نیند بھر نہیں سویا۔ ایک تم ہو۔ دل میں کہتے ہوگے مرجائے تو دوسری شادی رچائیں۔ دل میں خوش ہوگے کہ اچھا ہوا مر گئی روگ ٹلا۔ اب نئی بیوی لائیں گے۔

اور اس وقت منشی جی کا پینتالیسواں سال تھا، قویٰ مضبوط۔ صحت اچھی، خوش رُو، خوش مزاج، باحیثیت، چاہتے تو دوسری شادی کر لیتے۔ ان کے ہاں کرنے کی دیر تھی۔ غرض مند لڑکی والوں نے سلسلہ جنبانیاں کیں۔ دو دوستوں نے بھی اجڑا گھر بسانا چاہا، مگر اس دلدادۂ وفا نے محبت کے نام کو داغ نہ لگایا۔ اسی کے ساتھ ساری تمنائیں اور ساری خواہشیں فنا ہو گئیں۔ اب ہفتوں خط نہیں بنتا۔ بال بڑھے ہوئے ہیں، کچھ پرواہ نہیں۔ کہاں تو منہ اندھیرے اُٹھتے تھے، اور چار میل کا چکّر لگا آتے تھے۔ کبھی الکسا جاتے، تو دیوی جی گھڑکیاں جماتیں اور انھیں باہر نکال کر دروازہ بند کر لیتیں۔ کہاں اب آٹھ بجے تک چارپائی پر کروٹیں بدل رہے ہیں، اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ خدمت گار نے حقّہ لا کر رکھ دیا۔ دو چار کش لگا لیے۔ نہ لائے تو غم نہیں۔ چائے آئی پی لی، نہ آئے تو پرواہ

نہیں۔ دوستوں نے بہت اصرار کیا، تو سنیما دیکھنے چلے گئے۔ لیکن کیا دیکھا کیا سُنا خبر نہیں۔ کہاں تو اچھے اچھے سوٹوں کا خبط تھا۔ کوئی خوشنما ڈیزائن کا کپڑا بازار میں آجائے۔ منشی جی ایک سوٹ بنوائیں گے۔ ان کے لیے اُن کی بیوی بنوائے گی۔ کہاں اب وہ وہی پُرانے دُھرانے، پرشکن، بدرنگ کپڑے جسم پر لٹکائے چلے جا رہے ہیں۔ جو اَب لاغری کے باعث اُتارے کے لگتے ہیں، اور جنھیں اب کسی طرح سوٹ نہیں کہا جا سکتا۔ مہینوں بازار جانے کی نوبت نہیں آتی۔ اِب کی کڑاکے کا جاڑا پڑا، تو آپ نے ایک روئی دار نیچا لبادہ کوٹ بنوالیا۔ جسے پہن کر بالکل بھگت جی بن گئے۔ صرف کنٹوپ کی کسر تھی۔ بیوی ہوتی تو یہ لبادہ چھین کر کسی فقیر کو دے دیتی۔ مگر اب کون دیکھنے والا ہے۔ کسے پرواہ ہے کہ وہ کیا پہنتے ہیں اور کیسے رہتے ہیں۔ پینتالیس کی عمر میں جو شخص پنتیس کا جچتا تھا، وہ اب پچاس کی عمر میں ستّر کا معلوم ہوتا ہے۔ کمر میں کچھ خم بھی آگیا ہے۔ بال سفید ہوگئے ہیں۔ دانت بھی غائب ہو گئے۔ جس نے تب دیکھا ہو وہ آج پہچان بھی نہ سکے۔

مزا یہ کہ اس وقت جن مسئلوں پر لڑا کرتے تھے وہی اب ان کے جزو ایمان بن گئے ہیں۔ معلوم نہیں ان کے خیالات میں انقلاب ہو گیا ہے، یا مرحومہ نے ان کی روح میں محلول ہو کر اختلافات کا خاتمہ کر دیا ہے۔ بیوی بدھوا وِواہ کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ میاں اس کے پکے مؤید تھے لیکن اب وہ ودھوا وِواہ کو معیوب سمجھتے ہیں۔ پہلے نئی تہذیب کے شیدائی تھے۔ اب اس تہذیب کا ان سے بہتر نکتہ چین مشکل سے ملے گا۔ ایک باریوں ہی انگریزوں کی پابندی۔اوقات کا ذکر آگیا۔ میں نے کہا اس معاملہ میں ہمیں انگریزوں سے سبق لینا چاہیے۔ بس آپ اُٹھ بیٹھے، اور والہانہ انداز سے بولے۔ ''ہرگز نہیں، قیامت تک نہیں، میں اس پابندی کو خود غرضی کا قطب، رعونت کا ہمالیہ اور کج خُلقی کا صحرا سمجھتا ہوں۔ ایک شخص مصیبت کا مارا آپ کے پاس آتا ہے۔ معلوم نہیں کون سی ضرورت اسے آپ کے پاس کھینچ لائی ہے، لیکن آپ فرماتے ہیں میرے پاس وقت نہیں۔ یہ طرز عمل ان ہی لوگوں کا ہے، جو وقت کو روپیہ سمجھتے ہیں اور اپنا ایک ایک منٹ کسب زر کی نذر کرنا چاہتے ہیں۔ جو شخص انسانیت کا دلدادہ ہے، وہ کبھی اس طرز عمل کو پسند نہیں کرسکتا۔ ہم اپنا دروازہ ہر وقت کھلا رکھنا چاہتے ہے۔ جسے جب ضرورت ہو ہمارے پاس آئے۔ ہم پوری توجّہ سے اس کا حال سُنیں گے، اور اس کے غم یا مسرّت

میں شریک ہوں گے۔ اچھی تہذیب ہے! یہ تہذیب ہے یا بدتہذیبی، جس تہذیب کی سپرٹ خودغرضی پر مبنی ہو وہ دنیا کے لیے لعنت ہے۔ عذاب ہے۔ اسی طرح مذہب کے معاملہ میں بھی میاں بیوی میں کافی ردوکد ہوتی رہتی تھی۔ مرحومہ ہندو دھرم کو سب سے بڑھ کر سمجھتی تھی۔ آپ اسلام کے اصولوں کے قائل تھے، مگر اب آپ بھی پکّے ہندو ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ لا مذہب ہو گئے ہیں۔ ایک دن بولے میری کسوٹی تو ہے انسانیت، جس دھرم میں انسانیت کو فضیلت دی گئی ہے، بس اسی دھرم کو میں افضل سمجھتا ہوں۔ کوئی دیوتا ہو یا مُنی یا پیغمبر۔ اگر وہ انسانیت کے خلاف اصولوں کی تلقین کرتا ہے تو میرا اسے دور سے سلام ہے۔ اسلام کا میں اِس لیے قائل تھا کہ وہ اخوت اور مساوات کا علمبردار ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ اخوت اور مساوات عالمگیر نہیں، صرف مذہب کے دائرے تک محدود ہے۔ دوسرے لفظوں میں دیگر مذاہب کی طرح یہ بھی محض غول بندی ہے۔ اس کے آئین و قوانین محض غول کے استحکام و انضباط کے لیے بنائے گئے ہیں۔ گائے یا اونٹ کی قربانی کرنا عین ثواب ہے۔ آج بھی کہیں کہیں اس فرقے کے نام لیوا موجود ہیں، تو کیا گورنمنٹ نے انسانی قربانی کو جُرم نہیں قرار دیا۔ اور ایسے مذہبی دیوانوں کو پھانسی نہیں دی۔ نفس کے لیے آپ بھیڑ کو ذبح کیجیے یا گائے کو یا اونٹ کو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن مذہب کے نام پر قربانی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر آج جانوروں کے ہاتھ میں حکومت آجائے، تو فرمائیے۔ وہ اِن قربانیوں کے جواب میں ہمیں اور آپ کو قربان کردیں یا نہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں۔ جانوروں کو کبھی وہ قدرت حاصل نہ ہوگی۔ اسی لیے ہم بے غل و غش قربانیاں کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں ہم بڑے مذہب پرور ہیں۔ خودغرضی اور ہوس پرستی کے لیے ہم چوبیسوں گھنٹوں مذہبی شریعت کی خلاف ورزی کرتے ہیں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن قربانی کا ثواب لُوٹے بغیر ہم سے نہیں رہا جاتا، تو جناب ایسے خونی آشام مذاہب کا قائل نہیں۔ یہاں تو انسانیت کے پُجاری ہیں۔ چاہے اسلام میں ہو یا ہندو دھرم میں یا عیسائیت میں۔ ورنہ میں لامذہب ہی بھلا۔ مجھے کِسی انسان سے اس لیے بغض یا نفرت نہیں ہے کہ وہ میرا ہم مشرب نہیں ہے۔ کسی کا خون تو نہیں بہاتا۔ اس لیے کہ مجھے ثواب ہوگا''۔

اسی طرح کتنے ہی انقلابات منشی جی کے خیالات میں آگئے ہیں۔ اور ان کے اس

گفتگو کا ایک ہی موضوع ہے، جس سے وہ کبھی نہیں تھکتے۔ اور وہ ہے، اس جنت نصیب کا ذکر خیر۔ کوئی مہمان آجائے۔ آپ باؤلے سے اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں، کچھ نہیں سوجھتا کیسے اس کی خاطر کریں۔ معذرت کے لیے الفاظ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ بھائی جان۔ میں ان کی کیا خاطر کروں۔ جو آپ کی سچّی خاطر کرتا وہ نہیں رہا۔ اس وقت تک آپ ناشتے کے انتظار میں نہ رہتے۔ منہ اندھیرے چائے اور ٹوسٹ حاضر ہو جاتا۔ اس وقت بادام کا حلوا، سنترے اور سیب آجاتے۔ میں تو ذرا احمق ہوں بھائی صاحب۔ مجھ میں جو کچھ اچھا تھا، وہ سب اُس کا فیض تھا۔ اُسی کی ذہانت سے میں ذہین تھا۔ اسی کی فیاضی سے فیاض۔ اسی کی شرافت سے شریف۔ اب تو لاشۂ بے جان ہوں بھائی صاحب، بالکل مُردہ ہوں۔ میں اس دیوی کے لائق نہ تھا۔ نہ جانے کن اعمالِ خیر کے صلے میں وہ مجھے ملی تھی۔ آیئے آپ کو اس کی تصویر دکھاؤں معلوم ہوتا ہے، ابھی ابھی اُٹھ کر چلی گئی ہے۔ بھائی صاحب آپ سے حلفاً کہتا ہوں میں نے ایسی ماہ رو نہیں دیکھی۔ اس کے چہرے پر حسن کا رعب ہی نہ تھا۔ حُسن کی لطافت بھی تھی اور دلکشی بھی!

آپ مشتاق نظروں سے وہ تصویر دیکھتے ہیں۔ آپ کو اُس میں حُسن کی کوئی خاص دلکشی نہیں نظر آتی۔ فربہ جسم ہے، چوڑا سا مُنہ۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ انداز میں دہقانیت نمایاں ہے، مگر اس تصویر کے محاسن آپ کے سامنے کچھ اس شدو مد اور انہماک کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں کہ آپ کو سچ مچ اس تصویر میں حُسن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس وقتِ خیر میں جتنا وقت گزرتا ہے، وہی منشی جی کی زندگی کے بہترین لمحے ہیں۔ اتنی ہی دیر وہ زندہ رہتے ہیں، باقی اوقات میں زندہ درگور۔

پہلے کچھ دنوں تک تو وہ ہمارے ساتھ صبح کو ہوا خوری کے لیے جاتے رہے، وہ کیا جاتے رہے، میں زبردستی انھیں لے جاتا تھا۔ لیکن روز آدھ گھنٹے تک ان کا انتظار کرنا پڑا۔ کسی طرح گھر سے نکلتے بھی تو چیونٹی سی چال سے چلتے، اور آدھ میل میں ہی ہمّت ہار جاتے۔ لوٹ چلنے کا تقاضا کرنے لگتے۔ آخر میں نے انھیں ساتھ لے جانا چھوڑ دیا، تب سے بس ان کی چہل قدمی چالیس قدم کی رہ گئی ہے۔ سیر کیا ہے بیگار ہے۔ اور وہ بھی اس لیے کہ مرحومہ کے سامنے اُن کا یہ معمول تھا۔

ایک دن حسب معمول ان کے دروازے سے نکلا، تو دیکھا کہ اوپر کی کھڑکیاں جو

برسوں سے بندھی پڑی تھیں، کھلی ہوئی ہیں۔ تعجب ہوا۔ دروازے پر خدمتگار بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ اس سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ حضرت گھومنے گئے ہوئے ہیں۔ مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ آج نئی بات کیوں؟ اتنے سویرے تو یہ کبھی نہیں اُٹھتے۔ جس طرف وہ گئے تھے، ادھر میں نے بھی قدم بڑھائے۔ اور ایک ہفتہ سے مجھے اِدھر آنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ ایک قرابت داری میں گیا تھا۔ اس دوران میں کیا انقلاب ہوگیا۔ ضرور کوئی نہ کوئی راز ہے۔ دریافت حال کے لیے دل بے قرار ہوگیا۔ کوئی دو میل جاکر آپ ملے۔ جبکہ میں مایوس ہو کر لوٹنے والا تھا۔ تعجب ہو رہا تھا کہ راستے میں کہاں رہ گئے۔ راستے میں کسی سے ملاقات ہی نہیں ہے، جہاں ٹھہر گئے ہوں۔ کچھ تشویش ہو رہی تھی۔ حضرت کہیں کسی کنوئیں میں تو نہیں کود پڑے۔ دور سے انھیں آتا دیکھ کر دل کو اطمینان ہوا۔ آج تو کینڈا ہی اور تھا۔ بال نئے فیشن سے تراشے ہوئے، مونچھیں صاف، ڈاڑھی چکنی۔ چہرے پر بشاشت، رفتار میں پُھرتی۔ سوٹ پُرانا مگر بُرش کیا ہوا اور شاید استری بھی کی ہو، بوٹ پر پالش، مسکراتے چلے آتے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور بولے۔ ''آج کئی دن کے بعد نظر آئے۔ کہیں گئے تھے کیا؟''

میں نے اپنی غیرحاضری کا سبب بتا کر کہا۔ ''میں ڈرتا ہوں آج تمھیں کہیں نظر نہ لگ جائے۔ چشم بدُدور۔ اب میں روزانہ تمھارے ساتھ گھومنے آیا کروں گا۔ آج بہت دنوں بعد تم نے آدمی کا چولا بدلا ہے''۔

جھینپ کر بولے۔ ''نہیں بھئی۔ مجھے اکیلا ہی رہنے دو۔ تم لگو گے دوڑانے۔ اور اوپر سے گھڑکیاں جماؤ گے۔ میں اپنے ہَولے ہَولے چلا جاتا ہوں۔ جب تھک جاتا ہوں، کہیں بیٹھ جاتا ہوں''۔

''تمھاری یہ وضع تو ایک ہفتہ پہلے تک تھی۔ آج تو تم بالکل اپٹوڈیٹ ہو۔ اس رفتار سے تو شاید میں تم سے پیچھے ہی رہوں گا''۔

''تم تو بنانے لگے''۔

''میں کل سے آؤں گا اور تمھارے ساتھ سیر کو چلوں گا۔ میرا انتظار کرنا''۔

''نہیں بھئی۔ مجھے دق مت کرو۔ میں آج کل بہت سویرے اُٹھ جاتا ہوں۔ رات کو نیند نہیں آتی۔ سوچتا ہوں لاؤ ٹہل ہی آؤں۔ تم میرے ساتھ کیوں پریشان ہوگے''۔

میری حیرت بڑھتی جارہی تھی۔ یہ حضرت ہمیشہ میرے پیروں پڑتے تھے کہ مجھے بھی ساتھ لے لیا کرو۔ جب میں نے ان کی سُست روی سے مجبور ہو کر تنہا ٹہلنا شروع کیا، تو ان کی بہت دل شکنی ہوئی۔ دو ایک بار مجھ سے شکایت بھی کی۔ ''ہاں بھئی اَب کیوں ساتھ دو گے۔ بدنصیبوں کا ساتھ کِس نے دیا ہے۔ یا تم کوئی نئی تہذیب نکالوگے زمانہ کا دستور ہے جو لنگڑا ہوتا ہے، اسے دھکیل دو۔ جو بیمار ہو، اُسے زہر دے دو۔ یہی نئے زمانہ کی روش ہے''۔ لیکن میں نے ان کے طعن و طنز کی پرواہ نہ کی تھی۔ اور آج وہی شخص مجھ سے پیچھا چھڑا رہا ہے۔ یہ کیا راز ہے۔ یہ چُستی، تیزی اور بشاشت کہاں سے آگئی۔ کہیں حضرت نے بندر کی گِلٹی تو نہیں لگوالی۔ ضرور یہی بات ہے؟ یہ نیا سول سرجن غدود کے فن میں ماہر ہے۔ ممکن ہے انھیں کسی نے سو جھایا ہو، اور حضرت نے ہزار پانچ سو روپیہ خرچ کرکے گِلٹی بدلوالی ہو۔ اس معمّہ کو حل کیے بغیر مجھے چین کہاں؟ ان کے ساتھ ہی لوٹ پڑا۔

دو چار قدم چلنے کے بعد پوچھا۔ ''سچ کہنا برادر گلٹی ولٹی تو نہیں لگوالی''۔

انھوں نے استفسار کی نظروں سے دیکھا۔ ''کیسی گلٹی میں نہیں سمجھا''۔

''مجھے شک ہو رہا ہے کہ تم نے بندر کے غدود لگوائے ہیں، ورنہ تم میں یہ جانداری کہاں سے آگئی''۔

''ارے یار کیوں کوستے ہو؟ بندر کے غدود کس لیے لگواتا۔ میرے تو ذہن میں یہ بات کبھی آئی نہیں''۔

''تو کیا کوئی برقی آلہ منگوا لیا ہے؟''

''تم آج میرے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے۔ بیوہ عورت بھی تو کبھی سنگار کر لیتی ہے۔ انسان کی طبیعت ہی تو ہے۔ ایک دن مجھے اپنی پست ہمّتی اور کاہلی پر افسوس ہوا۔ جب دنیا میں رہنا ہے، تو زندوں کی طرح کیوں نہ رہوں۔ مُردوں کی طرح جینے سے کیا فائدہ؟ بس اور کوئی بات نہیں''۔

مجھے تاویل سے تشفی نہ ہوئی۔ دوسرے دن ذرا سویرے آیا، اور منشی جی کے دروازے پر آواز دی۔ معلوم ہوا چلے گئے۔ میں ان کے پیچھے بھاگا۔ ضد پڑگئی، اسے اکیلا نہ جانے دوں گا۔ دیکھوں کب تک مجھ سے بھاگتا ہے۔ آدھی رات کو آکر بستر سے نہ

اُٹھاؤں تو سہی۔ دوڑ نہ سکا۔ لیکن جس قدر تیز چل سکتا تھا چلا۔ بارے ایک میل کے بعد آپ نظر آئے۔ بھاگے چلے جا رہے تھے۔ اب میں بار بار پکار رہا ہوں کہ حضرت ذرا ٹھہریئے۔ خدا کے لیے ٹھہر جائے۔ میری سانس پھول رہی ہے۔ مگر آپ ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ آخر جب میں نے اپنے سر کی قسم دلائی۔ تب جاکر آپ رُکے۔ میں لپک کر آپ کے پاس پہنچا، تو چیں بہ جبیں ہوکر فرماتے ہیں۔ ''میں نے تو تم سے کہہ دیا تھا کہ میرے گھر مت آنا۔ پھر کیوں میرے پیچھے پڑگئے۔ مجھے دھیرے دھیرے گھومنے دو۔ اب تم اپنا راستہ لو''۔

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا، اور بولا۔ ''دیکھو ہوری لال۔ مجھ سے اڑو نہیں۔ ورنہ مجھے جانتے ہو۔ کتنا بے مروت آدمی ہوں۔ تم یہ دھیرے دھیرے ٹہل رہے ہو یا ڈبل مارچ کر رہے ہو۔ میرے درد ہونے لگا اور پسلیاں دُکھ رہی ہیں۔ سانس پھول گئی اور آپ فرماتے ہیں کہ مجھے دھیرے دھیرے گھومنے دو۔ ڈاک کا ہرکارہ بھی تو اس رفتار سے نہیں دوڑتا۔ اس پر غضب یہ کہ تم تھکتے نہیں ہو۔ اب بھی اسی دم خم سے چلے جا رہے ہو۔ اب تو تم ڈنڈے سے بھگاؤ تو بھی تمھارا دامن نہ چھوڑوں گا۔ تمھارے ساتھ دو میل چلوں گا، تو بھی خاصی ورزش ہو جائے گی۔ مگر اب صاف بتلاؤ راز کیا ہے۔ تم میں یہ جوانی کہاں سے آگئی؟ اگر کسی اکسیر کا استعمال کر رہے ہو، تو مجھے بھی دو۔ کم سے کم پتہ بتا دو۔ میں منگوالوں گا۔ اگر کسی دعا تعویذ کی کرامات ہے، تو مجھے بھی اس کے پاس لے چلو''۔

مسکرا کر بولے ''تم تو پاگل ہو۔ خواہ مخواہ مجھے دق کر رہے ہو۔ بوڑھے ہو گئے۔ مگر لڑکپن نہ گیا۔ کیا تم چاہتے ہو، میں ہمیشہ اسی طرح زندہ درگور پڑا رہوں۔ اتنا بھی تم سے نہیں دیکھا جاتا۔ تب تو تمھارے مزاج ہی نہ ملتے تھے۔ کتنی منّت کی کہ بھائی جان مجھ خستہ جان کو بھی ساتھ لے لیا کرو۔ تمھارے طفیل کچھ ہوا خوری ہو جائے گی۔ مگر آپ نخرے دکھانے لگے۔ اب کیوں میرے پیچھے پڑے ہو۔ بھائی جان جو اپنی مدد آپ کرتا ہے اس کی مدد پرماتما بھی کرتے ہیں۔ احباب واعزّا کی مروّت بھی خوب دیکھ لی۔ اب اپنے جوتے پر، چلوں گا''۔

وہ اسی طرح مجھے صلواتیں سُناتے جارہے تھے، اور میں انھیں چھیڑ چھیڑ کر اور بھی

اشتعال دلا رہا تھا کہ دفعتاً انھوں نے انگلی لب پر رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، اور ذرا قد اور سیدھا کر کے اور چہرہ پر بشاشت اور خود داری کا رنگ بھر کر متانہ چال چلنے لگے۔ میری سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ یہ رازداری اور بہروپ کس لیے۔ وہاں تو کوئی دوسرا تھا بھی نہیں۔ مگر ہاں سامنے سے ایک عورت ضرور چلی آرہی تھی۔ مگر اس کے سامنے اس پردہ دری کی ضرورت۔ میں نے تو اُسے کبھی دیکھا نہ تھا۔ آسمانی رنگ کی ساڑی جس پر زرد لیس ٹکا ہوا تھا اس پر خوب کِھل رہی تھی۔ حسین ہرگز نہ تھی، مگر حُسن سے زیادہ دلکش اس کی شگفتگی تھی، اور بھولاپن۔ انداز میں خودداری اور متانت لباس میں حُسنِ مذاق۔ بشرہ سے شرافت اور وجاہت عیاں۔ ایک بہت ہی معمولی شکل و صورت کی عورت اتنی جاذب نظر ہوسکتی ہے، یہ میں نہ سمجھتا تھا۔

اس لیے ہوری لال کے برابر آکر دونوں ہاتھوں سے نمسکار کیا۔ ہوری لال نے کسی قدر بے اعتنائی سے سر کو جنبش دی، اور آگے بڑھنا چاہتے تھے کہ اس نے کومل کی سی آواز میں کہا۔ ''لوٹئے گا نہیں؟ آپ اپنی حد سے آگے بڑھے جارہے ہیں۔ اور ہاں آج تو آپ نے مجھے دیوی جی کی تصویر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ شاید آپ بھول گئے۔ کہئے تو آپ کے ساتھ چلوں''۔

منشی جی پر ایسی عصبیت طاری تھی کہ معمولی اخلاق کا اظہار بھی نہ کر سکے۔ یوں وہ بہت ہی مہذّب آدمی ہیں، اور آداب مجلس کے بڑے ماہر۔ لیکن اس وقت جیسے ان کے اوسان خطا ہوگئے تھے۔ ایک قدم اور آگے بڑھ کر بولے۔ ''معاف کیجیے گا۔ ذرا مجھے ایک ضرورت ہے''۔

عورت نے کسی قدر شکستہ خاطر ہو کر کہا۔ ''تو مجھے وہ تصویر کب دیجیے گا۔ آپ تو آج جیسے بھاگے جارہے ہیں''۔

منشی جی نے میری طرف قہر کی نظروں سے دیکھا اور بولے ''تلاش کروں گا''۔

عورت نے چشم فریاد سے دیکھ کر کہا۔ ''آپ نے تو فرمایا تھا کہ وہ ہمیشہ آپ کی میز پر رہتی ہے۔ اِس وقت آپ کہتے ہیں، تلاش کروں گا۔ آپ کی طبیعت تو اچھی ہے؟ جب سے آپ نے ان کے اوصاف بیان کیے ہیں، میں ان کے درشنوں کے لیے بے قرار ہوں، اور اگر آپ یوں نہ دیں گے تو میں اسے آپ کی میز پر سے اٹھا لاؤں گی۔

(میری طرف دیکھ کر) آپ میری مدد کیجیے گا جناب، حالانکہ میں جانتی ہوں کہ آپ منشی جی کے دوست ہیں۔ اور ان کے ساتھ دغا نہ کریں گے۔ آپ کو تعجب ہو رہا ہوگا کہ یہ کون عورت منشی جی سے اتنی بے تکلفی سے باتیں کر رہی ہے۔ ان سے میری ملاقات بازار میں ہوئی۔ میں سبزی منڈی گئی ہوئی تھی۔ میں اپنی سبزی خود لاتی ہوں۔ نوکروں پر اتنا اہم کام چھوڑنا نہیں چاہتی، جس پر زندگی کا قیام ہے۔ سبزی لے کر دام دینے کے لیے روپیہ نکالا تو کنجڑے نے اسے ٹھنکا کر کہا۔ دوسرا روپیہ دو۔ یہ خراب ہے۔ اب جو میں نے خود ٹھنکایا تو معلوم ہوا واقعی روپیہ کی آواز میں کچھ ثقالت ہے۔ اب کیا کروں، میرے پاس دوسرا روپیہ نہ تھا۔ حالانکہ اس طرح کے تلخ تجربے مجھے بار ہا ہو چکے ہیں۔ مگر گھر سے روپیہ لے کر چلتے وقت مجھے اسے پرکھ لینے کی یاد نہیں رہتی۔ نہ کسی سے روپیہ لیتے وقت ہی پرکھتی ہوں۔ اس وقت میرے صندوق میں زیادہ نہیں تو بیس پچیس کھوٹے روپے پڑے ہوں گے، اور ریزگاریاں تو سینکڑوں ہوں گی۔ میرے لیے اس کے سوا دوسرا چارہ نہ تھا کہ سبزی واپس کرکے گھر لوٹ آؤں۔ اتفاق سے منشی جی بھی اسی دکان پر سبزی خریدنے آئے تھے؛ اس طرح آپ سے میرا تعارف ہوا......''

منشی جی نے بات کاٹ کر کہا۔ ''تو اس وقت آپ وہ سارا قصّہ کیوں بیان کر رہی ہیں۔ ہم دونوں ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ خواہ مخواہ دیر ہو رہی ہے''۔

انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

مجھے ان کی کج خلقی حد درجہ ناگوار گزری۔ کچھ اس کا راز بھی سمجھ میں آگیا۔ مجھ سے پردہ کیا جارہا ہے بولا۔ ''تو آپ جایئے مجھے کوئی ایسا ضروری کام نہیں ہے۔ میں بھی اب لوٹنا چاہتا ہو''۔

منشی جی نے دانت پیس لیے۔ اگر وہ عورت اس وقت وہاں نہ ہوتی تو معلوم نہیں میری کیا درگت کرتے۔ ایک سیکنڈ تک میری طرف غضبناک نظروں سے دیکھتے رہے، گویا کہہ رہے ہوں۔ اچھا بچہ۔ اس کا انتقام نہ لیا تو کہنا اور چل دیے، میں عورت کے ساتھ گھر کی طرف چلا۔

یکا یک اس نے ہچکچاتے ہوے کہا۔ ''مگر نہیں آپ جایئے۔ میں ان کے ساتھ گھوموں گی۔ شاید وہ مجھ سے ناراض ہوگئے ہیں۔ آج ایک ہفتہ سے میرا اور ان کا روز

ساتھ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا قصۂ غم سُنایا کرتے ہیں۔ کیسی خوش نصیب تھی، وہ عورت جس کا شوہر آج بھی اس کے نام کی پرستش کرتا ہے۔ آپ نے تو انھیں دیکھا ہوگا۔ کیا وہ سچ مچ بڑی جاں نثار عورت تھی؟''

میں نے پُر جوش لہجہ میں کہا۔ ''دونوں میں بہت محبت تھی''۔

''اور جب سے ان کا انتقال ہو گیا، یہ تارک الدنیا ہو گئے''۔

''اس سے بھی زیادہ۔ زندگی میں بجز اس کی یاد کے انھیں اور کوئی دلچسپی نہیں رہی''۔

''بہت حسین تھی؟''

''ان کی نظروں میں تو اس سے زیادہ حسین عورت دنیا میں نہ تھی''۔

اس نے ایک منٹ تک خیال میں محو رہنے کے بعد کہا۔ ''اچھا آپ جائیں۔ میں ان کے ساتھ جاکر کچھ دیر واک کروں گی۔ ایسے وفا پرور انسان کی مجھ سے جو خدمت ہوسکتی ہے، اس میں کیوں دریغ کروں۔ مجھے تو ان کی سرگزشت نے پاگل بنا دیا ہے''۔

میں اپنا سامنہ لے کر گھر چلا آیا۔ اتفاق سے اسی دن مجھے ایک ضروری کام سے دہلی جانا پڑا۔ وہاں سے ایک ماہ میں لوٹا۔ اور سب سے پہلا کام جو میں نے کیا وہ منشی ہوری لال کی پرسش حال تھی کہ معاملات نے اس دوران میں کیا رنگت اختیار کی۔ یہ جاننے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ دہلی سے انھیں خط لکھا تھا، مگر اس شخص کی یہ خبیث عادت ہے کہ خطوں کا جواب نہیں دیتا۔ اس عورت سے ان کے تعلقات نے کیا صورت اختیار کی۔ آمدورفت جاری ہے، یا قطع ہوگئی۔ اس نے ہوری لال کی وفاپروری کا صلہ کس صورت میں ادا کیا یا کرنے والی ہے۔ اسی طرح کے کتنے ہی سوالات دل میں ہیجان پیدا کر رہے تھے۔ میں منشی جی کے مکان پر پہنچا، تو آٹھ بجے ہوں گے۔ کھڑکیوں کے دروازے بند تھے۔ سامنے برآمدے میں خس و خشاک کے انبار تھے۔ بعینہ وہی حالت تھی، جو اس چند روزہ انہماک سے پہلے نظر آتی تھی۔ انتشار اور بڑھا۔ اوپر گیا تو دیکھا کہ آپ اسی فرش پر پڑے ہوئے، جو بے ترتیبی اور بدسلیقگی کا نمونہ ہے۔ ایک اخبار پڑھ رہے ہیں۔ شاید ایک ہفتہ سے خط نہیں بنا تھا۔ چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ سیر کر کے لوٹ آئے کیا؟''

نیم شرمندگی سے جواب دیا۔ ''اجی سیر سپاٹے کی کہاں فرصت ہے بھئی۔ اور فرصت

بھی ہو تو وہ دل کہاں ہے۔ تم تو کہیں باہر گئے تھے''۔

''ہاں ذرا دہلی تک گیا تھا۔ کیا اب اس دیوی سے آپ کی ملاقات نہیں ہوتی''؟

''ادھر تو عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی''۔

''کہاں چلی گئی''؟

''مجھے کیا خبر''؟

''مگر آپ تو اس پر بری طرح ریجھے ہوے تھے''۔

''میں اس پر ریجھا تھا۔ آپ کو جنون تو نہیں ہو گیا ہے۔ جس پر ریجھا تھا۔ جب اسی نے رفاقت کا حق ادا نہ کیا تو اب دوسروں پر کیا ریجھوں گا''۔

''دیکھو ہوری لال مجھے چکمہ نہ دو۔ پہلے میں تمھیں ضرور زاہد سمجھتا تھا، لیکن تمھاری رنگین مزاجیاں دیکھ کر جس کا دورہ تمھارے اوپر ایک ماہ قبل ہوا تھا، میں یہ نہیں مان سکتا کہ تم نے اپنی آرزوؤں کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ہے۔ تمھیں اس دوران کی ساری روداد مجھ سے بے کم و کاست بیان کرنی ہوں گی۔ ورنہ سمجھ لو میری اور تمھاری دوستی کا خاتمہ ہے''۔

ہوری لال کی آنکھیں آبگوں ہوگئیں۔ چند سیکنڈ بعد بولے۔ ''میرے ساتھ اتنی بے انصافی نہ کرو بھائی۔ اگر تم ہی میرے اوپر شبہہ کرنے لگوگے تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔

اس کا نام مس اندرا ہے۔ یہاں جو لڑکیوں کا ہائی اسکول ہے، اسی کی ہیڈ مسٹرس ہو کر آئی ہے۔ میری ان سے کیوں کر ملاقات ہوئی، یہ تمھیں معلوم ہی ہے۔ اس کی ہمدردی نے مجھے اس کا مداح بنا دیا۔ اس عمر میں اور اس غم کا بوجھ سر پر رکھے ہوئے مجھے ان کی جانب جس چیز نے کھینچا وہ ان کی ہمدردی تھی۔ میں صرف اپنا قصہ غم سنانے کے لیے روزان کے پاس جایا کرتا تھا، وہ حسین ہے، خوش مزاج ہے، درد مند ہے۔ سلیقہ شعار ہے، لیکن تمھاری فرشتہ خصلت بھابی کی کچھ اور ہی بات تھی۔ اس نے مجھ پر جو رنگ جما دیا، اس پر اب دوسرا رنگ کیا جمے گا۔ میں اسی کی حرارت سے زندہ تھا، اور اس حرارت کے ساتھ زندگی بھی ختم ہوگئی۔ اب تو میں اس روضے کا مجاور ہوں جو میرے دل میں ہے۔ کسی ہمدرد کی صورت دیکھتا ہوں تو دل کو خوشی ہوتی ہے، اور اپنا قصہ غم سنانے لگتا ہوں۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ یہ میری کمزوری ہے، اور تم اور دیگر احباب اسی وجہ سے

مجھ سے پرہیز کرتے ہیں۔ لیکن کیا کروں بھیا۔ بغیر اپنا قصہ غم کسی کو سنائے مجھ سے نہیں رہا جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دم گھٹ جائے گا۔

''اس لیے جب مس اندارا میری جانب ملتفت ہوئیں، تو میں نے اسے امداد غیب سمجھا، اور اس دھن میں جسے میرے بہت سے احباب میری بدقسمتی سے جنون سمجھتے ہیں، وہ سب کچھ کہہ گیا جو میرے دل میں تھا اور ہے۔ میں تو اب بھی اسی دنیا اور زمانہ میں بستا ہوں۔ مس اندرا کو غالباً مجھ پر رحم آگیا۔ ایک دن انھوں نے میری دعوت کی۔ اور کتنی ہی لزیز چیزیں اپنے ہاتھوں سے بنا کر کھلائیں۔ دوسرے دن خود آئیں اور یہاں کی ساری چیزیں اپنے ہاتھوں سے بنا کر کھلائیں اور یہاں کی ساری چیزیں ترتیب سے سجا گئیں۔ تیسرے دن کچھ کپڑے لائیں۔ اور میرے لیے خود ایک سوٹ تیار کیا۔ ان کی ہمدردیاں اسی طرح روز بر روز وسیع ہوتی گئیں۔ آخر ایک دن شام کو کوئنس پارک میں انھوں نے مجھ سے کہا۔ ''آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے''؟

میں نے ہنس کر کہا۔ ''اس عمر میں اب کیا شادی کروں گا۔ دنیا کیا کہے گی''؟

مس اندرا بولی۔ ''آپ کی عمر ابھی ایسی کیا زیادہ ہے۔ آپ چالیس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتے''۔

میں نے تصحیح کی۔ ''میرا پچپاسواں سال ہے''۔

''عمر کا حساب سالوں سے نہیں ہوتا صحت سے ہوتا ہے۔ آپ کی صحت کچھ توجہ کی محتاج ہے۔ کوئی آپ کو پان کی طرح پھیرنے والا چاہیے۔ آپ کی یہ افسر وہ دلی دور ہو سکتی ہے''۔

میرا دل دھڑکنے لگا۔ گویا اختلاج ہوگیا ہو۔ میں نے دیکھا مس اندارا کے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی ہے۔ ان کی آنکھیں شرم سے جھک گئی ہیں۔ اور کوئی بات باربار ان کے لبوں تک آکر لوٹ جاتی ہے۔

آخر انھوں نے میری طرف نظریں اٹھا کر کہا۔ ''اگر آپ سمجھتے ہوں کہ میں آپ کی کچھ خدمت کرسکتی ہوں، تو میں ہر طرح حاضر ہوں''۔

میں نے معذرت آمیز لہجہ میں جواب دیا کہ میں تمھاری اس ہمدردی کا کہاں تک شکریہ ادا کروں میں اندرا! مگر مجھے افسوس ہے کہ میں زندہ نہیں مردہ یاد گاروں کا

مجسمہ ہوں‘‘۔

اس کے بعد میں نے ان کی محبت، رحم دلی اور فیاضی کی خوب دل کھول کر داد دی۔ مگر وہ میری گفتگو سے کچھ ایسی متاثر ہوئیں کہ اسی وقت یہاں سے چلی گئیں، اور پھر تب سے نظر نہ آئیں۔ نہ مجھے ہی ہمت پڑی کہ ان کی تلاش کرتا۔ حالانکہ چلتے وقت انھوں نے کہا تھا۔ جب کبھی آپ کو کوئی تکلیف ہو اور آپ میری ضرورت محسوس کریں، تو مجھے بلا لیجیے گا۔

ہوری لال نے اپنی سرگزشت ختم کرکے مجھے داد خواہانہ انداز سے دیکھا۔ میں نے اس کا جواب ملامت سے دیا۔ ’’کتنے بدنصیب ہو تم ہوری لال۔ مجھے تمھارے اوپر رحم بھی آتا ہے، اور غصہ بھی۔ کمبخت تیری زندگی سنور جاتی۔ تو نے زریں موقعہ ہاتھ سے کھو دیا۔ یہ عورت نہیں۔ ایشور کی بھیجی ہوئی کوئی دیوی تھی۔ جو تیری اندھیری زندگی کو دوبارہ روشن کرنے کے لیے آئی تھی۔ جی چاہتا ہے، تمھیں اوپر سے دھکیل دوں نامعقول‘‘۔

ہوری لال نے اپنی بیوی کی تصویر کی طرف دیکھا، اور کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔

’’میں تو اسی کا ہوں بھائی جان اور اسی کا رہوں گا‘‘۔

(یہ قصہ پہلی بار دلی کے اردو ماہنامہ عصمت، کے 1932 کے سالگرہ نمبر میں شائع ہوا۔ ’دودھ کی قیمت‘ مجموعے میں شامل ہے۔ ہندی میں یہ بنارس کے ہندی ماہنامہ ہنس میں اپریل 1935 کے شمارے میں شائع ہوا عنوان تھا سمرتی کا پجاری۔ یہ مان سرور نمبر 4 میں شامل ہے۔)

سال بھر کی بات ہے۔ ایک دن شام کو ہوا خوری کے لیے جا رہا تھا کہ مسٹر شاطر سے ملاقات ہوگئی۔ میرے پرانے دوست ہیں۔ نہایت بے تکلف اور زندہ دل، آگرہ میں قیام رکھتے ہیں۔ خوش گو شاعر ہیں۔ ان کی بزمِ سخن میں کئی بار شریک ہو چکا ہوں۔ ایسا فنافی الشعر آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ پیشہ تو وکالت ہے مگر غرق رہتے ہیں فکر سخن میں چونکہ ذہین آدمی ہیں۔ معاملہ کی تہ تک آسانی سے پہنچ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی مقدمات مل جاتے ہیں، لیکن کچہری کے باہر عدالت یا مقدمہ کا ذکر ان کے لیے ممنوع ہے۔ عدالت کی چار دیواری کے اندر پانچ گھنٹے وہ وکیل ہوتے ہیں۔ چار دیواری کے باہر نکلتے ہی شاعر ہیں۔ جب دیکھیے، شعر وسخن کے چرچے ہو رہے ہیں۔ اشعار سن رہے ہیں۔ داد دے رہے ہیں۔ جھوم رہے ہیں۔ اور اپنا کلام سناتے وقت تو ان پر بلا مبالغہ وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لہجہ بھی اتنا دل پذیر ہے کہ بے اختیار اشعار جگر میں چبھ جاتے ہیں۔ روحانیات میں شعریت پیدا کرنا، تصوف میں گل و چمن کی بہار دکھانا ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ وہ جب لکھنؤ آتے مجھے پہلے اطلاع دے دیا کرتے تھے۔ آج انھیں لکھنؤ میں غیر متوقع دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ میں نے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے۔ آپ یکایک یہاں کیسے نمودار ہوئے۔ مجھے اطلاع تک نہ دی۔''

بولے ''بھائی جان بڑی پریشانی میں مبتلا ہوں۔ آپ کو اطلاع دینے کا موقعہ نہ تھا۔ پھر آپ کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہوں۔ اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے کہ آپ میرے لیے کوئی خاص اہتمام کریں۔ میں ایک اشد ضروری معاملہ میں آپ کو تکلیف دینے آیا ہوں۔ اس وقت ہوا خوری ملتوی کیجیے اور چل کر میرا قصہ غم سنیے''۔

''آپ نے تو مجھے وحشت میں ڈال دیا۔ آپ، اور قصۂ غم مجھے تو وحشت ہوتی ہے''۔

''چلیے اطمنان سے بیٹھوں تو سناؤں''۔

ہم دونوں گھر کی طرف چلے۔

منہ ہاتھ دھو کر، شربت پانی اور پان الائچی کے بعد مسٹر شاطر نے اپنی داستان سُنانی شروع کی۔

''کسم کی شادی میں تو آپ تشریف لے گئے تھے۔ اس سے قبل بھی آپ نے اُسے دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ایک سلیم الطبع نوجوان کی کشش کے لیے جن لوازمات کی ضرورت ہے وہ سب اس میں کافی سے زیادہ موجود ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

میں نے گرم جوشی کے ساتھ کہا۔ ''میں آپ سے کہیں زیادہ کُسم کا مداح ہوں ایسی سلیقہ شعار، باحیا، متین، خوش مزاج اور حسین لڑکی میں نے نہیں دیکھی''۔

شاطر صاحب نے مایوسانہ تبسّم کے ساتھ فرمایا۔ ''وہی کسم اپنے شوہر کی بے اعتنائی کے باعث رو رو کر مری جاتی ہے۔ اس کی رُخصتی ہوے ایک سال ہو رہا ہے۔ اس دوران میں دو تین بار سسرال گئی لیکن اس کا شوہر اس سے مخاطب ہی نہیں ہوتا۔ اس کی صورت سے بیزار ہے۔ میں نے ہر چند چاہا اُسے بلا کر دریافت حال کروں۔ مگر میرے خطوط کا نہ جواب دیتا ہے نہ آتا ہے۔ نہ جانے ایسی کیا بات ہوگئی کہ اس نے یہ روش اختیار کی۔ اب سنتا ہوں اس کی دوسری شادی ہونے والی ہے۔ کسم کا بُرا حال ہو رہا ہے۔ آپ شاید اسے دیکھ کر پہچان بھی نہ سکیں۔ شب و روز رونے کے سوا اُسے کوئی کام نہیں ہے۔ اس سے آپ ہماری پریشانی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ زندگی کی پیاری آرزوئیں پا مال ہوئی جاتی ہیں۔ ہمیں پرماتما نے کوئی لڑکا نہ دیا۔ مگر ہم اپنی کسم کو پا کر اس کا شکر کرتے تھے۔ اسے کتنی نازونعم سے پالا۔ کبھی اس کو پھول کی چھڑی سے بھی نہ چھوا۔ اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ اس نے بی. اے. پاس نہیں کیا، لیکن خیال کی وسعت اور معلومات میں وہ کسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ عورت سے کم نہیں۔ آپ نے اس کے مضامین دیکھے ہیں۔ اس نے مباحثہ کیے ہیں۔ خانہ داری میں وہ اتنی ہوشیار ہے کہ میرے گھر کا قریب قریب سارا انتظام اس کے ہاتھ میں تھا، لیکن اپنے شوہر کی نگاہ میں وہ دنیا کی بد ترین عورت ہے۔ بار بار پوچھتا ہوں تو نے اسے کچھ کہہ دیا ہے، یا کیا بات ہے؟ آخر وہ تجھ سے کیوں برگشتہ خاطر ہے۔ کسم اس کے جواب میں رو کر یہی کہتی ہے

کہ مجھ سے تو انھوں نے کبھی کوئی بات چیت ہی نہیں کی۔ وہ پہلے دن ذرا دیر کے لیے کسم کے پاس آیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے کسم سے کوئی سوال کیا ہوگا اس نے شرم کے باعث کوئی جواب نہ دیا ہوگا۔ میں یہ بھی ماننے کو تیار ہوں کہ اس نے دو چار بار وہی سوال کیا ہوگا۔ کسم نے سر نہ اُٹھایا ہوگا۔ آپ جانتے ہی ہیں، وہ کتنی شرمیلی ہے۔ بس حضرت روٹھ گئے ہوں گے۔ میں تو گمان ہی نہیں کر سکتا کہ کسم جیسی لڑکی سے کوئی مرد بے اثر رہ سکتا ہے، لیکن طبیعت کی اُفتاد کا کوئی کیا کرے؟ غریب نے اپنے شوہر کے نام متعدد خطوط درد اور سوز میں ڈوبے ہوئے لکھے مگر اس ظالم نے اس کے خطوط کا جواب نہ دیا۔ سب ہی واپس کردیے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سنگ دل کو کیسے نرم کروں۔ میری غیرت تو تقاضا نہیں کرتی کہ خود اس کے پاس کچھ لکھوں۔ اب آپ سے یہی التجا ہے کہ اس معاملہ میں میری امداد کیجیے۔ ورنہ غریب کسم مرجائے گی۔ اور اس کے بعد ہم دونوں بھی اس دنیا سے رخصت ہوجائیں گے۔ اس کی کوفت اب نہیں دیکھی جاتی''۔

شاطر کی آنکھیں پرآب ہوگئیں میں بھی بہت متاثر ہوا۔ سرگرمی سے بولا۔ ''میں آج ہی مرادآباد جاؤں گا۔ اور اس خر دماغ لونڈے کی بری طرح خبرلوں گا کہ وہ بھی یاد کرے گا بچہ کو زبردستی گھسیٹ کر لاؤں گا اور کسم کے پیروں پر گرادوں گا''۔

شاطر صاحب میری اس خود اعتمادی پر مسکرا کر بولے ''کیا کہیں گے اُس سے''؟

''یہ نہ پوچھیے۔ تالیف قلب کے جتنے نسخے ہیں اُن سبھی کی آزمائش کروں گا''۔

''تو آپ کو مطلق کامیابی نہ ہوگی۔ وہ اتنا خلیق، اتنا خندہ رو، اتنا منکسرالمزاج اتنا شیریں زبان ہے کہ آپ وہاں سے اس کے مدّاح ہو کر لوٹیں گے۔ وہ ہر وقت دست بستہ آپ کے روبرو کھڑا ہوگا۔ آپ کی ساری تندی اور تیزی فرو ہو جائے گی۔ آپ کے قلم کو خدا نے کمال عطا کیا ہے، آپ نے صد ہا نوجوانوں کے قلب کی تالیف کی ہے۔ دل میں درد پیدا کرنا آپ کا حصہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کسم کی جانب سے ایک ایسا دردناک، ایسا دل ہلا دینے والا خط لکھیں کہ وہ نادم ہو جائے۔ اور اس کے دل میں سویا ہوا انسان جاگ پڑے۔ میں آپ کا تازیست ممنون رہوں گا''۔

مسٹر شاطر شاعر ہی تو ٹھہرے۔ اس تجویز میں بھی شعریت کا عنصر غالب تھا۔ آپ

میرے کئی قصے پڑھ کر رو پڑے ہیں۔ اس سے آپ کو یقین ہو گیا ہے کہ میں جس دل کو چاہوں متاثر کر سکتا ہوں۔ آپ کو یہ معلوم نہیں کہ ہر شخص شاعر نہیں ہوتا اور نہ یکساں رقیق القلب۔ جن قصوں کو پڑھ کر شاطر صاحب روئے ہیں اُن ہی قصوں کو کتنے ہی حضرات نے سنٹی منٹل کہہ کر کتاب پھینک دی ہے۔ مگر اس وقت ان نکتہ چینیوں کا موقعہ نہ تھا۔ وہ سمجھے کہ میں پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں اس لیے میں نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ ''آپ کی تجویز سے مجھے پورا اتفاق ہے اور اگرچہ میرے خیال میں آپ نے امکانات کا مبالغہ آمیز اندازہ کیا ہے، لیکن میں خط لکھ دوں گا اور جہاں تک ہو سکے گا اظہارِ درد کے ساتھ اس کے جذبۂ انصاف کو متحرک بھی کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اگر آپ غیر مناسب نہ سمجھیں تو پہلے مجھے وہ خطوط دکھا دیں جو کسم نے اپنے شوہر کے نام لکھے تھے۔ اس نے خطوط تو لوٹا ہی دیے تھے۔ اگر کسم نے پھاڑ نہ ڈالے ہوں گے تو وہ چٹھیاں ضرور اس کے پاس ہوں گی۔ ان خطوط سے مجھے معلوم ہو جائے گا کہ کن پہلوؤں پر لکھنے کی گنجائش باقی ہے۔''

مسٹر شاطر نے جیب سے خطوں کا ایک پلندا نکال کر میرے سامنے رکھ دیا اور بولے۔ ''میں سارے خطوط لیتا آیا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ آپ ان خطوط کو دیکھنا چاہیں گے۔ آپ انھیں شوق سے دیکھیں۔ کسم جیسی میری لڑکی ہے، ویسی ہی آپ کی بھی لڑکی ہے آپ سے کیا پردہ ہے''۔

میں نے خطوں کو پڑھنا شروع کیا۔ گلابی کاغذ پر بہت خوش خط لکھے ہوئے معطّر خط تھے۔

پہلا خط

میرے آقا! مجھے یہاں آئے ایک ہفتہ ہوگیا، لیکن آنکھیں نہیں جھپکیں، ساری رات کروٹیں بدلتے گزر جاتی ہے۔ بار بار سوچتی ہوں مجھ سے ایسی کیا خطا ہوئی کہ آپ مجھے یہ سزا دے رہے ہیں۔ آپ مجھے جھڑکیں، کوسیں، مزاج چاہے تو میری گوشمالی بھی کریں۔ میں ہر ایک سزا برداشت کرلوں گی۔ لیکن یہ بے اعتنائی مارے ڈالتی ہے۔ میں آپ کے یہاں ایک ہفتہ رہی۔ میرا پرماتما جانتا ہے کہ میرے دل میں کیا کیا ارمان تھے۔ میں

کتنے اضطراب سے دن بھر ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتی رہتی تھی۔ کتنی بار کوشش کی کہ آپ سے کچھ پوچھوں۔ آپ سے اپنی خطاؤں کی معافی کی التجا کروں، لیکن آپ میرے سائے سے بھی دور بہ گئے تھے۔ مجھے کوئی موقعہ نہ ہاتھ آیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب دوپہر کو سارا گھر سوجاتا تھا۔ تو میں آپ کے کمرے میں جاتی تھی، اور گھنٹوں سر جھکائے کھڑی رہتی تھی۔ مگر آپ نے کبھی التفات نہ کیا۔ آپ نے مجھے نظر بھر کر دیکھنا بھی گورا نہ کیا۔ اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہوتی تھی، اُس کا شاید آپ اندازہ نہ کرسکیں گے، میری جیسی بدنصیب عورتیں اس کا کچھ اندازہ کرسکتی ہیں۔ میں نے اپنی سہیلیوں سے ان کی عروسی کے تذکرے سُن سُن کر جو خیالی جنّت بنائی تھی، اسے آپ نے کتنی بے دردی سے منہدم کر دیا۔ کیا میرا آپ پر کوئی حق نہیں ہے؟ عدالت بھی کسی مجرم کو سزا دیتی ہے، تو اس پر فرد جرم لگا دیتی ہے۔ آپ نے اتنی عنایت بھی نہ کی۔ مجھے خطا معلوم ہو جاتی تو آئندہ کے لیے سنبھل جاتی۔ میں آپ کے پیروں پر گر کر اپنی خطائیں معاف کراتی ہوں۔ میں آپ سے حلفاً کہتی ہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ مجھ سے کیا خطا سرزد ہوئی۔ ممکن ہے آپ نے اپنی بیوی میں جن اوصاف کے دیکھنے کی تمنّا کی ہو، وہ مجھ میں نہ ہوں۔ بے شک میں انگریزی بہت کم پڑھی ہوں۔ میں انگریزی سوسائٹی کے آداب و قواعد سے واقف نہیں۔ میں اپنی خامیوں سے ناواقف نہیں ہوں۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں آپ کے لائق نہ تھی۔ آپ کو مجھ سے کہیں زیادہ حسین، با سلیقہ اور روشن طبع نازنین ملنی چاہیے تھی۔ لیکن سزا خطاؤں کی ملنی چاہیے نہ کہ خامیوں کی، پھر میں تو آپ کے اشارے پر چلنے کو تیار ہوں۔ آپ میری دلجوئی کریں۔ پھر دیکھیے میں اپنی خامیوں کو کتنی جلدی پورا کر لیتی ہوں۔ آپ کی نگاہِ محبت مجھے چمکا دے گی، میرے ذہن کو جولاں کر دے گی۔ مجھ میں قوتِ بیان پیدا کر دے گی۔ میرے لیے نگاہِ معجزہ ثابت ہوگی۔ مگر میرے پیارے آقا، آپ کی یہ بے رحمی میرے دل و دماغ کو فنا کیے ڈالتی ہے۔ میرا دل بہت کمزور ہے۔ میں اس عتاب کی متحمل نہیں ہوسکتی اور کیا عرض کروں۔ براہ کرم ایک روز کے لیے چلے آیئے۔ ایک بے گناہ کو رُلا کر آپ کو حسرت کے سوا کچھ نہ ہاتھ آئے گا۔ مجھ میں سو عیب ہوں۔ مگر مجھے دعویٰ ہے کہ آپ کی جو خدمت میں کرسکتی ہوں، حقیقی پرستش میں کرسکتی ہوں، وہ کوئی دوسری عورت نہیں کرسکتی۔ آپ عالم و فاضل ہیں۔ طبائع

انسانی کے ماہر ہیں، بیدار مغز ہیں۔ آپ کی لونڈی آپ کے روبرو کھڑی نگاہِ کرم کی بھیک مانگ رہی ہے۔ کیا اس کے سوال کو ٹھکرا دیجیے گا؟

آپ کی خطاوار۔ کسُم۔

میں یہ خط پڑھ کر بے انتہا متاثر ہوا۔ مجھے اس خیال سے اشتعال پیدا ہوا کہ ایک حسینہ اپنے شوہر کے روبرو اتنا عجز وانکسار کیوں کرے؟ مرد کو اگر عتاب کی آزادی ہے تو عورت کو وہ آزادی کیوں نہیں۔ یہ ظالم سمجھتا ہے کہ شادی نے ایک عورت کو غلام بنا دیا وہ اس کے ساتھ جتنا چاہے ظالم کرے؟ کوئی اس سے باز پرس نہیں کرسکتا۔ وہ اپنی دوسری تیسری شادی کر سکتا ہے عورت سے کوئی تعلق نہ رکھ کر اس پر اسی سختی سے حکومت کر سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ عورت پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اسے رو رو کر مرجانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر اسے خوف ہوتا کہ عورت بھی اس کی اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں، اینٹ سے بھی نہیں، محض تھپڑ سے دے سکتی ہے تو اسے کبھی اس بد مزاجی کی جرأت نہ ہوتی۔ غریب عورت کتنی مجبور ہے! شاید میں کسی کی جگہ ہوتا تو اس کی بے اعتنائی کا جواب اس کی دَہ چند بے نیازی سے دیتا۔ میں اس کی چھاتی پر مونگ دلتا۔ زمانہ کے ہنسنے کی مطلق پرواہ نہ کرتا۔ جو زمانہ اتنا ظلم رَوا رکھ سکتا ہے اور زبان احتیاج نہیں کھولتا۔ اس کے ہنسنے اور رونے کی مجھے مطلق پرواہ نہ ہوتی۔ یہ وہ زمانہ ہے جس کی یاد شیریں زندگی میں مٹھاس پیدا کر دیتی ہے۔ جس کے ایک ایک دن پر ایک ایک عمر قربان کی جاسکتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مرد عورت پرنثار ہوتا ہے اس کی پرستش کرتا ہے اور عورت کے دل پر اتنا پائیدار نقش مرتسم کر دیتا ہے کہ وہ اس کے سارے مظالم کو ہنس کر برداشت کرتی ہوئی اس کی خدمت میں عمر گزار دیتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب الفت کی بہار آتی ہے اور دلوں میں نئی نئی کونپلیں جنم لینے لگتی ہیں۔ اس موسم میں کون ایسا بے رحم ہے کہ درخت پر تیر چلائے گا۔ یہ اخلاقی جُرم ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب صیّاد طائر کو اس کے نشیمن سے نکال کر پنجرے میں بند کر دیتاہے۔ کیا وہ اس کی گردن پر چھری چلا کر اس کا نغمۂ شیریں سننے کی ہوس رکھتا ہے؟ ہاں یہ وہ زمانہ ہے جب دو مسافر منزلِ حیات میں باہم رفیق بن جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو آسائش پہنچانے کی ذمہ داری دونوں پر برابر ہے، اگر ایک جو زیادہ طاقتور ہے اپنے کمزور رفیق

پر رفاقت کے پہلے ہی چند لمحوں میں رُعب جمانا شروع کرے تو منزل کا خدا ہی حافظ ہے۔

پھر میں نے دوسرا خط پڑھنا شروع کیا۔

دوسرا خط

''میرے سر تاج! دو ہفتے تک جواب کا انتظار کرنے کے بعد آج پھر یہ شکوہ نامہ لکھنے بیٹھی ہوں۔ جس وقت میں نے وہ خط لکھا تھا میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس کا جواب ضرور آئے گا۔ امید کے خلاف امید کر رہی تھی۔ میرا دل اب بھی اسے قبول نہیں کرتا کہ آپ نے عمداً جواب نہیں دیا۔ غالبًا آپ کو فرصت نہیں ملی یا خدانخواستہ آپ کی طبیعت تو نا ساز نہیں ہے، کس سے پوچھوں؟ اس خیال سے ہی میرا دل کانپتا ہے۔ میری ایشور سے یہی التجا ہے کہ آپ خوش و خرم ہوں۔ مجھے خط نہ لکھیں نہ سہی میں روکر خاموش ہی تو ہو جاؤں گی۔ آپ کو خدا کا واسطہ ہے اگر آپ کی طبیعت ذرا بھی مضمحل ہو تو مجھے فوراً خط لکھیے میں کسی کو ہمراہ لے کر آؤں گی۔ تکلف اور رواج سے میری طبیعت گھبراتی ہے۔ ایسی حالت میں بھی اگر آپ مجھے اپنی خدمت سے محروم رکھتے ہیں تو آپ میرا وہ حق مجھ سے چھین رہے ہیں جو میری زندگی کی سب سے عزیز چیز ہے۔ میں آپ سے اور کوئی درخواست نہیں کرتی۔ آپ مجھے موٹے سے موٹا کھلائیے۔ موٹے سے موٹا پہنائیے۔ مجھے ذرا بھی شکایت نہ ہوگی۔ آپ کے ساتھ میں بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی خوش رہوں گی۔ مجھے زیور کی ہوس نہیں، محل میں رہنے کی تمنّا نہیں۔ سیر تماشے کا شوق نہیں۔ میری زندگی کا منشا آپ کی خدمت ہے۔ یہی اس کا ماحصل ہے۔ میرا دنیا میں کوئی دیوتا نہیں، کوئی گورو نہیں، کوئی حاکم نہیں۔ میرے دیوتا آپ ہیں، میرے گرو آپ ہیں، میرے حاکم آپ ہیں۔ مجھے اپنے قدموں سے جدا نہ کیجیے، مجھے ٹھکرایئے نہیں میں محبت او رخدمت کے پھول لیے عصمت اور وفا کی نذردامن میں بھرے پجارن کی طرح آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مجھے ان پھولوں کو، اس نذر دامن میں بھرے پجارن کی طرح آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مجھے ان پھولوں کو، اس نذر کو اپنے قدموں پر رکھنے دیجیے۔ پجارن کا کام تو پوجا کرنا ہے۔ دیوتا اس کی پوجا قبول کرتا ہے یا

نہیں، یہ سوچنے کی اسے کہاں فرصت ہے۔ میرے آقا! شاید آپ کو معلوم نہیں، میری آج کل کیا کیفیت ہے، اگر معلوم ہوتا تو آپ ہرگز اس سرد مہری کا برتاؤ نہ کرتے۔ آپ مرد ہیں، آپ کے دل میں رحم ہے، وسعت ہے دادرسی ہے۔ میں یہ باور نہیں کرسکتی کہ آپ مجھ جیسی ناچیز پر غصہ کر سکتے ہیں۔ میں آپ کے رحم کے لائق ہوں۔ کتنی نحیف، کتنی بے زبان، کتنی حقیر، آپ آفتاب ہیں۔ میں ذرّہ ہوں۔ آپ شعلہ ہیں میں حسن ہوں۔ آپ راجہ ہیں میں بھکارن ہوں۔ غصہ تو برابر والوں پر آتا ہے۔ میں آپ کے غصہ کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اگر آپ سمجھتے ہیں میری آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے تو مجھے اپنے ہاتھوں سے زہر کا پیالہ دے دیجیے۔ میں اسے آبِ حیات کی طرح سر اور آنکھوں سے لگاؤں گی، اور آنکھیں بند کرکے پی جاؤں گی۔ مجھے یہ تسکین کافی ہے کہ میری موت سے آپ کو بے فکری ہوئی۔ زندگی جب آپ کی نذر ہوگئی تو اسے ماریں یا زندہ رکھیں۔ یہ آپ کی خوشی ہے۔ میں تو اتنا ہی جانتی ہوں کہ میں آپ کی ہوں اور ہمیشہ آپ کی رہوں گی۔ اس جنم میں ہی نہیں آئندہ جنموں میں بھی، بلکہ ابد تک!

آپ کی بدنصیب— کسُم'

مجھے یہ خط پڑھ کر کسُم پر غصہ آنے لگا۔ اور اس لونڈے سے نفرت ہوگئی۔ مانا کہ تم عورت ہو اور حال کے رواج کے مطابق مرد کو تمھارے اوپر ہر طرح کا اختیار ہے لیکن اس حد تک انکسار کیا معنی۔ عورت کو خوددار ہونا چاہیے۔ اگر مرد اس سے بے اعتنائی کرتا ہے تو اُسے بھی چاہیے کہ اس کی بات نہ پوچھے۔ عورتوں کو دھرم،فرض اور تیاگ کا سبق پڑھا پڑھا کر ہم نے ان کی خودداری اور خود اعتمادی دونوں ہی کا خاتمہ کر دیا۔ اگر مرد عورت کا محتاج نہیں تو عورت مرد کی محتاج کیوں ہو؟ ایشور نے مرد کو ہاتھ دیے ہیں تو کیا عورت کو ان سے محروم رکھا ہے؟ مرد کے دماغ ہے تو کیا عورت خالی الذہن ہے۔ اس انکسار نے تو مردوں کا مزاج آسمان پر پہنچا دیا۔ مرد روٹھ گیا تو گویا قیامت آگئی۔ میں تو سمجھتا ہوں عورت نہیں وہ مرد کے رحم کے قابل ہے، جو کسُم جیسی وفا کی دیوی کی قدر نہیں کر سکتا۔ مجھے ایسا شک ہونے لگا کہ اس لونڈے نے کوئی دوسرا ہی مرض پال رکھا ہے۔ کسی صیاد کے رنگین جال میں گرفتار ہوگیا ہوگا۔ خیر میں نے تیسرا خط کھولا اور پڑھنے لگا۔

تیسرا خط

میرے دل و جان کے مالک! اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا زندہ رہنا بے سود ہے۔ جس پھول کو دیکھنے والا چننے والا کوئی نہیں وہ کھل کر کیا کرے۔ میں آپ کے گھر ایک مہینہ رہ کر دوبارہ آئی ہوں۔ سسر جی نے مجھے بلایا۔ انھوں نے ہی مجھے رخصت کر دیا۔ اس دوران میں آپ نے ایک بار بھی مجھے درشن نہ دیے۔ آپ دن میں بیسیوں ہی مرتبہ گھر میں آتے تھے۔ اپنے بہن بھائیوں سے ہنستے بولتے تھے۔ یار دوستوں کے ساتھ سیر کرتے تھے۔ لیکن میرے پاس آنے کی آپ نے قسم کھالی تھی۔ میں نے آپ کو کتنی بار آپ کے پاس کتنے رقعے بھیجے، کتنی منتیں کیں، کتنی بار بے شرمی کرکے آپ کے کمرے میں گئی۔ لیکن آپ نے کبھی مجھے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ میں تو قیاس بھی نہیں کرسکتی کہ کوئی انسان اتنا سنگدل ہو سکتا ہے۔ میں محبت کے قابل نہیں۔ اعتبار کے قابل نہیں، خدمت کے قابل نہیں، کیا رحم کے قابل نہیں۔ میں نے اس دن کتنی محنت سے آپ کے لیے رس گلّے بنائے تھے۔ آپ نے انھیں چھوا بھی نہیں۔ جب آپ مجھ سے اس قدر برداشتہ خاطر ہیں تو میں نہیں سمجھتی کہ زندہ رہ کر کیا کروں۔ نہ جانے وہ کون سی امید ہے جو مجھے زندہ رکھے ہوے ہے۔ کیا ستم ہے کہ آپ سزا دیتے ہیں مگر جرم نہیں بتلاتے۔ یہ کون سا آئین انصاف ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ اس ایک ماہ کے قیام میں میں نے مشکل سے آپ کے یہاں دس دن کھایا ہوگا۔ میں اتنی کمزور ہوگئی ہوں کہ چلتی ہوں تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے، آنکھوں میں گویا بینائی نہیں رہی۔ دل میں گویا خون کی گردش ہی نہیں رہی۔ خیر ستا لیجیے جتنا جی چاہے رُلا لیجیے۔ اس ستم کی بھی ایک دن انتہا ہو جائے گی۔ اب تو موت ہی پر ساری امیدیں قائم ہیں۔ میں جانتی ہوں میری موت کی خبر پا کر آپ مسکرائیں گے۔ آپ کی آنکھوں سے آنسوں کی ایک بوند بھی نہ گرے گی۔ مگر آپ کی کوئی خطا نہیں۔ یہ میری بدنصیبی ہے۔ میرے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ اس جنم میں کوئی بہت بڑا گناہ کیا تھا۔ میں چاہتی ہوں میں بھی آپ کی پرواہ نہ کروں۔ آپ ہی کی طرح آپ سے بے التفاتی کروں۔ لیکن نہ جانے کیوں میں اپنے میں وہ طاقت نہیں پاتی۔ کیا لتا درخت کی طرح کھڑی رہ سکتی ہے۔ درخت کے لیے کسی

سہارے کی ضرورت نہیں۔ وہ قوت کہاں سے لائے۔ وہ تو درخت سے لپٹنے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اسے درخت سے الگ کر دو تو وہ خشک ہو جائے گی۔ میں آپ سے علیحدہ اپنی ہستی کا خیال ہی نہیں کر سکتی۔ میری زندگی کے ہر فعل، ہر خیال، ہر آرزو میں آپ موجود ہوتے ہیں۔ میری زندگی ایک دائرہ ہے جس کے مرکز آپ ہیں۔ میں وہ ہار ہوں جس کے ہر پھول میں آپ ہی دھاگے کی طرح پیوست ہو گئے ہیں۔ اس دھاگے کے بغیر ہار کے پھول بکھر جائیں گے اور خاک میں مِل مِل جائیں گے۔

میری ایک سہیلی کی امسال ہی شادی ہوئی ہے۔ اس کا شوہر جس وقت سسرال آتا ہے شنو کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے، دن میں کتنے روپ بدلتی ہے کہہ نہیں سکتی۔ چہرہ کھل جاتا ہے۔ مسرّت سنبھالے میں نہیں آتی۔ اسے بکھیرتی لُٹاتی چلتی ہے ہم جیسے بدنصیبوں کے لیے آکر گلے سے لپٹ جاتی ہے اور اس کے منہ سے خوشیوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے اخلاص اور وفا میں متوالے ہورہے ہیں۔ ان کے پاس دولت نہیں ہے۔ جائیداد نہیں ہے۔ مگر اپنی بے سرو سامانی میں خوش ہیں۔ اس لازوال محبت کا ایک لمحہ ساری دنیا کی دولت سے بیش قیمت ہے۔ میں جانتی ہوں یہ بے فکریاں اور رنگ رلیاں بہت دن نہ رہیں گی۔ افکار و حوادث روز گار ان کی زندگی کو بھی پا مال کر دیں گے۔ لیکن اس دور محبت کی یاد گاریں ان کے دل کو ہمیشہ تقویت دیتی رہیں گی۔ محبت میں بھیگی ہوئی روکھی روٹیاں اور محبت میں رنگے ہوئے موٹے کپڑے اور محبت کی روشنی سے نورانی چھوٹا سا حجرہ اپنی بے نوائی میں بھی وہ حلاوت اور وہ برکت اور وہ زیبائش رکھتا ہے جو شاید دیوتاؤں کو جنت میں نصیب نہیں۔ جب شنو کا شوہر اپنے گھر چلا جاتا ہے تو وہ دُکھیا کس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے۔ اس کے خطوط آجاتے ہیں تو گویا اسے کہیں کی نعمت مل جاتی ہے۔ اس کے آنسو اضطراب اور اشتیاق کے آنسو ہیں۔ میرے آنسو مایوسی اور غم کے آنسوں ہیں۔ اس کی بے تابیاں انتظار اور شوق کی بے تابیاں ہیں۔ میری بیتابیاں پا مالی اور کس مپرسی کی بیتابیاں ہیں۔ اس کے شکوہ میں قبضہ اور اپنا پن ہے۔ میرے شکوے میں دل شکستگی اور بے دست و پائی ہے، اس شوق اور انتظار اور درد کی کیفیتوں میں ان کی مسرتوں کا راز پوشیدہ ہے۔ میں ان کیفیتوں سے محروم ہوں۔

خط لمبا ہوا جاتا ہے اور دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوتا۔ بڑی شدت کی گرمی پڑ رہی ہے۔ دادا مجھے منصوری لے جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ میری لاغری اور خستہ حالی سے انھیں شاید شک ہو رہا ہے کہ میں ٹی بی کا شکار ہوں۔ میرے لیے منصوری ہی نہیں، جنت بھی وادیٔ غم ہے۔

آپ کی حسرت زدہ— 'کسم'

چوتھا خط

میرے پتھر کے دیوتا! کل منصوری سے لوٹ آئی۔ لوگ کہتے ہیں بڑی پُرفضا جگہ ہے، ہوگی۔ میں تو ایک دن بھی کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ مُردہ دلوں کے لیے دنیا ویران ہے۔ میں نے رات کو ایک پُرنشاط خواب دیکھا۔ بتاؤں؟ مگر کیا فائدہ۔ نہ جانے کیوں میں اب بھی موت سے ڈرتی ہوں۔ امید کا کچّا دھاگا مجھے اب بھی زندگی سے باندھے ہوے ہے۔ باغِ زندگی کے دروازے پر آکر بغیر سیر کیے لوٹ جانا کتنا حسرتناک ہے۔ اندر کیا کیا بہاریں ہیں، کیا کیا نغمے ہیں۔ کیا کیا دل فریبیاں ہیں۔ میرے لیے وہ دروازہ بند ہے۔ کتنی آرزوؤں سے سیر کا لطف اٹھانے چلی تھی۔ کتنی تیاریوں سے۔ مگر میرے پہنچتے ہی دروازہ بند ہوگیا۔

اچھا بتاؤ؟ میں مرجاؤں گی تو میری میت پر دو بوندیں آنسو گراؤ گے؟ جس کی زندگی بھر کی ذمہ داری لی تھی۔ جس کی ہمیشہ کے لیے بانہہ پکڑی تھی۔ کیا اس کے ساتھ اتنی بھی فیاضی نہ کروگے۔ مرنے والوں کی خطائیں سب معاف کردیا کرتے ہیں۔ تم بھی معاف کردینا۔ آکر میری لاش کو اپنے ہاتھوں سے نہلانا۔ اپنے ہاتھ سے سہاگ کا سیندور لگانا۔ اپنے ہاتھ سے سہاگ کی چوڑیاں پہنانا، اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں گنگا جل ڈالنا۔ چار قدم کے لیے کندھا دے دینا۔ میری روح خوش ہوجائے گی اور تمھیں دعائیں دے گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ایشور کے دربار میں تمھارا جشن گاؤں گی۔ کیا یہ بھی مہنگا سودا ہے؟ اتنی سی ظاہرداری کرکے تم اپنے سارے فرائض شوہری سے سبکدوش ہوے جاتے ہو۔ کاش مجھے اس کا یقین ہوتا تو میں کتنی خوشی سے مرتی۔ کتنی خوشی سے موت کا خیرمقدم کرتی! لیکن میں تمھارے ساتھ اتنی بے انصافی نہ کروں گی۔ تم ہزار سنگدل ہو۔

اتنے بے رحم نہیں ہوسکتے۔ میں جانتی ہوں تم خبر پاکر آؤگے اور شاید ایک لمحہ کے لیے میری مرگ حسرت پر تمھاری آنکھیں رو پڑیں۔ آہ کاش میں اپنی زندگی میں وہ نظارہ دیکھ سکتی۔

اچھا، کیا میں ایک سوال پوچھ سکتی ہوں۔ ناراض نہ ہونا۔ کیا میری جگہ کسی اور نے لے لی ہے؟ اگر ایسا ہے تو مبارک! ذرا اس کی تصویر میرے پاس بھیج دینا۔ میں اس کی پوجا کروں گی اس کے قدموں کو بوسہ دوں گی! میں جس پتھر کے دیوتا کو نہ پگھلا سکی اس سے اس نے بروان پایا۔ ایسی خوش نصیب عورت کے قدم دھو دھوکر پیوں گی۔ میری دلی دعا ہے کہ تم اس کے ساتھ آرام سے زندگی بسر کرو۔ کاش میں اس کی خدمت کرسکتی۔ بے واسطہ نہیں، بالواسطہ۔ تمھارے ساتھ اپنا کچھ فرض ادا کر دیتی۔ تم مجھے صرف اس کا نام اور پتہ بتا دو۔ میں سر کے بل دوڑی ہوئی اس کے پاس جاؤں گی اور کہوں گی۔ دیوی میں تمھاری کنیز ہوں اس لیے کہ تم میرے مالک کی منظور نظر ہو۔ مجھے اپنے قدموں میں جگہ دو۔ میں تمھارے لیے پھولوں کی سیج بچھاؤں گی۔ تمھارے گیسوؤں کو موتیوں سے گوندھوں گی۔ تمھارے ماتھے پر سہاگ کا ٹیکہ لگاؤں گی۔ تمھاری ایڑیوں میں مہندی رچوں گی۔ یہی میرا مقصد حیات ہوگا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں جلوں گی یا کڑھوں گی۔ جلن اس وقت ہوتی ہے جب کوئی مجھ سے میری چیز چھین رہا ہو۔ جس چیز کو اپنا سمجھنے کا کبھی مجھے موقعہ ہی نہ ملا اس کے لیے مجھے کیوں جلن ہو؟ ابھی بہت کچھ لکھنا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں۔ غریب مرض کو ٹی بی سمجھ رہا ہے۔

آپ کی حسرت نصیب—— کسُم،

ان دونوں خطوں نے ذرا دیر کے لیے مجھ پر جنون کا عالم طاری کر دیا۔ میں بھی سلامت پسند آدمی ہوں۔ میرے جذبات جلد ہیجان میں نہیں آتے۔ اکثر ادیبوں کی طرح میں بھی الفاظ سے متاثر نہیں ہوتا۔ کیا چیز دل سے نکلی ہے، کیا چیز محض تاثیر کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کا لطف اکثر افسانوں میں خارج ہو جاتا ہے۔ لیکن ان خطوط نے مجھے از خود رفتہ بنا دیا۔ ایک جگہ تو واقعی میری آنکھیں آب گوں ہو گئیں یہ خیال کتنا روح فرسا تھا کہ نازونعم میں پلی ہوئی کسُم جسے ماں باپ دونوں اپنی انکھوں سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ شادی ہوتے ہی یکا یک اتنی بے کس و مجبور ہو۔ شادی کیا ہوئی اس کی چتا تیار

ہوئی۔ یا اس کے قتل کا پروانہ لکھا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے دردناک سانحے زیادہ نہیں ہوتے لیکن ان کا امکان تو رہتاہے۔ جب تک ہر دو فریق کے حقوق و اختیار و فرائض مساوی نہ ہوں ایسے سانحے ہمیشہ ہوتے رہیں گے۔ زبردست کو ستانا شاید انسانی خصہ ہے۔ کاٹنے والے کتّے سے لوگ دور بھاگتے ہیں۔ سیدھے کتّے پر لونڈے تفریح کے لیے پتھر پھینکتے ہیں۔ لیکن آج ان میں سے ایک کو افسر اور دوسرے کو اس کا ماتحت بنا دو۔ پھر دیکھو افسر صاحب اپنے ماتحت پر کتنا رعب جماتے ہیں۔ موجودہ حالات میں بیوی بنتا غلامی نہ سہی، مرد سے کم تر درجہ قبول کرنا ہے۔ محبت تو مساوات تامّہ کا نام ہے۔ اس نا ہمواری میں محبت کا وجود ہو سکتا ہے مجھے تو اس میں بھی شک ہے۔ ہم آج جسے محبت کہتے ہیں۔ وہ فی الواقع وہی محبت ہے جو جانوروں کو اپنے آقا سے ہو سکتی ہے۔ جانور سر جھکائے کام کیے چلا جائے مالک اسے بھوسا اور کھلّی بھی دے گا۔ اس کا بدن بھی سہلائے گا۔ اس کو زیورات سے آراستہ بھی کرے گا۔ لیکن جانور نے ذرا رفتار سست کی، ذرا گردن ٹیڑھی کی اور مالک کی قمچی پیٹھ پر پڑی۔ یہ محبت نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔

خیر میں نے پانچواں خط کھولا۔

پانچواں خط

''جیسا مجھے یقین تھا آپ نے میرے پچھلے خط کا بھی جواب نہ دیا۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپ نے مجھے ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جیسی آپ کی مرضی۔ مردوں کے لیے بیوی پیر کی جوتی ہو، عورت کے لیے مرد دیوتا ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر طلوعِ شعور کے ساتھ ہی وہ شوہر کے نام پر بک جاتی ہے۔ جس وقت میں گڑیاں کھیلتی تھی، اُسی وقت آپ نے گڈے کے روپ میں میرے خانۂ دل میں قدم رکھا۔ میں نے آپ کے قدموں کو چوما۔ اور پھول مالا اور بتاشے سے آپ کی تواضع کی۔ پھر آپ کہانیوں کے راجہ کے روپ میں میرے گھر آئے۔ میں نے آپ کو دل میں جگہ دی۔ آپ کے خوں ریز معرکوں میں، آپ کے ہیبت زا رہ نور دیوں میں آپ کے ساتھ رہی۔ ایامِ طفلی سے اب تک آپ کسی نہ کسی صورت میں میرے دل میں موجود تھے۔ وہ جذبات میرے قلب کی گہرائیوں تک پہنچ گئے ہیں۔ میرے وجود کا ایک ایک ذرّہ ان کی

پرورش کرتا رہا ہے۔ انھیں دل سے نکال ڈالنا آسان نہیں ہے۔ اس کے ساتھ میری ہستی کے ریزے بھی منتشر ہو جائیں گے۔ لیکن آپ کی مرضی ہے تو یہی سہی۔ میں آپ کی خدمت میں سب کچھ کرنے کو آمادہ تھی۔ عسرت اور تنگی کا تو ذکر ہی کیا۔ میں اپنے کو فنا کر دینے کو آمادہ تھی۔ آپ کی خدمت میں فنا ہو جانا ہی میری زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد تھا۔ میں نے شرم و حیا کو خیر باد کہا۔ خود داری کو پیروں سے کچلا۔ لیکن آپ کو منظور نہیں ہے۔ مجبور ہوں۔ آپ کی کوئی خطا نہیں۔ ضرور مجھ سے کوئی ایسا فعل سر زد ہوا ہے، جسے آپ زبان پر نہیں لانا چاہتے۔ میں اس بے اعتنائی کے سوا اور ہر ایک سزا جھیلنے کو تیار تھی۔ آپ کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ لے کر پی جانے میں بھی مجھے کوئی تامّل نہ ہوتا۔ مگر نوشتۂ تقدیر سے کیا چارہ۔ آپ میرے خطوط واپس کر دیں۔ یہی میری آخری التجا ہے۔ یہ زیور اور بیش قیمت جوڑے میرے کس کام کے۔ انھیں اپنے پاس رکھنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ آپ انھیں جس وقت چاہیں واپس منگوالیں۔ میں نے انھیں ایک صندوق میں بند کر کے الگ رکھ دیا ہے۔ ان کی فہرست بھی صندوق میں ہے۔ ملا لیجیے گا۔ آج سے آپ میری زبان اور قلم سے کوئی شکایت نہ سنیں گے۔ اس خیال کو بھول کر بھی دل میں جگہ نہ دیجیے گا کہ میں آپ سے بے وفائی کروں گی۔ میں اسی گھر میں کڑھ کر مر جاؤں گی، مگر آپ کی جانب سے خیال فاسد میرے دل میں نہ آئے گا۔ میں آپ کے ناموس کی امین ہوں۔ اس امانت میں تادم زیست خیانت نہ ہوگی۔ اگر میرے امکان میں ہوتا تو میں اسے واپس کر دیتی۔ لیکن میں بھی مجبور ہوں، اور آپ بھی مجبور ہیں۔ میری ایشور سے یہی دعا ہے کہ آپ جہاں رہیں خوش رہیں۔ زندگی میں مجھے سب سے جگر سوز یہی تجربہ ہوا کہ عورت کی زندگی لعنت ہے اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے، اپنے خاندان کے لیے۔ اس کی قدر نہ والدین کے گھر میں ہے، نہ شوہر کے گھر میں۔ میرا گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے۔ اماں رو رہی ہیں، دادا رو رہے ہیں، عزیز بیگانے رو رہے ہیں۔ ساری دنیا ایک طرف ہو جائے۔ آپ سے عہد برآ نہیں ہو سکتی۔ یہاں آپ کا فیصلہ ناطق ہے۔ اس کی کہیں اپیل نہیں۔ کہیں فریاد نہیں۔ خیر آج سے یہ قصۂ زندگی تمام ہوا۔ اب میں ہوں اور میرا پامال دل۔ حسرت یہی ہے، کہ آپ کی کچھ خدمت نہ کر سکی۔

بدنصیب کسُم"

(3)

معلوم نہیں میں کتنی دیر تک عالم سکوت میں بیٹھا رہا کہ حضرت شاطر نے فرمایا۔
''آپ نے ان خطوط کو پڑھ کر کیا رائے قائم کی؟''

میں نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا۔ ''اگر ان خطوط نے اس ظالم کے دل پر اثر نہیں کیا تو میرا خط بھلا اس پر کیا اثر کرے گا۔ ان سے زیادہ دردناک اور پُرتاثیر تحریر میرے امکان سے باہر ہے۔ ایسا کون سا انسانی جذبہ ہے جسے ان خطوط میں متحرک نہ کیا گیا ہو۔ غیرت، رحم، درد، میرے خیال میں تو اس نے کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔ میرے لیے آخری تدبیر یہی ہے کہ اس شیطان کے سر پر سوار ہو جاؤں اور اس سے دوبدو گفتگو کر کے معاملہ کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کروں۔ اگر اس نے مجھے کوئی قابل اطمینان جواب نہ دیا تو میں اپنا اور اس کا خون ایک کردوں گا۔ یا تو مجھے پھانسی ہوگی یا وہی کالے پانی جائے گا۔ کُسم نے جتنا تحمل کیا ہے اس پر مجھے حیرت ہوتی ہے۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں اطمینان سے گھر واپس جائیں۔ میں آج رات کی گاڑی سے جاؤں گا اور پرسوں جو صورت حال ہوگی، اس کی آپ کو اطلاع دوں گا۔ مجھے یہ کوئی انتہا درجہ کا خبیث النفس آدمی معلوم ہوتا ہے۔ صورت اور سیرت میں اتنا تفاوت میں نے پہلی بار دیکھا۔ ظالم سمجھتا ہوگا کُسم اس کے قابل نہیں۔ کیونکہ وہ نمائش اور تصنّع نہیں جانتی۔ میں ایسے ایسے ایک ہزار لونڈوں پر نثار کر دوں''۔

میں بہک گیا اور نہ جانے کیا کیا بکتا رہا۔ اس کے بعد ہم دونوں کھانا کھا کر اسٹیشن چلے۔ وہ آگرہ گئے، میں نے مرادآباد کا راستہ لیا۔ شاطر صاحب کی روح اس وقت بھی فنا ہو رہی تھی کہ میں غصہ میں کوئی بے عنوانی نہ کر بیٹھوں۔ میرے بارے بہت اطمینان دلانے پر انھیں تشفّی ہوئی۔

میں علی الصّباح مرادآباد پہنچا اور تفتیش شروع کردی۔ ان حضرت کے اطوار کے متعلّق مجھے جو شبہہ تھا وہ غلط نکلا۔ محلّہ میں، کالج میں، اس کے دوستوں میں، سبھی اس کے مدّاح تھے۔ معاملہ زیادہ پیچیدہ ہوتا ہوا معلوم ہوا۔ آخر شام کو میں اس کے گھر جا پہنچا اور اس کے والد سے ملنا بے سود سمجھ کر براہ راست اس سے ملا۔ جس سعادت مندی

سے وہ مجھ سے ملایں اُسے بھول نہیں سکتا۔ نہایت شائستہ انداز کلام تھا۔ مزاج میں حد درجہ انکسار۔ میں نے دوچار تمہیدی جملوں کے بعد کہا۔ ''تم سے مل کر مجھے کمال مسرّت ہوئی۔ لیکن آخر کُسم نے کیا خطا کی ہے، جس کی تم اسے ایسی سخت سزا دے رہے ہو۔ اس غریب نے تمھارے پاس کئی خط لکھے۔ تم نے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ وہ دو تین بار یہاں بھی آئی۔ مگر تم اس سے مخاطب نہ ہوئے۔ کیا یہ اس معصوم کے ساتھ تمھاری بے انصافی نہیں ہے؟''

نوجوان نے ندامت آمیز انداز سے کہا۔ ''بہتر ہوتا کہ آپ نے اس مسئلہ کو نہ چھیڑا ہوتا۔ اس کا جواب دینا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ میں نے تو اُسے آپ صاحبوں کے قیافہ پر چھوڑ دیا تھا اور سمجھتا تھا کہ مجھے اظہار حال کی ضرورت نہ پڑے گی۔ لیکن غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اس لیے اب مجھے مجبوراً عرض کرنا پڑے گا، ممکن ہے آپ مجھے انتہا درجہ خو پرور، کمینہ اور حریص سمجھیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میری شادی نے وہ تمنا پوری نہ کی جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھی۔ میں شادی کرنے پر رضا مند نہ تھا۔ اپنے پیروں میں زنجیر ڈالنا نہ چاہتا تھا۔ لیکن جب جناب شاطر صاحب بہت درپے ہوئے اور ان کی باتوں سے مجھے یہ گمان کرنے کا موقعہ ملا کہ وہ میری ہر ممکن صورت سے امداد کرنے کو آمادہ ہیں تو میں رضا مند ہو گیا۔ مگر انھوں نے میری مطلق امداد نہ کی۔ ان کی بے اعتنائی نے میری زندگی کے سارے خواب پریشاں کردیے۔ میرے لیے اب بجز اس کے اور کیا ہے کہ ایل. ایل. بی. پاس کرلوں اور عدالت میں جوتیاں چٹخاتا پھروں''۔

میں نے پوچھا ''تو تم حضرت شاطر سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو۔ داد و دہش میں تو انھوں نے شکایت کا موقعہ نہ دیا''۔

نوجوان نے سر جھکا کر کہا۔ ''اس داد و دہش سے میرا ذاتی فائدہ کیا ہوا۔ طرفین کے دس بارہ ہزار روپے خاک میں مل گئے، اور انھیں کے ساتھ میری آرزوئیں بھی خاک میں مل گئیں۔ والد صاحب تو مقروض ہوگئے ہیں اور اب میری تعلیم کے بار کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔ میں بیگار کے طور پر ایل، ایل، بی کلاس میں شریک ہو گیا ہوں۔ کیا خسر صاحب مجھے انگلینڈ نہ بھیج سکتے تھے۔ ان کے لیے دس پانچ ہزار روپے کوئی حقیقت نہیں رکھتے''۔

میں سکتے میں آ گیا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''لاحول ولا قوۃ'' ان صاجبزادے کا جتنا و قار میری نظروں میں قائم ہوگیا تھا، وہ جھوٹے رنگ کی طرح اُڑ گیا۔ واہ ری دنیا! واہ رے ہندو سماج! تیرے یہاں ایسے دنیا پرست پڑے ہوے ہیں جو ایسے ظالمانہ و حشیانہ دباوٴ ڈال کر، ایک معصوم زندگی کو تباہ کر کے منصب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تحصیل علم کے لیے انگلینڈ یا امریکہ جانا بُرا نہیں۔ خدا توفیق دے تو شوق سے جاوٴ۔ مگر بیوی کو ترک کرکے خسر پر اس کا بار ڈالنا بے غیرتی کی انتہا ہے۔ تعریف کی بات تو یہ تھی کہ تم اپنی قوتِ بازو سے جاتے۔ حالانکہ خود غرضانہ محبت بہت ہی معیوب ہے اور کوئی غیرت مند آدمی محبت میں غرض کو شامل نہ کرے گا۔ لیکن اس وحشیانہ طرزِ عمل کے مقابلہ میں پھر بھی غنیمت ہے۔ کُسم کو ایک فرضی فرد گذاشت کے لیے قابل گردن زدنی ٹھہرا دینا چھچھوڑے پن کی انتہا ہے۔ اس ظالم کی نگاہ میں کُسم کی کوئی حقیقت نہیں۔ کُسم محض آلہ ہے اس کی دنیا طلبی کا۔ ایسے پست خیال آدمی سے کچھ بحث کرنا بیکار ہے۔ میں نے سوچا اس وقت ''دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ'' والی پالیسی ہی موزوں ہے۔

دوسری گاڑی سے میں آگرہ جا پہنچا اور مسٹر شاطر سے یہ سرگذشت کہی۔ اُن غریب کو کیا معلوم تھا کہ یہاں ساری ذمہ داری انھیں کے سر ڈال دی گئی ہے۔ اگر چہ اس عام سرد بازاری نے ان کی وکالت بھی ٹھنڈی کر رکھی ہے اور وہ دس ہزار کا خرچ بے تکلّف برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر اس صاجبزادے نے کنایتہً بھی اُن سے کہا ہوتا تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی انتظام کرتے۔ کُسم کے سوا دوسرا اُن کا کون بیٹھا ہوا ہے۔ ان غریب کو تو حقیقت کا علم ہی نہ تھا۔ چنانچہ میں نے جوں ہی یہ قصّہ کہا۔ وہ بولے ''چھی! اس ذرا سے معاملہ کو اس شخص نے خواہ مخواہ طول دے دیا۔ آج ہی آپ اسے لکھ دیں کہ وہ جس وقت، جہاں تحصیل علم کے لیے جانا چاہے شوق سے جا سکتا ہے۔ میں اس کی ساری ذمّہ داری قبول کرتا ہوں۔ سال بھر تک ظالم نے کُسم کو رُلا رُلا کر مار ڈالا، عرض حال کا اِس کے سوا اُسے کوئی طریقہ ہی نہ سوجھا''۔

گھر میں اس کا چرچا ہوا۔ کُسم نے بھی ماں سے سنا۔ معلم ہوا کہ ایک ہزار کا چیک اس کے شوہر کے نام بھیجا جا رہا ہے۔ مگر اس طرح جیسے کوئی آئی بلا کو ٹالنے کے

لیے نیاز چڑھائی جا رہی ہو۔

کُسُم نے بھویں سکیڑ کر ماں سے کہا۔ ''روپیہ بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اماں، دادا سے کہہ دو''۔ ماں نے حیرت سے لڑکی کی جانب دیکھا۔ ''کیسے روپے؟ اچھا وہ'' کیوں؟ کیا ہرج ہے۔ لڑکے کا دل ہے تو جائے اور یوں بھی اسی کا ہے۔ ہمیں کون چھاتی پر لاد کر لے جانا ہے''۔

''نہیں۔ آپ دادا سے کہہ دیجیے ایک پائی بھی نہ بھیجیں''۔

''آخر اس میں بُرائی کیا ہے؟''

''اس لیے کہ یہ اس طرح کی ڈاکہ زنی ہے جیسے بدمعاش کیا کرتے ہیں۔ کسی آدمی کو پکڑ کر لے گئے اور اس کے گھر والوں سے اس کی آزادی کے لیے ایک اچھی رقم وصول کرلی''۔

ماں نے تنبیہہ کی آنکھوں سے دیکھا۔ کیسی باتیں کرتی ہو بیٹی۔ اتنے دنوں کے بعد تو جاکے دیوتا سیدھے ہوئے ہین اور تم انھیں پھر چڑھائے دیتی ہو''۔

کُسُم نے جھلاّ کر کہا۔ ''ایسے دیوتا کا روٹھے رہنا ہی اچھا۔ جو شخص اتنا دنیا پرست، خود غرض اور حریص ہے اس کے ساتھ میرا نباہ نہ ہوگا۔ میں کہے دیتی ہوں اگر وہاں روپے گئے تو میں زہر کھالوں گی۔ اسے مذاق نہ سمجھنا، میں ایسے آدمی کا منہ بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ تم دادا سے کہہ دینا۔ اور اگر تمھیں ڈر لگتا ہو تو میں خود کہہ دوں گی۔ میں نے تنہا رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے''۔

ماں نے دیکھا لڑکی کا چہرہ تمتما اُٹھا ہے۔ گویا اس مسئلہ پر وہ اب نہ کچھ کہنا چاہتی ہے نہ سننا۔

دوسرے دن شاطر صاحب نے یہ قصہ مجھ سے کہا تو میں ایک بے خودی کے عالم میں دوڑا ہوا کُسُم کے پاس گیا اور اسے گلے لگا لیا۔

سال بھر ہو گیا ہے۔ کُسُم نے شوہر کے پاس ایک خط بھی نہ لکھا اور نہ اس کا ذکر ہی کرتی ہے۔ شاطر صاحب نے کئی بار داماد کو منانے کا ارادہ ظاہر کیا، مگر کُسُم اس کا نام بھی سننا نہیں چاہتی۔ اس میں خود اعتمادی کی ایسی اسپرٹ پیدا ہوگئی ہے کہ حیرت ہوتی

ہے۔ اس کے چہرے پر مایوسی اور حسرت زردی اور بے رونقی کی جگہ خودداری اور آزادی کی سرخی نمودار ہو گئی ہے۔

(یہ افسانہ پہلی بار دلّی کے اردو ماہنامہ 'عصمت' کے سالگرہ نمبر 1932 میں شائع ہوا۔ ''دودھ کی قیمت'' میں شامل ہے ہندی میں یہ 'مان سرووز' نمبر 2 میں شامل ہے۔ یہ 'چاند' میں اکتوبر 1934 میں بھی شائع ہوا۔)

بدنصیب ماں

پنڈت اجودھیاناتھ کا انتقال ہوا تو سب نے کہا۔ ''ایشور آدمی کو ایسی ہی موت دے''۔ چار جوان لڑکے یادگار چھوڑے اور ایک لڑکی۔ اثاثہ بھی کافی، پختہ مکان، دو باغ، کئی ہزار کے زیور اور بیس ہزار نقد۔ بیوہ پھول متی کو صدمہ ہونا تو لازمی تھا، اور وہ کئی دن تک بے حال رہی۔ لیکن جوان بیٹوں کو سامنے دیکھ کر اُسے تشفی ہوئی۔ چاروں لڑکے ایک سے ایک سعادت مند، چاروں بہوئیں ایک سی ایک فرماں بردار، جس وقت پھول متی چارپائی پر لیٹتی تو باری باری سے اس کے پاؤں دباتیں وہ اشنان کرکے اٹھتی تو اس کی ساڑی دھوتیں۔ سارا گھر اس کے اشارے پر چلتا تھا۔ بڑا لڑکا کامتاناتھ ایک دفتر میں پچاس روپے کا نوکر تھا۔ دوسرا اماناتھ ڈاکٹری پاس کرچکا تھا، اور کہیں مطب کھولنے کی فکر میں تھا۔ تیسرا دیاناتھ بی اے میں فیل ہو گیا تھا اور اخباروں میں مضامین لکھ کر، اپنا جیب خرچ نکال لیتا تھا۔ سب سے چھوٹا سیتا ناتھ چاروں میں ذہین اور ہونہار تھا۔ اور امسال بی۔اے اوّل درجے میں پاس کرکے ایم۔ اے کی تیاری میں مصروف تھا۔ کسی میں وہ لا اُبالیاں نہ تھیں۔نہ فضول خرچیاں، نہ کم اندیشیاں جو والدین کو جلاتی ہیں، اور خاندان کو تباہ کرتی ہیں۔ بڑھیا گھر کی مالکن تھی۔ اگرچہ کنجیاں بڑی بہو کے پاس رہتی تھیں۔ پھول متی میں وہ حکومت پسندی نہ تھی، جو بڑھاپے کو سخت گیر بنادیا کرتی ہے۔ مگر اس کی مرضی کے بغیر کوئی لڑکا ناشتہ نہیں منگا سکتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ پنڈت جی کو مرے آج بارھواں دن تھا۔ کل تیرھویں ہے۔ برہم بھوج ہوگا۔ برادری کی دعوت ہوگی۔ اسی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پھول متی حجرے میں بیٹھی دیکھ رہی تھی کہ پلّے دار بوروں میں آٹا لا کر رکھ رہے ہیں۔ گھی کے ٹین آرہے ہیں۔ سبزی کے ٹوکرے، شکر کی بوریاں، دہی کی مٹکیاں سب چلی آرہی ہیں۔ مہابرہمن کے لیے دان کی چیزیں لائی گئیں۔ برتن، پلنگ، بستر، کپڑے وغیرہ مگر پھول متی کو کوئی

چیز نہیں دکھائی گئی۔ حسب ضابطہ سب چیزیں اس کے پاس آنی چاہیے تھیں۔ وہ ہر ایک چیز کو دیکھتی، اُسے پسند کرتی، ان کی مقدار میں کمی بیشی کرتی تب ان چیزوں کو بھنڈارے میں رکھا جاتا۔ مگر اُسے دکھانے کی کسی نے ضرورت نہ سمجھی۔اچھا! اور آٹا تین ہی بوری کیوں آیا۔ اس نے تو پانچ بوریوں کے لیے کہا تھا۔ گھی کے بھی پانچ کنستر آئے۔اس نے دس کنستر منگوائے تھے۔ شاید سبزی، دہی، شکر وغیرہ میں بھی کمی کی گئی ہوگی۔ کس نے اس کے حکم میں مداخلت کی۔ جب اس نے بات طے کر دی تو کسی کو کیا حق ہے کہ اس میں کمی بیشی کرے۔ آج چالیس سال سے گھر کے ہر ایک معاملے میں پھول متی کا فیصلہ ناطق تھا۔ اس نے سو کہا تو سو خرچ کیے گئے۔ ایک کہا تو ایک۔ کسی نے مین میکھ نہ کی۔ یہاں تک کہ پنڈت اجودھیا ناتھ سب کچھ اس کی مرضی پر چھوڑ دیتے تھے۔ پر آج اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے، وہ اسے کیوں کر برداشت کر سکتی تھی۔

وہ کچھ دیر تک تو ضبط کیے بیٹھی رہی۔ پر آخر اس سے نہ رہا گیا۔ خود پروری اس کی فطرتِ ثانی بن گئی تھی۔ غصّے میں بھری ہوئی آئی اور کامتاناتھ سے بولی۔ کیا آٹا تین بورے لائے، میں نے پانچ بوروں کے لیے کہا تھا اور گھی بھی پانچ کنستر تمھیں یاد رہے میں نے دس کنستر کہے تھے۔ کفایت کو میں بُرا نہیں کہتی، لیکن جس نے یہ کنواں کھودا اُسی کی آتما پانی کو ترسے تو کتنے شرم کی بات ہے''۔

کامتا ناتھ نے معذرت نہیں کی۔ عذرِ گناہ نہیں کیا۔ نادم بھی نہیں ہوا۔ فوراً تقصیر کی تلافی کرنے نہیں دوڑا۔ ایک منٹ تو باغیانہ انداز سے کھڑا رہا۔ پھر بولا۔ ''ہم لوگوں کی صلاح تین ہی بوروں کی ہوئی اور تین بوروں کے لیے پانچ کنستر گھی کافی تھا۔ اسی حساب سے اور چیزیں بھی کم کر دی گئیں''۔

پھول متی تیز ہو کر بولی۔ ''کس کی رائے سے آٹا کم کیا گیا؟''

''ہم لوگوں کی رائے سے''۔

''تو میری رائے کوئی چیز نہیں ہے؟''

''ہے کیوں نہیں۔ لیکن اپنا نفع نقصان تو ہم بھی سمجھتے ہیں''۔

پھول متی ہکّا بکّا ہو کر اس کا منہ تکنے لگی۔ اس جملے کا مطلب اس کی سمجھ میں نہ

آیا، اپنا نفع نقصان یہ ''اپنا'' کیا بلا ہے؟ اس کا وجود کب سے ہوا؟ اس گھر کے نقصان کی ذمہ داری اس کے سر ہے۔ دوسروں کو خواہ وہ اس کے پیٹ کے لڑکے ہی کیوں نہ ہوں، اس کے فیصلے میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ لونڈا اس طرح جواب دے رہا ہے گویا گھر اس کا ہے۔ اس نے مرمر کر یہ گرہستی جمع کی ہے۔ میں تو غیر ہوں ذرا اس کی خودسری تو دیکھو۔

اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''میرے نفع نقصان کے ذمہ دار تم نہیں ہو۔ مجھے اختیار ہے، میں جو مناسب سمجھوں وہ کروں۔ ابھی جا کر دو بورے آٹا اور پانچ کنستر گھی اور لاؤ اور آئندہ سے خبردار جو کسی نے میری بات کاٹی''۔

اس نے اپنے خیال میں ضرورت سے زیادہ تنبیہ کر دی تھی اور اب وہاں کھڑے ہونے کی ضرورت نہ سمجھ کر، وہ اپنے حجرے میں چلی آئی۔ حالانکہ کامتاناتھ ابھی وہیں کھڑا تھا، اور اس کے چہرے سے ایسا مترشح ہو رہا تھا کہ اسے اس حکم کی تعمیل میں کچھ عذر ہے، مگر پھول متی مطمئن بیٹھی تھی۔ اتنی تنبیہ پر بھی کسی کو اس کی نافرمانی کی جرأت ہو سکتی ہے۔ یہ اس کے ذہن میں نہ آیا، مگر رفتہ رفتہ اس پر اب حقیقت کھلنے لگی کہ اس گھر میں اس کی وہ حیثیت نہیں رہی جو دس بارہ روز پہلے تھی۔ رشتہ داروں کے یہاں سے نوید میں گھی، شکر، مٹھائی وغیرہ آ رہی تھی۔ بڑی بہو ان چیزوں کو خود خاص انداز سے سنبھال سنبھال کر رکھ رہی تھی۔ تینوں چھوٹی بہویں بھی بھنڈارے میں گھسی ہوئی تھیں۔ کوئی بھی پھول متی سے کچھ نہیں پوچھنے آتا۔ برادری کے لوگ بھی جو کچھ پوچھتے ہیں، وہ کامتاناتھ سے یا بڑی بہو سے۔ کامتاناتھ کہاں کا بڑا مہتم ہے۔ دن بھر بھنگ پیئے پڑا رہتا ہے، اور بڑی بہو جیسی پھوہڑ عورت بھلا ان باتوں کو کیا سمجھ سکتی ہے۔ بھد ہوگی اور کیا۔ سب کے سب خاندان کی ناک کٹوائیں گے۔ وقت پر کوئی نہ کوئی چیز کم ہو جائے گی تب اِدھر اُدھر بھاگے پھریں گے۔ ان کاموں کے لیے بڑا تجربہ اور سلیقہ چاہیے، کوئی چیز ضرورت سے زیادہ بن جائے گی اور ماری ماری پھرے گی۔ کوئی چیز اتنی کم بنے گی کہ کسی پتّل پر پہنچے گی کسی پر نہیں، آخر ان سبھوں کو کیا ہوگیا ہے۔ اچھا بڑی بہو سیف کیوں کھول رہی ہے۔ وہ سیف کو میری مرضی کے بغیر کھولنے والی کون ہوتی ہے۔ کنجی اس کے پاس ہے ضرور، لیکن جب تک میں روپے نہ نکلواؤں وہ صندوق نہیں کھول سکتی،

آج اس طرح کھول رہی ہے گویا سب کچھ وہی ہے۔ میں کچھ ہوں ہی نہیں۔ اس نے بڑی بہو کے پاس جا کر تند لہجے میں کہا۔ ''سیف کیوں کھولتی ہو بہو؟ میں نے تو کھولنے کو نہیں کہا''۔

بڑی بہو نے بے باکانہ انداز سے کہا۔ ''بازار سے سامان آیا ہے تو دام نہ دیا جائے گا؟''

کون چیز کس بھاؤ سے آئی ہے اور کتنی آئی ہے، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ جب تک حساب کتاب نہ ہو جائے، روپے کیسے دیے جائیں؟''

''حساب کتاب سب ہو گیا ہے''۔

''کس نے کیا؟''

''اب میں کیا جانوں جا کر اپنے لڑکوں سے پوچھو''۔

پھول متی پھر آ کر اپنی کوٹھری میں بیٹھ گئی۔ اس وقت بگڑنے کا موقع نہ تھا، گھر میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ اگر اس وقت اس نے لڑکوں کو ڈانٹا تو لوگ یہی تو کہیں گے کہ پنڈت کے مرتے ہی ان کے گھر میں پھوٹ پڑگئی۔ خون کا گھونٹ پی پی کر رہ جاتی ہے۔ جب مہمان رخصت ہو جائیں تب وہ ایک ایک کی خبر لے گی۔ دیکھے گی اس وقت لڑکے کیا باتیں بناتے ہیں۔ اس عرصہ میں وہ کار پردازوں کی بے قاعدگیوں اور فضول کاریوں اور غلطیوں کا مبصرانہ نگاہوں سے مشاہدہ کر رہی تھی۔ بارہ بجتے بجتے دعوت شروع ہوئی۔ ساری برادری کے لوگ یکبارگی کھانے کے لیے بلائے گئے۔ پھول متی کھڑی کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ صحن میں مشکل سے ڈھائی سو آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ ساری برادری کیسے بیٹھے گی۔ دو پنگتوں میں لوگ بیٹھتے تو کیا بُرا تھا۔ یہی تو ہوتا کہ دو کی جگہ چار بجے ختم ہوئی۔ مگر یہاں تو سب کو سونے کی فکر پڑی ہوئی ہے۔

دفعتاً شور مچا۔ ''ترکاریو میں نمک نہیں''۔

بڑی بہو جلدی سے نمک پیسنے گئی۔ پھول متی غصّے سے ہونٹ چبارہی تھی مگر اس موقع پر زبان نہ کھول سکتی تھی۔ بارے نمک پسا اور پتیلیوں میں ڈالا گیا۔

یکایک پھر شور مچا۔ ''پانی گرم ہے''۔

گھر میں برف نہ تھی۔ آدمی بازار دوڑا گیا۔ بازار میں اتنی رات گئے برف کہاں،

آدمی ناکام لوٹ آیا۔ مہمانوں کو وہی نل کا گرم پانی پینا پڑا۔ پھول متی کا بس چلتا تو لڑکوں کا منہ نوچ لیتی۔ ایسی بد انتظامی اس کے گھر میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس پر سب کو مالک اور منتظم بننے کی دھن ہے۔ برف جیسی ضروری چیز منگوانے کی کسی کو بھی سُدھ نہیں رہی، سُدھ کہاں سے آئے جب کسی کو گپ مارنے سے فرصت نہ ملے۔ مہمان اپنے دل میں کیا کہتے ہوں گے، دعوت کرنے چلے تھے اور گھر میں برف تک نہیں۔ اچھا پھر کیوں ہل چل مچی؟ ارے غضب! کسی کے شوربے میں ایک مری چوہیا نکل آئی۔ یا بھگوان؟ اب تمھیں آبرو رکھیوں۔ چھی! اس پھوہڑ پن کی بھی کوئی حد ہے۔ سارے مہمان اٹھے جا رہے ہیں۔ نہ اٹھیں تو کیا کریں۔ آنکھوں سے دیکھ کر مکھی کون نگلے گا۔ پھول متی کے دل میں ایسا اُبال اُٹھ رہا تھا کہ دیوار سے سر ٹکرالے۔ مجنونانہ حالت میں بار بار سر کے بال نوچتی تھی۔ ابھاگے دعوت کا انتظام کرنے چلے تھے۔ سارا کرا دھرا مٹی میں مل گیا۔ سینکڑوں روپے پر پانی پھر گیا۔ بدنامی ہوئی وہ الگ۔ اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ مہمان اٹھ چکے تھے۔ پتلوں میں کھانا جوں کا توں پڑا تھا۔ چاروں لڑکے آنگن میں نادم کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کو الزام دے رہا تھا۔ بڑی بہو دیورانیوں پر بگڑ رہی تھیں۔ اسی وقت پھول متی شعلے کی طرح ٹوٹ کر آئی اور بولی منہ میں کالک لگ گئی کہ نہیں؟ یا ابھی کچھ کسر ہے۔ ڈوب مرو سب کے سب جاکر چلّو بھر پانی میں۔ شہر میں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے، ہفتوں اس دعوت کا چرچا رہے گا۔ مذاق اڑایا جائے گا۔ تم لوگوں کو کچھ شرم و حیا تو ہے نہیں تمھیں کیا۔ آتما تو اس کی رو رہی ہے جس نے زندگی کو گھر کی آبرو بنانے میں تباہ کر دیا''۔

کامتاناتھ کچھ دیر تو کھڑا سنتا رہا۔ آخر جھنجھلا کر بولا۔ ''اچھا اب رہنے دو۔ امّاں غلطی ہوئی، ہم سب مانتے ہیں بہت بڑی غلطی ہوئی، لیکن اب کیا اس کے لیے آدمیوں کو حلال کر ڈالوگی؟ سبھی سے غلطیاں ہوتی ہیں، پچھتانے کے سوا آدمی اور کیا کرتا ہے۔ کسی کی جان تو نہیں ماری جاتی۔ آدمی غلطیوں ہی سے سیکھتا بھی تو ہے''۔

بڑی بہو نے فرمایا۔ ''ہم کیا جانتے تھے کہ بی بی (نند کملا) سے اتنا ذرا سا کام نہ ہوگا۔ چوہیا ترکاری میں بیٹھی ہوگی۔ انھوں نے ٹوکری کو بغیر دیکھے بھالے کڑھائیں میں ڈال دیا'' کامتاناتھ نے بیوی کو ڈانٹا۔ ''اس میں نہ کملا کا قصور ہے، نہ تمھارا نہ میرا۔

اتفاق ہے، اتنے بڑے بھوج میں ایک ایک مٹھی ترکاری کڑھاؤ میں نہیں ڈالی جاتی۔ ٹوکرے کے ٹوکرے انڈیل دیے جاتے ہیں۔ اس میں کیسی جگ ہنسائی اور کیسی نک کٹائی۔ تم خواہ مخواہ جلے پر نمک چھڑکتی ہو''۔

پھول متی۔ ''شرماتے تو نہیں۔ الٹے اور بے حیائی کی باتیں کرتے ہو''۔

کامتا۔ ''شرماؤں کیوں۔ کسی کی چوری کی ہے؟ چینی میں چیونٹے اور آٹے میں گھن یہ سب تو نہیں دیکھے جاتے۔ ہماری نگاہ نہ پڑی۔ بس یہی بات بگڑ گئی۔ ورنہ چپکے سے چوہیا پکڑ کر نکال دیتے۔ کسی کو خبر تک نہ ہوتی''۔

پھول متی اس کفر پر استعجاب سے بولی۔ ''کیا سب کو چوہیا کھلا کر ان کا دھرم لے لیتا''۔

کامتاناتھ ماں کی طرف نگاہِ ملامت سے دیکھ کر بولا۔ ''کیا پرانے زمانے کی باتیں کر رہی ہو اماں۔ ان باتوں سے دھرم نہیں جاتا۔ یہ دھر ماتما لوگ جو پتّل سے اٹھ اٹھ کر گئے ہیں، ان میں ایسا کون ہے جو بھیڑ بکری کا گوشت نہ کھاتا ہو۔ تالاب کے کچھوے اور گھونگے تک تو کسی سے بچتے نہیں۔ کیا وہ ذرا سی چوہیا ان سب سے ناپاک ہے''۔

پھول متی کے پاس ایسی کٹھ حجتیوں کا جواب نہ تھا۔ اپنا سا منھ لے کر چلی گئی۔

(2)

دو مہینے گزر گئے ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ چاروں بھائی بھنگ پی کر کمرے میں بیٹھے مشورہ کر رہے ہیں۔ بڑی بہو بھی اس مجلس میں شریک ہیں۔

کامتاناتھ نے مسند پر ٹک کر کہا۔ ''میں تو کمد کی شادی میں اپنے حصّے کی ایک پائی بھی نہیں دے سکتا۔ آخر میرے بھی تو بال بچے ہیں''۔

اماناتھ: ''تو یہاں کس کے پاس فالتو روپے ہیں۔ پانچ پانچ ہزار ہی تو ایک ایک کے حصّے میں آتے ہیں۔ مجھے اپنا میڈیکل ہال کھولنے کے لیے کم از کم پانچ ہزار کی ضرورت ہے''۔

دیاناتھ: ''مجھے بھی پریس اور اخبار کی فکر ہے۔ پانچ ہزار اپنے ہوں گے، تو پانچ

ہزار کا کوئی ساجھی اور مل جائے گا۔ میں تو اپنے روپے میں سے ایک کوڑی بھی نہیں دے سکتا''۔

کامتا : ''دادا نے پانچ ہزار جہیز ٹھہرایا تھا۔ اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ پنڈت مراری لال کے لڑکے سے شادی ہو۔ لڑکی قسمت والی ہو تو غریب گھر میں بھی آرام سے رہ سکتی ہے، بدنصیب ہو تو راجا کے گھر میں روتی رہے گی۔ یہ تو نصیبوں کا کھیل ہے''۔

سیتا نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ طے کی ہوئی سگائی توڑ دی جائے۔ ان سے کہا جائے کہ پانچ ہزار کی جگہ تین ہزار لے لیں۔ اس طرح پانچ ہزار میں شادی ہو سکتی ہے۔ میں اپنے حصّے کے سب روپے دے دوں گا''۔

''کامتا ناتھ نے کھسیا کر بھائیوں سے کہا۔ ''سنتے ہو اس کی باتیں''۔

اُما : ''جب ٹھوکریں کھائیں گے تو آنکھیں کھلیں گی۔''

کامتا : ''اتنا یاد رکھو کہ ہم لوگ تمھاری تعلیم کے ذمے داری نہیں ہیں''۔

سیتا : ''جی ہاں۔ یاد ہے''۔

اُما : اور جو کہیں تمھیں ولایت جا کر پڑھنے کے لیے کل وظیفہ مل جائے تو سوٹ بوٹ اور سفر خرچ کے لیے روپیہ کہاں سے لاؤ گے؟ اس وقت کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرو گے؟''

کامتا : ''اور وظیفہ تمھیں ملے گا۔ کہو میں آج لکھ دوں''۔

اس دلیل سے سیتا ناتھ کو بھی توڑ لیا۔ فی الواقعہ اگر اُسے سرکاری وظیفہ مل گیا تو چار پانچ ہزار تیاریوں کے لیے درکار ہوں گے۔ کمد کے لیے وہ اتنی بڑی قربانی ہرگز نہیں کر سکتا کہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کو پامال کرے۔

بولا، ''ہاں ایسی حالت میں تو مجھے بھی روپے کی ضرورت پڑے گی''۔

کامتا : 'تو اس کی ایک صورت یہی ہے کہ کمد کی شادی کم سے کم خرچ میں کر دی جائے۔ ایک ہزار سے زیادہ ہم کسی طرح خرچ نہیں کر سکتے''۔

پنڈت دین دیال کیسے رہیں گے؟ ایم۔اے۔ بی۔اے نہ سہی۔ ججمانی سے ان کی آمدنی پچاس روپے ماہوار سے کم نہیں۔ عمر بھی ابھی چالیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ پچھلے سال ہی تو بیوی مری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بغیر جہیز کے راضی ہو جائیں گے''۔

اُما : ''وہاں جہیز کا کوئی سوال نہیں۔ تیسری شادی ہے''۔

کامتا : ''یہ نہ کہو۔ وہ آج چاہیں تو ہزار دو ہزار پا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ساتھ کچھ دب جائیں گے۔ تو یہی صلاح کہ مرری لال کو جواب دیا جائے اور دین دیال کے ساتھ سگائی کی جائے''۔

دیا : ''اماں سے بھی پوچھ لینا چاہیے''۔

کامتا : اماں سے پوچھنا بے کار ہے۔ ان کی تو جیسے عقل گھاس کھا گئی ہے۔ وہی پرانے وقتوں کی باتیں! مراری لال کے نام پر اُدھار کھائے بیٹھی ہیں۔ یہ نہیں سمجھتیں کہ وہ زمانہ نہیں رہا''۔

اُما : ''وہ مانیں گی نہیں۔ اپنے زیور بیچ کر شادی کریں گی۔ دیکھ لیجیے گا''۔

کامتا : ''ہاں یہ ممکن ہے۔ زیوروں پر ان کا پورا اختیار ہے۔ یہ ان کا استری دھن ہے، وہ جو چاہیں کر سکتی ہیں''۔

دیاناتھ : ''استری دھن ہے تو کیا اُسے لٹا دیں گی؟ آخر وہ بھی تو دادا ہی کی کمائی ہے''۔

کامتا : ''کسی کی کمائی ہو۔ استری دھن عورت کی چیز ہے''۔

اُما ''یہ سب قانونی گورکھ دھندے ہیں۔ استری دھن کوئی چیز نہیں۔ گہنے دس ہزار سے کم کے نہیں ہیں۔ اتنی بڑی رقم ہم کھودینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کسی بہانے سے یہ گہنے اپنے ہاتھ میں کرنے ہوں گے۔ ابھی دین دیال کا ذکر نہ کرو ورنہ تاڑ جائیں گی۔ گہنے اپنے پاس آجائیں تو صاف صاف کہہ دو۔ تب کیا کر لیں گی''۔

دیا : ''ہاں یہ ترکیب اچھی ہے''۔

کامتا : ''مجھے دھوکے کی چال مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ جس پر ہمارا حق ہے، اس کے لیے ہم لڑ سکتے ہیں۔ جس پر ہمارا حق نہیں، اس کے لیے ہم دھوکا دھڑی نہیں کر سکتے''۔

دیاناتھ : ''تو آپ الگ بیٹھیے، میں جا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایک اخبار میں مضمون لکھا تھا اس پر سرکار مقدمہ چلا رہی ہے۔ پانچ ہزار کی ضمانت دینی پڑے گی۔ آپ اپنے زیور دے دیں تو مری جان بچ جائے گی۔ آپ لوگ بھی کچھ نمک مرچ ملا

دیجیے گا''۔

کامتا : ''نا بھیا، میں اس کام کے قریب نہ جاؤں گا''۔

سیتا : ''میرا بھی استعفیٰ ہے''۔

اُما : ''ان لوگوں کو جانے دو جی۔ ہم اور تم مل کر رنگ جمالیں گے۔ یہ دھرماتما لوگ ہیں، بھیا نوکر ہی ہیں۔ سیتا کو وظیفہ ملنے والا ہے۔ ضرورت تو ہمیں اور تمھیں ہے''۔

بڑی بہو نے فرمایا۔ ''پچاس روپے کے ہی تو نوکر ہیں یا اور کچھ۔ اتنے دن مجھے آئے ہوگئے، پتیل کا ایک چھلا بھی نہ بنوایا۔ توفیق ہی نہ ہوئی۔ آج دھرماتما بنے ہیں''۔

اُما : ''اماں کے زیور مل جائیں گے تو ان کا ہار تمھیں دے دوں گا بھائی خاطر جمع رکھو''۔

بڑی بہو : ''مل چکے۔ وہ گڑ نہیں جو چینٹے کھائیں''۔

دیا : ''اچھا تو اسی بات پر ابھی جاتا ہوں۔ زیور لے کر نہ آؤں تو منہ نہ دکھاؤں''۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دیا ناتھ کی کوڑی چت پڑی۔ ماں کا مامتا بھرا دل بیٹے کی مصیبت دیکھ کر کیوں نہ پسیجتا۔ پھول متی یہ داستان سنتے ہی باؤلی ہوگئی، اس پر اماناتھ نے اور بھی رڈا جمایا۔ ''اگر صبح دس بجے تک روپے داخل نہ ہوئے تو ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی۔ بنک سے روپے تو ابھی مل نہیں سکتے۔ مہینوں خط و کتابت ہوگی۔ وراثت کا فیصلہ ہو جائے گا تب کہیں جا کر روپے ملیں گے۔ پھول متی کو یہ کب برداشت ہو سکتا تھا کہ اس کے زیوروں کے ہوتے اس کے بیٹے کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں۔ سارے زیور نکال کر دیاناتھ کو دے دیے۔ اس طرح اپنی ماں کی گردن پر خنجر چلا کر دونوں ناخلف خوش خوش بھائیوں کے پاس لوٹ آئے۔

(3)

دو تین مہینے اور گزر گئے۔ زیوروں پر تصرف کر کے چاروں بھائی اب ماں کی دلجوئی کرنے لگے، اپنی بیویوں کو سمجھاتے رہتے کہ اماں کا دل نہ دکھائیں۔ اگر اس کی تشفی تھوڑی سی ظاہر داری سے ہو جاتی ہے تو اس میں کیوں کمی کی جائے۔ چاروں کرتے

اپنے دل کی، مگر ماں سے صلاح لے لیتے یا ایسا جال پھیلاتے کہ وہ ان کی باتوں میں آجاتی اور ہر ایک بات میں رضامند ہو جاتی۔ باغ کا فروخت کرنا اسے بہت ناگوار گزرتا تھا، لیکن چاروں نے ایسی بندیشیں باندھیں کہ وہ اُسے بیچ کرنے پر راضی ہوگئی، ہاں کمد کی شادی کے معاملے میں بیٹوں سے اس کا اتفاق نہ ہوا۔ وہ کہتی تھی کہ شادی مراری لال کے لڑکے سے ہی ہوگی۔ چاروں بھائی پنڈت دین دیال سے کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن اس بات پر تکرار کی نوبت آگئی۔

پھول متی نے کہا۔ ''ماں باپ کی کمائی میں کیا بیٹی کا حصہ نہیں ہے؟ تمھیں دس ہزار کا ایک باغ ملا۔ پچیس ہزار کا مکان، بیس ہزار نقد میں سے کیا پانچ ہزار بھی کمد کا حصّہ نہیں ہے؟''

کامتاناتھ نے نرمی سے کہا۔ ''اماں کمد ہماری بہن ہے اور ہم اپنے مقدور بھر کوئی ایسی بات نہ کریں گے جس سے اسے نقصان ہو، لیکن حصّے کی جو بات کہتی ہو تو کمد کا حصّہ کچھ نہیں ہے۔ دادا جب زندہ تھے، تب اور بات تھی۔ اب تو ہمیں ایک ایک پیسے کی کفایت کرنا پڑے گی۔ جو کام ایک ہزار سے ہو جائے، اس کے لیے پانچ ہزار خرچ کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟''

اماناتھ نے تصحیح کی۔ ''پانچ ہزار کیوں صاحب۔ دس ہزار کہیے، دعوت، ضیافت، رسم، رسوم میں کیا پانچ ہزار بھی خرچ نہ ہوں گے''۔

کامتا : ''ہاں ٹھیک ہے۔ دس ہزار ہی سمجھو۔ دس ہزار روپے ایک شادی میں خرچ کرنے کی اب ہماری حیثیت نہیں ہے''۔

پھول متی نے ضد پکڑ کر کہا۔ ''شادی تو مراری لال کے لڑکے سے ہی ہوگی، چاہے پانچ ہزار خرچ ہوں چاہے دس ہزار۔ میرے شوہر کی کمائی ہے۔ میں نے مرمر کر جوڑا ہے۔ اپنی مرضی سے خرچ کروں گی۔ تم سے مانگنے جاؤں تو مت دینا''۔

کامتا ناتھ کو اب تلخ حقیقت کے اظہار کے سوا چارہ نہ رہا بولے۔ ''اماں تم خواہ مخواہ بڑھاتی ہو جس روپے کو اب تم اپنا سمجھتی ہو وہ تمھارا نہیں ہے۔ وہ ہمارا ہے۔ ایک ایک پائی ہماری ہے۔ تم ہماری مرضی کے بغیر اس میں سے کچھ خرچ نہیں کر سکتیں''۔

پھول متی کو جسے سانپ نے ڈس لیا بولی۔ ''کیا کہا پھر تو کہنا۔ میں اپنے ہی

روپے اپنی مرضی سے خرچ نہیں کر سکتی؟''

کامتا: ''وہ روپے تمھارے نہیں ہمارے ہیں؟''

پھول متی: ''تمھارے ہوں گے، لیکن میرے مرنے کے بعد؟''

کامتا: ''نہیں دادا کے مرتے ہی سب کچھ ہمارا ہوگیا''۔

اُما: ''اماں قانون تو جانتی نہیں۔ خواہ مخواہ الجھتی ہیں''۔

پھول متی کی بے نور آنکھیں شعلے کی طرح دہک اٹھیں۔ چہرہ لال ہوگیا۔

بولی۔ ''تمھارا قانون بھاڑ میں جائے ایسے قانون میں آگ لگے۔ میں ایسے لچر قانون کو نہیں مانتی۔ یہ قانون ہے کہ گلے پر چھری پھیرنا ہے۔ تمھارے دادا ایسے کوئی دھنّا سیٹھ نہ تھے۔ میں نے پیٹ اور تن کاٹ کاٹ کر یہ روپے جمع کیے ہیں۔ نہیں تو آج اس گھر میں دھول اڑتی ہوتی۔ گھر ہی کہاں ہوتا۔ میرے جیتے جی تم میرے روپے چھو نہیں سکتے''۔ میں نے تم چاروں کی شادی میں دس دس ہزار خرچ کیے ہیں۔ تمھاری پڑھائی میں بھی پانچ پانچ ہزار سے کم خرچ نہ ہوئے ہوں گے۔ کمد بھی تو میرے ہی پیٹ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کی شادی میں بھی دس ہزار خرچ کروں گی۔ جو کچھ بچے گا وہ تم لے لینا''۔

اماناتھ نے جھلا کر کہا۔ ''بھائی صاحب آپ ناحق اماں کے منہ لگتے ہیں۔ چل کر مراری لال کو خط لکھ دیجیے۔ تمھارے ہاں شادی نہ ہوگی۔ دین دیال کے پاس آج ہی پیغام بھیج دیجیے۔ اماں کو بکنے دیجیے یہ قاعدہ قانون تو جانتی نہیں۔ بے کار بحث کرتی ہیں''۔

پھول متی نے ضبط کر کے کہا۔ ''اچھا کیا قانون ہے۔ ذرا میں بھی سنوں''۔

اُما: ''قانون یہی ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد ساری جائداد بیٹوں کی ہو جاتی ہے۔ ماں کا حق صرف گزارہ لینے کا حق ہے''۔

پھول متی نے پوچھا۔ ''کس نے بنایا ہے ایسا قانون؟''

اُما: ''ہمارے رشیوں نے، مہاراج منو نے اور کس نے؟''

پھول متی ایک لمحہ خاموش رہ کر بولی۔ ''تو میں اس گھر میں تمھارے ٹکڑوں پر پڑی ہوئی ہوں''۔

اُما : ''تم جیسا سمجھو''۔

پھول متی۔ ''گھر میں نے بنوایا ہے۔ روپے میں نے جوڑے، باغ میں نے خریدا، اور آج سے اس گھر میں میں غیر ہوں؟ منو نے یہی قانون بنایا ہے؟ اچھی بات ہے۔ اپنا گھر بار لو۔ میری جان چھوڑو۔ اس طرح محتاج بن کر رہنا مجھے منظور نہیں۔ اس سے کہیں اچھا ہے کہ مرجاؤں۔ واہ رے اندھیر! میں نے ہی درخت لگایا اور میں ہی اس کا پتا نہیں توڑ سکتی۔ میں نے گھر بنوایا۔ میں ہی اس میں نہیں رہ سکتی۔ اگر یہی قانون ہے تو اس میں آگ لگ جائے۔ اگر میں جانتی کہ میری یہ درگت ہونے والی ہے تو ساری جائداد اپنے نام کرا لیتی''۔

چاروں نوجوانوں پر ماں کی اُس تندی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ قانون کا فولادی زرہ ان کی حفاظت کر رہا تھا۔ اس کچے لوہے کا ان پر کیا اثر ہوتا۔

شام ہو گئی تھی۔ دروازے پر نیم کا درخت سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے پتوں میں بھی حِس نہ تھا۔ رخصت ہونے والے آفتاب کی ٹھنڈی کرنیں جیسے جائے پناہ ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ پھول متی آہستہ سے اٹھ کر اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔

(4)

پھول متی اپنے کمرے میں جا کر لیٹی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ شوہر کے مرتے ہی اپنے پیٹ کے جنے لڑکے اس کے دشمن ہوجائیں گے۔ اس کا اُسے کبھی خواب میں بھی گمان نہ ہوا تھا۔ جن لڑکوں کو اس نے خونِ جگر پلا پلا کر پالا، جن پر اُسے اتنا غرور تھا، وہی آج اُسے یوں آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ واہ رے زمانے کی خوبی! اب اس گھر میں رہنا اُسے عذاب معلوم ہوتا تھا۔ جہاں اس کی کچھ قدر نہیں، کچھ گنتی نہیں، وہاں لاوارثوں کی طرح پڑی روٹیاں کھائے۔ یہ اس کی خوددار طبیعت کے لیے حد درجہ گراں تھا۔ مگر چارہ ہی کیا تھا۔ وہ لڑکوں سے الگ ہو کر رہے بھی تو کس کی ناک کٹے گی۔ زمانہ اسے تھوکے تو کیا اور لڑکوں کو تھوکے تو کیا۔ بدنامی تو اس کی ہے۔ دنیا تو یہی کہے گی کہ چار جوان بیٹوں کے ہوتے بڑھیا الگ پڑی ہوئی مزدوری کر کے پیٹ پال رہی ہے۔ جنھیں اس نے ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا۔ وہی اب اس پر ہنسیں گے۔

نہیں یہ ذلت اس بے کسی کی ذلت سے کہیں زیادہ دل شکن تھی۔ اب اسے اپنے آپ کو ایک نئے طرز عمل کا عادی بنانا پڑے گا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اسے اب نئے ماحول کے اندر زندگی بسر کرنی ہوگی۔ اب تک مالکن رہی۔ اب لونڈی بن کر رہنا پڑے گا۔ ایشور کی یہی مرضی ہے۔ اپنے بیٹوں کی لاتیں اور باتیں، غیروں کی لاتوں اور باتوں کے مقابلے میں پھر بھی غنیمت ہیں۔ وہ بڑی دیر تک منھ ڈھانپے اپنی اس بے کسی پر روتی رہی۔ ساری رات اسی روحانی کوفت میں گزر گئی۔

جاڑوں کی صبح آہستہ آہستہ ڈرتی تاریکی کے پردے سے نکلی، جیسے کوئی قیدی چھپ کر جیل سے نکل آیا ہو۔ پھول متی معمول کے خلاف آج تڑکے ہی اٹھی۔ رات بھر اس کا روحانی تناسخ ہو چکا تھا۔ سارا گھر سو رہا تھا اور وہ آنگن میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ رات بھر شبنم میں بھیگی ہوئی پختہ زمین اس کے ننگے پیروں میں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ پنڈت زندہ تھے۔ تب اسے بہت سویرے نہ اٹھنے دیتے تھے۔ ٹھنڈ اسے بہت مضر تھی مگر اب وہ دن نہیں رہے۔ جھاڑو سے فرصت پا کر اس نے آگ جلائی اور کنکریاں چننے لگی۔ رفتہ رفتہ لڑکے جاگے، بہوئیں اٹھیں سبھوں نے بڑھیا کو سردی سے سکڑے ہوئے کام کرتے دیکھا پر کسی نے یہ نہ کہا کہ اماں کیوں ہلکان ہوتی ہو۔ شاید وہ بڑھیا کی اس بے کسی پر دل میں خوش ہو رہے تھے۔

آج سے پھول متی کا یہی وطیرہ ہوگیا کہ جو کچھ بن پڑے گھر کا کام کرنا، سارے گھر کی خدمت کرنا اور انتظامی امور سے الگ رہنا۔ اس کے چہرے پر جو ایک خود داری کی جھلک نمایاں تھی اس کی جگہ ایک حسرت ناک بے بسی چھائی ہوئی نظر آتی تھی، جہاں بجلی جلتی تھی، وہاں اب تیل کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ جس کے بجھانے کے لیے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا کافی تھا۔ بھائیوں نے طے شدہ تجویز کے مطابق مراری لال کو انکاری خط لکھ بھیجا۔ دین دیال سے کمد کی شادی ہوگئی۔ دین دیال کی عمر چالیس سے کچھ زیادہ تھی اور خاندانی وجاہت میں ہیٹے تھے۔ لیکن روٹی دال سے خوش تھے، بغیر کسی قرار کے شادی منظور کر لی۔ تاریخ مقرر ہوئی۔ بارات آئی۔ شادی ہوئی۔ کمد رخصت ہوگئی۔ پھول متی کے دل پر کیا گزر رہی تھی اسے کون جان سکتا ہے۔ کمد کے دل پر کیا گذر رہی تھی

اسے بھی کون جان سکتا تھا۔ لیکن چاروں بھائی بے حد خوش تھے۔ گویا ان کے پہلو سے کانٹا نکل گیا ہو۔ شریف خاندان کی لڑکی گھر والوں کی رضا میں راضی تھی۔ تقدیر میں آرام لکھا ہوگا کرے گی، تکلیف لکھی ہوگی تکلیف اٹھائے گی۔ گھر والوں نے جس سے شادی کردی، اس میں ہزار عیب ہوں تو یہی اس کا معبود، اس کا مالک، انحراف اس کے وہم و گمان سے باہر تھا۔

پھول متی نے کسی کام میں دخل نہ دیا۔ کمد کو کیا دیا گیا۔ مہمانوں کی کیا خاطر مدارت کی گئی، کس کے وہاں سے نوید میں کیا آیا۔ اسے کسی امر سے سروکار نہ تھا۔ اس سے کچھ صلاح بھی لی گئی تو یہی کہا کہ ''بیٹا تم لوگ جو کچھ کرتے ہو اچھا ہی کرتے ہو۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو''۔

جب کمد کے لیے دروازے پر ڈولی آگئی اور کمد ماں کے گلے لپٹ کر رونے لگی تو وہ اُسے اپنی کوٹھری میں لے گئی اور جو کچھ سو پچاس روپے اور دو چار زیور اس کے پاس بچ رہے تھے، بیٹی کے آنچل میں ڈال کر بولی۔ ''بیٹی میری تو دل کی دل ہی میں رہ گئی، نہیں آج کیا تمھاری شادی اس طرح ہوتی اور تم اس طرح بدا کی جاتیں''۔

کمد نے زیور اور روپے آنچل سے نکال کر ماں کے قدموں پر رکھ دیے اور بولی۔ ''اماں میرے لیے تمھاری آشیرباد لاکھوں روپوں کے برابر ہے۔ تم ان چیزوں کو اپنے پاس رکھو، نہیں معلوم ابھی تمھیں کن کن مصیبتوں کا سامنا پڑے۔'' پھول متی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اُما ناتھ نے آکر کہا۔ ''کیا کر رہی ہو۔ کمد چل جلدی کر۔ ساعت ٹلی جاتی ہے۔ وہ لوگ جلدی مچا رہے ہیں، پھر تو دو چار مہینے میں آئے گی ہی جو کچھ لینا دینا ہو لے لینا''۔ پھول متی نے دل کو سنبھال کر کہا۔ میرے پاس اب کیا ہے بیٹا، جو میں اسے دوں گی۔ جاؤ بیٹی، بھگوان تمھارا سہاگ امر کریں''۔

کمد رخصت ہوگئی۔ پھول متی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔

(5)

ایک سال گزر گیا۔ پھول متی کا کمرہ گھر میں سب کمروں سے وسیع اور ہوا دار تھا۔ اس نے اُسے بڑی بہو کے لیے خالی کر دیا اور ایک چھوٹی سی کوٹھری میں رہنے لگی، جیسے

کوئی بھکارن ہو۔ لڑکوں اور بہوؤں سے اُسے اب کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ اب گھر کی لونڈی تھی، گھر کے کسی فرد سے، کسی معاملے سے اُسے دل چسپی نہ تھی۔ وہ زندہ صرف اس لیے تھی کہ اُسے موت نہ آتی تھی۔ خوشی یا رنج کا اس کے اوپر کوئی اثر نہ تھا۔ اُما ناتھ کا مطب کھلا، احباب کی دعوت ہوئی۔ دیا ناتھ نے اخبار جاری کیا، پھر جلسہ ہوا، سیتا ناتھ کو وظیفہ ملا۔ وہ ولایت پڑھنے گیا، پھر جشن ہوا، کامتاناتھ کے بڑے لڑکے کا یگیوت ہوا، خوب دھوم دھام ہوئی، پھول متی کے چہرے پر مسرّت کی خفیف سی جھلک بھی نظر نہ آئی۔ اُما ناتھ، ٹائیفائڈ میں مہینہ بھر بیمار رہے۔ دیاناتھ نے ایک مضمون لکھا اور دفعہ 144 میں چھ مہینے کے لیے جیل چلے گئے۔ اماناتھ نے ایک معاملہ میں رشوت لے کر غلط رپورٹ لکھی اور سال بھر کے لیے معطل کر دیے گئے۔ پر پھول متی کے چہرے پر رنج کی پرچھائیں تک نہ پڑی۔ اس کی زندگی میں کسی قسم کی دلچسپی، کوئی آرزو، کوئی فکر نہ تھی۔ بس چوپاؤں کی طرح کام کرنا اور کھانا یہی اس کی زندگی کے دو کام تھے۔ جانور مارنے سے کام کرتا ہے، مگر کھاتا ہے دل سے۔ وہ بے کہے کام کرتی تھی، مگر کھاتی تھی زہر کے نوالوں کی طرح۔ مہینوں سر میں تیل نہ پڑتا۔ مہینوں کپڑے نہ دھلتے کچھ پروا نہیں، اس میں احساس ہی گویا فنا ہو گیا تھا۔

ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ملیریا پھیل رہا تھا۔ آسمان پر مٹیالے بادل، زمین پر مٹیالا پانی، نم ہوا سینوں میں بلغم اور کف بھرتی پھرتی تھی۔ مہری اور کہارن دونوں بیمار پڑ گئے۔ پھول متی نے گھر کے سارے برتن مانجھے۔ پانی میں بھیگ بھیگ کر سارا کام کیا۔ آگ جلائی، پتیلیاں چڑھا دیں اور گنگا سے پانی لانے چلی۔ کامتا ناتھ روزانہ گنگا جل پیتے تھے نل کا پانی انھیں موافق نہ تھا۔

کامتا ناتھ نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ ''رہنے دو اماں، میں پانی بھر لاؤں گا، کہار اور مہری آج دونوں غائب ہیں''۔

پھول متی نے مٹیالے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تم بھیگ جاؤ گے بیٹا، سردی ہو جائے گی''۔

''تم بھیگ رہی ہو، کہیں بیمار نہ پڑ جاؤ''۔

''میں بیمار نہیں پڑوں گی۔ مجھے بھگوان نے امر کر دیا ہے''۔

اماناتھ بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے مطب میں کچھ نفع نہ ہوتا تھا، اس لیے بہت پریشان رہتا تھا۔ ''جانے بھی دو بھیا۔ بہت دنوں بہوؤں پر حکومت کر چکی ہے اس کا خمیازہ اٹھانے دو''۔

گنگا بڑھی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا سمندر ہے۔ افق پانی کے ساحل سے ملا ہوا تھا۔ کنارے کے درختوں کی صرف پھُنگیاں پانی کے اوپر نظر آتی تھیں۔ پھول متی کلسا لیے ہوئے سیڑھیوں کے نیچے اُتری، پاؤں پھسلا، سنبھل نہ سکی پانی میں گر پڑی۔ پل بھر ہاتھ پاؤں چلائے۔ پھر لہریں اُسے نیچے کھینچ لے گئیں۔ کنارے پر دو چار بنڈے چلاّئے۔ ''ارے بڑھیا ڈوبی جاتی ہے''۔ دو چار آدمی دوڑے بھی لیکن پھول متی لہروں میں سما گئی تھی۔ ان بل کھاتی ہوئی لہروں میں جنھیں دیکھ کر ہی انسان سہم اٹھتا تھا۔ ایک نے پوچھا۔ ''یہ کون بڑھیا تھی''۔

''ارے وہی پنڈت اجودھیاناتھ کی بیوہ ہے''۔

''اجودھیا ناتھ تو بہت بڑے آدمی تھے''۔

''ہاں اس کی تقدیر میں ٹھوکر کھانا لکھا تھا''۔

''اس کے تو کئی لڑکے بڑے بڑے ہیں اور سب کماتے ہیں''۔

''ہاں سب ہیں بھائی، مگر تقدیر بھی تو کوئی چیز ہے''۔

(یہ افسانہ پہلی بار الہ آباد کے ہندی ماہنامہ 'چاند' کے نومبر 1932 کے شمارے میں شائع ہوا۔ 'مان سرووَر' 7 میں شامل ہے۔ اردو میں یہ 'زادِ راہ' میں شامل ہے۔)

کاریہ

یووک کا نام کیشو تھا، یووتی کا نام پریما۔ دونوں ایک ہی کالج کے اور ایک ہی
کلاس کے وِدّیارتھی تھے۔ کیشو نئے وِچاروں کا یووک تھا، ذات پات کے بندھنوں کا
وِرودھی، پریما پرانے سنسکاروں کی قائل تھی۔ پُرانی مریاداؤں اور پرتھاؤں میں پورا وِشواس
رکھنے والی، لیکن پھر بھی دونوں میں گاڑھا پریم ہو گیا تھا اور یہ بات سارے کالج میں
مشہور تھی۔ کیشو برہمن ہوکر بھی ویشیہ کنّیا پریما سے وِواہ کر کے اپنا جیون سارتھک کرنا چاہتا
تھا۔ اُسے اپنے ماتا پتا کی پرواہ نہ تھی کل مَریادا کا وِچار بھی اسے سوانگ سا لگتا تھا۔
اس کے لیے ستّیہ کوئی وَستو تھی، تو پریم تھی کِنتو پریما کے لیے ماتاپتا اور کل پریوار کے
آدیش کے وِرُدھ ایک قدم بڑھانا بھی اسمبھو تھا۔

سندھیا کا سمے ہے۔ وِکٹوریا پارک کے ایک نرجن استھان میں دونوں آمنے سامنے
ہریالی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ سیر کرنے والے ایک ایک کر کے وِداع ہو گئے، کِنتو یہ دونوں
ابھی وہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک ایسا پرسنگ چھڑا ہوا ہے جو کسی طرح سماپت
نہیں ہوتا۔

کیشو نے جھنجھلا کر کہا۔ اس کا یہ ارتھ ہے کہ تمھیں میری پرواہ نہیں ہے؟

پریما نے اس کو شانت کرنے کی چیشٹا کر کے کہا۔ تم میرے ساتھ انیائے کر رہے
ہو کیشو۔ لیکن میں اس وِشے کو ماتا پتا کے سامنے کیسے چھیڑوں، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا
ہے۔ وِے لوگ پُرانی رُوڑھیوں کے بھکت ہیں۔ میری طرف سے کوئی ایسی بات سن کر
من میں جو جو شنکائیں ہوں گی، ان کی کلپنا تم کر سکتے ہو؟

کیشو نے اُگر بھاؤ سے پوچھا۔ تو تم بھی انھیں پرانی رُوڑھیوں کی غلام ہو؟

پریما نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں مرِدُو۔ سنیہہ بھر کر کہا۔ نہیں میں ان کی غلام
نہیں ہوں، لیکن ماتا پتا کی اِچھا میرے لیے اور سب چیزوں سے ادھیک مانیہ ہے۔

'تمھارا ویکتتو کچھ نہیں ہے؟'

'ایسا ہی سمجھ لو'

'میں تو سمجھتا تھا کہ یہ ڈھکوسلے مورکھوں کے لیے ہی ہیں، لیکن اب معلوم ہوا کہ تم جیسی وِدُشیاں بھی ان کی پوجا کرتی ہیں۔ جب میں تمھارے سنسار کو چھوڑنے پر تیار ہوں تو تم سے بھی یہی آشا کرتا ہوں۔

پریما نے من میں سوچا، میرا اپنی دیہہ پر کیا ادھیکار ہے جن ماتاپتا نے اپنے رکت سے میری سرِشٹی کی ہے اور اپنے سینہہ سے اسے پالا ہے، ان کی مرضی کے خلاف کام کرنے کا اسے کوئی حق نہیں۔

اس نے دینتا کے ساتھ کیشو سے کہا۔ کیا پریم استری اور پُرش کے روپ ہی میں رہ سکتا ہے میتری کے روپ میں نہیں؟ میں تو آتما کا بندھن سمجھتی ہوں۔ کیشو نے کٹھور بھاؤ سے کہا۔ ان دارشنک وِچاروں سے تم مجھے پاگل کردوگی، پریما۔ بس، اتنا ہی سمجھ لو میں نِراش ہوکر زندہ نہیں رہ سکتا، میں پرتیکش وادی ہوں، اور کلپناؤں کے سنسار میں پرتیکش کا آنند اُٹھانا میرے لیے اسمبھو ہے۔

یہ کہہ کر اس نے پریما کا ہاتھ پکڑ کر اپنی اور کھینچنے کی چیشٹا کی پریما نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور بولی نہیں کیشو میں کہہ چکی ہوں کہ میں سوتنتر (آزاد) نہیں ہوں۔ تم مجھ سے وہ چیز نہ مانگو، جس پر میرا کوئی ادھیکار نہیں ہے۔

کیشو کو اگر پریما نے کٹھور شبد کہے ہوتے تو بھی اسے اتنا دُکھ نہ ہوا ہوتا۔ ایک چھن (لمحہ) تو وہ من مارے بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر نراشا بھرے سور میں بولا۔ جیسی تمھاری اِچھا! آہستہ آہستہ قدم سا اُٹھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ پریما اب بھی وہیں بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔

(2)

رات کو بھوجن کرکے پریما جب اپنی ماں کے ساتھ لیٹی ،تو اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ کیشو نے اس سے ایک ایسی بات کہہ دی تھی۔ جو چنچل پانی میں پڑنے والی چھایا کی طرح اس کے دل پر چھائی ہوئی تھی۔ پرتی چھن اس کا روپ بدلتا تھا۔ وہ اسے استھر

نہ کر سکتی تھی۔ ماتا سے اس وِشے میں کچھ کہے تو کیسے؟ لجا منہ بند کر دیتی تھی۔ اس نے سوچا، اگر کیشو کے ساتھ میرا وِواہ نہ ہوا تو اس سے میرا کیا کرتویہ ہوگا۔ اگر کیشو نے کچھ اُدّنڈتا کر ڈالی تو میرے لیے سنسار میں پھر کیارہ جائے گا، لیکن میرا بس ہی کیا ہے۔ ان بھانتی بھانتی کے وِچاروں میں ایک بات جو اس کے من میں نِشچت ہوئی ،وہ یہ تھی کہ کیشو کے سوا وہ کسی اور سے وِواہ نہ کرے گی۔

اُس کی ماتا نے پوچھا۔ کیا تجھے اب تک نیند نہ آئی؟ میں نے تجھ سے کتنی بار کہا کہ تھوڑا بہت گھر کا کام کاج کیا کر لیکن تجھے کتابوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ چار دِن میں تو پرائے گھر جائے گی، کون جانے کیسا گھر ملے۔ اگر کچھ کام کرنے کی عادت نہ رہی، تو کیسے نباہ ہوگا؟

پریما نے بھولے پن سے کہا۔ میں پرائے گھر جاؤں گی ہی کیوں؟

ماتا نے مسکرا کر کہا۔ لڑکیوں کے لیے یہی تو سب سے بڑی وِپتی ہے، بیٹی۔ ماں باپ کی گود میں پل کر جیوں ہی سیانی ہوئی، دوسروں کی ہوجاتی ہے۔ اگر اچھے پرانی ملے، تو جیون آرام سے کٹ گیا، نہیں رُورُو کر دن کاٹنا پڑا۔ سب کچھ بھاگیہ کے ادھین ہے۔ اپنی برادری میں تو مجھے کوئی گھر نہیں بھاتا۔ کہیں لڑکیوں کا آدر نہیں، لیکن کرنا تو برادری میں ہی پڑے گا۔ نہ جانے یہ ذات پات کا بندھن کب ٹوٹے گا؟

پریما ڈرتے ڈرتے بولی۔ کہیں کہیں تو برادری کے باہر بھی وِواہ ہونے لگے ہیں۔

اس نے کہنے کو کہہ دیا، لیکن اس کا ہردے کانپ رہاتھا کہ ماتا جی کچھ بھانپ نہ جائیں۔

ماتا نے وسمے کے ساتھ پوچھا۔ کیا ہندوؤں میں ایسا ہواہے!

پھر اس نے آپ ہی آپ اس پرشن کا جواب بھی دیا۔

اور دوچار جگہ ایسا ہو بھی گیا، تو اس سے کیا ہوتا ہے؟

پریما نے اس کا کچھ جواب نہ دیا، بھئے ہوا کہ ماتا کہیں اس کا آشئے سمجھ نہ جائیں۔ اس کا بھوِشیہ ایک اندھیری کھائی کی طرح اس کے سامنے منھ کھولے کھڑا تھا۔ مانو اسے نگل جائے گا۔

اسے نہ جانے کب نیند آگئی۔

(3)

پراتہ کال پریما سو کر اُٹھی ،تو اس کے من میں ایک وِچتر ساہس کا اُدیہ ہوگیا تھا۔ سبھی مہتو پورن فیصلے ہم آکسِمِک (اتفاقی) رُوپ سے کرلیا کرتے ہیں، مانو کوئی دَیوی شکتی ہمیں ان کی اور کھینچ لے جاتی ہے، وہی حالت پریما کی تھی۔ کل تک وہ ماتا پِتا کے نرنے کو مانیہ سمجھتی تھی۔ پرسنکٹ کو سامنے دیکھ کر اس میں اس وایُو کی ہمت پیدا ہوگئی تھی ،جس کے سامنے کوئی پَروَت آگیا ہو وہی مند وایُو پربل ویگ سے پَروَت کے مستک پر چڑھ جاتی ہے اور اُسے کچلتی ہوئی دوسری طرف جا پہنچتی ہے۔ پریما من میں سوچ رہی تھی مانو، یہ دیہہ ماتا پِتا کی ہے۔ کنتو آتما تو میری ہے۔ میری آتما کو جو کچھ بھگتنا پڑے گا، وہ اسی دیہہ سے تو بھگتنا پڑے گا۔ اب وہ اس وِشے میں سنکوچ کرنا انوچت ہی نہیں، گھاتک سمجھ رہی تھی۔ اپنے جیون کو کیوں ایک جھوٹے سّمان پر بلیدان کرے؟ اس نے سوچا، وِواہ کا آدھار اگر پریم نہ ہو تو وہ دیہہ کا وکرِے ہے۔ آتم سمرپن کیا بنا پریم کے بھی ہوسکتا ہے؟ اس کلپنا ہی سے کہ نہ جانے کس اِپرِیچت یوُک سے اس کا وِواہ ہوجائے گا۔ اس کا ہرڈے وِدّروہ کر اٹھا۔

وہ ابھی ناشتہ کرکے کچھ پڑھنے جارہی تھی کہ اس کے پِتا نے پیار سے پُکارا۔ میں کل تمھارے پرنسپل کے پاس گیا تھا، وے تمھاری بڑی تعریف کررہے تھے۔

پریما نے سرل بھاؤ سے کہا۔ آپ تو یوں ہی کہا کرتے ہیں۔

'نہیں سچ'

یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنے میز کی دراز کھولی اور مخملی چوکھٹوں میں جڑی ہوئی ایک تصویر نکال کراسے دکھاتے ہوئے بولے ۔یہ لڑکا آئی۔ سی۔ایس کے امتحان میں پرتھم آیا ہے۔اس کا نام تم نے سنا ہوگا؟

بوڑھے پِتا نے ایسی بھومِکا (تمہید) باندھ دی تھی کہ ماں اُن کا آشے نہ سمجھ سکی لیکن پریما بھانپ گئی۔ اس کا من تیر کی بھانتی لکشیہ پر جا پہنچا۔ اس نے بنا تصویر کی اُور دیکھے ہی کہا۔نہیں، میں نے تو اس کا نام نہیں سنا۔ پِتا نے بناوٹی آشچریہ سے کہا۔ کیا! تم نے اس کا نام ہی نہیں سنا؟ آج کے دینک پتر میں اس کا چتر اور جیون وِرتانت چھپاہے۔

پریما نے رکھائی سے جواب دیا۔ ہوگا، مگر میں تو اس پریکشا کا کوئی مہتو نہیں سمجھتی۔ میں تو سمجھتی ہوں، جو لوگ اس پریکشا میں بیٹھتے ہیں، وے پلّے سرے کے سوارتھی ہوتے ہیں۔ آخر اُن کا اُدّیشیہ اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے کہ اپنے غریب نِردَھن، دلت بھائیوں پر شاسن کریں اور خوب دھن سنچے کریں۔ یہ تو جیون کا کوئی اونچا اُدّیشیہ نہیں ہے۔

اس آپتی میں جلن تھی، انیائے تھا، نردیتا تھی، پتا جی نے سمجھا تھا، پریما یہ بکھان سن کر لٹو ہو جائے گی۔ یہ جواب سن کر تیکھے سوِر میں بولے۔ تو تو ایسی باتیں کر رہی ہے۔ جیسے تیرے لیے دھن اور ادھیکار کا کوئی مولیہ ہی نہیں۔ پریما نے ڈھٹائی سے کہا۔ ہاں، میں تو اس کا مولیہ نہیں سمجھتی۔ میں تو آدمی کا تیاگ دیکھتی ہوں۔ میں ایسے یووکوں کو جانتی ہوں، جنھیں یہ پد زبردستی بھی دیا جائے، تو سویکار نہ کریں گے۔

پتا نے اُپہاس کے ڈھنگ سے کہا۔ یہ تو آج میں نے نئی بات سنی۔ میں تو دیکھتا ہوں کہ چھوٹی چھوٹی نوکریوں کے لیے لوگ مارے مارے پھرتے ہیں۔ میں ذرا اُس لڑکے کی صورت دیکھنا چاہتا ہوں، جس میں اتنا تیاگ ہو۔ میں تو اس کی پوجا کروں گا۔

شاید کسی دُوسرے اوسر پر یہ شبد سُن کر پریما لجا سے سر جھکا لیتی، پر اس سمے اس کی دشا اس سپاہی کی سی تھی۔ جس کے پیچھے گہری کھائی ہو۔ آگے بڑھنے کے سِوا، اس کے لیے اور کوئی مارگ نہ تھا۔ اپنے آویش کو سنیم سے دباتی ہوئی آنکھوں میں وِدروہ بھرے، وہ اپنے کمرے میں گئی، اور کیشو کے کئی چتروں میں سے وہ ایک چتر چن کر لائی، جو اس کی نگاہ میں سب سے خراب تھا، اور پتا کے سامنے رکھ دیا۔ بوڑھے پتا جی نے چتر کو اُپیکشا کے بھاؤ سے دیکھنا چاہا، لیکن پہلی دِرشٹی ہی میں اس نے انھیں آکرشت کر لیا۔ اونچا قد تھا اور دُربل ہونے پر بھی اس کا سواستھیہ اور سنیم کا پریچیہ دے رہا تھا، مُکھ پر پرتبھا کا تیج نہ تھا، پر وچارشیلتا کا کچھ ایسا پرتی بمب تھا جو اس کے من میں وشواس پیدا کرتا تھا۔

انھوں نے اس چتر کی اُور دیکھتے ہوئے پوچھا، یہ کس کا چتر ہے؟

پریما نے سنکوچ سے سر جھکا کر کہا۔ یہ میرے ہی کلاس میں پڑھتے ہیں۔

اپنی ہی برادری کا ہے؟

پریما کی مُکھ مُدرا دھومل ہوگئی۔ اسی پرشن کے اُتّر پر اس کی قسمت کا فیصلہ ہو

جائے گا۔ اس کے من میں پچھتاوا ہوا کہ ویرتھ میں اس چتر کو یہاں لائی ۔ اس میں ایک چھن (لمحہ) کے لیے، جو درڑھتا آئی تھی، وہ اس پینے پرشن کے سامنے کاتر ہو اٹھی۔ دبی ہوئی آواز میں بولی۔ جی نہیں، وہ برہمن ہے اور یہ کہنے کے ساتھ ہی چھبدھ ہوکر کمرے سے باہر نکل گئی، مانو یہاں کی وایو میں اس کا گلا گھٹا جا رہا ہو اور دیوار کی آڑ میں ہو کر رونے لگی۔

لالا جی کو تو پہلے ایسا کرودھ آیا کہ پریما کو بُلا کر صاف صاف کہہ دیں کہ یہ اسمبھو ہے۔ وے اسی غصے میں دروازے تک آئے لیکن پریما کو روتے دیکھ کر نرم ہوگئے۔ اس یووک کے پرتی پریما کے من میں کیا بھاؤ تھے، یہ ان سے چھپا نہ رہا۔ وے استری شکچھا کے پورے سمرتھک تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی وے کُل مریادا کی رکچھا بھی کرنا چاہتے تھے۔ اپنی ہی ذاتِ کے سویوگیہ ور کے لیے اپنا سروسو ارپن کرسکتے تھے، لیکن اس چھیتر کے باہر 'کولین سے کولین' اور یوگیہ سے یوگیہ ور کی کلپنا بھی ان کے لیے اسہیہ (ناقابلِ برداشت) تھی۔ اس سے بڑا اپمان وے سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔

انھوں نے کٹھور سور میں کہا۔ آج سے کالج جانا بند کردو، اگر شکچھا کُل مریادا کو ڈبونا ہی سکھاتی ہے تو کُ شکچھا ہے۔ پریما نے کاتر کنٹھ سے کہا۔ پریکشا تو سمیپ آگئی ہے۔

لالا جی نے درڑھتا سے کہا۔ آنے دو۔

اور پھر اپنے کمرے میں جاکر وِچاروں میں ڈوب گئے ۔

(4)

چھ مہینے گذر گئے۔

لالا جی نے گھر میں آکر پتنی کو ایکانت میں بُلایا اور بولے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، کیشو بہت ہی سُوشیل اور پرتبھا شالی یووک ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں پریما اس شوک میں گھُل گھُل کر پران دے دے گی۔ تم نے بھی سمجھایا، میں نے بھی سمجھایا، دوسروں نے بھی سمجھایا، پر اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسی دَشا میں ہمارے لیے اور کیا اُپائے ہے۔

ان کی پتنی نے چنتت بھاؤ سے کہا۔ کر تو دوگے، لیکن رہوگے کہاں؟ نہ جانے کہاں سے یہ کُلچھنی میری کوکھ میں آئی؟

لالاجی نے بھویں سکوڑ کر ترسکار کے ساتھ کہا۔ یہ تو ہزار دفعہ سن چکا، لیکن کُل مریادا کے نام کو کہاں تک روئے۔ چڑیا کا پر کھول کر یہ آشا کرنا کہ وہ تمھارے آنگن میں ہی پھدکتی رہے گی، بھرم ہے۔ میں نے اس پرشن پر ٹھنڈے دل سے وچار کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمیں اس آپدھرم کو سویکار کرلینا ہی چاہیے۔ کُل مریادا کے نام پر میں پریما کی ہتّیا نہیں کرسکتا۔ دنیا ہنستی ہے تو ہنسے، مگر وہ زمانہ بہت جلد آنے والا ہے، جب یہ سبھی بندھن ٹوٹ جائیں گے۔ آج بھی سیکڑوں وِواہ ذات پات کے بندھنوں کو توڑ کر ہوچکے ہیں۔ اگر وِواہ کا اُدّیشیہ استری اور پُرش کا سکھی جیون ہے، تو ہم پریما کی اُپیکشا نہیں کر سکتے ہیں۔

وِردّھا نے چھبدھ ہو کر کہا۔ جب تمھاری یہی اِچھا ہے ،تو مجھ سے کیا پوچھتے ہیں؟ لیکن میں کہے دیتی ہوں، میں اس وِواہ کے نزدیک نہ جاؤں گی، نہ کبھی اس چھوکری کا منھ دیکھوں گی، سمجھ لوں گی، جیسے اور سب لڑکے مرگئے یہ بھی مرگئی۔

'تو پھر آخر تم کیا کرنے کو کہتی ہو؟'

'کیوں نہیں اس لڑکے سے وِواہ کردیتے، اس میں کیا برائی ہے؟ وہ دوسال میں سِول سروس پاس کرکے آجائے گا۔ کیشو کے پاس کیا رکھا ہے، بہت ہوگا کسی دفتر میں کلرک ہوجائے گا۔'

'اوراگر پریما پران ہتّیا کرلے تو؟'

تو کرلے، تم تو اُسے اور شہ دیتے ہو؟ جب اُسے ہماری پرواہ نہیں ہے تو ہم اس کے لیے اپنے نام کو کیوں کلنکت کریں؟ پران ہتّیا کرنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ یہ سب دھمکی ہے۔ من گھوڑاہے، جب تک اُسے لگام نہ دو، پُٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دے گا۔ جب اس کے من کا یہ حال ہے تو کون کہے، کیشو کے ساتھ ہی زندگی بھر نباہ کرے گی۔ جس طرح آج اس سے پریم ہے،اُسی طرح کل دوسرے سے ہو سکتا ہے۔ تو کیا پتّے پر اپنا مانس بکوانا چاہتے ہو۔؟

لالاجی نے استری کو پرشن سوچک درِشٹِ سے دیکھ کر کہا اور اگر وہ کل خود جاکر کیشو سے وِواہ کرلے توتم کیاکرلوگی؟ پھر تمھاری کتنی عزت رہ جائے گی۔ وہ چاہے سنکوچ

وَش یا ہم لوگوں کے لحاظ سے یوں ہی بیٹھی رہے، پر یَدی ضد پر کمر باندھ لیں ہم تم کچھ نہیں کر سکتے۔

اس سمّسیا کا ایسا بھیشن انت بھی ہوسکتا ہے، یہ اس وِردّھا کے دھیان میں بھی نہ آیا تھا۔ یہ پرشن بم کے گولے کی طرح اس کے مستک پر گرا۔ ایک چھن (لمحہ) تک وہ اَواک بیٹھی رہ گئی، مانو اس آگھات نے اس کی بدھی کی دھجیاں اُڑادی ہوں۔ پھر پرابھوت ہوکر بولی۔تمھیں انوکھی ہی کلپنائیں سوجھتی ہیں، میں نے تو آج تک کبھی بھی نہیں سنا کہ کسی کولین کنّیا نے اپنی اِچھا سے وِواہ کیا ہے۔'

'تم نے نہ سنا ہو، لیکن میں نے سنا ہے، اور دیکھا ہے اور ایسا ہونا بہت سمبھو ہے۔'

جس دن ایسا ہوگا اُس دن تم مجھے جیتی نہ دیکھوگے۔'

'میں یہ نہیں کہتا کہ ایسا ہو گا ہی ،لیکن ہونا سمبھو ہے۔'

'توجب ایسا ہونا ہے تو اس سے تو یہی اچھا ہے کہ ہمیں اس کا پربندھ کریں۔ جب ناک ہی کٹ رہی ہے تو تیز چھری سے کیوں نہ کٹے۔ کل کیشو کو بلا کر دیکھو کیا کہتا ہے۔

(5)

کیشو کے پِتا سرکاری پینشنر تھے۔ مزاج کے چڑ چڑے اور کرِپن۔ دھرم کے آڈمبروں میں ہی ان کے چِت کو شانتی ملتی تھی۔ کلپنا شکتی کا آبھاوَ تھا۔ کسی کے منوبھاوَوں کا سَمّان نہ کرسکتے تھے۔ وے اب بھی اس سنسار میں رہتے تھے جس میں انھوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے دن کاٹے تھے۔ نویُگ کی بڑھتی ہوئی لہر کو وے سروناش کہتے تھے، اور کم سے کم اپنے گھر کو دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں کا زور لگا کراس سے بچائے رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے جب ایک دن پریما کے پِتا اس کے پاس پہنچے اور کیشو سے پریما کے وِواہ کا پرستاوَ کیا تو بوڑھے پنڈت جی اپنے آپ میں نہ رہ سکے۔ دُھندلی آنکھیں پھاڑ کر بولے۔ آپ بھنگ تو نہیں کھاگئے ہیں؟ اس طرح کا سمبندھ اور چاہے جو کچھ ہو، وِواہ نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے، آپ کو بھی نئے زمانے کی ہوا لگ گئی ہے۔

بوڑھے بابو جی نے نمرتا سے کہا ۔میں خود ایسا سمبندھ نہیں پسند کرتا۔ اس وِشے میں میرے بھی وہی وِچار ہے، جو آپ کے، پر بات ایسی آپڑی ہے کہ مجھے وِوش ہوکر آپ کی سیوا میں آنا پڑا۔ آج کل کے لڑکے اور لڑکیاں کتنے سوتچھا چاری ہوگئے ہیں، یہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ ہم بوڑھے لوگوں کے لیے اب اپنے سدھانتوں کی رکچھا کرنا کٹھن ہو گیا ہے۔ مجھے بھے ہے کہ کہیں یہ دونوں نراش ہوکر اپنی جان پر نہ کھیل جائیں۔

بوڑھے پنڈت جی زمین پر پاؤں پٹکتے ہوئے گرج اُٹھے۔ آپ کیا کہتے ہیں، صاحب! آپ کو شرم نہیں آتی؟ ہم برہمن ہیں اور برہمنوں میں کولین۔ برہمن کتنے ہی پَتِت ہو گئے ہوں۔ اتنے مریادا شونیہ نہیں ہوئے ہیں کہ بنیئے بکال کی لڑکی سے وِواہ کرتے پھریں، جس دن کولین برہمنوں میں لڑکیاں نہ رہیں گی، اس دن یہ سمّسیا اُپستھِت ہوسکتی ہے۔ میں کہتا ہوں۔ آپ کو مجھ سے یہ بات کہنے کا ساہس کیسے ہوا؟

بوڑھے بابو جی جتنا دبتے تھے، اتنا ہی پنڈت جی بگڑتے تھے۔ یہاں تک کہ لالا جی اپنا اپمان زیادہ نہ سہہ سکے اور اپنی تقدیر کو کوستے ہوئے چلے گئے۔

اسی وقت کیشو کالج سے آیا۔ پنڈت جی نے ترنت اسے بلاکر کٹھور کنٹھ سے کہا۔ میں نے سنا ہے تم نے کسی بنیئے کی لڑکی سے اپنا وِواہ کرلیا ہے۔ یہ خبر کہاں تک سہی ہے؟

کیشو نے انجان بن کر پوچھا۔ آپ سے کس نے کہا ؟

کسی نے کہا، میں پوچھتا ہوں، یہ بات ٹھیک ہے ، یا نہیں ؟

اگر ٹھیک ہے اور تم نے اپنی مریادا کو ڈبانا نشچے کرلیا ہے تو تمھارے لیے ہمارے گھر میں کوئی استھان نہیں۔ تمھیں میری کمائی پر ایک دِھیلا بھی نہیں ملتا۔میرے پاس جو کچھ ہے وہ میری اپنی کمائی ہے، مجھے اختیار ہے کہ میں اُسے جسے چاہوں، دے دوں۔ تم یہ انیتی کرکے میرے گھر میں قدم نہیں رکھ سکتے۔

کیشو پِتا کے سوبھاؤ سے پرچت تھا۔ پریما سے اسے پریم تھا۔ وہ گپت روپ سے پریما سے وِواہ کرلینا چاہتا تھا۔ باپ ہمیشہ تو بیٹھے نہ رہیں گے۔ ماتا کے سنیہہ پر اسے وشواس تھا۔ اس پریم کی ترنگ میں وہ سارے کشٹوں کو جھیلنے کے لیے تیار معلوم ہوتا تھا، لیکن جیسے کوئی سپاہی بندوق کے سامنے جاکر ہمّت کھو بیٹھتا ہے اور قدم پیچھے ہٹا لیتا ہے، وہی دشا کیشو کی ہوئی۔ وہ سادھارن یووکوں کی طرح سدّھانتوں کے لیے بڑے

بڑے ترک کر سکتا تھا۔ زبان سے ان میں اپنی بھکتی کی دُہائی دے سکتا تھا، لیکن اس کے لیے یاتنائیں جھیلنے کی سامرتھیہ (طاقت) اس میں نہ تھی۔ اگر وہ اپنی ضد پر اڑا اور پتا نے بھی اپنی ٹیک رکھی تو اس کا کہاں ٹھکانا لگے گا؟ اس کا جیون ہی نشٹ ہوجائے گا۔

اس نے دبی زبان سے کہا، جس نے آپ سے یہ کہا ہے، بالکل جھوٹ کہا ہے۔

پنڈت جی نے تیور نیتروں سے دیکھ کر کہا، تو یہ خبر بالکل غلط ہے؟

جی ہاں بالکل غلط،

تو تم آج ہی اسی وقت بنیے کو خط لکھ دو اور یاد رکھو کہ اگر اس طرح کی چرچا پھر کبھی اُٹھی ،توتمھارا سب سے بڑا شترو ہوؤں گا۔بس جاؤ۔

کیشو اور کچھ نہ کہہ سکا ۔وہ یہاں سے چلا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیروں میں دم نہیں ہے۔

(6)

دوسرے دن پریمانے کیشو کے نام یہ پتر لکھا ۔

'پریہ کیشو !'

تمھارے پوجیہ پتاجی نے لالاجی کے ساتھ جو اشِشٹ اور اپمان جنک وِیوہار کیا ہے، اس کا حال سن کر میرے من میں بڑی شنکا اُتپن ہو رہی ہے۔ شاید انھوں نے تمھیں بھی ڈانٹ پھٹکار بتائی ہوگی۔ ایسی دشا میں مَیں تمھارا نشچے سننے کے لیے وِکل ہورہی ہوں ۔تمھارے ساتھ ہر طرح کا کشٹ جھیلنے کو تیار ہوں۔ مجھے تمھارے پتاجی کی سمّپتی کا موہ نہیں ہے۔ میں تو کیول تمھارا پریم چاہتی ہوں اور اسی میں پرسّن ہوں۔ آج شام کو یہیں آکر بھوجن کرو۔ دادا اور ماں دونوں تم سے ملنے کے لیے بہت اِچھک ہیں۔ میں وہ سوپن دیکھنے میں مگن ہوں جب ہم دونوں اس سوتر میں بندھ جائیں گے، جو ٹوٹنا نہیں جانتا۔ جو بڑی سے بڑی آپتّی میں بھی اٹوٹ رہتا ہے۔

تمھاری

پریما!

سندھیا ہوگئی اور اس پتر کا کوئی جواب نہ آیا۔اس کی ماتا بار بار پوچھتی تھی، کیشو

آئے نہیں؟ بوڑھے لالا جی بھی دُوار کی اُور آنکھیں لگائے بیٹھے تھے۔ یہاں تک کہ رات کے نو بج گئے۔ پر نہ تو کیشو ہی آئے اور نہ ان کا پتر۔

پریما کے من میں بھانتی بھانتی کے سنکلپ وِکلپ اُٹھ رہے تھے۔ کداچت انھیں پتر لکھنے کا اوکاش نہ ملا ہوگا، یا آج آنے کی فرصت نہ ملی ہوگی۔ کل اَوشیہ آجائیں گے۔ کیشو نے اس کے پاس جو پریم پتر لکھے تھے۔ ان سب کو اس نے پھر پڑھا، ان کے ایک ایک شبدوں سے کتنا انوراگ ٹپک رہاتھا۔ ان میں کتنا کمپن تھا، کتنی وِکلتا کتنی تیّز آکانکشا۔ پھر اسے کیشو کے وے واکیہ یاد آئے جو اس نے سیکڑوں ہی بار کہے تھے۔ کتنی بار وہ اس کے سامنے رویا تھا۔ اتنے پرمانوں کے ہوتے ہوئے نراشا کے لیے کہاں استھان تھا،مگر پھر بھی ساری رات اس کا من جیسے سولی پر ٹنگا رہا۔

پراتہ کال کیشو کا جواب آیا۔ پریما نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پتر لے کر پڑھا۔ پتر ہاتھ سے گرگیا۔ایسا جان پڑا، مانو اس کی دیہہ کا رکت ستھر ہو گیا ہو۔لکھا تھا۔

'میں بڑے سنکٹ میں ہوں کہ تمھیں کیا جواب دوں۔ میں نے اِدھر اس سمسّیا پر خوب ٹھنڈے دل سے وِچار کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ورتمان دشاؤں میں میرے لیے پِتا کی آگیا کی اُپیکشا کرنا دُسہہ (ناقابل برداشت) ہے۔ مجھے کایر نہ سمجھنا۔ میں سوارتھی بھی نہیں ہوں لیکن میرے سامنے جوبادھائیں ہیں، ان پر وِجے پانے کی شکتی مجھ میں نہیں ہے۔پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔ اس سمے میں نے ان بادھاؤں کی کلپنا نہ کی تھی۔'

پریما نے ایک لمبی، گہری، جلتی ہوئی سانس کھینچی اور اس خط کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ اُس کی آنکھوں سے اشرودھار بہنے لگی۔ جس کیشو کو اس نے اپنے انتہ کرن سے ورلیا تھا۔ وہ اتنا نِشٹھُر ہوجائے گا۔ اس کی اس کو رتّی بھر بھی آشا نہ تھی۔ ایسا معلوم پڑا مانو اب تک وہ کوئی سنہلا سوپن دیکھ رہی تھی؛ پر آنکھ کھلنے پر سب کچھ ادِرشیہ ہوگیا۔ جیون میں جب آشاہی لُپت ہوگئی،تو اب اندھیکار کے سوا اور کیا رہا۔ اپنے ہردَے کی ساری سمپّتی لگا کر اس نے ایک ناؤ لدوائی تھی، وہ ناؤ جل مگن ہوگئی۔ اب دوسری ناؤ کون کہاں سے لدوائے؛ اگر وہ ناؤ ٹوٹی ہے تواس کے ساتھ وہ بھی ڈوب جائے گی۔

ماتا نے پوچھا کیا کیشو کا پتر ہے؟

پریما نے بھومی کی اُور تاکتے ہوئے کہا۔ ہاں ان کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ اس کے سِوا اور کیا کہے؟ کیشو کی نشٹھرتا اور بے وفائی کا سماچار کہہ کر لجّت ہونے کا ساہس اس میں نہ تھا۔

دن بھر وہ گھر کے کام دھندوں میں لگی رہی، مانو اسے کوئی چنتا ہی نہیں ہے رات کو اس نے سب کو بھوجن کرایا، خود بھی بھوجن کیا اور بڑی دیر تک ہارمونیم پر گاتی رہی۔

مگر سویرا ہوا تو اُس کے کمرے میں اُس کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

پربھات کی سنہری کرنیں اس کے پیلے مُکھ کو جیون کی آبھا پردان کر رہی تھیں۔

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں 'وشال بھارت' جنوری 1933 میں شائع ہوا۔ 'مان سرور' حصہ 1 میں شامل ہے، اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔)

رنگیلے بابو

بابو رسِک لال کو میں اس وقت سے جانتا ہوں۔ جب وہ لا کالج میں پڑھتے تھے۔ میرے سامنے ہی وہ وکیل ہوئے اور آناً فاناً چمکے۔ دیکھتے دیکھتے بنگلا بن گیا، زمین خرید لی، موٹر رکھ لی اور شہر کے رئیسوں میں شمار ہونے لگے۔ لیکن مجھے نہ جانے کیوں ان کے رنگ ڈھنگ کچھ بہت جچتے نہ تھے۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتا کہ کوئی بھلا آدمی خواہ مخواہ ٹیڑھی ٹوپی لگا کر نکلے یا سرمہ لگا کر، مانگ نکال کر منھ کو پان سے پھلا کر، گلے میں موتیاں یا بیلے کے گجرے ڈالے، تنزیب کا چُنٹ دار کرتا اور مہین دھوتی پہنے بازار میں کوٹھوں کی اور تاک جھانک کرتا، ٹھٹھے مارتا نکلے۔ مجھے اس سے چڑھ ہو جاتی ہے۔ وہ میرے پاس میونسپل ممبری کے لیے اُوٹ مانگنے آئے تو کبھی نہ دوں۔ اس سے یارانہ نبھانا تو دور کی بات ہے۔ بھلے آدمی کو ذرا گمبھیر، ذرا سادگی پسند دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اگر کسی مقدمے میں وکیل کرنا پڑے تو میں ایسے آدمی کو کبھی نہ کروں، چاہے وہ راس بہاری گھوش ہی کا سا قانون داں کیوں نہ ہو۔ رسِک لال اسی طرح کے رنگیلے آدمی ہیں ان کی ترک شکتی اونچے درجے کی ہے۔ مانتاہوں جرح بھی اچھی کرتے ہیں، یہ بھی مجھے سویکار ہے، لیکن سیدھی ٹوپی لگانے اور سیدھی چال چلنے سے ان کی وکالت کچھ ٹھنڈی نہ پڑجائے گی۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ بانکپن چھوڑ کر بھلے آدمی بن جائیں تو ان کی پریکٹس دونی ہو سکتی ہے، لیکن اپنے کو کیا پڑی ہے کہ کسی کی باتوں میں دخل دے؟ جب کبھی ان کا سامنا ہوجاتا ہے تو میں دوسری اُور تاکنے لگتا ہوں یا کسی گلی میں ہو رہتا ہوں۔ میں سڑک پر ان سے باتیں کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ کیا ہوا وہ نامی وکیل ہیں اور میں بیچارہ اسکول ماسٹر ہوں؟ مجھے ان سے کسی طرح کا دویش نہیں۔ انھوں نے میرا کیا بگاڑا ہے جو میں ان سے جلوں۔ میری تو وہ بڑی عزت اور خاطر کرتے ہیں۔ اپنی لڑکی کی شادی میں میں ان سے دریاں اور دوسرے سامان مانگنے گیا تھا۔ انھوں نے دو ٹھیلے بھر دریاں، قالینیں، جازم،

چوکیاں، مسندیں بھیج دیں۔ نہیں، مجھے ان سے ذرا بھی دولیش نہیں۔ بہت دنوں کے پریچے کے ناطے مجھے ان سے سنیہہ ہے لیکن ان کا یہ بانکپن مجھے نہیں اچھا لگتا۔ وہ چلتے ہیں تو ایسا جان پڑتا ہے جیسے دنیا کو للکارتے چلتے ہوں۔ دیکھوں میرا کوئی کیا کر سکتا ہے؟ مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ ایک بار مجھے اسٹیشن پر مل گئے۔ لپک کر میرے کندھے پر ہاتھ ہی تو رکھ دیا۔ آپ تو ماسٹر صاحب کبھی نظر ہی نہیں آتے، کبھی بھلا سال میں ایک آدھ بار تو درشن دے دیا کیجیے۔ میں نے اپنا کندھا چھڑاتے ہوئے کہا، ''کیا کریں صاحب، اوکاش ہی نہیں ملتا'' بس آپ نے چٹ ایک بازاری شعر پڑھا۔

تمھیں غیروں سے کب فرصت
ہم اپنے غم سے کب خالی؟
چلو، بس ہو چکا ملنا
نہ تم خالی نہ ہم خالی

میں نے ہنس تو دیا جو آدمی اپنا لحاظ کرے، اس سے کوئی کیسے رکھائی کرے؟ پھر بڑے آدمیوں سے بگاڑ کرنا بھی نہیں چاہتا، نہ جانے کب اپنی غرض لے کر ان کے پاس جانا پڑے۔ لیکن مجھے ان کی یہ بے تکلفی کچھ اچھی نہ لگی۔ یوں میں نہ کوئی تپسوی ہوں، نہ زاہد۔ اَرَسِک ہونا اس بانکپن سے بھی برا ہے۔ شُشکِ جیون بھی کوئی جیون ہے، جس میں ونود کے لیے اَستھان نہ ہو؟ وَن کی شوبھا ہرے بھرے، سرس وِرکشوں سے ہے، سوکھے ہوئے ٹھونٹھوں سے نہیں، لیکن میں چاہتا ہوں، آدمی جو کچھ کرے چھپا کر کرے۔ شراب پینا چاہتے ہو، پیو، مگر پیو ایکانت میں۔ اس کی کیا ضرورت کہ شراب میں مست ہوکر بہکتے پھرو؟ روپ کے اُپاسک بننا چاہتے ہو، بنو، لیکن اس کی کیا ضرورت ہے کہ ویشیاؤں کو دائیں بائیں بیٹھائے موٹر میں اپنے چھیل پن کا ڈھنڈھورا پیٹتے پھرو؟ پھر رَسِکتا کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ جب لڑکے جوان ہوگئے۔ لڑکیوں کی شادی ہوگئی۔ بال پک چلے، تو میرے خیال میں آدمی کو کچھ گمبھیر ہوجانا چاہیے۔ آپ کا دل ابھی جوان ہے، بہت اچھی بات ہے۔ میں تمھیں اس پر بدھائی دیتا ہوں۔ واسنا کبھی بوڑھی نہیں ہوتی، میرا تو انوبھو ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ وہ بھی پروڑھ ہوتی جاتی ہے۔ لیکن اس عمر میں کللیلیں کرنا مجھے اوچھا پن معلوم ہوتا ہے۔ سینگ کٹا کر بچھڑا بننے والی منووِرتی کا میں

قائل نہیں۔ کوئی کسی کا کیا کر لے گا؟ لیکن چار بھلے آدمی انگلی اٹھائیں، ایسا کام کیوں کروں؟ تمھیں بھگوان نے سمپن بنایا ہے، بہت اچھی بات ہے، لیکن اپنی سمپتا کو اس وپن سنسار میں دکھاتے پھرنا، جو چھدھا سے بیاکل ہیں، ان کے سامنے رس گلّے اڑانا، اس میں نہ تو رسکتا ہے، نہ آدمیت۔

رسِک لال کی بڑی لڑکی کا وِواہ تھا۔ متھرا سے بارات آئی تھی۔ ایسے ٹھاٹھ کی بارات یہاں شاید ہی کبھی آئی ہو۔ بڑی دھرم شالا میں جن واسا تھا۔ وَر کا پِتا کسی ریاست کا دیوان تھا۔ میں بھی باراتیوں کی سیوا ستکار میں لگا ہوا تھا۔ ایک ہزار آدمی سے کم نہ تھے۔ اتنے آدمیوں کا ستکار کرنا ہنسی نہیں ہے۔ یہاں تو کسی بارات میں سو پچاس آدمی آجاتے ہیں تو ان کی بھی اچھی طرح خاطر نہیں ہو پاتی۔ پھر باراتیوں کے مزاج کا کیا کہنا۔ سبھی تانا شاہ بن جاتے ہیں۔ کوئی چمیلی کا تیل مانگتا ہے، کوئی آنولے کا۔ کوئی کیش رنجنا، کوئی شراب مانگتا ہے، کوئی افیم! صابن چاہیے، عطر چاہیے، ایک ہزار آدمیوں کے کھانے کا پربندھ کرنا کتنا کٹھن ہے۔ میں سمجھتا ہوں، بیس پچیس ہزار کے وارے نیارے ہوئے ہوں گے۔ لیکن رَسِک لال کے ماتھے پر شکن نہ آئی۔ وہی بانکپن تھا، وہی ونود، وہی بے فکری، نہ جھنجھلانا، نہ بگڑنا، باراتیوں کی اور سے ایسی ایسی بے ہودہ فرمائشیں ہوتی تھیں کہ ہمیں غصہ آجاتا تھا۔ پاؤ آدھ پاؤ بھنگ بہت ہے، یہ پسیری بھر بھنگ لے کر کیا اس کی دھونی دیں گے؟ جب سنیما کے ایک سو اول درجے کے ٹکٹوں کی فرمائش ہوئی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ رَسِک لال کو خوب ڈانٹ بتائی، اور اسی کرودھ میں جن واسے کی اُور چلا کہ ایک ایک کو پھٹکاروں۔ لڑکے کا بیاہ کرنے آئے ہیں یا کسی بھلے آدمی کی عزت بگاڑنے؟ ایک دن بغیر سنیما دیکھے نہیں رہا جاتا؟ ایسے ہی بڑے شوقین ہو تو جیب سے پیسے کیوں نہیں خرچ کرتے؟ لیکن رَسِک لال کھڑے ہنس رہے تھے۔ بھائی صاحب، کیوں اتنا بگڑ رہے ہو؟ یہ لوگ تمھارے مہمان ہیں، مہمان دس جوتے بھی لگائے تو برا نہ مانیے۔ یہ سب زندگی کے تماشے ہیں۔ تماشے میں ہم خوش ہونے جاتے ہیں۔ وہاں رونا بھی پڑے تو اس میں آنند ہے۔ لپک کر سنیما گھر سے سو ٹکٹ لا دیجیے۔ سو دو سو روپیے کا منھ نہ دیکھیے۔ میں نے من میں کہا، مفت کا دھن بوُرا ہے تو لٹاؤ اور نام لوٹو۔ یہ کوئی ستکار نہیں ہے کہ مہمان کی غلامی کی جائے۔ مہمان اسی وقت تک مہمان ہے، جب وہ

مہمان کی طرح رہے۔ جب وہ رعب جمانے لگے، بے عزتی کرنے پر آمادہ ہو جائے، تو وہ مہمان نہیں شیطان ہے۔

اس کے تین مہینے بعد سنا کہ رَسِک لال کا داماد مر گیا، وہی جس کی نئی شادی ہوئی تھی، ٹریول سروس کے لیے انگلینڈ گیا ہوا تھا۔ وہیں نیومونیا ہوگیا۔ یہ خبر سنتے ہی مجھے رومانچ ہو آیا۔ اس یووک کی صورت آنکھوں میں دوڑ گئی۔ کتنا سومیہ کتنا پرتبھاشالی لڑکا تھا اور مرا جاکر انگلینڈ میں کہ گھر والے دیکھ بھی نہ سکے اور اس لڑکی کی کیا دَشا ہوگی جس کا سروناش ہو گیا؟ ابھی ہاتھ کی مہندی بھی تو نہ چھوٹی تھی۔ چندری بھی تو ابھی میلی نہیں ہوئی۔ واہ رے دیالو بھگوان، اور واہ رے تمھاری لیلا۔ پرانیوں کی ہولی بنا کر اس کی لپٹوں کا تماشا دیکھتے ہو۔ اسی وقت بھاگا ہوا رسک لال کے پاس گیا اور ان کی صورت دیکھتے ہی من کی کچھ ایسی دَشا ہوئی کہ چنگھاڑ مار کر رو پڑا۔ رسک لال آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔ اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اوراسی اَستھر اُوچلت نردوند بھاؤ سے بولے، واہ ماسٹر صاحب، آپ نے تو بالکوں کو بھی مات کر دیا جن کی مٹھائی کوئی چھین کر کھا جائے تو رونے لگتے ہیں۔ بالک تو اس لیے روتا ہے کہ اس کے بدلے میں دوسری مٹھائی مل جائے۔ آپ تو ایسی چیز کے لیے رو رہے ہیں جو کسی طرح مل ہی نہیں سکتی۔ ارے صاحب، یہاں بے حیا بن کر رہیے۔ مار کھاتے جایئے اور مونچھوں پر تاؤ دیتے جایئے۔ مزہ تو تب ہے کہ جلاد کے پیروں تلے آکر بھی وہی اکڑ بنی رہے۔ اگر ایشور ہے، مجھے تو کچھ معلوم نہیں، لیکن سنتا ہوں کہ وہ دیالو ہے۔اور دیالو ایشور بھلا نردئی کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ کسے مارتا ہے کسے جلاتا ہے، ہم سے مطلب نہیں۔ اس کے کھلونے ہیں کھیلے یا توڑے، ہم کیوں اس کے بیچ میں دخل دیں، وہ ہمارا دشمن نہیں، نہ ظالم بادشاہ ہے کہ ہمیں ستا کر خوش ہو۔ میرا لڑکا گھر میں آگ بھی لگا دے تو میں اس کا دشمن نہ بنوں گا۔ میں نے تو اسے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ اس سے کیا دشمنی کروں؟ بھلا ایشور کبھی نردئی ہوسکتا ہے، جس کے پریم کا سوروپ یہ برہمانڈ ہے؟ اگر ایشور نہیں ہے، مجھے معلوم نہیں، اور کوئی ایسی شکتی ہے، جسے ہماری وپتی میں آنند ملتا ہے تو صاحب یہاں رونے والے نہیں۔ ہاتھوں میں طاقت ہوتی اور دشمن نظر آتا تو ہم بھی کچھ جواں مردی دکھاتے۔ اب اپنی بہادری دکھانے کا اس کے سوا اور کیا سادھن ہے کہ مار کھاتے جاؤ اور ہنستے جاؤ،

اکڑتے جاؤ، روئے تو اپنی ہار کو سویکار کریں گے۔ مار لے سالے، جتنا چاہے مار لے، لیکن ہنستے ہی رہیں گے۔ مکار بھی ہے، جادوگر بھی۔ چھپ کر وار کرتا ہے آ جائے سامنے تو دکھاؤں۔ ہمیں تو اپنے ان بے چارے شاعروں کی ادا پسند ہے جو قبر میں بھی معشوق کے پازیب کی جھنکار سن کر مست ہوتے رہتے ہیں۔

اس کے بعد رَسِک لال نے اردو شعروں کا تانتا باندھ دیا اور اس طرح تنمے ہوکر ان کا آنند اٹھانے لگے مانو کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ پھر بولے۔ ''لڑکی رو رہی ہے میں نے کہا، ایسے بے وفا کے لیے کیا رونا، جو تمھیں چھوڑ کر چل دیا۔ اگر اس سے پریم ہے تو رونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پریم تو آنند کی وستو ہے۔ اگر کہو، کیا کریں دل نہیں مانتا تو دل کو مناؤ۔ بس دکھی مت ہو، دکھی ہونا ایشور کا اپمان کرنا ہے، اور مانوتا کو کلنکِت کرنا۔''

میں رَسِک لال کا منھ تاکنے لگا۔ انھوں نے یہ کتھن کچھ ایسے اُداتّ بھاؤ سے کیا کہ ایک چھن کے لیے مجھ پر بھی اس نے جادو کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں وہاں سے چلا تو دل کا بوجھ بہت کچھ ہلکا ہوگیا تھا۔ من میں ایک پرکار کا ساہس اُدے ہو گیا تھا جو وپتی اور بادھا پر ہنس رہا تھا۔

(2)

تھوڑے دنوں کے بعد وہاں سے تبادلہ ہوگیا اور رَسِک لال جی کی کوئی خبر نہیں ملی۔ کوئی سال بھر کے بعد ایک دن گلابی لفافے پر سنہرے اکشروں میں چھپا ہوا ایک نمترن پتر ملا۔ رَسِک لال کے بڑے لڑکے کا وِواہ ہو رہا تھا۔ نوید کے نیچے قلم سے آگرہ کیا گیا تھا کہ اوشیہ آیئے، ورنہ مجھے آپ سے بڑی شکایت رہے گی۔ آدھا مزہ جاتا رہے گا۔ ایک اردو کا شعر بھی تھا۔

اس شوقِ فراواں کی یارب
آخر کوئی حد بھی ہے کہ نہیں
انکار کرے وہ یا وعدہ
ہم راستہ دیکھتے رہتے ہیں

ایک سپتاہ کا سمے تھا میں نے نئی ریشمی اَچکن بنوائی، نئے جوتے خریدے اور خوب بن ٹھن کر چلا۔ ودھو کے لیے ایک اچھی سی کاشمیری ساڑی لے لی۔ مہینوں ایک جگہ رہتے رہتے اور ایک ہی کام کرتے کرتے من کچھ کنٹھت سا ہوگیا تھا۔ تین چار دن خوب جلسے رہیں گے، گانے سنوں گا، دعوتیں اڑاؤں گا۔ من بے حال ہوجائے گا۔ ریل گاڑی سے اتر کر ویٹنگ روم میں گیا اور اپنا نیا سوٹ پہنا۔ بہت دنوں بعد نیا سوٹ پہننے کی نوبت آئی تھی۔ پر آج بھی مجھے نیا سوٹ پہن کر وہی خوشی ہوئی جو لڑکپن میں ہوتی تھی۔ من کتنا ہی اداس ہو، نیا سوٹ پہن کر ہرا ہوجاتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں، بیماری میں بہت سی دوائیں نہ کھاکر ہم نیا سوٹ بنوا لیا کریں تو کم سے کم اتنا فائدہ تو ضرور ہی ہوگا جتنا دوا کھانے سے ہوتا ہے۔ کیا یہ کوئی بات ہی نہیں کہ ذرا دیر کے لیے آپ اپنی ہی آنکھوں میں کچھ اونچے ہو جائیں؟ میرا انوبھو تو یہ کہتا ہے کہ نیا سوٹ ہمارے اندر ایک نیا جیون ڈال دیتا ہے، جیسے سانپ کینچل بدلے یا بسنت میں ورکشوں میں نئی کونپلیں نکل آئیں۔

اسٹیشن سے نکل کر میں نے تانگا لیا اور رَسِک لال کے دوار پر پہنچا۔ تین بجے ہوں گے۔ لو چل رہی تھی۔ منھ جھلسا جاتا تھا۔ دوار پر شہنائیاں بج رہی تھیں۔ بندن وارے بندھی ہوئی تھیں۔ تانگے سے اتر کر اندر کے صحن میں پہنچا، بہت سے آدمی آنگن کے صحن کے بیچ میں گھیرا باندھے کھڑے تھے۔ میں نے سمجھا کہ شاید جوڑے گہنے کی نمائش ہو رہی ہوگی۔ بھیڑ چیر کر گھسا۔ بس کچھ نہ پوچھو، کیا دیکھا، جو ایشور ساتویں بیری کو نہ دکھائے۔

ارتھی تھی، پکے کام کے دوشالے سے ڈھکی ہوئی، جس پر پھول بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گر پڑوں گا۔

سہسا رَسِک لال پر میری نگاہ پڑ گئی۔ رنگین کپڑوں کا ایک گٹھر لیے اندر سے آئے تھے۔ نہ آنکھوں میں آنسو، نہ مکھ پر ویدنا، نہ ماتھے پر شکن، وہی بانکی ٹوپی تھی، وہی ریشمی کرتا، وہی مہین تنزیب کی دھوتی، سب رو رہے تھے، کوئی آنسوؤں کے ویگ کو روکے ہوئے تھا۔ کوئی شوک سے وِہوَل۔ یہ باہر کے آدمی تھے۔ کوئی متر تھا، کوئی بندھو اور جو مرنے والے کا باپ تھا، وہ ان ڈگمگانے والی نوکاؤں اور جہازوں کے بیچ میں استمبھکی بھانتی کھڑا تھا۔ میں دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ کر رونے لگا۔ وہ پانی کی بوند جو پتے

پر رکی ہوئی تھی، ذرا سی ہوا پا کر ڈھلک پڑی۔

رَسِک لال نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے کہا، ''آپ کب آئے؟ کیا ابھی چلے آرہے ہیں؟ واہ، مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ شادی کی تیاریوں میں ایسا پھنسا کہ مہمانوں کی خاطرداری بھی نہ کرسکا۔ چل کر کپڑے اتاریے، منہ ہاتھ دھوئیے۔ ابھی بارات میں چلنا پڑے گا۔ پوری تیاری کے ساتھ چلیں گے۔ بینڈ، بین، تاشا، شہنائی، نگاڑا، ڈفلی سبھی کچھ ساتھ ہوں گے۔ کوتل گھوڑے، ہاتھی، سواریاں سب کچھ منگوائی ہیں۔ آتش بازی، پھولوں کے تخت خوب دھوم سے چلیں گے۔ جیٹھے لڑکے کا بیاہ ہے، خوب دل کھول کر کریں گے، گنگا کے تٹ پر جن واسا ہوگا۔''

ان شبدوں میں شوک کی کتنی بھینکر، کتنی اتھاہ ویدنا تھی۔ ایک کہرام مچ گیا۔

رَسِک لال نے لاش کے سر پر بیلوں کا مور پہنا کر کہا: ''کیا روتے ہو بھائیو یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی ہے۔ روز ہی تو یہ تماشا دیکھتے ہیں۔ کبھی اپنے گھر میں، کبھی دوسرے کے گھر میں، روز ہی تو روتے ہو، کبھی اپنے دکھ سے، کبھی پرائے دکھ سے، کون تمھارے رونے کی پرواہ کرتا ہے، کون تمھارے آنسو پونچھتا ہے۔ کون تمھاری چنکار سنتا ہے، تم روئے جاؤ، وہ اپنا کام کیے جائے گا۔ پھر رو کر کیوں اپنی دُربلتا دکھاتے ہو؟ اس کی چوٹوں کو چھاتی پر لو اور ہنس کر دکھا دو تم ایسی چوٹوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ اس سے کہو، تیرے استرالیہ میں جو سب سے گھاتک استر ہو وہ نکال لا۔ یہ کیا سوئیاں سی چبھوتا ہے؟ پر ہماری کوئی دلیل نہیں سنتا۔ نہ سنے! ہم بھی اپنی اکڑ نہ چھوڑیں گے۔ اسی دھوم دھام سے بارات نکالیں گے۔ خوشیاں منائیں گے۔

رَسِک لال روتے تو اور لوگ بھی انھیں سمجھاتے۔ اس وِدروہ بھری للکار نے سب کو استمبھت کر دیا۔ سمجھاتا کون؟ ہمیں وہ للکار وِکشپت ویدنا سی جان پڑی۔ جو آنسوؤں سے کہیں مرمانتک تھی۔ چنگاری کے اسپرش سے آبلے پڑ جاتے ہیں۔ دہکتی ہوئی آگ میں پاؤں پڑ جائے تو بھُن جائے گا، آبلے نہ پڑیں گے۔ رَسِک لال کی ویدنا وہی دہکتی ہوئی آگ تھی۔

لاش موٹر پر رکھی گئی۔ موٹر گلاب کے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ کسی نے پکارا، ''رام نام ستیہ ہے۔''

رَسِک لال نے اسے ونود بھری آنکھوں سے دیکھا، تم بھولے جاتے ہو، لالا۔ یہ وِواہ کا اُتسو ہے۔ ہمارے لیے ستیہ جیون ہے، اس کے سوا جو کچھ ہے، متھیا ہے۔''

باجے گاجے کے ساتھ بارات چلی۔ اتنا بڑا جلوس تو میں نے شہر میں نہیں دیکھا۔ وِواہ کے جلوس میں دو چار سو آدمیوں سے زیادہ نہ ہوتے۔ اس جلوس کی سنکھیا لاکھوں سے کم نہ تھی۔ دھنیہ ہو۔ رَسِک لال! دھنئے تمھارا کلیجا! رَسِک لال اسی بانکی ادا سے موٹر کے پیچھے گھوڑے پر سوار چلے جا رہے تھے۔ جب لاش چِتا پر رکھی گئی تو رَسِک لال نے ایک بار زور سے چھاتی پر ہاتھ مارا۔ مانوتا نے وِدّروہی آتما کو آندولت کیا، پر دوسرے ہی چھن ان کے مکھ پر وہی کٹھور مسکان چمک اٹھی۔ مانوتا وہ تھی یا یہ کون کہے؟

اس کے دو دن بعد میں نوکری پر لوٹ گیا۔ جب چھٹیاں ہوتی ہیں تو رَسِک لال سے ملنے آتا ہوں۔ انھوں نے اس وِدروہ کا ایک انش مجھے بھی دے دیا ہے۔ اب جو کوئی ان کے آچار ویوہار پر آکشیپ کرتا ہے تو میں کیول مسکرا دیتا ہوں۔

(یہ افسانہ ہندی میں 'بھارت' 20 جنوری 1933 میں شائع ہوا۔ 'پریم چند کا اپراپیہ ساہتیہ' حصہ 1 میں شامل ہے۔ اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔)

نیور

آسمان میں چاندی کے پہاڑ اُڑ رہے تھے، ٹکرا رہے تھے، گلے مل رہے تھے، آنکھ مچولی کھیل رہے تھے کبھی سایہ ہو جاتا تھا، کبھی تیز دھوپ چمک اٹھتی تھی۔ برسات کے سوکھے دن تھے، اُمس ہو رہی تھی، ہوا بند ہو گئی تھی۔

گاؤں کے باہر کئی مزدور ایک کھیت کی مینڈھ باندھ رہے تھے، ننگے بدن پسینے میں تر، کچھنی کسے ہوئے سیاہ فام، سب کے سب پھاوڑے سے مٹی کھود کر منڈیر رکھتے جاتے تھے، کئی دن قبل بارش ہوئی تھی، اس سے مٹی نرم ہو گئی تھی۔

گوبر نے اپنی کانی آنکھ مٹکا کر کہا۔ ''اب تو ہاتھ نہیں چلتا بھائی، گولا بھی چھوٹ گیا ہوگا، چلو چبینہ کر لیں''۔

نیور نے ہنس کر کہا۔ ''یہ مینڈھ تو پوری کر لو، پھر چبینہ کر لینا۔ میں تو تم سے پہلے آیا تھا''۔

وینو نے جھوا سر پر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اپنی جوانی میں جتنا گھی کھایا ہوگا، نیور دادا اتنا تو اب ہمیں پانی بھی میسر نہیں''۔

نیور پستہ قد، گٹھیلا، بے حد سیاہ، پھرتیلا آدمی تھا۔ عمر پچاس سے زائد تھی، مگر اچھے اچھے نوجوان محنت میں اس کا لوہا مانتے تھے۔ ابھی دو تین سال پہلے تک کشتی لڑتا تھا، جب سے گھر کی گائے مری کشتی لڑنا چھوڑ دیا۔ مول کے دودھ میں گزارا کہاں۔

گوبر نے پھر نیور کو چھیڑا۔ ''تم سے بے تماکو پئے کیسے رہا جاتا ہے۔ نیور دادا یہاں تو چاہے روٹی نہ ملے، لیکن پاؤ بھر تمباکو ضرور چاہیے''۔

. نیور اپنے کام میں مصروف تھا، نوجوان کی گپ شپ میں اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی، دیتو نے اسے باتوں میں لگانے کی دوبارہ کوشش کی۔ ''تو یہاں سے جا کر روٹی پکاؤ گے۔ دادا تمھاری بڑھیا کیوں کام نہیں کرتی، ہم سے دادا ایسی میریا سے ایک دن نہ پٹے''۔

یہ کوشش کارگر ہوئی۔ نیور کے پچکے ہوئے، کھچڑی مونچھوں سے ڈھکے چہرے پر تبسم کی نورانی لکیر کھینچ گئی۔ جس نے اس کے کریہہ منظر میں ابھی ایک حسن پیدا کر دیا، بولا۔

''جوانی تو اسی کے ساتھ کٹی ہے بیٹا، اب اس سے کوئی کام نہیں ہوتا تو کیا کروں''۔

گوبر نے زمین پر بیٹھ کر ہاتھ سے ماتھے کا پسینہ پوچھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ نہیں کام کیوں نہ کرتی، مجے سے کھاٹ پر بیٹھی چلم پیا کرتی ہے۔ اور سارے گاؤں سے لڑا کرتی ہے۔ تم بوڑھے ہوگئے، لیکن وہ تو اب بھی جوان بنی ہوئی ہے''۔

دینا نے اور رڈا جمایا۔ ''جوان عورت کیا اس کی برابری کرے، سیندور، کاجل، مستی، مہندی، ان سنگاروں میں سے تو جیسے اس کا من بستا ہے، جب دیکھا کناروا، رنگین ساڑی ہی پہنے دیکھا، اس پر گہنے الگ، گہنوں سے تو اس کا جی ہی نہیں بھرتا، تم گئوہو۔ اس سے نباہ ہو جاتا ہے، نہیں تو اب تک گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرتی۔

''گوبر نے تھوڑے دن پہلے اپنی عورت کو اسی لیے چھوڑ دیا تھا کہ وہ کام چور تھی، اور کھانے میں حاتم''۔

دینا بولا۔ ''مجھے تو اس کے بناؤ سنگار پر غُسہ آتا ہے، کچھ کام نہ کرے گی کھانے پہننے کو اچھا ہی چاہیئے''۔

نیور نے جیسے اپنی صفائی دی۔ ''تم کیا جانو گے بیٹا، تب تم لوگوں کا جنم ہی نہیں ہوا تھا۔ جب وہ آئی تھی، تو میرے گھر میں سات ہل چلتے تھے۔ وہ رانی بنی بیٹھی رہتی تھی۔ تھی بھی بڑے گھر کی بیٹی۔ مجور لگے ہوئے تھے۔ اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہ کرنا پڑتا تھا۔ جمانا بدل گیا تو کیا، اس کا دل تو وہی ہے۔ گھڑی بھر چولھے کے سامنے بیٹھ جاتی ہے، تو آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، اور سر تھام کر پڑ رہتی ہے، مجھ سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا۔ اسی دن رات کے لیے تو آدمی سادی بیاہ کرتا ہے، نئ گرہستی میں جنجال کے سوا اور کیا رکھا ہے۔ یہاں سے جا کر روٹی پکاؤں گا۔ پانی لاؤں گا، تب بڑی مشکل سے دروکور کھائے گی۔ نہیں مجھے اپنی کیا چنتا تھی، تمھاری طرح چار پھنکی مار کر ایک لوٹا پانی چڑھا لیتا، جب سے بیٹا مر گئی تب سے تو وہ اور بھی ٹوٹ گئی، یہ بڑا بھاری دھکّا لگا۔

''اس ماں کی ممتا ہم تم کیا سمجھیں گے۔ بیٹا، پہلے تو میں کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتا تھا، اب تو اس کو دیکھ کر درد آجاتا ہے''۔

دینا نے پوچھا۔ ''تم کل روکھ پر کاہے کو چڑھ رہے تھے، ابھی تو گولر نہیں پکے''۔

نیور کے چہرے پر رقت جھلک اٹھی بولا۔ ''اس بکری کے لے پتیاں توڑ رہا تھا۔ بیٹا اسی کا دودھ تو پیتی تھی۔ اب بے چاری بڑھیا ہو گئی ہے۔ دودھ کیا دے گی، لیکن یہ کیسے بھول جاؤں کہ بیٹا اسی کا دوھ پیتی تھی''۔

گھر پہنچ کر نیور نے لوٹا اور ڈول اٹھایا، اور نہانے چلا، کہ بیوی نے کھاٹ پر لیٹے لیٹے کہا۔ ''اتنی دیر کیوں کر دیتے ہو۔ آدمی کام کے پیچھے جان تھوڑے ہی دے دیتا ہے۔ جب مجوری سب کو برابر ملتی ہے، تو کام بھی برابر کرو، کوئی ایک دھیلا بیسی تو نہیں دیتا''۔

نیور کے فضائے دل پر سنہرے بادلوں کی طرح ایک مستانہ کیفیت طاری ہو گئی۔ ان لفظوں کی مٹھاس نے جیسے اس کے وجود کے ایک ایک ذرّے کو مٹھاس میں شرابور کر دیا۔ اس بے غرضانہ محبت میں کتنا درد، کتنی دلجوئی، کتنی خیر اندیشی بھری ہوئی تھی، اور دوسرا کون ہے، جسے اس کے آرام کی، اس کے مرنے جینے کی فکر ہو۔ پھر وہ کیو ں نہ اپنی بڑھیا کے لیئے مرے، سرور میں آکر بولا۔ ''تم اس جنم میں کوئی دیوی رہی ہوگی بدھیا''۔

سچ۔ بدھیا نے میٹھی جھڑکی دی۔ ''اچھا رہنے دو یہ چاپلوسی۔ ہمارے آگے اب کون بیٹھا ہوا ہے جس کے لیے اتنی ہائے ہائے کرتے ہو''۔

نیور دس گز کی چھاتی لیے نہانے چلا گیا، لوٹ کر اس نے موٹی موٹی روٹیاں پکائیں، آلو چولھے میں ڈال دیے تھے، ان کا بھرتا بنایا، تب دونوں ساتھ کھانے بیٹھے۔

بُدھیا نے حسرت سے کہا۔ ''میری جات سے تمھیں کوئی آرام نہ ملا۔ پڑے پڑے کھاتی ہوں، اور تمھاری چھاتی پر مونگ دلتی ہوں۔ اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ بھگوان مجھے اٹھا لیتے''۔

''بھگوان آئیں گے تو میں کہوں گا۔ پہلے مجھے لے چلو، تب اس سونی جھونپڑی میں کون رہے گا''۔

''تم نہ رہو گے تو میری کون دساہوگی۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے میں نے کوئی بڑا پن کیا تھا، جو تمھیں پایا۔ کسی اور کے ساتھ میرا کیا نباہ ہوتا''۔

اس انکسار میں کتنا نشہ تھا۔ نیور کی ایک ایک رگ مخمور ہو اٹھی۔ اس سے پہلے بھی کتنی ہی بار یہ مسئلہ چھڑا تھا، اور یوں ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔

لیکن نہ جانے کیوں نیور نے اپنے حق میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پہلے میں جاؤں گا۔

اس کے بعد بھی بڑھیا جب تک جیے آرام سے رہے، کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے، اس لیے وہ مرتا رہتا تھا کہ ہاتھ میں چار پیسے ہو جائیں، سخت سے سخت کام جس کے لیے کوئی نہ کھڑا ہو، وہ نیور کے ہاتھوں انجام پاتے، دن بھر پھاوڑے، کدال کا کام کرنے کے بعد رات کو وہ ایکھ کے دنوں میں کسی کی ایکھ پیلتا یا فصل کی رکھوالی کرتا، لیکن دن نکلتے جاتے تھے۔ اور جو کچھ کماتا تھا وہ بھی نکلتا جاتا تھا، بڑھیا کے لیے کوئی آسرا نہ تھا۔

لیکن آج کی باتوں نے نیور کے دل میں ہیبت ڈال دی، سچ مچ کہیں بڑھیا ہی نہ چل جاوے۔ پانی میں ایک بوند رنگ کی طرح۔ یہ خیال اس کے دل میں سما کر گھلنے لگا۔

گاؤں میں نیور کے لیے کام کی کمی نہ تھی، پر مزدوری تو وہی ملتی تھی جو اب تک ملتی آئی تھی، اس کسادا بازاری کے زمانہ میں وہ مزدوری بھی نہ رہ گئی تھی، کہیں بڑھیا پہلے چل بسی، تو اس کے کریا کرم کے لیے ہاتھ میں ہونا چاہیے، اس دھوم سے کام کرے گا کہ لوگ دنگ رہ جائیں۔

اسی دن اتفاق سے ایک مہاتما کہیں سے گھومتے آ نکلے، اور وہیں نیور کی جھونپڑی کے سامنے پیپل کے نیچے ان کی دھونی جم گئی۔ گاؤں والوں نے سمجھا، زہے نصیب! بابا جی کی خدمت اور تکریم کے سامان جمع ہونے لگے۔ کہیں سے لکڑی آ گئی کہیں سے پوال کہیں سے بچھانے کو کمبل، نیور غریب کے پاس کیا تھا۔ بابا جی کا بھوجن پکانے کی خدمت اس نے اپنے ذمے لی۔ چرس آ گئی۔ بابا جی نے دم لگانا شروع کیا، بھگتوں کی ایک جماعت نے بھجن گانے کی تیاریاں کیں ڈھول، مجیرا لے کر نال آ گئے۔

دو تین دن میں ہی بابا جی کے کشف و کرامات کے چرچے ہونے لگے، وہ روشن ضمیر ہیں، ان کی نگاہ پر زمانے کی قید نہیں،، لوبھ تو چھو ہی نہیں گیا، پیسہ ہاتھ سے نہیں چھوتے اور بھوجن بھی کیا کرتے ہیں، آٹھ پہر میں ایک کٹورہ دودھ پی لیا یا ایک دو چمچہ کھچڑی کھا لی، لیکن چہرے پر کتنا جلال ہے، جیسے شمع جل رہی ہو۔ زبان کتنی میٹھی ہے۔

سیدھا سادا نیور بابا جی کا خاص طور پر معتقد ہو گیا تھا۔ اس پر کہیں بابا جی کی دیا ہوگئی تو پارس ہی ہو جائے گا۔ سارا دکھ دلدّر دور ہو جائے گا۔

آدھی رات ہو گئی تھی، عقیدت مندوں کی جماعت رخصت ہوگئی تھی۔ صرف نیور بیٹھا بابا جی کے پاؤں دبا رہا تھا۔

بابا جی نے فرمایا۔ ''بچہ سنسار مایا ہے اس میں کیوں پھنسے ہو''۔

نیور نے سرِ تعظیم جھکا کر کہا۔ ''نادان ہوں مہاراج، کیا کروں عورت ہے اسے کس پر چھوڑ دوں؟''

''تو سمجھتا ہے تو ہی اس کا پالن کرتا ہے''۔

''اور دوسرا کون سہارا ہے اسے بابا جی''۔

''ایشور کچھ نہیں ہے، تو ہی سب کچھ ہے''۔

نیور کا ضمیر جیسے نور عرفاں سے منور ہو گیا۔ میں اتنا مغرور ہوں، اتنا خر دماغ، اتنا کور باطن، مزدوری کرتے کرتے جان نکلی جاتی ہے، اور میں سمجھتا ہوں، میں ہی بُدھیا کا سب کچھ ہوں۔ ایشور جو سارے سنسار کا پالن کرتے ہیں، تو ان کی مرضی میں دخل دینے والا کون ہے، اس کے زود اعتقاد دہقانی، باطن سے ایک صدا سی نکل کر اس کی رگ رگ میں گونجنے لگی، تو اگیانی ہے، صرف اتنا بولا۔ ''آپ مجھے گیان دیجیے''۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

بابا جی نے تحکمانہ انداز سے کہا۔ ''دیکھنا چاہتا ہے ایشور کی لیلا، وہ چاہے تو تجھے چھن بھر میں لکھ پتی کر دے، چھن بھر میں تیری ساری چنتائیں ہٹا دے۔ میں اس کا ادنیٰ غلام ہوں۔ کوّے کی بیٹ لیکن مجھ میں بھی اتنی کرامات ہے کہ تجھے پارس بنادوں، تو صاف دل سچا ایماندار آدمی ہے۔ مجھے تجھ پر دیا آتی ہے۔ میں نے اس گاؤں میں ایک ایک کو غور سے دیکھا کسی میں بھی اعتقاد نہیں، ایمان نہیں۔ تجھ میں میں نے بھگت کا دل پایا، بتا تیرے پاس کچھ چاندی ہے؟''

نیور کو ایسا معلو ہو رہا تھا کہ سامنے جنت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

''دس پانچ روپے پڑے ہوں گے مہاراج''۔

''چاندی کے ٹوٹے پھوٹے گہنے نہیں ہیں؟''

''گھر والی کے کچھ گہنے بھی ہیں''۔

''کل رات کو جتنی چاندی مل سکے یہاں لا، اور ایشور کی کرامات دیکھ تیرے سامنے میں چاندی کو ایک ہانڈی میں کس کے بند کر کے اسی دھونی میں رکھ دوں گا۔ سویرے آ کر ہانڈی نکال لینا مگر اتنا یاد رکھنا کہ ان اشرفیوں کو شراب، جوا یا کسی دوسرے بُرے کام میں خرچ کیا تو کوڑھی ہو جائے گا۔ اب جا سو رہ۔ ہاں اتنا اور سُن لے اس کا چرچہ کسی سے مت کرنا، گھر والی سے بھی نہیں''۔

''نہیں''۔

نیور گھر چلا تو ایسا خوش تھا، گویا ایشور کا ہاتھ اس کے سر پر ہے۔ رات بھر اسے نیند نہیں آئی۔ سویرے اس نے کئی آدمیوں سے دو دو چار روپے ادھار لے کر پچاس روپے جمع کر لیے لوگ اس کا اعتبار کرتے تھے، کبھی کسی کا ایک پیسہ نہ دباتا تھا، وعدے کا پکّا، نیت کا صاف، روپے ملنے میں دقت نہ ہوئی، پچیس روپے اس نے اپنی کمائی سے بٹور رکھے تھے، مگر بُڈھیا سے گہنے کیسے مانگے؟ لگے گی طرح طرح کے سوال پوچھنے، کیا کروگے، کسی کو دے تو نہ دوگے، چکمہ دیا، تیرے گہنے بہت میلے ہو گئے ہیں۔ بُڈھیا کھٹائی سے صاف کر لے، رات بھر کھٹائی میں رکھنے سے نئے ہو جائیں۔ تب میں پٹوے کے پس لے جا کر نئے ڈورے میں گتھوا لاؤں گا۔'' بڈھیا چکمے میں آگئی۔ نیور کی جانب سے کسی طرح شبہ ہونا امکان سے بعید تھا۔ ہانڈی میں کھٹائی ڈال کر گہنے بھگو دیے۔ جب رات کو وہ سو گئی تو نیور نے روپے بھی اس ہانڈی میں ڈال دیے اور ہانڈی لیے بابا جی کی خدمت میں حاضر ہو گیا، بھگت لوگ رخصت ہو چکے تھے، مطلع صاف تھا، بابا نے بے اعتنائی کے انداز سے ہانڈی لے لی، کچھ منتر پڑھ کر اس پر پھونکا، اور ہانڈی کو دھونی کی راکھ میں رکھ کر نیور کو سورج نکلنے سے پہلے آنے کی تاکید کر کے رخصت کیا۔

رات بھر اشتیاق اور گدگدی کا مزہ لینے اور خیالی پلاؤ پکانے کے بعد نیور منہ اندھیرے بابا جی کے دردشن کرنے گیا، سینہ بانسوں اچھل رہا تھا، کل یہ جھونپڑی، جھونپڑی نہ رہے گی اور نہ یہ بُڈھیا اس حال میں رہے گی، یہیں بُڈھیا کے نام پر ایک کنواں کھدے گا اور ایک مندر بنے گا۔ مگر نیور اسی طرح چار آنے روز کی مزدوری کرتا رہے گا، دولت پا کر آدمی اپنے کو نہ بھولے جب ہے، اترانے لگے تو کیا رہ گیا، ایں!

آج بابا جی دھونی کے پاس نہیں ہیں گئے ہوں گے ندی کی طرف، ان کے انتظار کی ضرورت نہیں، انھوں نے کہہ دیا تھا سورج نکلنے کے پہلے آکر ہانڈی نکال لینا، چٹ دھونی میں ہاتھ ڈالا، ہانڈی ملی، مگر بالکل خالی سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ پھر راکھ ٹٹولی کچھ نہ ملا۔ کوئی ہانڈی سے اشرفیاں نکال تو نہیں لے گیا، بابا جی نے ہی تو کہیں احتیاطاً چھپا کر نہیں رکھ دیں، بدحواس ہو کر بابا جی کی تلاش میں ندی کی طرف دوڑا باغوں میں ڈھونڈا بابا کی گرد بھی نہ ملی مایوس ہو کر لوٹا اور وہیں دھونی کے پاس سر جھکا کر بیٹھ گیا بھگت لوگ آنے لگے۔ ''ارے بابا کہاں گئے، کمبل بھی غائب یہ ماجرا کیا ہے؟''

ایک صاحب بولے رہتے سادھوؤں کا کیا ٹھکانا، آج یہاں، کل وہاں، ایک جگہ رہیں تو مایا جال میں نہ پھنس جائیں لوگوں سے میل و محبت ہو جائے''۔

دوسرے بھگت نے کہا۔ ''پہنچے ہوئے تھے''۔

''پورے سدھ''۔

''لوبھ تو چھو نہیں گیا تھا''۔

''نیور کہاں ہے اس پر بڑی دیا کرتے تھے۔ اس سے کہہ گئے ہوں گے''۔

نیور دفعتاً لا پتہ ہو گیا۔ اس کی تلاش ہونے لگی۔ اتنے میں بُدھیا نیور کو پکارتی ہوئی گھر میں سے نکلی پھر ہنگامہ برپا ہو گیا، بُدھیا روتی تھی اور نیور کو گالیاں دیتی تھی۔

نیور کھیتوں کی مینڈوں سے بے تحاشہ بھاگتا چلا جاتا تھا گویا اس دار عصیاں سے نکل جائے گا۔ ادھر نیور کی بدنیتی کے قصے کھلنے لگے۔

''کل ہم سے پانچ روپے لیے تھے۔ آج شام کو دینے کا وعدہ کیا تھا''۔ ہم سے بھی دو روپے آج ہی کے وعدے پر لیے تھے۔''

بدھیا روئی، داڑھی جار، میرے سارے گہنے لے گیا۔ پچیس روپے جوڑ کر رکھے تھے وہ بھی اٹھا لے گیا۔

ایک آدمی نے اس کو ملامت کی۔ ''کیوں اسے گالی دیتی ہے بدھیا، تیرے لیے جان دیتا تھا اور آج تو اسے گالیاں دے رہی ہے۔ اس کی نیت کبھی بدل ہی نہیں سکتی اس بابا نے اسے چکمہ دیا ہوگا، بے چارہ سیدھا آدمی تھا۔ جھانسے میں آگیا۔ بڑا مکّار نکلا یہ بابا''۔

قرائن اس شبہ کی تصدیق کر رہے تھے۔

نیور لاج کے مارے کہیں چھپا بیٹھا ہوگا''۔

''جو گنگا میں نہ کود پڑا ہو''۔

''بابا ملے تو کچا ہی کھا جائیں''۔

''تین مہینے گزر گئے''۔

جھانسی ضلع میں دھسان ندی کے کنارے ایک بڑا گاؤں ہے۔ کاشی پور ندی کے دوسرے کنارے ایک پہاری ہے۔ اس پر کئی دن سے ایک سادھو نے آسن جمایا ہے، ناٹے قد کا آدمی ہے کالے توے کا سا رنگ، جسم گٹھا ہوا۔ یہ نیور ہے، جو سادھوؤں کے بھیس میں دنیا کو دھوکا دے رہا ہے۔ وہی بھولا بھالا، صاف دل، بے لوث نیور، جس نے کبھی پرائے مال کی طرف آنکھ نہیں اٹھائی جو پسینے کی روٹی کھا کر مگن تھا، جو کبھی اپنے لیے نہیں ہمیشہ دوسروں کے لیے مرا۔ گھر کی اور گاؤں کی اور بڈھیا کی یاد اس کے دل میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں اترتی۔ اس زندگی میں کیا پھر کوئی دن آئے گا کہ وہ گھر پہنچے اور پھر اس دنیا میں ہنستا کھیلتا اپنی چھوٹی چھوٹی فکر والی اور چھوٹی چھوٹی امیدوں کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ کتنی پر عافیت تھی وہ زندگی، جتنے تھے سب اپنے تھے۔ سبھی عزت کرتے تھے، ہمدردی کرتے تھے۔ دن بھر کی کڑی محنت کے بعد جب وہ تھوڑا اناج اور تھوڑے سے پیسے لے کر گھر آتا تھا تو بڈھیا اس سے کیسی میٹھی میٹھی باتیں کرتی تھی، وہ ساری محبت اور تھکاوٹ جیسے اس مٹھاس میں پک کر اور بھی میٹھی ہو جاتی تھی، آہ وہ دن کب آئیں گے؟ نہ جانے بڈھیا کیسے رہتی ہوگی؟ کون اسے پان کی طرح پھیرتا ہوگا، کون اسے پکار کر کھلاتا ہوگا، گھر میں ایک پیسہ بھی تو نہیں چھوڑا۔ گہنے تک ڈبا دیے۔ تب اسے اس بابا پر ایسا غصہ آیا کہ پاجائے تو خون ہی پی لے، ہائے رے لالچ۔

اس کے خاص عقیدت مندوں میں ایک حسینہ بھی تھی۔ جسے اس کے شوہر نے کئی سال سے چھوڑ رکھا تھا۔ حسینہ کا باپ فوجی پنشنر تھا۔ ایک تعلیم یافتہ نوجوان سے لڑکی کی شادی کی۔ لیکن لڑکا اپنی ماں کا سعادت مند فرزند تھا، اور حسینہ اپنی ساس کو خوش نہ رکھ سکی۔ وہ چاہتی تھی ساس سے علیحدہ ہو کر شوہر کے ساتھ رہے، شوہر اپنی ماں سے الگ ہونے پر راضی نہ ہوا۔ ماں کی قربانیوں کو کیسے بھول جائے۔ بہو روٹھ کر میکے چلی آئی۔

تب سے تین سال ہو گئے تھے، اور سسرال سے ایک بار بھی بلاوا نہ آیا۔ نہ شوہر ہی نے آنے کی تکلیف کی۔ نازنین کسی طرح اپنے شوہر کو اپنے بس میں کرلینا چاہتی تھی، مہاتماؤں کے لیے کسی کا دل کسی کی طرف سے پھیر دینا کیا مشکل ہے۔ ہاں ان کی نظر کرم چاہیے۔

ایک دن اس نے تخلیہ میں بابا جی سے اپنی داستان غم سنائی۔ نیور کو جس شکار کی تلاش تھی وہ آج بہت دنوں کے بعد پھنستا ہوا معلوم ہوا۔ تقدس کی شان سے بولا، ''میں نہ مہاتما ہوں نہ کامل، نہ دنیا کی مایا جال میں پڑتا ہوں، لیکن تیری سردھا اور پریم دیکھ کر تجھ پر رحم آتا ہے بھگوان نے چاہا تو تیری مراد پوری ہو جائے گی''۔

اس انکسار نے اس کا رنگ اور بھی جمایا۔ لڑکی نے اس کے قدموں پر سر رکھ کر عرض کی۔

''آپ سب کچھ کر سکتے ہیں مہاراج مجھے آپ کے اوپر وشواش ہے''۔

''بھگوان جی کی جو مرضی ہوگی وہ ہوگا میں کچھ نہیں ہوں''۔

''اس بدنصیب کا ڈونگا آپ ہی پار لگا سکتے ہیں''۔

''ایشور پر بھروسہ رکھو''۔

''میرے ایشور تو آپ ہی ہیں''۔

نیور نے گویا اس کی منتوں سے بہت مجبور ہو کر کہا۔ ''لیکن بیٹی اس کام میں بہت سے انوشٹھان (عملیات) کرنے پڑیں گے اور انوشٹھان میں سیکڑوں، ہزاروں روپے کا خرچ ہے اس پر بھی تیری مراد پوری ہوگی یا نہیں، کہہ نہیں سکتا، ہاں میرے کیے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ میں کیا کروں گا، مگر سب کچھ بھگوان کے ہاتھ ہے، میں مایا کو ہاتھ سے نہیں چھوتا، لیکن تیرا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔

اسی رات کو اس غرض کی باؤلی نے اپنے گہنوں کی پٹاری بابا جی کے قدموں پر رکھ دی بابا جی نے متنفر ہاتھوں سے پٹاری کھولی اور چاند کی روشنی میں زیوروں کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ اب اگر ان میں کچھ عقل ہو تو یہ ساری مایا ان کی ہے وہ گویا ان کے سامنے دست بستہ کہہ رہی ہے مجھے قبول کیجیے۔ کرنا ہی کیا ہے کچھ بھی نہیں، محض پٹاری لے کر اپنے سرہانے رکھ لینا ہے اور لڑکی کو دعائیں اور تقویت دے کر رخصت کر

دینا ہے وہ سویرے آئے گی۔ اس وقت تک وہ اتنی دور ہوں گے جتنی دور ٹانگیں لے جائیں، ایسی غیر متوقعہ نعمت جب وہ روپیوں سے بھری تھیلی لیے گھر پہنچیں گے اور بڑھیا کے سامنے رکھ دیں گے اس وقت بڑھیا......

لیکن نہ جانے کیوں اتنا ذرا سا کام بھی اس سے نہیں ہو سکتا، وہ پٹاری کو اٹھا کر اپنے سرہانے کمبل کے نیچے دبا کر نہیں رکھ سکتا۔ کچھ نہیں، اس سے زیادہ آسان کام دنیا میں نہ ہوگا مگر اس کے لیے میغ ہے، ہمت شکن ہے، انفوان ہے، وہ پٹاری کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھا سکتا، ہاتھوں پر اس کا کوئی نہیں ہے۔ جانے دو، ہاتھ سمجھ لو کٹ گئے۔ زبان پر تو اس کا قابو ہے۔ اتنا کہنے میں کون سی دنیا الٹی جاتی ہے کہ بیٹی پٹاری اٹھا کر کمبل کے نیچے رکھ دو زبان کٹ تو نہ جائے گی، مگر اس پر حقیقت کھلتی ہے کہ زبان پر بھی اس کا قابو نہیں ہے۔ آنکھوں کے اشارے سے بھی وہ کام ہو سکتا ہے، لیکن اس موقع پر آنکھیں بھی دغا دے رہی ہیں، دل کا بادشاہ اتنے وزیروں اور مشیروں کے ہوتے ہوئے بھی لاچار ہے۔ ضعیف ہے، لاکھ روپے کی تھیلی سامنے رکھی ہو، ننگی تلوار ہاتھ میں ہو۔ گائے مضبوط رسی سے سامنے بندھی ہو۔ کیا اس گائے کی گردن پر اس کے ہاتھ اٹھیں گے، غیر ممکن کوئی خود اس کی گردن کاٹ لے، مگر وہ گئو کی ہتیا نہیں کر سکتا۔ وہ غم نصیب مظلوم عورت اس کی نظروں میں اس گئو کی طرح بے زبان، قابلِ رحم تھی۔ جس موقع کو وہ اتنے دنوں سے تلاش کر رہا ہے۔ اسے پا کر آج اس کا ضمیر لرز رہا ہے اور روح کانپ رہی ہے۔ اس کی ہوس بھی فطرتاً وحشی جانوروں کی طرح خونخوار ہے، لیکن عرصہ دراز تک زنجیر میں رہنے سے اس کے ناخن گر گئے ہیں، اور دانت کمزور ہو گئے ہیں۔

اس نے فاتحانہ انداز سے کہا۔ ''بیٹی پٹاری اٹھا لے جاؤ، تمھاری مراد پوری ہو جائے گی، میں تمھارا امتحان لے رہا تھا۔

چاند ندی کے اس پار درختوں کی گود میں محو خواب تھا۔ نیور آہستہ سے اٹھا اور ایک طرف چل دیا۔ بھبھوت اور تلک سے اُسے نفرت ہو رہی تھی۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ وہ گھر سے نکلا ہی کیوں، تھوڑی سی رسوائی اور تضحیک کے خوف سے بانہیں سمیت کے زیر اثر دغا اور ریا نے اس میں جن شیطانی جذبات کو برانگیختہ کیا تھا، ان سے مغلوب ہو کر اور آج ایک معصوم مظلوم آتما کے اعتقاد اور اعتماد میں اس نے اپنی کھوی ہوئی حقیقت کو

پھر پالیا تھا۔ ایسا خوش تھا گویا وہ زنجیروں سے آزاد ہو گیا ہو۔ ایک نئی سحر کا طلوع اس کی روح کو ایک نورانی ضیا سے منور کر رہا تھا، اور اس کی رگ رگ سے اس کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔

نیور آٹھویں دن اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ لڑکوں نے دوڑ کر، اچھل کود کر، ناچ کر اس کے ہاتھ سے اس کی لکڑی چھین کر اس کا خیر مقدم کیا۔

ایک لڑکے نے کہا۔ ''کاکی تو مر گئی نیور دادا''۔

نیور کے پاؤں جیسے بندھ گئے۔ منہ کے دونوں کونے نیچے جھک گئے اور آنکھیں بجھ گئیں کچھ بولا نہیں۔ کسی سے کچھ پوچھا بھی نہیں، پل بھر جیسے غشی کی حالت میں کھڑا رہا پھر دیوانہ وار ایک بے خودی کے عالم میں اپنی جھونپڑی کی طرف چلا، لڑکے بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے مگر ان کا طفلانہ شرارت غائب ہو گئی تھی۔ نادانستہ طور پر وہ سب بھی اس حادثہ غم سے متاثر ہوئے۔

جھونپڑی کھلی پڑی تھی، بدھیا کی چارپائی جوں کی توں بچھی ہوئی تھی۔ ایک گوشہ میں چار پیتل کے برتن پڑے ہوئے تھے۔ لڑکے باہر ہی کھڑے رہ گئے اندر کیسے جائیں وہاں بدھیا بیٹھی ہے۔

گاؤں میں ہل چل مچ گئی، نیور داد آ گئے۔ جھونپڑی کے دروازے پر بھیڑ لگ گئی۔ سوالات کی بورش ہونے لگی، تم اتنے دن کہاں تھے داد۔ تمھارے جانے کے تیسرے دن کاکی چل بسی۔ رات دن تمھیں گالیاں دیتی تھی۔ مرتے دم تک تمھیں کوستی رہی، تیسرے دن ہم لوگوں نے دیکھا تو اکڑی پڑی تھی۔ تم اتنے دن کہاں رہے، وہ مکّار بابا پھر نہیں دکھائی دیا۔ نہیں تو کھود کر گاڑ دیتے۔

نیور نے جواب نہ دیا۔ صرف مایوس، درد ناک، مجروح، خالی آنکھوں سے لوگوں کو دیکھتا رہا گویا حس ہی نہ ہو۔ اسی دن سے کبھی نے اُسے روتے یا ہنستے نہیں دیکھا، ہاں محنت وہ اسی طرح کرتا ہے، اور اس کی مزدوری صرف دو روٹیاں ہیں۔

(یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ 'ہنس' کے جنوری 1733 کے شمارے میں شائع ہوئی۔ 'مان سرودر 2' میں شامل ہے اردو میں یہ 'زادِ راہ' میں شامل ہے۔)

گلّی ڈنڈا

ہمارے انگریزی خواں دوست مانیں یا نہ مانیں میں تو یہی کہوں گا کہ گلی ڈنڈا سب کھیلوں کا راجہ ہے۔ اب بھی جب کبھی لڑکوں کو گلی ڈنڈی کھیلتے دیکھتا ہوں تو جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے کہ ان کے ساتھ جا کر کھیلنے لگوں۔ نہ لان (میدان) کی ضرورت ہے، نہ شن گارڈ کی، نہ نیٹ کی نہ بلّے کی۔ مزے سے کسی درخت کی ایک شاخ کاٹ لی، گلی بنائی اور دو آدمی بھی آ گئے تو کھیل شروع ہو گیا۔ ولائتی کھیلوں میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ ان کے سامان بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ جب تک کم از کم ایک سو خرچ نہ کیجیے کھلاڑیوں میں شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ یہاں گلی ڈنڈا ہے کہ بغیر ہینگ پھٹکری لگے چوکھا رنگ دیتا ہے۔ لیکن ہم انگریزی کھیلوں پر ایسے دیوانے ہو رہے ہیں، کہ اپنی سب چیزوں سے ہمیں نفرت سی ہو گئی ہے۔ ہمارے اسکولوں میں ہر ایک لڑکے سے تین چار روپے سالانہ صرف کھیلنے کی فیس لی جاتی ہے۔ کسی کو یہ نہیں سوجھتا کہ ہندوستانی کھیلیں کھلائیں۔ جو بغیر پیسے کوڑی کے کھیلے جاتے ہیں۔ انگریزی کھیل ان کے لیے ہیں جن کے پاس روپیہ ہے۔ بے چارے غریب لڑکوں کے سر پر یہ فضول خرچیاں کیوں منڈھتے ہو۔ ٹھیک ہی گلی سے آنکھ پھوٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے تو کیا کرکٹ سے سر پھوٹ جانے، تلی پھٹ جانے، ٹانگ ٹوٹ جانے کا خدشہ نہیں رہتا؟ اگر ہمارے ماتھے میں گلی کا داغ لگا ہوا ہے تو ہمارے کئی دوست ایسے بھی ہیں جو بلّے سے گھائل ہونے کا سرٹیفکٹ رکھتے ہیں۔ خیر یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔ مجھے گلی ڈنڈا سب کھیلوں سے زیادہ پسند ہے اور بچپن کی یادوں میں گلی ڈنڈا ہی سب سے زیادہ شیریں یاد ہے، وہ علی الصبح گھر سے نکل جانا، وہ درخت پر چڑھ کر ٹہنیاں کاٹنا اور گلی ڈنڈے بنانا وہ جوش و خروش، وہ لگن، وہ کھلاڑیوں کے جمگھٹے، وہ پدنا اور پدانا، وہ لڑائی، جھگڑے وہ بے تکلف سادگی جس میں چھوت اچھوت اور غریب امیر کی کوئی تمیز نہ تھی۔ جس میں امیرانہ چونچلوں کی، غرور اور خود نمائی

کی گنجائش ہی نہ تھی، اسی وقت بھولے گا جب... گھر والے بگڑ رہے ہیں، والد صاحب چوکے پر بیٹھے ہوئے روٹیوں پر اپنا غصہ اتار رہے ہیں، اماں کی دوڑ صرف دروازے تک ہے لیکن ان کے خیال میں میرا تاریک مستقبل ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح ڈگمگا رہا ہے، اور مین ہوں کہ پدانے میں مست ہوں۔ نہ نہانے کا خیال ہے نہ کھانے کا۔ گلی ہے تو ذرا سی مگر اس میں دنیا بھر کی مٹھائیوں کی مٹھاس اور تماشوں کا لطف بھرا ہوا ہے۔

میرے ہمجولیوں میں ایک لڑکا گیا نام کا تھا۔ مجھ سے دو تین سال بڑا ہوگا دبلا، لمبا، بندروں کی سی پھرتی، بندروں کی سی لمبی لمبی انگلیاں، بندروں کی سی جھپٹ۔ گلی کیسی ہو اس پر اس طرح لپکتا تھا جس طرح چھپکلی کیڑوں پر لپکتی ہے۔ معلوم نہیں اس کے ماں باپ کون تھے، کہاں رہتا تھا۔ کیا کھاتا تھا۔ پر تھا ہمارے گلی کلب کا چیمپئن۔ جس کی طرف وہ آجائے اس کی جیت یقینی تھی، ہم سب اسے دور سے آتا دیکھ کر اس کا استقبال کرتے تھے اور اسے اپنا گوئیاں بنا لیتے تھے۔

ایک دن ہم اور گیا دو ہی کھیل رہے تھے۔ وہ پدا رہا تھا میں پد رہا تھا، لیکن کچھ عجیب بات ہے کہ پدانے میں ہم دن بھر مست رہ سکتے ہیں۔ پدنا ایک منٹ کا بھی سہا نہیں جاتا۔ میں نے گلا چھڑانے کے لیے وہ سب چالیں جو ایسے مواقع پر خلافِ قانون ہوتے ہوئے بھی قابلِ معافی ہیں۔ لیکن گیا اپنا داؤں لیے بغیر میرا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ میں گھر کی طرف بھاگا۔ منت سماجت اور خوشامد کا کوئی اثر نہ ہوا۔ گیا نے مجھے دوڑ کر پکڑ لیا،اور ڈنڈا تان کر بولا۔ ''میرا داؤں دے کر جاؤ۔ پدایا تو بہادر بن کر۔ پدنے کے وقت کیوں بھاگے جاتے ہو؟''

''تم دن بھر پداؤ تو میں دن بھر پدتا رہوں؟''

''ہاں تمھیں دن بھر پدنا پڑے گا؟''

''نہ کھانے جاؤں نہ پینے جاؤں''

''ہاں میرا داؤں دیے بغیر کہیں نہیں جا سکتے''۔

''میں تمھارا غلام ہوں''۔

''ہاں تم میرے غلام ہو''۔

''میں گھر جاتا ہوں۔ دیکھوں تم میرا کیا کر لیتے ہو؟''

''گھر کیسے جاؤگے کوئی دل لگی ہے۔ داؤں دیا ہے داؤں لیں گے''۔

''اچھا کل میں نے تمھیں امرود کھلایا تھا وہ رکھ دو''۔

''وہ پیٹ میں چلا گیا''۔

''نکالو پیٹ سے۔ تم نے کیوں کھایا میرا امرود؟''

''امرود تم نے دیا۔ تب میں نے کھایا۔ میں تم سے مانگنے نہ گیا تھا''۔

''جب تک میرا امرود نہ دوگے میں داؤں نہ دوں گا''۔

میں سمجھتا تھا انصاف میری طرف ہے۔ آخر میں نے کسی غرض کے لیے ہی اسے امرود کھلا دیا ہوگا۔ کون کسی کے ساتھ بے غرضانہ سلوک کرتا ہے۔ بھیک تک تو غرض کے لیے ہی دیتے ہیں۔ جب گیا نے میرا امرود کھایا تو پھر اسے مجھ سے داؤں لینے کا کیا حق حاصل ہے۔ رشوت دے کر تو لوگ خون کھپا جاتے ہیں۔ وہ میرا امرود یوں ہی ہضم کر جائے گا۔ امرود پیسے کے پانچ والے تھے جو گیا کے باپ کو بھی نصیب نہ ہوں گے۔ یہ سراسر بے انصافی ہے۔

گیا نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ''میرا داؤں دے کر جاؤ۔ امردو سمرود میں نہیں جانتا''۔

مجھے انصاف کا زور تھا۔ میں ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے جانے نہ دیتا تھا۔

میں نے گالی دی۔ اس نے اس سے بھی سخت گالی دی اور گالی ہی نہیں دی ایک چانٹا جما دیا۔ میں نے اسے دانت سے کاٹ لیا۔ اس نے میری پیٹھ پر ڈنڈا جما دیا۔ میں رونے لگا۔ گیا میرے اس ہتھیار کا مقابلہ نہ کر سکا۔ بھاگا، میں نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے ڈنڈے کی چوٹ بھول گیا اور ہنستا ہوا گھر پہنچا۔ میں تھانے دار کا لڑکا ایک نیچ ذات کے لونڈے کے ہاتھوں پٹ گیا۔ یہ مجھے اس وقت بھی بے عزتی کا باعث معلوم ہوا۔ لیکن گھر میں کسی سے شکایت نہ کی۔

ان ہی دنوں والد صاحب کا وہاں سے تبادلہ ہو گیا۔ نئی دنیا دیکھنے کی خوشی میں ایسا پھولا کہ اپنے ہمجولیوں سے جدا ہو جانے کا بالکل افسوس نہ ہوا۔ والد صاحب افسوس کرتے تھے۔ یہ بڑی آمدنی کی جگہ تھی۔ اماں جی بھی بہت افسوس کرتی تھیں۔ یہاں

سب چیزیں سستی تھیں۔ اور محلے کی عورتوں سے لگاؤ سا ہو گیا تھا، لیکن میں مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا۔ لڑکوں میں شیخی بگھارتا تھا۔ وہاں ایسے گھر تھوڑے ہی ہیں، ایسے ایسے اونچے مکان ہیں کہ آسمان سے باتیں کرتے ہیں وہاں کے انگریزی اسکول میں کوئی ماسٹر لڑکوں کو پیٹے تو قید ہو جائے۔ میرے دوستوں کی حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھیں اور متعجب چہرے صاف بتلا رہے تھے کہ میں ان کی نگاہ میں کتنا اونچا اٹھ گیا ہوں۔ بچوں میں جھوٹ کو سچ بنا لینے کی وہ طاقت ہوتی ہے جسے ہم جو سچ کو جھوٹ بنا دیتے ہیں، نہیں سمجھ سکتے۔ دوست کہہ رہے تھے۔ تم خوش قسمت ہو۔ بھائی جاؤ۔ ہمیں تو اسی گاؤں میں جینا بھی ہے اور مرنا بھی ہے''۔

بیس سال گزر گئے۔ میں نے انجینئری پاس کی، اور کسی ضلع کا دورہ کرتا ہوا اسی قصبے میں پہنچا اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرا۔ اس جگہ کو دیکھتے ہی اس قدر دلکش اور شیریں یاد تازہ ہو اٹھی کہ میں نے چھڑی اٹھائی اور قصبے کی سیر کو نکلا۔ آنکھیں کسی پیاسے مسافر کی طرح بچپن کے ان مقامات کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں، جن کے ساتھ کتنی ہی یادگاریں وابستہ تھیں لیکن اس مانوس نام کے علاوہ وہاں کوئی شناسا نہ ملا۔ جہاں کھنڈر تھا وہاں پکے مکانات کھڑے تھے۔ جہاں برگد کا پرانا درخت تھا۔ وہاں اب ایک خوب صورت باغیچہ تھا اس جگہ کی کایا پلٹ ہوگئی تھی۔ اگر اس کے نام و نشان کا علم نہ ہوتا تو میں اسے پہچان بھی نہ سکتا۔ وہ پرانی یادگاریں باہیں پھیلا پھیلا کر اپنے پرانے دوستوں کے گلے لپٹنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھیں۔ مگر وہ دنیا بدل گئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اس زمین سے لپٹ کر روؤں اور کہوں۔ ''تم مجھے بھول گئیں لیکن میرے دل میں تمھاری یاد تازہ ہے''۔

اچانک ایک کھلی جگہ میں نے دو تین لڑکوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے میں اپنے آپ کو بالکل بھول گیا کہ میں ایک اونچا افسر ہوں۔ صاحبی ٹھاٹ میں، رعب اور اختیار کے لباس میں۔ جا کر ایک لڑکے سے پوچھا۔ ''کیوں بیٹے! یہاں کوئی گیا نام کا آدمی رہتا ہے؟''

ایک لڑکے نے گلی ڈنڈا سمیٹ کر سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کون گیا، گیا چمار؟''

میں نے یوں ہی کہا۔ ''ہاں ہاں وہی گیا نام کا کوئی آدمی ہے تو شاید وہی ہو''۔

''ہاں ہے تو''۔

''ذرا اسے بلا سکتے ہو؟''

لڑکا ، دوڑا گیا اور جلد ایک پانچ ہاتھ کے کالے دیو کو ساتھ لیے آتا دکھائی دیا۔ میں نے دور سے ہی پہچان لیا۔ اس کی طرف لپکنا چاہتا ہی تھا کہ اس کے گلے لپٹ جاؤں۔ مگر کچھ سوچ کر رہ گیا۔

بولا۔ ''کہو مجھے پہچانتے ہو؟''

گیاّ نے جھک کر سلام کیا۔ ''ہاں مالک! بھلا پہچانوں گا نہیں۔ آپ مزے میں رہے''۔

''بہت مزے میں۔ تم اپنی کہو؟''

''ڈپٹی صاحب کا سائیس ہوں''۔

''مانا، موہن، درگا یہ سب کہاں ہیں کچھ خبر ہے؟''

''مانا تو مر گیا۔ موہن اوز درگا دونوں ڈاکیے ہو گئے ہیں۔ آپ؟''

''میں ضلع کا انجینئر ہوں''۔

''سرکار تو پہلے ہی بڑے جہین تھے''۔

''اب کبھی گلی ڈنڈا کھیلتے ہو؟''

گیاّ نے میری طرف سوال کی آنکھوں سے دیکھا۔ ''گلی ڈنڈا کیا کھیلوں گا سرکار، اب تو پیٹ کے دھندے سے ہی چھٹی نہیں ملتی''۔

''آؤ آج ہم تم کھیلیں۔ تم پدانا ہم پدیں گے۔ تمھارا ایک داؤں ہمارے اوپر ہے وہ آج لے لو''۔

گیا بڑی مشکل سے راضی ہوا۔ وہ ٹھہرا ٹکے کا مزدور۔ میں ایک بڑا افسر۔ میرا اور اس کا کیا جوڑ بے چارہ جھینپ رہا تھا لیکن مجھے بھی کچھ کم جھینپ نہ تھی، اس لیے نہیں کہ میں گیاّ کے ساتھ کھیلنے جا رہا تھا۔ بلکہ لوگ اس کھیل کو عجوبہ سمجھ کر اس کا تماشا بنا لیں گے۔ اور اچھی خاصی بھیڑ لگ جائے گی۔ اس بھیڑ میں وہ لطف کہاں رہے گا لیکن کھیلے بغیر تو رہا نہیں جاتا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ دونوں بستی سے بہت دور تنہائی میں جا کر کھیلیں وہاں کون دیکھنے والا بیٹھا ہوگا۔ مزے سے کھیلیں گے اور بچپن کی اس مٹھائی کو

خوب مزے لے لے کر کھائیں گے۔ میں گیا کو لے کر ڈاک بنگلے پر آیا۔ اور موٹر میں بیٹھ کر دونوں میدان کی طرف چلے ساتھ ایک کلہاڑی لے لی۔ میں متانت کے ساتھ یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ مگر گیا ابھی تک مذاق سمجھ رہا تھا اس کے چہرے پر خوشی اور ولولے کا کوئی نشان نہ تھا۔ شاید ہم دونوں میں جو فرق ہوگیا تھا وہ اسے سوچنے میں محو تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''تمھیں کبھی ہماری یاد آتی تھی گیا؟ سچ کہنا!''

گیا جھینپتا ہوا بولا۔ ''میں آپ کو کیا یاد کرتا حضور، کس لائق ہوں۔ قسمت میں کچھ دن آپ کے ساتھ کھیلنا لکھا تھا۔ نہیں تو میری کیا گنتی''۔

میں نے کچھ اداس ہو کر کہا۔ ''لیکن مجھے تو تمھاری یاد برابر آتی تھی۔ تمھارا وہ ڈنڈا جو تم نے تان کر جمایا تھا، یاد ہے نا''۔

گیا نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''وہ لڑکپن تھا سرکار، اس کی یاد نہ دلاؤ''۔

''واہ، وہ میرے ان دنوں کی سب سے رسیلی یاد ہے۔ تمھارے اس ڈنڈے میں جو رس تھا وہ اب عزت اور بڑائی میں پاتا ہوں۔ نہ دولت میں کچھ ایسی مٹھاس تھی۔ اس میں کہ آج تک اس سے من میٹھا ہوتا رہتا ہے''۔

اتنی دیر میں ہم بستی سے کوئی تین میل نکل آئے تھے چاروں طرف سناٹا تھا۔ مغرب کی طرف کوسوں تک بھیم تال پھیلا ہوا تھا جہاں آکر ہم کسی وقت کنول کے پھول توڑ لے جاتے تھے اور اس کے جھمکے بنا کر کانوں میں ڈال لیتے تھے۔ جون کی شام کیسر میں ڈوبی چلی آرہی ہے۔ میں لپک کر ایک درخت پر چڑھ گیا اور ایک شاخ کاٹ لایا۔ جھٹ پٹ گلی ڈنڈا بن گیا۔ کھیل شروع ہو گیا۔ میں نے راب میں گلی رکھ کر اچھالی، گیا کے سامنے سے نکل گئی اس نے ہاتھ لپکایا جیسے مچھلی پکڑ رہا ہو۔ گلی اس کے پیچھے جا گری۔ یہ وہی گیا تھا جس کے ہاتھوں میں گلی جیسے آپ ہی آپ جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ وہ اپنے دائیں بائیں کہیں ہو، گلی اس کی ہتھیلی میں ہی پہنچتی تھی جیسے گلیوں پر اس نے جادو کرکے انھیں بس میں کر لیا ہو۔ نئی گلی، پرانی گلی، چھوٹی گلی، بڑی گلی، نوک دار گلی۔ سب ہی اس سے ہل جاتی تھیں گویا اس کے ہاتھوں میں کوئی مقناطیسی طاقت ہے جو گلیوں کو کھینچ لیتی ہو، لیکن آج گلی کو اس سے وہ محبت نہیں رہی۔ پھر تو میں نے پدانا شروع کیا۔ میں طرح طرح کے فریب کر رہا تھا۔ مشق کی کمی بے ایمانی سے پوری کر رہا تھا۔ داؤں

پورا ہونے پر بھی میں کھیلے جاتا تھا۔ حالانکہ قاعدے کے مطابق گیا کی باری آنی چاہیے تھی۔ گلی پر ہلکی چوٹ پڑتی اور وہ ذرا ہی دور پر گر پڑتی تو میں لپک کر اسے خود ہی اٹھا لاتا اور دوبارہ ٹل لگاتا۔ گیا یہ ساری، بے قاعدگیاں دیکھ رہا تھا۔ مگر نہ بولتا تھا۔ گویا اسے وہ تمام قاعدے قانون بھول گئے ہیں، اس کا نشانہ کتنا بے خطا تھا گلی اس کے ہاتھ سے نکل کر ٹن سے ڈنڈے میں آکرلگتی تھی، اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کا کام تھا ڈنڈے سے ٹکرا جانا۔ لیکن آج وہ گلی ڈنڈے میں لگتی ہی نہیں۔ کبھی داہنے جاتی ہے۔ کبھی بائیں۔ کبھی آگے۔ کبھی پیچھے۔

آدھ گھنٹے پدانے کے بعد ایک بار گلی ڈنڈے میں آلگی میں نے دھاندلی کی۔ ''گلی ڈنڈے میں نہیں لگی، پاس سے گئی۔ لیکن لگی نہیں''۔

گیا نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔ ''نہ لگی ہوگی''۔

''ڈنڈے میں لگتی تو کیا میں بے ایمانی کرتا!''

''نہیں بھیا تم بھلا بے ایمانی کروگے!''

بچپن میں مجال تھی کہ میں ایسا گھپلا کرکے جیتا بچتا۔ یہی گیا میری گردن پر چڑھ بیٹھتا۔ لیکن آج میں اسے کتنی آسانی سے دھوکا دیے چلا جاتا تھا۔ ''گدھا ہے ساری باتیں بھول گیا''۔

اچانک گلی ڈنڈے میں لگی اور اتنے زور سے لگی جیسے بندوق چھوٹی ہو۔ اس ثبوت کے مقابل اب کسی طرح کا فریب چلنے کا مجھے اس وقت بھی حوصلہ نہ ہو سکا۔ لیکن کیوں نہ ایک بار سچ کو جھوٹ بنانے کی کوشش کروں۔ میرا ہرج ہی کیا ہے۔ مان گیا۔ واہ واہ، ورنہ دو چار ہاتھ پدنا ہی تو پڑے گا۔ اندھیرے کا بہانہ کرکے گلا چھڑا لوں گا۔ پھر کون داؤں دینے آتا ہے۔

گیا نے فاتحانہ انداز سے کہا۔ ''لگ گئی لگ گئی۔ ٹن سے بولی''۔

میں نے انجان بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے لگتے دیکھا، میں نے تو نہیں دیکھا۔''

''ٹن سے بولی ہے سرکار!''

''اور جو کسی اینٹ میں لگ گئی ہو۔''

''میرے منہ سے یہ فقرہ اس وقت کیسے نکل گیا۔ اس پر مجھے خود حیرت ہے۔ اس سچائی کا جھٹلانا ایسا ہی تھا جیسے دن کو رات بتانا۔ ہم دونوں نے گلی ڈنڈے میں زور سے لگتے دیکھا۔ لیکن گیا نے میرا کہنا مان لیا۔

''ہاں سرکار کسی اینٹ سے لگی ہوگی۔ ڈنڈے میں لگتی تو اتنی آواز نہ آتی۔''

میں نے پھر پدانا شروع کیا، لیکن اس قدر صاف اور صریح دھوکا دینے کے بعد گیا کی سادگی پر مجھے رحم آنے لگا۔ اس لیے جب تیسری بار گلی ڈنڈے میں لگی تو میں نے بڑی فراخ دلی سے داؤں دینا طے کر لیا۔

گیا نے کہا۔ ''اب تو اندھیرا ہوگیا ہے بھیا۔ کل پر رکھو۔''

میں نے سوچا کل بہت سا وقت ہوگا۔ یہ نہ جانے کتنی دیر پدائے اس لیے اسی وقت معاملہ صاف کر لینا اچھا ہوگا ''نہیں نہیں ابھی بہت اجالا ہے۔ تم اپنا داؤں لے لو۔'' .... ''گلی سوجھے گی نہیں۔''

''کچھ پروا نہیں۔''

گیا نے پدانا شروع کیا لیکن اب اسے بالکل مشق نہ تھی۔ اس نے دوبارہ ٹل لگانے کا ارادہ کیا لیکن دونوں ہی بار چوک گیا۔ ایک منٹ سے کم میں وہ اپنا داؤں پورا کر چکا، بے چارا گھنٹہ بھر پدا لیکن ایک منٹ ہی میں اپنا داؤں کھو بیٹھا۔ میں نے اپنے دل کی وسعت کا ثبوت دیا۔ ''ایک داؤں اور لے لو۔ تم تو پہلے ہی ہاتھ میں چُچ گئے۔''

''نہیں بھیا اب اندھیرا ہو گیا ہے۔''

''تمھاری مشق چھوٹ گئی۔ کیا کبھی کھیلتے نہیں ہو؟''

''کھیلنے کا وقت ہی کہاں ملتا ہے بھیا۔''

ہم دونوں موٹر پر جا بیٹھے اور چراغ جلتے جلتے پڑاؤ پر پہنچ گئے۔

گیا چلتے چلتے بولا۔ ''کل یہاں گلی ڈنڈا ہوگا۔ سب ہی پرانے کھلاڑی کھیلیں گے تم بھی آؤ گے؟ جب تمھیں فرصت ہو سب ہی کھلاڑیوں کو بلا لوں۔''

میں نے شام کا وقت دیا اور دوسرے دن میچ دیکھنے لگا۔ کوئی دس آدمیوں کی منڈلی تھی۔ کئی میرے لڑکپن کے ساتھی نکلے۔ مگر بیشتر نوجوان تھے۔ جنھیں میں پہچان نہ سکا۔ کھیل شروع ہوا۔ میں موٹر پر بیٹھا، تماشا دیکھنے لگا۔ آج گیا کا کھیل اور اس کی کرامت

دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ وہ ٹل لگاتا تو گلی آسمان سے باتیں کرتی۔ کل کی سی وہ جھجک، وہ ہچکچاہٹ وہ بے دلی آج نہ تھی۔ لڑکپن کی جو بات تھی آج اس نے اسے کمال معراج تک پہنچا دیا۔ کہیں کل اس نے مجھے اس طرح پدایا ہوتا تو میں ضرور رونے لگتا۔ اس کے ڈنڈے کی چوٹ کھا کر گلی دو سو گز کی خبر لاتی تھی۔

پدانے والوں میں ایک نوجوان نے کچھ بے عنوانی کی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ میں نے گلی دبوچ لی ہے۔ گیا کا کہنا تھا گلی زمین سے لگ کر اچھلی ہے۔ اس پر دونوں میں تال ٹھونکنے کی نوبت آئی۔ نوجوان دب گیا۔ گیا کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ میں کھیل میں نہ تھا مگر دوسروں کے اس کھیل میں مجھے وہی لڑکپن کا لطف آرہا تھا، جب ہم سب کچھ بھول کر کھیل میں مست ہو جاتے تھے، اب مجھے معلوم ہوا کہ گیا کل میرے ساتھ کھیلا نہیں صرف کھیلنے کا بہانہ کیا۔ اس نے مجھے قابلِ رحم سمجھا۔ میں نے دھاندلی کی، بے ایمانیاں کیں اسے ذرا بھی غصہ نہ آیا، اس لیے کہ وہ کھیل نہ رہا تھا مجھے کھلا رہا تھا۔ میرا جی رکھ رہا تھا۔ وہ پدا کر میرا کچومر نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اب افسر ہوں۔ یہ افسری میرے اور اس کے درمیان اب دیوار بن گئی ہے۔ میں اب اس کا لحاظ پا سکتا ہوں، ادب پا سکتا ہوں لیکن اس کا ہمجولی نہیں بن سکتا۔ لڑکپن تھا۔ تب میں اس کا ساتھی تھا۔ ہم میں کوئی بھید نہ تھا۔ یہ عہدہ پا کر اب میں اس کے رحم کے قابل ہوں، وہ اب مجھے اپنا جوڑ نہیں سمجھتا۔ وہ بڑا ہو گیا ہے۔ میں چھوٹا ہو گیا ہوں۔

(یہ افسانہ بنارس کے ہندی ماہنامہ 'ہنس' کے فروری 1933 کے شمارے میں شائع ہوا۔ 'مان سروور 1' میں شامل ہے۔ اردو میں یہ واردات میں شائع ہوا۔)

ویشیا

چھ مہینے بعد کلکتے سے گھر آنے پر دیا کرشن نے پہلا کام جو کیا، وہ اپنے پریہ متر سنگار سنگھ سے ماتم پرسی کرنے جانا تھا۔ سنگار کے پتا کا آج تین مہینے ہوئے دیہانت ہوگیا تھا۔ دیا کرشن وِیَست رہنے کے کارن اس سے نہ آسکا تھا۔ ماتم پرسی کی رسم پتر لکھ کر ادا کردی تھی، لیکن ایسا ایک دن بھی نہیں بیتا کہ سنگار کی یاد اسے نہ آئی ہو۔ ابھی وہ دو چار مہینے اور کلکتے رہنا چاہتا تھا، کیونکہ وہاں اس نے جو کاروبار جاری کیا تھا اسے سنگٹھِت روپ میں لانے کے لیے اس کا وہاں موجود رہنا ضروری تھا اور اس کے تھوڑے دن کی غیرحاضری سے بھی ہانی کی شنکا تھی۔ کنتو جب سنگار کی اِستری لیلا کا پروانہ پہنچا تو وہ اپنے کو روک نہ سکا۔ لیلا نے صاف صاف تو کچھ نہ لکھا تھا۔ کیول اسے تُرنت بلایا تھا، لیکن دیا کرشن کو پتر کے شبدوں سے کچھ ایسا انومان ہوا کہ وہاں کی پرستھتی چنتاجنک ہے اور اس اَوسر پر اس کا وہاں پہنچنا ضروری ہے، سنگار سمپن باپ کا بیٹا تھا، بڑا ہی الہڑ، بڑا ہی ضدی، بڑا ہی آرام پسند۔ دِرڑھتا (استقامت) یا لگن اسے چھو بھی نہیں گئی تھی۔ اس کی ماں اس کے بچپن ہی میں مر چکی تھی اور باپ نے اس کے پالنے میں نینترن (ضابطے) کی اپیکشا سنیہ سے زیادہ کام لیا تھا۔ اسے کبھی دنیا کی ہوا لگنے نہ دی۔ اُدیوگ بھی کوئی وستو ہے، یہ وہ جانتا ہی نہ تھا۔ اس کے محض اشارے پر ہر ایک چیز سامنے آجاتی تھی۔ وہ جوان بالک تھا، جس میں نہ اپنے وچار تھے، نہ سِدھانت۔ کوئی بھی آدمی اسے بڑی آسانی سے اپنے کپٹ بانوں کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ مختاروں اور منیموں کے داؤں پیچ سمجھنا اس کے لیے لوہے کے چنے چبانا تھا۔ اسے کسی ایسے سمجھدار اور ہتیشی (خیرخواہ) متر کی ضرورت تھی، جو سوارتھیوں کے ہتھکنڈوں سے اس کی رکشا کرتا رہے۔ دیا کرشن پر اس گھر کے بڑے بڑے احسان تھے۔ اسے دوستی کا حق ادا کرنے کے لیے آنا ضروری تھا۔

منہ ہاتھ دھو کر سنگار سنگھ کے گھر پر ہی بھوجن کا ارادہ کر کے دیا کرشن اس سے ملنے چلا۔ نو بج گئے تھے، ہوا اور دھوپ میں گرمی آنے لگی تھی ۔ سنگار سنگھ اس کی خبر پاتے ہی باہر نکل آیا۔ دیا کرشن اسے دیکھ کر چونک پڑا۔ لمبے لمبے کیشوں کی جگہ پر اس کے سر پر گھنگھرالے بال تھے(وہ سِکھ تھا) آڑی مانگ نکلی ہوئی، آنکھوں میں نہ آنسو تھے، نہ شوک کا کوئی دوسرا چنہ، چہرا کچھ زرد اوشیہ تھا پر اس پر وِلاستا (آرام پسندی) کی مسکراہٹ تھی۔ وہ ایک مہین ریشمی قمیض اور مخملی جوتے پہنے ہوئے تھا۔ مانو کسی محفل سے اٹھا آرہا ہو۔ سنویدنا کے شبد دیاکرشن کے ہونٹوں تک آکر نراش لوٹ گئے۔ وہاں بدھائی کے شبد زیادہ اَنُوکول پرتیت ہو رہے تھے۔ سنگار سنگھ لپک کر اس کے گلے سے لپٹ گیا اور بولا۔ تم خوب آئے یار، ادھر تمھاری بہت یاد آرہی تھی، مگر پہلے یہ بتلا دو، وہاں کا کاروبار بند کر آئے یا نہیں؟ اگر وہ جھنجھٹ چھوڑ آئے ہو تو پہلے اسے تِلانجلی دے آؤ۔ اب آپ یہاں سے نہ جانے پائیں گے۔ میں نے تو بھائی، اپنا کینڈا بدل دیا۔ بتاؤ، کب تک تپسیا کرتا۔ اب تو آئے دن جلسے ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا- یار، دنیا میں آئے تو کچھ دن سیر سپاٹے کا آنند بھی اٹھا لو۔ نہیں تو ایک دن یوں ہی ہاتھ ملتے چلے جائیں گے۔ کچھ بھی ساتھ نہ جائے گا۔

دیا کرشن وِسمے (حیرت) سے اس کے منہ کی اور تاکنے لگا۔ یہ وہی سنگار ہے یا کوئی اور۔ باپ کے مرتے ہی اتنی تبدیلی دونوں مِتر کمرے میں گئے اور صوفے پر بیٹھے۔ سردار صاحب کے سامنے اس کمرے میں فرش اور مسند تھی، الماری تھی، اب درجنوں گدّے دار صوفے اور کرسیاں ہیں، قالین کا فرش ہے، ریشمی پردے ہیں، بڑے بڑے آئینے ہیں۔ سردار صاحب کو سنچے کرنے کی دھن تھی، سگار کو اڑانے کی دھن ہے۔

سنگار نے ایک سیگار جلاکر کہا۔ تیری بہت یاد آتی تھی یار- تیری جان کی قسم۔

دیا کرشن نے شکوہ کیا۔ کیوں جھوٹ بولتے ہو بھائی، مہینوں گزر جاتے تھے ایک خط لکھنے کو تو آپ کو فرصت نہ ملتی تھی، میری یاد آتی تھی۔

سنگار نے الہڑ پن سے کہا۔ بس، اسی پر میری صحت کا ایک جام پیو۔ ارے یار، اس زندگی میں اور کیا رکھا ہے؟ ہنسی کھیل میں جو وقت کٹ جائے، اسے غنیمت سمجھو۔ میں نے یہ تپسیا تیاگ دی۔ اب تو آئے دن جلسے ہوتے ہیں کبھی دوستوں کی دعوت

ہے، کبھی دریا کی سیر، کبھی گانا بجانا، کبھی شراب کا دور، میں نے کہا لاؤ کچھ دن وہ بہار بھی دیکھ لوں۔ حسرت کیوں دل میں رہ جائے۔ جس نے مزے نہیں چکھے، اس کا جیون وِیرتھ (بیکار) ہے۔ بس دوستوں کی مجلس ہو، بغل میں معشوق ہو اور ہاتھ میں پیالا ہو، اس کے سوا مجھے کچھ اور نہ چاہیے!

اس نے الماریب کھول کر ایک بوتل نکالی اور دو گلاسوں میں شراب ڈال کر بولا۔ یہ میری صحت کا جام ہے۔ انکار نہ کرنا۔ میں تمھاری صحت کا جام پیتا ہوں۔

دیا کرشن کو بھی شراب پینے کا اَوسر نہ ملا تھا۔ وہ اتنا دھرماتما تو نہ تھا کہ شراب پینا پاپ سمجھتا۔ ہاں، اسے درویَسن سمجھتا تھا گندھ ہی سے اس کا جی مالش کرنے لگا۔ اسے بھَیہ (خوف) ہوا کہ وہ شراب کا گھونٹ چاہے منہ میں لے لے، اسے کنٹھ کے نیچے نہیں اتار سکتا۔ اس نے پیالے کو شِشٹاچار (اخلاقاً) کے طور پر ہاتھ میں لے لیا، پھر اسے جیوں کا تیوں میز پر رکھ کر بولا۔ تم جانتے ہو، میں نے کبھی نہیں پی۔ اس سَمے مجھے چھما کرو۔ دس پانچ دن میں یہ فن سیکھ جاؤں گا مگر یہ تو بتلاؤ اپنا کاروبار بھی کچھ دیکھتے ہو، یا اسی میں پڑے رہتے ہو۔

سنگار نے اُروچی (غیر دلچسپی) سے منہ بنا کر کہا۔ اوہ، کیا ذکر تم نے چھیڑ دیا یار؟ کاروبار کے پیچھے اس چھوٹی سی زندگی کو تباہ نہیں کر سکتا، نہ کوئی ساتھ لایا ہے، نہ ساتھ لے جائے گا۔ پاپا نے مر مر کر دھن سنچے کیا، کیا ہاتھ لگا؟ پچاس تک پہنچتے پہنچتے چل بسے۔ ان کی آتما اب بھی سنسار کے سکھوں کے لیے ترس رہی ہوگی۔ دھن چھوڑ کر کہیں مرنے سے فاقے مست رہنا کہیں اچھا ہے۔ دھن کی چنتا تو نہیں ستاتی، پر یہ ہائے ہائے تو نہیں ہوتی کہ میرے بعد کیا ہوگا! تم نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ ذرا پیو، آنکھیں کھل جائیں گی، دل ہرا ہو جائے گا اور لوگ سوڈا اور برف ملاتے ہیں۔ میں تو خالص پیتا ہوں۔ اچھا کہو تمھارے لیے برف منگاؤں؟

دیا کرشن نے پھر چھما مانگی، مگر سنگار گلاس پر گلاس پیتا گیا، اس کی آنکھیں لال لال نکل آئیں، اُول جلول بکنے لگا، خوب ڈینگیں ماریں، پھر بے سُرے راگ میں ایک بازارو گیت گانے لگا۔ اَنت میں اسی کرسی پر پڑا پڑا بے سُدھ ہوگیا۔

(2)

سہسا پیچھے کا پردہ ہٹا اور لیلا نے اسے اشارے سے بلایا۔ دیا کرشن کی دھمنیوں میں شت گن ویگ (رگوں میں تیز رفتار) سے رَکت دوڑنے لگا۔ اس کی سنکوچ مَے، بھیر و پرکرتی بھیتر سے جتنی ہی روپا سکت تھی، باہر سے اتنی ہی وِرکت۔ سندریوں کے سمّکھ آکر وہ سویم اواک ہو جاتا تھا، اس کے کپولوں پر لجّا کی لالی دوڑ جاتی تھی اور آنکھیں جھک جاتی تھیں۔ لیکن من ان کے چرنوں پر لوٹ کر اپنے آپ کو سمرپت کر دینے کے لیے، وِکل (بے چین) ہو جاتا تھا۔ مِتر گن اسے بوڑھا بابا کہا کرتے تھے۔ استریاں اسے اَرسِک (خشک مزاج) سمجھ کر اس سے اداسین رہتی تھیں۔ کسی یووتی کے ساتھ لنکا تک ریل میں یکانت یاترا کر کے بھی وہ اس سے ایک شبد بھی بولنے کا ساہس نہ کرتا، ہاں یدی یووتی سویم اسے چھیڑتی، تو وہ اپنے پران تک اس کو بھینٹ کر دیتا۔ اس کے اس سنکوچ مے اوردھ جیون میں لیلا ہی ایک یووتی تھی۔ جس نے اس کے من کو سمجھا تھا اور اس سے سواک سَہر دیتا کا ویوہار کیا تھا۔ تبھی سے دیا کرشن من سے اس کا اُپاسک ہو گیا تھا۔ اس کے اُنوبھوشُنیہ ہردے میں لیلا ناری جاتی کا سب سے سندر آدرش تھی۔ اس کی پیاسی آتما کو شربت یا لیمنیڈ کی اتنی اِچھا نہ تھی جتنی ٹھنڈے میٹھے پانی کی ۔ لیلا میں روپ ہے، لاونیہ ہے، سُکمارتا ہے ان باتوں کی اُور اُس کا دھیان نہ تھا۔ اس سے زیادہ روپ وتی، لاونیمئی اور سکمار یُوتیاں اس نے پارکوں میں دیکھی تھیں۔ لیلا میں سہر دیتا ہے، وِچار ہے، دیا ہے، انھیں تتوں (حقیقتوں) کی اور اس کا آکرشن تھا۔ اس کی رسِکتا میں آتم سمرپن کے سِوا اور کوئی بھاؤ نہ تھا۔ لیلا کے کسی آدیش کا پالن کرنا، اس کی سب سے بڑی کامنا تھی۔ اس کی آتما کی ترپتی کے لیے اتنا کافی تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے پردہ اٹھایا اور اندر جا کر کھڑا ہو گیا اور وِسمے (استعجاب) بھری آنکھوں سے اسے دیکھنا لگا۔ اس نے لیلا کو یہاں نہ دیکھا ہوتا، تو پہچان بھی نہ سکتا وہ روپ، یُوون اور وکاس کی دیوی اس طرح مرجھا گئی تھی جیسے کسی نے اس کے پرانوں کو چوس کر نکال لیا ہو۔ کرُون سور میں بولا۔ یہ تمھارا کیا حال ہے، لیلا؟ بیمار ہو گیا۔ مجھے سوچنا تک نہ دی۔

لیلا مسکرا کر بولی، تم سے مطلب؟ میں بیمار یا اچھی ہوں، تمھاری بلا سے ! تم تو

اپنے سیر سپاٹے کرتے رہے۔ چھ مہینے کے بعد جب آپ کو یاد آئی ہے، تو پوچھتے ہو، بیمار ہو؟ میں اس روگ سے گرست ہوں، جو پران لے کر ہی چھوڑتا ہے۔ تم نے ان مہاشے کی حالت دیکھی؟ ان کا یہ رنگ دیکھ کر میرے دل پر کیا گزرتی ہے، یہ کیا میں اپنے منہ سے کہوں گی، تبھی سمجھو گے۔ میں اب اس گھر میں زبردستی پڑی ہوں اور بے حیائی سے جیتی ہوں۔ کسی کو میری چاہ یا چنتا نہیں ہے۔ پاپا کیا مرے، میرا سہاگ ہی اٹھ گیا۔ کچھ سمجھتی ہوں، تو بیوقوف بنائی جاتی ہوں۔ رات رات بھر نہ جانے کہاں غائب رہتے ہیں۔ جب دیکھو نشے میں مست، ہفتوں گھر میں نہیں آتے کہ دو باتیں کر لوں، اگر ان کے یہی ڈھنگ رہے، تو سال دو سال میں روٹیوں کے محتاج ہو جائیں گے۔

دیا نے پوچھا۔ یہ لت انھیں کیسے پڑ گئی؟ یہ باتیں تو ان میں نہ تھیں!

لیلا نے ویتھت سُور میں کہا - روپے کی بلیہاری ہے اور کیا! اسی لیے تو بوڑھے مرمر کے کماتے ہیں اور مرنے کے بعد لڑکوں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ اپنے من میں سمجھتے ہوں گے، ہم لڑکوں کے لیے بیٹھنے کا ٹھکانہ کیے جاتے ہیں۔ میں کہتی ہوں تم ان کا سَروناش کیے جاتے ہو، ان کے لیے زہر بوئے جائے ہو۔ پاپا نے لاکھوں روپے کی سمپتی نہ چھوڑی ہوتی تو آج یہ مہاشے کسی کام میں لگے ہوتے، کچھ گھر کی چنتا ہوتی، کچھ ذمہ داری ہوتی، نہیں تو بینک سے روپیے نکالے اور اُڑائے۔ اگر مجھے وِشواس ہوتا کہ سمپتی سماپت کر کے یہ سیدھے مارگ پر آجائیں گے، تو مجھے ذرا بھی دکھ نہ ہوتا، پر مجھے تو یہ بھئے ہے کہ ایسے لوگ پھر کسی کام کے نہیں رہتے۔ یا تو جیل خانے میں مرتے ہیں یا اناتھالیہ میں۔ آپ کی ایک ویشیا سے آشنائی ہے۔ مادھوری نام ہے اور وہ انھیں الٹے چھرے سے مونڈ رہی ہے، جیسا اس کا دھرم ہے۔ آپ کو یہ خبط ہوگیا کہ وہ مجھ پر جان دیتی ہے۔ اس سے ویواہ کا پرستاؤ بھی کیا جا چکا ہے۔ معلوم نہیں، اس نے کیا جواب دیا۔ کئی بار جی میں آیا کہ جب یہاں کسی سے کوئی ناطہ ہی نہیں تو اپنے گھر چلی جاؤں، لیکن ڈرتی ہوں کہ تب تو یہ اور بھی سوتنتر ہو جائیں گے۔ مجھے کسی پر وِشواس ہے تو وہ تم ہو۔ اس لیے تمھیں بلایا تھا کہ شاید تمھارے سمجھانے بجھانے کا کچھ اثر ہو۔ اگر تم بھی اَسپھل ہوئے تو میں ایک چھن یہاں نہیں رہوں گی۔ بھوجن تیار ہے، چلو کچھ کھا لو۔

دیا کرشن نے سنگار سنگھ کی اُور سنکیت کر کے کہا اور یہ؟

'یہ تو اب کہیں دو تین بجے تک چتیں گے'

'برا نہ مانیں گے'

'میں اب ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتی۔ میں نے تو نشچئے کر لیا ہے کہ اگر مجھے کبھی آنکھیں دکھائیں تو میں انھیں مزہ چکھا دوں گی۔ میرے پتا جی فوج میں صوبے دار میجر ہیں۔ میری دِیہہ میں ان کا رکت ہے۔'

لیلا کی مُدرا (صورت) اُتّے جِت (جذباتی) ہوگئی۔ وِدروہ کی وہ آگ ، جو مہینوں سے پڑی سُلگ رہی تھی، پر چنڈ ہو اٹھی۔

اس نے اسی لہجے میں کہا- میری اس گھر میں اتنی سانست ہوئی ہے، اتنا اَپمان ہوا ہے اور ہو رہا ہے کہ میں اس کا کسی طرح بھی پرتیکار کرکے آتم گِلانی کا اُنوبھو نہ کروں گی۔ میں نے پاپا سے اپنا حال چھپا رکھا ہے۔ آج لکھ دوں، تو ان کی ساری مشیخت اتر جائے۔ ناری ہونے کا دنڈ بھوگ رہی ہوں۔ لیکن ناری کے دھیرج کی بھی سیما ہے۔

دیا کرشن اس سکماری کا وہ تمتمایا ہوا چہرہ، وے جلتی ہوئی آنکھیں، وہ کانپتے ہوئے ہونٹ دیکھ کر کانپ اٹھا۔ اس کی دشا اس آدمی کی سی ہوگئی جو کسی کو درد سے تڑپتے دیکھ کر وَید کو بلانے دوڑے۔ آردر کنٹھ (بھرّائی ہوئی آواز) سے بولا۔ اس سمے مجھے چھما کرو لیلا، پھر کبھی تمھارا نمنترن (دعوت) سیوکار کروں گا۔ تمھیں اپنی اُور سے اتنا ہی وشواس دلاتا ہوں کہ مجھے اپنا سیوک سمجھتی رہنا۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ تمھیں اتنا کشٹ ہے، نہیں تو شاید اب تک میں نے کچھ یکتی سوچی ہوتی۔ میرا یہ شریر تمھارے کسی کام آئے، اس سے بڑھ کر سوبھاگیہ کی بات میرے لیے اور کیا ہوگی!

دیا کرشن یہاں سے چلا تو اس کے من میں اتنا اُلّاس (خوشی) بھرا ہوا تھا مانو وِمان پر بیٹھا ہوا سورگ کی اُور جارہا ہے۔ آج اُسے جیون میں ایسا لکشے (مقصد) مل گیا تھا، جس کے لیے وہ جی بھی سکتا ہے اور مر بھی سکتا ہے۔ وہ ایک مہیلا کا وِشواس پاتر ہو گیا تھا۔ اس رتن کو وہ اپنے ہاتھ سے کبھی نہ جانے دے گا، اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

(3)

ایک مہینہ گزر گیا۔ دیا سنگھ سنگار سنگھ کے گھر نہیں آیا۔ نہ سنگار نے اس کی پرواہ کی۔ اس ایک ہی ملاقات میں اس نے سمجھ لیا تھا کہ دیا اس نئے رنگ میں آنے والا آدمی نہیں ہے۔ ایسے ساتوِک جنوں کے لیے اس کے یہاں استھان نہ تھا۔ وہاں تو رنگیلے، رسیا، عیاش اور بگڑے دلوں ہی کی چاہ تھی۔ ہاں لیلا کو ہمیشہ اس کی یاد آتی رہتی تھی۔

مگر دیا کرشن کے سوبھاؤ میں اب وہ سَنیم (استقلال، قابو) نہیں ہے۔ وِلاستا کا جادو اس پر بھی چلتا ہوامعلوم ہوتا ہے۔ مادھوری کے گھر اس کا بھی آنا جانا شروع ہو گیا ہے۔ وہ سنگار سنگھ کا مِتر نہیں رہا۔ پرتی دُوندی (حریف) ہوگیا ہے۔ دونوں ایک ہی پرتِما کے اُپاسک ہیں، مگر ان کی اُپاسنا میں انتر ہے۔ سنگار کی درشٹی سے مادھوری کیول وِلاس کی ایک وستو ہے، کیول وِنود کا ایک ینتر۔ دیا کرشن وِنے کی ایک مورتی ہے جو مادھوری کی سیوا میں ہی پرسن ہے۔ سنگار مادھوری کے ہاس وِلاس کو اپنا زر خرید حق سمجھتا ہے، دیا کرشن اسی میں سَنتشٹ ہے کہ مادھوری اس کی سیواؤں کو سویکار کرتی ہے۔ مادھوری کی اُور سے ذرا بھی اروچی دیکھ کر وہ اسی طرح بگڑ جائے گا جیسے اپنی پیاری گھوڑی کی منہ زوری پر۔ دیا کرشن اپنے کو اس کی کرپا درشٹی کے یوگیہ ہی نہیں سمجھتا۔ سنگار جو کچھ مادھوری کو دیتا ہے، گرو بھرے آتم پردرشن کے ساتھ! مانو اس پر کوئی احسان کر رہا ہو۔ دیا کرشن کے پاس دینے کو ہے ہی کیا، پر وہ جو کچھ بھینٹ کرتا ہے، وہ ایسی شردھا سے، مانو دیوتا کو پھول چڑھاتا ہو۔ سنگار کا آسکت من مادھوری کو اپنے پنجرے میں بند رکھنا چاہتا ہے۔ جس میں اس پر کسی کی نگاہ نہ پڑے۔ دیا کرشن نرلپت بھاؤ سے اس کی سوچھند کریڑا کا آنند اٹھاتا ہے۔ مادھوری کو اب تک جتنے آدمیوں سے سابقہ پڑا تھا وہ سب سنگار سنگھ کی ہی بھانتی کامکی (پرشہوت) اِرشیالُو (حاسد)، دمبھی اور کومل بھاؤ سے شُنیہ تھے، روپ کو بھوگنے کی وستو سمجھنے والے۔ دیا کرشن ان سبھوں سے الگ تھا۔ سہر دئی، بھدر اور سیوا شیل، مانو اسی پر اپنی آتما کو سمرپن کر دینا چاہتا ہو۔ مادھوری کو اب اپنے جیون میں کوئی ایسا پدارتھ مل گیا ہے جسے وہ بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھنا چاہتی ہو۔ جڑاؤ گہنے اب اس کی آنکھوں میں مولیہ وان نہیں رہے، جتنی یہ فقیر کی دی ہوئی

تعویز، جڑاؤ گہنے ہمیشہ ملیں گے، یہ تعویز کھو گئی تو پھر شاید ہی کبھی ہاتھ آئے۔ جڑاؤ گہنے کیول اس کی وِلاس پرورتی کو اتیجت کرتے ہیں۔ پر اس تعویز میں کوئی دَیوی شکتی ہے، جو نہ جانے کیسے اس میں سَد نُوراگ اور پَرشِکار بھاؤنا کو جگاتی ہے۔ دیا کرشن کبھی پریم پردرشن نہیں کرتا۔ اپنی وِرہ وِیتھا کے راگ نہیں الاپتا پر مادھوری کو اس پر وِشواس ہے۔ سنگار سنگھ کے پرلاپ میں اسے بناوٹ اور دکھاوے کا آبھاس ہوتا ہے۔ وہ چاہتی ہے، یہ جلدی یہاں سے ٹلے۔ لیکن دیا کرشن کے سَنیت بھاشن سے اسے گہرائی اور گامبھریہ اور گرتُو کا آبھاس ہوتا ہے۔ اوروں کی وہ پریمکا ہے، لیکن دیا کرشن کی عاشق، جس کے قدموں کی آہٹ پا کر اس کے اندر ایک طوفان اٹھنے لگتا ہے۔ اس کے جیون میں یہ نئی اُنوبھوتی ہے۔ اب تک وہ دوسروں کے بھوگ کی وستو تھی۔ اب کم سے کم ایک پرانی کی دِرشٹی میں وہ آدر اور پریم کی وستُو ہے۔

سنگار سنگھ کو جب سے دیا کرشن کے اس پَریم ابھیئے کی سُوچنا ملی ہے، وہ اس کے خون کا پیاسا ہوگیا۔ اِرشیاگنی (حسد کی آگ) سے پھنکا جارہا ہے۔ اس نے دیا کرشن کے پیچھے شُہدے لگا رکھے ہیں کہ وہ اسے جہاں پایں اس کا کام تمام کردیں۔ وہ خود پستول لیے اس کی ٹوہ میں رہتا ہے۔ دیا کرشن اس خطرے کو سمجھتا ہے، جانتا ہے، اپنے نیت (مقررہ) سمئے پر مادھوری کے پاس بلا ناغہ آجاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، اسے اپنی جان کا کچھ بھی موہ نہیں ہے۔ شہدے اس کو دیکھ کر کیوں کترا جاتے ہیں، موقع پا کر بھی کیوں اس پر وار نہیں کرتے ، اس کا رَہسیہ وہ نہیں سمجھتا۔ایک دن مادھوری نے اس سے کہا۔ کرشن جی، تم یہاں نہ آیا کرو، تمھیں تو پتہ نہیں ہے پر یہاں تمھارے بیسیوں دشمن ہیں۔ میں ڈرتی ہوں کہ کسی دن کوئی بات نہ ہوجائے!

شِشِر کی تشار منڈِت سندھیا تھی۔ مادھوری ایک کشمیری شال اوڑھے انگیٹھی کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ کمرے میں بجلی کا رَجت (چاندی) پرکاش پھیلا ہوا تھا۔ دیا کرشن نے دیکھا مادھوری کی آنکھیں سَجل ہوگئی ہیں اور وہ منہ پھیر کر دیا کرشن سے چھپانے کی چیشٹا کر رہی ہے۔ پردرشن اور سکھ بھوگ کرنے والی رمنی کیوں اتنا سنکوچ کر رہی ہے یہ اس کا اناڑی من نہ سمجھ سکا۔ ہاں ، مادھوری کے گورے ، پرسنّ، سنکوچ ہیں (نہ جھجھکنے والی) مکھ پر لجّا، مِشرِت مدھورِما کی ایسی چھٹا اس نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ آج اس نے مجھ

پر گُل ودھو کی بھیرو آکانچھا اور دِرِڑھ واتسلیہ دیکھا اور اس کے ابھنئے میں ستے کا ادے ہو گیا۔ اس نے اِستھر بھاؤ سے جواب دی- میں تو کسی کی برائی نہیں کرتا، مجھ سے کسی کو کیوں وَیر ہونے لگا۔ میں یہاں کسی کا بادھک نہیں ، کسی کا ورودھی نہیں، داتا کے دوار پر سبھی بِھکشک جاتے ہیں۔ اپنا اپنا بھاگیہ ہے، کسی کو ایک چٹکی ملتی ہے، کسی کو پورا تھال۔ کوئی کیوں کسی سے جلے؟ اگر کسی پر تمھاری وِشیش (خاص) کرپا ہے، تو میں اسے بھاگیہ شالی سمجھ کر اس کا آدر کروں گا۔ جلوں کیوں؟

مادھوری نے سنیہہ کا ترسُور میں کہا۔ جی نہیں آپ کل سے نہ آیا کیجیے دیا کرشن مسکرا کر بولا۔ تم مجھے یہاں آنے سے نہیں روک سکتیں۔ بھکشک کو تم دُتکار سکتی ہو، دوار پر آنے سے نہیں روک سکتیں۔ مادھوری سنیہہ کی آنکھوں سے اس کو دیکھنے لگی، پھر بولی۔ کیا سبھی آدمی تمھیں جیسے نِشکپٹ ہیں؟

'تو پھر میں کیا کروں'

'یہاں نہ آیا کرو'

'یہ میرے بس کی بات نہیں ہے'

مادھوری ایک چھن تک وِچار کر کے بولی۔ ایک بات کہوں، مانوگے؟ ہم تم کسی دوسرے نگر کی راہ لیں۔

'کیول اس لیے کہ کچھ لوگ مجھ سے خار کھاتے ہیں؟'

'خار نہیں کھاتے ، تمھاری جان کے گراہک ہیں۔'

دیا کرشن اسی اَوچلِت بھاؤ سے بولا۔ جس دن پریم کا یہ پُرسکار ملے گا، وہ میرے جیون کا نیا دن ہوگا، مادھوری !اس سے اچھی مِرتیو اور کیا ہوسکتی ہے؟ جب میں تم سے پرتھک (الگ) نہ رہ کر تمھارے من میں ، تمھاری اُسمرتی میں رہوں گا۔ مادھوری نے کومل ہاتھ سے اس کے گال پر تھپکی دی۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں، ان شبدوں میں جو پیار بھرا ہوا تھا، وہ جیسے پچکاری کی دھار کی طرح اس کے ہردَے میں سما گیا۔ ایسی وِکل ویدنا، ایسا نشہ! اسے وہ کیا کہے؟

اس نے کرُن سُور میں کہا۔ ایسی باتیں نہ کیا کرو کرشن، نہیں تو میں سچ کہتی ہوں، ایک دن زہر کھا کر تمھارے چرنوں پر سو جاؤں گی۔ تمھارے ان شبدون میں نہ جانے کیا

جادو تھا کہ میں جیسے پھنک اٹھی۔ آپ خدا کے لیے یہاں نہ آیا کیجیے، نہیں تو دیکھ لینا، میں ایک دن پران دے دوں گی۔ تم کیا جانو، ہتیارا سنگار کس بری طرح تمھارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں اس کے شُہدوں کی خوشامد کرتے کرتے ہار گئی ہوں۔ کتنا کہتی ہوں دیا کرشن سے میرا کوئی سمبندھ نہیں ہے، اس کے سامنے تمھاری نِندا کرتی ہوں لیکن اس نِردئی کو مجھ پر وِشواش نہیں آتا۔ تمھارے لیے ان غنڈوں کی کتنی منّتیں کی ہیں، ان کے ہاتھ کتنا اَپمان سَہا ہے، وہ تم سے نہ کہنا ہی اچھا ہے۔ جن کا منہ دیکھنا بھی میں اپنے شان کے خلاف سمجھتی ہوں، ان کے پیروں پڑی ہوں، لیکن یہ کتّے ہڈیوں کے ٹکڑے پاکر اور بھی شیر ہو جاتے ہیں۔ میں اب ان سے تنگ آگئی ہوں اور تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ یہاں سے کسی ایسی جگہ چلے چلو جہاں ہمیں کوئی نہ جانتا ہو۔ وہاں شانتی کے ساتھ پڑے رہیں۔ میں تمھارے ساتھ سب کچھ جھیلنے کو تیار ہوں۔ آج اس کا نِشچئے کرائے بنا تمھیں نہ جانے دوں گی۔ میں جانتی ہوں، تمھیں مجھ پر اب بھی وِشواس نہیں ہے۔ تمھیں سندِیہ ہے کہ تمھارے ساتھ کپٹ کروں گی۔

دیا کرشن نے ٹوکا- نہیں مادھوری، تم میرے ساتھ انیائے کر رہی ہو ۔ میرے من میں کبھی ایسا سندیہہ نہیں آیا۔ پہلے ہی دن نہ جانے کیوں کچھ ایسا پرتیت ہوا کہ تم اپنی اور بہنوں سے پرتھک ہو۔ میں نے تم میں وہ شیل اور سنکوچ دیکھا جو میں نے کُل وَدھوؤں میں دیکھا ہے۔

مادھوری نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گڑا کر کہا - تم جھوٹ بولنے کی کلا میں اتنے نِی پُن (ماہر) نہیں ہو کرشن، کہ وِیشیا کو بھلاوا دے سکو! میں نہ شیل وتیھوں، نہ سنکوچ وتی (ہچکچانے والی) ہوں اور نہ اپنی دوسری بہنوں سے بھِنیہ (مختلف) ہوں، میں ویشیا ہوں، اتنی ہی کُلوشِت اتنی ہی وِلاساندھ، اتنی ہی مایاوِنی جتنی میری دوسری بہنیں، بلکہ ان سے کچھ زیادہ۔ نہ تم ان سے پُروشوں کی طرح میرے پاس وِنود اور واسنا ترپتی کے لیے آئے تھے۔ نہیں، مہینوں آتے رہنے پر بھی تم یوں اگپت نہ رہتے۔ تم نے کبھی ڈینگ نہیں ماری، مجھے دھن کا پرلوبھن نہیں دیا۔ میں نے بھی کبھی تم سے دھن کی آشا نہیں کی۔ تم نے اپنی واستوِک اِستھتی مجھ سے کہہ دی۔ پھر بھی میں نے تمھیں ایک نہیں، انیک ایسے اَوسر دیے کہ کوئی دوسرا آدمی انھیں نہ چھوڑتا، لیکن تمھیں میں اپنے پنجے میں نہ

41

لاسکی۔ تم چاہے اور جس ارادے سے آئے ہو، بھوگ کی اِچھا سے نہیں آئے۔ اگر میں تمھیں اتنا نیچ ، اتنا ہردَے ہین،اتنا وِلاساندھ سمجھتی تو اس طرح تمھارے ناز نہ اٹھاتی۔ پھر میں بھی تمھارے ساتھ بتر بھاؤ رکھنے لگی، سمجھ لیا میری پریکشا ہو رہی ہے۔ جب تک اس پریکشا میں سپھل نہ ہوجاؤں، تمھیں نہیں پا سکتی۔ تم جتنے بجن ہو، اتنے ہی کٹھور ہو۔

یہ کہتے ہوئے مادھوری نے دیا کرشن کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُنوراگ اور سَمر پن بھری چتونوں سے اسے دیکھ کر بولی ۔ سچ بتاؤ کرشن ، تم مجھ میں کیا دیکھ کر آکرشت ہوئے تھے؟ دیکھو بہانے بازی نہ کرنا۔ تم روپ پر مگدھ ہونے والے آدمی نہیں ہو، میں قسم کھا سکتی ہوں۔

دیا کرشن نے سنکٹ میں پڑ کر کہا۔ روپ اتنی تُچھ (حقیر) وستو نہیں ہے مادھوری ! وہ من کا آئینہ ہے۔

'یہاں مجھ سے روپ وان استریوں کی کمی نہیں ہے۔'

'یہ تو اپنی اپنی نگاہ ہے۔ میرے پُرو سنسکار رہے ہوں گے۔'

مادھوری نے بھویں سکوڑ کر کہا۔ 'تم پھر جھوٹ بول رہے ہو، چہرہ کہے دیتا ہے۔' دیا کرشن نے پراست (ہار کر) ہو کر پوچھا۔ پوچھ کر کیا کروگی مادھوری؟ میں ڈرتا ہوں، کہیں تم مجھ سے گھرِنا نہ کرنے لگو۔ سمجھو ہے، تم میرا جو روپ دیکھ رہی ہو وہ میرا اصلی روپ نہ ہو۔

مادھوری کا منہ لٹک گیا۔ وِرکت سی ہو کر بولی ۔ اس کا کھلے شبدوں میں یہ ارتھ ہے کہ تمھیں مجھ پر وِشواس نہیں ۔ ٹھیک ہے، ویشیاؤں پر وِشواس کرنا بھی نہیں چاہیے، وِدوانوں اور مہاتماؤں کا اُپدیش کیسے نہ مانوگے؟

ناری ہردَے اس سمسیا پر وِجے پانے کے اپنے استروں سے کام لینے لگا۔

دیا کرشن پہلے ہی حملے میں ہمت چھوڑ بیٹھا۔ بولا- تم تو ناراض ہوئی جاتی ہو، مادھوری! میں نے تو کیول اس وچار سے کہا تھا کہ تم مجھے دھوکے باز سمجھنے لگو گی۔ تمھیں شاید معلوم نہیں ہے،سنگار سنگھ نے مجھ پر کتنے اَحسان کیے ہیں۔ میں انھیں کے ٹکڑوں پر پلا ہوں۔ اس میں رتّی بھر بھی مبالغہ نہیں ہے۔ وہاں جا کر جب میں نے ان کے رنگ ڈھنگ دیکھے اور ان کی سادھوی استری لیلا کو بہت دکھی پایا، تو سوچتے سوچتے مجھے یہی

اُپائے سوچا کہ کسی طرح سنگار سنگھ کو تمھارے پنجے سے چھڑاؤں۔ میرے اس ابھیمان کا یہی رہسیہ ہے، لیکن انھیں چھڑا تو نہ سکا، خود پھنس گیا۔ میرے اس فریب کی جو سزا چاہو، دو، سر جھکائے ہوئے ہوں۔

مادھوری کا ابھیمان ٹوٹ گیا۔ جل کر بولی- تو یہ کہیے کہ آپ لیلا دیوی کے عاشق ہیں۔ مجھے پہلے سے معلوم ہوتا، تو تمھیں گھر میں گھسنے نہ دیتی۔ تم تو ایک چھپے رستم نکلے۔

وہ طوطے کے پنجرے کے پاس جاکر اسے پچکارنے کا بہانہ کرنے لگی۔ من میں جو ایک داہ اٹھ رہی تھی، اسے کیسے شانت کریں۔

دیا کرشن نے ترسکار بھرے سُور میں کہا۔ میں لیلا کا عاشق نہیں ہوں مادھوری، اس دیوی کو کلنکِت نہ کرو۔ میں آج تم سے شپتھ کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے کبھی اسے اس نگاہ سے نہیں دیکھا۔ اس کے پرتی میرا وہی بھاؤ تھا جو اپنے کسی آتمیہ کو دکھ میں دیکھ کر ہر ایک مُنشیہ کے من میں آتا ہے۔

'کسی سے پریم کرنا تو پاپ نہیں ہے' تم ویَرتھ میں اپنی اور لیلا کی صفائی دے رہے ہو۔'

'میں نہیں چاہتا کہ لیلا پر کسی طرح کا آچھیپ کیا جائے۔'

'اچھا صاحب لیجیے، لیلا کا نام نہ لوں گی۔ میں نے مان لیا' وہ ستی ہے، سادھوی ہے اور کیول اس کی آگیا سے...''

دیا کرشن نے بات کاٹی۔ ان کی کوئی آگیا نہیں تھی۔

'اوہو تم تو زبان پکڑتے ہو کرشن! چھما کرو، ان کی آگیا سے نہیں تم اپنی اِچھا سے آئے۔ اب تو راضی ہوئے۔ اب یہ بتاؤ، آگے تمھارے کیا ارادے ہیں؟ میں وَچن تو دے دوں گی: مگر اپنے سنسکاروں کو نہیں بدل سکتی۔ میرا من دُربل (کمزور) ہے میرا ستو کب کا نشٹ ہوچکا ہے۔ اَنیہ (دیگر) ملیہ وان پدارتھوں (قیمتی اشیاء) کی طرح روپ اور یوون کی اِچھا بھی بلوان ہاتھوں سے ہوسکتی ہے۔ میں تم سے پوچھتی ہوں، تم مجھے اپنی شرن میں لینے پر تیار ہو؟ تمھارا آشرے پا کر تمھارے پریم کی شکتی سے مجھے وِشواس ہے، میں جیون کے سارے پرلوبھنوں کا سامنا کرسکتی ہوں۔ میں اس سونے کے محل کو ٹھکرا دوں گی، لیکن اس کے بدلے مجھے کسی ہرے وِرکچھ (درخت) کی چھانہہ (سایہ) تو ملنی

چاہیے۔ وہ چھانہہ تم مجھے دوگے۔؟ اگر نہیں دے سکتے تو مجھے چھوڑ دو۔ میں اپنے حال میں مگن ہوں۔ میں وعدہ کرتی ہوں، سنگار سنگھ سے کوئی سمبندھ نہ رکھوں گی، وہ مجھے گھیرے گا، روئے گا! سمجھو ہے غنڈوں سے میرا اَپمان کرائے، آتنک دکھائے۔ لیکن میں سب کچھ جھیل لوں گی، تمھارے خاطر سے...'

آگے اور کچھ نہ کہہ کر وہ ترشنا بھری لیکن اس کے ساتھ ہی نرپیکچھ نیتروں سے دیا کرشن کی اُور دیکھنے لگی، جیسے دُکان دار گاہک کو بلاتا تو ہے، پر ساتھ ہی یہ بھی دکھانا چاہتا ہے کہ اسے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ دیا کرشن کیا جواب دے؟ سنگھرش مے (جدو جہدبھرے) سنسار میں وہ ابھی کیول ایک قدم نکالپایا ہے۔ ادھر وہ انگل بھر جگہ بھی اس سے چھن گئی ہے۔ شاید زور مار کر وہ پھر وہ استھان پا جائے، لیکن وہاں بیٹھنے کی جگہ نہیں اور ایک دوسرے پرانی کولے کر تو وہ کھڑا بھی نہیں رہ سکتا۔ اگر مان لیا جائے کہ ارمے اُدّیوگ سے دونوں کے لیے استھان نکال لے گا، تو آتم سمّان کو کہاں لے جائے؟ سنسار کیا کہے گا؟ لیلا کیاپھر اس کا منہ دیکھنا چاہے گی؟ سنگار سے وہ پھر آنکھیں ملا سکے گا؟ یہ بھی چھوڑو۔ لیلا اگر اسے پتی سمجھتی ہے، سمجھے، سنگار اگر اس سے جلتا ہے تو جلے، اسے اس کی پرواہ نہیں۔ لیکن اپنے من کو کیا کرے؟ وِشواس اس کے اندر آکر جال میں پھنسے پنچھی کی بھانتی پھڑپھڑا کر نکل بھاگتا ہے۔ کُلینا اپنے ساتھ وِشواس کا وَردان لیے آتی ہے۔ اس کے ساہچریہ میں ہمیں کبھی سندیہہ (شک) نہیں ہوتا۔ وہاں سندیہہ کے لیے پرتیکش پرمان چاہیے۔ کتنتا سندیہہ کا سنسکار لیے آتی ہے وہاں وشواس کے لیے پرتیکش اتیت پرتیکش۔ پرمان (ثبوت) کی ضرورت ہے۔اس نے نمرتا سے کہا۔ تم جانتی ہو، میری کیا حالت ہے؟

'ہاں خوب جانتی ہوں'

'اور اس حالت میں تم پرسنّ رہ سکوگی؟

'تم ایسا پرشن کیوں کرتے ہو، کرشن؟ مجھے دکھ ہوتا ہے۔ تمھارے من میں جو سندیہہ ہے، وہ میں جانتی ہوں، سمجھتی ہوں، مجھے بھرم ہوا تھا کہ تم نے بھی مجھے جان لیا ہے، سمجھ لیا ہے، اب معلوم ہوا میں دھوکے میں تھی!'

وہ اٹھ کر وہاں سے جانے لگی۔ دیا کرشن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پرارتھی بھاؤ

سے بولا۔ تم میرے ساتھ انیائے کر رہی ہو، مادھوری! میں ستیہ کہتا ہوں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مادھوری نے کھڑے کھڑے وِرکت من سے کہا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو، بالکل جھوٹ۔ تم اب بھی من سے یہ سویکار نہیں کر رہے ہو کہ کوئی استری سوتچھا (اپنی خواہش) سے روپ کا بیوسائے (تجارت) نہیں کرتی۔ پیسے کے لیے اپنی لجّا کو اُگھاڑنا، تمھاری سمجھ میں کچھ ایسے آنند کی بات ہے، جسے ویشیا شوق سے کرتی ہے۔ تم ویشیا میں اِستریتو (نسوانیت) کا ہونا سمبھو سے بہت دور سمجھتے ہو۔ تم اس کی کلپنا ہی نہیں کر سکتے کہ وہ کیوں اپنے پریم میں اِستھر نہیں ہوتی۔ تم نہیں جانتے کہ پریم کے لیے اس کے من میں کتنی ویاکلتا (بے چینی) ہوتی اور جب وہ سوبھاگیہ سے اسے پا جاتی ہے تو کس طرح پرانوں کے بھانتی اسے سنچت رکھتی ہے۔ کھارے پانی کے سمندر میں میٹھے پانی کا چھوٹا سا پاتر کتنا پریہ ہوتا ہے، اسے وہ کیا جانے جو میٹھے پانی کے مٹکے انڈیلتا رہتا ہو۔

دیا کرشن کچھ ایسے اسمنجس میں پڑا ہوا تھا کہ اس کے منہ سے ایک بھی شبد نہ نکلا۔ اس کے من میں شنکا چنگاری کی بھانتی چھپی ہوئی ہے، وہ باہر نکل کر کتنا بھینکر جوالا اُتپن کر دے گی۔ اس نے کپٹ کا جو ابھینئے کیا تھا۔ پریم کا جو سوانگ رچا تھا، اس کی گلانی اسے اور بھی وِیتھت کر رہی تھی۔ سَہسا (دفعتاً) مادھوری نے نِشٹھُرتا سے پوچھا۔ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟

دیا کرشن نے ایمان کو پی کر کہا- مجھے سوچنے کے لیے کچھ اور سمئے دو مادھوری!

'کیا سوچنے کے لیے؟'

'اپنا کرتویہ کیا ہے؟'

میں نے اپنا کرتویہ سوچنے کے لیے تو تم سے سمئے نہیں مانگا! تم اگر میرے اڈھار کی بات سوچ رہے ہو، تو اسے دل سے نکال ڈالو۔ میں بھرشٹا ہوں اور تم سادھوتا کے پتلے ہو۔ جب تک یہ بھاؤ تمھارے اندر رہے گا، میں تم سے طرح کی بات کروں گی جیسے اوروں کے ساتھ کرتی ہوں۔ اگر بھرشٹ ہوں، تو جو لوگ یہاں اپنا منہ کالا کرنے آتے ہیں وہ کچھ کم بھرشٹ نہیں ہیں۔ تم جو ایک مِتر کی استری پر دانت لگائے ہوئے ہو، تم جو ایک سر لاابلا (کمزور وسیدھی) کے ساتھ جھوٹ پریم کا سوانگ کرتے ہو، تمھارے ہاتھوں اگر مجھے سورگ بھی ملتا ہو، تو اسے ٹھکرادوں۔

دیا کرشن نے لال آنکھیں کر کے کہا۔ تم نے پھر وہی آچھیپ (حملہ/ وار) کیا؟
مادھوری تلملا اٹھی۔ اس کی رہی سہی مرِدوتا بھی اِرشیا کے اُمڈتے ہوئے پرواہ میں سما گئی۔
لیلا پر آچھیپ بھی اَسہیہ ہے، اس لیے کہ وہ کُل ودھو ہے، میں ویشیا ہوں ۔ اس لیے
میرے پریم کا اُپکار بھی سویکار نہیں کیا جا سکتا!

اس نے اُوچِلت بھاؤ سے کہا۔ آچھیپ نہیں کر رہی ہوں، سچی بات کہہ رہی ہوں،
تمھارے ڈر سے بل کھودنے جا رہی ہوں۔ تم سویکار کرو یا نہ کرو، تم لیلا پر مرتے ہو۔
تمھاری لیلا تمھیں مبارک رہے۔ میں اپنے سنگار سنگھ ہی میں پرسن ہوں ۔ اُدھار کی لالسا
(لالچ) اب نہیں رہی۔ پہلے جا کر اپنا اُدھار کرو۔ اب سے خبردار کبھی بھول کر بھی یہاں
نہ آنا، نہیں تو پچھتاؤگے۔ تم جیسے رنگے ہوئے سیتیو کا اُدھار نہیں کرتے۔ اُدھار وہی کر
سکتے ہیں جو اُدھار کے ابھیمان کو ہردے میں آنے ہی نہیں دیتے۔ جہاں پریم ہے وہاں
کسی طرح کا بھید نہیں کر سکتا۔

یہ کہنے کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر برابر والے دوسرے کمرے میں چلی گئی اور اندر
سے دوار بند کر لیا۔ دیا کرشن کچھ دیر وہاں مرماہت سا رہا، پھر دھیرے دھیرے نیچے اتر
گیا، مانو دیہہ (جسم) میں پران نہ ہو۔

(4)

دودن دیا کرشن گھر سے نہ نکلا۔ مادھوری نے اس کے ساتھ جو بیوہار کیا، اس کی
اسے آشا نہ تھی۔ مادھوری کو اس سے پریم تھا، اس کا اسے وِشواس تھا، لیکن جو پریم اتنا
اَسہشنُو ہو، جو دوسرے کے منو بھاؤں کا ذرا بھی وِچار نہ کرے، جو متھیا کلنک آروپن
کرنے سے بھی سنکوچ نہ کرے۔ وہ اُنماد ہو سکتا ہے، پریم نہیں۔ اس نے بہت اچھا کیا
کہ مادھوری کے کپٹ جال میں نہ پھنسا، نہیں تو اس کی نہ جانے کیا دُرگتی ہوتی۔

پر دوسرے چھن اس کے بھاؤ بدل جاتے اور مادھوری کے پرتی اس کا من کوملتا
سے بھر جاتا۔ اب وہ اپنی انودارتا پر، اپنی سنکیرنتا (تنگ نظری) پر پچھتاتا! اسے مادھوری
پر سندیہہ کرنے کا کوئی کارن نہ تھا۔ ایسی دَشا میں اِرشیا سوبھاوک ہے اور وہ اِرشیا ہی
کیا، جس میں ڈنک نہ ہو، وِش نہ ہو۔ مانا، سماج اس کی نِندا کرتا۔ یہ بھی مان لیا کہ

مادھوری ستی بھاریہ نہ ہوتی۔ کم سے کم سنگار سنگھ تو اس کے پنجے سے نکل جاتا۔ دیا کرشن کے سر سے رِن (قرض) کا بھار تو کچھ ہلکا ہو جاتا، لیلا کا جیون تو سکھی ہوجاتا۔

سَہسا کسی نے دوار کھٹکھٹایا۔ اس نے دوار کھولا تو سنگار سنگھ سامنے کھڑا تھا۔ بال بکھرے ہوئے کچھ است ویَست۔

دیا کرشن نے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ 'کیا پاؤں پاؤں ہی آرہے ہو، مجھے کیوں نہ بلا لیا؟'

سنگار سنگھ نے اسے چبھتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا- میں تم سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ مادھوری کہاں ہے؟ اَوشیہ (ضرور) تمھارے گھر میں ہوگی۔'

'کیوں اپنے گھر پر ہوگی، مجھے کیا خبر؟ میرے گھر کیوں آنے لگی؟'

'ان بہانوں سے کام نہ چلے گا' سمجھ گئے' میں کہتا ہوں، میں تمھارا خون پی جاؤں گا ورنہ ٹھیک ٹھیک بتادو، وہ کہاں گئی؟'

میں بالکل کچھ نہیں جانتا، تمھیں وِشواس دلاتا ہوں۔ میں تو دو تین دن گھر سے نکلا ہی نہیں۔

رات کو میں اس کے پاس تھا۔ سویرے مجھے اس کا یہ پتر ملا۔ میں اسی وقت دوڑا ہوا اس کے گھر گیا۔ وہاں اس کا پتہ نہ تھا۔ نوکروں سے اتنا معلوم ہوا، تانگے پر بیٹھ کر کہیں گئی ہے۔ کہاں گئی ہے، یہ کوئی نہ بتا سکا۔ مجھے شک ہوا، یہاں آئی ہوگی۔ جب تک تمھارے گھر کی تلاشی نہ لے لوں گا۔ مجھے چین نہیں آئے گا۔

اس نے مکان کا ایک ایک کونا دیکھا، تخت کے نیچے، الماری کے پیچھے، تب نراش ہو کر بولا۔ بڑی بے وفا اور مکّار عورت ہے۔ ذرا اس خط کو پڑھو۔ دونوں فرش پر بیٹھ گئے۔ دیا کرشن نے پتر لے کر پڑھنا شروع کیا-

سردار صاحب! میں آج کچھ دنوں کے لیے یہاں سے جا رہی ہوں، کب لوٹوں گی، کچھ نہیں جانتی، کہاں جارہی ہوں یہ بھی نہیں جانتی۔ جا اس لیے رہی ہوں کہ اس بے شرمی اور بے حیائی کی زندگی سے مجھے گھڑنا ہورہی ہے اور گھڑنا ہو رہی ہے ان لمپٹوں سے، جن کے کُتسِت وِلاس کا میں کھلونا تھی اور جن میں تم مکھیہ ہو۔ تم مہینوں سے مجھ پر سونے اور ریشم کی وَرشا کر رہے ہو، مگر میں تم سے پوچھتی ہوں، اس سے

لاکھ گنے سونے اور دس لاکھ گنے ریشم پر بھی تم اپنی بہن یا استری کو اس روپ میں بازار میں بیٹھنے دوگے؟ کبھی نہیں۔ ان دیویوں میں کوئی ایسی وستو ہے، جسے تم سنسار بھر کی دولت سے بھی مولیہ وان سمجھتے ہو۔ لیکن جب تم شراب کے نشے میں چؤر، اپنے ایک ایک انگ میں کام کا اُنماد بھرے آتے تھے تو تمھیں کبھی دھیان آتا تھا کہ تم اپنی اَملیہ وستو کو کس بزردیتا (بے رحمی) سے کچل رہے ہو؟ کبھی دھیان آتا تھا کہ اپنی کُل دیویوں کو اس اوستھا میں دیکھ کر تمھیں کتنا دکھ ہوتا؟ کبھی نہیں۔ یہ ان گیدڑوں اور گِدھوں کی منوورتی ہے، جو کسی لاش کو دیکھ کر چاروں اور سے جمع ہوجاتے ہیں، اور اسے نوچ نوچ کر کھاتے ہیں۔ یہ سمجھ رکھو ناری اپنا بس رہتے ہوئے کبھی پیسوں کے لیے اپنے کو سمرپت نہیں کرتی۔ یدی وہ ایسا کر رہی ہے، تو سمجھ لو کہ اس کے لیے اور کوئی آشرے اور کوئی آدھار نہیں ہے اور پُرش اتنا بزلجّ ہے کہ اس کی دُراوستھا (بری حالت) سے اپنی واسنا ترپت کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اتنا بزدے کہ اس کے ماتھے پر پتیتا کا کلنک لگا کر اسے اسی دُراوستھا میں مرتے دیکھنا چاہتا ہے۔ کیا وہ ناری ہے؟ کیا نارتو کے پوتر مندر میں اس کا استھان نہیں ہے لیکن تم اسے اس مندر میں گھسنے نہیں دیتے۔ اس کے اسپرش سے مندر کی پرتیما بھرشٹ ہو جائے گی، خیر، پُرش سماج جتنا اتیاچار چاہے کر لے ہم اسہائے ہیں آتم ابھیمان کو بھول بیٹھی ہیں، لیکن...

سہسا سنگار سنگھ نے اس کے ہاتھ سے وہ پتر چھین لیا اور جیب میں رکھتا ہوا بولا۔ کیا بڑے غور سے پڑھ رہے ہو، کوئی نئی بات نہیں۔ سب کچھ وہی ہے، جو تم نے سکھایا ہے۔ یہی کرنے تو تم اس کے یہاں جاتے تھے، میں کہتا ہوں، تمھیں مجھ سے اتنی جلن کیوں ہوگئی ہے؟ میں نے تو تمھارے ساتھ کوئی برائی نہ کی تھی۔ اس سال بھر میں نے مادھوری پر دس ہزار سے کم نہ پھونکے ہوں گے۔ گھر میں جو کچھ مولیہ وان تھا وہ میں نے اس کے چرنوں پر چڑھا دیا اور آج اسے ساہس ہو رہا ہے کہ وہ ہماری کُل دیویوں کی برابری کرے! یہ سب تمھارا پرساد ہے۔ ستّر چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی! کتنی بے وفا ذات ہے، ایسوں کو تو گولی ماردے۔ جس پر سارا گھر لٹا دیا، جس کے پیچھے سارے شہر میں بدنام ہوا، یہ مجھے آج اُپدیش کرنے چلی! ضرور اس میں کوئی نہ کوئی رہسیہ ہے۔ کوئی نیا شکار پھنسا ہوگا، مگر مجھ سے بھاگ کر جائے گی کہاں، ڈھونڈ نہ نکالوں تو نام

نہیں۔ کمبخت کیسی پریم بھری باتیں کرتی تھی کہ مجھ پر گھڑوں نشہ چڑھ جاتا تھا۔ بس کوئی نیا شکار پھنس گیا۔ یہ بات نہ ہو، مونچھ منڈا لوں!

دیا کرشن اس کے صفا چٹ چہرے کی اُور دیکھ کر مسکرایا۔ تمھاری مونچھ تو پہلے ہی منڈ چکی ہے۔

اس ہلکے سے ونود نے جیسے سنگار سنگھ کے گھاؤ پر مرہم رکھ دیا۔ وہ بے سروسامان گھر، وہ پھٹا فرش، وہ ٹوٹی پھوٹی چیزیں دیکھ کر اسے دیا کرشن پر دیا آگئی۔ چوٹ کی تلملاہٹ میں وہ جواب دینے کے لیے اینٹ پتھر ڈھونڈ رہا تھا، پر اب چوٹ ٹھنڈی پڑ گئی تھی اور درد گھنی بھوت ہو رہا تھا۔ درد کے ساتھ ساتھ سوہاڑور بھی جاگ رہا تھا۔ جب آگ ہی ٹھنڈی ہو گئی تو دھواں کہاں سے آتا؟'

اس نے پوچھا۔ 'سچ کہنا تم سے بھی کبھی پریم کی باتیں کرتی تھی؟'

دیا کرشن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ 'مجھ سے؟ میں تو خالی اس کی صورت دیکھنے جاتا تھا۔'

'صورت دیکھ کر دل میں قابو تو نہیں رہتا'

'یہ تو اپنی اپنی روچی ہے'

'ہے موہنی، دیکھتے ہی کلیجے پر چھری چل جاتی ہے'

'میرے کلیجے پر تو کبھی چھری نہیں چلی۔ یہی اچھا ہوتی تھی کہ اس کے پیروں پر گر پڑوں۔'

'اس شاعری نے تو یہ انرتھ کیا۔ تم جیسے بدھوؤں کو کسی دیہاتن سے شادی کر کے رہنا چاہیے، چلے تھے ویشیا سے پریم کرنے!'

'ایک چھن کے بعد اس نے پھر کہا۔ مگر ہے بے وفا مکّار!

'تم نے اس سے وفا کی آشا کی، مجھے تو یہی افسوس ہے'

'تم نے وہ دل ہی نہیں پایا' تم سے کیا کہوں۔'

ایک منٹ کے بعد اس نے سہردئے (اچھے دل) بھاؤ سے کہا۔ اپنے پتر میں اس نے باتیں تو سچی لکھی ہیں، چاہے کوئی مانے یا نہ مانے؟ سوندریہ کو بازارو چیز سمجھنا کچھ بہت اچھی بات تو نہیں ہے۔'

دیا کرشن نے پُچکارا دیا- جب استری اپنا روپ بیچتی ہے، تو اس کے خریدار بھی نکل آتے ہیں- پھر یہاں تو کتنی ہی جاتیاں ہیں- جن کا یہی پیشہ ہے۔'

'یہ پیشہ چلا کیسے؟'

'استریوں کی دُربلتا سے'

'نہیں میں سمجھتا ہوں- بسم اللہ پروشوں نے کی ہوگی'

اس کے بعد ایکاایک جیب سے گھڑی نکال کر دیکھتا ہوا بولا- 'او ہو! دو بج گئے اور ابھی یہیں بیٹھا ہوں- آج شام کو میرے یہاں کھانا کھانا- ذرا اس وِشے پر باتیں ہوں گی ابھی تو اسے ڈھونڈ نکالنا ہے- وہ ہے کہیں اسی شہر میں- گھر والوں سے بھی کچھ نہیں کہا- بڑھیا نائیکا سر پیٹ رہی تھی-استاد جی اپنی تقدیر کو رو رہے تھے، نہ جانے کہاں جا کر چھپ رہی-

اس نے اُٹھ کر دیا کرشن سے ہاتھ ملایا اور چلا-

دیا کرشن نے پوچھا- 'میری طرف سے تو تمھارا دل صاف ہو گیا؟'

سنگار نے پیچھے پھر کر کہا- 'ہوا بھی اور نہیں بھی ہوا' اور باہر نکل گیا-

(5)

سات آٹھ دن تک سنگار سنگھ نے سارا شہر چھانا،پولیس میں رپورٹ کی، سماچار پتروں میں نوٹس چھپائی، اپنے آدمی دوڑائے، لیکن مادھوری کا کچھ بھی سراغ نہ ملا کہ پھر محفل گرم ہوتی-متر وِرند(دوست، احباب) صبح شام حاضری دینے آتے اور اپنا سا منہ لے کر لوٹ جاتے- سنگار کے پاس ان کے ساتھ گپ شپ کرنے کا سمئے نہ تھا- گرمی کے دن، سجا ہوا کمرہ بھٹی بنا ہوا تھا-خس کی ٹٹیاں بھی تھیں، پنکھا بھی، لیکن گرمی جیسے کسی کے سمجھنے بوجھنے کی پرواہ نہیں کرنا چاہتی، اپنے دل کا بخار نکال کر ہی رہے گی-

سنگار سنگھ اپنے بھیتر والے کمرے میں بیٹھا ہوا پیگ پر پیگ چڑھا رہا تھا، پر اندر کی آگ نہ شانت ہوتی تھی- اس آگ نے اوپر کی گھانس پھونس کو جلا کر بھسم کر دیا تھا اور اب انت استھل کی جڑ درکت اور اچل وچار کو درزوت کر کے بڑے ویگ سے اوپر پھینک رہی تھی- مادھوری کی بے وفائی نے اس کے آمودی ہردے کو اتنا آہت کر دیا تھا

کہ اب اپنا جیون ہی بیکار سا معلوم ہوتا تھا۔ مادھوری اس کے جیون میں سب سے ستیہ وستو تھی، ستیہ بھی اور سندر بھی۔ اس کے جیون کی ساری ریکھائیں اسی بندو پر آکر جمع ہو جاتی تھیں۔ وہ بندو ایکا ایک پانی کے بلبلے کے بھانتی مٹ گیا اور اب وہ ساری ریکھائیں ساری بھاوَنائیں وہ ساری مردواسمرتیاں (میٹھی یادیں) ان جھلائی ہوئی مدھو مکھیوں کی طرح بھنبھناتی پھرتی تھیں۔ جن کا چھتہ جلادیا گیا ہو۔ جب مادھوری نے کپٹ بیوہار کیا تو اور کس سے کوئی آشا کی جائے؟ اس جیون ہی میں کیا ہے؟ آم میں رس ہی نہ رہا، تو گٹھلی کس کام کی؟

لیلا کئی دنوں سے محفل میں سناٹا دیکھ کر چکت ہو رہی تھی۔ اس نے کئی مہینوں سے گھر کے کسی وشے میں بولنا چھوڑ دیا تھا۔ باہر سے جو آدیش ملتا تھا، اسے بنا کچھ کہے سنے پورا کرنا ہی اس کے جیون کا کرم تھا۔ ویت راگ سی ہوگئی تھی۔ نہ کسی شوق سے واسطہ تھا نہ سنگار سے۔

مگر اس کئی دن کے سناٹے نے اس کے اداس من کو بھی چنتت کردیا۔ چاہتی تھی کہ کچھ پوچھے، لیکن پوچھے کیسے؟ مان جو ٹوٹ جاتا۔ مان ہی کس بات کا؟ مان تب کرے، جب کوئی اس کی بات پوچھتا ہو۔ مان اپمان سے پریوجن نہیں۔ ناری ہی کیوں ہوئی؟

اس نے دھیرے دھیرے کمرے کا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔ دیکھا سنگار سنگھ صوفہ پر چپ چاپ لیٹا ہوا ہے، جیسے کوئی پنچھی سانجھ کے سناٹے میں پروں میں منہ چھپائے بیٹھا ہو۔

سمیپ آکر بولی۔ 'میرے منہ پر تالا ڈال دیا گیا ہے لیکن کیا 'کروں بنا بولے رہا نہیں جاتا۔ کئی دن سے سرکار کی محفل میں سناٹا کیوں ہے؟ طبیعت تو اچھی ہے۔'

سنگار نے اس کی اُور آنکھیں اٹھائیں۔ ان میں ویتھا بھری ہوئی تھی۔ کہا۔ 'تم اپنے میکے کیوں نہیں چلی جاتی' لیلا؟

'آپ کی جو آگیا، پر یہ تو میرے پرشن کا اتر نہ تھا۔'

'وہ کوئی بات نہیں، میں بالکل اچھا ہوں، ایسے بے حیاؤں کو موت بھی نہیں آتی اب اس جیون سے جی بھر گیا۔ کچھ دنوں کے لیے باہر جانا چاہتا ہوں۔ تم اپنے گھر چلی

جاؤ۔ تو میں نشچنت ہو جاؤں۔

'بھلا آپ کو میری اتنی چنتا تو ہے۔'

'اپنے ساتھ جو کچھ لے جانا چاہتی ہو، لے جاؤ!

میں نے اس گھر کی چیزوں کو اپنا سمجھنا چھوڑ دیا ہے'

میں ناراض ہو کر نہیں کہہ رہا ہوں، لیلا نہ جانے کب لوٹوں، تم یہاں اکیلے کیسے رہوگی؟ کئی مہینے کے بعد لیلا نے پتی کی آنکھوں میں سنیہہ کی جھلک دیکھی۔

'میرا وِواہ تو اس گھر کی سمپتی سے نہیں ہوا ہے، تم سے ہوا ہے۔ جہاں تم رہوگے وہیں میں بھی رہوں گی۔'

'میرے ساتھ تو اب تک تمھیں رونا ہی پڑا'

لیلا نے دیکھا، سنگار سنگھ کی آنکھوں میں آنسو کی ایک بوند نیلے آکاش میں چندرما کی طرح گرنے گرنے کو ہو رہی تھی۔اس کا من بھی پلکت ہو اٹھا۔ مہینوں کی چھد اگنی میں جلنے کے بعد انّ کا ایک دانہ پا کر وہ اسے کیسے ٹھکرا دے؟ پیٹ نہیں بھرے گا۔ کچھ بھی نہیں ہوگا، لیکن اس دانے کو ٹھکرانا کیا اس کے بس کی بات تھی؟

اس نے بالکل پاس آکر اپنے آنچل کو اس کے سمیپ لے جا کر کہا۔ 'میں تو تمھاری ہو گئی۔ ہنساؤگے، ہنسوں گی، رلاؤگے، روؤں گی، رکھوگے تو رہوں گی، نکالو گے تو بھی رہوں گی، میرا گھر تم ہو، دھرم تم ہو، اچھی ہوں تو تمھاری ہوں، بری ہوں تو تمھاری ہوں۔'

اور دوسرے چھن سنگار کے وشال سینے پر اس کا سر رکھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ تھے لیلا کی کمر میں۔ دونوں کے مکھ پر ہرش (خوشی) کی لالی تھی، آنکھوں میں ہرش کے آنسو اور من میں ایک ایسا طوفان، جو انھیں نہ جانے کہاں اُڑا لے جائے گا۔

ایک چھن کے بعد سنگار نے کہا- تم نے کچھ سنا، مادھوری بھاگ گئی اور پگلا دیاکرشن اس کی کھوج میں نکلا!

'لیلا کو وِشواس نہ آیا- 'دیا کرشن!'

'ہاں جی جس دن وہ بھاگی ہے، اس کے دوسرے ہی دن وہ بھی چل دیا، وہ تو ایسا نہیں ہے اور مادھوری کیوں بھاگی؟

'دونوں میں پریم ہو گیا تھا، مادھوری اس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی وہ راضی نہ ہوا'

لیلا نے ایک لمبی سانس لی۔ دیا کرشن کے وے شبد یاد آئے جو اس نے کئی مہینے پہلے کہے تھے۔ دیا کرشن کی وے یاچنا بھری آنکھیں اس کے من کو مسوسنے لگیں۔

سَہسا کسی نے بڑے زور سے دوار کھولا اور دھڑدھڑاتا ہوا بھیتر والے کمرے کے دوار پر آگیا۔

سنگار نے چکت ہو کر کہا- ارے تمھاری یہ کیا حالت ہے، کرشنا؟ کدھر سے آرہے ہو؟'

دیا کرشن کی آنکھیں لال تھیں، سر اور منہ پر گرد جمی ہوئی چہرے پر گھبراہٹ، جیسے کوئی دیوانہ ہو۔

اس نے چلاّ کر کہا- 'تم نے سنا ، مادھوری اس سنسار میں نہیں رہی؟'

اور دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ پیٹ کر رونے لگا، مانو ہردئے اور پرانوں کو آنکھوں سے بہادے گا۔''

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں 'چاند' فروری 1933 شائع ہوا۔ 'مان سرور' حصہ 2 میں شامل ہے اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔)

رسِک سمپادک

نورس کے سمپادک پنڈت چوکھے لال شرما کی دھرم پتنی کاجب سے دیہانت ہوا ہے، آپ کو استریوں سے وِشیش انوراگ ہوگیا ہے اور رسکتا کی ماترا بھی کچھ بڑھ گئی ہے۔ پُرشوں کے اَچھے اچھے لیکھ ردّی میں ڈال دیے جاتے ہیں، پر دیویوں کے لیکھ کیسے بھی ہوں، تُرنت سویکار کرلیے جاتے ہیں اور بہودھا (اکثر) لیکھ کی رسید کے ساتھ لیکھ کی پرشنسا کچھ ان شبدوں میں کی جاتی ہے۔ آپ کا لیکھ پڑھ کر دِل تھام کر رہ گیا، اتیت جیون آنکھوں کے سامنے مُورتی مان ہو گیا، اتھوا آپ کے بھاؤ ساہیتہ ساگر کے اُجّول (روشن) رتن ہیں، جن کی چمک کبھی کم نہ ہوگی اور کویتائیں تو ہردے کی ہِلوریں، وِشو ویڑا کی امرتان، اننت کی مدھر ویدنا، نِشا کا نیرو گان ہوتی تھی۔ پرشنسا کے ساتھ درشن کی اُتکٹ ابھیلاشا بھی پرکٹ کی جاتی تھی۔ یدی آپ کبھی ادھر سے گذریں تو مجھے نہ بھولیے گا۔ جس نے ایسی کویتا کی شرشٹی کی ہے۔ اس کے درشن کا سوبھاگیہ مجھے ملا تو اپنے کو دھنیہ مانوں گا۔

لیکھیکائیں انوراگ مے پروتساہن سے بھرے ہوئے پتر پاکر پھولی نہ ساتیں۔ جو لیکھ ابھاگے بھیکشک (بھکاری) کی بھانتی کتنے ہی پتر، پتریکاؤں کے دُوار سے نراش لوٹ آئے تھے ان کا اتنا آدر۔ پہلی بار ہی ایسا سمپادک جنما ہے۔ جو گنوں کا پارکھی ہے اور سبھی سمپادک اہمنیہ ہیں۔ اپنے آگے کسی کو سمجھتے ہی نہیں، ذراسی سمپادکی کیا مل گئی، مانو کوئی راجیہ مل گیا۔ سَمپادکوں کو کہیں سرکاری پد مل جائے تو اندھیر مچادیں۔ وہ تو کہو کہ سرکار انھیں پوچھتی نہیں۔ اس نے بہت اچھا کیا جو آرڈیننس پاس کردیے اور استریوں سے دِویش کرو، یہ اُسی کا ڈنڈ ہے۔ یہ بھی سَمپادک ہی ہیں کوئی گھاس نہیں چھیلتے اور سَمپادک بھی ایک جگت وکھیات پتر کے۔ نورس، سب پتّروں میں راجا ہے۔

چوکھے لال جی کے پتّر کی گراہک سنکھیا بڑے وِیگ سے بڑھنے لگی۔ ہر ڈاک

سے دھنیہ واد کی ایک باڑھ سی آجاتی، اور لیکھیکاؤں میں ان کی پوجا ہونے لگی۔ بیاہ گونا، موڑن، چھیدن، جنم، مرن کے ساچار آنے لگے۔ کوئی آشیرواد مانگتی، کوئی ان کے مکھ سے سانتونا (تسلی) کے دو شبد سننے کی ابھیلاشا کرتی، کوئی ان سے گھریلو سنکٹوں میں پرامرش پوچھتی اور مہینے میں دس پانچ مہیلائیں انھیں درشن بھی دے جاتیں۔ شرماجی اُن کی آوائی کا تار یا پتر پاتے ہی اسٹیشن پر جا کر ان کا سواگت کرتے، بڑے آگرّہ سے انھیں ایک آدھ دن ٹھہراتے، ان کی خوب خاطر کرتے، سنیما کے فری پاس ملے ہوئے تھے ہی، خوب سینما دکھاتے۔ مہیلائیں ان کے سدبھاؤ سے مُگدھ ہوکر وداع ہوتیں۔ مشہور تو یہاں تک ہے کہ شرماجی کا کئی لیکھیکاؤں سے بہت گہرا گھنشٹ سمبندھ ہو گیا ہے۔ لیکن اس وِشے میں ہم نشچے پورک کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ جو دیویاں ایک بار یہاں آجاتیں، وہ شرماجی کی اننیہ بھکت ہو جاتیں۔ بے چارا ساہتیہ کی کٹیا کا تپسوی ہے۔ اپنے وِدھر جیون کی نراشاؤں کو اپنے انتستل میں سَنچت رکھ کر مُوک وِیدنا میں پریم مادھریہ کا رس پان کررہاہے۔ سمپادک جی کے جیون میں جو کمی آگئی تھی، اس کی کچھ پورتی کرنا مہیلاؤں نے اپنا دھرم سا مان لیا۔ ان کے بھرے ہوئے بھنڈار میں سے اگر ایک گشذھت پرانی کو تھوڑی سی مٹھائی دی جاسکے، تو اُن سے بھنڈار کی شوبھا ہے۔ کوئی دیوی پارسل سے اچار بھیج دیتی، کوئی لڈو، ایک نے پوجا کا اونی آسن اپنے ہاتھوں بنا کر بھیج دیا۔ ایک دیوی مہینے میں ایک بار آکر ان کے کپڑوں کی مرمت کر دیتی تھی۔ دوسری دیوی مہینے میں دو تین بار آکر اُنھیں اچھی اچھی چیزیں بنا کر کھلا جاتی تھی۔ اب وہ کسی ایک کے نہ ہو کر سب کے ہوگئے تھے۔ اِستریوں کے اَدھیکاروں کا ان سے بڑا رکشک شاید ہی کوئی ملے۔ پُرشوں سے تو شرماجی کو ہمیشہ تیور آلوچنا ہی ملتی تھی۔ شردّھا مے سہانوبھوتی کا آنند تو اُنھوں نے اِستریوں ہی میں پایا۔

ایک دن سَمپادک جی کو ایسی کویتا ملی، جس میں لیکھیکا نے اپنے اُگرِ پریم کا روپ دکھایا تھا۔ اننیہ سَمپادک اُسے اشلیل کہتے، لیکن چوکھے لال اِدھر بہت اُدار ہوگئے تھے۔ کویتا اتنے سُندر اکشروں میں لکھی تھی، لیکھیکا کا نام اتنا موہک تھا کہ سَمپادک جی کے سامنے اس کا ایک کلپنا چتر سا آکر کھڑا ہوگیا۔ بھاؤک پرکرتی کومل، گات، یا چنا بھرے نیتر، بمب اَدھر، چمپئی رنگ، انگ انگ میں چپلتا بھری ہوئی، پہلے گوند کی طرح شُشک

اور کٹھور آردِر ہوتے ہی چپک جانے والی۔ انھوں نے کویتا کو دو تین بار پڑھا اور ہر بار ان کے من میں سنسنی دوڑی۔

کیا تم سمجھتے ہو مجھے چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے؟
بھاگ سکو گے؟
میں تمھارے گلے میں ہاتھ ڈال دوں گی
میں تمھاری کمر میں کر پاش کس دوں گی
میں تمھارا پاؤں پکڑکر روک لوں گی
تب اس پر سر رکھ دوں گی
کیا تم سمجھتے ہو، مجھے چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے ،چھوڑ سکو گے؟
میں تمھارے دھروں پر اپنے کپول چپکادوں گی
اُس پیالے میں جو مادک سُودھا ہے
اُسے پی کر تم مست ہوجاؤ گے
اور میرے پیروں پر سر رکھ دو گے
کیاتم سمجھتے ہو، مجھے چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے؟

شرما جی کو ہر بار اس کویتا میں ایک نیا رس ملتا تھا۔انھوں نے اسی چھن کاماکشی دیوی کے نام یہ پتر لکھا۔

آپ کی کویتا پڑھ کر میں نہیں کہہ سکتا ،میرے چت کی کیا دشا ہوئی۔ ہردے میں ایک ایسی ترِشنا جاگ اُٹھی ہے، جو مجھے بھسم کیے ڈالتی ہے۔نہیں جانتا اسے کیسے شانت کروں؟ بس،یہی آشا ہے کہ اس کوشیتل کرنے والی سدھا بھی وہیں ملے گی جہاں سے یہ ترشنا ملی ہے۔من تتنگ کی بھانتی زنجیر تڑا کر بھاگ جانا چاہتاہے۔جس ہردے سے یہ بھاؤ نکلے ہیں، اس میں پریم کا کتنا اکشیہ بھنڈار ہے، اس پریم کا جو اپنے کو سمرپت کردینے میں ہی آنند پاتا ہے۔ میں آپ سے ستیہ کہتا ہوں، ایسی کویتا میں نے آج تک نہیں پڑھی تھی اور اس نے میرے اندر جو طوفان اُٹھا دیا ہے، وہ میری وِدُھر شانتی کو چھن بھن کیے ڈالتا ہے۔ آپ نے ایک غریب کی پھوس کی جھونپڑی میں آگ لگا دی

ہے۔ لیکن من یہ سویکار نہیں کرتا کہ یہ کیول وِنود کریڑا ہے۔ ان شبدوں میں مجھے ایک ایسا ہردَے چھپا ہوا گیات ہوتا ہے، جس نے پریم کی ویدنا سہی ہے، جو لالسا کی آگ میں تپا ہے، میں اسے اپنا پرم سوبھاگیہ سمجھوں گا یدی آپ کے درشنوں کا سوبھاگیہ پاسکا۔ یہ کٹیا انوراگ کی بھینٹ لیے آپ کا سواگت کرنے کو تڑپ رہی ہے۔

سپریم۔

تیسرے ہی دن اُتر آگیا، کاماکشی نے بڑے بھاؤ کتا پورن شبدوں میں کرتگیتا پرکٹ کی تھی اور اپنے آنے کی تِتھی بتائی تھی۔

(2)

آج کاماکشی کا شبھ آگمن ہے۔

شرماجی نے پراتہ کال حجامت بنوائی، صابن اور بیسن سے اسنان کیا، مہین کھدّر کی دھوتی کوکٹی کاڑھیلا چُنٹ دار کرتا، ملائی کے رنگ کی ریشمی چادر۔ اس ٹھاٹھ سے آکر کاریالیہ میں بیٹھے ،تو سارا دفتر گمک اُٹھا۔ دفتر کی بھی خوب صفائی کرادی گئی تھی۔ برآمدے میں گملے رکھوا دیے گیے تھے۔ میز پر گلدستے سجا دیے گئے تھے۔ گاڑی نو بجے آتی ہے۔ ابھی ساڑھے آٹھ ہیں، ساڑھے نو بجے تک یہاں آجائے گی۔ اس پریشانی میں کوئی کام نہیں ہورہا ہے۔ بار بار گھڑی کی اور تاکتے ہیں، پھر آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتے ہیں۔ مونچھوں میں دو چار بال پکے ہوئے نظر آرہے ہیں پر انھیں اکھاڑ پھینکنے کا اس سے کوئی سادھن نہیں ہے۔ کوئی حرج نہیں۔اس سے رنگ کچھ اور زیادہ جمے گا۔ پریم جب شردھا کے ساتھ آتا ہے تب وہ ایسا مہمان ہوجاتا ہے،جو اُپہار (انعام) لے کر آتا ہو۔ یووکوں کا پریم خرچیلی وَستو ہے۔ لیکن مہاتما یا مہاتماپن کے سمیپ پہنچتے ہوئے لوگوں کو پریم اُلٹے اور کچھ لے آتا ہے۔ یووک جو رنگ بہو مولیہ اُپہاروں سے جماتا ہے، یہ مہاتما یا اردھ مہاتما لوگ کیول آشیرواد (دعا) سے جمالیتے ہیں۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے چپراسی نے آکر ایک کارڈ دیا، لکھا تھا ۔

کاماکشی

شرماجی نے اسے دیوی جی کو لانے کی انومتی دے کر ایک بار پھر آئینے میں اپنی

صورت دیکھی اور ایک موٹی سی پُستک پڑھنے لگے، مانو سوادھیائے میں تن مے ہوگئے ہیں۔ ایک چھن میں دیوی جی نے کمرے میں قدم رکھا۔ شرما جی کو ان کے آنے کی خبر نہ ہوئی۔

دیوی جی ڈرتے ڈرتے سمیپ آگئیں۔ تب شرما جی نے چونک کر سر اُٹھایا، مانو سادھی سے جاگ پڑے ہوں اور کھڑے ہوکر دیوی جی کا سواگت کیا، مگر یہ وہ مورتی نہ تھی،جس کی انھوں نے کلپنا کر رکھی تھی۔

ایک کالی، موٹی، ادھیڑ چنچل عورت تھی جو شرما جی کو اس طرح گھور رہی تھی، مانو انھیں پی جائے گی، شرما جی کا سارا اُتساہ سارا انوراگ ٹھنڈا پڑگیا۔ وہ ساری من کی مٹھائیاں، جو وہ مہینوں سے کھا رہے تھے، پیٹ میں شول کی بھانتی چُبھنے لگیں، کچھ کہتے سُنتے نہ بنا۔ کیول اتنا بولے۔ سمپادکوں کا جیون بالکل پشوؤں کا جیون ہے۔ سر اُٹھانے کا سے نہیں ملتا۔ اس پر کاریادھکیہ سے ادھر میرا سواستھیہ بھی بگڑ رہا ہے۔ رات ہی سے سردرد سے بے چین ہوں، آپ کی کیا خاطر کروں؟

کاماکشی دیوی کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پلندہ تھا۔ اسے میز پر پٹک کر رومال سے منھ پونچھ کر مِردو سوَر میں بولی۔ یہ آپ نے تو بڑی بری خبر سنائی۔ میں تو ایک سہیلی سے ملنے جا رہی تھی۔ سوچا، راستے میں آپ کے درشن کرتی چلوں۔ لیکن جب آپ کا سواستھ ٹھیک نہیں ہے، تو مجھے یہاں کچھ دِن رہ کر آپ کا سواستھ سُدھارنا پڑے گا۔ میں آپ کے سَمپادن کاریہ میں بھی آپ کی مدد کروں گی۔ آپ کا سواستھ اِستری جاتی کے لیے بڑے مہتو کی وِستو ہے۔ آپ کو اس دشا میں چھوڑ کر میں اب جا نہیں سکتی۔

شرما جی کو ایسے جان پڑا جیسے ان کا رکت پرواہ رُک گیا ہے۔ ناڑی چھوٹی جا رہی ہے۔ اس چڑیل کے ساتھ رہ کر تو جیون ہی نرک ہوجائے گا۔ چلی ہے کویتا کرنے، اور کویتا کیسی اَشلیلتا میں ڈوبی ہوئی اَشلیل تو ہے ہی۔ بالکل سڑی ہوئی گندی۔ ایک سندری یووتی کی قلم سے وہ کویتا کام باز تھی۔ اس ڈائین کی قلم سے تو وہ پرنالے کا کیچڑ ہے۔ میں کہتا ہوں اِسے ایسی کویتا لکھنے کا اَدھیکار ہی کیا ہے؟ یہ کیوں ایسی کویتا لکھتی ہے؟ کیوں نہیں کسی کونے میں بیٹھ کر رام بھجن کرتی ہے؟ آپ پوچھتی ہیں ۔مجھے چھوڑ کر

بھاگ سکو گے؟ میں کہتا ہوں آپ کے پاس کوئی آئے گا ہی کیوں ؟ دُور سے ہی دیکھ کر نہ لمبا ہو جائے گا۔ کویتا کیا ہے، جس کا نہ سر نہ پیر، ماتراؤں تک کا اسے گیان نہیں ہے اور کویتا کرتی ہے۔ کویتا اگر اس کایا میں نِواس (گھر) کرسکتی ہے۔ تو پھر گدھا بھی گا سکتا ہے۔ اُونٹ بھی ناچ سکتا ہے۔ اس رانڈ کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ کویتا کرنے کے لیے روپ اور یَووَن چاہیے، نزاکت چاہیے، نفاست چاہیے۔ بھوتنی سی تو آپ کی صورت ہے، رات کو کوئی دیکھ لے ،تو ڈر جائے اور آپ اُتیجک (ورغلانے والی) کویتا لکھتی ہیں، کوئی کتنا ہی کشُدھا تُر (بھوکا) ہو تو کیا گوبر کھالے گا؟ اور چڑیل اتنا بڑا پوتھا لیتی آئی ہے۔ اس میں بھی وہی پرنالے کا گندہ کیچڑ ہوگا۔ اس موٹی پُستک کی اور دیکھتے ہوئے بولے۔ نہیں ۔نہیں، میں آپ کو کشٹ نہیں دینا چاہتا۔ وہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دو چار دن کے وِشرام سے ٹھیک ہوجائے گا آپ کی سہیلی آپ کی پرتیکشا کرتی ہوں گی،

آپ تو مہاشے جی سنکوچ کررہے ہیں۔ میں دس پانچ دن بعد بھی چلی جاؤں، تو کوئی ہانی نہ ہوگی۔

اس کی کوئی آوشیکتا نہیں ہے دیوی جی،

آپ کے منھ پر تو آپ کی پرشنسا (تعریف) کرنا خوشامد ہوگی پر جو سجّنتا میں نے آپ میں دیکھی، وہ کہیں نہیں پائی۔ آپ پہلے مہانوبھاؤ ہیں جنھوں نے میری رچنا کا آدر کیا، نہیں تو میں تو نراش ہی ہوچکی تھی، آپ کے پروتساہن (ہمت افزائی) کا یہ شُبھ پھل ہے کہ میں نے اتنی کویتائیں رچ ڈالیں۔ آپ ان میں جو چاہیں رکھ لیں۔ میں نے ایک ڈراما بھی لکھنا شروع کردیاہے۔ اسے بھی شیگھر ہی آپ کی سیوا میں بھیجوں گی۔ کہیے تو دو چار کویتائیں سناؤں؟ ایسا اوسر مجھے پھر کب ملے گا۔ یہ تو نہیں جانتی کہ کویتائیں کیسی ہیں پر آپ سن کر پرسن (خوش) ہوں گے۔ بالکل اُسی رنگ کی ہیں۔ اس نے انومتی کی پرتکشا (انتظار) نہ کی، تُرنت پوتھا کھول کر ایک کویتا سنانے لگی۔ شرماجی کو ایسامعلوم ہونے لگا جیسے کوئی بھگو بھگو کر جوتے مار رہا ہے۔ کئی بار اُنھیں متلی آگئی، جیسے ایک ہزار گدھے کانوں کے پاس کھڑے اپنا سور الاپ رہے ہوں۔ کاماکشی کے سوَر میں کوئل کا ماُدھریہ تھا، پر شرماجی کو اس سے وہ بھی اپریہ (ناپسند) لگ رہا تھا۔ سر میں سچ مچ

درد ہونے لگا۔ وہ گدھی ٹلے گی بھی، یا یوں ہی بیٹھی سر کھاتی رہے گی؟ اسے میرے چہرے سے بھی میرے منو بھاؤوں کا گیان نہیں ہو رہا ہے۔ اس پر آپ کویتا کرنے چلی ہیں۔ اس منہ سے تو مہادیوی یا سوبھدرا کماری کی کویتا بھی گھرنا ہی اُتپن کرے گی۔

آخر نہ رہا گیا۔ بولے۔ آپ کی رچناؤں کا کیا کہنا، آپ یہ سنگرہ یہیں چھوڑ جائیں۔ میں اوکاش میں پڑھوں گا۔ اس سے تو بہت سا کام ہے۔

کاماکشی نے دیادر ہو کر کہا۔ آپ اتنا دُربل سواستھ ہونے پر بھی اتنے ویَست (مصروف) رہتے ہیں۔ مجھے آپ پر دیا آتی ہے۔

'آپ کی کرِپا ہے'

'آپ کو کل اوکاش رہے گا؟'

'ذرا میں اپنا ڈراما سنانا چاہتی تھی؟'

'کھید ہے، کل مجھے ذرا پریاگ جانا ہے۔'

'تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟ گاڑی میں سناتی چلوں گی۔

کچھ نشچے نہیں، کس گاڑی سے جاؤں۔'

'آپ لوٹیں گے کب تک؟'

'یہ بھی نشچے نہیں۔'

اور ٹیلی فون پر جاکر بولے ہیلو نمبر (77)

کاماکشی نے آدھ گھنٹے تک ان کا انتظار کیا، مگر شرما جی ایک سجن سے ایسی مہتو کی باتیں کررہے تھے جس کا انت ہی ہونے نہ پاتا تھا۔

نراش ہو کر کاماکشی دیوی وداع ہوئیں اور شگھر ہی پھر آنے کا وعدہ کر گئیں۔ شرما جی نے آرام کی سانس لی اور اس پوتھے کو اٹھا کر ردّی میں ڈال دیا، اور جلے ہوئے دل سے آپ ہی آپ کہا۔ ایشور نہ کرے کہ پھر تمھارا درشن ہو۔ کتنی بے شرم ہے، کلٹا کہیں کی۔ آج اس نے سارا مزہ کرکرا کردیا۔

پھر منیجر کو بلا کر کہا۔ کاماکشی کی کویتا نہیں جائے گی۔ منیجر نے استمبھت ہوکر کہا، فارم تو مشین پر ہے۔

کوئی حرج نہیں۔ فارم اُتار لیجیے۔

بڑی دیر ہوگی۔

ہونے دیجیے۔وہ کویتا نہیں جائے گی،

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں 'جاگرن' مارچ 1933 میں شائع ہوا۔ 'مان سرووَر' حصہ 1 میں شامل ہے، اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔)

معصوم بچہ

(1)

گنگو کو لوگ برہمن کہتے ہیں اور وہ اپنے کو برہمن سمجھتا بھی ہے۔ میرے سائیس اور خدمت گار مجھے زور سے سلام کرتے ہیں۔ گنگو مجھے کبھی سلام نہیں کرتا۔ وہ شاید مجھ سے پالاگن کی توقع رکھتا ہے، میرا جھوٹا گلاس کبھی ہاتھ سے نہیں چھوتا اور نہ کبھی میری اتنی ہمت ہوئی کہ اس سے پنکھا جھلنے کو کہوں۔ جب میں پسینے میں تر ہوتا ہوں اور وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہوتا تو گنگو آپ ہی آپ پنکھا اٹھا لیتا ہے، لیکن اس کے چہرے سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ وہ مجھ پر کوئی احسان کر رہا ہے اور میں بھی نہ جانے کیوں فوراً ہی اس کے ہاتھ سے پنکھا چھین لیتا ہوں۔ تیز مزاج آدمی ہے، بات کی مطلق برداشت نہیں۔ ایسے بہت کم آدمی ہیں جن سے اس کی دوستی ہو۔ سائیس اور خدمت گار کے ساتھ بیٹھنا شاید وہ کسرِ شان سمجھتا ہے۔ میں نے اسے کسی سے بے تکلف ہوتے نہیں دیکھا، نہ میلے تماشے میں جاتے دیکھا۔ حیرت یہ ہے کہ اسے بھنگ بوٹی سے بھی شوق نہیں جو اس طبقے کے آدمیوں میں ایک غیر معمولی وصف ہے، وہ کبھی پوجا پاٹ نہیں کرتا اور نہ اسے ندی میں اشنان کرنے کا خبط ہے۔ بالکل ناحرف شناس آدمی ہے، لیکن پھر بھی وہ برہمن ہے اور چاہتا ہے کہ دنیا اس کی تعظیم اور خدمت کرے اور کیوں نہ چاہے؟ جب اجداد کی پیدا کی ہوئی ملکیتوں پر آج بھی لوگ قابض ہیں اور اسی شان سے قابض ہیں گویا انھوں نے خود پیدا کی ہو، تو وہ کیوں اس تقدس اور امتیاز کو ترک کر دے جو اس کے بزرگوں نے پیدا کیا تھا۔ یہی اس کا ترکہ ہے۔

میری طبیعت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اپنے ملازموں سے بہت کم بولتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں جب تک میں نہ بلاؤں کوئی میرے پاس نہ آئے۔ مجھے یہ اچھا

نہیں لگتا کہ ذرا ذرا سی باتوں کے لیے آدمیوں کو آواز دیتا پھروں۔ مجھے اپنے ہاتھ سے صراحی سے پانی انڈیل لینا یا لیمپ جلا لینا یا اپنے جوتے پہن لینا یا الماری سے کوئی کتاب نکال لینا، اس سے کہیں زیادہ آرام دہ معلوم ہوتا ہے کہ ہینگن اور میکو کو پکاروں، اس سے مجھے اپنی آزادی اور خود اختیاری کا احساس ہوتا ہے۔ نوکر بھی میرے مزاج سے واقف ہو گئے ہیں اور بلا ضرورت میرے پاس بہت کم آتے ہیں۔ اس لیے ایک دن علی الصبح جب گنگو میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تو مجھے کچھ ناگوار گزرا۔ یہ لوگ جب آتے ہیں تو یا تو پیشگی حساب میں کچھ مانگنے کے لیے یا کسی دوسرے ملازم کی شکایت کرنے کے لیے اور مجھے یہ دونوں حرکتیں حد درجہ ناپسند ہیں۔ میں پہلی کو ہر ایک کی تنخواہ بیباق کر دیتا ہوں اور بیچ میں جب کوئی مانگتا ہے تو مجھے غصہ آتا ہے۔ کون دو دو، چار چار روپے کا حساب رکھتا پھرے۔ پھر جب کسی کو منھ بھری مزدوری مل گئی تو اسے کیا حق ہے کہ اسے پندرہ دن میں خرچ کر دے اور قرض یا پیشگی کی ذلت اختیار کرے اور شکایتوں سے مجھے نفرت ہے۔ میں شکایت کو کمزوری کی دلیل سمجھتا ہوں یا خوشامد پرستی اور امداد طلبی کی کمینہ کوشش۔

میں نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ ''کیا معاملہ ہے۔ میں نے تو تمھیں بلایا نہیں۔''

گنگو کے تیکھے، بے نیاز چہرے پر آج کچھ ایسی لجاجت، کچھ ایسی التجا، کچھ ایسا حجاب تھا کہ مجھے تعجب ہوا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ کچھ جواب دینا چاہتا ہے مگر الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔

میں نے ذرا اور تیز ہو کر کہا۔ ''آخر بات کیا ہے؟ کہتے کیوں نہیں؟ تم جانتے ہو یہ میری ہوا خوری کا وقت ہے مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

گنگو نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ ''تو آپ ہوا کھانے جائیں میں پھر آجاؤں گا۔''

یہ صورت اور بھی پریشان کرنے والی تھی۔ اس روا روی میں ایک منٹ میں وہ اپنی سرگذشت کہہ سنائے گا۔ وہ اتنا جانتا ہے کہ مجھے زیادہ فرصت نہیں۔ دوسرے موقع پر تو کم بخت گھنٹوں روئے گا۔ میرے کچھ لکھنے پڑھنے کو تو شاید کام سمجھتا ہو لیکن غور و خوض کو جو میرے لیے انتہائی مصروفیت ہے وہ میرے آرام کا وقت سمجھتا ہے۔ یقیناً یہ اسی وقت آ کر میرے سر پر سوار ہو جائے گا۔

میں نے تلخی کے ساتھ کہا۔ ''کچھ پیشگی مانگنے آئے ہو میں پیشگی نہیں دیتا۔''

''جی نہیں سرکار، میں نے تو کبھی پیشگی نہیں مانگی۔''

''کیا کسی کی شکایت کرنا چاہتے ہو؟ مجھے شکایتوں سے نفرت ہے۔''

''جی نہیں سرکار، میں نے تو کبھی کسی کی شکایت نہیں کی۔''

''تو پھر خواہ مخواہ کیوں سر پر سوار ہو گئے؟''

گنگو نے اپنے دل کو مضبوط کیا۔ اس کے بشرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ گویا کوئی جست لگانے کے لیے اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کر رہا ہے۔ آخر اس نے کہا۔ ''مجھے اب آپ چھٹی دے دیں۔ میں اب آپ کی نوکری نہ کر سکوں گا۔'' یہ اس قسم کی پہلی استدعا تھی جو میرے کانوں میں پڑی۔ میری خود داری کو چوٹ لگی۔ میں جو اپنے آپ کو انسانیت کا پتلا سمجھتا ہوں، اپنے ملازموں سے سخت کلامی نہیں کرتا اپنی آقائیت کو حتی الامکان نیام میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، اس درخواست پر کیوں نہ حیرت میں آجاتا۔ تحکم کے لہجے میں پوچھا۔ ''کیوں کیا شکایت ہے؟''

آپ نے تو ہجور جیسی نیک طبیعت پائی ہے ویسی کیا کوئی پائے گا لیکن بات ایسی آپڑی ہے کہ اب میں آپ کے یہاں نہیں رہ سکتا۔ ایسا نہ ہو پیچھے سے کوئی بات ہو جائے تو آپ کی بدنامی ہو۔ میں نہیں چاہتا میرے ڈیل سے آپ کی آبرو میں بٹہ لگے۔''

میرے دل میں الجھن پیدا ہوئی۔ دریافت حال کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ہوا خوری کا نشہ اتر گیا۔ توکل کے انداز سے برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ ''تم تو پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کیا معاملہ ہے؟''

گنگو نے مجسم معذرت بن کر کہا۔ ''بات یہ ہے کہ عورت جو ابھی بدھوا آشرم سے نکال دی گئی ہے۔ وہی گومتی دیو......۔''

وہ خاموش ہوگیا۔ میں نے بے صبر ہو کر کہا۔ ''ہاں نکال دی گئی ہے تو پھر؟ تمھاری نوکری کا اس سے کیا تعلق ہے؟''

''میں اس سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں ہجور۔''

میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ یہ پرانے خیال کا بونگا برہمن جسے نئی تہذیب کی ہوا تک نہیں لگی، اس عورت سے شادی کرے گا جسے کوئی بھلا آدمی اپنے گھر میں قدم

بھی نہ رکنے دے گا۔ گومتی نے محلے کی پر سکون فضا میں تھوڑی سی حرکت پیدا کر دی تھی۔ کئی سال قبل وہ بدھوا آشرم میں داخل ہوئی تھی۔ تین بار آشرم کے منتظموں نے اس کی شادی کر دی مگر ہر بار وہ ہفتہ عشرہ کے بعد بھاگ آئی۔ یہاں تک کہ آشرم کے سیکریٹری نے اب کی بار اسے آشرم سے نکال دیا تھا وہ اسی محلے میں ایک کوٹھری لے کر رہتی تھی۔ اور سارے محلے کے شہدوں کے لیے دلچسپیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

مجھے گنگو کی سادہ لوحی پر غصہ بھی آیا اور رحم بھی۔ اس بے وقوف کو ساری دنیا میں کوئی عورت ہی نہ ملتی تھی جو اس سے شادی کرنے جا رہا ہے۔ جب وہ تین بار شوہروں کے پاس سے بھاگ آئی تو اس کے پاس کتنے دنوں رہے گی۔ کوئی گانٹھ کا پورا آدمی ہوتا تو ایک بات بھی تھی۔ شاید سال چھ مہینے ٹک جاتی۔ یہ تو محض آنکھ کا اندھا ہے۔ ایک ہفتہ بھی تو نباہ نہ ہوگا۔

میں نے تو تنبیہ آمیز لہجہ میں پوچھا۔ ''تم اس عورت کے حالات سے واقف ہو؟''

گنگو نے عین الیقین کے انداز سے کہا۔ ''سب جھوٹ ہے سرکار لوگوں نے اس کو بک نا ہک بدنام کیا ہے۔''

''کیا معنی؟ کیا وہ تین بار اپنے شوہروں کے پاس سے نہیں بھاگ آئی؟''

''ان لوگوں نے اسے نکال دیا تو کیا کرتی؟''

''کیسے احمق آدمی ہو کوئی اتنی دور سے آکر شادی کرکے لے جاتا ہے۔ ہزاروں روپے خرچ کرتا ہے۔ اس لیے کہ عورت کو نکال دے؟''

گنگو نے شاعرانہ جوش کے ساتھ کہا۔ ''جہاں محبت نہیں ہے ہجور، وہاں کوئی عورت نہیں رہ سکتی۔ عورت کھالی۔ روٹی، کپڑا تو نہیں چاہتی ہے۔ کچھ محبت بھی تو چاہتی ہے۔ وہ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ہم نے بدھوا سے بیاہ کرکے اس کے اوپر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہے۔ چاہتے تھے کہ وہ دل و جان سے اس کی ہو جائے۔ لیکن دوسرے کو اپنا بنانے کے لیے پہلے آپ کو اس کا بن جانا پڑتا ہے۔ ہجور۔ یہ بات ہے۔ پھر اُسے ایک بیماری بھی ہے۔ اسے کوئی بھوت لگا ہوا ہے وہ کبھی بک جھک کرنے لگتی ہے اور بے ہوش ہو جاتی ہے۔''

''اور تم ایسی عورت سے شادی کروگے؟'' میں نے شبہ کے انداز سے سر ہلا کر کہا۔

''سمجھ لو زندگی تلخ ہو جائے گی۔''

گنگو نے شہیدانہ سرگرمی سے کہا۔ ''میں تو سمجھتا ہوں میری جندگی بن جائے گی۔ آگے بھگوان جی کی مرضی۔''

میں نے زور دے کر کہا۔ ''تو تم نے طے کر لیا ہے؟''

''ہاں ہجور۔''

''تو میں تمھارا استعفیٰ منظور کرتا ہوں۔''

میں بے معنی رسوم اور مہمل بندشوں کا غلام نہیں ہوں۔ لیکن جو آدمی ایک فاحشہ سے شادی کر لے اسے اپنے یہاں رکھنا اندیشے سے خالی نہ تھا۔ آئے دن قضیے ہوں گے۔ نئی نئی الجھنیں پیدا ہوں گی۔ کبھی پولیس تحقیقات کرنے آئے گی۔ کبھی مقدمے کھڑے ہوں گے۔ کیا عجب ہے چوری کی وارداتیں بھی ہوں۔ گنگو بھوکے آدمی کی طرح روٹی کا ٹکڑا دیکھ کر اس کی طرف لپک رہا ہے۔ روٹی خشک ہے، بدمزہ ہے۔ اس کی اسے پروا نہیں۔ اس کا عقلِ سلیم سے کام لینا محال تھا۔ میں نے اس کے علیٰحدہ کر دینے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔

(2)

پانچ مہینے گزر گئے۔ گنگو نے گومتی سے شادی کر لی تھی اور اسی محلّے میں ایک کھپریل کا مکان لے کر رہتا تھا۔ وہ اب چاٹ کا خوانچہ لگا کر گزر بسر کرتا تھا۔ مجھے جب کبھی بازار میں مل جاتا۔ میں اس سے فوراً استفسار حال کرتا مجھے اس کے حالات سے ایک خاص دلچسپی ہوگئی تھی۔ یہ ایک معاشرتی مسئلے کی آزمائش تھی۔ معاشرتی ہی نہیں بلکہ نفسیاتی بھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ میں گنگو کو ہمیشہ خوش و خرم دیکھتا۔ فراغت اور بےفکری سے چہرہ پر جو ایک نفاست اور مزاج میں ایک خود داری پیدا ہو جاتی ہے وہ مجھے یہاں صریحاً نظر آتی تھی۔ روپے بیس آنے کی بکری ہو جاتی تھی۔ اس میں لاگت نکال کر آٹھ دس آنے بچ جاتے تھے۔ یہی اس کی معاش تھی مگر اس میں کوئی خاص برکت تھی۔ کیوں کہ اس طبقے کے آدمیوں میں جو بے سرو سامانی، جو بے غیرتی نظر آتی ہے ان سے وہ پاک تھا۔ اس کے چہرے پر خود اعتمادی اور مسرت کی

جھلک تھی جو سکون قلب ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

ایک دن میں نے سنا کہ گومتی گنگو کے گھر سے بھاگ گئی۔

کہہ نہیں سکتا کیوں مجھے اس خبر سے ایک خاص خوشی ہوئی۔ مجھے گنگو کے اطمیان اور پر عافیت زندگی پر ایک طرح کا رشک آتا تھا۔ میں اس کے بارے میں کسی رسوا کن سانحے، کسی دل نگار اور تباہ کن تغیر کا منتظر تھا۔ آخر اسے اپنی سہل اعتقادی کا تاوان دینا پڑا۔ اب دیکھیں وہ کس طرح منہ دکھاتا ہے۔ اب آنکھیں کھلیں گی اور معلوم ہوگا کہ لوگ جو اسے اس شادی سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے کتنے نیک نیت تھے۔ اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا حضرت کو ایک نایاب چیز ملی جا رہی ہے۔ گویا نجات کا دروازہ کھل گیا ہے۔ لوگوں نے کتنا سمجھایا کتنا کہا کہ یہ عورت اعتبار کے قابل نہیں، کتنوں کو دغا دے چکی ہے۔ تمھارے ساتھ بھی دغا کرے گی مگر اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔ اب میں ابلہانہ ضد کا خمیازہ اٹھاؤ۔ ملیں تو ذرا مزاج پُرسی کروں۔ کہوں۔ ''کیوں مہراج، دیوی جی کا یہ پروان پا کر خوش ہوئے یا نہیں۔ تم تو کہتے تھے وہ ایسی ہے اور ویسی ہے۔ لوگ اسے محض بدخواہی کے باعث تہمت لگاتے ہیں۔ اب بتلاؤ کون غلطی پر تھا۔ اب آ گیا خیال شریف میں کہ حُسن فروش عورتوں سے لوگ کیوں احتراز کرتے ہیں۔''

اسی دن اتفاق سے بازار میں گنگو سے میری ملاقات ہوگئی۔ بدحواس تھا، بالکل کھویا ہوا۔ گم گشتہ، کشتی شکستہ۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ندامت سے نہیں، درد سے، میرے پاس آکر بولا۔ ''بابو جی، گومتی نے میرے ساتھ بھی دغا کی۔''

میں نے حاسدانہ مسرّت سے لیکن بظاہر ہمدردی کا اظہار کرکے کہا۔ ''تم سے تو میں نے پہلے ہی کہا تھا، لیکن تم مانے ہی نہیں۔ اب صبر کرو۔ اس کے سوا اور کیا چارہ ہے روپے پیسے صاف کر لے گئی یا کچھ چھوڑ گئی؟''

گنگو نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ایسا معلوم ہوا گویا میرے اس سوال نے اس کے جگر کے ٹکڑے کر دیے ہیں۔

ارے بابو جی ایسا نہ کہیے۔ اس نے دھیلے کی چیز بھی نہیں چھوئی۔ اپنا جو کچھ تھا وہ بھی چھوڑ گئی نہ جانے مجھ میں کیا برائی دیکھی۔ میں اس کے لائق نہ تھا۔ بس اور کیا کہوں۔ وہ پڑھی لکھی ہیں میں کریا اچھر بھینس برابر۔ میرے ساتھ اتنے دن رہی۔ یہی

بہت تھا۔ کچھ دن اور اس کے ساتھ رہ جاتا تو آدمی بن جاتا۔ اس کا آپ سے کہاں تک بکھان کرو۔ بابو جی اوروں کے لیے وہ چاہے کچھ رہی ہو، وہ میرے لیے کسی دیوتا کا اشیر باد تھی۔ کیا جانے مجھ سے ایسی کیا کھتا ہوگئی، مگر کسم لے لیجیے جو اس نے بھول کر بھی شکایت کی ہو۔ میری اوکات ہی کیا ہے بابو جی۔ دس بارہ آنے کا روج کا مجور ہوں مگر اسی میں اس کے ہاتھوں اتنی برکت تھی کہ کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ کبھی میں نے اس کے چہرے پر میل نہیں دیکھا۔''

مجھے ان الفاظ سے سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے سمجھا تھا وہ اس کی بے وفائی کی داستان کہے گا اور میں اس کی حماقت پر حاسدانہ ہمدردی کروں گا۔ مگر اس احمق کی آنکھیں اب تک نہیں کھلیں اب بھی اسی کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔ ضرور اس کے دماغ میں کچھ خلل ہے۔

میں نے شماتت آمیز ظرافت شروع کی۔ ''تو وہ تمھارے گھر سے کچھ نہیں لے گئی؟''

''کچھ نہیں بابو جی، دھیلے کی چیز بھی نہیں۔''

''اور تم سے محبت بھی بہت کرتی تھی؟''

''اب آپ سے کیا کہوں بابو جی، وہ محبت تو مرتے دم تک یاد رہے گی۔''

''پھر بھی تمھیں چھوڑ کر چلی گئی؟''

''یہی تو تعجب ہے بابو جی۔''

''تریا چتر کا نام کبھی سنا ہے؟''

''ارے بابو جی! ایسا نہ کہیے۔ میری گردن پر کوئی چھری بھی رکھ دے تو بھی میں اس کا جس ہی گائے جاوں گا۔''

''تو پھر ڈھونڈ نکالو۔''

''ہاں مالک؟ جب تک اُسے ڈھونڈ نہ لاؤں، مجھے چین نہ آئے گا۔ مجھے اتنا معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہے، پھر تو میں اسے لے ہی آؤں گا اور بابو جی! میرا دل کہتا ہے کہ وہ آئے گی جرور، دیکھ لیجیے گا وہ مجھ سے خفا نہیں تھی۔ لیکن دل نہیں مانتا۔ جاتا ہوں مہینے دو مہینے جنگل پہاڑ کی خاک چھانوں گا۔ جیتا رہا تو پھر آپ کے درسن کروں گا۔'' یہ

کہہ کر وہ مجنونانہ رفتار سے ایک طرف چل دیا۔

(3)

اس کے بعد مجھے ایک ضرورت سے نینی تال جانا پڑا۔ تفریح کے لیے۔ ایک مہینے کے بعد لوٹا اور ابھی کپڑے بھی اتارنے نہ پایا تھا کہ دیکھتا ہوں گنگو ایک نوزائیدہ بچے کو گود میں لیے کھڑا ہے۔ شاید کرشن کو پاکر نند بھی اتنے باغ باغ نہ ہوئے ہوں گے۔ معلوم ہوتا تھا مسرّت اس کے جسم سے باہر نکلی پڑتی ہے۔ چہرے اور آنکھوں سے تشکّر اور نیاز کے نغمے سے نکل رہے تھے، کچھ وہی کیفیت تھی جو کسی فاقہ کش سائل کے چہرے پر شکم سیر ہوجانے کے بعد نظر آتی ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''کہو مہراج، گومتی دیوی کا کچھ سراغ ملا؟ تم تو باہر گئے تھے۔''

گنگو نے جامے میں پھولے نہ سماتے ہوئے جواب دیا ''ہاں بابو جی آپ کی دعا سے ڈھونڈ لایا۔ لکھنؤ کے زنانے ہسپتال میں ملی۔ یہاں ایک سہیلی سے کہہ گئی تھی کہ اگر وہ بہت بے قرار ہوں تو بتلا دینا۔ میں سنتے ہی لکھنؤ بھاگا اور انھیں لے آیا گھاتے میں یہ بچہ بھی مل گیا۔''

اس نے بچے کو گود میں میری طرف بڑھایا گویا کوئی کھلاڑی تمغہ پاکر اسے دکھا رہا ہو۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ابھی اس کی شادی کو ہوئے کل چھ مہینے ہوئے ہیں پھر بھی یہ بچے کو کتنی بے حیائی سے دکھا رہا ہے۔ میں نے تمسخر کے انداز سے پوچھا ''اچھا یہ لڑکا بھی مل گیا۔ شاید اس لیے وہ یہاں سے بھاگی تھی۔ ہے تمھارا ہی لڑکا نہ۔''

''میرا کاہے کو ہے بابو جی، آپ کا ہے بھگوان کا ہے۔''

''تو لکھنؤ میں پیدا ہوا؟''

''ہاں بابو جی۔ ابھی تو کُل ایک مہینے کا ہے۔''

''تمھاری شادی ہوئے کتنے دن ہوئے؟''

''یہ ساتواں مہینہ جا رہا ہے۔''

''شادی کے چھٹے مہینے میں پیدا ہوا؟''

''اور کیا بابو جی۔''

''پھر بھی تمھارا لڑکا ہے۔''

''ہاں جی۔''

''کیسی بے سر پیر کی باتیں کر رہے ہو؟''

معلوم نہیں میرا منشا سمجھ رہا تھا۔ اسی سادہ لوحانہ انداز سے بولا۔ ''گھر میں مرتے مرتے بچی۔ بابو جی یہ نیا جنم ہوا۔ تین دن تین رات چھپٹ پٹاتی رہی۔ کچھ نہ پوچھیے۔''

میں نے اب کی ذرا طنز کے ساتھ کہا۔ ''لیکن چھ مہینے میں لڑکا ہوتے میں نے آج ہی سنا۔''

یہ کنایہ نشانہ پر جا بیٹھا۔ معذرت آمیز تبسم کے ساتھ بولا۔ ''مجھے تو بابو جی اس کا خیال بھی نہیں آیا۔ اسی لاج سے تو گومتی بھاگی تھی۔ میں نے کہا۔ ''گومتی اگر تمھارا دل مجھ سے نہیں ملتا ہو تو مجھے چھوڑ دو۔ میں اسی دم چلا جاؤں گا۔ اور پھر کبھی تمھارے پاس نہ آؤں گا۔ تمھیں جب کسی چیز کی جرورت ہو مجھے لکھنا میں بھرسک تمھاری مدد کروں گا، مجھے تم سے کوئی ملال نہیں ہے۔ تم میری نجر میں اب بھی اتنی ہی بھلی ہو۔ اب بھی میں تمھیں اتنا ہی چاہتا ہوں، نہیں اب میں تمھیں اور زیادہ چاہتا ہوں، لیکن اگر تمھارا دل مجھ سے پھر نہیں گیا ہے تو میرے ساتھ چلو۔ گنگو جیتے جی تم سے بے وپھائی نہیں کرے گا۔ میں نے تم سے اس لیے بیاہ نہیں کیا کہ تم دیوی ہو بلکہ اس لیے کہ میں تمھیں چاہتا ہوں اور سمجھتا تھا کہ تم بھی مجھے چاہتی ہو۔ یہ بچہ میرا ہے میرا اپنا بچہ ہے۔ میں نے ایک بویا ہوا کھیت لیا تو کیا اس کی پھسل کو اس لیے چھوڑ دوں گا کہ اسے کبھی دوسرے نے بویا تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے زور سے قہقہہ مارا۔

میں کپڑے اتارنا بھول گیا۔ کہہ نہیں سکتا کہ کیوں میری آنکھیں پُر آب ہو گئیں نہ جانے وہ کون سی طاقت تھی جس نے میری دلی کراہت کے باوجود میرے ہاتھوں کو بڑھا دیا۔ میں نے اس معصوم بچے کو گود میں لے لیا اور اس پیار سے اس کا بوسہ لیا کہ شاید اپنے بچوں کا کبھی نہ لیا ہوگا۔

گنگو بولا۔ ''بابو جی آپ بڑے شریف ہیں۔ میں گومتی سے برابر آپ کا بکھان کیا کرتا ہوں۔ کہتا ہوں چل ایک بار ان کے درسن کر آ۔ لیکن مارے سرم کے آتی ہی

نہیں۔"

میں اور شریف! اپنی شرافت کا پردہ آج میری نظروں سے ہٹا۔

میں نے عقیدت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نہیں جی، وہ میرے جیسے سیاہ دلوں کے پاس کیا آئیں گی۔ چلو میں ان کے درشن کرنے چلتا ہوں۔ تم مجھے شریف سمجھتے ہو۔ میں ظاہر میں شریف مگر دل کا کمینہ ہوں۔ اصلی شرافت تم میں ہے اور یہ معصوم بچہ وہ پھول ہے جس سے تمھاری شرافت کی مہک نکل رہی ہے۔

میں بچے کو سینے سے چمٹائے ہوئے گنگو کے ساتھ چلا۔

(یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ 'ہنس' کے اپریل 1933 کے شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا بالک۔ 'مان سروور' 2 میں شامل ہے۔ اردو میں یہ 'جامعہ' فروری 1935 میں شائع ہوا۔ 'واردات' مین شامل ہے۔)

ویراگیہ

گورکھپور ریلوے میں کوئی ایسا نیک اور خداترس شخص نہیں تھا جیسے پنڈت بجرنگ ناتھ۔ بہت پڑھے لکھے، روشن خیال اور سیدھے سوبھاؤ کے آدمی تھے۔ دفتر کے سبھی آدمی چھوٹے سے بڑے تک ان سے خوش رہتے تھے۔

بیساکھ کا مہینہ تھا۔ مئی کی پہلی تاریخ۔ پنڈت جی نے تنخواہ کے اسّی روپے پائے اور گھر میں لاکر بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیے۔ بیوی کا نام بندھیشوری تھا۔ اپنے شوہر کے مانند وہ بھی دیا اور پریم کی دیوی تھی۔ شوہر کے لیے لوٹے کا پانی لاکر بولی، ''دس تو گھر کے کرائے میں جائیں گے اور تیس گھر بھیجنے ہیں''۔

بجرنگ۔ ''ہاں، اور دس روپے دونوں بچّوں کے لیے گروکل بھیجنے ہوں گے۔''

ان کے محلے کے دو بچے گروکل آشرم میں پڑھنے گئے تھے، جنھیں دس روپے ماہوار چندہ دینے کا پنڈت جی نے وعدہ کیا تھا۔

بندھیشوری۔ ''ہاں، اور کیا، کم سے کم پانچ روپے اس برہمن کو دینے چاہیے جو اپنی لڑکی کی شادی کے لیے کچھ مدد مانگنے آیا تھا''۔

بجرنگ۔ ''ہاں، ہاں! مجھے تو اس کی یاد ہی نہ رہی تھی۔ گوشالا کا چندہ بھی تو دو روپے ہوگا''۔

بندھیشوری۔ ''اور دو روپے پُتری پاٹھ شالا کا چندہ بھی تو ہے''۔

بجرنگ۔ ''روپے تو سب ہوگئے۔ تو ہم بدری ناتھ کی یاترا کیسے کریں گے؟''

بندھیشوری۔ ''اسی میں دس روپے نکال کر رکھ دو۔ ہر مہینے اتنا ہی نکالیں گے تو سال میں ایک سو بیس روپے جمع ہوجائیں گے۔ کیا اتنے میں بدری ناتھ کی زیارت نہ ہوگی؟

بجرنگ۔ ''(حساب لگاکر) دس روپے ادھر جمع کروں گا تو مہینے بھر کے لیے کیا بچے

گا؟ کل گیارہ روپے تو بچتے ہیں''۔
بندھیشوری۔ ''اتنا کھانے بھر کو بہت ہے''۔
بجرنگ۔ ''تمھاری ساری بھی دیکھ رہا ہوں، پھٹ رہی ہے''۔
بندھیشوری۔ ''اس مہینے چل جائے گی۔ اس مہینے میں بن پڑے تو لے لوں گی''۔
بجرنگ۔ ''گھر پر صرف بیس روپے بھیجیں، اب کے ایک نوکرانی رکھ لی جائے''۔
بندھیشوری۔ ''نہیں نہیں، نوکرانی کی کیا ضرورت ہے؟ دو آدمیوں کے ویسے ہی برتن کون بہت سے ہوتے ہیں''۔

اسی طرح پنڈت کی تنخواہ ہر ماہ بٹ جاتی تھی۔ مہینوں کے سوچ وِچار کے بعد کہیں جاکر ایک جوڑا ساڑی آپاتی تھی۔ لیکن دونوں اسی میں خوش تھے۔ انھیں پیسے کا اور لالچ نہ تھا۔ ہاں، ابھی تک ان کے کوئی لڑکا نہیں تھا اور دونوں میاں بیوی ایک لڑکے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ ان کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ ہمارے ایک لڑکا ہوتا۔ صرف ایک ...... ان کی سکون کی سلطنت میں بس ایک کمی تھی۔

آہستہ آہستہ دس سال گزر گئے۔ پنڈت بجرنگ ناتھ کے اسّی سے ایک سو پچاس ہوگئے۔ اسی لحاظ سے ماہانہ اخراجات میں بھی زیادتی ہوگئی، لیکن اپنے خرچ کے لیے اب بھی وہ کسی مہینے میں پچاس روپے سے زیادہ نہ لیتے تھے۔ اور وہ بھی اس لیے کہ اتنے دنوں میں وقت بہت بدل چکا تھا اور ضروریات کی چیزیں مہنگی ہوگئی تھیں۔ بندھیشوری نے ابھی تک کوئی برتن مانجنے والی نہ رکھی تھی۔ پر اور سب کچھ ہوگیا۔ اور ان کی اولاد کی خواہش بھی پوری نہیں ہوئی وہ اب تک اکیلے تھے۔ پہلے یہ خواہش محض عقائد کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ صرف کبھی کبھی ان کی یاد آجاتی تھی، پر اب ان دنوں کو خاص طور سے ...... بندھیشوری کو اپنی سونی گود دیکھ کر دکھ اور محرومی کا احساس ہوتا تھا۔ ان کا مذہبی جھکاؤ پہلے فطری اور بنا لالچ کا تھا۔ پر اب اس میں لالچ ملتا جارہا تھا۔ وہ اب دان دے کر اس کی اجر بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان میں کبھی کبھی باتیں ہوتیں۔ ایشور کیسا منصف ہے، جو رات دن خودغرضیوں کے چکر اور ہوسناکیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں انھیں دودھ پوت سبھی دیتا ہے اور ہماری اتنی سی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔ یہی بھگت کا مقدر ہے۔ مذہب پرستی میں ساری عمر گزر گئی اور پھر بھی کوئی سکھ نہیں۔ ہم سے تو وہی اچھے ہیں جو

عیش و آرام کی زندگی گزارتے ہیں، لیکن شاید بھگوان کی بھی یہی مرضی ہے، نہیں تو ہمارے اوپر اتنا کرم بھی نہ ہوتا۔ بھگتوں کے لیے چاروں پروشارتھ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ یہاں کچھ بھی نہیں۔ موچھ نہ جانے ہوگا یا نہیں۔ جیسا کہ اتنی ذرا سی خواہش پوری نہیں ہوئی تو موچھ کون دیتا ہے!

پنڈت بجرنگ ناتھ اپنی بیوی کو سمجھاتے رہتے تھے، ''بھگوان کی مرضی کون جانتا ہے۔ اگر بنا اولاد ہونے ہی میں ہمارا کلیان ہو تو ......؟ جب ان کی مہربانی ہوگی، مذہب، اولاد، دھن، موچھ سبھی مل جائیں گے۔ بھگتوں کا فرض صرف اپنے تن من کو بھگوان کے چرنوں پر نچھاور کر دینا ہے۔ پھل کی کوئی امید نہیں کرنی چاہیے۔ ہم اپنی محدود عقل سے کیا جان سکتے ہیں کہ ہمارے لیے کیا سودمند ہے اور کیا نہیں''۔ بندھیشوری یہ اُپدیش سن کر چپ تو ہوجاتی پر اس کے من میں اطمینان نہیں ہوتا تھا اور پنڈت جی بھی خود صاف دل سے یہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ لڑکے کی خواہش سے ان کا من بھی چنچل ہوجاتا تھا لیکن وہ اس درد کو زیادہ ظاہر نہیں کرتے تھے۔

پنڈت جی کے پڑوس میں ایک بنیا رہتا تھا۔ دونوں گھروں کی دیواریں ملی ہوئی تھیں۔ بیچ میں بنئے نے ایک چھوٹی سی کھڑکی کھول لی تھی۔ کبھی کبھی دونوں عورتیں کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوکر بات چیت کرتی تھیں۔ بنیائن کے کئی بچے تھے۔ لین دین ہوتا تھا اور کپڑے کی دکان چلتی تھی۔ دونوں ہی زیادہ اور کڑا سود لینے والے تھے۔ بنیائن خود بھی کچھ لین دین کیے ہوئے تھی اور روپے پر ایک آنا سود لیتی تھی۔ ان کے دروازے پر ایسا کوئی بھاگیہ وان بھکاری ہوگا جو خیرات پا جاتا، نہیں تو مسلسل یہی جواب ملتا، پھر مانگو، ہاتھ خالی نہیں ہے، وغیرہ۔ بھکاری گالیاں دیتے چلے جاتے تھے۔ دیوار ملی رہنے کی وجہ سے کبھی کبھی بنئے کے گھر کی باتیں اس گھر میں سنائی دیتی تھیں۔ خاص طور سے اس لیے کہ بنئے کی بیوی کی آواز کافی تیز تھی۔

ایک دن رات کو بندھیشوری کھانا کھاکر آنگن میں لیٹی ہوئی تھی اور پنڈت جی کوئی سماچار پتر پڑھ رہے تھے کہ اتنے میں بنیا دکان بڑھاکر گھر آیا۔ اس کی بیوی نے پوچھا، ''آج کیسی بکری ہوئی؟''

بنیا بولا، ''آج تو سارے دن مکھیاں مارتا رہا۔ بوہنی تک نہیں ہوئی''۔

بنیائن۔ ''یہاں بھی نہ جانے کس کا منہ دیکھا تھا کہ تیل کی ہانڈی ہاتھ سے چھوٹ گئی اور سارا تیل بہہ گیا۔

بنیا۔ ''پڑوس والی پنڈتائن کا منہ تو نہیں دیکھا تھا؟''

بنیائن۔ ''ہاں، خوب یاد آیا۔ میں نے اٹھتے ہیں کھڑکی سے جھانکا تو وہ نہا رہی تھی''۔

بنیا۔ ''میں نے بھی اسی پنڈت کا منہ دیکھا تھا۔ گھر سے چلا نہانے، تو بیٹھا منہ دھو رہا تھا''۔

بنیائن۔ ''میں بھی بنا دن چڑھے گھر کی کھڑکی نہیں کھولوں گی''۔

رات کی خاموشی عام طور سے زیادہ گہری ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی یا ان دونوں نے ان لوگوں کو سنانے کے لیے یہ باتیں کی تھی، اس کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ پر باتیں صاف صاف سنائی دیں۔ دونوں نے سن لیا۔ بندھیشوری نے دکھی آنکھوں سے اپنے شوہر کو دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ پنڈت جی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اخبار کو زمین پر رکھ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی مذہبیت کبھی بھی اتنے سخت امتحان سے نہیں گزری تھی۔

کچھ دیر کے بعد بندھیشوری نے کہا۔ ''کوئی دوسرا گھر کھوجو''۔

بجرنگ ناتھ بولے۔ ''ہاں، کل''۔

گھر تو دوسرے ہی دن بدل دیا گیا۔ پر باتوں سے دل کو جو تکلیف پہنچی تھی، اس کا علاج نہ ہوسکا۔ جو آگ پہلے دبی ہوئی سلگتی رہتی تھی اس نے اب بھڑکنا شروع کردیا تھا اور اس کی لپٹیں زندگی کی اونچی اقدار کو چھونے لگی تھیں۔ عقیدت، بدرنگی، عمل پرستی پر سے اب ان کا اعتماد اٹھنے لگا تھا۔ مذہبی زندگی اب انھیں فریب معلوم ہوتی تھی۔

شام کا وقت تھا۔ پنڈت بجرنگ ناتھ ماہانہ تنخواہ کے ڈیڑھ سو روپے بیوی کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے بولے، ''ابھی تو وقت ہے، لاؤ ٹہلتا آؤں اور گوشالہ کے پانچ روپے دیتا آؤں۔ اُدھر کی پاٹھ شالہ کا چندہ بھی دیتا آؤں گا''۔

بندھیشوری نے روپے صندوق میں بند کرتے ہوئے کہا، ''اب سے کسی کو نہ دوں گی۔ کیا فائدہ؟ کیا اور سب لوگ کھانا پہننا جانتے ہیں اور ہم نہیں جانتے۔ صرف تیس روپے گھر بھیج دو، باقی روپے گھر کے خرچ میں آئیں گے۔ کل تک کہار تلاش کرکے رکھ

لیں، تپ کرتے کرتے آدھی عمر بیت گئی اور اس کا کچھ پھل ہی نہیں ملا۔ اپنے پیٹ کھاتے، اپنے تن پہنتے تو تسکین ہوتی۔ دوسروں کے لیے بیکار کیوں جان دیں۔ کائنات خدا کی ہے۔ وہ اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ ہم کیوں اپنی خواہشات کو ختم کریں''۔

بجرنگ نے ہنس کر کہا۔ ''لاؤ، لاؤ۔ دیتا آؤں۔ لوگ کیا کہیں گے!''

بندھیشوری۔ ''دنیا کو کسی کے کہنے کا ڈر نہیں ہے تو ہمیں کو کیوں ہو؟ کسی کو دودھ بھی اور پوت بھی۔ یہاں ایک سے بھی گئے''۔

بجرنگ کے دل میں بھی یہی خیال پیدا ہو چکا تھا۔ ایک بار اور اوپر دل سے کہا۔ پھر دو روپے لے کر قلمی آم لینے بازار چلے گئے۔

آج سے دونوں خود اپنی سیوا میں محو ہو گئے۔ اچھے اچھے بھوجن بنانے لگے۔ سندر کپڑے پہننے لگے۔ ایک سو روپے ہوتے ہی کیا ہیں؟ کھانے پہننے ہی میں اڑنے لگے۔ پہلے جتنا دیا دھرم کرتے تھے، پیٹ اور تن کاٹ کر کرتے تھے۔ اب من پسند بھوجن اور لباس کا خیال کرنے لگے تو مہینے کے لیے تنخواہ کافی نہ ہوتی۔ ایشور کی مایا۔ جیون کی اس کایاپلٹ کے دوسرے ہی سال بندھیشوری کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ خوشیاں منائی جانے لگیں۔ باجے بجنے لگے۔ جشن کی تیاریاں ہونے لگیں۔

بچے کی 'برہی' تھی۔ ڈومنیاں گا رہی تھیں۔ باہر دوستوں کی محفل تھی۔ شناساؤں اور رشتے داروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ شامیانہ تنا ہوا تھا۔ ملہار کی تانیں اڑ رہی تھیں۔ ایک طرف دعوت کا سامان ہو رہا تھا۔ بندھیشوری اس جشن میں خوشی کے مارے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ بار بار نوزائیدہ بچے کا منھ دیکھتی اور اس کو چومنے لگتی۔ دل خوش ہو جاتا۔ 'میرے لال، تم نے آ کر میرا منھ روشن کر دیا۔ اب کس کا منھ ہے جو مجھے طعنے دے سکے''۔ اس پڑوسی بنئے کو بھی بلایا گیا تھا جس نے بندھیشوری کے خلاف اذیت ناک لفظوں کا استعمال کیا تھا۔ بنیائن کچھ ان منی سی بیٹھی تھی اور بندھیشوری کی ساس جو گھر سے اس جشن کا انتظام کرنے آئی تھی، بار بار بنیائن کو طعنے دے رہی تھی۔ بندھیشوری بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی کہ کب جشن ختم ہو اور میں اپنے پیارے لال کو اس کے باپ کو گود میں دے دوں۔

اس کی آنکھوں میں چمک آئے گی۔ چھاتی ایک گج کی ہو جائے گی۔

گیارہ بج گئے تھے۔ مہمان رخصت ہوگئے تھے۔ محفل اٹھ چکی تھی۔ نوکر چاکر نمٹ کر کھانے بیٹھے تھے۔ بابو بجرنگ بالک کا منہ دیکھنے کے لیے بے چین ہورہے تھے۔ مہمانوں کو رخصت کراکے گھر میں گئے۔ بندھیشوری نہا دھوکر آچکی تھی۔ اس کا منہ کمل کی طرح کھلا ہوا تھا بجرنگ جیوں ہی گھر میں گئے، مسکرا کر کہا، بیٹا مبارک ہو!'' اور بالک کو گود میں اٹھاکر پتا کی گود میں دے دیا۔ سنسار کی مایا پاکر بھی ان کا دل اتنا خوش نہ ہوتا۔ کتنی سندر موہنی مورتی تھی! گویا آسمانی دیوتاؤں کی مہربانی سے مجسم ہوگیا ہو۔

بالک کو لے کر اس کا منوہر مکھرا دیکھا۔ آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ چھاتی سے لگایا، چھاتی پھول اٹھی۔

بندھیشوری نے کہا، ''تم سے کوئی بھاری انعام لوں گی''۔

''خدا بچے کی عمر دراز کرے، یہی تمھیں میرا سب سے بڑا انعام ہے''۔

اس طرح باتیں کرتے ہوئے دونوں سوگئے۔ دن بھر کے تھکے ماندے تھے۔ فوراً نیند آگئی۔ مگر تھوڑے دیر بعد بجرنگ ناتھ ایک خواب دیکھ کر چونک پڑے، جیسے ایک مہاتما آکر بالک کے سرہانے کھڑے ہوکر ان سے کہہ رہے ہوں، ''لے، اب تیری دلی خواہش پوری ہوگئی۔ یہ لالچ کا پھل ہے۔ اس پر تو اتنا خوش ہے۔ خدا کی لگن کا پھل اس میں کہیں زیادہ میٹھا ہوتا ہے۔ تو سونا نہ لے کر لوہے پر لٹّو ہوگیا''۔ یہ کہہ کر مہاتما غائب ہوگئے۔ چاروں طرف رات کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چراغ جل رہا تھا۔ بالک میٹھی نیند میں سورہا تھا۔ گویا کسی دل میں کوئی خوبصورت نور سورہا ہے۔ بجرنگ ناتھ کے کانوں میں خواب کے الفاظ گونج رہے تھے۔ انھوں نے لڑکے کے منہ کی طرف دیکھ کر دل میں کہا — کیا اس سے بھی اچھی کوئی شے ہے تو خدا کی لگن کا پھل کتنا من موہک ہوگا''۔ وہ فوراً گھر سے نکلے۔ بچے کی طرف بڑی دردبھری نظر سے دیکھا اور جنگل کی راہ لی۔ پھر کسی کو ان کا پتہ نہ لگا۔

(یہ افسانہ ہندی رسالہ 'سوا دھیتا' 1933 میں شائع ہوا۔ 'پریم چند کا اپراپیہ ساہتیہ' جلد 1 میں شامل ہے۔ اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔)

اکسیر

بیوہ ہو جانے کے بعد بوٹی کے مزاج میں کچھ تلخی آگئی تھی۔ جب خانہ داری کی پریشانیوں سے بہت جی جلتا تو اپنے جنت نصیب کو صلواتیں سناتی۔ ”آپ تو سدھار گئے۔ میرے لیے یہ سارا جنجال چھوڑ گئے۔ جب اتنی جلدی جانا تھا تو شادی نہ جانے کس لیے کی تھی۔ گھر میں بھونی بھانگ نہ تھی، چلے تھے شادی کرنے۔“ بوٹی چاہتی تو دوسری سگائی کر لیتی۔ اہیروں میں اس کا رواج ہے۔ اس وقت وہ دیکھنے سننے میں بھی بُری نہ تھی۔ دو ایک اس کے خواستگار بھی تھے۔ لیکن بوٹی عفت پروری کے خیال کو نہ روک سکی۔ اور یہ سارا غصہ اترتا تھا اس کے بڑے لڑکے موہن پر، جس کا سولھواں سال تھا۔ سوہن ابھی چھوٹا تھا اور مینا لڑکی تھی۔ یہ دونوں ابھی کس لائق تھے۔ اگر یہ تین بچے اس کی چھاتی پر سوار نہ ہوتے تو کیوں اتنی تکلیف ہوتی۔ جس کے گھر میں تھوڑا سا کام کر دیتی، وہ روٹی کپڑا دے دیتا۔ جب چاہتی کسی کے گھر بیٹھ جاتی۔ اب اگر وہ کہیں بیٹھ جائے تو لوگ یہی کہیں گے کہ تین تین بچوں کے ہوتے یہ اسے کیا سوجھی! موہن اپنی بساط کے مطابق اس کا بار ہلکا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جانوروں کو سانی پانی ڈھونا متھنا یہ سب وہ کر لیتا، لیکن بوٹی کا منہ سیدھا نہ ہوتا تھا۔ روزانہ ایک نہ ایک بات نکالتی رہتی۔ اور موہن نے بھی عاجز ہو کر اس کی تلخ نوائیوں کی پرواہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بوٹی کو شوہر سے یہی گلہ تھا کہ وہ اس کے گلے پر گرہستی کا جنجال چھوڑ کر چلا گیا۔ اس غریب کی زندگی ہی تباہ کردی۔ نہ کھانے کا سُکھ میسر ہوا نہ پہننے کا، نہ اور کسی بات کا۔ وہ اس گھر میں کیا آئی، گویا بھٹی میں پڑ گئی۔ اس کے ارمانوں کی تشنہ کامی اور بیوگی کے قیود میں ہمیشہ ایک جنگ سی چھڑی رہتی تھی، اور جلن میں ساری مٹھاس جل کر خاک ہو گئی تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد بوٹی کے پاس اور کچھ نہیں تو چار پانچ سو کے زیور تھے، لیکن ایک ایک کر کے وہ سب اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اس کے محلّے، اس کی برادری

میں کتنی ہی عورتیں ہیں جو عمر میں اس سے بڑی ہونے کے باوجود گہنے جھمکا کر، آنکھوں میں کاجل لگا کر، مانگ میں سیندور کی موٹی سی لکیر ڈال کر گویا اسے جلاتی رہتی ہیں۔ اس لیے جب اس میں سے کوئی بیوہ ہو جاتی ہے تو بوٹی کو ایک حاسدانہ مسرت ہوتی ہے۔ وہ شاید ساری دنیا کی عورتوں کو اپنی ہی جیسی دیکھنا چاہتی تھی۔ اور اس کی محروم آرزوؤں کو اپنی پاکدامنی کی تعریف اور دوسروں کی پردہ دری اور حرف گیری کے سوا سکونِ قلب کا اور کیا ذریعہ تھا۔ کیسے اپنے آنسو پونچھتی! وہ چاہتی تھی اس کا خاندان حسن سیرت کا نمونہ ہو۔ اس کے لڑکے ترغیبات سے بے اثر رہیں۔ یہ نیک نامی بھی اس کی پاکدامنی کے غرور کو مشتعل کرتی رہتی تھی۔

اس لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ موہن کے متعلق کوئی شکایت سنے اور ضبط کر جائے۔ تردید کی گنجائش نہ تھی۔ غیبت کی اس دنیا میں رہتے رہتے وہ ایک خاص قسم کی باتوں میں بے انتہا سہل اعتقاد ہوگئی تھی۔ گویا وہ کوئی ایسا سہارا ڈھونڈتی رہتی تھی جس پر چڑھ وہ اپنے کو دوسروں سے اونچی دکھا سکے۔ آج اس کے غرور کو ٹھیس لگی۔ موہن جوں ہی دودھ بیچ کر گھر آیا، بوٹی نے اسے قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''دیکھتی ہوں اب تجھے ہوا لگ رہی ہے۔''

موہن اشارہ نہ سمجھ سکا۔ پُر سوال نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں، کیا بات ہے؟

''شرمائے گا تو نہیں۔ الٹا مجھی سے پوچھتا ہے۔ تو روپا سے چھپ چھپ کر نہیں ہنستا بولتا۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ گھر میں پیسے پیسے کی تنگی ہے اور اس کے لیے پان لائے جاتے ہیں۔ کپڑے رنگائے جاتے ہیں۔''

موہن نے عذر گناہ کیا جو گناہ سے بھی بدتر تھا۔

''تو میں نے کون سا گناہ کر ڈالا۔ اگر اس نے مجھ سے چار پیسے کے پان مانگے تو کیا کرتا۔ کہتا کہ پیسے دے تو پان لاؤں گا۔ اپنی ساڑھی رنگانے کو دے دی تو اس سے رنگائی مانگتا۔''

''محلے میں ایک تو ہی بڑا دھنّا سیٹھ ہے۔ اس نے اور کسی سے کیوں نہ کہا؟''

''یہ وہ جانے۔ میں کیا بتاؤں۔''

''کبھی گھر میں بھی دھیلے کے پان لایا'' یا ساری خاطرداری دوسروں کے لیے ہی رکھ چھوڑی ہے؟''

''یہاں کس کے لیے پان لاتا؟''

''تیرے لیے کیا گھر کے سارے آدمی مر گئے؟''

''میں نہ جانتا تھا تم بھی پان کھانا چاہتی ہو۔''

''سنسار میں ایک روپا ہی پان کھانے کے لائق ہے؟''

''شوق سنگار کی بھی تو ایک عمر ہوتی ہے۔''

بوٹی جل اٹھی۔ اُسے بڑھیا کہہ دینا اس کے تقویٰ وطہارت کو خاک میں ملا دینا تھا۔ بڑھاپے میں ان پابندیوں کی وقعت ہی کیا۔ جب نفس کشی کے بل پر وہ سب عورتوں کے سامنے سر اٹھا کر چلتی تھی۔ اس کی یہ ناقدری! انھی لڑکوں کے پیچھے اس نے اپنی ساری جوانی خاک میں ملا دی۔ اس کے شوہر کو گزرے آج پانچ سال ہوئے، تب اس کی چڑھتی جوانی تھی۔ یہ تین چینٹے پوت اس کے گلے منڈھ دیے ہیں۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ چاہتی تو آج وہ بھی ہونٹ سرخ کیے پاؤں میں مہندی رچائے، الوٹ، بچھوئے پہنے مٹکتی پھرتی۔ یہ سب کچھ اس نے لڑکوں کے کارن تیاگ دیا اور بوٹی بڑھیا ہے۔

بولی۔ ''ہاں اور کیا، میرے لیے تو اب پھٹے چیتھڑے پہننے کے دن ہیں۔ جب تیرا باپ مرا تو میں روپا سے دو ہی چار سال بڑی تھی۔ اس وقت کوئی گھر کر لیتی تو تم لوگوں کا کہیں پتہ نہ لگتا۔ گلی گلی بھیک مانگتے پھرتے۔ لیکن میں کہے دیتی ہوں، اگر تو پھر اس سے بولا تو یا تو تُو ہی گھر میں رہے گا یا میں ہی رہوں گی۔''

موہن نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''میں اسے بات دے چکا ہوں، اماں۔''

''کیسی بات؟''

''سگائی کی۔''

''اگر روپا میرے گھر میں آئی تو جھاڑو مار کر نکال دوں گی۔ یہ سب اس کی ماں کی مایا ہے۔ وہی کٹنی میرے لڑکے کو مجھ سے چھینے لیتی ہے۔ رانڈ سے اتنا بھی نہیں دیکھا جاتا۔ چاہتی ہے کہ اسے سوت بنا کر میری چھاتی پر مونگ دلے۔''

موہن نے دردناک لہجہ میں کہا۔ ''اماں ایشور کے لیے چُپ رہو۔ کیوں اپنا پانی آپ کھو رہی ہو۔ میں تو سمجھتا تھا چار دن میں مینا اپنے گھر چلی جائے گی۔ تم اکیلی رہ جاؤ گی اسی لیے اُسے لانے کا خیال ہوا۔ اگر تمھیں برا لگتا ہے تو جانے دو۔''

بوٹی نے شبہ آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''تو آج سے یہیں آنگن میں سویا کر۔''

''اور گائے بھینس باہر پڑی رہیں گی؟''

''پڑی رہنے دو۔ کوئی ڈاکہ نہیں پڑا جاتا۔''

''مجھ پر تجھے اتنا شبہ ہے؟''

''ہاں۔''

موہن نے خود داری کی شان سے کہا۔ ''میں یہاں نہ سوؤں گا۔''

''تو نکل جا میرے گھر سے۔''

''ہاں تیری یہی مرضی ہے تو نکل جاؤں گا۔''

مینا نے کھانا پکایا۔ موہن نے کہا۔ ''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

بوٹی اسے منانے نہ گئی۔ موہن کا سرکش دل ماں کے اس جابرانہ حکم کو کسی طرح قبول نہیں کرسکتا۔ ماں کا گھر ہے لے لے اپنے لیے۔ وہ کوئی دوسرا ڈھونڈ لے گا۔ روپا نے اس کی بے لطف، بے کیف زندگی میں ایک مسرت پیدا کردی تھی۔ جب وہ اپنے دل میں ایک ناقابلِ بیان شورش کا احساس کر رہا تھا۔ جب وہ اپنی زندگی کی معمولی پُر مشقت رفتار سے بیزار ہو رہا تھا۔ جب دنیا اسے سونی سونی دلچسپیوں سے خالی نظر آ رہی تھی۔ اس وقت روپا نے اس کی زندگی میں بہار کی طرح رونما ہو کر اسے سرخ کونپلوں اور طیور کے نغموں سے حلاوت پیدا کر دی۔ اب اس کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی کام کرتا ہوتا تو دل روپا کی طرف لگا ہوتا۔ یہی ارمان تھا کہ اسے کیا چیز دے دے کہ وہ خوش ہو جائے۔ بڑی ہمت کر کے اس نے اس سے اپنا دردِ دل کہا۔ اب آج وہ کس منہ سے اس کے پاس جائے۔ کیا اس سے کہے، کہ اماں نے مجھے تم سے ملنے کی ممانعت کی ہے۔ ابھی کل تو چراگاہ میں برگد کے سایہ دار درخت کے نیچے دونوں میں کیسے اخلاص کی باتیں ہو رہی تھیں۔ موہن نے کہا تھا ''روپا تم اتنی سندر ہو کہ تمھارے لیے سو گاہک نکل آئیں گے۔ تم جس گھر میں جاؤ گی وہ روشن ہو جائے گا۔ میرے گھر میں تمھارے لیے

کیا رکھا ہے۔'' اس پر روپا نے جواب دیا تھا۔ وہ ایک نغمۂ لطف کی طرح اس کے جسم کی ایک ایک رگ میں، اس کی روح کے ایک ایک ذرہ میں بسا ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''میں تو تم کو چاہتی ہوں موہن صرف تم کو۔ پرگنے کے چودھری ہو جاؤ تب بھی موہن ہو، مزدوری کرنے لگو تب بھی موہن ہو۔'' وہ اپنے موہن کے لیے افلاس، رسوائی اور فاقہ کشی سب کچھ جھیل لے گی۔'' اسی روپا سے اب وہ جاکر کہے''مجھے اب تم سے کوئی سروکار نہیں ہے۔''

نہیں یہ غیر ممکن ہے۔ اسے گھر کی پرواہ نہیں ہے۔ وہ روپا کے ساتھ ماں سے الگ رہے گا۔ یہاں نہ سہی، کسی دوسرے محلّے میں سہی۔ اس وقت بھی روپا اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ کیسے مجھے بیڑے لگاتی ہے کہ جی خوش ہو جاتا ہے۔ جیسے بیڑوں میں پریم گھول دیتی ہے۔ لیکن جاؤگے کیسے؟ اماں سے وعدہ نہیں کیا ہے؟ کہیں اماں سُن لیں کہ یہ رات کو روپا کے پاس گیا تھا تو جان ہی دے دیں، تو میرا کیا نقصان؟ دے دیں جان اپنی، تقدیر کو تو نہیں بکھانتیں کہ ایسی دیوی جو انھیں پان کی طرح پھیرے گی۔ الٹے اور اس سے جلتی ہیں۔ نہ جانے کیوں روپا سے اُسے اتنی چڑھ ہے۔ وہ ذرا پان کھا لیتی ہے۔ ذرا رنگین ساڑھی پہن لیتی ہے۔ بس یہی تو اس کی عمر کھانے پہننے کی ہے۔ کیا بُرا کرتی ہے۔

چوڑیوں کی جھنکار سُنائی دی۔ روپا آرہی ہے شاید۔ ہاں وہی ہے۔ موہن کے سارے جسم کے سارے جھنکار اٹھے۔ اس کے وجود کا ایک ایک ذرہ ناچنے لگا۔ روپا اس کے دروازے پر آئی۔ شیریں ادا روپا۔ کیسے اس کا خیر مقدم کرے، کیا کرے؟ جاکر اس کے قدموں پر سر رکھ دے۔

روپا اس کے سرہانے آکر بولی ۔''کیا سو گئے موہن؟ اتنی جلدی، گھڑی بھر سے تمھاری راہ دیکھ رہی ہوں۔ آئے کیوں نہیں؟''

موہن نیند کا بہانہ کیے پڑا رہا۔

روپا نے اس کا سر ہلا کر کہا۔ ''کیا سو گئے موہن ابھی سے، اپنا پان کھا لو۔''

اس کی انگلیوں میں کیا اعجاز تھا، کون جانے؟ مون کی روح میں جیسے شادیانے بجنے لگے۔ اس کی جان روپا کے قدموں پر سر رکھنے کے لیے گویا اچھل پڑی۔ دیوی برکتوں کا

تھال لیے اس کے سامنے کھڑی ہے۔ ساری کائنات مسرت سے رقص کر رہی ہے۔ اسے ہوا جیسے اس کا جسم لطیف ہو گیا ہے اور وہ کسی صدائے مضطرب کی طرح فضا کی گود سے ہوا اس کی ساتھ رقص کر رہا ہے۔ ''میں جاتی ہوں نہیں جاگتے نہ جاگو۔ ہاں نہیں تو۔''

موہن اب ضبط نہ کر سکا۔ ''ہاں ذرا نیند آگئی تھی۔ تم اس وقت کیا کرنے آئیں۔ اگر اماں نے دیکھ لیں تو مجھے مار ہی ڈالیں۔''

روپا نے اس کے منہ میں پان کا بیڑا رکھ کر کہا۔ ''تم آج آئے کیوں نہیں؟''

''آج اماں سے لڑائی ہو گئی۔''

''کیا کہتی تھیں؟''

''کہتی تھیں روپا سے بولوگے تو جان دے دوں گی۔''

''تم نے پوچھا نہیں روپا سے کیوں اتنا چڑھتی ہو؟''

''اب ان کی بات کیا کہوں روپا، وہ کسی کا کھانا پینا نہیں دیکھ سکتیں۔''

''یہ بات نہیں ہے موہن۔ انھیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔ میں چنچل تھی نہ لیکن اب تو میں کسی سے نہیں ہنستی۔''

''اماں کو کیسے سمجھاؤں؟''

''تم میرے پاس ایک بار روز آجایا کرو۔ بس اور میں کچھ نہیں چاہتی۔''

دفعتاً موہن کے گھر کا دروازہ کھلا۔ شاید بوٹی آرہی ہے۔ روپا سرک گئی۔ موہن بھیگی بلی بن گیا۔

(2)

موہن دوسرے دن سو کر اٹھا تو اس کے دل میں مسرت کا دریا موجزن تھا۔ اس کی خلقی خشونت اور تندی غائب ہو گئی تھی۔ گویا بچے کو مٹھائی مل گئی ہو۔ وہ سوہن کو ہمیشہ ڈانٹتا تھا۔ سوہن آرام طلب اور کاہل تھا۔ گھر کے کام دھندے سے جی چُراتا تھا۔ آج بھی وہ آنگن میں بیٹھا اپنی دھوتی میں صابن لگا رہا تھا۔ غازی میاں کے میلے کی تیاری کر رہا تھا۔ موہن کو دیکھتے ہی اس نے صابن چھپا دیا۔ اور بھاگ جانے کے لیے موقعہ ڈھونڈنے لگا۔

موہن نے مخلصانہ تبسم کے ساتھ کہا۔ ''کیا دھوتی بہت میلی ہو گئی ہے سوہن۔ دھوبی کو کیوں نہیں دے دیتے؟''

''دھوبن پیسے نہ مانگے گی؟''

''تو پیسے اماں سے کیوں نہیں مانگ لیتے؟''

''اماں پیسے دے چکیں الٹی گھڑکیاں دیں گی۔''

''تو مجھ سے لے لو۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک اکنّی اس کی طرف پھینک دی۔ سوہن باغ باغ ہو گیا۔ بھائی اور ماں دونوں اس کو ملامت کرتے رہتے تھے۔ بہت دنوں کے بعد آج اسے محبت کی شیرینی کا مزا ملا۔ اکنّی اٹھا لی اور دھوتی وہیں چھوڑ گائے کو کھولنے چلا۔

موہن نے کہا۔ ''تم رہنے دو میں اسے لیے جاتا ہوں۔''

سوہن نے گائے کو کھونٹے سے کھول کر باہر ناند پر باندھ دیا۔ اور اندر آکر بھائی سے بولا۔ ''تمھارے لیے چلم رکھ لاؤں؟''

آج پہلی بار سوہن نے بڑے بھائی کی جانب ایسے حُسن عقیدت کا اظہار کیا۔ اس میں کیا راز ہے۔ یہ موہن کی سمجھ میں نہ آیا۔ برادرانہ خلوص سے اس کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ بولا۔ ''آگ ہو تو رکھ لاؤ۔''

مینا سر کے بال کھولے آنگن میں گھروندا بنا رہی تھی۔ موہن کو دیکھتے ہی اس نے گھروندا بگاڑ دیا۔ اور آنچل سے سر ڈھانپنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی رسوئی گھر کی طرف برتن اٹھانے چلی۔ موہن کے غصے سے سب ہی ڈرتے تھے۔

موہن نے پیار سے پوچھا۔ ''کیا کھیل رہی تھی مینا؟''

مینا تھر تھر کانپتی ہوئی بولی۔ ''کچھ نہیں۔''

''تو تو بہت اچھے گھروندے بنا لیتی ہے۔ ذرا بنا تو دیکھوں۔''

موہن کے مزاج میں آج یہ پُر لطف انقلاب دیکھ کر مینا کو یکایک یقین نہ آیا۔ لیکن پھر بھی اس کا چہرہ شگفتہ ہوگیا۔ پیار کے ایک لفظ میں کتنا جادو ہے۔ منہ سے نکلتے ہی جیسے ایک دلکشی سی پھیل گئی۔ جس نے سُنا اس کا دل کھل اٹھا۔ جہاں خوف اور بدگمانی تھی، وہاں اعتبار اور خلوص چمک اٹھا۔ جہاں بیگانگی تھی، وہاں اپناپا سا چھلک پڑا۔ چاروں

طرف انہاک چھا گیا۔ کہیں سُستی نہیں، کہیں بے دلی نہیں، کہیں بے نیازی نہیں۔ لوگوں کی ترقیاں ہوتی ہیں۔ خطاب ملتے ہیں۔ مقدمات میں فتح ہوتی ہے۔ لیکن ان چھوٹے چھوٹے روز مرّہ کے واقعات میں جو شیرینی ہے وہ ان اوکھ اور گنّے کے کھیتوں میں کہاں! موہن کے سینے میں آج محبت کا سوتا سا کھُل گیا تھا۔ اس میں مسرت، ہمدردی اور خلوص کی دھاریں سی نکل رہی تھیں۔

مینا گھروندا بنانے بیٹھ گئی۔

موہن نے اس کے الجھے ہوئے بالوں کو سلجھا کر کہا۔ ''تیری گڑیا کا بیاہ کب ہوگا مینا؟ جلد نیوتہ دے کچھ مٹھائی کھانے کو ملے۔''

مینا آسمان میں اڑ رہی تھی۔ بھیّا کتنے اچھے ہیں۔ اب بھیا پانی مانگیں گے تو وہ لوٹے کو راکھ سے خوب چماچم کرکے پانی لے جائے گی۔

''اماں پیسے نہیں دیتیں، گڈا تو ٹھیک ہو گیا ہے، لیکن ٹیکا کیسے بھیجوں؟''

''کتنے پیسے لگیں گے؟''

''ایک پیسے کے بتاشے لوں گی۔ اور ایک پیسے کا گلابی رنگ، جوڑے تو رنگے جائیں گے کہ نہیں۔''

''تو دو پیسے میں ہی تمھاری گڑیا کا بیاہ ہو جائے گا۔ کیوں؟''

''ہاں تم دو پیسے دے دو تو میری گڑیا کا دھوم دھام سے بیاہ ہو جائے۔''

موہن نے دو پیسے ہاتھ میں لے کر مینا کو دکھائے۔ مینا لپکی۔ موہن نے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ مینا نے ہاتھ پکڑ کے نیچے کھینچنا شروع کیا۔ جب یوں نہ پاسکی تو موہن کی گود میں چڑھ گئی اور پیسے لے لیے۔ پھر نیچے آکر ناچنے لگی۔ تب اپنی سہیلیوں کو شادی کا نوید سنانے دوڑی۔

اسی وقت بوٹی گوبر کا جھوّا لیے سار کے گھر سے نکلی۔ موہن کو کھڑے دیکھ کر تند لہجہ میں بولی۔ ''ابھی تک مٹرگشت ہی ہو رہی ہے۔ بھینیس کب دوہی جائیں گی؟''

آج موہن نے بوٹی کو سخت جواب نہ دیا۔ ماں کو بوجھ سے دبے ہوئے دیکھ کر اس نے اضطراری طور پر اس کے سر سے جھوّا لے کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

''بوٹی نے کہا۔ ''رہنے دے۔ جاکر بھینس دوہ لے۔ گوبر تو میں لیے جاتی ہوں۔''

''تم اتنا بھاری بوجھ کیوں اٹھا لیتی ہو ماں، مجھے کیوں نہیں بلا لیتیں؟''
ماں کا دل ممتا سے رقیق ہوگیا۔
''تو جا اپنا کام دیکھ۔ میرے پیچھے کیوں پڑتا ہے؟''
''گوبر نکالنے کا کام میرا ہے۔''
''دودھ کون دوہے گا؟''
''وہ بھی میں کر لوں گا۔''
''تو اتنا کہاں کا جودھا ہے کہ سارے کام کر لے گا۔''
''جتنا کہتا ہوں اتنا کر لوں گا۔''
''تو میں کیا کروں گی؟''
''تم لڑکوں سے کام لو۔ جو بے راہ چلے اُسے سمجھاؤ۔ جو غلطی دیکھو اسے ٹھیک کرو۔ بس یہی تمھارا کام ہے۔''
''میری سنتا ہے کوئی؟''
آج موہن بازار دودھ پہنچا کر لوٹا تو ایک چھوٹا سا پاندان، پان، کتھا، چھالیہ، اور تھوڑی سی مٹھائی لایا۔ بوٹی بگڑ کر بولی۔ ''آج روپے کہیں فالتو مل گئے تھے کیا؟ اس طرح تو پیسے اڑائے گا تو کے دن نباہ ہوگا؟''
''میں نے تو ایک پیسہ بھی فضول خرچ نہیں کیا۔ اماں، میں سمجھتا تھا تم پان کھاتی ہی نہیں اسی لیے نہ لاتا تھا۔''
''تو اب میں پان کھانے بیٹھوں گی؟''
''کیوں۔ اس میں ہرج کیا ہے؟ جس کے دو دو جوان بیٹے ہوں، کیا وہ اتنا شوق بھی نہ کرے؟''
بوٹی کے سخت خزاں رسیدہ دل میں کہیں سے ہریالی نکل آئی۔ ایک ننھی سی کوئل تھی۔ لیکن اس کے اندر کتنی طراوت، کتنی رطوبت، کتنی جاں بخشی بھری ہوئی تھی۔ جیسے اس کے چہرے کی جھرّیاں چکنی ہوگئیں۔ آنکھوں میں نور آگیا۔ دلِ مایوس میں ایک ترنم سا ہونے لگا۔ اس نے ایک مٹھائی سوہن کو دی، ایک مینا کو۔ اور ایک موہن کو دینے لگی۔ موہن نے کہا۔

''مٹھائی تو میں لڑکوں کے لیے لایا تھا اماں۔''

''اور تو بوڑھا ہوگیا۔ کیوں؟''

''ان لڑکوں کے سامنے تو بوڑھا ہی ہوں۔''

''لیکن میرے سامنے تو لڑکا ہی ہے۔''

موہن نے مٹھائی لے لی۔ مینا نے مٹھائی کے پاتے ہی گپ سے منہ میں ڈال لی تھی اور وہ زبان پر مٹھاس کی لذت چھوڑ کر کب کی قعرِ فنا میں جا چکی تھی۔ موہن کی مٹھائی کو للچائی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ موہن نے وہ مٹھائی مینا کو دے دی۔ ایک مٹھائی اور بچ رہی تھی۔ بوٹی نے اسے موہن کی طرف بڑھا کر کہا۔

''لایا بھی تو ذرا سی مٹھائی۔''

موہن نے کہا۔ ''وہ تم کھا جانا اماں۔''

''تمھیں کھاتے دیکھ کر مجھے جو خوشی ہوگی۔ اس میں مٹھاس سے زیادہ مزہ ہے۔''

موہن نے مٹھائی کھا لی اور باہر چلا گیا۔ بوٹی پاندان کھول کر دیکھنے لگی۔ آج زندگی میں پہلی بار اُسے یہ خوش نصیبی حاصل ہوئی۔ زہے نصیب کہ شوہر کے راج میں جو نعمت نہ میسر ہوئی۔ وہ بیٹے کے راج میں ملی۔ پاندان میں کئی کلیاں ہیں۔ اس میں چونا رہے گا۔ اس میں کتھا۔ اس میں چھالیہ۔ اس میں تمباکو۔ واہ! یہاں تو دو چھوٹی چھوٹی چمچیاں بھی ہیں، مزے سے چونا کتھا لگا لو۔ انگلی میں داغ تک نہ لگے۔ ڈھکنے میں کڑا لگا ہوا ہے۔ جہاں چاہوں لٹکا کر لیے چلو جاؤ۔ اوپر کی طشتری میں پان رکھے جائیں گے۔ مگر سروتے کے لیے کہیں جگہ نہیں ہے، نہ سہی۔ اس نے پاندان کو مانجھ دھو کر اس میں چونا کتھا رکھا۔ چھالیہ کاٹ کر رکھا۔ پان بھگو کر طشتری میں رکھے۔ تب ایک بیڑا لگا کر کھایا۔ اس بیڑے کے عرق نے جیسے اس کی بیوگی کی کرختگی کو ملائم کر دیا۔ دل کی مسرت عنایت و کرم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اب بوٹی کیسے بیٹھی رہے۔ اس کا دل اتنا گہرا نہیں ہے، کہ یہ خوبیٔ قسمت اس میں جا کر گُم ہو جائے۔ گھر میں ایک پُرانا آئینہ پڑا ہوا تھا۔ بوٹی نے اس میں اپنا منہ دیکھا۔ ہونٹوں پر سُرخی نہیں ہے۔ منہ لال کرنے کے لیے اس نے تھوڑا ہی پان کھایا ہے۔ سُرخی ہوتی تو وہ کلی کر لیتی۔ گاؤں کی ایک عورت دھنیا نے آ کر کہا۔ ''کاکی جرا رسّی دے دو رسّی ٹوٹ گئی ہے۔''

کل بوٹی نے صاف کہہ دیا تھا ''میری رسّی گاؤں بھر کے لیے نہیں ہے۔ رسّی ٹوٹ گئی ہے تو بنوا کیوں نہیں لیتی۔'' لیکن آج اس نے اتنی کج خلقی سے کام نہیں لیا۔ اس نے خندہ پیشانی سے رسّی نکال کر دھنیا کو دے دی اور ہمدردانہ انداز سے پوچھا۔ ''لڑکے کے دست بند ہوئے یا نہیں دھنیا؟''

دھنیا نے کہا۔ ''نہیں کاکی۔ آج تو دن بھر دست آئے۔ جانوں دانت آرہے ہیں۔''

''پانی بھر لے تو چل۔ ذرا دیکھوں دانت ہی ہے کہ کوئی اور فساد ہے۔ کسی کی نجر وجر تو نہیں لگی؟''

''کیا جانوں کاکی، کون جانے کسی کی آنکھیں پھوٹی ہوں۔''

''چونچال لڑکوں کو نجر کا بڑا ڈر رہتا ہے۔ جس نے چُمکار کر بلایا اسی کی گود میں چلا جاتا ہے۔''

''کاکی ایسا سہدوں کی طرح ہنستا تھا کہ تم سے کیا کہوں؟''

''کبھی کبھی ماں کی نجر بھی لگ جاتی ہے بچے کو۔''

''اے نوج، کاکی بھلا کوئی اپنے بچے کو نظر لگائے گا۔''

''یہی تو تو سمجھتی نہیں۔ نجر کوئی لگاتا نہیں آپ ہی آپ لگ جاتی ہے۔''

''دھنیا پانی لے کر آئی تو بوٹی اس کے ساتھ بچے کو دیکھنے چلی۔''

''تو اکیلی ہے۔ آج کل تو گھر کے کام دھندے میں بڑا پھجیتا ہوتا ہوگا۔''

''نہیں کاکی۔ روپا آجاتی ہے۔ اس سے بڑی مدد ملتی ہے، نہیں تو اکیلی میں کیا کرتی؟''

بوٹی کو تعجب ہوا۔ روپا کو اس نے محض تتلی سمجھ رکھا تھا۔ جس کا کام پھولوں پر بیٹھنا اور پھر اڑ جانا تھا۔ حیرت انگیز لہجہ میں بولی۔ ''روپا!''

''ہاں کاکی! بے چاری بڑی بھلی ہے۔ جھاڑو لگا دیتی ہے۔ چوکا برتن کر دیتی ہے۔ لڑکے کو سنبھالتی ہے۔ گاڑھے سے کون کسی کی بات پوچھتا ہے کاکی؟''

''اُسے تو اپنے مسّی کاجل سے ہی چھٹی نہ ملتی ہوگی۔'' ''یہ تو اپنی اپنی رُچ ہے کاکی۔ مجھے تو مسّی کاجل والی نے جتنا سہارا دیا۔ اتنا کسی پوجا پاٹ کرنے والی نے نہ

دیا۔ کل بے چاری رات بھر جاگتی رہی۔ میں نے اسے کچھ دے تو نہیں دیا، ہاں جب تک جیوں گی اس کا جس گاؤں گی۔''

''تو اس کے گن ابھی نہیں جانتی دھنیا۔ پان کے پیسے کہاں سے آتے ہیں۔ رنگین ساڑھیاں کون لاتا ہے کچھ سمجھتی ہے؟''

''میں ان باتوں میں نہیں پڑتی کاکی۔ پھر سَوک سنگار کرنے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ کھانے پہننے کی یہی تو عمر ہے۔''

دھنیا کا گھر آگیا۔ آنگن میں روپا بچے کو گود میں لیے تھپکیاں دے رہی تھی۔ بچہ سو گیا تھا۔ دھنیا نے بچہ کو اس سے لے کر کھٹولے پر سلا دیا۔ بوٹی نے بچے کے سر پر ہاتھ رکھا۔ پیٹ میں آہستہ آہستہ انگلی گڑوکر دیکھا۔ ناف پر ہینگ کا لیپ کرنے کی تاکید کی۔ روپا پنکھا لا کر اسے جھیلنے لگی۔

بوٹی نے کہا۔ ''لا پنکھا مجھے دے دے۔''

''میں جھلوں گی تو کیا چھوٹی ہو جاؤں گی؟''

''تو دن بھر یہاں کام دھندا کرتی رہتی ہے تھک گئی ہوگی۔''

''تم اتنی بھلی مانُس ہو۔ اور یہاں لوگ کہتے ہیں بغیر گالی کے کسی سے بات نہیں کرتیں، اس لیے تمھارے پاس آنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔''

بوٹی مسکرائی۔ ''لوگ جھوٹ تو نہیں کہتے۔''

''اپنی آنکھوں کی دیکھی مانوں یا کانوں کی سنی۔'' آج بھی روپا آنکھوں میں کاجل لگائے پان کھائے رنگین ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ مگر آج بوٹی کو معلوم ہوا کہ پھول میں محض رنگ نہیں ہے بُو بھی ہے۔ اُسے روپا سے جو ایک طرح کا للہی بغض تھا وہ آئینہ پر جمے ہوئے گرد کی طرح صاف ہو گیا تھا۔ کتنی نیک سیرت، کتنی سگھڑ اور شرمیلی لڑکی ہے۔ آواز کتنی پیاری ہے۔ آج کل کی لڑکیاں اپنے بچوں کی تو پرواہ نہیں کرتیں۔ دوسروں کے لیے کون مرتا ہے۔ ساری رات دھنیا کے بچے کو لیے جاگتی رہی۔ موہن نے کل کی باتیں اس سے کہہ تو دی ہوں گی۔ دوسری لڑکی ہوتی تو مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتی، اسے تو جیسے کچھ معلوم ہی نہیں، ممکن ہے موہن نے اس سے کچھ کہا ہی نہ ہو۔ ضرور یہی بات ہے۔

آج روپا اسے بہت حسین معلوم ہوئی ٹھیک تو ہے۔ ابھی شوق سنگار نہ کرے گی تو

کب کرے گی۔ شوق سنگار اس لیے بُرا لگتا ہے کہ ایسے آدمی اپنے ہی عیش و آرام میں مست رہتے ہیں۔ کسی کے گھر میں آگ لگ جائے ان سے مطلب نہیں۔ ان کا کام تو صرف دوسروں کو رِجھانا ہے۔ جیسے اپنے روپ کو سجائے راہ چلتوں کو بلاتے ہوں، کہ ذرا اس دکان کی سیر بھی کرتے جایئے۔ ایسے نیک دل آدمیوں کا سنگار بُرا نہیں لگتا۔ بلکہ اور اچھا لگتا ہے۔ کون نہیں چاہتا کہ لوگ اس کے رنگ روپ کی تعریف کریں۔ کون دوسروں کی نظر میں کھُپ جانا نہیں چاہتا۔ بوٹی کا شباب کب کا رخصت ہو چکا تھا۔ پھر بھی یہ تمنا اس کے دل میں موجود تھی۔ زمین پر پاؤں نہیں پڑتے۔ پھر روپا تو ابھی جوان ہے

روپا اب قریب قریب روز دو ایک بار بوٹی کے گھر آتی۔ بوٹی نے موہن سے تقاضا کرکے اس کے لیے اچھی سی ساڑھی منگوا دی۔ اگر روپا بغیر کاجل لگائے یا محض سفید ساڑھی پہنے آجاتی تو بوٹی کہتی۔ ''بہو بیٹیوں کو یہ جوگیا بھیس اچھا نہیں لگتا۔ یہ بھیس تو ہم بوڑھیوں کے لیے ہے۔''

روپا کہتی ''تم بوڑھی کس طرح ہوگئیں اماں! مردوں کو اشارہ مل جائے تو بھونروں کی طرح منڈلانے لگیں، میرے دادا تو تمھارے دروازے پر دھرنا دینے لگیں۔''

بوٹی لطف آمیز ملامت کے ساتھ کہتی۔ ''چل میں تیری ماں کی سوت بن کر جاؤں گی۔''

''اماں تو بوڑھی ہوگئیں۔''

''تو کیا تیرے دادا جوان بیٹھے ہیں۔''

''ہاں اماں! بڑی اچھی کاٹھی ہے ان کی۔''

آج موہن بازار سے دودھ بیچ کر لوٹا تو بوٹی نے کہا۔ ''کچھ روپے پیسے کی فکر کر بھائی۔ میں روپا کی ماں سے روپا کے لیے تیری بات چیت پکی کر رہی ہوں۔''

(یہ افسانہ دلی کے اردو ماہنامہ 'عصمت' کے مئی 1933 کے شمارے میں شائع ہوا۔ 'دودھ کی قیمت' میں شامل ہے۔ ہندی میں یہ 'جیوتی' کے عنوان سے الٰہ آباد کے ہندی ماہنامہ 'چاند' کے مئی 1933 کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ 'مان سروور' 1 میں شامل ہے۔)

عیدگاہ

رمضان کے پورے تیس روزوں کے بعد آج عید آئی ہے۔ کتنی سُہانی اور رنگین صبح ہے۔ بچہ کی طرح پُرتبسم، درختوں پر کچھ عجیب ہریاول ہے۔ کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے۔ آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے۔ آج کا آفتاب دیکھو کتنا پیارا ہے گویا دنیا کو عید کی خوشی پر مبارکباد دے رہا ہے۔ گاؤں میں کتنی چہل پہل ہے۔ عیدگاہ جانے کی دھوم ہے۔ کسی کے کرتے میں بٹن نہیں ہیں تو سوئی تاگا لینے دوڑا جارہا ہے۔ کسی کے جوتے سخت ہوگئے ہیں۔ اسے تیل اور پانی سے نرم کر رہا ہے۔ جلدی جلدی بیلوں کو سانی پانی دے دیں۔ عیدگاہ سے لوٹتے لوٹتے دوپہر ہوجائے گی۔ تین کوس کا پیدل راستہ پھر سینکڑوں رشتے قرابت والوں سے ملنا ملانا۔ دوپہر سے پہلے لوٹنا غیر ممکن ہے۔ لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں۔ کسی نے ایک روزہ رکھا۔ وہ بھی دوپہر تک۔ کسی نے وہ بھی نہیں۔ لیکن عیدگاہ جانے کی خوشی ان کا حصّہ ہے۔ روزے بڑے بوڑھوں کے لیے ہوں گے۔ بچوں کے لیے تو عید ہے۔ روز عید کا نام رٹتے تھے۔ آج وہ آگئی۔

اب جلدی پڑی ہوئی ہے کہ عیدگاہ کیوں نہیں چلتے۔ انھیں گھر کی فکروں سے کیا واسطہ؟ سویّوں کے لیے گھر میں دودھ، شکر اور میوے ہیں یا نہیں۔ اس کی انھیں کیا فکر۔ وہ کیا جانیں ابا کیوں بدحواس گاؤں کے مہاجن چودھری قاسم علی کے گھر دوڑے جا رہے ہیں۔ ان کی اپنی جیبوں میں تو قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ بار بار جیب سے اپنا خزانہ نکال کر گنتے ہیں۔ دوستوں کو دکھاتے ہیں اور خوش ہو کر رکھ لیتے ہیں۔ ان ہی دو چار پیسوں میں دنیا کی ساری نعمتیں لائیں گے۔ کھلونے اور مٹھائیاں اور بگل۔ اور خدا جانے کیا کیا۔ اور سب سے زیادہ خوش ہے حامد۔ وہ چار سال کا غریب صورت بچہ ہے۔ جس کا باپ پچھلے سال ہیضہ کی نذر ہوگیا۔ اور ماں نہ جانے کیوں زرد ہوتی ہوتی ایک دن مرگئی۔ کسی کو پتہ نہ چلا کیا بیماری ہے۔ کہتی کس سے، کون سننے والا تھا۔ دل پر جو گزرتی

تھی سہتی تھی۔ اور جب نہ سہا گیا تو دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اب حامد اپنی بوڑھی دادی امینہ کی گود میں سوتا ہے۔ اور اتنا ہی خوش ہے۔ اس کے ابا جان بڑی دور روپے کمانے گئے ہیں۔ بہت سی تھیلیاں لے کر آئیں گے۔ امی جان اللہ میاں کے گھر مٹھائی لینے گئی ہیں۔ اس لیے خاموش ہے۔ حامد کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں۔ سر پر ایک پُرانی دھرانی ٹوپی ہے۔ جس کا گوٹا سیاہ ہو گیا ہے۔ پھر بھی وہ خوش ہے۔ جب اس کے ابا جان تھیلیاں اور اماں جان نعمتیں لے کر آئیں گی تب وہ دل کے ارمان نکالے گا۔ تب دیکھے گا کہ محمود اور محسن، نور اور سمیع کہاں سے اتنے پیسے لاتے ہیں۔ دنیا اپنی مصیبتوں کی ساری فوج لے کر آئے، اس کی ایک نگاہ معصوم اسے پامال کرنے کے لیے کافی ہے۔''

حامد اندر جا کر امینہ سے کہتا ہے۔ ''تم ڈرنا نہیں اماں، میں گاؤں والوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ بالکل نہ ڈرنا۔'' لیکن امینہ کا دل نہیں مانتا۔ گاؤں کے بچے اپنے اپنے باپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ حامد کیا اکیلا ہی جائے گا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو جائے تو کیا ہو۔ نہیں امینہ اسے تنہا نہ جانے دے گی۔ ننھی سی جان۔ تین کوس چلے گا، پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں گے۔

مگر وہ چلی جائے تو یہاں سویاں کون پکائے گا۔ بھوکا پیاسا دوپہر کو لوٹے گا۔ کیا اس وقت سویاں پکانے بیٹھے گی۔ رونا تو یہ ہے کہ امینہ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس نے فہیمن کے کپڑے سئے تھے۔ آٹھ آنے پیسے ملے تھے۔ اس اٹھنی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی آئی تھی اس عید کے لیے لیکن کل گھر میں اور پیسے نہ تھے اور گوالن کے پیسے چڑھ گئے تھے۔ دینے پڑے۔ حامد کے لیے روز دو پیسے کا دودھ تو لینا پڑتا ہے۔ اب کُل دو آنے پیسے بچ رہے ہیں۔ تین پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ امینہ کے بٹوے میں۔ یہی بساط ہے۔ اللہ ہی بیڑا پار کرے۔ دھوبن، مہترانی اور نائن سبھی تو آئیں گی۔ سب کو سویاں چاہئیں۔ کس کس سے منہ چھپائے؟ سال بھر کا تہوار ہے۔ زندگی خیریت سے رہے۔ ان کی تقدیر بھی تو اس کے ساتھ ہے۔ بچے کو خدا سلامت رکھے۔ یہ دن بھی یوں ہی کٹ جائیں گے۔

گاؤں سے لوگ چلے۔ اور بچوں کے ساتھ حامد بھی تھا۔ سب کے سب دوڑ کر آگے نکل جاتے۔ پھر کسی درخت کے نیچے کھڑے ہو کر ساتھ والوں کا انتظار کرتے۔ یہ

لوگ کیوں اتنے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں؟

شہر کا سواد شروع ہوگیا۔ سڑک کے دونوں طرف امیروں کے باغ ہیں۔ پختہ چہار دیواری بنی ہوئی ہے۔ درختوں میں آم لگے ہوئے ہیں۔ حامد نے ایک کنکری اٹھا کر ایک آم پر نشانہ لگایا۔ مالی اندر سے گالی دیتا ہوا باہر آیا۔ بچے وہاں سے ایک فرلانگ پر ہیں۔ خوب ہنس رہے ہیں۔ مالی کو کیسا الو بنایا۔

بڑی بڑی عمارتیں آنے لگیں۔ یہ عدالت ہے، یہ مدرسہ ہے، یہ کلب گھر ہے اتنے بڑے مدرسہ میں کتنے سارے لڑکے پڑھتے ہوں گے۔ لڑکے نہیں ہیں جی۔ بڑے بڑے آدمی ہیں۔ سچ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ اتنے بڑے ہوگئے اب تک پڑھے جاتے ہیں۔ آج تو چھٹی ہے۔ لیکن ایک بار جب پہلے آئے تھے تو بہت سی ڈاڑھی مونچھوں والے لڑکے یہاں کھیل رہے تھے۔ نہ جانے کب تک پڑھیں گے اور کیا کریں گے اتنا پڑھ کر۔ گاؤں کے دیہاتی مدرسے میں دو تین بڑے بڑے لڑکے ہیں۔ بالکل کودن غبی۔ کام سے جی چُرانے والے۔ یہ لڑکے بھی اسی طرح کے ہوں گے جی۔ اور کیا نہیں۔ کیا اب تک پڑھتے ہوتے۔ وہ کلب گھر ہے۔ وہاں جادو کا کھیل ہوتا ہے۔ سُنا ہے مردوں کی کھوپڑیاں اُڑتی ہیں۔ آدمی کو بے ہوش کر دیتے ہیں۔ پھر اس سے جو کچھ پوچھتے ہیں، وہ سب بتلا دیتا ہے۔ اور بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں اور میمیں بھی کھیلتی ہیں۔ سچ، ہماری اماں کو وہ دے دو۔ کیا کہلاتا ہے ''بیٹ'' تو اسے گھماتے ہی لڑھک جائیں۔

محسن نے کہا۔ ''ہماری امی جان تو اسے پکڑ ہی نہ سکیں۔ ہاتھ کانپنے لگے اللہ قسم۔''

حامد نے اس سے اختلاف کیا۔ ''چلو، منوں آٹا پیس ڈالتی ہیں۔ ذرا سی بیٹ پکڑ لیں گی تو ہاتھ کانپنے لگے گا۔ سینکڑوں گھڑے پانی روز نکالتی ہیں۔ کسی میم کو ایک گھڑا پانی نکالنا پڑے تو آنکھوں تلے اندھیرا آجائے۔

محسن۔ ''لیکن دوڑتی تو نہیں، اچھل کود نہیں سکتیں۔''

حامد۔ ''کام آپڑتا ہے تو دوڑ بھی لیتی ہیں۔ ابھی اس دن تمھاری گائے کھُل گئی تھی، اور چودھری کے کھیت میں جا پڑی تھی۔ تو تمھاری اماں ہی تو دوڑ کر اسے بھگا لائی تھیں۔ کتنی تیزی سے دوڑی تھیں۔ ہم تم دونوں ان سے پیچھے رہ گئے۔''

پھر آگے چلے۔ حلوائیوں کی دُکانیں شروع ہوئیں۔ آج خوب سجی ہوئی تھیں، اتنی

مٹھائیاں کون کھاتا ہے؟ دیکھونا، ایک ایک دکان پر منوں ہوں گی۔ سُنا ہے رات کو ایک جنات ہر ایک دکان پر جاتا ہے۔ جتنا مال بچا ہوتا ہے وہ سب خود خرید لیتا ہے، اور سچ مچ کے روپے دیتا ہے۔ بالکل ایسے ہی چاندی کے روپے۔

محمود کو یقین نہ آیا۔ ایسے روپے جنات کو کہاں سے مل جائیں گے۔"

محسن۔ "جنّات کو روپوں کی کیا کمی؟ جس خزانہ میں چاہیں چلے جائیں۔ کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ لوہے کے دروازے تک نہیں روک سکتے جناب، آپ ہیں کس خیال میں۔ ہیرے جواہرات ان کے پاس رہتے ہیں۔ جس سے خوش ہوگئے اُسے ٹوکروں جواہرات دے دیے۔ پانچ منٹ میں کہو کابُل پہنچ جائیں۔"

حامد۔ "جنّات بہت بڑے ہوتے ہوں گے۔"

محسن۔ "اور کیا۔ ایک ایک آسمان کے برابر ہوتا ہے۔" زمین پر کھڑا ہو جائے، اس کا سر آسمان سے جا لگے۔ مگر چاہے تو ایک لوٹے میں گھُس جائے۔"

سمیع۔ "سُنا ہے چودھری صاحب کے قبضہ میں بہت سے جنّات ہیں، کوئی چیز چوری چلی جائے، چودھری صاحب اس کا پتہ بتادیں گے، اور چور کا نام تک بتا دیں گے۔ جمعراتی کا بچھڑا اس دن کھو گیا تھا۔ تین دن حیران ہوئے کہیں نہ ملا۔ تب جھک مار کر چودھری کے پاس گئے۔ چودھری نے کہا مویشی خانہ میں ہے اور وہیں ملا۔ جنّات آکر انھیں سب خبریں دے جایا کرتے ہیں۔"

اب ہر ایک کی سمجھ میں آگیا کہ چودھری قاسم علی کے پاس کیوں اس قدر دولت ہے، اور کیوں وہ قرب و جوار کے مواضعات کے مہاجن ہیں۔ جنّات آکر انھیں روپے دے جاتے ہیں۔ آگے چلیے۔ یہ پولیس لائن ہے۔ یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں۔ رائٹ،لِپ، پھام، پھو۔!

نوری نے تصحیح کی۔ "یہاں پولیس والے پہرہ دیتے ہیں۔ جب ہی تمھیں بہت خبر ہے۔ اجی حضرت! یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں۔ شہر کے جتنے چور ڈاکو ہیں۔ سب ان سے ملے رہتے ہیں۔ رات کو یہ سب ایک محلّہ میں چوروں سے کہتے ہیں، چوری کرو اور دوسرے محلّے میں پکارتے ہیں، جاگتے رہو۔ میرے ماموں ایک تھانہ میں سپاہی ہیں۔ بیس روپے مہینہ پاتے ہیں، لیکن تھیلیاں بھر بھر کے گھر بھیجتے ہیں۔ اللہ قسم تھیلیاں بھر بھر

کے۔ میں نے ایک بار پوچھا تھا۔ ماموں اتنے روپے آپ کہاں سے لاتے ہیں۔ ہنس کر کہنے لگے۔ بیٹا اللہ دیتا ہے۔ خود ہی بعد کو کہا کہ ہم لوگ چاہیں تو ایک دن میں لاکھوں مار لائیں۔ ہم تو اتنا ہی لیتے ہیں جس میں اپنی بدنامی نہ ہو اور نوکری بنی رہے۔

حامد نے تعجب سے پوچھا۔ ''یہ لوگ چوری کراتے ہیں تو انھیں کوئی پکڑتا نہیں۔

نوری نے اس کی کوتاہ فہمی پر رحم کھا کر کہا۔ ''ارے احمق۔ انھیں کون پکڑے گا۔ پکڑنے والے تو یہ خود ہیں۔ لیکن اللہ انھیں سزا بھی خوب دیتا ہے۔ تھوڑے دن ہوئے ماموں کے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا مال متاع جل گیا۔ ایک برتن تک نہ بچا۔ کئی دن تک درخت کے نیچے سوئے اللہ قسم! پھر نہ جانے کہاں سے قرض لائے تو برتن بھانڈے آئے۔''

بستی گھنی ہونے لگی۔ عیدگاہ جانے والوں کے مجمع نظر آنے لگے۔ ایک سے ایک زرق برق پوشاک پہنے ہوئے۔ کوئی تانگے پر سوار کوئی موٹر پر، چلتے تھے، تو کپڑوں سے عطر کی خوشبو اُڑتی تھی۔

دہقانوں کی یہ مختصر سی ٹولی اپنی بے سروسامانی سے بے حس، اپنی خستہ حالی میں مگن صابر و شاکر چلی جاتی تھی۔ جس چیز کی طرف تاکتے، تاکتے رہ جاتے اور پیچھے سے بار بار ہارن کی آواز ہونے پر بھی خبر نہ ہوتی۔ محسن تو موٹر کے نیچے جاتے جاتے بچا۔

وہ عیدگاہ نظر آئی۔ جماعت شروع ہوگئی ہے۔ اوپر املی کے گھنے درختوں کا سایہ ہے نیچے کھلا ہوا پختہ فرش ہے، جس پر جاجم بچھا ہوا ہے۔ اور نمازیوں کی قطاریں ایک کے پیچھے دوسری۔ خدا جانے کہاں تک چلی گئی ہیں۔ پختہ فرش کے نیچے جاجم بھی نہیں۔ کئی قطاریں کھڑی ہیں، جو آتے جاتے ہیں، پیچھے کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔ آگے اب جگہ نہیں رہی۔ یہاں کوئی رتبہ اور عہدہ نہیں دیکھتا۔ اسلام کی نگاہ میں سب انسان برابر ہیں۔ دہقانوں نے بھی وضو کیا۔ اور جماعت میں شامل ہوگئے۔ کتنی باقاعدہ نظم جماعت ہے۔ لاکھوں آدمی ایک ساتھ جھکتے ہیں۔ ایک ساتھ دو زانو بیٹھ جاتے ہیں اور یہ عمل بار بار ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے، گویا بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہو جائیں اور ایک ساتھ بجھ جائیں۔ کتنا پُراحترام رُعب انگیز نظارہ ہے۔ جس سے ہم آہنگی اور وُسعت اور تعداد دلوں پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ گویا اخوت کا ایک رشتہ ان تمام

روحوں کو منسلک کیے ہوئے ہے۔

(2)

نماز ختم ہو گئی ہے۔ لوگ باہم مل رہے ہیں۔ کچھ لوگ محتاجوں اور سائلوں کو خیرات کر رہے ہیں۔ جو آج یہاں ہزاروں جمع ہو گئے ہیں۔ ہمارے دہقانیوں نے مٹھائی اور کھلونوں کی دکانوں پر یورش کی۔ بوڑھے ان دلچسپیوں میں بچوں سے کم محظوظ نہیں ہیں۔ یہ دیکھو ہنڈولا ہے۔ ایک پیسہ دے کر آسمان پر جاتے معلوم ہوگئے۔ کبھی زمین پر گرتے۔ یہ چرخی ہے۔ لکڑی کے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی میخوں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک پیسہ دے کر بیٹھ جاؤ۔ اور پچیس چکروں کا مزا لو۔ محمود اور محسن ہنڈولے پر بیٹھے ہیں۔ نور اور سمیع گھوڑوں پر۔ ان کے بزرگ اتنے ہی طفلانہ اشتیاق سے چرخی پر بیٹھے ہیں۔ حامد دور کھڑا ہے۔ تین ہی پیسے تو اس کے پاس ہیں۔ ذرا سا چکّر کھانے کے لیے وہ اپنے خزانہ کا ثلث نہیں صرف کر سکتا۔ محسن کا باپ اسے بار بار چرخی پر بلاتا ہے، لیکن وہ راضی نہیں ہوتا۔ بوڑھے کہتے ہیں، اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آ گیا۔ حامد سوچتا ہے، کیوں کسی کا احسان لوں۔ عسرت نے اسے ضرورت سے زیادہ ذکی الحس بنا دیا ہے۔

سب لوگ چرخی سے اترتے ہیں۔ کھلونوں کی خرید شروع ہوتی ہے۔ سپاہی اور گجریا اور راجہ رانی اور وکیل اور دھوبی اور بہشتی بے امتیاز ران سے ران ملائے بیٹھے ہیں۔ دھوبی راجہ رانی کی بغل میں ہے۔ اور بہشتی وکیل صاحب کی بغل میں۔ واہ کتنے خوبصورت، بولا ہی چاہتے ہیں۔ محمود سپاہی پر لٹو ہو جاتا ہے۔ خاکی وردی اور لال پگڑی۔ کندھے پر بندوق۔ معلوم ہوتا ہے ابھی قواعد کے لیے چلا آ رہا ہے۔ محسن کو بہشتی پسند آیا۔ کمر جھکی ہوئی ہے۔ اس پر مشک کا دہانہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہے۔ دوسرے ہاتھ میں رسّی ہے۔ کتنا بشّاش چہرہ ہے۔ شاید کوئی گیت گا رہا ہے۔ مشک سے پانی ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نوری کو وکیل سے مناسبت ہے۔ کتنی عالمانہ صورت ہے۔ سیاہ چُغہ نیچے سفید اچکن، اچکن کے سینہ کی جیب میں سُنہری زنجیر، ایک ہاتھ میں قانون کی کتاب لیے ہوئے ہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی کسی عدالت سے جرح یا بحث کرکے چلے آ رہے ہیں۔ یہ سب دو دو پیسے کے کھلونے ہیں۔ حامد کے پاس کُل تین پیسے ہیں۔ اگر دو کا ایک کھلونا لے لے تو

پھر اور کیا لے گا۔ نہیں، کھلونے فضول ہیں، کہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چور چور ہو جائے۔ ذرا سا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ ڈھل جائے۔ ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا۔ کس مصرف کے ہیں۔

محسن کہتا ہے۔ ''میرا بہشتی روز پانی دے جائے گا صبح و شام۔''

محمود۔ ''اور میرا سپاہی گھر کا پہرہ دے گا۔ کوئی چور آئے گا تو فوراً بندوق سے فائر کر دے گا۔''

نوری۔ ''اور میرا وکیل روز مقدمے لڑائے گا۔ اور روز روپے لائے گا۔''

حامد کھلونوں کی مذمّت کرتا ہے۔ مٹی ہی کے تو ہیں۔ گریں تو چکنا چور ہو جائیں۔ وہ چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ ذرا دیر کے لیے میں ہاتھ میں لے سکتا۔ یہ بساطی کی دکان ہے طرح طرح کی ضروری چیزیں، ایک اور بچھی ہوئی ہے۔ گیند، سیٹیاں، بگل، بھونرے، ربڑ کے کھلونے اور ہزاروں چیزیں۔ وہ ایک سیٹی لیتا ہے، محمود گیند، نوری ربڑ کا بط جو چوں چوں کرتا ہے۔ اور سمیع ایک بانسری۔ اسے بجا بجا کر وہ گائے گا۔ حامد کھڑا ہر ایک کو حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ جب اس کے رفیق کوئی چیز خرید لیتے ہیں تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے کے لیے لپکتا ہے۔ لیکن لڑکے اتنے دوست نواز نہیں ہوتے۔ خاص کر جب کہ ابھی دلچسپی تازہ ہے۔ بچارا یوں ہی مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

کھلونوں کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آیا۔ کسی نے ریوڑیاں لی ہیں۔ کسی نے گلاب جامن۔ کسی نے سوہن حلوا۔ مزے سے کھا رہے ہیں۔ حامد ان کی برادری سے خارج ہے۔ کم بخت کی جیب میں تین پیسے تو ہیں۔ کیوں نہیں کچھ لے کر کھاتا۔ حریص نگاہوں سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔

محسن نے کہا۔ ''حامد یہ ریوڑی لے جا کتنی خوشبودار ہیں؟''

حامد سمجھ گیا یہ محض شرارت ہے۔ محسن اتنا فیاض طبع نہ تھا، پھر بھی وہ اس کے پاس گیا۔ محسن نے دونے سے دو تین ریوڑیاں نکالیں۔ حامد کی طرف بڑھائیں۔ حامد نے ہاتھ پھیلایا۔ محسن نے ہاتھ کھینچ لیا اور ریوڑیاں اپنے منھ میں رکھ لیں۔ محمود اور نور اور سمیع خواب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔ حامد کھسیانا ہو گیا۔

محسن نے کہا۔ ''اچھا اب ضرور دیں گے۔ یہ لے جاؤ حامد اللہ قسم۔''

حامد نے کہا۔ ''رکھیے رکھیے۔ کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں؟''

سمیع بولا۔ ''تین ہی پیسے تو ہیں۔ کیا کیا لوگے؟''

محمود۔ ''تم اس سے مت بولو۔ حامد میرے پاس آؤ۔ یہ گلاب جامن لے لو!

حامد۔ ''مٹھائی کون بڑی نعمت ہے۔ کتاب میں اس کی برائیاں لکھی ہیں۔

محسن۔ ''لیکن جی میں کہہ رہے ہوگے کہ کچھ مل جائے تو کھا لیں۔ اپنے پیسے کو نہیں نکالتے۔''

محمود۔ ''میں اس کی ہوشیاری سمجھتا ہوں۔ جب ہمارے سارے پیسے خرچ ہو جائیں گے، تب یہ مٹھائی لے گا اور ہمیں چڑھا کر کھائے گا۔''

حلوائیوں کی دکانوں کے آگے کچھ دکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں۔ کچھ گلٹ اور ملمّع کے زیورات کی۔ لڑکوں کے لیے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ حامد لوہے کی دکان پر ایک لمحہ کے لیے رُک گیا۔ دست پناہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ دست پناہ خرید گا۔ ماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے۔ توے سے روٹیاں اتارتی ہیں تو ہاتھ جل جاتا ہے، اگر وہ دست پناہ لے جا کر اماں کو دے دے تو وہ کتنی خوش ہوں گی۔ پھر ان کی انگلیاں کبھی نہ جلیں گی۔ گھر میں ایک کام کی چیز ہو جائے گی۔ کھلونوں سے کیا فائدہ، مفت میں پیسے خراب ہوتے ہیں۔ ذرا دیر ہی تو خوشی ہوتی ہے۔ پھر تو انھیں کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ یا تو گھر پہنچتے پہنچتے ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائیں گے یا چھوٹے بچے جو عیدگاہ نہیں جا سکے ہیں۔ ضد کرکے لے لیں گے اور توڑ ڈالیں گے۔ دست پناہ کتنے فائدہ کی چیز ہے! روٹیاں توے سے اُتار لو۔ چولھے سے آگ نکال کر دے دو۔ اماں کو کہاں فرصت ہے بازار آئیں اور اتنے پیسے کہاں ملتے ہیں۔ روز ہاتھ جلا لیتی ہیں۔ اس کے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ سبیل پر سب کے سب پانی پی رہے ہیں۔ کتنے لالچی ہیں۔ سب نے اتنی مٹھائیاں لیں۔ کسی نے مجھے ایک بھی نہ دی۔ اس پر کہتے ہیں میرے ساتھ کھیلو، میری تختی دھو لاؤ۔ اب اگر میاں محسن نے کوئی کام کرنے کو کہا تو خبر لوں گا۔ کھائیں مٹھائیاں، آپ منھ نہ لگا۔ پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی۔ آپ ہی چٹوری زبان ہو جائے گی۔ تب پیسے چرائیں گے اور مار کھائیں گے۔ میری زبان کیوں خراب ہوگی۔ اس

نے پھر سوچا۔ اماں دست پناہ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے ہاتھ سے لے لیں گی۔ اور کہیں گی میرا بیٹا اپنی اماں کے لیے دست پناہ لایا ہے ہزاروں دعائیں دیں گی۔ پھر اسے پڑوسیوں کو دکھائیں گی۔ سارے گاؤں مین واہ وا مچ جائے گی۔ ان لوگوں کے کھلونوں پر کون نہیں دعائیں دے گا۔ بزرگوں کی دعائیں سیدھی خدا کی درگاہ میں پہنچتی ہیں، اور فوراً قبول ہوتی ہیں۔ میرے پاس بہت سے پیسے نہیں ہیں، جب ہی تو محسن اور محمود یوں مزاج دکھاتے ہیں۔ میں بھی ان کو مزاج دکھاؤں گا وہ کھلونے کھیلیں۔ مٹھائیاں کھائیں۔ میں غریب سہی۔ کسی سے کچھ مانگنے تو نہیں جاتا۔ آخر ابا کبھی نہ کبھی آئیں گے ہی۔ پھر ان لوگوں سے پوچھوں گا کتنے کھلونے لوگے۔ ایک ایک کو ایک ایک ٹوکری دوں۔ اور دکھادوں کہ دوستوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ جتنے غریب لڑکے ہیں، سب کو اچھے اچھے کُرتے دلوا دوں گا۔ اور کتابیں دے دوں گا۔ یہ نہیں کہ ایک پیسہ کی ریوڑیاں لیں، تو چڑھا چڑھا کر کھانے لگے۔ دست پناہ دیکھ کر سب کے سب خوب ہنسیں گے۔ احمق تو ہیں ہی سب۔ اس نے دوڑتے دوڑتے دکاندار سے پوچھا۔ ''یہ دست پناہ بیچو گے؟''

دکاندار نے اس کی طرف دیکھا اور ساتھ کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا۔ ''وہ تمھارے کام کا نہیں ہے۔''

''بکاؤ ہے یا نہیں؟''

''بکاؤ ہے جی۔ اور یہاں کیوں لاد کر لائے ہیں۔''

''تو بتلائے کیوں نہیں، کے پیسے کا دوگے؟''

''چھ پیسے لگیں گے۔''

حامد کا دل بیٹھ گیا۔ کلیجہ مضبوط کر کے بولا۔ ''تین پیسے لوگے؟'' اور آگے بڑھا کہ دکاندار کی گھڑکیاں نہ سنے۔ مگر دکاندار نے گھڑکیاں نہ دیں۔ دست پناہ اس کی طرف بڑھا دیا اور پیسے لے لیے۔

حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا، گویا بندوق ہے۔ اور شان سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔

محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ دست پناہ لایا ہے۔ احمق اسے کیا کرے گا؟''

حامد نے دست پناہ کو زمین پر پٹک کر کہا۔ ''ذرا اپنا بہشتی زمین پر گرا دو۔ ساری پسلیاں چور چور ہوجائیں گی بچّا کی۔''

محمود ۔''تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے؟''

حامد۔ ''کھلونا کیوں نہیں ہے۔ ابھی کندھے پر رکھا بندوق ہو گیا۔ ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا۔ چاہوں تو اس سے تمھاری ناک پکڑ لوں۔ ایک چمٹا دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے۔ تمھارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ!''

سمیع متاثر ہو کر بولا۔ ''میری خنجری سے بدلو گے۔ دو آنے کی ہے۔''

حامد نے خنجری کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا۔ ''میرا دست پناہ چاہے تو تمھاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے۔ بس ایک چمڑے کی جھلّی لگادی۔ ڈھب ڈھب بولنے لگی۔ ذرا سا پانی لگے تو ختم ہوجائے۔ میرا بہادر دست پناہ آگ میں ،پانی میں، آندھی میں، طوفان میں برابر ڈٹا کھڑا رہے گا؟''

میلہ بہت دور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ دس بج رہے تھے۔ گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اب دست پناہ نہیں مل سکتا۔ اب کسی کے پاس پیسے بھی تو نہیں رہے۔ حامد ہے بڑا ہوشیار!

اب دو فریق ہو گئے۔ محمود، محسن اور نوری ایک طرف، حامد یکہ و تنہا دوسری طرف، سمیع غیر جانب دار ہے۔ جس کی فتح دیکھے گا اس کی طرف جائے گا۔ مناظرہ شروع ہو گیا۔ آج حامد کی زبان بڑی صفائی سے چل رہی ہے۔ اتحاد ثلاثہ اس کے جارحانہ عمل سے پریشان ہو رہا ہے۔ ثلاثہ کے پاس تعداد کی طاقت ہے۔ حامد کے پاس حق اور اخلاق، ایک طرف مٹی، ربڑ اور لکڑی کی چیزیں، دوسری جانب اکیلا لوہا۔ جو اس وقت اپنے کو فولاد کہہ رہا ہے۔ وہ روئیں تن ہے۔ صف شکن ہے۔ اگر کہیں شیر کی آواز کان میں آجائے تو میاں بہشتی کے اوسان خطا ہو جائیں۔ میاں سپاہی مٹی کی بندوق چھوڑ کر بھاگیں۔ وکیل صاحب کا سارا قانون پیٹ میں سما جائے۔ چغے میں منھ چھپا کر زمین پر لیٹ جائیں۔ مگر بہادر، یہ رستم ہند لپک کر شیر کی گردن پر سوار ہو جائے گا۔ اور اس کی آنکھیں نکال لے گا۔

محسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا۔ ''اچھا تمھارا دست پناہ پانی تو نہیں بھر سکتا۔''

حامد نے دست پناہ کو سیدھا کرکے کہا۔ ''یہ بہشتی کو ایک ڈانٹ بتائے گا، تو دوڑا ہوا پانی لا کر اس کے دروازے پر چھڑکنے لگے گا۔ جناب پھر اس سے چاہے گھڑے مٹکے اور کونڈے بھر ڈالو۔''

محسن کا ناطقہ بند ہو گیا۔ نوری نے کمک پہنچائی۔ بچا گرفتار ہو جائیں تو عدالت میں بندھے بندھے پھریں گے۔ تب تو ہمارے وکیل صاحب ہی پیروی کریں گے بولیے جناب!''

حامد کے پاس اس وار کا دفعیہ اتنا آسان نہ تھا۔ دفعتاً اس نے ذرا مہلت پا جانے کے ارادے سے پوچھا۔ ''اسے پکڑنے کون آئے گا؟''

محمود نے کہا۔ ''یہ سپاہی بندوق والا۔''

حامد نے منہ چڑھا کر کہا۔ ''یہ بے چارے اس رستم ہند کو پکڑیں گے؟ اچھا لاؤ ابھی ذرا مقابلہ ہو جائے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بچہ کی ماں مرجائے گی۔ پکڑیں گے کیا بے چارے۔''

محسن نے تازہ دم ہو کر وار کیا۔ ''تمھارے دست پناہ کا منہ روز آگ میں جلے گا۔''

حامد کے پاس جواب تیار تھا۔ ''آگ میں بہادر کودتے ہیں جناب۔ تمھارے یہ وکیل اور سپاہی اور بہشتی ڈرپوک ہیں۔ سب گھر میں گھس جائیں گے۔ آگ میں کودنا وہ کام ہے، جو رستم ہی کرسکتا ہے۔''

نوری نے انتہائی جودت سے کام لیا۔ ''تمھارا دست پناہ باورچی خانہ میں زمین پر پڑا رہے گا۔ میرا وکیل شان سے میز کرسی لگا کر بیٹھے گا۔'' اس حملہ نے مردوں میں بھی جان ڈال دی۔ سمیع بھی جیت گیا۔ ''بے شک بڑے معرکے کی بات کہی۔ دست پناہ باورچی خانہ میں پڑا رہے گا۔'' حامد نے دھاندلی کی۔ ''میرا دست پناہ باروچی خانہ میں نہیں رہے گا۔ وکیل صاحب اُسی پر بیٹھیں گے تو جا کر انھیں زمین پر پٹک دے گا، اور سارا قانون ان کے پیٹ میں ڈال دے گا۔''

اس جواب میں بالکل جان نہ تھی۔ بالکل بے تکی سی بات تھی۔ لیکن قانون پیٹ

مین ڈالنے والی بات چھا گئی۔ ایسی چھا گئی کہ تینوں سورما منھ تکتے رہ گئے۔ حامد نے میدان جیت لیا۔ گو ثلاثہ کے پاس ابھی گیند، سیٹی اور ربط ریزرو تھے۔ مگر ان مشین گنوں کے سامنے ان پٹاخوں کو کون پوچھتا۔ دست پناہ رستم ہند ہے۔ اس میں کسی کو چوں و چرا کی گنجائش نہیں۔

فاتح کو مفتوحوں سے وقار اور خوشامد کا خراج ملتا ہے، وہ حامد کو ملنے لگا۔ اوروں نے تین تین آنے خرچ کیے اور کوئی کام کی چیز نہ لے سکے۔ حامد نے تین ہی پیسوں میں رنگ جما لیا۔ کھلونوں کا کیا اعتبار۔ دو ایک دن میں ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ حامد کا دست پناہ تو فاتح رہے گا۔ ہمیشہ صلح کی شرطیں طے ہونے لگیں۔

محسن نے کہا۔ ''ذرا اپنا چمٹا دو۔ ہم بھی دیکھیں۔ تم چاہو تو ہمارا وکیل دیکھو۔'' حامد کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ فیاض طبع فاتح ہے۔ دست پناہ باری باری سے محسن، محمود، نور اور سمیع سب کے ہاتھوں میں گیا۔ اور ان کے کھلونے باری باری سے حامد کے ہاتھ میں آئے۔ کتنے خوبصورت کھلونے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بولا ہی چاہتے ہیں۔ مگر ان کھلونوں کے لیے انھیں دعا کون دے گا؟ کون کون ان کھلونوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوگا۔ جتنا اماں جان دست پناہ کو دیکھ کر ہوں گی۔ اسے اپنے طرز عمل پر مطلق پچھتاوا نہیں ہے۔ پھر اب تو دست پناہ رستم ہے۔ اور سب کھلونوں کا بادشاہ۔ راستے میں محمود نے ایک پیسے کی ککڑیاں لیں۔ اس میں حامد کو بھی خراج ملا۔ حالانکہ وہ انکار کرتا رہا۔ محسن اور سمیع نے ایک ایک پیسے کے فالسے لیے۔ حامد کو بھی خراج ملا۔ یہ سب رستم ہند کی برکت تھی۔

(3)

گیارہ بجے گاؤں میں چہل پہل ہوگئی، میلے والے آگئے۔ محسن کی چھوٹی بہن نے دوڑ کر بہشتی اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اور مارے خوشی کے جو اچھلی تو میاں بہشتی نیچے آرہے۔ اور عالمِ جاودانی کو سدھارے۔ اس پر بھائی بہن میں مار پیٹ ہوئی۔ دونوں خوب روئے، ان کی اماں جان یہ کہرام سن کر اور بگڑیں، دونوں کو اوپر سے دو دو چانٹے رسید کیے۔ میاں نوری کے وکیل کا حشر اس سے بھی بدتر ہوا۔ وکیل زمین پر یا طاق پر تو

نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کے پوزیشن کا لحاظ تو کرنا ہی ہوگا۔ دیوار میں دو کھونٹیاں گاڑی گئیں۔ ان پر چیڑ کا ایک پرانا پٹرا رکھا گیا۔ پڑے پٹرا سُرخ رنگ کا ایک چیتھڑا بچھا دیا گیا۔ جو بمنزلہ قالین کے تھا۔ وکیل صاحب عالم بالا پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہیں سے قانونی بحث کریں گے۔ نوری ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا۔ معلوم نہیں پنکھے کی ہوا سے یا پنکھے کی چوٹ سے وکیل صاحب عالمِ بالا سے دنیائے فانی میں آرہے۔ اور ان کے جسدِ خاکی کے پُرزے ہوگئے۔ پھر بڑے زور شور کا ماتم ہوا۔ اور وکیل صاحب کی میّت پارسی دستور کے مطابق گھورے پر پھینک دی گئی۔ تاکہ بے کار نہ جاکر زاغ و زغن کے کام آجائے۔

اب رہے میاں محمود کے سپاہی۔ محترم اور ذی رعب ہستی ہے۔ اپنے پیروں چلنے کی ذلت اسے گوارا نہیں۔ محمود نے اپنا بکری کا بچہ پکڑا اور اس پر سپاہی کو سوار کیا۔ محمود کی بہن ایک ہاتھ سے سپاہی کو پکڑے ہوئے تھی۔ اور محمود بکری کے بچہ کا کان پکڑ کر اسے دروازے پر چلا رہا تھا۔ اور اس کے دونوں بھائی سپاہی کی طرف سے ''تھونے والے داگتے لہو'' پکارتے چلتے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا۔ میاں سپاہی اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑے۔ اور اپنی بندوق لیے زمین پر آرہے۔ ایک ٹانگ مضروب ہو گئی۔ مگر کوئی مضائقہ نہیں، محمود ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر نگم اور بھاٹیا اس کی شاگردی کر سکتے ہیں۔ اور یہ ٹوٹی ٹانگ کو آناً فاناً میں جوڑ دے گا۔ صرف گولر کا دودھ چاہیے۔ گولر کا دودھ آتا ہے۔ ٹانگ جوڑی جاتی ہے۔ لیکن جوں ہی کھڑا ہوتا ہے ٹانگ پھر الگ ہو جاتی ہے۔ عمل جراحی ناکام ہو جاتا ہے۔ تب محمود اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دیتا ہے۔ اب وہ آرام سے ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ ایک ٹانگ سے تو نہ چل سکتا تھا، نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اب وہ گوشہ میں بیٹھ کر ٹٹّی کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔

اب میاں حامد کا قصّہ سنئے۔ امینہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑی۔ اور اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگی۔ دفعتاً اس کے ہاتھ میں چمٹا دیکھ کر وہ چونک پڑی۔

''یہ دست پناہ کہاں تھا بیٹا۔''

''میں نے مول لیا ہے تین پیسے میں۔''

امینہ نے چھاتی پیٹ لی۔ ''یہ کیسا بے سمجھ لڑکا ہے کہ دوپہر ہوگئی نہ کچھ کھایا نہ پیا۔

لایا کیا یہ دست پناہ۔ سارے میلے میں تجھے اور کوئی چیز ہی نہ ملی۔"

حامد نے خطاوارانہ انداز سے کہا۔ "تمھاری انگلیاں توے سے جل جاتی تھیں کہ نہیں۔"

امینہ کا غصہ فوراً شفقت میں تبدیل ہوگیا۔ اور شفقت بھی وہ نہیں، جو پُر بیان ہوتی ہے۔ اور اپنی تاثیر لفظوں میں منتشر کر دیتی ہے۔ یہ بے زبان شفقت تھی، درد، التجا میں ڈوبی ہوئی۔ اُف! کتنی نفس کشی ہے۔ کتنی جاں سوزی ہے۔ غریب نے اپنے طفلانہ اشتیاق کو روکنے کے لیے کتنا ضبط کیا ہوگا۔ جب دوسرے لڑکے کھلونے لے رہے ہوں گے۔ مٹھائیاں کھا رہے ہوں گے۔ اس کا دل کتنا لہراتا ہوگا۔ اتنا ضبط اس سے ہوا کیونکر! اپنی بوڑھی اماں کی یاد اُسے وہاں بھی رہی۔ میرا لال میری کتنی فکر رکھتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ایسا علوی جذبہ پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ میں دنیا کی بادشاہت آجائے۔ اور وہ اسے حامد کے اوپر نثار کر دے۔ اور تب ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن گئی۔ وہ رونے لگی۔ دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی۔ اور آنکھوں سے آنسو کی بڑی بڑی بوندیں گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا راز کیا سمجھتا۔ اور نہ شاید ہمارے ناظرین ہی سمجھ سکیں گے۔

(یہ افسانہ پہلی بار دلی کے اردو رسالہ 'عصمت' کے 1933 کے سالگرہ نمبر میں شائع ہوا۔ 'دودھ کی قیمت' میں شامل ہے۔ ہندی میں یہ الٰہ آباد کے ماہنامہ 'چاند' کے اگست 1933 کے شمارے میں شامل ہے۔ یہ 'مان سرور' 1 میں شائع ہوا ہے۔)

قیدی

چودہ سال تک نرنتر (ہمیشہ) مانسک ویدنا اور شارِیرک یاتنا بھوگنے کے بعد آئی ون اُوکھوٹسک جیل سے نکلا، پر اس پکشی کی بھانتی نہیں، جو شکاری کے پنجرے سے پنکھ ہین ہوکر نکلا ہو بلکہ اس سنہہ کی بھانتی، جسے کٹگھرے کی دیواروں نے اور بھی بھینکر تتھا اور بھی رکت لُولُپ (خون کا لالچی) بنا دیا ہو۔ اس کے اَنتستَل میں ایک درَو (سیّال) جوالا اُٹھ رہی تھی، جس نے اپنے تاپ سے اس کے بلِشٹھ (طاقتور) شریر، سوڈول، انگ پر تینگ اور لہراتی ہوئی ابھیلاشاؤں کو جھلس ڈالا تھا اور آج اس کے اَستو (وجود) کا ایک ایک انو ایک ایک چنگاری بنا ہوا تھا۔ شودھت، چنچل اور وِدّروہ۔

جیلر نے اسے تولا۔ پرویش کے سمے دو من تیں سیر تھا، آج کیول ایک من پانچ سیر۔

جیلر نے سہانوبھوتی دکھا کر کہا۔ 'تم بہت دُربل ہوگئے ہو، آئی ون۔ اگر ذرا بھی کپتھیہ ہوا تو برا ہوگا۔'

آئی وَن نے اپنے ہڈیوں کے ڈھانچے کو وجے بھاؤ سے دیکھا اور اپنے اندر ایک اَگنی سے پرواہ کا انوبھو کرتا ہوا بولا، 'کون کہتا ہے کہ میں دُر بل ہوگیا ہوں؟'

'تم خود دیکھ رہے ہوگے'

'دل کی آگ جب تک نہیں بجھے گی ، آئی ون نہیں مرے گا، مسٹر جیلر، سو وَرش تک نہیں ، وِشواس رکھیے۔'

آئی ون اِسی پرکار بہکی بہکی باتیں کیا کرتا تھا۔ اس لیے جیلر نے زیادہ پرواہ نہ کی۔ سب اُسے اَردھوکشپت سمجھتے تھے۔ کچھ لکھا پڑھی ہوجانے کے بعد اس کے کپڑے اور پُستکیں منگوائی گئیں۔ پر وِے سارے سُوٹ اب اسے اُتارے ہوئے سے لگتے تھے۔ کوٹوں کی جیبوں میں کئی نوٹ نکلے، کئی نقد رُوبل۔ اس نے سب کچھ وہیں جیل کے

وارڈروں اور نمن کرمچاریوں کو دے دیا مانو اسے کوئی راجیہ مل گیا ہو۔

جیلر نے کہا۔ 'یہ نہیں ہوسکتا، آئی ون،تم سرکاری آدمیوں کو رشوت نہیں دے سکتے۔'

آئی ون سادھو بھاؤ سے ہنسا۔ 'یہ رشوت نہیں ہے مسٹر جیلر۔ انھیں رشوت دے کر اب مجھے ان سے کیا لینا دینا ہے؟ اب یہ اپرسن ہو کر میرا کیا بگاڑ لیں گے اور پرسن ہو کر مجھے کیا دیں گے؟'

یہ ان رکر پاؤں کا دھنیہ واد ہے جن کے بنا چودہ سال تو کیا، میرا یہاں چودہ گھنٹے رہنا اسہہ ہو جاتا۔ جب وہ جیل کے پھاٹک سے نکلا تو جیلر اور سارے انیہ کرمچاری اس کے پیچھے اسے موٹر تک پہنچانے چلے۔

(2)

پندرہ سال پہلے آئی ون ماسکو کے سمپن اور سمبھرانت کُل کا دیپک تھا۔

اس نے وِدیالیہ میں اونچی شکچھا پائی تھی، کھیل میں اَبھیست تھا، نربھیک تھا، اُدار اور سہردے تھا۔ دل آئینے کی بھانتی نرمل، شیل کا پتلا، دربلوں کی رکشا کے لیے جان پر کھیلنے والا، جس کی ہمت سنکٹ کے سامنے ننگی تلوار ہوجاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہیلن نام کی ایک یووتی پڑھتی تھی، جس پر وِدیالیہ کے سارے یُوک پران دیتے تھے۔ وہ جتنی ہی روپ وتی تھی، اتنی ہی تیز تھی، بڑی کلپنا شیل پر اپنے منو بھاؤں کو تالے میں بند رکھنے والی۔ آئی ون میں کیا دیکھ کر وہ اس کی اُور آکرشِت ہوگئی، یہ کہنا کٹھن ہے۔ دونوں میں لیش ماتر بھی سامنجسیہ نہ تھا۔ آئی ون سیر اور شراب کا پریمی تھا، ہیلن کویتا ایوم سنگیت اور نرتیہ پر جان دیتی تھی۔ آئی ون کی نگاہ میں روپیے کیول اس لیے تھے کہ دونوں ہاتھوں سے اڑائے جائیں، ہیلن اَتینت کرپن۔ آئی ون کو لکچر ہال کاراگار سا لگتا تھا، ہیلن اِس ساگر کی مچھلی تھی، پر کداچت وہ وِبھنّتا ہی ان میں سوابھاوک آکرشن بن گئی۔ جس نے انت میں وکل پریم کا روپ لیا۔ آئی ون نے اس سے وِواہ کا پرستاؤ کیا اور اس نے سویکار کرلیا اور دونوں کسی شُبھ مہورت میں پانڑی گرہن کر کے سہاگ رات بتانے کے لیے کسی پہاڑی جگہ میں جانے کے منصوبے باندھ رہے تھے کہ سہساراجنیتک سنگرام نے انھیں اپنی اُور کھینچ لیا۔ ہیلن پہلے سے ہی راشٹر وادیوں کی اُور جھکی ہوئی تھی۔ آئی ون بھی اسی رنگ

میں رنگ اٹھا۔ خاندان کا رئیس تھا، اس کے لیے پرجا پکش لینا ایک مہان تپسیا تھی، اس لیے جب کبھی وہ اس سنگرام میں ہتاش ہو جاتا، تو ہیلن اسی کی ہمت بندھاتی اور آئی ون اس کے ساہس اور انوراگ سے پربھاوت ہوکر اپنی دُر بلتا پر لجت ہو جاتا۔

انھیں دنوں اُکرّائن پرانت کی صوبیداری پر روم ناف نام کا ایک گورنر نیوکت ہو کر آیا۔ بڑا ہی کٹّر، راشٹر وادیوں کا جانی دشمن، دن میں دو چار وِدّروہیوں کو جب تک جیل نہ بھیج لیتا، اسے چین نہ آتا۔ آتے ہی آتے اس نے کئی سمپادکوں پر راجیہ دروہ کا ابھیوگ چلا کر انھیں سائبیریا بھجوا دیا، کرشکوں کی سبھائیں توڑ دیں، نگر کی میونسپلٹی توڑ دی اور جب جنتا نے اپنا روش پرکٹ کرنے کے لیے جلسے کیے تو پولیس سے بھیڑ پر گولیاں چلوائیں، جس سے کئی بے گناہوں کی جانیں گئیں، مارشل لا جاری کر دیا۔ سارے نگر میں ہاہا کار مچ گیا۔ لوگ مارے ڈر کے گھروں سے نہ نکلتے تھے، کیوں کہ پولیس ہر ایک کی تلاشی لیتی تھی اور اسے پیٹتی تھی۔

ہیلن نے کٹھور مدّرا سے کہا۔ 'یہ اندھیر تو اب نہیں دیکھا جاتا، آئی ون اس کا کچھ اُپائے ہونا چاہیے۔'

آئی ون نے پرشن کی آنکھوں سے دیکھا 'اُپائے ہم کیا کر سکتے ہیں؟'

ہیلن نے اس کی جڑتا پر کھِن ہو کر کہا۔ 'تم کہتے ہو، ہم کیا کر سکتے ہیں؟ میں کہتی ہوں، ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ میں انھیں ہاتھوں سے ان کا انت کر دوں گی۔'

آئی ون نے وسمے سے اس کی اُور دیکھا، 'تم سمجھتی ہو، اسے قتل کرنا آسان ہے؟ وہ کبھی کھلی گاڑی میں نہیں نکلتا۔ اس کے آگے پیچھے سہ شستر سواروں کا ایک دل ہمیشہ رہتا ہے۔ ریل گاڑی میں بھی وہ ریزرو ڈبوں میں سفر کرتا ہے۔ مجھے تو اسمبھو سا لگتا ہے، ہیلن بالکل اسمبھو۔'

ہیلن کئی منٹ تک چائے بناتی رہی پھر دو پیالے میز پر رکھ کر اس نے پیالہ منھ سے لگایا اور دھیرے دھیرے پینے لگی۔ کسی وچار میں تنمے ہو رہی تھی۔ سہسا اس نے پیالہ میز پر رکھ دیا اور بڑی بڑی آنکھوں میں تیج بھر کر بولی۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میں اسے قتل کر سکتی ہوں، آئی ون۔ آدمی ایک بار اپنی جان پر کھیل کر سب کچھ کر سکتا ہے۔ جانتے ہو، میں کیا کروں گی؟ میں اس سے راہ و رسم پیدا کروں گی، اس کا وِشواس

پراپت کروں گی، اسے اس بھرانتی میں ڈالوں گی کہ مجھے اس سے پریم ہے۔ منشیہ کتنا ہی ہردے ہین ہو، اس کے ہردے میں کسی نہ کسی کونے میں پراگ کی بھانتی رس چھپا ہی رہتا ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ روم ناف کی یہ دَمَن نیتی اس کی اَورودھ ابھیلاشا کی گانٹھ ہے، اور کچھ نہیں۔ کسی مایاونی کے پریم میں اپھل ہو کر اس کے ہردے کا رس سُروت سوکھ گیا ہے۔ وہاں رس کا سنچار کرنا ہوگا اور کسی یُووتی کا ایک مدھر شبد، ایک سرل مسکان بھی جادو کا کام کرے گی۔ ایسے کو تو وہ چٹکیوں میں اپنے پیروں پر گراسکتی ہے۔ تم جیسے سیلانیوں کو رِجھانا اس سے کہیں کٹھن ہے۔ اگر تم یہ سوِیکار کرتے ہوکہ میں روپ ہین نہیں ہوں، تو میں تمھیں وِشواس دلاتی ہوں کہ میرا کاریہ سپھل ہوگا۔ بتلاؤ میں روپ وتی ہوں یا نہیں؟

اس نے ترچھی آنکھوں سے آئی ون کو دیکھا۔ ’آئی ون اس بھاؤ وِلاس پر مُگدھ ہو کر بولا۔ تم یہ مجھ سے پوچھتی ہو ہیلن۔ میں تو تمھیں سنسار کی.....‘

ہیلن نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ’اگر تم ایسا سمجھتے ہوتو تم مورکھ ہو، آئی ون۔ اسی نگر میں نہیں، ہمارے وِدیالیہ میں ہی، مجھ سے کہیں روپ وتی بالیکائیں موجود ہیں۔ ہاں تم اتنا ہی کہہ سکتے ہوکہ تم کُروپا نہیں ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو، میں تمھیں سنسار کا سب سے روپ وان یُووک سمجھتی ہوں؟ کبھی نہیں میں ایسے ایک نہیں سو نام گنا سکتی ہوں، جو چہرے مُہرے میں تم سے کہیں بڑھ کر ہیں، مگر تم میں کوئی ایسی وستو ہے جو مجھے کہیں اور نظر نہیں آتی۔ تو میرا کاریہ کرم سنو۔ ایک مہینے تو مجھے اس سے میل کرتے لگے گا۔ پھر وہ میرے ساتھ سیر کرنے نکلے گااور تب ایک دن ہم اور وہ دونوں رات کو پارک میں جائیں گے اور تالاب کے کنارے بینچ پر بیٹھیں گے۔ تم اسی وقت ریوالور لیے آجاؤ گے اور وہیں پرتھوی اس کے بوجھ سے ہلکی ہو جائے گی۔‘

جیسا ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں، آئی ون ایک رئیس کا لڑکا تھا اور کرانت مے راجنیتی سے اس کا ہاردِک پریم نہ تھا۔ ہیلن کے پربھاؤ سے کچھ مانسک سہانی بھوتی اوشیہ پیدا ہو گئی تھی اور مانسک سہانی بھوتی پرانی کو سنکٹ میں نہیں ڈالتی۔ اس نے پَرکٹ روپ سے تو کوئی آپتی نہیں کی ۔ لیکن کچھ سَن دِگدھ بھاؤ سے بولا۔ ’یہ تو سوچو ہیلن، اس طرح کی ہتّیا کوئی مانوشیہ کرتی ہے۔

ہیلن نے تیکھے پن سے کہا۔ جو دوسروں کے ساتھ مانوشیہ ویوہار نہیں کرتا، اس کے ساتھ ہم کیوں مانوشیہ ویوہار کریں؟ کیا یہ سُوریہ کی بھانتی پَرکٹ نہیں ہے کہ آج سیکڑوں پریوار اس راکشش کے ہاتھوں تباہ ہورہے ہیں؟ کون جانتا ہے، اس کے ہاتھ کتنے بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں؟ ایسے وِیکتی کے ساتھ کسی طرح کی رعایت کرنا اسنگت ہے۔ تم نہ جانے کیوں اتنے ٹھنڈے ہو۔ میں تو اس کے دُشٹاچرن کو دیکھتی ہوں تو میرا رَکّت کھولنے لگتا ہے، میں سچ کہتی ہوں جس وقت اس کی سواری نکلتی ہے میری بوٹی بوٹی ہنسا کے آویگ سے کانپنے لگتی ہے۔ اگر میرے سامنے کوئی اس کی کھال بھی کھینچ لے تو مجھے دیا نہ آئے ۔ اگر تم میں اتنا ساہس نہیں ہے، تو کوئی ہرج نہیں، میں خود سب کچھ کرلوں گی۔ ہاں، دیکھ لینا، میں کیسے اس کتّے کو جہنّم پہنچاتی ہوں۔

ہیلن کا مُکھ منڈل ہنسا کے آویگ سے لال ہوگیا۔ آئی وَن نے لجّت ہو کر کہا۔ نہیں نہیں، یہ بات نہیں ہے، ہیلن۔ میرا یہ آشے نہ تھا کہ میں اِس کام میں تمھیں سہیوگ نہ دوں گا۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ تمھاری آتما دیش کی دُر دشا سے کتنی وِکل ہیں۔ لیکن میں پھر یہی کہوں گا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے اور ہمیں بڑی ساوَدھانی سے کام لینا پڑے گا۔

ہیلن نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ تم اس کی کچھ چنتا نہ کرو۔ آئی ون سنسار میں میرے لیے جو وستو سب سے پیاری ہے، اُسے داؤ پر رکھتے ہوئے کیا میں ساوَدھانی سے کام نہ لوں گی؟ لیکن تم سے ایک یاچنا کرتی ہوں۔ اگر اس بیچ میں کوئی ایسا کام کروں، جو تمھیں برا معلوم ہو تو تم مجھے چھما کرو گے نہ؟'

آئی ون نے وسمے بھری آنکھوں سے ہیلن کے مُکھ کی اُور دیکھا۔ اس کا آشے اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

ہیلن ڈری، آئی ون کوئی نئ آپتّی تو نہیں کھڑی کرنا چاہتا۔ آشواسن کے لیے اپنے مُکھ کو اُس کے آتُر آدھروں کے سمیپ لے جا کر بولی۔ 'پریم کا ابھینے کرنے میں مجھے وہ سب کچھ کرنا پڑے گا، جس پر ایک ماتر تمھارا ہی ادھیکار ہے۔ میں ڈرتی ہوں، کہیں تم مجھ پر سندیہہ نہ کرنے لگو'

آئی ون نے اسے کر پاش میں لے کر کہا۔ 'یہ اسمبھو ہے ہیلن، وِشواس پریم کی

پہلی سیڑھی ہے۔'
انتم شبد کہتے کہتے اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ اِن شبدوں میں اُدارتا کا جو آدرش تھا۔ وہ اُس پر پورا اترے گا یا نہیں، وہ یہی سوچنے لگا۔
اس کے تین دن پیچھے ناٹک کا سوترپات ہوا۔ ہیلن اپنے اوپر پولیس کے نرادھار سندیہہ کی فریاد لے کر روم ناف سے ملی اور اسے وِشواس دلایا کہ پولیس کے ادھیکاری اس سے کیول اس لیے اسنتشٹ ہے کہ وہ ان کے کلوشِت پرستاؤں کو ٹھکرا رہی ہے۔ یہ ستیہ ہے کہ وِدّیالیہ میں اس کی سنگتی کچھ اُگر یووکوں سے ہوگئی تھی، پر وِدّیالیہ سے نکلنے کے بعد اس کا ان سے کوئی سمبندھ نہیں ہے۔ روم ناف جتنا چتر تھا، اس سے کہیں چتر اپنے کو سمجھتا تھا۔ اپنے دس سال کے ادھیکاری جیون میں اسے کسی ایسی رمنی سے سابقہ نہ پڑا تھا، جس نے اس کے اوپر اتنا وِشواس کر کے اپنے کو اس کی دَیا پر چھوڑ دیا ہو۔ کسی دھن ، لولپ کی بھانتی، سہسا یہ دھن راشی دیکھ کر اس کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا۔
اپنی سمجھ میں تو وہ ہیلن سے اُگر یووکوں کے وِشے میں ایسی بہت سی باتوں کا پتہ لگا کر پھولا نہ سمایا، جو خفیہ پولیس والوں کو بہت سر مارنے پر بھی گیات نہ ہوسکی تھیں۔ پر اُن باتوں میں متھیہ کا کتنا مِشرن ہے، وہ نہ بھانپ سکا۔ اِس آدھ گھنٹے میں ایک یووتی نے ایک انوبھوی افسر کو اپنے روپ کی مدرا سے انمکت کر دیا تھا۔
جب ہیلن چلنے لگی، تو روم ناف نے کُرسی سے کھڑے ہو کر کہا۔ 'مجھے آشا ہے، یہ ہماری آخری ملاقات نہ ہوگی۔
ہیلن نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔
'حضور نے جس سَوجنیہ سے میری وِپتّی کتھا سنی ہے، اس کے لیے میں آپ کو دھنیہ واد دیتی ہوں۔'
'کل آپ تیسرے پہر یہیں چائے پئیں۔'
ربط ضبط بڑھنے لگا۔ہیلن آکر روز کی باتیں آئی ون سے کہہ سناتی۔ روم ناف واستو میں جتنا بدنام ہے۔ اُتنا برا نہیں، وہ بڑا رسِک سنگیت اور کلا کا پریمی اور شیل تتھا وِنئے کی مورتی ہے،ان تھوڑے ہی دنوں مین ہیلن سے اس کی گھنشٹھتا ہوگئی ہے اور کسی اَگیات ریتی سے نگر میں پولیس کا اَتیا چار کم ہونے لگا ہے۔

انت میں وہ نشچت تتھی آئی۔ آئی ون اور ہیلن دن بھر بیٹھے بیٹھے اسی پرشن پر وچار کرتے رہے۔ آئی ون کا من آج بہت چنچل ہو رہا تھا۔ کبھی اکارن ہی ہنسنے لگتا، کبھی انایاس ہی رو پڑتا۔ شنکا، پرتیکشا (انتظار) اور کسی اگیات (لامعلوم) چنتا نے اس کے منو ساگر کو اِتنا اشانت کر دیا تھا کہ اس میں بھاوؤں کی نوکائیں ڈگمگا رہی تھیں۔ نہ مارگ کا پتہ تھا نہ دِشا کا ہیلن بھی آج بہت چنتت اور گمبھیر تھی۔ آج کے لیے اس نے پہلے ہی سے سجیلے وَستر بنوا رکھے تھے۔روپ کو اَلنکرت کرنے کے نہ جانے کن کن ودھانوں کا پریوگ کر رہی تھی، پر اس میں کسی یودّھا (سپاہی) کا اُتساہ نہیں، کائیر کا کمپن تھا۔

سہسا آئی ون نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ 'تم آج اتنی مایا وِنی ہوگئی ہو ہیلن، کہ مجھے نہ جانے کیوں تم سے بھے ہو رہا ہے۔'

ہیلن مسکائی۔ اس مسکان میں کرونا بھری ہوئی تھی۔ مَنُشیہ کو کبھی کبھی کتنے ہی اپریہ کرتوّیوں (فرضوں) کا پالن کرنا پڑتا ہے۔ 'آئی وَن ،آج میں سُدھا سے وِش کا کام لینے جارہی ہوں۔ النکار کا ایسا 'درپیوگ تم نے کہیں اور دیکھا ہے؟'

آئی ون اُڑے ہوئے من سے بولا۔ اسی کو راشٹر جیون کہتے ہیں،

'یہ راشٹر جیون ہے یہ نرک ہے۔'

'مگر سنسار میں ابھی کچھ دن اور اس کی ضرورت رہے گی۔'

'یہ اوستھا جتنی جلد بدل جائے، اتنا ہی اچھا۔'

'پانسا پلٹ چکا تھا، آئی ون نے گرم ہوکر کہا۔ اَتیا چاریوں کو سنسار میں پھلنے پھولنے دیا جائے۔' 'جس میں ایک دن ان کے کانٹوں کے مارے پرتھوی پر کہیں پاؤں رکھنے کی جگہ نہ رہے۔'

'ہیلن نے کوئی جواب نہ دیا، پر اس کے من میں جو اَوساد اُتپنّ ہوگیا تھا، وہ اس کے مکھ پر جھلک رہا تھا۔ راشٹر اس کی دِرشٹی میں سر و پَری (اعلیٰ) تھا، اس کے سامنے ویکتی کا کوئی مولیہ نہ تھا۔ اگر اس سمے اس کا من کسی کارَن سے دُربل بھی ہو رہا تھا، تو اُسے کھول دینے کا اس میں ساہَس نہ تھا۔

دونوں گلے مل کر وِداع ہوئے۔ کون جانے ، یہ انتم درشن ہو؟

دونوں کے دل بھاری تھے اور آنکھیں سجل۔

آئی ون نے اتساہ کے ساتھ کہا۔ 'میں ٹھیک سمے پر آؤں گا۔' ہیلن نے کوئی جواب نہ دیا۔

آئی ون نے پھر سانورودھہ کہا۔ خدا سے میرے لیے دعا کرنا، ہیلن۔'

ہیلن نے جیسے روتے ہوئے گلے سے کہا۔ مجھے خدا پر بھروسا نہیں ہے۔'

'مجھے تو ہے۔'

'کب سے؟'

'جب سے موت میری آنکھوں کے سامنے کھڑی ہوگئی۔'

'وہ ویگ کے ساتھ چلا گیا۔ سندھیا ہوگئی تھی اور دو گھنٹے کے بعد ہی اس کٹھن پریکشا کا سمے آجائے گا، جس سے اس کے پران کانپ رہے تھے۔ وہ کہیں یکانت میں بیٹھ کر سوچنا چاہتا تھا۔

آج اسے گیات ہورہا تھا کہ وہ سوادھین نہیں ہے۔ بڑی موٹی زنجیر اس کے ایک ایک انگ کو جکڑے ہوئے تھی۔ انھیں وہ کیسے توڑے؟

دس بج گئے تھے۔ ہیلن اور روم ناف پارک کے ایک کنج میں بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تیز برفیلی ہوا چل رہی تھی۔ چاند کسی چھین آشا کی بھانتی بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔

ہیلن نے اِدھر اُدھر سشنکک نیتروں سے دیکھ کر کہا۔ 'اب تو دیر ہوگئی، یہاں سے چلنا چاہیے۔'

روم ناف نے بنچ پر پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔ 'ابھی تو ایسی دیر نہیں ہوئی ہے۔' ہیلن کہہ نہیں سکتا، جیون کے یہ چھن سوپن ہیں یا ستیہ، لیکن ستیہ بھی ہے تو سوپن سے ادھیک مدھر (دلکش) اور سوپن بھی ہیں تو ستیہ سے ادھیک اتول۔

ہیلن بے چین ہوکر اٹھی اور روم ناف کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ میرا جی آج کچھ چنچل ہو رہا ہے۔ سر میں چکر سا آرہا ہے۔ چلو مجھے میرے گھر پہنچا دو۔'

روم ناف نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی بغل میں بیٹھاتے ہوئے کہا، لیکن میں نے موٹر گیارہ بجے بلائی ہے۔

ہیلن کے منھ سے چیخ نکل گئی، 'گیارہ بجے۔'

'ہاں، اب گیارہ بجا چاہتے ہیں۔ آؤ تب تک اور کچھ باتیں ہوں۔ رات تو کالی بلا

سی معلوم ہوتی ہے۔ جتنی ہی دیر اسے دور رکھ سکوں اُتنا ہی اچھا، میں تو سمجھتا ہوں، اس دن تم میرے سوبھاگیہ کی دیوی بن کر آئی تھیں ہیلن، نہیں تو اب تک میں نے نہ جانے کیا کیا اتیا چار کیے ہوتے۔ اس اُودار نیتی نے واتا ورن میں جو شبھ پریورتن کردیا ، اس پر مجھے سوئم آشچریہ ہو رہا ہے۔مہینوں کے دمن میں جو کچھ نہ کر پایا تھا، وہ دنوں کے آشواسن نے پورا کر دکھایا اور اس کے لیے میں تمھارا رنی (مقروض) ہوں ہیلن، کیول تمھارا۔ پرکھید یہی ہے کہ ہماری سرکار دوا کرنا نہیں جانتی، کیول مارنا جانتی ہے۔ زار کے منتریوں میں ابھی سے میرے وِشے میں سندیہہ ہونے لگا ہے، اور مجھے یہاں سے ہٹانے کا پرستاؤ ہو رہا ہے۔

سَہسا ٹارچ کا چکا چوندھ پیدا کرنے والا پرکاش بجلی کی بھانتی چمک اُٹھا اور ریوالور چھوٹنے کی آواز آئی۔ اسی وقت روم ناف نے اچھل کر آئی ون کو پکڑلیا اور چلاّیا، 'پکڑو پکڑو خون ہیلن، تم یہاں سے بھاگو۔

پارک میں کئی سنتری تھے۔ چاروں اور سے دوڑ پڑے، آئی ون گھر گیا۔ ایک چھن (لمحہ) میں نہ جانے کہاں سے ٹاؤن پولیس، سشستر پولیس، گپت پولیس اور سوار پولیس کے جتھے کے جتھے آپہنچے۔آئی ون گرفتار ہو گیا۔ روم ناف نے ہیلن سے ہاتھ ملا کر سندہیہ کے سُر میں کہا۔ یہ آئی ون تو وہی یوُوک ہے جو تمھارے ساتھ وِدّیالیہ میں تھا۔

ہیلن نے چھبدھ (بے قرار) ہوکر کہا 'ہاں ہے لیکن مجھے اس کا ذرا بھی انومان نہ تھا کہ وہ کرانتی کاری (انقلابی) ہو گیا۔

گولی میرے سر پر سے سَن سَن کرتی ہوئی نکل گئی۔'

'یا ایشور'

میں نے دوسرا فائر کرنے کا اوسر ہی نہ دیا۔ مجھے اس یووک کی دشا پر دُکھ ہورہا ہے ہیلن، یہ اَبھاگے سمجھتے ہیں کہ ان ہتّیاؤں سے وے دیش کا اُدّھار کر لیں گے۔ اگر میں مرہی جاتا تو کیا میری جگہ کوئی مجھ سے بھی زیادہ کٹھور منشیہ نہ آجاتا؟ لیکن مجھے ذرا بھی کرودھ یا دکھ یا بھے نہیں ہے ہیلن، تم بالکل چنتا نہ کرنا۔چلو میں تمھیں پہنچا دوں۔

راستے بھر روم ناف اس آگھات سے بچ جانے پر اپنے کو بدھائی اور ایشور کو دھنّیہ واد دیتا رہا اور ہیلن وچاروں میں مگن بیٹھی رہی۔

دوسرے دن مجسٹریٹ کے اجلاس میں اَبھیوگ چلا اور ہیلن سرکاری گواہ تھی۔ آئی ون کو معلوم ہوا کہ دنیا اندھیری ہوگئی ہے اور اس کی اتھاہ گہرائی میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔

(3)

چودہ سال کے بعد۔

آئی ون ریل گاڑی سے اُتر کر ہیلن کے پاس جارہا ہے۔ اسے گھر والوں کی سُدھ نہیں ہے، ماتا اور پِتا اس کے وِیوگ میں مَرنا سنّ ہورہے ہیں، اس کی اُسے پرواہ نہیں ہے۔ وہ اپنے چودہ سال کے پالے ہوئے ہنسا بھاؤ سے اُنمکت، ہیلن کے پاس جارہا ہے، پر اس کی ہنسا میں رکت کی پیاس نہیں ہے، کیول گہری دَاہک دربھاوَنا (بُرا جذبہ) ہے۔ اس چودہ سالوں میں اس نے جو یاتنائیں (دُکھے) جھیلی ہیں، ان کے دو چار وَاکیوں میں مانو سَت نکال کر، وِش کے سمان ہیلن کی دھمنیوں میں بھر کر، اسے تڑپتے ہوئے دیکھ کر وہ اپنی آنکھوں کو ترِپت کرنا چاہتا ہے اور وہ وَاکیہ (جملہ) کیا ہے؟ 'ہیلن، تم نے میرے ساتھ جو دغا کی ہے، وہ شاید تریا چرتر کے اِیتہاس (تاریخ) میں بھی اَدُوتیہ ہے۔ میں نے اپنا سرو تمھارے چرنوں پر اَرپن کر دیا۔ میں کیول تمھارے اشاروں کا غلام تھا۔ تم نے ہی مجھے روم ناف کی ہتیا کے لیے پریرت کیا اور تم نے ہی میرے وِرُدّھ ساکشی دی، کیول اپنی کُٹل کام لپسا کو پورا کرنے کے لیے۔ میرے وِرُدّھ کوئی دوسرا پرمان نہ تھا۔ روم ناف اور اس کی ساری پولس بھی جھوٹی شہادتوں سے مجھے پراست نہ کرسکتی تھی، مگر تم نے کیول اپنی واسنا کو ترپت کرنے کے لیے کیول روم ناف کے وِشاکت آلنگن کا آنند اٹھانے کے لیے میرے ساتھ یہ وِشواس گھات کیا۔ پر آنکھیں کھول کر دیکھو کہ وہی آئی ون، جسے تم نے پیر کے نیچے کچلا تھا، آج تمھاری ان ساری مکّاریوں کا پردہ کھولنے کے لیے تمھارے سامنے کھڑا ہے۔ تم نے راشٹر کی سیوا کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ تم اپنے کو راشٹر کی ویدی پر ہُوم کردینا چاہتی تھیں۔ کنتو کتِست کامناؤں کے پہلے ہی پرلوبھن میں تم اپنے سارے بہروپ کو تیلانجلی دے کر بھوگ لالسا کی غلامی کرنے پر اُتر گئیں۔ ادھیکار اور سَمردھی کے پہلے ہی ٹکڑے پر تم دُم ہلاتی ہوئی ٹوٹ پڑیں۔ دِھکّار ہے تمھاری اس بھوگ لپسا کو، تمھارے اس کتِست جیون کو۔

(4)

سندھیا کال تھا۔ پچّھم کے چھجّے پر دن کی چِتا جل کر ٹھنڈی ہو رہی تھی اور روم ناف کے وشال بھون میں ہیلن کی ارتھی کو لے چلنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ نگر کے نیتا جمع تھے اور روم ناف اپنے شوک ہاتھوں سے ارتھی کو پُشپ ہاروں سے سجا رہا تھا۔ ایوم انھیں اپنے آتم جل سے شیتل کر رہا تھا۔ اس وقت آئی ون اُنمت وِیش میں دُربل، جھکا ہوا، سر کے بال بڑھائے، کنکال سا آکر کھڑا ہو گیا۔ کسی نے اُس کی اُور دھیان نہ دیا۔ سمجھے کوئی بھِکشک (بھکاری) ہوگا، جو ایسے اُوسروں پر دان کے لوبھ سے آجایا کرتے ہیں۔ جب نگر کے بشپ نے انتم سنسکار سماپت کیا اور مریم کی بیٹیاں نئے جیون کے سواگت کا گیت گا چکیں۔ تو آئی ون نے ارتھی کے پاس جا کر آویش سے کانپتے ہوئے سُور میں کہا۔ یہ وہ دُشٹا ہے جسے ساری دنیا کے پوِتر آتماؤں کی شبھ کامنائیں بھی نرک کی یاتنا سے نہیں بچا سکتیں۔ وہ اس یوگیہ تھی کہ اس کی لاش .....؛

کئی آدمیوں نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا اور دھکّے دیتے ہوئے پھاٹک کی اور لے چلے۔ اسی وقت رُوم ناف نے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے الگ لے جا کر پوچھا۔ دوست کیا تمھارا نام کلاڈیَس آئی وناف ہے؟ ہاں تم وہی ہو۔ مجھے تمھاری صورت یاد آگئی۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ رتّی رتّی معلوم ہے۔ ہیلن نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ اب وہ اس سنسار میں نہیں ہے، میں جھوٹ بول کر اس کی کوئی سیوا نہیں کر سکتا۔ تم اُس پر کٹھور شبدوں کا پرہار کرو یا کٹھور آگھاتوں کا، وہ سمان روپ سے شانت رہے گی، لیکن انت سے تک وہ تمھاری یاد کرتی رہی۔ اس پرسنگ کی اِسمرتی اسے سدَیو رُلاتی رہتی تھی۔ اس کے جیون کی یہ سب سے بڑی کامنا تھی کہ تمھارے سامنے گھٹنے ٹیک کر چھما کی یاچنا کرے، مرتے مرتے اس نے یہ وصیت کی کہ جس طرح بھی ہو سکے، اس کی یہ وِنے تم تک پہنچاؤں کہ وہ تمھاری اپرادھنی ہے اور تم سے چھما چاہتی ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو، جب وہ تمھارے سامنے آنکھوں میں آنسو بھرے آتی، تو تمھارا ہردے پتّھر ہونے پر بھی نہ پگھل جاتا؟ کیا اس سے بھی تمھیں دین یاچنا کی پرتیما سی کھڑی نہیں دِکھتی؟ چل کر اس کا مسکراتا ہو چہرہ دیکھو موشیو آئی ون، تمھارا من اب بھی اس کا چمبن لینے کے لیے وِکل ہوجائے گا۔ مجھے ذرا بھی اِیرشیا نہ ہوگی، اس پھولوں کی

سیج پر لیٹی ہوئی وہ ایسی لگ رہی ہے، مانو پھولوں کی رانی ہو۔ جیون میں اس کی ایک ہی ابھی لاشا اپورن رہ گئی آئی ون، وہ تمھاری چھما ہے۔ پریمی ہردے بڑا اُدار ہوتا ہے۔ آئی ون، وہ چھما اور دیا کا ساگر ہوتا ہے۔ اِیرشیا اور دمبھ کے گندے نالے اس میں مل کر اتنے ہی وشال اور پوتر ہوجاتے ہیں۔ جسے ایک بار تم نے پیار کیا، اس کی انتم ابھیلاشا کی تم اَپیکشا نہیں کرسکتے۔

اس نے آئی ون کا ہاتھ پکڑا اور سیکڑوں کوتوہل پورن نیتروں کے سامنے اُسے لیے ہوئے ارتھی کے پاس آیا اور تابوت کا اُوپری تختہ ہٹا کر ہیلن کا شانت مُکھ منڈل اسے دکھا دیا۔ اس نس پسند، نش چیشٹ، نروِکار چھوی کو مرتیو نے ایک دیوی گریما سی پردان کر دی تھی، مانو سورگ کی ساری وِبھوتیاں اُس کا سواگت کر رہی ہیں۔ آئی ون کی کوٹل آنکھوں میں ایک دِویہ جیوتی سی چمک اُٹھی اور وہ دِرشیہ سامنے کھنچ گیا، جب اس نے ہیلن کو پریم سے آلنگت کیا تھا اور اپنے ہردے کے سارے انوراگ اور الاس کو پشپوں میں گونتھ کر اس کے گلے میں ڈالا تھا۔ اسے جان پڑا کہ یہ سب کچھ جو اس کے سامنے ہو رہا ہے، سوپن ہے اور ایکا یک اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور وہ اسی بھانتی ہیلن کو اپنی چھاتی سے لگائے ہوئے ہے۔ اس آتم آنند کے ایک چھن کے لیے کیا وہ پھر چودہ سال کا کاراواس جھیلنے کے لیے تیار نہ ہوجائے گا؟ کیا اب بھی اس کے جیون کی سب سے سکھد گھڑیاں وہی نہ تھیں، جو ہیلن کے ساتھ گزری تھیں اور کیا ان گھڑیوں کے انوپم آنند کو وہ ان چودہ سالوں میں بھی بھول سکا تھا؟ اس نے تابوت کے پاس بیٹھ کر شردّھا کے کانپتے ہوئے کنٹھ سے پرارتھنا کی۔ ایشور تو میرے پرانوں سے پریہ ہیلن کو اپنی چھما کے دامن میں لے اور جب وہ تابوت کو کندھے پر لیے چلا، تو اس کی آتما لجّت تھی۔ اپنی سَنکیرنتا پر، اپنی اُدّگنتا پر، اپنی نیچتا پر، اور جب تابوت قبر میں رکھ دیا، تو وہ وہاں بیٹھ کر نہ جانے کب تک روتا رہا۔ دوسرے دن روم ناف جب فاتحہ پڑھنے آیا تو دیکھا، آئی ون سجدے میں سر جھکائے ہوئے ہے اور اس کی آتما سُورگ کو پریان کر چکی ہے۔

(یہ افسانہ ہندی میں 'ہنس' جولائی 1933 میں شائع ہوا۔ 'مان سرووَر' حصہ 2 میں شامل ہے، اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔ ح)

دل کی رانی

جن وِیر ترکوں کے پرکھر پرتاپ (جاہ وجلال) سے عیسائی دینا کانپ رہی تھی، انھیں کا رَکت آج قسطنطنیہ کی گلیوں میں بہہ رہا ہے۔ وہی قسطنطنیہ جو سوسال پہلے تُرکوں کے آتنک سے آہت ہورہاتھا،آج ان کے گرم رَکت سے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کررہا ہے۔ ستّر ہزار تُرک یودھاؤں کی لاشیں باس فرس کی لہروں پر تیر رہی ہیں اور تُرکی سینا پتی ایک لاکھ سپاہی کے ساتھ تیموری تیج کے سامنے اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے کھڑا ہے۔

تیمور نے وِجے سے بھری آنکھیں اٹھائیں اور سیناپتی یزدانی کی اُور دیکھ کر سنگھ کے سمان گرجا -کیا چاہتے ہو،زندگی یا موت؟

یزدانی نے گرو سے سر اٹھا کر کہا-عزت کی زندگی ملے تو زندگی ،ورنہ موت۔

تیمور کا کرودھ پرچنڈ (تیز) ہو اٹھا ۔اس نے بڑے بڑے ابھیمانیوں کا سرنیچا کردیا تھا۔ یہ جواب اس اَوسر پر سننے کی اُسے تاب نہ تھی۔ ان ایک لاکھ آدمیوں کی جان اس کی مٹھی میں ہے۔ انھیں وہ ایک چھن میں مسل سکتا ہے۔ اس پر بھی اتنا ابھیمان! عزت کی زندگی ۔اس کا یہی تو اَرتھ ہے کہ غریبوں کا جیون امیروں کے بھوگ وِلاس پر بلیدان کیا جائے، وہی شراب کی مجلسیں ہمیں ،وہی ارمینیا اور قاف کی پریاں...... نہیں ،تیمور نے خلیفہ بایزید کا گھمنڈ اس لیے نہیں توڑا کہ تُرکوں کو پھر اس مداندھ سوادھینتا (مدہوش آزادی) میں اسلام کا نام ڈُبانے کو چھوڑ دے۔ تب اُسے اتنا رَکت بہانے کی ضرورت تھی۔ مانو رکت کا پرواہ سنگیت کا پرواہ نہیں، رس کا پرواہ نہیں- ایک وِبھتس درشیہ (خوفناک منظر) ہے جسے دیکھ کر آنکھیں منھ پھیر لیتی ہیں، ہردے سر جھکا لیتا ہے۔ تیمور کوئی ہنسک پشونہیں ہے، جو یہ درشیہ دیکھنے کے لیے اپنے جیون کی بازی لگادے۔

وہ اپنے شبدوں میں دھگّار بھر کر بولا -جسے تم عزت کی زندگی کہتے ہو ،وہ گناہ اور جہنم کی زندگی ہے۔

یزدانی کو تیمور سے دَیا یا چھما کی آشا نہ تھی ۔ اس کی یا اس کے یودھاؤں کی جان کسی طرح نہیں بچ سکتی ۔ پھر کیوں دبے اور کیوں کھیل کر تیمور کے پرتی اس کے من میں جو گھِرنا ہے، اُسے پرکٹ کردے۔ اس نے ایک بارکاتر (مضطرب) نیتروں سے اُس روپ وان یووَک کی اُور دیکھا، جو اس کے پیچھے کھڑا جیسے اپنی جوانی کا لگام کھینچ رہا تھا۔ سان پر چڑھے ہوئے، اسپات کے سان انگ انگ سے اَتُل کرودھ کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ یزدانی نے اُس کی صورت دیکھی اور جیسے اپنی کھینچی ہوئی تلوار میان میں کرلی اور خون کے گھونٹ پی کر بولا- جہاں پناہ اس وقت فتح مند ہیں، لیکن اپرادھ چھما ہو تو کہہ دوں کہ اپنے جیون کے وِشے میں تُرکوں کو تاتاریوں سے اپدیش لینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دنیا سے الگ تاتار کے اُوسر میدانوں میں نہ تیاگ اور ورت کی اپاسنا کی جاسکتی ہے اور نہ میسر ہونے والے پدارتھوں کا بہشکار کیا جاسکتا ہے، پر جہاں خدا نے نعمتوں کی ورشا کی ہو، وہاں ان نعمتوں کو بھوگ نہ کرنا ناشکری ہے، اگر تلوار ہی سبھیتا کی سند ہوتی تو گال قوم رومنوں سے کہیں زیادہ سبھیہ ہوتی۔

تیمور زور سے ہنسا اور اس کے سپاہیوں نے تلوار پر ہاتھ رکھ لیے۔ تیمور کا ٹھہاکا موت کا ٹھہاکا تھا، یا گرنے والے ورج کا تڑاکا۔

'تاتاروالے پشو ہیں، کیوں؟'

'میں یہ نہیں کہتا۔'

'تم کہتے ہو ،خدا نے تمھیں عیش کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ میں کہتاہوں، وہ کفر ہے۔ خدا نے انسان کو بندگی کے لیے پیدا کیا ہے اور اس کے خلاف جو کوئی کچھ کرتا ہے، وہ کافر ہے، جہنمی ہے۔ رسولِ پاک ہماری زندگی کو پاک کرنے کے لیے آئے تھے ہمیں سچّا انسان بنانے کے لیے آئے تھے، ہمیں حرام کی تعلیم دینے نہیں۔ تیمور دنیا کو اس کفر سے پاک کردینے کا بیڑا اٹھا چکا ہے۔ رسولِ پاک کے قدموں کی قسم، میں بے رحم نہیں ہوں، ظالم نہیں، خونخوار نہیں ہوں، لیکن کفر کی سزا میرے ایمان میں موت کے سوا کچھ نہیں ہے۔'

اس نے تاتاری سپہ سالار کی طرف قاتل نظروں سے دیکھا اور تت چھن ایک دیو سا آدمی تلوار سونت کر یزدانی کے سر پر آپہنچا۔ تاتاری سینا بھی تلواریں کھینچ کھینچ کر ترکی

سینا پر ٹوٹ پڑی اور دم کے دم 2 میں کتنی ہی لاشیں زمین پر پھڑکنے لگیں۔

سہساوہی روپ وان یووَک، جو یزدانی کے پیچھے کھڑا تھا،آگے بڑھ کر تیمور کے سامنے آیا اور جیسے موت کو اپنی بندھی مٹھیوں میں مسلتا ہوا بولا-اے اپنے کو مسلمان کہنے والے بادشاہ-کیا یہی اسلام ہے، جس کی تبلیغ کا تونے بیڑا اٹھایا ہے؟ اسلام کی یہی تعلیم ہے کہ تو اُن بہادروں کا اس بے دردی سے خون بہائے، جنھوں نے اس کے سوا کوئی گناہ نہیں کیا کہ اپنے خلیفہ اور اپنے ملک کی حمایت کی۔

چاروں طرف سناٹا چھا گیا-ایک یووَک، جس کی ابھی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں، تیمور جیسے تیجسوی (پرجلال) بادشاہ کا اتنے کھلے شبدوں میں ترسکار (لعنت ملامت) کرے اور اس کی زبان تالو سے نہ کھنچوا لی جائے۔ سبھی استمبھت (مبہوت)ہورہے تھے اور تیمور سمّوہت سا بیٹھا اُس یووَک کی اُور تاک رہا تھا۔

یووَک نے تاتاری سپاہیوں کی طرف، جن کے چہروں پر کوتوہل مے (پرتجسس) پروتساہن جھلک رہاتھا، دیکھا اور بولا- تو ان مسلمانوں کو کافر کہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ انھیں قتل کرکے خدا اور اسلام کی خدمت کررہا ہے۔ میں تجھ سے پوچھتا ہوں، اگر وہ لوگ جو خدا کے سِوااور کسی کے سامنے سجدہ نہیں کرتے، جو رسولِ پاک کو اپنا رہبر سمجھتے ہیں، مسلمان نہیں ہیں تو کون مسلمان ہیں؟میں کہتا ہوں ،ہم کافر صحیح،لیکن تیرے قیدی توہیں؟کیا اسلام زنجیر میں بندھے قیدیوں کے قتل کی اجازت دیتا ہے؟خدا نے اگر تجھے طاقت دی ہے، اختیار دیا ہے، توکیا اس لیے کہ تو خدا کے بندوں کا خون بہائے؟کیا گنہگاروں کوقتل کرکے انھیں سیدھے راستے پر لے جائے گا؟ تونے کتنی بے رحمی سے ستّر ہزار بہادر تُرکوں کو دھوکہ دے کر سُرنگ سے اڑوا دیا، اور ان کے معصوم بچوں اور نرپرادھ استریوں کو اناتھ کردیا،تجھے کچھ انومان ہے؟کیا یہی کارنامے ہیں، جن پر تو اپنے کو مسلمان ہونے کا گرو کرتاہے؟ کیا اسی قتل ،خون اور ظلم کی سیاہی سے تو دنیا میں اپنا نام روشن کرے گا؟ تونے تُرکوں کے خون بہتے دریا میں اپنے گھوڑوں کے سُم نہیں بھگائے ہیں،بلکہ اسلام کو جڑ سے کھود کر پھینک دیا ہے۔ یہ وِیر تُرکوں کا ہی آتموتسرگ (ایثارنفس) ہے،جس نے یورپ میں اسلام کی توحید پھیلائی-آج صوفیہ کے گرجے میں تجھے اللہ اکبر کی صدا سنائی دے رہی ہے، سارا یورپ اسلام کا سواگت کرنے کو تیار ہے۔ کیا یہ

کارنامے اس لائق ہیں کہ ان کا یہ انعام ملے؟ اس خیال کو دل سے نکال دے کہ تو خوں ریزی سے اسلام کی خدمت کررہاہے۔ ایک دن تجھے بھی پروردگار کے سامنے اپنے کرموں کا جواب دینا پڑے گا اور تیرا کوئی عذر نہ سناجائے گا، کیوں کہ اگر تجھ میں اب بھی نیک اور بد کی تمیز باقی ہے تو اپنے دل سے پوچھ۔تو نے یہ جہاد خدا کی راہ میں کیا یا کسی ہوس کے لیے اور میں جانتا ہوں تجھے جو جواب ملے گا، وہ تیری گردن شرم سے جھکادے گا۔

خلیفہ ابھی سر جھکائے ہی تھا کہ یزدانی نے کانپتے ہوئے شبدوں میں عرض کی-جہاں پناہ، یہ غلام کا لڑکا ہے۔ اس کے دماغ میں کچھ فتور ہے۔ حضور اس کی گستاخیوں کو معاف کریں ۔اس کی سزا جھیلنے کو تیار ہوں۔

تیمور اس یوک کے چہرے کی طرف استھر نیتروں سے دیکھ رہا تھا۔ آج جیون مین پہلی بار اُسے ایسے نربھک شبدوں کو سننے کا اوسر ملا۔ اس کے سامنے بڑے بڑے سیناپتیوں ،منتریوں اور بادشاہوں کی زبان نہ کھلتی تھی۔وہ جو کچھ کرتا یا کہتا تھا،وہی قانون تھا، کسی کو اس میں چوں کرنے کی طاقت نہ تھی۔ ان کی خوشامدوں نے اس کی اہمنیتا (غرور) کو آسمان پر چڑھادیا تھا۔ اسے وِشواس ہوگیا تھا کہ خدا نے اسلام کو جگانے اور سدھارنے کے لیے ہی دنیا میں بھیجا ہے۔ اس نے پیغمبری کا دعوا تو آج تک نہیں کیا تھا، پر اس کے من میں یہ بھاؤنا دِڑھ ہوگئی تھی، اس لیے جب یوک نے پرانوں کا موہ چھوڑ کر اس کی کرتی کا پردہ کھول دیا تو اس کی چتینا جیسے جاگ اُٹھی ۔ اس کے من میں کرودھ اور ہنسا کی جگہ شردھا کا اُدے ہوا۔ اس کی آنکھوں کا ایک اشارہ اس یوک کی زندگی کا چراغ گُل کر سکتا تھا۔ اس کی سنسار وجئینی شکتی کے سامنے یہ دودھ منھہا بالک مانو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے سمندر کے پرواہ کو روکنے کے لیے کھڑا ہو۔ کتنا ہاسیاسپد (مضحکہ خیز) ساہس تھا، پر اس کے ساتھ ہی کتنا آتم وِشواس سے بھرا ہوا ۔تیمور کو ایسا جان پڑا کہ اس نہتھے بالک کے سامنے وہ کتنا نربل ہے۔ منشیہ میں ایسے ساہس کا ایک ہی سروت ہوسکتا ہے اور ستیہ پر اٹل وِشواس ہے۔ ان کی آتما دوڑ کر اس یوک کے دامن میں چمٹ جانے کے لیے ادھیر ہوگئی ، وہ دارشنک نہ تھا،جو ستیہ میں شنکا کرتا ہے۔ وہ سَرل سینک تھا اوراستیہ کو بھی اپنے وشواس سے ستیہ بنادیتا ہے۔

یزدانی نے اسی سُور میں کہا - جہاں پناہ ،اس کی بدزبانی کا خیال نہ فرماویں......

تیمور نے تُرنت تخت سے اٹھ کر یزدانی کو گلے سے لگا لیا اور بولا- کاش ،ایسی گستاخیوں اور بدزبانیوں کے سننے کا پہلے اتفاق ہوتا،تو آج اتنے بے گناہوں کا خون میری گردن پر نہ ہوتا۔ مجھے اس جوان میں کسی فرشتے کی روح کا جلوہ نظرآتا ہے،جو مجھ جیسے گمراہوں کو سچّا راستہ دکھانے کے لیے بھیجی گئی ہے۔ میرے دوست ،تم خوش نصیب ہو کہ ایسے فرشتے صفت بیٹے کے باپ ہو۔کیا میں اس کا نام پوچھ سکتا ہوں ؟

یزدانی پہلے آتش پرست تھا ،پیچھے مسلمان ہوگیا تھا ،پر ابھی تک کبھی کبھی اس کے من میں شنکائیں اٹھتی رہتی تھیں کہ اس نے کیوں کر اسلام قبول کیا۔جو قیدی پھانسی کے تختے پر کھڑا سوکھا جا رہا تھا کہ ایک چھن میں رسی اس کی گردن میں پڑے گی اور وہ لٹکتا رہ جائے گا، اسے جیسے کسی فرشتے نے گود میں لے لیا۔ وہ گدگد کنٹھ سے بولا- اُسے حبیب کہتے ہیں۔

تیمور نے یوٗسک کے سامنے جاکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے آنکھوں سے لگاتا ہوا بولا- میرے جوان دوست ،تم سچ مچ خدا کے حبیب ہو۔میں گنہگار ہوں،جس نے اپنی جہالت میں ہمیشہ اپنے گناہوں کو ثواب سمجھا ،اس لیے مجھ سے کہا جاتا تھا، تیری ذات بے عیب ہے۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ میرے ہاتھوں اسلام کو کتنا نقصان پہنچا۔آج سے میں تمھارا ہی دامن پکڑتا ہوں۔تمھیں میرے خضر، تمھیں میرے رہنما ہو مجھے یقین ہو گیا کہ تمھارے ہی وسیلے سے میں خدا کے درگاہ تک پہنچ سکتا ہوں۔

یہ کہتے ہوئے اس نے یوٗسک کے چہرے پر نظر ڈالی ، تو اس پر شرم کی لالی چھائی ہوئی تھی۔اس کٹھورتا کی جگہ مدھور سنکوچ جھلک رہاتھا۔

یوٗسک نے سر جھکا کر کہا - یہ حضور کی قدر دانی ہے،ورنہ میری کیا ہستی ہے!

تیمور نے اسے کھینچ کر اپنی بغل میں تخت پر بیٹھا دیا اور اپنے سیناپتی کو حکم دیا، سارے ترک قیدی چھوڑ دیے جائیں،ان کے ہتھیار واپس کردیے جائیں اور جو مال لوٹا گیا ہے ،وہ سپاہیوں میں برابر بانٹ دیا جائے۔

وزیر تو اِدھر اس حکم کی تکمیل کرنے لگا ،اُدھر تیمور حبیب کا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے خیمے میں لے گیا اور دونوں مہمانوں کی دعوت کا پربندھ کرنے لگا۔اور جب بھوجن سماپت

ہوگیا،تو اُس نے اپنے جیون کی ساری کتھا رو رو کر سنائی، جو آدی سے اَنت تک مِشرِت پَشوتا اور بربرتا کے کرتیوں سے بھری ہوئی تھی اور اس نے سب کچھ اس بھرم میں کیا کہ وہ ایشور آدیش کا پالن کررہا ہے۔وہ خدا کون منہ دکھائے گا؟ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

اَنت میں اس نے حبیب سے کہا -میرے جوان دوست، اب میرا بیڑا آپ ہی پار لگا سکتے ہیں۔ آپ نے مجھے راہ دکھائی ہے تو منزل پر پہنچایئے۔ میری بادشاہت کو اب آپ ہی سنبھال سکتے ہیں۔ مجھے اب معلوم ہوگیا کہ میں اُسے تباہی کے راستے پر لیے جاتا تھا۔ میری آپ سے یہی التماس (پرارتھنا) ہے کہ آپ اس کی وزارت قبول کریں۔ دیکھیے، خدا کے لیے انکار نہ کیجیے گا، ورنہ میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ یزدانی نے عرض کی -حضور اتنی قدردانی فرماتے ہیں، یہ آپ کی عنایت ہے، لیکن ابھی اس لڑکے کی عمر ہی کیا ہے۔ وزارت کی خدمت یہ کیا انجام دے سکے گا؟ ابھی تو اس کی تعلیم کے دن ہیں۔

اِدھر سے انکار ہوتا رہا اور اُدھر تیمور آگرہ کرتا رہا -یزدانی انکار تو کر رہے تھے، پر چھاتی پھولی جاتی تھی۔موسیٰ آگ لینے گئے تھے، پیغمبری مل گئی۔ کہاں موت کے منہ میں جارہے تھے، وزارت مل گئی۔ لیکن یہ شنکا بھی تھی کہ ایسے اَاستھر چت آدمی کا کیا ٹھکانہ؟ آج خوش ہوئے، وزارت دینے کو تیار ہیں، کل ناراض ہوگئے، تو جان کی خیریت نہیں۔ انھیں حبیب کی لیاقت پر بھروسہ تو تھا، پھر بھی جی ڈرتا تھا کہ پرانے دیش میں نہ جانے کیسی پڑے ، کیسی نہ پڑے؟ دربار والوں میں شڑینتر ہوتے ہی رہتے ہیں۔حبیب نیک ہے، سمجھدار ہے، اوسر پہچانتا ہے، لیکن وہ تجربہ کہاں سے لائے گا، جو عمر ہی سے آتا ہے۔ انھوں نے اس پرَشن پر وِچار کرنے کے لیے ایک دن کی مہلت مانگی اور رخصت ہوئے۔

(2)

حبیب یزدانی کا لڑکا نہیں،لڑکی تھی۔اس کا نام اُمّ الحبیب تھا۔ جس وقت یزدانی اور اس کی پتنی مسلمان ہوئے ،تو لڑکی کی عمر کل بارہ سال کی تھی،پر پرکِرتی نے اسے بدّھی اور پرتیبھا کے ساتھ وِچار سواتنتریہ بھی پردان کیا تھا۔ وہ جب تک ستیہ استیہ کی پریکچھا نہ

کر لیتی ،کوئی بات سویکار نہ کرتی ۔ ماں باپ کے دھرم پریورتن سے اُسے اشانتی تو ہوئی، پر جب تک اسلام کا اچھی طرح ادھیَین نہ کر لے، وہ کیول ماں باپ کو خوش کرنے کے لیے اسلام کی دیکچھا نہیں لے سکتی تھی۔ ماں باپ بھی اس پر کسی طرح کا دباؤ نہ ڈالنا چاہتے تھے۔ جیسے انھیں اپنے دھرم کو بدل دینے کا اَدھیکار ہے، ویسے ہی اُسے اپنے دھرم پر آروڑھ (قائم) رہنے کا بھی اَدھیکار ہے۔ لڑکی کو سنتوش ہوا، لیکن اس نے اسلام اور زرتُشت دھرم دونوں ہی کا تُلناتمک ادھیَین آرمبھ کیا، اور پورے دوسال کے انویشن اور پریکچھن کے بعد اس نے اسلام کی دیکچھا لے لی۔ ماتاپِتا پھولے نہ سمائے ۔لڑکی ان کے دباؤ سے مسلمان نہیں ہوئی ہے، بلکہ سوئچھا سے، سوادھیائے سے اور ایمان سے۔ دو سال تک انھیں جو ایک شنکا گھیرے رہتی تھی،وہ مٹ گئی۔

یزدانی کے کوئی پُتر نہ تھا اور اس یُگ میں،جب کہ آدمی کی تلوار ہی سب سے بڑی عدالت تھی، پُتر کا نہ رہنا سنسار کا سب سے بڑا دُربھاگیہ تھا۔ یزدانی بیٹے کا ارمان بیٹی سے پورا کرنے لگا۔ لڑکوں کی ہی بھانتی اس کی شکچھا دیکچھا ہونے لگی۔ بالکوں کے سے کپڑے پہنتی،گھوڑے پر سوار ہوتی،،شستر وِدیا سیکھتی اور اپنے باپ کے ساتھ اکثر خلیفہ بایزید کے محلوں میں جاتی اور راج کماروں کے ساتھ شکار کھیلنے جاتی۔ اس کے ساتھ ہی وہ درشن ،کاویہ،وِگیان اور ادھیاتم (روحانیت)کا بھی ابھیاس کرتی تھی۔ یہاں تک کہ سولہویں وَرش میں فوجی وِدیالیہ میں داخل ہوگئی۔ شستر وِدیا اور سینا سنچالن کلامیں وہ اتنی نپُن (ماہر) تھی اور خلیفہ بایزید اس کے چرتروں سے اتنا پرسّن تھا کہ پہلے ہی پہلے اُسے ایک ہزاری منصب مل گیا۔ ایسی یووَتی کے چاہنے والوں کی کیا کمی؟ اس کے ساتھ کے کتنے ہی افسر، راج پریوار کے کتنے ہی یووَک اس پر پران دیتے تھے، پر کوئی اس کی نظروں میں نہ جنچتا تھا۔ نِتیہ ہی نکاح کے پیغام آتے رہتے تھے پر وہ ہمیشہ انکار کر دیتی تھی ۔وَیواہک جیون ہی سے اسے اَروچی تھی۔ اس کی سوادھین (آزاد) پرکرِتی اس بندھن میں نہ پڑنا چاہتی تھی۔ پھر نِتیہ ہی وہ دیکھتی تھی کہ یووتیاں کتنے ارمانوں سے بیاہ کر لائی جاتی ہیں اور پھر کتنے نِرادَر سے محلوں میں بند کر دی جاتی ہیں۔ ان کا بھاگیہ پُرشوں کی دَیا کے اَدھین ہے۔ اکثر اونچے گھرانے کی مہیلاؤں سے اس کو ملنے جلنے کا اَوسر ملتا تھا۔ ان کے مُکھ سے ان کی کرون کتھا سن سن کر وہ وَیواہک پرادھینتا سے اور

بھی نفرت کرنے لگتی تھی اور یزدانی اس کے سوادھینتا میں بالکل بادھانہ دیتا تھا۔ لڑکی سوادھین ہے۔ اس کی اِچھا ہو تو وہ وِواہ کرے یا کنواری رہے، وہ اپنی آپ مختار ہے۔ اُس کے پاس پیغام آتے، تو وہ صاف جواب دیتا- میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا، اس کا فیصلہ وہی کرے گی۔ یدیپی (اگرچہ) ایک یووتی کا پُرش ویش میں رہنا ،یووکوں سے ملنا جلنا سماج میں آلوچنا کا وِشے تھا،پر یزدانی اور اس کی استری دونوں ہی کو اس کے ستوپر وشواش تھا۔ حبیب کے وِیوہار اور آچار میں انھیں کوئی ایسی بات نظر نہ آتی تھی،جس سے انھیں کسی کی شنکا ہوتی۔ یووَن کی آندھی میں‌اور لالساؤں کے طوفان میں بھی وہ چوبیس وَرش کی وِیر بالا اپنے ہرِدَے کی سمپتی لیے اَٹل اور اَجے کھڑی تھی، مانو سبھی یووَک اس کے سگے بھائی ہیں۔

(4)

قسطنطنیہ میں کتنی خوشیاں منائی گئیں، حبیب کا کتنا سمّان اور سواگت ہوا، تو کتنی بدھائیاں ملیں، یہ سب لکھنے کی بات نہیں۔شہر تباہ ہوا جاتا تھا۔ سمبھو تھا، آج اس کے محلوں اور بازاروں سے آگ کی لپٹیں نکلتی ہوتیں۔ راجیہ اور نگر کو اس کلپناتیت وِپتی سے بچانے والا آدمی کتنے آدر، پریم، شرڈھا اور اُلّاس کا پاتر ہوگا، اس کی تو کلپنا بھی نہیں کی جاسکتی۔ اس پر کتنے پھولوں اور کتنے لعل اور جواہر کی ورشا ہوئی، اس کا اَنومان تو کوئی گوِی ہی کرسکتا ہے۔ اور نگر کی مہیلائیں ہرِدَے کے اکشے بھنڈار (لازوال) سے آسیسیں (دعائیں) نکال نکال کر اس پر لٹکاتی تھیں اور گَرو سے پھولی ہوئی اس کا مُکھ نہار کر اپنے کو دھنیہ مانتی تھیں۔ اس نے دیویوں کا مستک اونچا کردیا تھا۔

رات کو تیمور کے پرستاؤ پر وِچار ہونے لگا ۔سامنے گدّے دار کُرسی پر یزدانی تھا- سَومیہ (متینؔ)،وِشال،تیجسوی۔ اس کی داہنی طرف اس کی پتنی تھی، ایرانی لباس میں، آنکھوں میں دَیا اور وِشواش کی جیوتی بھرے ہوئے۔ بائیں طرف اُمتہ الحبیب تھی، جو اس سَمے رمنی ویش میں موہنی بنی ہوئی تھی،برہماچاریہ کے تیج سے دِیپت

یزدانی نے پرستاؤ کا وِرودھ کرتے ہوئے کہا-میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتا، لیکن یَدی۔ مجھے صلاح دینے کا اَدھیکار ہے، تو میں اسپشٹ کہتا ہوں کہ تمھیں اس

پرستاؤ کو سویکار نہ کرنا چاہیے۔ تیمور سے یہ بات بہت دن تک چھپی نہیں رہ سکتی کہ تم کیا ہو۔ اس وقت کیا پرستھتی (حالت) ہوگی، میں نہیں کہہ سکتا ۔اور یہاں اس وِشے میں جو کچھ شنکائیں ہوں گی،وہ تم مجھ سے زیادہ جانتی ہو۔ یہاں میں موجود تھا اور کتسا (ذلیلوں) کو منھ نہ کھولنے دیتا تھا،پر وہاں تم اکیلی رہوگی اور کتسا کو من مانے آروپ کرنے کا اَوسر ملتا رہے گا۔

اس کی پتنی سوبھا کو اتنا مہتّو نہ دینا چاہتی تھی۔ بولی میں نے سنا ہے، تیمور نگاہوں کا اچھا آدمی نہیں ہے۔ میں کسی طرح تجھے نہ جانے دوں گی۔ کوئی بات ہوجائے تو ساری دنیا ہنسے یوں ہی ہنسنے والے کیا کم ہیں؟

اس طرح استری پُرش بڑی دیر تک اونچے نیچے بُجھاتے اور طرح طرح کی شنکائیں کرتے رہے، لیکن حبیب مَون سادھے بیٹھی ہوئی تھی۔ یزدانی نے سمجھا، حبیب بھی ان سے سہمت ہے۔انکار کی سوچنا دینے کے لیے ہی تھا کہ حبیب نے پوچھا-

آپ تیمور کو کیا کہیں گے؟

'یہی، جو یہاں طے ہوا ہے'

'میں نے تو ابھی کچھ نہیں کہا۔'

'میں نے تو سمجھا تم بھی ہم سے سہمت ہو۔'

'جی نہیں، آپ ان سے جاکر کہہ دیں، میں سویکار کرتی ہوں۔'

ماتا نے چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہا یہ کیا غضب کرتی ہے بیٹی، سوچ تو دنیا کیا کہے گی؟

یزدانی بھی سر تھام کر بیٹھ گئے، مانو ہردَیے میں گولی لگ گئی ہو۔منھ سے ایک شبد بھی نہ نکلا۔

حبیب تیوریوں پر بل ڈال کر بولی: امّاں جان، میں آپ کے حکم سے جَو بھر بھی منھ نہیں پھیرنا چاہتی۔ آپ کو پورا اختیار ہے، مجھے جانے دیں یا نہ جانے دیں، لیکن ملک کی خدمت کا ایسا موقع شاید مجھے زندگی میں پھر نہ ملے۔ اس موقعے کو ہاتھ سے کھودینے کا افسوس مجھے عمر بھر رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ امیر تیمور کو میں اپنی دیانت، بے غرضی اور سچّی وفاداری سے انسان بناسکتی ہوں اور شاید اس کے ہاتھوں خدا کے بندوں کا خون اتنی کثرت سے نہ بہے۔ وہ دلیر ہے، مگر بے رحم نہیں۔ کوئی دلیر آدمی بے رحم نہیں ہوسکتا۔

اس نے اب تک جو کچھ کیا ہے، مذہب کے اندھے جوش سے کیا ہے۔ آج خدا نے مجھے وہ موقع دیا ہے کہ میں اُسے دکھادوں کہ مذہب خدمت کا نام ہے، لوٹ اور قتل کا نہیں۔ اپنے بارے میں مجھے مطلق اندیشہ نہیں ہے۔ میں اپنی حفاظت آپ کر سکتی ہوں مجھے دعویٰ ہے کہ اپنے فرض کو نیک نیتی سے ادا کر کے میں دشمنوں کی زبان بھی بند کر سکتی ہوں اور مان لیجیے مجھے ناکامی بھی ہو، تو کیا سچائی اور حق کے لیے قربان ہوجانا زندگی کی سب سے شاندار فتح نہیں ہے؟ اب تک میں نے جس اصول پر زندگی بسر کی ہے، اس نے مجھے دھوکہ نہیں دیا اور اسی کے فیض سے آج مجھے یہ درجہ حاصل ہوا ہے جو بڑے بڑوں کے لیے زندگی کا خواب ہے۔ایسے آزمائے ہوئے دوست مجھے کبھی دھوکہ نہیں دے سکتے۔ تیمور پر میری حقیقت کھل بھی جائے ،تو کیا خوف؟ میری تلوار میری حفاظت کر سکتی ہے۔ شادی پر میرے خیال آپ کو معلوم ہیں اگر مجھے ایسا آدمی ملے گا، جسے میری روح قبول کرتی ہو،جس کی ذات اپنی ہستی کو کھو کر میں اپنی روح کو اونچا اٹھا سکوں تو میں اس کے قدموں پر گر کر اپنے کو اس کی نذر کر دوں گی۔

یزدانی نے خوش ہوکر بیٹی کو گلے لگا لیا۔ اس کی استری اتنی جلد آشوست نہ ہوسکی۔ وہ کسی طرح بیٹی کو اکیلا نہ چھوڑے گی۔اس کے ساتھ وہ بھی جائے گی۔

(5)

کئی مہینے گزر گئے۔ یوں کہ حبیب تیمور کا وزیر ہے لیکن واستو میں وہی بادشاہ ہے۔تیمور اسی کی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اسی کے کانوں سے سنتا ہے اور اسی کی عقل سے سوچتا ہے۔ وہ چاہتا ہے، حبیب آٹھوں پہر اس کے پاس رہے۔ اس کے سامیپیہ (قربت) میں اسے سُورگ کا سکھ ملتا ہے۔ سمرقند میں ایک نفس بھی ایسا نہیں جو اس سے جلتا ہو۔ اس کے برتاؤ نے سبھی کو مُگدھ کر لیا ہے، کیوں کہ وہ انصاف سے جَو بھر بھی قدم نہیں ہٹاتا۔ جو لوگ اس کے ہاتھوں چلتی ہوئی نیائے کی چکی میں پس جاتے ہیں، وے بھی اس سے سَدبھاؤ ہی رکھتے ہیں، کیوں کہ وہ نیائے کو ضرورت سے زیادہ کٹو (تلخ ناگوار) نہیں ہونے دیتا۔

سندھیا ہو گئی تھی۔ راجیہ کرمچاری جا چکے تھے۔ شمع دان میں موم کی بتّیاں جل رہی

تھیں۔ اگر کی سُگندھ سے سارا دیوان مہک رہا تھا۔ حبیب بھی اٹھنے ہی کو تھا کہ چوبدار نے خبر دی۔ حضور، جہاں پناہ تشریف لارہے ہیں۔

حبیب اس خبر سے کچھ پرسن نہیں ہوا۔ انیہ منتریوں کی بھانتی وہ تیمور کی صحبت کا بھوکا نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ تیمور سے دور رہنے کی چیشٹا کرتا ہے۔ ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو اس نے شاہی دسترخوان پر بھوجن کیا ہو۔ تیمور کی مجلسوں میں بھی وہ کبھی شریک نہیں ہوتا۔ اسے جب شانتی ملتی ہے ،تو ایکانت میں اپنے ماتا کے پاس بیٹھ کر دن بھر کا ماجرا کہتا ہے اور وہ اس پر اپنی پسند کی مہر لگا دیتی ہے۔

اس نے دُوار پر جاکر تیمور کا سواگت کیا۔ تیمور نے مسند پر بیٹھتے ہوئے کہا- مجھے تعجب ہوتا ہے کہ تم اس جوانی میں زاہدوں کی سی زندگی کیسے بسر کرتے ہو حبیب! خدا نے تمھیں وہ حُسن دیا ہے کہ حسین سے حسین نازنین بھی تمھاری معشوق بن کر اپنے کو خوش نصیب سمجھے گی۔ معلوم نہیں تمھیں خبر ہے یا نہیں جب تم اپنے مشکی گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتے ہو،تو سمرقند کی کھڑکیوں پر ہزاروں آنکھیں تمھاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے منتظر بیٹھی رہتی ہیں، پر تمھیں کسی نے کسی طرح آنکھیں اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میرا خدا گواہ ہے، میں جتنا چاہتا ہوں کہ تمھارے قدموں کے نقش پر چلوں، پر دنیا میری گردن نہیں چھوڑتی۔ کیوں اپنی پاک زندگی کا جادو مجھ پر نہیں ڈالتے؟ میں چاہتا ہوں جیسے تم دنیا میں رہ کر بھی دنیا سے الگ رہتے ہو ویسے میں بھی رہوں، لیکن میرے پاس نہ وہ دل ہے ،نہ وہ دماغ ۔میں ہمیشہ اپنے آپ پر، ساری دنیا پر دانت پیستا رہتا ہوں جیسے مجھے ہردم خون کی پیاس لگی رہتی ہے، جسے تم بجھنے نہیں دیتے اور وہ جانتے ہوئے بھی کہ تم جو کچھ کرتے ہو، اس سے بہتر کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ میں اپنے غصے کو قابو میں نہیں کرسکتا۔ تم جدھر سے نکلتے ہو ،محبت اور روشنی پھیلا دیتے ہو۔ جس کو تمھارا دشمن ہونا چاہیے، وہ بھی تمھارا دوست ہے، میں جدھر سے نکلتا ہوں۔ نفرت اور شبہہ پھیلاتا ہوا نکلتا ہوں۔ جسے میرا دوست ہونا چاہیے، وہ بھی میرا دشمن ہے۔ دنیا میں بس یہی ایک جگہ ہے، جہاں مجھے عافیت ملتی ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو، یہ تاج اور تخت میرے راستے کے روڑے ہیں تو خدا کی قسم میں آج ان پر لات مار دوں۔ میں آج تمھارے پاس یہی درخواست لے کر آیا ہوں کہ تم مجھے وہ راستہ دکھاؤ، جس سے میں سچّی خوشی پاسکوں۔ میں چاہتا ہوں تم اسی

محل میں رہوتا کہ میں تم سے سچی زندگی کا سبق سیکھوں۔

حبیب کا ہردے دَھک سے ہو اٹھا۔ کہیں امیر پر اس کے نارِتو کا رہسیہ کھل تو نہیں گیا؟ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا جواب دے۔اس کا کومل ہردے تیمور کی کرون آتم گلانی (پشیمانی) پر دَروِت ہوگیا۔ جس کے نام سے دنیا کانپتی ہے، وہ اس کے سامنے ایک دینیہ پرارتھی (سوالی) بنا ہوا اس سے پرکاش بھکشا مانگ رہا ہے۔ تیمور کی اس کٹھور وِکرت، شُشک، ہنساتمک مُدرا میں اُسے ایک سگندھ (مشتبہ) مدھور جیوتی دکھائی دی، مانو اس کا جاگرت وِویک بھیتر سے جھانک رہا ہو۔ اُسے اپنا اِستھر جیون، جس میں اوپر اٹھنے کی اِسمرتی ہی نہ رہی تھی، اس وِپھل اُدیوگ کے سامنے تُچھ جان پڑا۔

اس نے مُگدھ کنٹھ سے کہا۔ حضور،اس غلام کی اتنی قدر کرتے ہیں، یہ میری خوش نصیبی ہے۔لیکن میرا شاہی محل میں رہنا مناسب نہیں۔

تیمور نے پوچھا -کیوں؟

'اس لیے کہ جہاں دولت زیادہ ہوتی ہے، وہاں ڈاکے پڑتے ہیں‌اور جہاں قدر زیادہ ہوتی ہے، وہاں دشمن بھی زیادہ ہوتے ہیں۔'

'تمھارا دشمن بھی کوئی ہوسکتا ہے۔'

'میں‌خود اپنا دشمن ہوجاؤں گا۔ آدمی کا سب سے بڑادشمن غرور ہے۔'

تیمور کو جیسے کوئی رَتن مل گیا۔ اُسے اپنی من تُشٹی کا آبھاس ہوا۔'آدمی کا سب سے بڑا دشمن غرور ہے۔'اس واکیہ کو من ہی من دُہرا کر اس نے کہا- تم میرے قابو میں کبھی نہ آؤ گے حبیب۔ تم وہ پرندہ ہو،جو آسمان میں ہی اڑسکتا ہے۔ اُسے سونے کے پنجرے میں بھی رکھنا چاہو تو پھڑپھڑاتا رہے گا۔ خیر، خدا حافظ۔

وہ تُرنت اپنے محل کی اور چلا، مانو اس رَتن کو سُرکشِت استھان میں رکھ دینا چاہتا ہو۔ یہ واکیہ آج پہلی بار اس نے نہ سنا تھا، پر آج اس میں جوگیان، جو آدیش، جو سدپریرنا (ترغیب) اُسے ملی وہ کبھی نہ ملی تھی۔

(6)

استخر کے علاقے سے بغاوت کی خبر آئی ہے۔ حبیب کو شنکا ہے کہ تیمور وہاں پہنچ

کر کہیں قتلِ عام نہ کردے۔ وہ شانتی ئے اُپایوں سے اس وِدّروہ کو ٹھنڈا کر کے تیمور کو دکھانا چاہتا ہے کہ سدبھاؤ میں کتنی شکتی ہے۔ تیمور اُسے اس مُہم پر نہیں بھیجنا چاہتا، لیکن حبیب کے آگرہ کے سامنے بے بس ہے۔حبیب کو جب اور کوئی یُکتی نہ سوجھی، تو اس نے کہا- غلام کے رہتے ہوئے حضور اپنی جان خطرے میں ڈالیں، یہ نہیں ہوسکتا۔

تیمور مسکرایا- میری جان کی تمھاری جان کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں ہے حبیب۔ پھر میں نے تو کبھی جان کی پرواہ نہ کی ۔میں نے دنیا میں قتل اور لوٹ کے سوا اور کیا یاد گار چھوڑی ؟میرے مرجانے پر دنیا میرے نام پر روئے گی نہیں، یقین مانو۔ میرے جیسے لُٹیرے ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے،لیکن خدا نہ کرے تمھارے دشمنوں کو کچھ ہوگیا، تو سلطنت خاک میں مل جائے گی اور تب مجھے بھی سینے میں خنجر چبھالینے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہے گا۔ میں نہیں کہہ سکتا حبیب تم سے میں نے کتنا پایا۔ کاش ،دس پانچ سال پہلے تم مل جاتے، تو تیمور تاریخ میں اتنا روسیاہ نہ ہوتا۔ آج اگر ضرورت پڑے تو اپنے جیسے سو تیموروں کو تمھارے اوپر نثار کردوں۔ یہی سمجھ لو کہ تم میری روح کو اپنے ساتھ لیے جارہے ہو۔ آج میں تم سے کہتا ہوں حبیب کہ مجھے تم سے عشق ہے،وہ عشق جو مجھے آج تک کسی حسینہ سے نہیں ہوا۔ عشق کیا چیز ہے،اسے میں اب جان پایا ہوں۔ مگر اس میں کیا برائی ہے کہ میں بھی تمھارے ساتھ چلوں؟

حبیب نے دھڑکتے ہوئے ہردَے سے کہا- اگر میں آپ کی ضرورت سمجھوں گا تو اطلاع دوں گا۔

تیمور نے داڑھی پر ہاتھ رکھ کر کہا-جیسی تمھاری مرضی ،لیکن روزانہ قاصد بھیجتے رہنا، ورنہ شاید میں بے چین ہو کر چلا آؤں۔

تیمور نے کتنی محبت سے حبیب کے سفر کی تیاریاں کیں۔ طرح طرح کے آرام اور تکلفات کی چیزیں اس کے لیے جمع کیں۔ اس کوہستان میں یہ چیزیں کہاں ملیں گی۔ وہ ایسا سنگین (محو) تھا مانو ماتا اپنی لڑکی کو سسرال بھیج رہی ہو۔

جس وقت حبیب فوج کے ساتھ چلا، تو سارا سمرقند اس کے ساتھ تھا اور تیمور آنکھوں پر رومال رکھے ،اپنے تخت پر ایسا سر جھکائے بیٹھا تھا، مانو کوئی پنچھی آہت ہوگیا ہو۔

(7)

استخر آرمنی عیسائیوں کا علاقہ تھا۔مسلمانوں نے انھیں پراست کرکے وہاں اپنا ادھیکار جمالیا تھا اور ایسے نَیم بنادیے تھے ،جن سے عیسائیوں کو پگ پگ پر اپنی پرادھینتا کا اسمرن (احساس) ہوتا رہتا تھا۔ پہلا نَیم جزیہ کا تھا، جو ہر ایک کو دینا پڑتا تھا، جس سے مسلمان مُکت تھے۔ دوسرا نَیم تھا کہ گرجوں میں گھنٹا نہ بجے۔ تیسرا نَیم مَدِرا کا تھا، جسے مسلمان حرام سمجھتے تھے۔عیسائیوں نے ان نَیموں کا کریاتمک وِرُودھ کیا اور مسلمان ادھیکاریوں نے شستر بل سے کام لینا چاہا،تو عیسائیوں نے بغاوت کردی، مسلمان صوبے دار کو قید کرلیا اور قلعے پر صلیبی جھنڈا اُڑنے لگا۔

حبیب کو آج یہاں دوسرا دن ہے، پر اس سمسیا کو کیسے حل کرے۔ اس کا اُدار ہِدَے کہتا تھا ،عیسائیوں پر ان بندھنوں کا کوئی ارتھ نہیں ،ہر ایک دھرم کا سمان روپ سے آدر ہونا چاہیے۔ لیکن مسلمان ان قیدوں کواٹھادینے پر راضی نہ ہوں گے اور یہ لوگ مان بھی جائیں تو تیمور کیوں ماننے لگا؟ اس کے دھارمِک وِچاروں میں کچھ اُدارتا آئی ہے، پھر بھی وہ ان قیدیوں کو اٹھانا کبھی منظور نہ کرے گا۔ لیکن کیا وہ اس لیے عیسائیوں کو سزا دے کہ وہ اپنی دھارمِک سوادھینتا کے لیے لڑرہے ہیں۔ جسے وہ ستیہ سمجھتا ہے۔ اس کی بتیا کیسے کرے؟ نہیں اُسے ستیہ کا پالن کرنا ہوگا، چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ امیر سمجھیں گے، میں ضرورت سے زیادہ بڑھاجا رہا ہوں۔ کوئی مضائقہ نہیں۔

دوسرے دن حبیب نے پراتہ کال ڈنکے کی چوٹ اعلان کرایا- جزیہ معاف کیا گیا، شراب اور گھنٹوں پر کوئی بھید نہیں ہے۔

مسلمانوں میں تہلکہ پڑگیا۔ یہ کُفر ہے، حرام پرستی ہے۔ امیر تیمور نے جس اسلام کو اپنے خون سے سینچا ہے، اس کی جڑ انھیں کے وزیر حبیب پاشا کے ہاتھوں کُھد رہی ہے۔ پانسا پلٹ گیا۔ شاہی فوجیں مسلمانوں سے جا ملیں۔ حبیب استخر کے قلعے میں پناہ لی۔ مسلمانوں کی طاقت شاہی فوج سے مل جانے سے بہت بڑھ گئی تھی۔ انھوں نے قلعہ گھیر لیا اور یہ سمجھ کر کہ حبیب نے تیمور سے بغاوت کی ہے، تیمور کے پاس اس کی سوچنا دینے اور پرستھتی سمجھانے کے لیے قاصد بھیجا۔

(8)

آدھی رات گذر چکی تھی۔ تیمور کو دو دنوں سے اتخز کی کوئی خبر نہ ملی تھی۔ طرح طرح کی شنکائیں ہورہی تھیں۔ من میں پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے کیوں حبیب کو اکیلا جانے دیا۔ مانا کہ وہ بڑا نیتی کُشل ہے، پر بغاوت کہیں زور پکڑ گئی تو مٹھی بھر آدمیوں سے وہ کیا کرسکے گا؟اور بغاوت یقیناً زور پکڑے گی۔ وہاں کے عیسائی بلا کے سرکش ہیں۔ جب انھیں معلوم ہوگا کہ تیمور کی تلوار میں زنگ لگ گیا اور اُسے اب محلوں کی زندگی زیادہ پسند ہے تو ان کی ہمتیں دونی ہوجائیں گی۔ حبیب کہیں دشمنوں میں گھر گیا تو بڑا غضب ہوجائے گا۔

اس نے اپنے زانو پر ہاتھ مارا اور پہلوبدل کراپنے اوپر جھنجھلایا۔ وہ اتنا پست ہمّت کیوں ہوگیا؟ کیا اس کا تیج اور شوریہ اس سے وداع ہو گیا؟جس کا نام سن کر دشمنوں میں کمپن پڑجاتا تھا، وہ آج اپنا منہ چھپاکر محلوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ دنیا کی آنکھوں میں اس کا ایک ہی اَرتھ ہوسکتا ہے کہ تیمور اب میدان کا شیر نہیں قالین کا شیر ہوگیا۔ حبیب فرشتہ ہے،انسان کی برائیوں سے واقف نہیں۔ جو رحم اور صاف دل اور بے غرضی کا دیوتا ہے۔ وہ کیا جانے انسان کتنا شیطان ہوسکتاہے۔ امن کے دنوں میں تو یہ باتیں قوم اور ملک کی ترقی کے راستے پر لے جاتی ہیں، پر جنگ میں جب کہ شیطانی جوش کا طوفان اٹھتا ہے، خوبیوں کی گنجائش نہیں۔ اس وقت تو اس کی جیت ہوتی ہے، جو انسانی خون کا رنگ کھیلے، کھیتوں کھلیانوں کی ہولی جلائے، جنگلوں کو بسائے اور بستیوں کو ویران کرے۔ امن کا قانون جنگ کے قانون سے بالکل جُدا ہے۔

سہسا چوبدار نے اتخز سے ایک قاصد کے آنے کی خبر دی۔ قاصد نے زمین چومی اور ایک کنارے ادب سے کھڑا ہو گیا۔ تیمور کا رُعب ایسا چھاگیا کہ جو کچھ کہنے آیا تھا، وہ سب بھول گیا۔

تیمور نے تیوریاں چڑھاکر پوچھا- 'کیا خبر لائے ہو؟ تین دن کے بعد آیا بھی تو اتنی رات گئے؟'

قاصد نے پھر زمین چومی اور بولا- 'خداوند ،وزیر نے جزیہ معاف کردیا۔'

تیمور گرج اٹھا- 'کیا کہتا ہے، جزیہ معاف کردیا؟'

'ہاں خداوند۔'

'کس نے۔'

'وزیر صاحب نے۔'

'کس کے حکم سے؟'

'اپنے حکم سے حضور۔'

'ہوں'

'اور حضور،شراب کا بھی حکم دے دیا۔'

'ہوں'

'گرجوں میں گھنٹے بجانے کاحکم بھی دے دیا۔'

'ہوں'

اور خداوند عیسائیوں سے مل کر مسلمانوں پر حملہ کردیا۔'

'تو میں کیا کروں؟'

'حضور ہمارے مالک ہیں ۔اگر ہماری کچھ مدد نہ ہوئی ،تو وہاں ایک مسلمان بھی زندہ نہ بچے گا۔'

'حبیب پاشا اس وقت کہاں ہے؟'

'استخر کے قلعہ میں حضور۔'

'اور مسلمان کیا کررہے ہیں۔'

'ہم نے عیسائیوں کو قلعہ میں گھیر لیا ہے۔'

'انھیں کے ساتھ حبیب کو بھی ؟'

'ہاں حضور،وہ حضور سے باغی ہوگئے ۔'

اور اسی لیے میرے وفادار اسلام کے خادموں نے انھیں قید کر رکھا ہے۔ممکن ہے میرے پہنچتے پہنچتے انھیں قتل بھی کردے۔ بدذات، دور ہوجا میرے سامنے سے۔مسلمان سمجھتے ہیں، حبیب میرا نوکر ہے اور میں اس کا آقا ہوں۔ یہ غلط ہے، جھوٹ ہے۔ بس سلطنت کا مالک حبیب ہے، تیمور اس کا ادنیٰ غلام ہے۔ اس کے فیصلے میں تیموردست

اندازی نہیں کرسکتا۔ بے شک جزیہ معاف ہونا چاہیے۔مجھے کوئی مجاز نہیں کہ دوسرے مذہب والوں سے ان کے ایمان کا تاوان لوں۔ کوئی مجاز نہیں، اگر مسجد میں اذان ہوتی ہے تو کلیسا میں گھنٹہ کیوں نہ بجے؟ گھنٹے کی آواز میں کفر نہیں ہے۔ سنتا ہے بدذات۔ گھنٹے کی آواز میں کفر نہیں ہے۔ کافر وہ ہے جو دوسروں کا حق چھین لے، جو غریبوں کو ستائے، دغاباز ہو خود غرض ہو۔ کافر وہ نہیں، جو مٹی یا پتھر کے ٹکڑے میں خدا کا نور دیکھتا ہے، جو ندیوں اور پہاڑوں میں، درختوں پر، جھاڑیوں میں، خدا کا جلوہ پاتا ہو۔ وہ ہم سے اور تم سے زیادہ خدا پرست ہیں۔ جو مسجد میں خدا کو بند سمجھتے ہیں۔ تو سمجھتا ہے، میں کفر بک رہا ہوں؟ کسی کو کافر سمجھنا ہی کفر ہے۔ ہم سب خدا کے بندے ہیں، سب۔ بس جا ان باغی مسلمانوں سے کہہ دے، فوراً محاصرہ نہ اٹھا لیا گیا، تو تیمور قیامت کی طرح آپہنچے گا۔

قاصد ہت بُدھی (بے وقوف) سا کھڑا ہی تھا کہ باہر خطرے کا بگل بج اٹھااور فوجیں کسی سمریاترا کی تیاری کرنے لگیں۔

تیسرے دن تیمور استخر پہنچا ،تو قلعے کا محاصرہ اٹھ چکا تھا۔قلعے کی توپوں نے اس کا سواگت کیا۔ حبیب نے سمجھا تیمور عیسائیوں کو سزا دینے آرہاہے۔ عیسائیوں کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے، مگر حبیب مقابلے کے لیے تیار تھا۔ عیسائیوں کے سَوتو (حق) کی رکشا میں یَدی اس کی جان بھی جائے تو کوئی غم نہیں۔ اس معاملے پر کسی طرح کا سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔ تیمور اگر تلوار سے کام لینا چاہتا ہے، تو اس کا جواب تلوار سے دیا جائے گا۔

مگر یہ کیابات ہے۔شاہی فوج سفید جھنڈا دکھا رہی ہے۔ تیمور لڑنے نہیں صلح کرنے آیاہے۔ اس کا سواگت دوسری طرح کا ہوگا۔ عیسائی سرداروں کو ساتھ لیے حبیب قلعے کے باہر نکلا، تیمور اکیلا گھوڑے پر سوار ہوکر چلا آرہا تھا۔ حبیب گھوڑے سے اتر کر آداب بجا لایا۔ تیمور بھی گھوڑے سے اتر پڑا اور حبیب کا ماتھا چوم لیا اور بولا- میں سب کچھ سن چکا ہوں حبیب! تم نے بہت اچھا کیا اور وہی کیا جو تمھارے سِوا دوسرا نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے جزیہ لینے کا یا عیسائیوں کے مذہبی حق چھیننے کا کوئی مجاز نہ تھا۔ میں آج دربار کرکے ان باتوں کی تصدیق کردوں گا اور تب میں ایک ایسی تجویز کروں گا ،جو کئی دن سے

میرے ذہن میں آرہی ہے، اور مجھے امید ہے کہ تم اُسے منظور کرلوگے۔منظور کرنا پڑے گا؟

حبیب کے چہرے کا رنگ اُڑ رہا تھا۔ کہیں حقیقت کھل تو نہیں گئی؟ وہ کیا تجویز ہے اس کے من میں کھلبلی پڑگئی۔

تیمور نے مسکرا کر پوچھا- تم مجھ سے لڑنے کو تیار تھے؟ جیب نے شرماتے ہوئے کہا۔ حق کے سامنے امیر تیمور کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔

'بے شک، بے بیشک! تم میں فرشتوں کا دل ہے ہتو شیروں کی ہمت بھی ہے، لیکن افسوس یہی ہے کہ تم نے گمان ہی کیوں کیا کہ تیمور تمھارے فیصلے کو منسوخ کر سکتا ہے؟ یہ تمھاری ذات ہے، جس نے مجھے بتلایاہے کہ سلطنت کسی آدمی کی جائیداد نہیں بلکہ ایک ایسا درخت ہے جس کی ہر ایک شاخ اور پتّی ایک سی خوراک پاتی ہے۔'

دونوں قلعے میں داخل ہوئے۔سورج ڈوب چکا تھا۔آن کی آن میں دربار لگ گیااور اس میں تیمور نے عیسائیوں کے دھارمِک ادھیکاروں کو سویکار کیا۔

چاروں طرف سے آواز آئی- خداہمارے شہنشاہ کی عمر دراز کرے۔

تیمور نے اُسی سلسلے میں کہا- دوستوں میں اس دُعا کا حق دار نہیں ہوں۔ جو چیز مین نے آپ سے جبراً چھین لی تھی، اسے آپ کو واپس دے کر میں دُعا کا کام نہیں کر رہا ہوں، اس سے کہیں زیادہ مناسب ہے کہ آپ مجھے لعنت دیں کہ میں نے اتنے دنوں تک آپ کے حقوق سے آپ کومحروم رکھا۔

چاروں طرف سے آواز آئی- مرحبا! مرحبا!!

'دوستو، ان کے حقوق کے ساتھ ساتھ میں آپ کی سلطنت بھی آپ کو واپس کرتاہوں ،کیوں کہ خدا کی نگاہ میں سبھی انسان برابر ہیں اور کسی قوم یا شخص کودوسری قوم پر حکومت کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ آج سے آپ اپنے بادشاہ ہیں۔مجھے امید ہے کہ آپ بھی مسلم آبادی کو اس کے جائز حقوق سے محروم نہ کریں گے۔ اگر کبھی ایسا موقع آئے کہ کوئی جابر قوم آپ کی آزادی چھیننے کی کوشش کرے، تو تیمور آپ کی مدد کو ہمیشہ تیار رہے گا۔'

قلعے میں جشن ختم ہوچکا ہے۔ امراء اور حکام رخصت ہوچکے ہیں۔ دیوانِ خاص میں صرف تیمور اور حبیب رہ گئے۔ حبیب کے مُکھ پر آج اِسمِت ہاسیہ (پرمزاح شگفتگی) کی وہ چھٹا ہے، جو سدَیو گمبھیرتا کے نیچے دبی رہتی ہے۔ آج اس کے کپولوں پر جو لالی،

آنکھوں میں جو نشہ، انگوں میں جو چنچلتا ہے، وہ تو اور کبھی نظر نہ آئی تھی۔ وہ کئی بار تیمور سے شوخیاں کرچکاہے، کئی بار ہنسی کر چکا ہے، اس کی یُووَتی چیتنا، پَداور ادھیکار کو بھول کرچہکتی پھرتی ہے۔

سہسا تیمور نے کہا- حبیب ،میں نے آج تک تمھاری ہرایک بات مانی ہے۔ اب میں تم سے یہ تجویز کرتا ہوں جس کا میں نے ذکر کیا، اُسے تمھیں قبو ل کرنا پڑے گا۔

حبیب نے دھڑکتے ہوئے ہردَے سے سر جھکا کرکہا-فرمایئے۔

'پہلے وعدہ کروکہ تم قبول کروگے۔'

'میں تو آپ کا غلام ہوں۔'

نہیں میرے مالک ہو، میری زندگی کی روشنی ہو۔تم سے میں نے کتنا فیض پایاہے۔ اس کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ میں اب تک سلطنت کو اپنی زندگی کی سب سے پیاری چیز سمجھتا تھا۔ اس کے لیے میں نے سب کچھ کیا، جو مجھے نہ کرنا چاہیے تھا۔ اپنوں کے خون سے بھی ان ہاتھوں کو داغدار کیا، غیروں کے خون سے بھی۔ میرا کام اب ختم ہوچکا۔ میں نے بنیاد جمادی، اس پر محل بنانا تمھارا کام ہے۔ میری یہی التجا ہے کہ آج سے تم اس بادشاہت کے امین ہو جاؤ، میری زندگی میں بھی ار میرے مرنے کے بعد بھی۔

حبیب نے آکاش میں اڑتے ہوئے کہا- نہیں اتنا بڑا بوجھ۔ میرے کندھے اتنے مضبوط نہیں ہیں۔

تیمور نے دین آگرّہ کے سوَر میں کہا- نہیں میرے پیارے دوست، میری یہ التجا تمھیں ماننی پڑے گی۔

حبیب کی آنکھوں میں ہنسی تھی، ادھروں پرسنکوچ۔ اس نے آہستہ سے کہا- منظور ہے۔

تیمور نے پرپھُلّت سُور میں کہا- خداتمھیں سلامت رکھے۔

'لیکن اگر آپ کو معلوم ہوجائے کہ حبیب ایک کچّی عقل کی کنواری بالکا ہے تو؟

'تو وہ میری بادشاہت کے ساتھ میرے دل کی بھی رانی ہوجائے گی۔'

'آپ کو بالکل تعجب نہیں ہوا؟'

'میں جانتا تھا۔'

'کب سے؟'

'جب تم نے پہلی بار اپنی ظالم آنکھوں سے مجھے دیکھا۔'
'مگر آپ نے چھپایا خوب!!'
'تمھیں نے تو سکھایا۔ شاید میرے سوا یہاں کسی کو یہ بات معلوم نہیں۔'
'آپ نے کیسے پہچان لیا۔'
تیمور نے متوالی آنکھوں سے دیکھ کر کہا- یہ نہ بتاؤں گا۔
یہی حبیب تیمور کی 'بیگم حمیدہ' کے نام سے مشہور ہے۔

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں 'چاند' نومبر 1933 میں شائع ہوا۔ 'مان سروور 1' میں شامل ہے۔ اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔)

قاتل

جاڑوں کی رات تھی۔ دس بجے ہی سڑکیں بند ہو گئی تھیں اور گلیوں میں سناٹا تھا۔ بوڑھی بیوہ ماں نے اپنے نو جوان بیٹے دھرم دیر کے سامنے تھالی پرستے ہوئے کہا۔ ''تم رات تک کہاں رہتے ہو بیٹا؟ رکھے رکھے کھانا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ چاروں طرف سوتا پڑ گیا۔ آگ بھی اتنی نہیں رہتی کہ اتنی رات تک بیٹھی تاپتی رہوں''۔

دھرم دیر شکیل دتوانا نو جوان تھا۔ تھالی کھینچتا ہوا بولا۔ ''ابھی تو دس بھی نہیں بجے اماں! یہاں کے مردہ دل آدمی سر شام ہی سو جائیں تو کوئی کیا کرے۔ یورپ میں لوگ بارہ ایک بجے تک سیر و تفریح کرتے رہتے ہیں۔ زندگی کے لطف اُٹھانا کوئی ان سے سیکھ لے۔ ایک بجے سے پہلے تو کوئی سوتا ہی نہیں''۔

ماں نے پوچھا۔ ''تو آٹھ دس بجے سو کر اُٹھتے بھی ہوں گے''۔

دھرم ویر نے پہلو بچا کر کہا۔ ''نہیں وہ چھ بجے ہی اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ ہم لوگ بہت سونے کے عادی ہیں۔ دس سے چھ بجے تک آٹھ گھنٹے ہوتے ہیں۔ چوبیس گھنٹوں میں آٹھ گھنٹے آدمی سوئے، تو کام کیا کرے گا؟ یہ بالکل غلط ہے کہ آدمی کو آٹھ گھنٹے سونا چاہیے۔ انسان جتنا کم سوئے اتنا ہی اچھا۔ ہماری سبھا نے اپنے دستورالعمل میں داخل کر لیا ہے کہ اس کے ممبروں کو تین گھنٹے سے زیادہ سونا چاہیے''۔

ماں اس سبھا کا ذکر سنتے سنتے تنگ آ گئی تھی۔ یہ نہ کھاؤ۔ وہ نہ کھاؤ۔ یہ نہ پہنو۔ وہ نہ پہنو۔ نہ بیاہ کرو نہ شادی کرو۔ نہ نوکری کرو' نہ چاکری کرو۔ یہ سبھا کیا آدمیوں کو سنیاسی بنا کر چھوڑے گی۔ اتنا تیاگ تو سنیاسی ہی کر سکتا ہے۔ تیاگی سنیاسی بھی تو نہیں ملتے۔ ان میں بھی زیادہ تر نفس کے بندے' نام کے تیاگی ہیں۔ آج سونے کی قید بھی لگا دی۔ ابھی تین مہینے کی سیاحت ختم ہوئی ہے۔ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اب بارہ بجے کھائیے۔ یا کون جانے رات کو کھانا ہی اڑا دیں۔ اعتراض کے لہجہ

میں بولی ''۔ جب ہی یہ صورت نکل آئی ہے کہ چاہو تو ایک ایک ہڈی گن لو۔ آخر سبھا والے کوئی کام بھی کرتے ہیں۔ یا محض آدمیوں پر قیدیں ہی لگایا کرتے ہیں''؟

دھرم ویر بولا :- ''جو کام تم کرتی ہو' وہی ہم کرتے ہیں۔ تمھارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے۔ ہمارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے۔''

بوڑھی بیوہ جنگ آزادی میں دل و جان سے شریک تھی۔ دس سال قبل اس کا شوہر ایک باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں سزایاب ہوا تھا۔ جیل میں اس کی صحت خراب ہوگئی۔ اور جیل ہی میں راہی عدم ہوا۔ تب سے یہ بیوہ عفت آمیز خلوص و انہماک سے خدمتِ قوم میں مصروف تھی۔ شروع میں اس کا نوجوان فرزند بھی رضا کاروں میں شامل ہوگیا تھا۔ مگر ادھر پانچ مہینوں سے وہ اس نئی سبھا میں شریک ہوگیا۔ اور اس کے سرگرم کارکنوں میں سمجھا جاتا تھا۔

ماں نے مشتبہ انداز سے پوچھا۔ ''تو تمھاری سبھا کا بھی کوئی دفتر ہے ؟''

''ہاں ہے''۔

''اس میں کتنے ممبر ہیں ؟''

''ابھی تو صرف پچیس ممبر ہیں۔ لیکن وہ پچیس آدمی جو کچھ کرسکتے ہیں۔ وہ تمھارے پچیس ہزار بھی نہیں کرسکتے۔ دیکھو اماں! کسی سے کہنا مت۔ ورنہ سب سے پہلے میری جان پر آفت آئے گی۔ مجھے امید نہیں کہ پکٹنگ اور جلوسوں سے ہمیں آزادی حاصل ہوسکے۔ یہ تو اپنی کمزوری، اور معذوری کا صریح اعلان ہے۔ جھنڈیاں نکال کر اور گیت گا کر قومیں نہیں آزاد ہوا کرتیں۔ یہاں کے لوگ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے۔ ایک آدمی نے کہا، یوں سوراجیہ مل جائے گا۔ بس آنکھیں بند کرکے اس کے پیچھے ہولیے۔ وہ آدمی گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہا ہے۔ یہ لوگ دل میں اس خیال سے خوش ہولیں کہ ہم آزادی کے قریب آتے جاتے ہیں۔ مگر مجھے تو یہ طرزِ عمل بالکل بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ لڑکوں کے رونے دھونے اور مچلنے پر کھلونے اور مٹھائیاں ملا کرتی ہیں۔ وہی ان لوگوں کو مل جائے گا۔ اصلی چیز جب ہی ملے گی، جب ہم اس کی قیمت دینے کو تیار ہوں گے''۔

ماں نے کہا۔ ''اس کی قیمت کیا ہم نہیں دے رہے ہیں؟ ہمارے لاکھوں آدمی جیل

نہیں گئے؟ ہم نے ڈنڈے نہیں کھائے؟ ہم نے اپنی جائدادیں نہیں ضبط کرائیں''؟

دھرم ویر:- ''اس سے انگریزوں کا نقصان ہوا؟ وہ ہندوستان اسی وقت چھوڑیں گے۔ جب انھیں یقین ہو جائے گا، کہ اب وہ ایک لمحہ بھر بھی نہیں رہ سکتے۔ اگر آج ہندوستان کے ایک ہزار انگریز قتل کر دیے جائیں۔ تو آج ہی سوراجیہ مل جائے۔ روس اسی طرح آزاد ہوا، آئرلینڈ بھی اسی طرح آزاد ہوا اور ہندوستان بھی اسی طرح آزاد ہوگا، اور کوئی طریقہ نہیں۔ ہمیں ان کا خاتمہ کر دینا ہے۔ ایک گورے افسر کے قتل کر دینے سے حکومت پر جتنا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ اتنا ایک ہزار جلوسوں سے ممکن نہیں''۔

ماں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ اسے بیوہ ہوے دس سال ہو گئے تھے۔ یہی لڑکا اس کی زندگی کا سہارا ہے۔ اسی کو سینہ سے لگائے محنت مزدوری کرکے اپنے مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے۔ وہ اس خیال سے خوش تھی، کہ یہ چار پیسے کمائے گا۔ گھر میں بہو آئے گی۔ ایک ٹکڑا کھاؤں گی اور پڑی رہوں گی۔ آرزوؤں کے پتلے پتلے تنکوں سے اس نے ایک کشتی بنائی تھی۔ اور اسی پر بیٹھ کر زندگی کے دریا کو پار کر رہی تھی۔ وہ کشتی اب اُسے لہروں میں جھکولے کھاتی معلوم ہوئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا، کہ وہ کشتی دریا میں ڈوبی جارہی ہے۔ اس نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا:-

''بیٹا، تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو، انگریزوں کو قتل کر دینے سے ہم آزاد ہو جائیں گے؟ ہم انگریزوں کے دشمن نہیں۔ ہم اس طرز حکومت کے دشمن ہیں۔ اگر یہ طرز حکومت ہمارے بھائی بندوں ہی کے ہاتھوں میں ہو۔ اور اس کا بہت بڑا حصّہ ہے بھی۔ تو ہم اس کی بھی اسی طرح مخالفت کریں گے۔ روس میں تو کوئی دوسری قوم راج نہ کرتی تھی۔ پھر بھی روس والوں نے اس حکومت کو اُکھاڑ پھینکا۔ تو اس کا سبب یہی تھا کہ زار رعایا کی پروا نہ کرتا تھا۔ اُمرا مزے اُڑاتے تھے۔ غریبوں کو پیسا جاتا تھا۔ یہ باتیں تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ وہی حال ہمارا ہے۔ یہاں ایک ایک عہدے دار ایک ہزار غریبوں کا حصّہ کھا جاتا ہے۔ ملک کی دولت ایک نہ ایک بہانے نکلتی چلی جاتی ہے اور ہم غریب ہوتے جاتے ہیں۔ ہم اس غیر آئینی حکومت کو بدلنا چاہتے ہیں۔ میں تمھارے پیروں پڑتی ہوں، اس سبھا سے اپنا نام کٹوا لو۔ خواہ مخواہ آگ میں نہ کو دو۔ میں اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ نہیں دیکھنا چاہتی کہ تم عدالت میں خون کے جرم میں لائے جاؤ''۔

دھرم ویر پر اس منت آمیز التجا کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بولا۔ ''اس کا کوئی خوف نہیں۔ ہم نے اس کے متعلق کافی احتیاط کرلی ہے۔ گرفتار ہونا تو حماقت میں داخل ہے۔ ہم لوگ ایسی حکمت سے کام کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی گرفتار نہ ہو''۔

ماں کے چہرے پر اب خوف کی جگہ شرمندگی کی جھلک نظر آئی۔ بولی۔ ''یہ تو اس سے بھی بدتر ہے۔ بے گناہ سزا پائیں اور قاتل چین سے بیٹھے رہیں۔ یہ شرمناک حرکت ہے۔ میں اسے کمینہ پن سمجھتی ہوں۔ کسی کو چھپ کر قتل کرنا دغا بازی ہے۔ مگر اپنے عوض اپنے بے گناہ بھائیوں کو پھنسا دینا قوم فروشی ہے۔ ان بے گناہوں کا خون بھی قاتل کی گردن پر ہوگا''۔

دھرم ویر نے اپنی ماں کی پریشانی کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اماں'' تم ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔ تم اپنے دھرنے دیے جاؤ۔ جلوس نکالے جاؤ۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں، ہمیں کرنے دو۔ گناہ اور ثواب، پاپ اور پُن، دھرم اور ادھرم، یہ بے معنی الفاظ ہیں۔ جس کام کو تم گناہ سمجھتی ہو، اُسے میں عین ثواب سمجھتا ہوں۔ تمھیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ نسبتی الفاظ ہیں۔ تم نے بھگوت گیتا تو پڑھی ہے۔ کرشن بھگوان نے صاف کہا ہے۔ مارنے والا میں ہوں۔ جلانے والا مین ہوں۔ آدمی نہ کسی کو مار سکتا ہے۔ نہ جلا سکتا ہے۔ پھر کہاں رہا تمھارا گناہ؟ مجھے اس بات کی کیوں شرم ہو کہ میرے عوض کوئی دوسرا مجرم قرار دیا گیا۔ یہ انفرادی جنگ نہیں۔ انگلینڈ کی مجموعی طاقت سے جنگ ہے۔ میں مروں یا میرے عوض کوئی دوسرا مرے اس میں کوئی فرق نہیں۔ جو آدمی قوم کی زیادہ خدمت کر سکتا ہے۔ اُسے زندہ رہنے کا زیادہ حق ہے''۔

ماں حیرت سے لڑکے کا منہ دیکھنے لگی۔ اس سے مباحثہ کرنا بے سود تھا۔ اپنی دلیلوں سے وہ اُسے قائل نہ کرسکتی تھی۔ دھرم ویر کھانا کھا کر اُٹھ گیا، مگر وہ مفلوج سی بیٹھی رہی۔ اس نے سوچا۔ کہیں ایسا تو نہیں، کہ وہ کسی کو قتل کر آیا ہو، یا قتل کرنے جا رہا ہو۔ اس خیال سے اس کے جسم میں رعشہ آگیا۔ عام آدمیوں کی طرح قتل اور خون کی نفرت اس کے جسم کے ایک ایک ذرّہ میں بھری ہوئی تھی۔ اس کا اپنا فرزند قتل کا مرتکب ہو۔ اس سے زیادہ شرم، ذلت، حقارت اس کے لیے اور کیا ہو سکتی تھی۔ وہ قومی خدمت کے اس معیار پر جان دیتی تھی۔ جو تیاگ، بے نفسی، خلوص اور صاف دلی کی برکت ہے۔ اس کی

نگاہ میں قوم کا خادم وہ تھا۔ جو حقیر ترین مخلوق کا دل بھی نہ دکھائے۔ بلکہ ضرورت پڑنے پر خوشی سے اپنے کو قربان کر دے۔ اہنسا اس کے اخلاقی احساسات کا جزو اعظم تھی۔ اگر دھرم ویر کسی غریب کی حمایت میں گولی کا نشانہ بن جاتا۔ تو وہ روتی ضرور مگر گردن اُٹھا کر۔ اُسے روحانی صدمہ ہوتا۔ شاید اس صدمہ سے جان بر نہ ہوتی۔ مگر اس صدمہ میں غرور شامل ہوتا۔ لیکن وہ کسی کا خون کر آئے۔ یہ عذابِ قہر تھا۔ لعنت تھی۔ لڑکے کو روکے کیسے؟ یہی سوال اس کے سامنے تھا۔ وہ یہ نوبت ہرگز نہ آنے دے گی کہ اس کا فرزند خون کے جُرم میں گرفتار ہو۔ نہ اُسے یہی برداشت تھی کہ اس کے جُرم کی سزا بے گناہوں کو ملے۔ اُسے تعجب ہو رہا تھا، لڑکے میں یہ شوریدہ سری آئی کیونکر؟ وہ کھانا کھانے بیٹھی۔ مگر لقمہ حلق میں نہ جا سکا۔ کوئی ظالم ہاتھ دھرم ویر کو اس کی گود سے چھینے لیتا ہے۔ وہ اس ہاتھ کو ہٹا دینا چاہتی تھی۔ اپنے لختِ جگر کو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی جُدا نہ کرے گی۔ سایہ کی طرح اس کے پیچھے رہے گی۔ کس کی مجال ہے جو اس کے لڑکے کو اس کی گود سے چھینے؟

دھرم ویر باہر کے کمرے میں سویا کرتا تھا۔ اُسے گمان ہوا وہ کہیں چلا نہ گیا ہو۔ فوراً اس کے کمرہ میں آئی۔ دھرم ویر کے سامنے چراغ دان پر چراغ جل رہا تھا۔ وہ ایک کتاب کھولے پڑھتا پڑھتا سو گیا تھا۔ کتاب اس کے سینے پر پڑی تھی۔ ماں نے وہیں بیٹھ کر بے کسانہ خلوص اور انکسار کے ساتھ پر ماتما سے اس کی تالیف قلب کے لیے دعا کی۔ اس کے چہرہ پر اب بھی وہی بھولا پن، وہی معصومیت تھی جو پندرہ بیس سال پہلے نظر آتی تھی۔ تندی یا کرختگی کا کوئی نشان نہ تھا۔ ماں کی اصول پروری ایک لمحہ کے لیے ماتا کے دامن میں چھپ گئی۔ ماں نے دل سے بیٹے کے دلی جذبات کو دیکھا۔ اس نوجوان کے دل میں خدمت کا کتنا جوش ہے۔ قوم کا کتنا درد ہے۔ مظلومی سے کتنی ہمدردی ہے۔ اگر اس میں بوڑھوں کی مصلحت اندیشی، صبر، آہستہ روی ہے۔ تو اس کی کیا وجہ ہے۔ جو شخص جان جیسی عزیز چیز کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو، اس کی تڑپ اور جلن کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔ کاش! یہ جوش، یہ درد ہنسا کے پنجہ سے نکل سکتا۔ تو بیداری کی رفتار کتنی تیز ہو جاتی۔

ماں کی آہٹ پا کر دھرم ویر چونک پڑا اور کتاب سنبھالتا ہوا بولا۔ ''تم کب آ گئیں

ماں؟ مجھے تو نہ جانے کب نیند آ گئی''۔

ماں نے چراغ دان کو دور ہٹا کر کہا۔ ''چار پائی کے پاس چراغ رکھ کر نہ سویا کرو۔ اس سے کبھی کبھی حادثے ہو جایا کرتے ہیں۔ اور کیا ساری رات پڑھتے ہی رہوگے۔ آدھی رات تو ہوئی۔ آرام سے سو جاؤ۔ میں بھی یہیں لیٹی جاتی ہوں، مجھے اندر نہ جانے کیوں ڈر لگتا ہے''۔

دھرم ویر۔ ''تو میں ایک چارپائی لاکر ڈالے دیتا ہوں''۔

''نہیں میں یہیں زمین پر لیٹی جاتی ہوں''۔

''واہ! میں چارپائی پر لیٹوں، اور تم زمین پر پڑی رہو۔ تم چارپائی پر آ جاؤ''۔

''چل! میں چارپائی پر لیٹوں، اور تو زمین پر پڑا رہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا''۔

''میں چارپائی لیے آتا ہوں۔ نہیں تو میں بھی اندر ہی لیٹتا ہوں، آج آپ ڈریں کیوں''؟

''تمھاری باتوں نے ڈرا دیا تو مجھے بھی کیوں اپنی سبھا میں نہیں شریک کر لیتا''۔

دھرم ویر نے کوئی جواب نہ دیا۔ بستر اور چارپائی اٹھا کر اندر والے کمرہ میں لے چلا۔ ماں آگے آگے چراغ دکھاتی ہوئی چلی۔ کمرہ میں چار پائی ڈال کر اس پر لیٹتا ہوا بولا۔ ''اگر تم میری سبھا میں شریک ہو جاؤ تو کیا پوچھنا۔ بے چارے کچی کچی روٹیاں کھا کر بیمار ہو رہے تھے۔ انھیں اچھا کھانا ملنے لگے گا۔ پھر ایسی کتنی ہی باتیں ہیں۔ جنھیں ایک بوڑھی عورت جتنی آسانی سے کر سکتی ہے۔ نوجوان ہرگز نہیں کر سکتے۔ مثلاً کسی معاملہ کا سراغ لگانا، عورتوں میں ہمارے خیالات کی اشاعت کرنا۔ مگر تم مذاق کر رہی ہو''۔

ماں نے متانت سے کہا۔ ''نہیں بیٹا، مذاق نہیں کر رہی دل سے کہہ رہی ہوں۔ ماں کا دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتے۔ تمھیں اتنے بڑے خطرے میں تنہا چھوڑ کر میں گھر میں نہیں بیٹھ سکتی۔ جب تک مجھے کچھ نہ معلوم تھا۔ دوسری بات تھی۔ لیکن اب یہ حالات جان لینے کے بعد میں تم سے علیحدہ نہیں رہ سکتی۔ میں ہمیشہ تمھارے پہلو میں رہوں گی۔ اور اگر کوئی ایسا موقعہ آیا، تو تم سے پہلے میں اپنے تئیں قربان کروں گی۔ مرتے وقت تم میرے سامنے ہوگے۔ میرے لیے یہی سب سے بڑی خوشی ہے۔ یہ مت سمجھو کہ میں نازک موقعوں پر ڈر جاؤں گی۔ چیخوں گی، چلاؤں گی۔

ہرگز نہیں۔ سخت سے سخت خطروں کے سامنے بھی تم میری زبان سے ایک چیخ نہ سنو گے۔ اپنے بچّے کی حفاظت کے لیے گائے بھی شیرنی بن جاتی ہے''۔

دھرم ویر نے عقیدت سے سرشاز ہو کر ماں کے قدموں کا بوسہ لے لیا۔ اس کی نگاہوں میں وہ کبھی اتنی تعظیم اور محبت کے قابل نہ تھی۔

دوسرے ہی دن آزمائش کا موقع درپیش ہوا۔ یہ دو دن بڑھیا نے ریوالور چلانے کی مشق میں صرف کیے۔ پٹاخے کی آواز پر' کانوں پر ہاتھ رکھنے والی' اہنسا اور دھرم کی دیوی' اتنی دلیری سے ریوالور چلاتی تھی۔ اور اس کا نشانہ اتنا بے خطا ہوتا تھا کہ سبھا کے نوجوانوں کو بھی حیرت ہوتی تھی۔

پولیس کے افسرِ اعلیٰ کے نام موت کا پروانہ نکلا اور یہ خدمت دھرم ویر کے سپرد ہوئی۔

دونوں گھر پہنچے تو ماں نے پوچھا۔ ''کیوں بیٹا' اس افسر نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔ پھر سبھا نے کیوں اس کا انتخاب کیا''؟

دھرم ویر ماں کی سادگی پر مسکرا کر بولا۔ ''تم سمجھتی ہو ہمارے کانسٹیبل اور سب انسپکٹر اور سپرنٹنڈنٹ جو کچھ کرتے ہیں۔ اپنی خوشی سے کرتے ہیں ؟ وہ لوگ جتنے مظالم کرتے ہیں، ان کے لیے یہی شخص ذمہ دار ہے۔ اور پھر ہمارے لیے تو اتنا ہی کافی ہے کہ یہ اس مشین کا ایک خاص پُرزہ ہے۔ جو ہماری قوم کو انتہائی بے رحمی سے پامال کررہی ہے۔ لڑائی میں ذاتیات سے کوئی سروکار نہیں۔ وہاں تو مخالف فریق کا ممبر ہونا ہی سب سے بڑا گناہ ہے''۔

ماں خاموش ہوگئی۔ ایک لمحہ کے بعد ڈرتے ڈرتے بولی۔ ''بیٹا میں نے تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ اب ایک سوال کرتی ہوں۔ اُسے پورا کروگے''؟

دھرم ویر نے کہا۔

''یہ پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اماں تم جانتی ہو، میں تمھارے کسی حکم سے انکار نہیں کرسکتا''۔

ماں: ''ہاں بیٹا، یہ جانتی ہوں، اسی وجہ سے مجھے یہ سوال کرنے کی جرأت ہوئی۔ تم اس سبھا سے الگ ہو جاؤ۔ دیکھو تمھاری بوڑھی ماں ہاتھ باندھ کر تم سے یہ عرض

کر رہی ہے''۔

اور وہ ہاتھ باندھ کر سائلانہ انداز سے بیٹے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ دھرم ویر نے قہقہہ مار کر کہا۔

''یہ تو تم نے بے ڈھب سوال کیا اماں۔ تم جانتی ہو، اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ زندہ لوٹ کر نہ آؤں گا۔ اگر یہاں سے کہیں بھاگ جاؤں۔ تو بھی جان نہیں بچ سکتی۔ سبھا کے سب ممبر ہی میرے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ اور مجھے ان کی گولیوں کا نشانہ بننا پڑے گا۔ تم نے مجھے یہ زندگی عطا کی ہے، اسے تمھارے قدموں پر نثار کر سکتا ہوں۔ لیکن مادرِوطن نے تمھیں اور مجھے دونوں کو زندگی عطا کی ہے۔ اور اس کا حق افضل ہے۔ اگر کوئی ایسا موقعہ ہاتھ آجائے کہ مجھے مادرِوطن کی حمایت کے لیے تمھیں قتل کرنا پڑے، تو میں اس ناگوار فرض سے بھی منہ نہ موڑ سکوں گا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوں گے۔ لیکن تلوار تمھاری گردن پر ہوگی۔ ہمارے مذہب میں قوم کے مقابلہ میں کسی چیز کی حقیقت نہیں۔ اس لیے سبھا کو چھوڑنے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ ہاں تمھیں خوف ہو تو میرے ساتھ نہ جاؤ۔ میں کوئی بہانہ کر دوں گا۔ اور کسی دوسرے کا مریڈ کو ساتھ لے لوں گا۔ اگر تمھارے دل میں ضعف ہوتو مجھے فوراً بتلادو۔''

ماں نے کلیجہ مضبوط کر کے کہا۔ ''میں نے تمھارے خیال سے کہا تھا بھیّا' ورنہ مجھے کیا خوف؟''

تاریک شب کے پردے میں اس مہم کو انجام دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ معتوب رات کو کلب سے جس وقت لوٹے۔ وہیں اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا جائے۔ دھرم ویر نے دوپہر ہی کو موقعہ کا معائنہ کر لیا۔ اس خاص مقام کا انتخاب کر لیا۔ جہاں سے وہ نشانہ مارے گا۔ صاحب کے بنگلہ کے قریب کریل اور کروندے کی ایک چھوٹی سی جھاڑی تھی۔ وہی اس کی کمین گاہ ہوگی۔ جھاڑی کے بائیں جانب نشیب تھا۔ نشیب میں بیر اور امرود کے باغ تھے۔ بھاگ نکلنے کا اچھا موقعہ تھا۔

صاحب کے کلب جانے کا وقت سات اور آٹھ بجے کے درمیان تھا۔ لوٹنے کا وقت گیارہ یا بارہ بجے تھا۔ ان اوقات کی تحقیق کر لی گئی تھی۔ دھرم ویر نے طے کیا کہ نو بجے چل کر اسی کروند والی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ جائیں۔ وہیں ایک موڑ بھی تھا۔ موڑ پر موٹر

کی رفتار کچھ سُست ہو جائے گی۔ عین اسی وقت اسے ریوالور کا نشانہ بنا لیا جائے۔

جوں جوں دن گزرتا جاتا تھا۔ بوڑھی ماں کا دل دہشت سے خشک ہوتا جاتا تھا۔ لیکن دھرم ویر کے معمول میں مطلق فرق نہ تھا۔ وہ معین وقت پر اُٹھا۔ ناشتہ کیا۔ سندھیا کی۔ حسبِ معمول کچھ دیر پڑھتا رہا۔ دو چار احباب آ گئے۔ ان کے ساتھ دو تین بازیاں شطرنج کی کھیلیں۔ اطمنان سے کھانا کھایا اور معمول سے کچھ زیادہ پھر آرام سے سو گیا۔ گویا اُسے کوئی غم نہیں ہے۔ ماں کا دل اُچاٹ تھا۔ کھانے پینے کا تو ذکر ہی کیا۔ وہ من مار کر ایک جگہ بیٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ پڑوس کی عورتیں حسبِ معمول آئیں۔ وہ کسی سے مخاطب نہیں ہوئی۔ ایک سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر دوڑتی پھرتی تھی۔ گویا چوہیا بلّی کے خوف سے کوئی سوراخ ڈھونڈتی ہو۔ کوئی پہاڑ سا اس کے سر پر گرنا تھا۔ اس سے کہیں نجات نہیں۔ کہیں مفر نہیں وہ رسمی فلسفہ جس سے اب تک اُسے تسکین ہوتی تھی۔ تقدیر پنرجنم، مشیّت اس بلائے مہیب کے سامنے بے کار سے معلوم ہوتے تھے۔ زرہ بکتر اور خود تیر اور تفنگ سے حفاظت کر سکتے ہیں۔ لیکن پہاڑ تو اُسے اُن سارے دفاعی آلات کے ساتھ کچل ڈالے گا۔ اس کے دل و دماغ مفلوج ہوتے جاتے تھے۔ اگر کوئی احساس تھا، تو دہشت کا۔ مگر شام ہوتے ہوتے اس کے دل پر ایک سکون کی حالت طاری ہوئی۔ اس کے اندر ایک طاقت پیدا ہوئی۔ جسے مجبوری کی طاقت کہہ سکتے ہیں۔ چڑیا اس وقت تک پھڑ پھڑاتی رہی۔ جب تک اُڑ نکلنے کی امید تھی۔ اس کے بعد وہ پنجہ صیاد اور تیغ قاتل کے لیے تیار ہو گئی۔ انتہائی خوف کا نام دلیری ہے۔

اس نے دھرم ویر کو پکارا۔ ''بیٹا، کچھ آ کر کھالو''۔

دھرم ویر اندر آیا۔ آج دن بھر ماں بیٹے میں ایک بات بھی نہ ہوئی تھی۔ اس وقت ماں نے دھرم ویر کو دیکھا، تو اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ وہ ضبط جس سے آج اس نے دن بھر اپنے اندرونی اضطراب کو چھپا رکھا تھا۔ جو اب تک سُبکسری کی صورت میں نمایاں ہو رہا تھا۔ خطرہ کے ہوا۔ کپڑے پہنے۔ ریوالور جیب میں رکھا، اور بولا۔ ''اب تو وقت ہو گیا اماں''!

ماں نے کچھ جواب نہ دیا۔ گھر سنبھالنے کی کسے پروا تھی۔ جو چیز جہاں پڑی تھی۔ وہیں پڑی رہی۔ یہاں تک کہ چراغ بھی گل نہ کیا گیا۔ دونوں خاموش گھر سے نکلے۔

ایک مردانہ وار قدم اُٹھاتا، دوسری متفکر اور مغموم اور بار مجبوری سے جھکی ہوئی، راستہ میں بھی تبادلہ الفاظ نہ ہوا۔ دونوں نوشتہ تقدیر کی طرح اٹل، خاموش اور سرگرم تھے۔ حصۂ نثر پُر شکوہ، قوی اور تحریک عمل مستحسن۔ حصۂ نظم درد، تاثیر اور التجا سے لرزاں۔

جھاڑی میں پہنچ کر دونوں چُپ چاپ بیٹھ گئے۔ کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد صاحب کا موٹر نکلا۔ دھرم ویر نے غور سے دیکھا۔ موٹر کی رفتار سُست تھی۔ صاحب اور لیڈی دونوں بیٹھے تھے۔ نشانہ غیر متوقع تھا۔ دھرم ویر نے جیب سے ریوالور نکالا۔ ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور موٹر آگے نکل گیا۔

دھرم ویر نے کہا۔ ''یہ تم نے کیا کیا اماں؟ ایسا سُنہرا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا''۔

ماں نے کہا۔ ''موٹر میں میم بھی تھی۔ کہیں میم ہی کو گولی لگ جاتی تو''؟

''تو کیا مضائقہ تھا۔ ہمارے مذہب میں ناگ ناگن اور سنپولے میں کوئی بھی فرق نہیں''۔

ماں نے نفرت آمیز لہجہ میں کہا۔ ''تو تمھارا مذہب درندوں اور وحشیوں کا ہے۔ جو جنگ کے بنیادی اصولوں کی بھی پروا نہیں کرتا۔ عورت ہر ایک مذہب میں معصوم سمجھی گئی ہے۔ یہاں تک کہ وحشی بھی اس کا احترام کرتے ہیں''۔

میں واپسی کے وقت ہرگز نہ چھوڑوں گا''۔

''میرے جیتے جی تم عورت پر ہاتھ نہیں ے اُٹھا سکتے''۔

''میں اس معاملے میں تمھاری پابندیوں کا غلام نہیں ہو سکتا''۔

ماں نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس نامردانہ ضرب سے اس کی مامتا ریزہ ریزہ ہوگئی۔ مشکل سے بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ وہی موٹر دوسری جانب سے آتا دکھائی دیا، دھرم ویر نے موٹر کو غور سے دیکھا اور اچھل کر بولا:-

''لو اماں، اب کی بار صاحب اکیلا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ نشانہ لگانا''۔

ماں نے لپک کر دھرم ویر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور مجنونا نہ تندی کے ساتھ اس کا ریوالور چھیننے لگی۔ دھرم ویر نے اس کو دھکا دے کر گرا دیا۔ اور ایک قدم ہٹ کر ریوالور سادھا۔ ایک سیکنڈ میں ماں اُٹھی۔ اسی وقت گولی چلی موٹر آگے نکل گئی۔ مگر ماں زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔

دھرم ویر ریوالور پھینک کر ماں کے پاس گیا اور گھبرا کر بولا۔ ''اماں کیا ہوا''؟

پھر یکایک اس سانحہ کا علم اس کے اندر چمک اُٹھا۔ وہ اپنی پیاری ماں کا قاتل ہے۔ اس کی فطرت کی ساری درشتی اور تیزی اور گرمی بجھ گئی۔ آنسوؤں کی بڑھتی ہوئی لرزش کو محسوس کرتا وہ نیچے جھکا۔ اور ماں کے چہرہ کی طرف اشک آلود پشیمانی سے دیکھ کر بولا۔

''یہ کیا ہو گیا اماں! ہائے تم کچھ بولتی کیوں نہیں۔ یہ کیسے ہو گیا؟ اندھیرے میں کچھ نظر بھی تو نہیں آتا۔ کہاں گولی لگی؟ کچھ بتاؤ آہ! اس بدنصیب کے ہاتھوں تمھاری موت لکھی تھی۔ جس کو تم نے گود میں پالا۔ وہی تمھارا قاتل ہوا۔ کس کو بُلاؤں۔ کوئی نظر بھی تو نہیں آتا''۔

ماں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میرا جنم سپھل ہوگیا بیٹا، تمھارے ہاتھوں میری مٹی اُٹھے گی۔ تمھاری گود میں مر رہی ہوں۔ سینہ میں زخم ہو گیا ہے۔ جوں ہی تم نے گولی چلائی۔ میں تمھارے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اب نہیں بولا جاتا، پرماتما تمھیں خوش رکھے۔ میری یہ دعا ہے۔ میں اور کیا کرتی بیٹا! ماں کی آبرو تمھارے ہاتھ میں ہے مین تو چلی''!

ایک لمحہ کے بعد اس تاریک سناٹے میں دھرم ویر اپنی عزیز ماں کے تن نیم جاں کو گود میں لیے گھر چلا۔ تو اس کے ٹھنڈے تلوؤں سے اپنی آنسو بھری آنکھیں رگڑ کر روحانی مسرّت سے بھری ہوئی خلش محسوس کر رہا تھا۔

(یہ افسانہ 'آخری تحفہ' میں شامل ہے۔ ہندی میں یہ 'گپت دھن' نمبر 2 میں شامل ہے۔)

برات

آج بابو دیوکی ناتھ اپنی پندرہ سال کی بیاہتا بیوی کو چھوڑ کر نئی شادی کرنے جا رہے ہیں۔ عزیز و اقربا جمع ہیں۔ مگر کوئی یہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا، کہ آخر اس بے کس پر اتنا عتاب کیوں ہے؟ بابو دیوکی ناتھ سے کیوں بُرے بنیں۔ دروازہ پر نوبت بج رہی ہے۔ اندر مستورات بیاہ کے گیت گا رہی ہیں۔ نوکر چاکر خوش رنگ وردیاں پہنے ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں۔ براتی اصحاب اپنی اپنی آرائش میں مصروف ہیں۔ مگر اس شادی کے ساتھ ایک عزیز جان کا خون ہو رہا ہے۔ اس کی کسی کو پرواہ نہیں۔

آج پندرہ سال ہوئے۔ جب دیوکی ناتھ کی شادی پھول وتی سے ہوئی تھی۔ پھول وتی حسین تھی۔ باتمیز تھی۔ شیریں دہن تھی۔ تعلیم یافتہ تھی۔ دیوکی ناتھ بھی نیک اطوار، مستقل مزاج، روشن خیال، مگر پہلے ہی دن دُلہا دُلہن میں کچھ ایسی بدمزگی پیدا ہوئی کہ دونوں میں ایک خلیج حائل ہوگئی۔ اور زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آج دیوکی ناتھ نئی شادی کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

اور اس بدمزگی کا باعث کیا تھا؟ معاشرتی معاملات میں اختلاف۔ دیوکی ناتھ پرانی تہذیب کے قائل تھے۔ پھول وتی نئی روشنی کی دلدادہ۔ پرانی تہذیب پردہ چاہتی ہے۔ تحمل اور صبر چاہتی ہے۔ نئی روشنی آزادی چاہتی ہے۔ اعزاز چاہتی ہے۔ حکومت چاہتی ہے۔ دیوکی ناتھ چاہتے ہیں پھول وتی میری ماں کی خدمت کرے۔ بغیر اجازت گھر سے قدم نہ نکالے۔ لمبا سا گھونگھٹ نکال کر چلے۔ پھول وتی کو ان باتوں میں سے ایک بھی پسند نہ تھی۔ دونوں میں مباحثے ہوئے۔ سخت کلامیوں کی نوبت آئی۔ شکر رنجی ہوئی۔ میاں نے بیوی کے میکے والوں کی تحقیر کی۔ بیوی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ میاں نے ڈانٹ بتائی۔ بیوی نے میکے کی راہ لی۔ میکہ بھی دور نہ تھا۔ دس منٹ میں گھر جا پہنچی۔ مہینوں تک دونوں کھنچے رہے۔ پھر پھول وتی منائی گئی۔ سسرال آئی۔ مگر دو ہی چار دن

میں وہی قصے شروع ہوگئے۔ نہ دیوکی ناتھ اپنے عمل کی اصلاح کر سکتے تھے، نہ پھول وتی اپنے طرزِ عمل کی۔ اب کے برسوں بول چال بند رہی۔ آخر احباب کے سمجھانے سے دیوکی ناتھ تیسری بار بیوی کو منا لائے۔ مگر اب کے معاملات نے کچھ ایسا طول کھینچا کہ دائمی مفارقت ہوگئی۔ نہ انھوں نے بلایا، نہ وہ آئی ۔ اور آج میاں شوہر نئی شادی رچا کر اپنے دل کی آگ بجھا رہے ہیں ۔کیا پھول وتی کے لیے بھی یہی آزادی ہے ؟ کیا اسے یہ آزادی ہوتی، تو دیو کی ناتھ کو نئی شادی ٹھاننے کا حوصلہ ہوتا ؟

دیو کی ناتھ کی ماں صندوق میں زیوروں کو سجارہی ہیں۔ نئی بہوکی خوشی میں متوالی ہورہی ہیں ۔ اس پر سن لیا ہے کہ بہو ہوشیار ہے ۔ خدمت گزار ہے ۔شرمیلی ہے ۔ پھر کیا پوچھنا، اس لکشمی کے آتے ہی گھر کی رونق ہی کچھ اور ہوجائے گی ۔ پڑوسنیں اسے چڑانے کو کہتی ہیں ۔

''نئی بہو.جی پڑھی لکھی تو خوب ہوں گی''؟

ساس جی منہ بنا کر کہتی ہیں۔''مجھے میم صاحب کی ضرورت نہیں ۔ میں درگزری ایسی پڑھی لکھی سے مجھے اب گنوار بہو چاہئے''۔

دروازہ سے منشی جی آکر بولے ۔'' بھئی جلدی کرو ۔گاڑی چھوٹ جاے گی پھر کوئی دوسری ساعت نہیں ہے''۔

ساس کہتی ہے ''۔ آپ اپنا کام دیکھیے ۔ مجھے کوئی دیر نہیں ہے ۔ درزی کو بلوادیجیے، نوشہ کو کپڑے پہنادے''۔

درزی نے آکر جوڑا پہنایا ۔ مالی نے آکر سہرا باندھا ۔ چمار نے آکر جوتی پہنائی۔ پھوپھا.جی پگڑی سنوار گئے ۔ بوّا جی نے آکر آنکھوں میں کاجل لگایا ۔ مامی جی نے آکر بندن دار باندھ دی ۔ دلہا آدمی سے بندر بن گیا ۔ ۴۵سال کی عمر ۔ کچھ کچھ بالوں میں سفیدی آچلی تھی۔ دو چار دانت بھی جواب دے چکے تھے ۔ چہرہ پر جھرّیاں پڑنی ہوئی مگر وضع ایسی، گویا ابھی عنفوانِ شباب ہے ۔

(2)

ادھر پھول وتی کے باپ کو خبر ملی ۔ دریائے تفکّر میں ڈوب گئے۔ پہلے سے خبر

ہوتی، تو ہاتھ پاؤں مارتے ۔ مگر اب تو برات جانے کو تیار ہے۔ اس تنگ وقت وہ کیا کر سکتے ہیں؟ سوچ رہے تھے۔ ہم لوگوں سے تو نیچی ذاتیں ہی اچھی ہیں۔ ان کو کم سے کم برادری کا تو خوف ہے۔ ہم لوگوں نے تو بے غیرتی پر کمر باندھ لی ہے۔ ہائے، پھول وتی کو معلوم ہوگا تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ آج پندرہ سال گزر گئے۔ اسے کیا آرام ملا؟ بیواؤں کی زندگی بسر کررہی ہے۔ اس پر یہ نیا صدمہ! یہ نئی چوٹ اس سے کیونکر برداشت ہوگی؟

پھول وتی آن آن، پر جان دینے والی عورتوں میں سے تھی۔ جو دل میں ایک بات ٹھان کر پھر پیچھے ہٹ نہیں جانتیں۔ اگر وہ ذرا سا بھی دب سکتی تو اس کی زندگی آرام سے کٹ جاتی۔ لیکن پندرہ سال کی بے اعتنائی بھی اس کی خودداری پر فتح نہ پاسکی۔ اسے جوں ہی یہ خبر ملی۔ اس نے دل میں طے کر لیا کہ یہ شادی میرے جیتے جی نہیں ہوگی۔ ہرگز نہیں ہوگی! وہ نئی بہو کے ساتھ زندگی کی بہار نہیں اڑا سکتے۔ اگر میں رورو کر زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔ تو تم کو بھی یوں ہی جلتے رہنا پڑے گا۔ تم میری چھاتی پر مونگ نہیں دل سکتے۔ اس نے گھر میں کسی سے کچھ نہ کہا۔ والد کو بھی خبر نہ دی۔ آہستہ سے گھر سے نکلی۔ ایک تانگہ کرایہ پر لیا اور سسرال چلی۔ راستہ میں سوچتی جاتی تھی۔ آج اس زندگی کا آخری فیصلہ کر دوں گی۔ دکھلادوں گی کہ آج بھی ہندوستان میں ایسی عورتیں ہیں، جو اپنی بات کے لیے ہنستے ہنستے جان دے دیتی ہیں۔ وہ عیش و آرام کے لیے زندہ نہیں رہتیں۔ بلکہ اپنے دھرم کو پالنے کے لیے۔ اس کی حالت بالکل دیوانوں کی سے ہوگئی تھی۔ کبھی آپ ہی آپ ہنستی۔ کبھی آپ ہی آپ روتی۔ نہ جانے کیا بکتی جاتی تھی۔ اسی بے ہوشی کے عالم میں شوہر کے مکان سے بہت دور نکل گئی۔ جب ہوش آیا، تو تانگے والے سے پوچھا۔ ''یہ کون سا محلہ ہے؟'' بولا۔ ''یہ کٹڑہ ہے۔''

''واہ! تم یہاں کہاں آگئے ۔ مجھے تو سبزی منڈی جانا ہے''۔

''تو آپ نے پہلے کیوں نہ کہا۔ اسی طرف سے تو آیا ہوں۔ کیا آپ کو گھر معلوم نہیں؟''

''مجھے خیال نہ تھا۔''

''کیا سوگئی تھیں مجھے اتنا چکّر پڑا''۔

''بک بک مت کرو۔ ٹانگہ لوٹالو۔''

آدھ گھنٹہ میں ٹانگہ دیوکی ناتھ کے دروازے پر جا پہنچا۔

(3)

برات تیار تھی، دولھا پھولوں سے سجے ہوئے موٹر پر بیٹھ چکا تھا۔ باجے بج رہے تھے۔ یہ تماشا دیکھ کر پھول وتی کے سینہ پر سانپ سالوٹنے لگا۔ جی میں آیا کنوئیں میں کود پڑوں۔ تاکہ زندگی کا خاتمہ ہوجائے۔ جب اپنا کوئی پرساں ہی نہیں، تو اس زندگی سے موت کہیں اچھی۔ پہلے یہ خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی ان کی چھاتی پر مونگ دلوں۔ انھیں دکھا کر کسی سے شادی کر لوں۔ پھر دیکھوں یہ حضرت کیا کر لیتے ہیں میرا؟ مگر اس خیال کو اس نے دل سے نکال دیا۔ نہیں، میں عورتوں کے نام کو داغ نہیں لگاؤں گی۔ اپنے خاندان کو بدنام نہ کروں گی۔ مگر ان حضرات کو برات لے کر جانے نہ دوں گی۔ چاہے میری جان ہی کیوں نہ جائے۔ موٹر نے ہارن بجایا۔ اور چلا ہی چاہتی تھی' کہ پھول وتی ٹانگے سے اتر پڑی۔ اور آکر موٹر کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

دیوکی ناتھ اسے دیکھتے ہی جل بھن کر خاک ہوگئے۔ بولے۔'' تم یہاں کیوں آئیں؟ تمھیں یہاں کس نے بلایا؟''

پھول وتی نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔''مجھے نیوتے کی ضرورت نہ تھی۔''

دیوکی ناتھ۔ ''ہٹ جاؤ۔ میرے سامنے سے۔ میں تمھاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔''

پھول وتی۔'' تم شادی کرنے نہیں جاسکتے۔''

دیوکی ناتھ۔'' مجھے تم روک لوگی؟''

پھول وتی۔'' یا تو روک لوں گی یا اپنی جان دے دوں گی۔''

دیوکی ناتھ۔'' اگر جان دینا چاہتی ہو تو کنویئں میں کود پڑو۔ یازہر کھالو۔ اس پر بھی صبر نہ آئے تو دوسری شادی کرلو۔ یا کسی کو لے کر نکل جاؤ۔ میں تمھیں نہیں روکتا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں زبان تک نہ ہلاؤں گا۔ میرے پیچھے کیوں پڑتی ہو؟ میں نے تمھارے لیے آدھی زندگی تلخ کر دی۔ اب مجھ میں ضبط کی طاقت نہیں ہے۔ میرا

کہنا مانو۔ راستہ سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ میں موٹر چلادوں گا۔"

پھول وتی۔" میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ مجھے پیروں تلے روند کر تم جاسکتے ہو۔"

دیو کی ناتھ۔" تم کیا چاہتی ہو۔ میں ساری زندگی تمھارے نام کو روندتا رہوں۔ جو عورت اپنے شوہر سے دشمنی کرے۔ اس کی صورت دیکھنا گناہ ہے۔"

پھول وتی۔" میں تمھیں اپنی صورت دکھانے نہیں آئی ہوں۔"

دیو کی ناتھ۔" تو پھر تریا چرتر کیوں کرتی ہو۔ کیوں نہیں کسی طرف اپنا منہ کالا کر لیتی۔ میں ایسی عورتوں کے چرتر خوب جانتا ہوں۔"

پھول وتی نے خون آب آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ "ذرا زبان سنبھال کر باتیں کرو۔ ورنہ میری آہ پڑ جائے گی۔ میں اور سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ تحقیر برداشت نہیں کر سکتی"۔

دیو کی ناتھ نے گردن ہلا کر کہا۔ "ایسی ہی تو بڑی عصمت مآب ہو"۔

پھول وتی۔ "جو خود بے وفا ہیں۔ انھیں دوسروں سے وفا کی امید رکھنے کا کوئی حق نہیں۔"

دیو کی ناتھ فوراً موٹر پر سے اتر آئے۔ بولے۔ "سامنے سے ہٹے گی یا نہیں؟"

پھول وتی نے مستقل انداز سے کہا۔ نہیں۔"

دیوکی ناتھ دانت پیس کر بولے۔ "ہٹ جا، نہیں تو میں کچل دوں گا۔ اور ساری شیخی دھری رہ جائے گی۔"

پھول وتی۔ "تمھیں اختیار ہے۔ جو چاہو کرو۔ میں نے ایک بار کہہ دیا۔ میں سب کچھ برداشت کرسکتی ہوں۔ تحقیر نہیں برداشت کر سکتی۔"

دیو کی ناتھ۔" میں پھر سمجھائے دیتا ہوں کہ ہٹ جا۔ نہیں تو میں کچل دوں گا۔ گدھی کہیں کی۔"

پھول وتی... "میں دل میں ٹھان کر آئی ہوں کہ میرے جیتے جی تم چین نہ کرنے پاؤ گے۔"

دیو کی ناتھ۔" میں نے کہہ تو دیا جا کر کسی سے اپنی شادی کر لے۔ مجھ سے دستبرداری لکھالے۔ میں نہیں چاہتا کہ تو میرے نام کو روئے۔"

پھول وتی۔ ''میری شادی تو اب بھگوان کے گھر ہوگی۔ لیکن جیتے جی یہ ستم برداشت نہیں کر سکتی۔''

دیو کی ناتھ اب ضبط نہ کر سکے۔ ڈرائیور سے بولے۔

''چلا دو موٹر۔ جو کچھ ہوگا۔ دیکھا جائے گا۔ مجھ پر دھونس جمانے چلی ہے۔''

ڈرائیور نے موٹر چلانے سے انکار کیا۔ وہ ایک عورت پر دیدہ و دانستہ موٹر چلا کر اپنی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ زندہ رہے گا تو بھیک مانگ کھائے گا۔ ایسی نوکری اسے منظور نہیں۔ وہ موٹر سے اُتر کر چل دیا۔

پھول وتی نے تازیانہ جمایا۔ ''تم مجھے موت سے کیا دھمکاتے ہو۔ موت سے وہ ڈرے جسے عیش و آرام کی آرزو ہو۔ یہاں تو مرنے کے لیے تیار ہو کر آئی ہوں۔ زندہ رہ کر مجھے کرنا ہی کیا ہے؟ رونے سے جی بھر گیا، اب اس کی خواہش نہیں ہے۔''

دیوکی ناتھ کا غصہ طیش کی حد تک جا پہنچا۔ جب انسان کی قوت تمیز سلب ہو جاتی ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ اتنے آدمیوں کے روبرو ایک عورت کے ہاتھوں وہ خفیف نہ ہونا چاہتا تھا۔ سفاکانہ عزم کے ساتھ ہارن بجایا۔

پھول وتی ایک بار چونک پڑی۔ اور فطری حفظِ بقا کے زیرِ اثر ایک قدم ہٹ گئی۔ مگر فوراً سنبھل کر پھر موٹر کے سامنے آئی اور لیٹ گئی اس کے ترکش کا یہ آخری تیر تھا۔

دوبارہ ہارن بجا۔

پھول وتی نے جنبش نہ کی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا، گویا دل بیٹھا جاتا ہے۔

موٹر نے تیسری بار ہارن بجایا اور ایک شانِ فرعونیت کے ساتھ چل پڑا۔ ایک چیخ کی آواز سُن پڑی۔ اور موٹر آگے نکل گیا۔

پھول وتی کا تن نازک زمین پر پڑا ہوا ستار کے چوٹ کھائے ہوئے تاروں کی طرح کانپ رہا تھا۔ جس نے کبھی شوہر کا ایک کلمہ سخت نہیں برداشت کیا۔ وہ آج کیا یہ تحقیر برداشت کر سکتی تھی؟

(4)

نظارہ اتنا دردناک تھا، اتنا نفرت انگیز، اتنا وحشیانہ، کہ ہزاروں تماشائیوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اجتماعی ذہنیت ہمیشہ انتہا کی طرف مائل ہوتی ہے۔ وہ سب کچھ کر گزرتی ہے جو افراد کے لیے ناقابلِ خیال ہے۔ سیلاب اگر آبادیوں کو غرقاب کرتا ہے، تو زمین کو بھی زرخیز کرتا ہے۔ دریائے تہ نشیں کے سکون میں قوتِ عمل کہاں؟

اس مجمع میں ستم ناروا کے خلاف احتجاج کا ایک سیلاب سا آگیا۔ خونِ بیداد کے لیے مشتعل ہوگیا۔ قانون پر تصرف اس ذہنیت کی خصوصیت ہے۔

صدہا آدمی ایک اندھے جنون کے عالم میں موٹر کی طرف دوڑے دیوکی ناتھ کا ہاتھ پکڑ کر موٹر سے کھینچ لیا، اور خونخوار درندوں کی طرح اس پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے، اور آنِ واحد میں نوشہ اپنی ساری تمنائیں لیے ایک تودۂ استخوان بنا خونی سہرا سر پر رکھے، زمین پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔

دونوں لاشیں آمنے سامنے پڑی تھیں۔ دونوں پر حسرت برس رہی تھی۔ کون قاتل تھا؟ کون مقتول؟

پہر رات گئے دونوں جنازے چلے۔ ڈھول مجیرے کی جگہ آہ و بکا کی گرم بازاری تھی۔

یہ نئی برات تھی!

(یہ افسانہ 'آخری تحفہ' میں شائع ہوا۔ یہی افسانہ ہندی میں 'دو یاترا' کے عنوان سے شورانی دیوی کے نام سے 'ناری ہردے' میں شائع ہوا۔ یہ 'اپراپیہ ساہتیہ' میں ہے۔)

غم نداری بُز بخر

ان دنوں دودھ کی تکلیف تھی۔ کئی ڈیری فارموں کی آزمائش کی، اہیروں کا امتحان لیا، کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ دو چار دن تو دودھ اچھا ملتا۔ پھر آمیزش شروع ہو جاتی۔ کبھی شکایت ہوتی دودھ پھٹ گیا۔ کبھی اس میں سے ناگوار بُو آنے لگتی، کبھی کبھی مکھن کے ریزے نکلتے۔ آخر ایک دن ایک دوست سے کہا۔ ''بھئی، آؤ ساجھے میں ایک گائے لے لیں۔ تمھیں بھی دودھ کا آرام ہو جائے گا، مجھے بھی، لاگت آدھی آدھی، خرچ آدھا آدھا، دودھ بھی آدھا آدھا۔ دوست صاحب راضی ہوگئے۔ میرے گھر میں جگہ نہ تھی اور گوبر وغیرہ سے مجھے نفرت ہے۔ ان کے مکان میں کافی جگہ تھی۔ اس لیے تجویز ہوئی کہ گائے انھیں کے گھر رہے۔ اس کے عوض انھیں گوبر پر بلا شرکتِ غیر اختیار ہے۔ وہ اسے کامل آزادی سے پاتھیں، اُپلے بنائیں، گھر لیپیں، پڑوسیوں کو دیں یا اسے کسی طبی مصرف میں لائیں۔ منمقر کو اس میں کسی قسم کا اعتراض، احتجاج یا قیل و قال نہ ہوگا، اور منمقر بہ صحت ہوش وحواس و بہ اصابت عقل اقرار کرتا ہے کہ وہ گوبر پر کبھی دست تصرف دراز نہ کرے گا اور نہ کسی کو تصرف کے لیے آمادہ کرے گا۔

دودھ آنے لگا روز روز کی ضیق سے نجات ملی۔ ایک ہفتہ تک کسی قسم کی شکایت نہ پیدا ہوئی۔ گرم گرم دودھ پیتا تھا اور خوش ہو کر گاتا تھا۔

رب کا شکر ادا کر بھائی　　جس نے ہماری گائے بنائی

تازہ دودھ پلایا اس نے　　لطفِ حیات چکھایا اس نے

دودھ میں بھیگی روٹی میری　　اس کے کرم نے بخشی سیری

خدا کی رحمت کی ہے مورت　　کیسی بھولی بھالی صورت

مگر رفتہ رفتہ یہاں بھی پرانی شکایتیں پیدا ہونے لگیں۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ دودھ صرف نام کا دودھ رہ گیا۔ کتنا ہی اُبالو، نہ کہیں ملائی کا پتہ نہ مٹھاس کا۔ پہلے تو

شکایت کر لیا کرتا تھا۔ اس سے دل کا بخار نکل جاتا تھا۔ شکایت سے اصلاح نہ ہوئی تو دودھ بند کر دیتا تھا۔ اب تو شکایت کا بھی موقع نہ تھا۔ بند کر دینے کا تو ذکر ہی کیا۔ قہر درویش بر جانِ درویش۔ پیو یا نالی میں ڈال دو۔ آٹھ روز کا نسخہ نوشتہ قسمت تھا۔ بچہ دودھ کو منہ نہ لگاتا، پینا تو دور رہا۔ آدھوں آدھ شکر ڈال کر کچھ دنوں دودھ پلایا تو پھوڑے نکلنے شروع ہوئے اور میرے گھر میں روز بم چخ مچی رہتی تھی۔ بیوی نوکر سے فرماتیں ''دودھ لے جا کر انھیں کے سرپٹک آ۔'' میں نوکر کو منع کرتا۔ وہ کہتیں ''اچھے دوست ہیں تمھارے، اسے شرم نہیں آتی۔ کیا اتنا احمق ہے کہ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ یہ لوگ دودھ دیکھ کر کیا کہیں گے؟ گائے کو اپنے گھر منگوا لو، بلا سے بدبو آئے گی۔ مچھر ہوں گے، دودھ تو اچھا ملے گا۔ روپے خرچ ہیں تو اس کی لذّت تو ملے گی۔'' چڈھا صاحب میرے پرانے مہربان ہیں، خاصی بے تکلفی ہے۔ ان سے یہ حرکت ان کے علم میں ہوتی ہو اسے قیاس باور نہیں کرتا۔ یا تو ان کی بیوی کی شرارت ہے یا نوکر کی۔ لیکن ذکر کیسے کروں اور پھر ان کی بیوی سے بھی تو راہ و رسم ہے۔ کئی بار میرے گھر آچکی ہیں۔ میری دیوی جی بھی ان کے ہاں کئی بار مہمان جا چکی ہیں۔ کیا وہ یکایک اتنی بے وقوف ہو جائیں گی۔ صریح آنکھوں میں دھول جھونکیں گی اور پھر چاہے کسی کی شرارت ہو، میرے لیے یہ غیر ممکن تھا کہ ان سے دودھ کی خرابی کی شکایت کرتا۔ خیرت یہ ہوئی کہ تیسرے مہینے چڈھا کا تبادلہ ہو گیا۔ میں تنہا گائے نہ رکھ سکتا تھا۔ ساجھا ٹوٹ گیا۔ گائے آدھے داموں میں بیچ دی گئی۔ میں نے اس دن اطمینان کا سانس لیا۔

آخر یہ صلاح ہوئی کہ ایک بکری رکھ لی جائے۔ وہ بیچ آنگن میں ایک گوشے میں پڑی رہ سکتی ہے۔ اسے رہنے کے لیے نہ گوالے کی ضرورت ہے، نہ اس کا گوبر اٹھانے، ناند دھونے، چارہ بھوسا ڈالنے کے لیے کسی اہیرن کی ضرورت۔ بکری تو میرا ملازم بھی آسانی سے دوہ لے گا۔ تھوڑی سی چوکر ڈال دی، چلیے قصہ تمام ہوا۔ پھر بکری کا دودھ مفید بھی زیادہ ہے۔ بچوں کے لیے خاص طور پر زود ہضم، معتدل صحت بخش۔ حسن اتفاق سے میرے یہاں جو پنڈت جی میرے مسودے نقل کرنے آیا کرتے تھے، ان معاملات میں کافی تجربہ کار تھے۔ ان سے ذکر آیا تو انھوں نے ایک بکری کی ایسی قصیدہ خوانی کی کہ میں اس کا نا دیدہ عاشق ہو گیا۔ پچھائیں نسل کی بکری ہے، اونچے قد کی۔ بڑے

بڑے تھن، جو زمین سے لگتے چلتے ہیں۔ بے حد کم خور، لیکن بے حد دودھار۔ ایک وقت میں دو ڈھائی سیر دودھ لے لیجیے۔ ابھی پہلی مرتبہ ہی بیائی ہے، 25 روپے میں آجائے گی۔ مجھے دام کچھ زیادہ معلوم ہوئے لیکن پنڈت جی پر مجھے اعتبار تھا۔ فرمائش کر دی گئی اور تیسرے دن بکری آپہنچی۔ میں دیکھ کر اچھل پڑا۔ جو اوصاف بیان کیے گئے تھے ان سے کچھ زیادہ ہی نکلے۔ ایک چھوٹی سی مٹی کی ناند منگوائی گئی۔ چوکر کا بھی انتظام ہوگیا۔ شام کو میرے خدمت گار نے دودھ نکالا۔ تو سچ مچ ڈھائی سیر۔ میری چھوٹی پتیلی لبریز ہوگئی تھی۔ اب موسلوں ڈھول بجائیں گے۔ یہ مسئلہ اتنے دنوں کے بعد جا کے کہیں حل ہوا ہے۔ پہلے ہی یہ بات سوجھتی تو کیوں اتنی پریشانی ہوتی۔ پنڈت جی کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ مجھے علی الصبح اور شام کو سینگ پکڑنے پڑتے تھے تب آدمی دودھ نکالتا تھا۔ لیکن یہ تکلیف اس دودھ کے مقابلے میں کچھ نہ تھی۔ بکری کیا ہے کام دھین ہے۔ بیوی نے سوچا اسے کہیں نظر نہ لگ جائے۔ اس لیے اس کے تھن کے لیے غلاف تیار ہوا۔ اس کی گردن میں نیلے چینی کے دانوں کی ایک مالا پہنائی گئی۔ گھر میں جو کچھ جھوٹا بچتا دیوی جی خود جا کر اسے کھلا آتی تھیں۔

لیکن ایک ہفتے میں دودھ کی مقدار کم ہونے لگی۔ ضرور نظر لگ گئی، بات کیا ہے پنڈت جی سے حال کہا تو انھوں نے کہا۔ ''صاحب دیہات کی بکری ہے۔ زمیندار کی! بے دریغ اناج کھاتی تھی اور سارے دن باغ میں گھوما چرا کرتی تھی۔ یہاں بندھے بندھے دودھ کم ہو جائے تو تعجب نہیں۔ اسے ذرا ٹہلا دیا کیجیے۔''

لیکن شہر میں بکری کو ٹہلائے کون اور کہاں؟ اس لیے یہ طے ہوا کہ مضافات میں مکان لیا جائے۔ وہاں بستی سے ذرا نکل کر کھیت اور باغ ہوں گے۔ کہار گھنٹے دو گھنٹے ٹہلایا کرے گا۔ جھٹ پٹ مکان تبدیل کیا اور ہر چند مجھے دفتر آنے جانے میں تین میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اچھا دودھ ملے تو میں اس کا دوگنا فاصلہ طے کرنے کو تیار۔ یہاں مکان کشادہ تھا۔ مکان کے سامنے صحن تھا ذرا اور بڑھ کر آم اور مہوے وغیر کا باغ۔ باغ سے نکلیے تو کاچھیوں کے کھیت تھے۔ کسی میں آلو، کسی میں گوبھی۔ ایک کاچھی سے طے کر لیا کہ روزانہ بکری کے لیے ہریالی دے جایا کرے، مگر اتنی کوشش کرنے پر بھی دودھ کی مقدار میں کوئی خاصی بیشی نہ ہوئی۔ ڈھائی سیر کی جگہ مشکل سے

سیر بھر دودھ نکلتا تھا۔ لیکن یہ تسکین تھی کہ دودھ خالص ہے۔ یہی کیا کم ہے۔

میں یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ خدمت گاری کے مقابلے میں بکری چرانا زیادہ ذلیل کام ہے۔ ہمارے دیوتاؤں اور نبیوں کا نہایت معزز طبقہ گلہ بانی کیا کرتا تھا۔ کرشن جی گائیں چراتے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس گلّے میں بکریاں نہ رہی ہوں گی۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت محمدؐ دونوں ہی بھیڑیں چراتے تھے۔ لیکن انسان روایات کا غلام ہے۔ جو بزرگوں نے نہیں کیا اسے وہ کیسے کرے۔ نئے راستے پر چلنے کے لیے جس عزم اور پختہ یقین کی ضرورت ہے وہ ہر ایک میں تو ہوتا نہیں۔ دھوبی آپ کے غلیظ کپڑے دھوئے گا لیکن آپ کے دروازے پر جھاڑو لگانے میں اپنی ہتک سمجھتا ہے۔ جرائم پیشہ اقوام کے فرد بازار سے کوئی چیز قیمتاً خریدنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ میرے خدمت گار کو بکری لے کر باغ میں جانا بُرا معلوم ہوتا تھا۔ گھر سے تو لے جاتا لیکن باغ میں اُسے چھوڑ کر خود کسی درخت کے نیچے سو جاتا۔ بکری پتیاں چر لیتی تھی۔ مگر ایک دن اس کی جی میں آیا کہ ذرا باغ سے نکل کر کھیتوں کی سیر کرے۔ یوں وہ بہت ہی شستہ مزاج اور وضع دار بکری تھی۔ اس کی صورت سے متانت اور تحمل جھلکتا تھا۔ لیکن باغ اور کھیت میں اسے یکساں آزادی نہیں ہے۔ اسے وہ شاید نہ سمجھ سکی۔ ایک روز کسی کھیت میں گھس گئی اور گوبھی کی کئی کیاریاں صاف کر گئی۔ کاچھی نے دیکھا تو اس کے کان پکڑ لیے اور میرے پاس آکر بولا۔ ''بابو جی! اس طرح آپ کی بکری ہمارے کھیت چرے گی تو ہم تو تباہ ہو جائیں گے۔ آپ کو بکری رکھنے کا شوق ہے تو اسے باندھ کر رکھیے۔ آج تو ہم نے تمھارا لحاظ رکھ لیا، لیکن پھر ہمارے کھیت میں گئی تو ہم یا تو اس کی ٹانگ توڑ دیں گے یا کانجی ہاؤس میں بھیج دیں گے۔'' ابھی وہ اپنی تقریر ختم نہ کرنے پایا تھا کہ اس کی بیوی آپہنچی اور اس نے اسی خیال کو زیادہ پُر زور الفاظ میں ادا کیا۔ ''ہاں ہاں کرتی رہی۔ مگر رانڈ کھیت میں گھس گئی اور سارا کھیت چوپٹ کر دیا۔ اس کے پیٹ میں بھوانی بیٹھیں، یہاں کوئی تمھارا دبیل نہیں ہے۔ حاکم ہوگے، اپنے گھر کے ہوگے۔ بکری رکھنا ہے تو باندھ کر رکھو۔ نہیں تو گلا اینٹھ دوں گی۔'' میں بھیگی بلی بنا ہوا کھڑا تھا۔ جتنی پھٹکار آج سہنی پڑی اتنی زندگی میں کبھی نہ سہی تھی۔ اور جس تحمل سے آج کام لیا اگر اس سے دوسرے موقعوں پر کام لیا ہوتا تو آج آدمی ہوتا۔ کوئی جواب ہی نہ سوجھتا تھا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ

بکری کا گلا گھونٹ دوں اور خدمت گار کے ڈیڑھ سو ہنٹر جماؤں۔ میری خاموشی سے وہ خاتون اور بھی شیر ہوتی جاتی تھی۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ بعض موقعوں پر خاموشی مضر ثابت ہوتی ہے۔ میری اہلیہ نے گھر میں یہ غل گپاڑہ سنا تو دروازے پر آگئیں۔ اور ہیکڑی سے بولیں۔

''تو کانجی ہاؤس پہنچا دے او رکیا کرے گی ناحق بڑ بڑ کر رہی ہے گھنٹے بھر سے، جانور ہی ہے ایک دن کھل گئی تو کیا اس کی جان لے گی۔ خبردار جو اب ایک بات بھی منہ سے نکالی۔ کیوں نہیں کھیت کے چاروں طرف جھاڑ لگا دیتی۔ کانٹوں سے روندھ دے۔ اپنی غلطی تو مانتی نہیں۔ اوپر سے لڑنے آتی ہے۔ ابھی پولس کو اطلاع کر دیں تو بندھے پھرو۔''

اس تحکمانہ اندازِ بیان نے ان دونوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ لیکن ان دونوں کے چلے جانے کے بعد میں نے دیوی جی کی خوب خبر لی۔ ''غریبوں کا نقصان بھی کرتی ہو۔ اوپر سے رعب جماتی ہو۔ اسی کا نام انصاف ہے؟ دیوی جی نے انداز تفاخر سے جواب دیا۔ ''میرا احسان تو نہ مانوگے کہ شیطان کو کتنی آسانی سے دفع کر دیا، لگے الٹے ڈانٹنے۔ گنواروں کو راہ پر لانے کا سختی کے سوا دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔ شرافت یا فیاضی ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اسے یہ لوگ کمزوری سمجھتے ہیں اور کمزور کو کون نہیں دبانا چاہتا؟''

خدمت گار سے جواب طلب کیا تو اس نے صاف کہہ دیا۔ ''صاحب بکری چرانا میرا کام نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم سے بکری چرانے کو کون کہتا ہے۔ ذرا اسے دیکھتے رہا کرو کہ کسی کھیت میں نہ جائے۔ اتنا بھی تم سے نہیں ہو سکتا۔''

''میں بکری نہیں چرا سکتا صاحب! کوئی دوسرا آدمی رکھ لیجیے۔''

آخر میں نے خود شام کو اسے باغ میں چرانے کا فیصلہ کیا۔ اتنے ذرا سے کام کے لیے ایک نیا آدمی رکھنا میری حیثیت سے باہر تھا اور اپنے خدمت گار کو بھی جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ جس نے کئی سال تک وفاداری سے میری خدمت کی تھی اور ایمان دار تھا۔ دوسرے دن میں دفتر سے ذار جلد چلا آیا اور چٹ پٹ بکری کو لے کر باغ میں جا پہنچا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ درختوں کے نیچے سوکھی پتیاں گری

ہوئی تھیں۔ بکری پتیوں پر ٹوٹی پڑتی تھی، گویا مہینوں کی بھوکی ہو۔ ابھی اس درخت کے نیچے تھی۔ ایک پل میں وہاں جا پہنچی۔ اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا۔ دفتر سے لوٹ کر ذرا آرام کیا کرتا تھا۔ آج یہ قواعد کرنا پڑی، تھک گیا مگر محنت سپھل ہوگئی۔ آج بکری نے کچھ زیادہ دودھ دیا۔

یہ خیال آیا اگر سوکھی پتیاں کھانے سے دودھ کی مقدار بڑھ گئی تو یقیناً ہری پتیاں کھلائی جائیں تو اس سے کہیں بہتر نتیجہ نکلے۔ لیکن ہری پتیاں آئیں کہاں سے؟ درختوں سے توڑوں تو باغ کا مالک ضرور اعتراض کرے گا۔ قیمتاً ہری پتیاں مل نہ سکتی تھیں۔ سوچا کیوں نہ ایک بار بانس کے لگّے سے پتیاں توڑیں۔ مالک نے شور مچایا تو اس سے منتیں کرلیں گے۔ راضی ہوگیا تو خیر، نہیں تو دیکھا جائے گا۔ تھوڑی سی پتیاں توڑ لینے سے درخت کا کیا بگڑا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک پڑوسی سے ایک پتلا لمبا بانس مانگ کر لایا۔ اس میں ایک انکس باندھا اور شام کو بکری کو ساتھ لے کر پتیاں توڑنے لگا۔ چور آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا جاتا تھا۔ کہیں مالک تو نہیں آرہا ہے۔ دفعتاً وہی کاچھی ایک طرف سے آنکلا اور مجھے پتیاں توڑتے دیکھ کر بولا۔ ''یہ کیا کرتے ہو بابوجی! آپ کے ہاتھ میں یہ لگّا اچھا نہیں لگتا۔ بکری پالنا ہم گریبوں کا کام ہے کہ آپ جیسے سریفوں کا۔'' میں کٹ گیا۔ کچھ جواب نہ سوجھا۔ اس میں کیا برائی ہے اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرنے میں کیا شرم، وغیرہ جوابات ہلکے، بے حقیقت، مصنوعی معلوم ہوئے۔ سفید پوشانہ خودداری نے زبان بند کر دی۔ کاچھی نے قریب آکر میرے ہاتھ سے لگّا لے لیا اور آنِ واحد میں ہری پتیوں کا ڈھیر لگا دیا۔ پوچھا۔ ''پتیاں کہاں رکھ آؤں۔''

میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''تم رہنے دو۔ میں اٹھا لے جاؤں گا۔''

اس نے تھوڑی سی پتیاں بغل میں اٹھا لیں اور بولا۔ ''آپ کیا پتیاں رکھنے جائیں گے۔ چلیے میں رکھ آؤں۔''

میں نے برآمدے میں پتیاں رکھوا دیں۔ اسی درخت کے نیچے اس کی چوگنی پتیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کاچھی نے ان کا ایک گٹھا بنایا اور سر پر لاد کر چلا گیا۔ اب مجھے معلوم ہوا یہ دہقان کتنے چالاک ہوتے ہیں۔ کوئی بات مطلب سے خالی نہیں۔

مگر دوسرے دن بکری کو باغ میں لے جانا میرے لیے دشوار ہوگیا۔ کاچھی پھر

دیکھے گا اور نہ جانے کیا کیا فقرے چست کرے۔ اس کی نظروں میں گر جانا رو سیاہ ہو جانے سے کم شرمسار نہ تھا۔ ہماری عزت و توقیر کا جو معیار عوام نے قائم کر رکھا ہے، ہم کو اس کا احترام کرنا پڑے گا۔ نکّو بن کر رہے تو کیا رہے۔

لیکن بکری اتنی آسانی سے آزادانہ چہل قدمی سے دست بردار ہونا نہ چاہتی تھی جسے اس نے اپنا معمول سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ شام ہوتے ہی اس نے اتنے زور شور سے صدائے احتجاج بلند کی کہ گھر میں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ گٹکری دار مَیں مَیں کی پیہم آوازیں آ آکر کان کے پردوں کو مجروح کرنے لگیں۔ کہاں بھاگ جاؤں؟ بیوی نے اسے گالیاں دینا شروع کیں۔ میں نے غصہ میں آکر کئی ڈنڈے رسید کیے۔ مگر اس نے ستیہ گرہ ملتوی کرنا تھا نہ کیا۔ عجیب عذاب میں جان تھی۔

آخر مجبور ہوگیا۔ ''خود کردہ را علاجے نیست، آٹھ بجے رات جاڑوں کے دن، گھر سے باہر منھ نکالنا مشکل اور میں بکری کو باغ میں ٹہلا رہا تھا اور اپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔ اندھیرے میں پاؤں رکھتے میری روح کانپتی ہے۔ ایک بار میرے سامنے سے ایک سانپ نکل گیا تھا۔ اگر اس کے اوپر پَیر پڑ جاتا تو ضرور کاٹ لیتا۔

تب سے میں اندھیرے میں کبھی نہ نکلتا تھا، مگر آج اس بکری کے کارن مجھے اس خطرے کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ذرا بھی ہوا چلتی اور پتّے کھڑکتے تو میری آنتیں سکڑ جاتیں اور پنڈلیاں کانپنے لگتیں۔ شاید اس جنم میں میں بکری رہا ہوں گا اور یہ بکری میری آقا رہی ہوگی۔ وہی کفارہ اس زندگی میں ادا کر رہا تھا۔ بُرا ہوا اس پنڈت کا جس نے یہ بلا میرے سر منڈھی۔ گرہستی ہی جنجال ہے۔ بچّہ نہ ہوگا تو کیوں اس موذی جانور کی اتنی خوشامد کرنی پڑتی اور یہ بچہ بڑا ہو جائے گا تو بات نہ سنے گا۔ آپ نے میرے لیے کیا کیا ہے، کون سی جائیداد چھوڑی ہے۔ یہ سزا بھگت کر نو بجے رات کو لوٹا۔ اگر رات کو بکری مر جاتی تو مجھے مطلق غم نہ ہوتا۔

دوسرے دن صبح ہی سے مجھے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کسی طرح رات کی بیگار سے چھٹی ملے۔ آج دفتر میں تعطیل تھی میں نے ایک لمبی سی رسّی منگوائی اور شام کو بکری کے گلے میں رسی ڈال ایک درخت کی جڑ سے باندھ کر چھوڑ دیا۔ اب چرے جتنا چاہے۔ اب چراغ جلتے جلتے کھول لاؤں گا۔ تعطیل تھی ہی، شام کو سنیما دیکھنے کی ٹھہری ایک اچھا

سا کھیل آیا ہوا تھا۔ نوکر کو بھی ساتھ لیا، ورنہ بچّے کو کون سنبھالتا۔ جب نو بجے رات کو گھر لوٹے اور میں لالٹین لے کر بکری لینے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس نے رسّی کو دو تین درختوں میں لپیٹ کر ایسا الجھا ڈالا ہے کہ سلجھنا مشکل ہے۔ اتنی رسّی بھی نہ بچی کہ وہ ایک قدم بھی چل سکتی، لاحول ولا قوۃ! جی میں آیا کہ کم بخت کو یہیں چھوڑ دوں۔ مرتی ہے تو مر جائے۔ اب اتنی رات کو لالٹین کی روشنی سے کون رسی سلجھانے بیٹھے۔ لیکن دل نہ مانا پہلے اس کی گردن سے رسّی کھولی۔ پھر اس کی پیچ در پیچ اینٹھن چھڑائی، ایک گھنٹہ وقت صرف ہوگیا۔ مارے سردی کے ہاتھ ٹھٹھرے جاتے تھے۔ اور جی جل رہا تھا وہ الگ، یہ ترکیب اور بھی تکالیف دہ ثابت ہوئی۔

اب کیا کروں! کچھ عقل کام نہ کرتی تھی۔ دودھ کا خیال نہ ہوتا تو کسی کو مفت دے دیتا۔ شام ہوتے ہی چڑیل اپنی صدائے بے ہنگام شروع کر دے گی اور گھر میں رہنا مشکل ہو جائے گا، اور آواز بھی کتنی کریہہ اور منحوس ہوتی ہے۔ شاستروں میں لکھا بھی ہے جتنی دور اس کی آواز جاتی ہے اتنی دور دیوتا نہیں آتے۔ سورگ کی بسنے والی ہستیاں جو اپسراؤں کے نغمے سننے کی عادی ہیں اس کی مکروہ آواز سے نفرت کریں تو کیا تعجب، مجھ پر اس کی سمع خراش صداؤں کی ایسی ہیبت سوار تھی کہ دوسرے دن دفتر سے آتے ہی میں گھر سے نکل بھاگا، لیکن ایک میل نکل جانے پر بھی ایسا گمان ہو رہا تھا کہ اس کی آواز میرا پیچھا کیے چلی آتی ہے۔ اپنی تنگ ظرفی پر شرم بھی آرہی تھی، جسے ایک بکری رکھنے کی بھی توفیق نہ ہو وہ اتنا نازک دماغ کیوں بنے اور پھر تم ساری رات تو گھر سے باہر رہوگے نہیں۔ آٹھ بجے پہنچوگے تو کیا وہ گوسفندانہ نغمہ تمھارا خیر مقدم نہ کرے گا۔

دفعتاً ایک نیچی شاخوں والا درخت دیکھ کر مجھے بے اختیار اس پر چڑھنے کی تحریک ہوئی۔ سپاٹ تنوں پر چڑھنا مشکل ہوتا ہے، یہاں تو 7-6 فٹ کی اونچائی پر شاخیں پھوٹ گئیں تھیں۔ ہری ہری پتیوں سے درخت لدا کھڑا تھا اور درخت بھی تھا گولر کا جس کی پتیوں سے بکریوں کو خاص رغبت ہے۔ میں ادھر تیس سال سے کسی روکھ پر نہیں چڑھا، وہ عادت جاتی رہی اس لیے آسان چڑھائی کے باوجود میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔ پر میں نے ہمت نہ ہاری اور پتیاں توڑ توڑ کر نیچے گرانے لگا۔ یہاں اکیلے میں

کون مجھے دیکھتا ہے کہ پتیاں توڑ رہا ہوں۔ ابھی اندھیرا ہوا جاتا ہے۔ پتیوں کا ایک گٹھر بغل میں دباؤں گا اور گھر جا پہنچوں گا۔ اگر اتنے پر بھی بکری نے کچھ چیں چپڑ کی تو اس کی شامت ہی آجائے گی۔

میں ابھی اوپر ہی تھا کہ بکریوں اور بھیڑوں کا ایک غول نہ جانے کدھر سے آنکلا اور پتیوں پر پل پڑا۔ میں اوپر سے چیخ رہا ہوں، مگر کون سنتا ہے۔ چرواہے کا کہیں پتہ نہیں۔ کہیں دبک رہا ہوگا کہ دیکھ لیا جاؤں گا تو گالیاں پڑیں گی، جھلا کر نیچے اترنے لگا۔ ایک ایک پل میں پتیاں غائب ہوتی جاتی تھیں۔ اتر کر ایک ایک کی ٹانگ توڑ دوں گا۔

یکا یک پاؤں پھسلا او رمیں دس فٹ کی اونچائی سے نیچے آرہا۔ کمر میں ایسی چوٹ آئی کہ پانچ منٹ تک آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ خیریت ہوئی کہ اور اوپر سے نہیں گرا، نہیں تو یہیں شہید ہو جاتا۔ بارے میرے گرنے کے دھماکے سے بکریاں بھاگیں۔ اور تھوڑی سی پتیاں بچ رہیں۔ جب ذرا ہوش بجا ہوئے تو میں نے ان پتیوں کو جمع کر کے ایک گٹھا بنایا اور مجبوروں کی طرح اسے کندھے پر رکھ کر شرم کی طرح چھپائے گھر چلا۔ راستے میں کوئی حادثہ نہ ہوا۔ جب مکان کوئی چار فرلانگ رہ گیا اور میں نے قدم تیز کیے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے تو وہ کاچھی سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ کچھ نہ پوچھو اس وقت میری کیا حالت ہوگی۔ راستے کے دونوں طرف کھیتوں کی اونچی مینڈیں تھیں جن کے اوپر ناگ پھنی کے کانٹے لگے ہوئے تھے۔ اگر رستے رستے جاتا ہوں تو وہ ظالم میری بغل سے ہو کر گزرے گا اور خدا معلوم کیا ستم ڈھائے۔ کہیں مڑنے کا راستہ نہیں اور وہ مردود بلائے بے درماں کی طرح چلا آتا تھا۔ میں نے دھوتی اوپر سرکائی، چال بدل لی۔ اور سر جھکا کر اس طرح نکل جانا چاہتا تھا کہ کوئی مزدور ہے۔ تلے کی سانس تلے تھی، اوپر کی اوپر جیسے وہ کاچھی کوئی خوں خوار شیر ہو۔ بار بار خدا کو یاد کر رہا تھا۔

''یا الٰہی تو ہی آفت زدوں کا والی و مددگار ہے۔ اس مردود کی زبان بند کر دے۔ ایک لمحہ کے لیے اس کی آنکھوں کا نور غائب کردے...'' آہ! دو جاں گسل لمحہ جب میں اس کے برابر ایک گز کے فاصلے سے نکلا۔ ایک ایک قدم تلوار کی دھار پر تھا کہ شیطانی آواز کان میں آئی۔ ''کون ہے رے، کہاں سے پتیاں توڑے لاتا ہے؟''

مجھے معلوم ہوا نیچے کی زمین نکل گئی ہے اور میں اس کے گہرے شکم میں جا پہنچا ہوں۔ روئیں برچھیاں بنے ہوئے تھے، دماغ میں ابال سا آرہا تھا۔ اعضا مفلوج ہو رہے تھے۔ جواب دینے کا ہوش نہ رہا۔ تیزی سے دو تین قدم آگے بڑھ گیا مگر وہ ارادی فعل نہ تھا، حفظ جان کا اضطراری عمل تھا۔ ایک ظالم ہاتھ گٹھے پر پڑا اور گٹھا نیچے گر پڑا۔ پھر مجھے یاد نہیں کیا ہوا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے دروازے پر پسینے میں تر کھڑا تھا۔ گویا مرگی کے دورے کے بعد اٹھا ہوں۔ اس وقفے میں روح پر شعور ثانی کی حکومت تھی اور بکری کی وہ مکروہ آواز، وہ دل خراش آواز، وہ ہمت شکن آواز، وہ دنیا کی ساری نحوستوں کا خلاصہ، وہ دنیا کی ساری لعنتوں کی روح، کان میں چبھی جا رہی تھی۔

بیوی نے پوچھا۔ ''آج کہاں چلے گئے تھے۔ اس چڑیل کو ذرا باغ میں بھی نہ لے گئے۔ جینا محال کیے دیتی ہے۔ گھر سے نکل کر کہاں چلی جاؤں؟''

میں نے تشفی دی۔ ''آج چلا لینے دو۔ کل سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ اسے گھر سے نکال باہر کروں، چاہے قصاب ہی کو دینا پڑے۔''

''اور یہ لوگ نہ جانے کیسے بکریاں پالتے ہیں۔''

''بکری پالنے کے لیے کتے کا دماغ چاہیے۔''

صبح کو بستر سے اٹھ کر اسی فکر میں بیٹھا تھا کہ اس کالی بلا سے کیوں کر نجات حاصل کروں کہ دفعتاً ایک گڈریہ بکریوں کا ایک گلہ چراتا ہوا آنکلا۔ میں نے اسے پکارا اور اس سے اپنی بکری کو چرانے کی تجویز پیش کی۔ گڈریہ راضی ہوگیا، یہی اس کا کام تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا لوگے؟''

''آٹھ آنے بکری ملتے ہیں۔ ہجور۔''

''میں ایک روپیہ دوں گا۔ لیکن بکری میرے سامنے نہ آئے۔''

گڈریہ حیرت میں رہ گیا۔ ''مرکھنی ہے کیا، بابو جی؟''

''نہیں نہیں۔ بہت سیدھی ہے۔ بکری کیا مارے گی لیکن میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔''

''ابھی تو دودھ دیتی ہے۔''

''ہاں! سیر سوا سیر دودھ دیتی ہے۔''

''دودھ آپ کے گھر میں پہنچ جایا کرے گا۔''

''تمھاری مہربانی۔''

جس وقت بکری گھر سے نکلی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری نحوست نکلی جا رہی ہے۔ بکری بھی خوش تھی، گویا قید سے چھوٹی ہو۔

گڈریے نے اسی وقت دودھ نکالا اور گھڑ میں رکھ کر بکری کو لیے چلا گیا۔ ایسا بے غرض گاہک اسے زندگی میں شاید پہلی ہی بار ملا ہوگا۔

ایک ہفتے تک تو دودھ تھوڑا بہت آتا رہا۔ پھر اس کی مقدار کم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ایک مہینہ ختم ہوتے ہوتے دودھ بالکل بند ہوگیا۔ معلوم ہوا بکری گابھن ہوگئی ہے۔ میں نے ذرا بھی اعتراض نہ کیا۔ کاچھی کے پاس گائے تھی۔ اس سے دودھ لینے لگا۔ میرا نوکر خود جا کر دُہا لاتا تھا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ گڈریہ مہینے میں ایک بار آکر اپنا روپے لے جاتا۔ میں نے کبھی اس سے بکری کا ذکر نہ کیا۔ اس کے خیال ہی سے میری روح کو وحشت ہوتی ہے؟ اگر قیافہ شناس ہوتا تو بڑی آسانی سے اپنا حق الخدمت دوگنا کر سکتا تھا۔

ایک دن میں دروازے پر بیٹھا ہوا تھا کہ گڈریہ اپنی بکریوں کا گلہ لیے آنکلا۔ میں اس کا روپیہ لانے اندر گیا کہ کیا دیکھتا ہوں میری بکری دو بچوں کے ساتھ مکان میں آپہنچی۔ وہ پہلے سیدھی اس جگہ گئی جہاں بندھا کرتی تھی۔ پھر وہاں سے آنگن میں آئی اور شاید تعارف کے اظہار کے لیے میری بیوی کی طرف تاکنے لگی۔ انھوں نے دوڑ کر ایک بچے کو گود میں لیا اور کوٹھری میں جا کر مہینوں کا جمع چوکر نکال لائیں اور ایسی محبت سے بکری کو کھلانے لگیں گویا بہت دنوں کی بچھڑی ہوئی سہیلی آگئی ہو۔ نہ وہ پرانی تلخی تھی، نہ وہ کدورت۔ کبھی بچے کو چمکارتی تھیں۔ کبھی بکری کو سہلاتی تھیں اور بکری ڈاک کی رفتار سے چوکر اڑا رہی تھی۔

تب مجھ سے بولیں۔ ''کتنے خوب صورت بچے ہیں!''

''ہاں بہت خوبصورت۔''

''جی چاہتا ہے ایک پال لوں۔''

''ابھی طبیعت سیر نہیں ہوئی۔''

''تم بڑے نرموہئے ہو۔''

چوکر ختم ہوگیا۔ بکری اطمیان سے رخصت ہوگئی۔ دونوں بچے بھی اس کے پیچھے پھدکتے ہوئے چلے گئے۔ دیوی جی آنکھ میں آنسو بھرے یہ تماشا دیکھتی رہیں۔

گڈریے نے چلم بھری اور گھر میں آگ مانگنے آیا۔ چلتے وقت بولا۔ ''کل سے دودھ پہنچا دیا کروں گا، مالک!''

دیو.جی نے کہا۔ ''اور دونوں بچے کیا پئیں گے؟''

''بچے کہاں تک پئیں گے بہو.جی! دو سیر دودھ دیتی ہے۔ ا.جی دودھ اچھا نہ ہوتا تھا اس مارے نہیں لایا۔''

مجھے رات کا وہ روح شکن واقعہ یاد آگیا۔

میں نے کہا۔ ''دودھ لاؤ یا نہ لاؤ تمھاری خوشی، لیکن بکری کو ادھر نہ لانا''

اس دن سے پھر نہ وہ گڈریہ نظر آیا اور نہ وہ بکری اور نہ میں نے سراغ لگانے کی کوشش کی۔ لیکن دیوی جی اس کے بچوں کو یاد کرکے کبھی کبھی آنسو بہا لیتی ہیں۔

(یہ افسانہ 'واردات' میں شائع ہوا۔ ہندی میں یہ 'گپت دھن' نمبر 2 میں بہ عنوان ''کوئی غم نہ ہو تو بکری خرید لو'' شامل ہے۔)

وفا کی دیوی

ماگھ کا مہینہ، صبح کا وقت، ہر دوار میں گنگا کا کنارہ، اشنان کا میلہ، صبح کی زرّیں شعاعوں میں سامنے کی پہاڑیاں نہائی کھڑی ہیں۔ جاتریوں کا اتنا ہجوم ہے کہ کھوئے سے کھوا چھلتا ہے۔ جا بجا سادھو سنتوں اور بھجن گانے والوں کی ٹولیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اس وقت سانگلی کے کنور صاحب اور ان کی رانی اشنان کرنے آئے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کی چھ سال کی لڑکی بھی ہے۔ کنور صاحب کے سر پر جے پوری پگڑی، نیچی اچکن، امر تسری جوتے، بڑی بڑی مونچھیں تناور جسم، رانی گندمی رنگ، نازک بدن، زیوروں سے لدی ہوئی، لڑکی بھی زیور پہنے ہوئے ہے۔ ان کے ساتھ کئی سپاہی، پیادے۔ بھال بلّم لیے۔ وردیاں پہنے چلے آرہے ہیں۔ کئی خدمت گار بھی ہیں۔

یہ لوگ ہجوم کو ہٹاتے دریا کے کنارے پہنچ کر اشنان کرتے ہیں۔ رانی کے اشنان کے لیے چار آدمی پردہ کرتے ہیں۔ لڑکی پانی سے کھیل رہی ہے۔ راجہ صاحب پنڈتوں کو دان دے رہے ہیں، اور لڑکی اپنی کشتی پانی میں تیرا رہی ہے۔ یکا یک کشتی ایک ریلے میں بہہ جاتی ہے۔ لڑکی اسے پکڑنے کے لیے لپکتی ہے۔ اسی وقت آدمیوں کا ایسا ریلا آتا ہے کہ لڑکی ماں باپ سے الگ ہو جاتی ہے۔ کبھی ادھر بھاگنا، کبھی ادھر، بار بار اپنی ماں کو دیکھنے کا دھوکا ہوتا ہے۔ پھر وہ رونے لگتی ہے۔ مارے خوف کے کسی سے کچھ بولتی نہیں۔ نہ راستہ پوچھتی ہے۔ کھڑی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے اور رہ رہ کر اپنی ماں کو پکارتی ہے۔ یکا یک ایک راستہ دیکھ کر اسے قیام گاہ کے راستے کا گمان ہوتا ہے۔ اسی پر ہو لیتی ہے۔ مگر وہ راستہ اسے دھرم شالہ سے دور لیے جارہا ہے۔

ادھر کنور صاحب اور ان کی رانی لڑکی کو نہ پاکر ادھر ادھر تلاش کرنے لگتے ہیں۔ بدحواس ہو کر اپنے ملازموں پر بگڑتے ہیں۔ ملازم لڑکی کی تلاش میں چلے جاتے ہیں۔ رانی ایک چھوٹی لڑکی کو دیکھ کر بے اختیار اس کی طرف دوڑتی ہے۔ مگر جب اپنی غلطی

ظاہر ہوتی ہے، تو آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگتی ہے۔ کنور صاحب غصّہ سے آگ ہورہے ہیں۔ مگر کہیں تلاش کرنے نہیں جاتے۔ ابھی ان کا صافا ٹھیک نہیں ہوا۔ چکن بھی سجل نہیں ہوئی۔ بال بھی نہیں سنوارے جاسکے۔ نوکر تو اب وہاں رہے نہیں۔ تب وہ پنڈتوں پر بگڑتے ہیں اور بالآخر نک سک سے درست ہوکر، کمر میں تلوار لگا کر، لڑکی کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ اسی اثناء میں رانی نے گنگا کے کنارے آکر منت مانی ہے۔ ہجوم کے مارے ایک قدم چلنا مشکل ہے۔ ہجوم بڑھتا جاتا ہے۔ بے چارے غم نصیب ماں باپ دھکے میں کبھی دو قدم آگے بڑھتے ہیں۔ کبھی دس قدم پیچھے چلے جاتے ہیں۔

ادھر لڑکی روتی ہوئی اپنے دھرم شالہ کو پہچاننے کی کوشش کرتی دور چلی جارہی ہے۔

دفعتاً کنور صاحب کو خیال آتا ہے کہ شاید لڑکی دھرم شالے میں پہنچ گئی، اور نوکروں نے اسے پا لیا ہو۔ دونوں فوراً بھیڑ کو ہٹاتے دھرم شالہ کی طرف چلتے ہیں۔ مگر وہاں پہنچ کر دیکھتے ہیں، تو لڑکی کا پتہ نہیں۔ دونوں پھر گھبرا کر نکل پڑتے ہیں۔ دل لگی یہ ہے کہ آگے آگے لڑکی روتی چلی جاتی ہے۔ پیچھے پیچھے ماں باپ اس کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ بیچ میں صرف بیس گز کا فاصلہ ہے، مگر دونوں میں مڈبھڑ نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ گھنٹوں گزر جاتے ہیں۔ بادل گھر آتا ہے۔ رانی تھک جاتی ہے۔ اس سے ایک قدم بھی نہیں چلا جاتا۔ وہ سڑک کے کنارے بیٹھ جاتی ہے اور رونے لگتی ہے۔ کنور صاحب لال لال آنکھیں نکالے، حواس باختہ، ساری دنیا پر جھلائے ہوئے ہیں۔

راج کماری مایوس ہوکر پھر ہر دوار گھاٹ کی طرف چلتی ہے اور ماں باپ کے سامنے سے نکل جاتی ہے۔ مگر دونوں کی نگاہیں دوسری طرف ہیں۔ آنکھیں چار نہیں ہوتیں۔

اتنے میں ایک جٹا دھاری مہاتما کندھے پر مرگ چھالا ڈالے، طنبورہ ہاتھ میں لیے چلے آرہے ہیں۔ راج کماری کو گھبرایا دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ اپنے گھر والوں سے الگ ہوگئی ہے۔ اسے گود میں اٹھا لیتے ہیں اور اس سے اس کے گھر کا پتہ پوچھتے ہیں۔ لڑکی نہ اپنے والدین کا نام بتلا سکتی ہے، نہ اپنے گھر کا پتہ۔ وہ صرف رو رہی ہے۔ مارے خوف کے اس کی زبان ہی نہیں کھلتی۔

اب سادھو کے دل میں ایک نئی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ وہ لڑکی کو گود میں لیے

سوچ رہے ہیں، مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ان کا دل کہتا ہے۔ جب اس کے والدین کا پتہ ہی نہیں، تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ ان کا نفس اس لڑکی کو چھپا رکھنے کی تحریک کرتا ہے۔ وہ راج کماری کو لیے اپنی کٹی کی طرف چلے جاتے ہیں۔ ان کی لڑکی اور بیوی دونوں مر چکی ہیں۔ اسی غم میں وہ دنیا سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ اس چاند سی لڑکی کو پا کر ان کے دل میں پھر محبت پدری تازہ ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں، پرماتما نے ان پر رحم کھا کر یہ مشعلِ زندگی کو روشن کرنے کے لیے بھیجی ہے۔

(2)

کوہستانی مقام میں ایک صاف ستھری، بیلوں اور پھولوں سے آراستہ کٹی ہے۔ پشت کی طرف بہت گہرائی میں دریا بہہ رہا ہے۔ کٹی کے سامنے چھوٹا سا میدان ہے۔ دو ہرن اور دو مور میدان میں پھر رہے ہیں۔ وہی مہاتما کٹی کے سامنے ایک چٹان پر بیٹھے طنبورے پر گا رہے ہیں۔ راج کماری بھی ان کے سر میں سر ملا کر گا رہی ہے۔ اس کی عمر اب دس سال کی ہوگی۔ بھجن گا چکنے کے بعد لڑکی پھول چننے لگتی ہے اور ایک مالا بناتی ہے۔ پھر کٹی میں جا کر ٹھاکر جی کو اشنان کراتی ہے۔

سادھو بھی آجاتے ہیں اور دونوں ٹھاکر جی کی استت کرتے ہیں۔ پھر وہ وجد میں آکر ناچنے لگتے ہیں۔ ذرا دیر بعد لڑکی بھی رقص کرنے لگتی ہے۔ کیرتن ختم ہو جانے کے بعد دونوں چرن امرت لیتے ہیں اور سادھو راج کماری کو (جس کا نام اب اندرا رکھا گیا ہے) پڑھانے لگتے ہیں۔ انھیں اس کو گانا، بجانا، ناچنا سکھانے اور پڑھانے میں روحانی لطف حاصل ہوتا ہے۔ ان کی دلی آرزو ہے کہ اندرا ایشور بھجن اور دنیا کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کردے۔ وہ اس مبارک دن کا خواب دیکھتے ہیں۔ جب اندرا ٹھاکر جی کے سامنے میرا کی طرح گائے گی اور وجد میں آکر ناچے گی۔ اندرا اتنی حسین، اتنی خوش گلو، اور رقص کرنے میں اتنی مشاق ہے کہ جب وہ رات کو کیرتن کرنے لگتی ہے تو بھگتوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔

مہاتما جی نے یہ پانچ سال اسی کٹی میں کاٹے ہیں۔ اب اندرا سفر کی تکلیفیں برداشت کرنے کے قابل ہوگئی ہے۔ اس لیے اب سادھو تیرتھ یاترا کرنے نکلتے ہیں۔

بھگت لوگ انھیں رخصت کرنے آتے ہیں۔ ایک بھگت کو وہ کٹی سپرد کردی جاتی ہے اور مہاتما اندرا کے ساتھ تیرتھ یاترا کو روانہ ہو جاتے ہیں۔

مہاتما جی برسوں تک تیرتھ استھانوں کی یاترا کرتے رہتے ہیں۔ کبھی بدری ناتھ جاتے ہیں کبھی کیدار ناتھ، کبھی دوارکا، کبھی رامیشور، کبھی متھرا، کبھی کاشی، کبھی پوری، ہر جگہ مندر میں دونوں کیرتن کرتے ہیں اور عقیدت مندوں کو معرفت کے نشہ سے متوالا کر دیتے ہیں۔ اب مہاتما جی اندرا کو شاستر اور وید کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ اکثر جب مہاتما دھیان میں مگن ہو جاتے ہیں، تو اندرا ویدوں کا مطالعہ کرتی ہے۔

(3)

ایک دن مہاتما جی اور اندرا دونوں ایک گاؤں میں جا پہنچتے ہیں۔ یہ گاؤں مسلمانوں کا ہے۔ ایک ہفتہ سے طاعون پھیلا ہوا ہے۔ گاؤں کے باہر لوگ جھونپریاں ڈالے پڑے ہیں۔ مہاتما جی ایک درخت کے نیچے آسن جماتے ہیں اور طاعوں زدہ لوگوں کا معالجہ کرتے ہیں۔ اندرا بھی عورتوں کی خدمت میں مصروف ہو جاتی ہے۔ جڑی بوٹیاں تلاش کرنا، دوائیں بنانا، مریضوں کو اٹھانا بٹھانا، ان کے بچوں کے لیے کھانے پینے کی فکر کرنا، ان دونوں کا روز مرہ کا کام ہے۔ یہاں تک کہ مہاتما جی کو طاعون ہو جاتا ہے اور وہ اسی درخت کے نیچے پڑ جاتے ہیں۔ گاؤں کے سبھی زن و مرد اور قرب و جوار کے دیہات کے لوگ مہاتما جی کی تیمار داری کے لیے آتے ہیں۔ لیکن مہاتما جی کی حالت خراب ہوتی جاتی ہے اور ایک دن وہ اندرا کو بلا کر ایشور بھجن اور عوام الناس کی خدمت کا اپدیش کر کے ٹھاکر جی کے چرنوں کا دھیان کرتے ہوئے سمادھی لے لیتے ہیں۔ گاؤں میں کہرام مچ جاتا ہے۔ مہاتما جی کی ارتھی دھوم دھام اور باجے گاجے کے ساتھ نکلتی ہے۔ بھجن گانے والوں کی ایک منڈلی بھی ساتھ ہے۔ گاؤں کا چکر لگانے کے بعد اسی درخت کے سایہ میں ان کی چھتری بنتی ہے۔

اندرا کی عمر اس وقت بیس اکیس سال ہے اور اس کے چہرہ پر ایسا جلال ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ اس کا مضبوط جسم ہر قسم کی سختیاں جھیلنے کا عادی ہو گیا ہے۔ گاؤں کے لوگ چاہتے ہیں، وہ اسی گاؤں میں رہے۔ مگر اس سے اب اپنے

محسن کی جدائی نہیں برداشت ہوتی۔ جس گاؤں میں اس پر یہ مصیبت پڑی اس میں وہ اب نہیں رہ سکتی۔ وہ دل کو اس خیال سے تسکین دینا چاہتی ہے کہ ایشور کو جو کچھ منظور تھا، ہوا۔ مگر کسی طرح تسکین نہیں ہوتی۔ آخر ایک دن وہ سب سے رخصت ہو کر نکل پڑتی ہے۔ اس کی کمر میں چھپی ہوئی کٹار ہے۔ ہاتھ میں طنبورہ اور کنڈل اور کندھے پر مرگ چھالا۔

وہ گاؤں گاؤں اور شہر شہر ایشور کے بھجن سناتی اور عوام کے دلوں میں بھگتی اور سیوا کی شمع جلاتی پھرتی ہے۔ وہ جس شہر میں جا پہنچتی ہے، بات کی بات میں ہزاروں آدمی آجاتے ہیں۔ اس کی سواری کے لیے بہترین نعمتیں پیش کی جاتی ہیں۔ مگر وہ نمائش اور تکلف کو حقیر سمجھتی ہوئی کسی مندر کے سامنے درخت کے سایہ میں ٹھہرتی ہے۔ اس کی آنکھوں کی موہنی اداؤں میں وہ کشش ہے کہ لوگ اس کے منہ سے ایک ایک لفظ سننے کے لیے بے قرار رہتے ہیں۔ بڑے بڑے عیاش اور رنگین مزاج اس کے درشن کرتے ہی عقیدت سے اس کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔ اندرا کو صوفی شعراء کا کلام بہت پسند ہے۔ میرا، کبیر وغیرہ کے دوہوں کو بڑے شوق سے پڑھتی، اور انھیں کے بھجن گاتی ہے۔ تلسی اور سورداس کے پدوں سے بھی اسے عشق ہے۔ حال کے شعراء میں اسے جس کا کلام سب سے زیادہ عزیز ہے، وہ ہری ہر نام کا ایک شاعر ہے۔ وہ اس کے گیتوں کو پڑھ کر متوالی ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے اس کے دل میں خاص احترام ہے۔ وہ چاہتی ہے، کہیں ہری ہر سے ملاقات ہو جاتی، تو وہ اس کے قدموں کو بوسہ دیتی۔

(4)

جرول ریاست کا خاص شہر، کوہستانی علاقہ، صاف ستھری سڑکیں، صاف ستھرے آدمی، عالی شان محلات، ایک نہایت خوش نما چوک۔ چاروں طرف روشنی سے جگمگاتی ہوئی دکانیں، وسط میں ایک پارک، پارک میں فوّارہ، اندرا اسی فوّارے کے سامنے کھڑی طنبورے پر بھجن گا رہی ہے۔ ہزاروں آدمی محویت کے عالم میں کھڑے ہیں۔ جاتی ہوئی موٹریں رک جاتی ہیں اور اس پر سے رؤسا اتر اتر کا گانا سننے لگتے، خوانچے والے رک جاتے ہیں اور خوانچہ لیے بھجن سننے لگتے ہیں۔ اندرا اپنے پیارے شاعر ہری ہر کا ایک

معرفت میں ڈوبا ہوا پدگا رہی ہے۔ اس کی مستانہ لے سب کو مست کر رہی ہے۔

(5)

کئی سال ہوئے، ہری ہر ایک متمول رئیس تھا۔ شعر وسخن کا دلدادہ۔ فلسفیانہ خیالات میں ڈوبا اور تصوّف میں رنگا ہوا۔ اپنے عالی شان محل کو چھوڑ کر ایک جھونپڑی میں بیٹھا تصوّف اور فلسفہ کے جذبات کو شعر اور نغمہ کے دلفریب رنگ میں ادا کیا کرتا تھا۔ معرفت کی حقیقتیں اس کے دل و دماغ میں جاکر صفاتِ شعری سے آراستہ ہو جاتی ہیں۔ ساری رات بیٹھے گزر گئی ہے۔ اور وہ اپنے خیالات میں مست ہے۔ کھانے پینے، کپڑے لتے کی فکر نہیں۔ دنیا اس کی نظروں میں خواب ہے۔ محض سراب آرزو۔ اس کی کوئی چیز اس کے خیال میں ایسی نہیں کہ انسان اس میں دل لگائے۔ وہ اپنی ملکیت اور جائیداد کی پروا نہیں کرتا۔ کاروبار کی طرف مطلق دھیان نہیں دیتا۔ کاروباری لوگ اس سے بار بار ملنے آتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے گوشۂ عافیت سے باہر نہیں نکلتا۔ ہاں اگر کوئی پھٹے حال آجاتا ہے۔ تو فوراً آکر اسے مہمان خانہ میں لے جاتا ہے۔ غرباء کے لیے اس کی ساری ثروت وقف ہے۔ کبھی غریبوں کو کمبل تقسیم کرتا ہے۔ کبھی غلّہ۔ کوئی بھوکا سائل اس کے دروازے سے مایوس نہیں جانے پاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قرضہ سے زیر بار ہو جاتا ہے۔ قرض خواہ نالشیں کرتے ہیں۔ اس پر ڈگری ہوتی ہے۔ ہری ہر کبھی اپنا گوشۂ تنہائی چھوڑ کر مقدمہ کی پیروی کرنے نہیں جاتا۔ اس کی جائیداد قرق ہو رہی تھی۔ اور وہ اپنی جھونپڑی میں بیٹھا ستار پر ایک پد گا رہا تھا جو اس نے ابھی ابھی تصنیف کیا تھا۔ سجاوٹ اور تکلّف کی چیزیں اس کے محل سے نکالی جاتی ہیں اور نیلام کردی جاتی ہیں۔ اسے مطلق غم نہیں۔ تب اس کا محل نیلام ہو جاتا ہے اور وہ اسی طرح بے اثر رہتا ہے۔ اس محل میں آکر ایک بہت بڑا رئیس قبضہ جما لیتا ہے۔ ہری ہر کے پاس اب بھی وسیع علاقہ ہے۔ وہ چاہے تو پھر شاندار محل بنوا سکتا ہے۔ مگر اسے ملکیت سے محبت نہیں۔ وہ ہر ایک گاؤں میں گھوم گھوم کر اپنی اسامیوں کو زمینداری کے حقوق عطا کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے ایک سو ایک گاؤں سب آزاد ہو جاتے ہیں۔ وہ جس گاؤں میں جانکلتا ہے، لوگ اس کا استقبال کرنے دوڑتے ہیں۔ اور اس کے قدموں کی خاک پیشانی پر لگاتے

ہیں۔ اس کے لیے ہمہ نعمت حاضر کی جاتی ہے۔ لیکن وہ گاؤں کے باہر کسی درخت کے سایہ میں مقیم ہوتا ہے اور جنگلی پھل کھا کر سو رہتا ہے۔ آخر ملکیت کی فکر سے آزاد ہو کر وہ اطمینان سے پھر اپنے گوشۂ عافیت میں آبیٹھتا ہے۔ آج اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں۔ اس کی کٹی میں اب بھی کتنی ہی فالتو چیزیں ہیں۔ جنھیں اس کی نفاست پسند طبیعت نے جمع کر رکھا ہے۔ مصوّری اور صنعت کے ان کمالات کو جمع کر کے وہ ایک ڈھیر لگا دیتا ہے۔ اور اس میں آگ لگا دیتا ہے۔ اس کا ستار اور طنبورہ اور دف، مورتیں، مرگ چھالے، تصوف اور فلسفیوں کی کتابیں، سب اس ڈھیر میں جل کر خاک ہو جاتی ہیں۔ اور وہ متبسّم کھڑا ان چیزوں کو خاک ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔

(6)

شام ہو گئی ہے۔ شہر کے چوک میں اندرا اپنے طنبورے پر ایک پد گا رہی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کا ہجوم ہے۔ بڑے بڑے رؤسا اور امراء محو کھڑے ہیں۔ ہری ہر وہ نغمہ دلنواز سن کر چونک پڑتا ہے۔ کان لگا کر سنتا ہے۔ اور تب لپک کر مجمع کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اندرا پد گا رہی ہے۔ اس کی ایک ایک تان اس کے دل پر چوٹ کرتی ہے۔ ہری ہر کو آج اپنے کلاح کی گہرائی، درد اور تاثیر کا اندازہ ہوتا ہے وہ نفس حیرت بنا کھڑا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ گانا ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ رخصت ہو جاتے ہیں۔ اندرا بھی وہاں سے چلی جاتی ہے۔ مگر ہری ہر ابھی تک وہیں مورت کی طرح خیال میں ڈوبا ہوا بے حس و حرکت کھڑا ہے۔ جب بالکل سناٹا چھا جاتا ہے۔ تو اسے اپنے گردوپیش کی خاموشی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ دو ایک آدمیوں سے اندرا کا پتہ پوچھنا چھاہتا ہے۔ مگر جھجک کے مارے نہیں پوچھتا۔ مجبور ہو کر وہ اپنی کٹی میں لوٹ جاتا ہے۔ اور پریم کا پہلا گیت لکھتا ہے۔ وہ ساری رات ایک بیتابی کے عالم میں کاٹ دیتا ہے۔ اور دوسرے دن شام کو پھر چوک کی طرف جاتا ہے۔ آج بھی اندرا چوک میں گا رہی ہے۔ ہجوم کل سے کئی گنا زیادہ ہے۔ مگر کیا مجال کوئی جنبش کر سکے۔ ہری ہر بھی بت بنا ہوا سنتا ہے۔ اور جب آدھ گھنٹہ کے بعد اندرا چلی جاتی ہے، تو وہ اس کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ عقیدت مندوں کا ایک اژدہام ساتھ ہے۔ کٹی کے قریب پہنچ کر اندرا سب آدمیوں کو رخصت کر

دیتی ہے۔ صرف ہری ہر اس کے کچھ فاصلے پر چلا آرہا ہے۔ اندرا اپنی کٹی میں پہنچ کر پانی بھر لاتی ہے۔ اور تب ٹھاکر جی کا بھوگ لگا کر خود کھاتی ہے۔ پھر زمین پر پڑ رہتی ہے۔

سفید چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ ہری ہر کٹی کے سامنے زمین پر بیٹھ کر پتھر کے ٹکڑوں پر کوئلے سے تازہ عشق و محبت کا گیت لکھنے لگتا ہے۔ ساری رات لکھتے گزر جاتی ہے۔ جب مشرق کی طرف طلوع سحر کی سرخی نمودار ہوتی ہے، تو وہ سنگریزوں کو کٹی کے دروازے پر ترتیب سے رکھ کر وہاں سے کچھ دور ایک درخت کے نیچے جاکر لیٹ جاتا ہے۔ سنگریزے اس طرح رکھے گئے ہیں کہ اندرا کو اس کا پیغام محبت پڑھنے میں بالکل تردد نہ ہو۔

علی الصبح اندرا سندھیا پوجن اور کیرتن کے بعد جب باہر نکلتی ہے، تو عین دروازے پر اسے چوکور سنگریزے ایک ترتیب سے رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ حیرت میں آکر ایک پتھر اٹھا لیتی ہے۔ اس پر اسے کوئی تحریر نظر آتی ہے۔ ارے! یہ کوئی پریم کا نغمہ ہے۔ وہ دوسرا پتھر اُٹھاتی ہے۔ اس پر بھی وہی تحریر ہے۔ وہ اس گیت کا دوسرا بند معلوم ہوتا ہے۔ پھر وہ سارے سنگریزوں کو اٹھا کر پڑھتی ہے۔ اور انھیں ایک قطار میں رکھ کر پورا گیت پڑھ لیتی ہے۔ اس گیت میں وہ درد اور تاثیر ہے کہ کلیجہ تھام کر رہ جاتی ہے۔ یہ اسی زندہ جاوید ہری ہر کا کلام ہے۔ کتنی ہی بار اندرا کے دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی کہ اس شاعر کا درشن کرے۔ لیکن اسے کچھ خبر نہ تھی، وہ کون ہے۔ کہاں رہتا ہے؟ آج یہ پیغامِ محبت پا کر وہ دیوانہ وار اس کی تلاش میں نکل پڑی ہے۔ وہ کہیں قریب ہوگا، اس کا اسے یقین ہے۔ وہ چاروں طرف اسے تلاش کرتی ہے۔ اور آخر وہ کٹی کے عقب میں زمین پر اسے سوتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ حیرت آمیز مسرّت سے اس کے چہرہ کی طرف دیکھتی ہے۔ مکھیاں اسے ستا رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ اپنے آنچل سے مکھیاں اُڑانے لگتی ہے۔ ہری ہر کی نیند کھل جاتی ہے۔ اور اندرا کو آنچل سے پنکھا جھلتے دیکھ کر وہ اس محبت کا مزا لینے کے لیے پڑا رہتا ہے۔ تب وہ اٹھ کر بیٹھتا ہے۔ اندرا اسے پرنام کرتی ہے۔

اب ہری ہر بھی وہیں رہتا ہے۔ وہ کٹی کے اندر رہتی ہے، ہری ہر باہر۔ دونوں ساتھ ساتھ پہاڑیوں کی سیریں کرتے اور جنگلی پھول پھل جمع کرتے ہیں۔ پہاڑیاں اندرا کے نغموں سے گونج جاتی ہیں۔ وہ اب شہر کے چوک میں اپنا راگ سنانے نہیں آتی۔ اب اس کے سننے والا صرف ہری ہر ہے۔ مگر شہر کے عقیدت مندوں کی اب بھی بھیڑ لگ

جاتی ہے۔ اور لوگ تحفے تحائف دینے جاتے ہیں۔ جنھیں اندرا فیاضی سے غرباء میں تقسیم کر دیتی ہے۔

(7)

صبح کا وقت۔ جھیل کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھی ہوئی اندرا گا رہی ہے۔ اور ہری ہر سامنے بیٹھا ٹھاکر جی کے لیے ایک ہار گونتھ رہاہے۔ جھیل میں مرغابیاں، ہنس وغیرہ تیر رہے ہیں۔ کناروں پر ہرن، نیل گائے وغیرہ سب گویا اس نغمہ سے مست ہو رہے ہیں۔

یکا یک راج کمار گیان سنگھ گھوڑے پر سوار ادھر سے گزرتا ہے۔ اس کے ساتھ کئی برق انداز شکاری اور مصاحب ہیں۔ نہایت شکیل مردانہ صورت کا نوجوان ہے۔ ابھی مسیں بھیگ رہی ہیں۔ اونچا قد، فراخ سینہ، اونچی پیشانی، اندرا کا نغمہ سنتے ہی اسے جیسے سکتہ سا ہو جاتا ہے۔ اس کا گھوڑا وہیں رک جاتا ہے۔ اور سارا مجمع چپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اندرا معرفت کے نشہ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اسے گیان سنگھ کے آنے کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ جب گانا ختم ہو جاتا ہے۔ تو راج کمار گھوڑے سے اتر پڑتا ہے۔ اور اندرا کے پاس آکر ادب سے پر نام کرتا ہوا اس کا نام دریافت کرتا ہے۔ وہ اب تک بن بیاہا تھا۔ صدہا پیغامات راجوں مہاراجوں کے یہاں سے آئے تھے۔ اس نے ایک بھی منظور نہ کیا۔ آج اس حسینہ کو دیکھ کر اس پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ وہ اسے ادب کے ساتھ اپنے محل میں آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اندرا ایک دن کی مہلت مانگتی ہے۔ گیان سنگھ دوسرے دن آنے کا وعدہ کرکے چلا جاتا ہے۔ لیکن شکار میں اس کا دل بالکل نہیں لگتا۔ اسے یکا یک شکار سے نفرت اور ہر جاندار سے انس ہو جاتا ہے۔ اسے اب ہرنوں کا شکار کرتے صدمہ ہوتا ہے۔ وہی نغمۂ درد اس کے کانوں میں گونج رہا ہے اور آنکھوں میں وہی صورت بسی ہوئی ہے۔

(8)

اندرا یہ دعوت پاکر خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ اسے اس شعلہ کی مطلق خبر نہیں، جو اس کے حسن اور نغمہ نے گیان سنگھ کے دل میں روشن کر دیا ہے۔ وہ سوچتی ہے۔ شاہی

عنایات کی بدولت وہ زندگی کے تفکرات سے آزاد ہو جائے گی۔ اور ہری ہر کے ساتھ گوشۂ قناعت میں بیٹھی ہوئی زندگی کے دن کاٹ دے گی۔ ہری ہر خیال کرتا ہے کہ اندرا رنواس میں کتنی خوش ہوگی۔ کیونکہ راج کمار کے دل کی کیفیت اس سے مخفی نہیں رہتی۔ کیا ایسی بے مثال حسینہ کوہ و بیابان میں پھرنے کے قابل ہے۔ ہری ہر کے ساتھ رہ کر اسے فقروفاقہ کے سوا اور کیا نصیب ہوگا۔ وہ اس دیوی کو ان آزمائشوں میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ اس کی روحانی تسکین کے لیے اتنا ہی یقین کافی ہے کہ اندرا کے دل میں اس کی جگہ ہے۔ یہی خیال اس کی زندگی کو معراج کمال تک پہنچانے کے لیے کافی ہے۔ اس کے دل میں اور کوئی خواہش، کوئی آرزو نہیں۔

رات گزر جاتی ہے۔ علی الصباح ہری ہر پھولوں کے زیوروں سے اندرا کو آراستہ کرتا ہے۔ اس دن اندرا کو عقیدت مندوں نے جتنے تحفے پیش کیے۔ وہ سب ہری ہر نے جمع کر رکھے ہیں۔ وہ اندرا کے حسن کو ان آرائشوں سے اور بھی چمکا دیتا ہے۔ مگر جب موقعہ مل جاتا ہے، تو اندرا کی آنکھیں بچا کر آنسوؤں کی دو چار بوندیں بھی گرا لیتا ہے۔ اندرا سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے۔ گویا اسے کوئی اندیشہ نہیں۔ مگر دل میں اسے یقین ہے کہ اب پھر اندرا کے درشن نہ ہوں گے۔ یہ خوف بھی ہے کہ اندرا کے دل میں اب اس کی یاد نہ رہے گی۔ شاہی عیش و عشرت میں پڑ کر وہ اسے یقیناً بھول جائے گی۔ کون کسی کو یاد کرتا ہے۔ لیکن وہ اس خیال سے اپنے دل کو تسکین دیتا ہے کہ وہ تو آرام سے رہے گی۔ رعایا کو اس کی ذات سے فیض پہنچے گا۔ کیا وہ اس قدر تبدل ہو جائے گی کہ اختیار پاکر شاہی جو روستم کے خلاف زبان نہ کھولے؟ کیا وہ مہاتما کے اپدیش کو فراموش کر سکتی ہے؟

جب اندرا بن سنور کر تیار ہو جاتی ہے، تو دونوں ساتھ بیٹھ کر کیرتن کرتے ہیں۔ آج اس کیرتن میں دونوں کے دلوں میں مختلف جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اندرا بے خبری میں خوش ہے۔ اسے اپنے روبرو بہار ہی بہار نظر آرہی ہے۔ وہ سنیاس اور ویراگ سے سیر ہو چکی ہے۔ اور اب دنیا کی نعمتوں کا لطف اٹھانا چاہتی ہے۔ اس کے خیال میں شاہی عنایتیں اس کے لیے آسائش کا دروازہ کھول دیں گی۔ وہ اس وقت بھی اس زندگی کا خواب دیکھ رہی ہے۔ جب وہ ہری ہر کے لیے اچھے کھانے پکائے گی۔ اس کے لیے

اچھے اچھے کپڑے بنوائے گی۔ اس کے سر میں تیل ڈالے گی۔ جب وہ سوئے گا، تو اس کے لیے پنکھا جھلے گی۔ کیا ایسا باکمال، خدا رسیدہ شاعر اس قابل ہے کہ دنیا کی نا قدری کا شکار بنے؟ مگر ہری ہر غمناک خیالات میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کے سامنے تاریک مستقبل ہے۔ اسی وقت گیان سنگھ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سواری لیے آپہنچتا ہے۔

(9)

شاہی محل کے آراستہ اور پرتکلف کمرے، حسین کنیزیں، راج ماتا کا دربار لگا ہوا ہے۔ اندرا محل میں پہنچ کر راج ماتا کو پرنام کرتی ہے۔ رانی اس کی بڑی خاطر و مدارات کرتی ہیں۔ وہ اشنان کیے ہوئے پوجا کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ اندرا ان کے ساتھ مندر میں جاتی ہے۔ جو شیشہ وآلات سے سجا ہوا ہے۔ اور وہاں ان کا کیرتن ہوتا ہے۔ اور بھی کئی شریف زادیاں رانی کے ساتھ ہیں۔ سب اندرا کا کیرتن سن کر بے خود ہو جاتی ہیں۔ رانی صاحبہ اندرا کو گلے لگا لیتی ہیں۔ اور اپنی موتیوں کی مالا نکال کر اس کی گردن میں ڈال دیتی ہیں۔ اندرا دوسرا بھجن گاتی ہے۔ رانی اس کے قدموں پر سر رکھ دیتی ہے۔ بھگوان سے ایسی بھگتی کبھی اس کے دل میں نہ اٹڈی تھی۔ اسی وقت پدما آتی ہے۔ پدما حسن میں اندرا سے بالکل جدا ہے۔ اس کے حسن میں رعب، تمکنت، ملاحت اور کشش ہے۔ اندرا کے حسن میں نزاکت اور انکسار۔ ایک چنبیلی کا پھول ہے۔ سادہ اور نازک، اس کا حسن اس کی نزاکت اور سادگی میں ہے۔ دوسرا سورج مکھی ہے۔ خوش رنگ اور نظر فریب۔ پدما کا باپ سردار کیسری سنگھ راج میں وزارت کے عہدے پر مامور ہے۔ وہ پدما کی شادی راج کمار گیان سنگھ سے کرنا چاہتا ہے۔ پدما بھی راجکمار کو سچے دل سے چاہتی ہے۔ مگر راجکمار اس کی طرف زیادہ مائل نہیں۔ پھر بھی اس کی بہت خاطر اور دلجوئی کرتا ہے۔

پدما آکر راجکمار کو اندرا کی طرف گرویدہ نظروں سے تاکتے دیکھتی ہے۔ یہ بھی دیکھتی ہے کہ یہاں اس کی قدر و منزلت ہو رہی ہے۔ خود اس کی اتنی قدر کبھی نہ ہوئی تھی۔ یہ معمولی، بازاروں میں گانے والی عورت اس سے بازی لے جائے۔ اس خیال سے وہ دل میں جل جاتی ہے۔ اندرا سے اسے فوراً حسد و رقابت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور

اسے ذلیل کرنے کے منصوبے باندھنے لگتی ہے۔ وہ رانی صاحبہ کو اس سے بدگمان کرنا چاہتی ہے۔ اس کی شکل و صورت، وضع قطع کا مذاق اڑاتی ہے۔ مگر جب اس بد اندیشی کا اندرا پر کوئی اثر نہیں ہوتا، تو وہ اسے بدنام کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنا بیش قیمت کنگن موقعہ پاکر اس کے طنبورے کے نیچے چھپا دیتی ہے۔ اور ذرا دیر بعد اسے تلاش کرنے لگتی ہے۔ ادھر ادھر ڈھونڈتی ہوئی وہ اندرا کے پاس آتی ہے۔ اور طنبورے سے کنگن نکال لیتی ہے۔ اندرا شرمندہ ہو کر رونے لگتی ہے۔ کنیزیں پدما سے بہت خوش ہیں۔ کیونکہ پدما انھیں انعام دیتی رہتی ہے۔ وہ سب اندرا سے بد گمانی ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن اسی وقت گیان سنگھ آجاتا ہے اور اس واقعہ کی خبر پاکر اندرا کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتا۔ اسے اس معاملہ میں فتنہ انگیزی اور شرارت نظر آتی ہے۔ اندرا کی طرف سے وہ کسی قسم کی بدنیتی کا خیال ہی دل میں نہیں لا سکتا۔ اس کا رخ دیکھ کر کنیزیں بھی اسی کی ہاں میں ہاں ملاتی ہیں۔ اور رانی صاحبہ پدما کو سخت سست کہتی ہیں۔ پدما دانت پیس کر رہ جاتی ہے۔

ادھر ہری ہر شاہی محل کی دیوار کے نیچے خود فراموشی کی حالت میں کھڑا ہے کہ شاید اندرا کی آواز کانوں میں پڑجائے۔ یہاں سے مایوس ہو کر وہ پھر اندرا کی کٹی میں جاتا ہے اوراس کی ایک ایک چیز کو لے کر چومتا اور روتا ہے۔

دوسرے دن محل میں پھر محفل آراستہ ہوتی ہے۔ آج مہاراجہ صاحب جر دل بھی رونق افروز ہیں۔ اتفاق سے سانگلی کے کنور صاحب بھی تشریف لائے ہوے ہیں۔ ان چودہ پندرہ برسوں میں انھوں نے بڑے بڑے صدمے اٹھاے ہیں۔ ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ بیوی اور بیٹی کی یاد میں بہت لاغر ہو گئے ہیں۔ مگر آرائش کا شوق ابھی تک قائم ہے۔ اب بھی وہی جے پوری صافہ ہے۔ وہی نیچی اچکن، وہی امرت سری جوتا، اسی طرح بال سنوارے ہوئے، حالانکہ ان ظاہری آرائشوں کے نیچے روتا ہوا دل ہے۔ اندرا جس وقت محو ہو کر گاتی ہے، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ انھیں اندرا کی صورت میں اپنی جنت نصیب بیوی کا عکس نظر آتا ہے۔ پہلی بار جب انھوں نے اندرا کی ماں کو نویلی دلہن کے روپ میں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ہو بہو ایسی ہی تھی۔ اتنی مشابہت آج تک انھوں نے کسی عورت میں نہیں دیکھی۔ جب اندرا یہاں سے جانے لگتی ہے، تو وہ کئی قدم اس کے ساتھ جاتے ہیں۔ اور موقعہ پاکر اس کا نام، اور اس کے

والدین کا حال پوچھتے ہیں۔ اندرا اپنے بچپن کا واقعہ ان سے بیان کرتی ہے۔ کنور صاحب کو یقین ہو جاتا ہے کہ اندرا میری ہی کھوئی ہوئی بیٹی ہے۔ ان کے دل میں بے اختیار ولولہ اٹھتا ہے کہ اسے گلے لگالیں، مگر شرم مانع ہوتی ہے۔ کیا خبر یہ کس کس کے ساتھ رہی۔ اس پر کیا کیا گزری۔ وہ اسے اپنی لڑکی کیسے تسلیم کر سکتے ہیں؟ اندرا بھی غور سے ان کے چہرے کو دیکھتی ہے اور اسے کچھ کچھ یاد آتا ہے کہ اس کے باپ کی شکل ان سے ملتی تھی۔ لیکن وہ بھی شرم سے اس کا اظہار نہیں کرتی کہ کنور صاحب انکار کر دیں، تو خفت ہو۔

راجہ صاحب جردل اندرا کے کیرتن سے اتنے خوش ہوتے ہیں کہ اسے پانچ موضع معافی عطا کر دیتے ہیں۔ اندرا ان کے قدموں پر گر کر احسان مندی کا اظہار کرتی ہے۔

(10)

راجکمار اپنی کشتی آراستہ کرتا ہے۔ اور اندرا کو دریا کی سیر کے لیے لے جاتا ہے۔ اندرا اس موقع کی منتظر ہے کہ راج کمار سے ہری ہر کی سفارش کرکے اسے درباری شاعر کا رتبہ دلا دے۔ اس لیے باوجودیکہ اس کا دل یہاں سے جانے کے لیے بے تاب ہے۔ اور ہری ہر کی جدائی اسے شاق گزر رہی ہے۔ مگر وہ جانے کا نام نہیں لیتی۔ دریا کی سیر میں شاید وہ موقعہ ہاتھ آجائے۔ اس لیے وہ اس تجویز کو خوشی سے منظور کر لیتی ہے۔ کشتی لہروں پر خوش فعلیاں کر رہی ہے۔ اندرا ہری ہر کا ایک پد گانے لگتی ہے۔ دفعتاً اسے کنارے پر ہری ہر کھڑا نظر آجاتاہے۔ اس کی صورت سے ایسے مایوسی برس رہی ہے۔ گویا یہ دائمی مفارقت ہے۔

راجکمار کا دل اس پریم کے پد سے مدہوش ہو جاتا ہے۔ اسے اب صبر کی تاب نہیں رہتی۔ وہ اندرا کے روبرو اپنے دل بے تاب کی داستان سناتا ہے۔ وہ اپنا دل اس کی نذر کرتا ہے۔ اندرا کو اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک سنہرے جال میں پھنس گئی ہے۔ اب ہری ہر کا نام بھی زبان پر لانا قہر ہو جائے گا۔ راج کمار فوراً ہری ہر کے خون کا پیاسا ہو جائے گا۔ وہ دل میں افسوس کرتی ہے کہ ناحق راج کمار کی دعوت قبول کی۔ یہ ہوس کا پہلا تا زیانہ ہے جو اس پر پڑا۔ وہ اب یہ بھی سمجھنے لگی ہے کہ گو راج کمار اس

کے روبرو سائل کی حالت میں کھڑا ہے۔ مگر فی الواقع وہ اس کی قید میں ہے۔

وہ کہتی ہے۔ ''راج کمار، میں غریب عورت ہوں۔ اس قابل نہیں کہ تمھاری رانی بنوں۔ تم بدنام ہو جاؤ گے۔ اور عجب نہیں کہ راجہ صاحب اور تمھاری ماتا جی بھی تم سے ناراض ہوں۔ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ میں تمھیں مصیبتوں میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی''۔

راج کمار۔ ''میں تمھارے لیے تخت و تاج پر لات مار دوں گا۔ اندرا مجھے کسی کی خوشی یا نا خوشی کی پروا نہیں ہے۔ میں تمھارے لیے سب کچھ کرنے کو حاضر ہوں''۔

اندرا بہانہ کرتی ہے کہ اس نے سنیاس برت دھارن کر لیا ہے۔ اور اگر اس نے عہد کی خلاف ورزی کی، تو ان مہاتما جی کو کتنی تکلیف ہوگی، جنھیں وہ اپنا گورو سمجھتی ہے۔ سورگ میں بھی انھیں اس کی یہ حرکت دل شکستہ کر دے گی۔ وہ راج کمار کی عزت کرتی ہے۔ لیکن محبت کرنا اس کے لیے ممنوع ہے۔ اور اپنے عہد کو توڑ نہیں سکتی۔

راج کمار۔ ''تمھیں میرے اوپر مطلق رحم نہیں آتا اندرا؟''

اندرا۔ ''میں اپنے عہد کو توڑ کر زندہ نہیں رہ سکتی''۔

راج کمار۔ ''یہ سب حیلے ہیں اندرا۔ کیا میں خیال کروں۔ تمھارے دل میں کسی دوسرے کے لیے جگہ ہے''؟

اندرا۔ ''میں نے آپ سے کہہ دیا، میں سنیاسنی ہوں''۔

راجکمار۔ ''یہ تمھارا آخری فیصلہ ہے''؟

اندرا۔ ''ہاں آخری''۔

راج کمار مایوسی کے عالم میں کمر سے تلوار نکال کر اپنے سینہ میں چبھونا چاہتا ہے۔ اندرا تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔

راجکمار۔ ''مجھے مر جانے دو اندرا۔ جب میں تمھیں زندگی میں نہیں پا سکتا، تو زندگی بے کار ہے''۔

اندرا اس کی کمر میں تلوار لگاتی ہوئی دلجوئی کے لیے کہتی ہے۔ ''میرے جیسی ہزاروں عورتیں آپ کو ملیں گی۔ ایک غریب کا پریم آپ کو مل بھی جائے تو آپ کو اس سے تشفی نہ ہوگی''۔

راج کمار کا چہرہ مسرت سے کھل جاتا ہے۔ کہتا ہے۔ ''محبت تو عہد اور برت کی

پروا نہیں کرتی''۔

اندرا۔ ''لیکن محبت چھومنتر سے پیدا ہونے والی چیز بھی تو نہیں۔ جو محبت ایک نگاہ سے پیدا ہو سکتی ہے، وہ ایک نگاہ میں فنا بھی ہو سکتی ہے۔ تم راج کمار ہو۔ مجھے کیا بھروسہ کہ مجھ سے زیادہ حسینہ اور جمیلہ عورت پا کر تم میری طرف سے آنکھیں پھیر نہ لوگے۔ پھر تو میں کہیں کی بھی نہ رہوں گی۔ وصالِ صنم کے لیے خدا کو چھوڑ کر اگر نامراد رہوں، تو کیا ہو؟''

راج کمار۔ ''ہاں تمھاری یہ شرط مجھے منظور ہے۔ اندرا مجھے موقعہ دو کہ میں اپنی محبت کا نقش تمھارے دل پر جما سکوں۔ لیکن اگر تم مجھ سے منہ موڑ کر چلی گئیں، تو دیکھ لینا، اسی دن تمھیں میرے مرنے کی خبر ملے گی''۔

اندرا دیکھتی ہے کہ ہری ہر آہستہ آہستہ دریا کے کنارے سے بستی کی طرف چلا جارہا ہے۔ اپنی بے کسی اور مایوسی کا خیال کر کے اس کی آنکھیں آبگوں ہوگئیں۔

(11)

پدما آسانی سے اپنی آرزوؤں کا خون ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ اندرا کے متعلق تحقیقات شروع کرتی ہے کہ شاید کوئی ایسا پہلو ہاتھ آجائے، جس کی بنا پر وہ اسے راجکمار کی نظروں سے گرا دے۔ ایک دن وہ اس کی قیام گاہ کا پتہ دریافت کرتی اس کی کٹی تک جا پہنچتی ہے۔ وہاں ہری ہر سے اس کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ باتوں باتوں میں وہ اندرا کی بے وفائیوں کی داستان ہری ہر سے بیان کرتی ہے۔ اس نے کئی تصویریں اتروالی ہیں، جن میں اندرا کا راجکمار کے ساتھ سیر کرنا، گانا بجانا، لکھنا پڑھنا، نظر آتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اندرا وہاں ایسی خوش ہے، گویا اسے کائنات کی دولت مل گئی ہو۔ اور تم اس کے فراق میں گھل رہے ہو۔ ایسی بے وفا عورت اسی قابل ہے کہ اس کی قلعی کھول دی جائے تاکہ وہ کہیں اپنا روئے سیاہ نہ دکھا سکے۔ لیکن ان پد گوئیوں کا ہری ہر پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ آخر ادھر سے مایوس ہو کر پدما ایک دوسرا جال پھیلاتی ہے۔ وہ ہری ہر کو اپنے ساتھ دربار میں لاتی ہے۔ اور راج کمار سے اس کا تعارف کراتی ہے۔ راج کمار اس کا کلام سن کر بہت محظوظ ہوتا ہے۔ یہ وہی کلام ہے جو اس نے اندرا کے منہ سے سنا

ہے۔ راج کمار اس کی بڑی خاطر کرتا ہے۔ پدما ہری ہر کی زبان سے ایسے الفاظ نکلوانا چاہتی ہے جو اس کی محبت کا پردہ فاش کر دیں اور راج کمار کو معلوم ہو جائے کہ یہ اندرا کا عاشق ہے۔ لیکن ہری ہر اتنا محتاط ہے کہ وہ ایک لفظ بھی ایسا منہ سے نہیں نکلنے دیتا، جس سے محبت کا اظہار ہو۔ راج کمار اندرا کی تعریف کرتا ہے۔ ہری ہر اس طرح سنتا ہے، گویا اس نے اندرا کا نام بھی نہیں سنا۔ پدما اسی وقت رنواس میں جاکر اندرا کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اسے یقین ہے کہ دونوں بروقت ملاقات پر ضرور ایسے خوش ہو جائیں گے کہ اس ضعیف بنیاد پر کوئی تعمیر کھڑی کی جاسکے گی۔ لیکن اندرا ہری ہر کو دیکھ کر بیگانہ وار پیش آتی ہے۔ اور ہری ہر بھی اس سے زیادہ مخاطب نہیں ہوتا۔ تب پدما ایک مشاعرہ منعقد کرتی ہے۔ اور اس میں ریاست کے بڑے بڑے خوش گو شعراء کو مدعو کرتی ہے۔ یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ جس کا کلام بہتر ہو، اسے درباری شاعر کا منصب عطا کیا جائے۔ پدما کو یقین ہے کہ ہری ہر کا کلام سبقت لے جائے گا۔ اس لیے وہ اندرا کو منصف قرار دیتی ہے۔ راج کمار بھی بڑی خوشی سے اندرا کا منصف بنایا جانا منظور کرتا ہے۔ اندرا کو اب صاف نظر آرہا ہے کہ اس کی تباہی کے سامان کیے جا رہے ہیں۔ ہری ہر کا کلام یقیناً بہترین ہوگا۔ اور اسے مجبوراً اسی کو فائق کہنا پڑے گا۔ ہری ہر کی حمایت یا سفارش میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا اس کے لیے زہر قاتل کا کام دے سکتا ہے۔ اس کے فیصلہ پر اعتراض کرنا، اور ہری ہر کے کلام میں نقائص نکال کر راج کمار کو اندرا سے بدظن کر دینا مشکل نہ ہوگا۔ وہ چاہتی ہے کہ اگر موقعہ ملے، تو ہری ہر کو آگاہ کردے۔ مگر یہ موقع اسے نہیں ملتا۔

پدما مشاعرہ کی تیاریوں میں مصروف رہتی ہے۔ مقررہ تاریخ کو سبھی شاعر تشریف لاتے ہیں۔ ہری ہر بھی آتا ہے۔ شرط تازہ کلام کی ہے۔ ہری ہر نے کوئی تازہ نظم نہیں لکھی۔ اور شعراء اپنے کلام سناتے ہیں۔ نعرۂ تحسین بلند ہو جاتا ہے۔ بالآخر جب ہری ہر کی باری آتی ہے، تو وہ صاف کہہ دیتا ہے۔ ''میں نے کوئی تازہ نظم نہیں لکھی۔'' اس نے بھی پدما کی ان سرگرمیوں کو اپنی فراست سے تاڑ لیا ہے۔ اور اس کے جال میں نہیں پھنسنا چاہتا۔ اندرا اسے تائید غیبی سمجھ کر پرماتما کا دل میں شکریہ ادا کرتی ہے۔ انعام اور منصب ایک دوسرے شاعر کو مل جاتے ہیں۔ اور اندرا کی محبت کا راز سر بستہ رہ جاتا

ہے۔ ہری ہر یہاں سے خوش خوش رخصت ہوتا ہے۔ اندرا بھی رنواس میں خوش و خرم ہے۔ اس سے زیادہ مسّرت کی بات اس کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے۔

(12)

راج کمار گیان سنگھ کی گدی نشینی کا جشن منایا جا رہا ہے۔ شہر میں چراغاں ہو رہا ہے۔ چورستوں پر عالی شان پھاٹک بنائے گئے ہیں۔ صدر پھاٹک سے چوک تک دو رویہ بجلی کے خوش رنگ بلب لگائے گئے ہیں۔ کنارے کے درختوں پر بجلی کی روشنی کے حروف میں دعائیہ کلمات لکھے گئے ہیں۔ پنڈت لوگ مہورت دیکھتے ہیں۔ اسی وقت گیان سنگھ محل سے نکل کر عالی شان منڈپ میں آتا ہے۔ جو اسی تقریب کے لیے نصب کیا گیا ہے۔ اراکین دربار اور رؤسا نذرانے پیش کرتے ہیں۔ گیان سنگھ اٹھ کر اپنے طرز عمل کا اعلان اور ملازمین شاہی ونیز رعایا کو اپنے فرائض کی پابندی کی ہدایت کرتا ہے۔ اسامیوں کا نصف لگان اس نے معاف کر دیا ہے۔ اس لیے رعایا بے حد خوش ہے۔ سب اظہار مسرت کرکے اس کو دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں۔ پھر غرباء کو کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔ قیدیوں کی رہائی کا حکم ہوتا ہے۔ تب فوجوں کی سلامی اور قواعد ہوتی ہے۔ بینڈ بجتا ہے۔ افسروں کو تمغے اور پروانے ملتے ہیں۔ پھر آتش بازیاں چھوڑی جاتی ہیں۔ اس کے بعد ٹھاکر دوارے میں کیرتن ہوتا ہے۔ ہری ہر وہاں اندرا کے درشنوں کے اشتیاق میں آیاں ہے۔ مگر کیرتن کرنے والوں میں اندرا نہیں ہے۔ طوائفوں کو مطابق مدعو نہیں کیا گیا۔ جیسا عام دستور تھا۔ گیان سنگھ نے اس تقریب میں بھی بے جا صرف نا منظور کر دیا ہے۔ شہر میں خبر گرم ہے کہ اندرا کی شادی گیان سنگھ سے ہوگی۔ ایسی مہربان، غریب پرور، ہر دل عزیز رانی پانے سے ہر خاص و عام خوش ہے۔

کیرتن کے بعد گیان سنگھ اندرا کے پاس جاتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ ''اندرا کیا ابھی تمھارا امتحان پورا نہیں ہوا؟''

اندرا کہتی ہے۔ ''ابھی نہیں۔ مجھے اس رتبہ کے قابل بننے دیجیے''۔

راج کمار۔ ''اس تقریب کی یادگار میں محبت کا ایک تحفہ پیش کرتا ہوں''۔

اندرا۔ ''محبت کا کوئی تحفہ ابھی میرے لیے منع ہے''۔

راج کمار۔ ''تم بڑی بے رحم ہو اندرا''۔

اندرا۔ ''اور ایسی بے رحم عورت کو آپ رانی بنانا چاہتے ہیں۔ رانی کو رحمدل ہونا چاہیے''۔

راج کمار۔ ''ساری دنیا کے لیے تو تم رحم کی دیوی ہو۔ لیکن میرے لیے پتھر کی مورت''۔

گیان سنگھ اب اندرا کے ہاتھوں میں ہے۔ روح وہ ہے۔ جسم گیان سنگھ۔ اندرا کو رعایا کے حقوق کا خیال ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں بھولتا۔ آئے دن نئے نئے فرمان جاری ہوتے ہیں۔ جن میں رعایا کی ضرورتوں کے لیے کوئی نہ کوئی نیا حق عطا کیا جاتا ہے۔ شاہی اخراجات کم کیے جاتے ہیں۔ شاہی محل میں بھی وہ نفاست اور شوقت نہیں ہے۔ خادموں کی ایک پوری فوج تھی۔ انھیں جواب دے دیا جاتا ہے۔ حسین لونڈیوں کا بھی ایک قافلہ تھا۔ انھیں بھی جواب مل جاتا ہے۔ محلات کے کئی حصّے رعایا کی ضرورتوں کے لیے علیحدہ کر دیے جاتے ہیں۔ ایک محل میں کتب خانہ کھل جاتا ہے۔ دوسرے میں شفا خانہ۔ ایک پوری عمارت کسانوں اور مزدوروں کے لیے وقف کردی جاتی ہے۔ جہاں ان کی پنچایتیں ہوتی ہیں۔ اور طرح طرح کے زرعی آلات کی نمائش کی جاتی ہے۔ فوج کے ایک بڑے حصّے کو موقوف کر دیا جاتا ہے۔ اس کی جگہ رعایا میں سے نو جوان چن لیے جاتے ہیں۔ اور قومی فوج فوراً آراستہ کی جاتی ہے۔ نوجوانوں کے لیے ورزش گاہیں تعمیر کی جاتی ہیں۔ گیان سنگھ ملوکیت کی آب و ہوا میں پلا ہوا شہزادہ ہے۔ اس کا حکم رعایا کے لیے قانون ہوسکتا تھا۔ اب وہ قدم قدم پر اپنے اوپر بندشیں عاید کرتا ہے۔ یہ سب اندرا کی تحریک کا اثر ہے۔ اندرا جو فرمان لکھتی ہے، اس پر وہ آنکھیں بند کرکے دستخط کر دیتا ہے۔

ادھر امرا اور اراکین دربار کے حلقہ میں بڑی تشویش پھیلتی ہے۔ ان کے خیال میں ریاست تباہ ہوئی جاتی ہے۔ گیان سنگھ کی یہی حالت رہی تو تھوڑے دنوں میں امراء کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حریت کے اس سیلاب کو روکنے کی سازشیں کی جاتی ہیں۔ پدما اس سازش کی روح رواں ہے۔ یہ لوگ تخفیف شدہ فوج کے سپاہیوں، اور برخاست شدہ شاہی ملازموں میں بدگمانیاں پھیلاتے ہیں۔ اُمراء میں بھی شورش پیدا کرتے ہیں۔ گیان کو بزور

شمشیر زیر کر کے کسی دوسرے راجہ کو بٹھانا چاہتے ہیں۔ پدما کا اس سازش سے صرف یہی منشاء ہے کہ اندرا ذلیل اور بدنام ہو۔ وہ اس کو بدنام کرتی ہے۔ اور ان سارے تغیرات کا واحد سبب اندرا ہی کو ٹھہراتی ہے۔ اس لیے باغیوں کی یہ جماعت اس کی جان کی دشمن ہو جاتی ہے۔ مسلّح شورش کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔

گیان سنگھ اور اندرا شاہی محل کے ایک مختصر سے کمرہ میں بیٹھے شطرنج کھیل رہے ہیں۔ کمرہ میں کوئی تکلف یا آرائش نہیں ہے۔ اندرا نے آج یہ بازی لگا ئی ہے کہ اگر وہ جیت جائے گی، تو راجہ سے جو چاہے گی، طلب کرے گی۔ راجہ کو اس کی تعمیل میں انکار نہ ہوگا۔ اور راجہ کو بھی یہی اختیار ہوگا۔ دونوں اپنے اپنے خیال میں خوش ہیں۔ گیان سنگھ کی خوشی کا دارا پار نہیں ہے۔ وہ آج اپنی کامیابی کے یقین سے پھولا نہیں ساتا۔ دونوں خوب دل لگا کر کھیل رہے ہیں۔ پہلے راجہ صاحب غالب آتے ہیں۔ اور اندرا کے کئی مہرے پیٹ لیتے ہیں۔ ان کی مسرت ہر لحہ بڑھتی جاتی ہے۔ دفعتاً بازی پلٹ جاتی ہے۔ راجہ کے بادشاہ پر شہ پڑجاتی ہے۔ اور اس کا فرزین پٹ جاتا ہے۔ پھر تو ایک ایک کرکے اس کے سبھی مہرے غائب ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ہار جاتا ہے۔ اس کے چہرہ پر مایوسی چھا جاتی ہے۔ اندرا اسی وقت ایک فرمان نکالتی ہے اور راجہ سے اس پر دستخط کرنے کی استدعا کرتی ہے۔ راجہ دبی ہوئی نظروں سے فرمان کو دیکھتا ہے۔ غلّہ کا محصول درآمد معاف کر دیا گیا ہے۔ جس سے شاہی محاصل میں ایک معتدبہ رقم کی کمی ہو جاتی ہے۔ ریاست میں غلّہ بہت کم ہوتا ہے۔ غلّہ زیادہ تر دیگر ملکوں سے آتا ہے۔ اس پر درآمد محصول کے باعث غلہ گراں ہو جاتا ہے، اور رعایا کو تکلیف ہوتی تھی۔ اندرا غرباء کو ارزاں غلّہ بہم پہنچانے کی فکر میں تھی۔ اور آج موقع پاکر اس نے یہ فرمان پیش کیا۔ گیان سنگھ کو تامل تو ہوتا ہے۔ مگر زبان ہار چکا ہے۔ فرمان پر دستخط کر دیتا ہے۔

اس وقت باہر ایک شور برپا ہوتا ہے۔ ایک سنتری دوڑا ہوا آتا ہے۔ اور اطلاع دیتا ہے کہ باغیوں نے شاہی محل کو گھیر لیا۔ اور اندر گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(13)

گیان سنگھ کا چہرہ غصّہ سے سرخ ہو جاتا ہے وہ فوراً اسلحہ سے آراستہ ہو کر اندرا

سے رخصت ہوتا ہے اور فصیل کے اوپر چڑھ کر بلند آواز میں شورش کرنے والوں کو مخاطب کر کے اس شورش کا سبب پوچھتا ہے۔

ایک آدمی نیچے سے جواب دیتا ہے۔ ''ہم یہ مظالم برداشت نہیں کر سکتے۔ اندرا ہماری تباہی کا باعث ہے۔ وہ ہماری رانی نہیں بن سکتی''۔

گیان سنگھ اندرا کے احسانات، جو اس نے قوم پر کیے ہیں، بیان کرتا ہے۔ مگر نیچے سے وہی جواب آتا ہے۔ ''اندرا ہماری تباہی کا باعث ہے۔ وہ ہماری رانی نہیں بن سکتی''۔ گویا کوئی گراموفون کی صدا ہو۔

گیان سنگھ تب وہ فرمان نکال کر پڑھنا شروع کرتا ہے۔ جس پر اس نے ابھی دستخط کیے ہیں۔ مگر اس کا بھی باغیوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ پھر وہی رٹ لگائی جاتی ہے۔ ''اندرا ہماری رانی نہیں بن سکتی۔ وہ ہماری تباہی کا باعث ہے''۔ اس کے ساتھ ہی باغی لوگ زینوں سے فصیل پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صدر دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔

گیان سنگھ اب غضب ناک ہو کر دھمکیاں دیتا ہے۔ مگر اس کی فہمائش کی طرح دھمکیاں بھی مجمع پر کوئی اثر نہیں کرتیں۔ وہ برابر فصیل پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

گیان سنگھ طیش میں آکر خطرے کے گھنٹے کے پاس جاتا ہے۔ اور اسے زور سے بجاتا ہے۔ فوج کے سپاہی سنتے ہیں مگر نکلتے نہیں۔ دوسری بار گھنٹہ بجاتا ہے۔ سپاہی تیار ہوتے ہیں۔ اور جلد جلد اسلحہ جمع کرنے لگتے ہیں۔ تیسرا گھنٹہ ہوتا ہے۔ سب فوج نکل پڑتی ہے۔ اسی وقت پدما آکر انھیں بہکاتی ہے۔ ''نادانوں! کیوں اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارتے ہو۔ کیا اب تک تمھاری آنکھیں نہیں کھلیں؟ تمھارے کتنے ہی بھائی علاحدہ کر دیے گئے؟ اور آج وہ دربدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں تم لوگوں کی باری بھی بہت جلد آئی جاتی ہے۔ اگر یہی لیل و نہار ہیں، تو دو چار مہینے میں سب کے سب نکال دیے جاؤ گے۔ یہ باغی کون ہیں؟ یہ وہی تمھارے بھائی ہیں۔ جنھیں گیان سنگھ کی نئی بن بیاہی رانی اندرا نے دیا ہے۔ ایک بازاری طوائف تمھارے اوپر اس طرح حکومت کر رہی ہے۔ کیا تم لوگ اسے برداشت کر سکتے ہو؟''

اس وقت پدما اندرا کے پاس آکر دوستانہ مشورہ دیتی ہے۔ ''اندرا بھاگ جاؤ؟ ورنہ تمھاری جان خطرے میں ہے''۔ اندرا اس موقعہ کو غنیمت سمجھتی ہے اور پدما کا احسان مانتی

ہے۔ پدماا سے ایک چور دروازہ سے لے جاتی ہے، جو شہر کے باہر ایک مندر میں کھلتا ہے۔ ایسے ہی نازک موقعوں کے لیے وہ سُرنگ بنائی گئی ہے۔ پدما نے ہری ہر کو پہلے ہی بلا لیا ہے۔ اس کے ساتھ دو گھوڑے ہیں۔ چاروں طرف اندھیرا ہے۔

ہری ہر ایک گھوڑے پر اندرا کو سوار کرتا ہے۔ دوسرے پر خود بیٹھتا ہے۔ اور دونوں شہر کی اندھیری سڑکوں پر ہوتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

اسی وقت پدما فصیل پر آکر گیان سنگھ کے بغل میں کھڑی ہو کر کہتی ہے۔ ''بہادرو! میں تمھیں مژدہ سناتی ہوں کہ اندرا اب اس محل میں نہیں ہے تم میں سے کوئی ایک معتبر آدمی قصر شاہی میں آکر اپنا اطمینان کر سکتا ہے۔ وہ جس گمنامی سے نکلی تھی۔ اسی میں پھر چلی گئی ہے۔ اب تم لوگ واپس جاؤ۔ میں تم لوگوں کو اطمینان دلاتی ہوں کہ تم لوگوں کے سر سے یہ احکام ہٹا لیے جائیں گے''۔

گیان سنگھ زخم خوردہ طائر کی طرح ایک ٹھنڈی سانس لے کر گر پڑتا ہے۔ باغیوں کی جماعت لوٹ جاتی ہے۔ اور گیان سنگھ کو اس شورش سے نجات دلانے کی نیک نامی پدما کو ملتی ہے۔

گیان سنگھ مایوسانہ لہجہ میں پوچھتا ہے۔ ''اندرا کہا چلی گئی''؟

پدما۔ ''جہاں سے آئی تھی، وہیں چلی گئی۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ اسے تم سے محبت تھی، تو تم غلطی پر ہو۔ وہ یہاں بدرجہ مجبوری پڑی تھی۔ اس کا عاشق وہی بدنصیب شاعر ہری ہر ہے۔ اسی پر وہ جان دیتی ہے۔ اس کو کوئی منصب دلانے کی فکر میں وہ یہاں پڑی ہوئی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ یہاں خطرہ ہے تو بھاگ نکلی۔ بے وفا تھی''۔

گیان سنگھ نیم جانی کی حالت میں اندر آیا، اور اسی غیظ میں اندرا کی ہر ایک چیز کو پیروں سے کچل ڈالتا ہے۔ عشق ناکام ہو کر حسرت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اندرا کی کئی تصویریں دیواروں پر لگی ہوئی ہیں۔ گیان سنگھ ان تصاویر کو اتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ پدما اس وقت تحمل اور عفو کی دیوی بنی ہوئی ظاہر میں اس کے غصہ کو فرو کر رہی ہے۔ مگر باتیں ایسی ایسی چوٹ کرنے والی کہتی ہے کہ گیان سنگھ کی آتش حسد اور بھی مشتعل ہو جاتی ہے۔ وہ اس طنبورے کے سیکڑوں ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ دفعتاً اسے ایک بات یاد آجاتی ہے۔ وہ فوراً باہر آتا ہے۔ اور کئی معتبر سپاہیوں کو اندرا کا تعاقب کرنے

کے لیے روانہ کر دیتا ہے۔ اور حکم دیتا ہے کہ شہر کے سب ناکے بند کر دیے جائیں۔

پھر اندر جاکر اندرا کی کی پوجا کی چیزیں اور ٹھاکر جی کا سنگھاسن سب اٹھا اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ جو کنیزیں اندرا کی خدمت پر مامور تھیں، انھیں نکال دیتا ہے۔ اور ایک جنون کے عالم میں پیر پٹکتا ہوا بار بار اندرا کو کوستا ہے۔ ''مکارہ، عیارہ، ساحرہ، بے وفا، دغا شعار''۔

پدما ٹھنڈے پانی کا گلاس لاکر اسے دیتی ہے۔ وہ ایک ہی سانس میں اسے خالی کرکے گلاس کو پٹک دیتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ نتھنے پھڑک رہے ہیں۔ پدما کی طرف سے نرم ہو جاتا ہے۔ وہ اسے ضبط اور وفا کی دیوی خیال کرنے لگتا ہے۔ احسان مندی کا احساس بھی کچھ کم نہیں ہے۔ پدما آگر آڑے نہ آتی، تو باغیوں نے محل پر قبضہ کر لیا ہوتا۔ اور معلوم نہیں اس کے سر پر کیا آفت آتی۔ وہ اس سے اپنی گزشتہ فرو گزاشتوں کی معافی مانگتا ہے۔ اور پہلی بار اس کی محبت کا جلوہ اس کے دل میں جاگزیں ہوتا ہے۔ اس مایوسی اور غم کی حالت میں پدما ہی اسے نجات کی دیوی نظر آتی ہے۔ وہ اسے گلے سے لگا لیتا ہے۔ پدما فرطِ محبت سے اس کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگتی ہے۔

(14)

اندرا اور ہری ہر گھوڑوں پر سوار شہر پناہ کے ایک دروازے پر پہنچتے ہیں۔ دروازہ بند ہے۔ دوسرے دروازے پر آتے ہیں۔ وہ بھی بند ہے۔ ہری ہر کو معلوم ہے کہ فصیل میں ایک شگاف ہے۔ اس پر گھاس پھوس جمی ہوئی ہے۔ اور کسی کو شاید اس شگاف کی خبر بھی نہ ہو۔ دونوں اسی شگاف کے اندر گھوڑے ڈال دیتے ہیں۔ اور کانٹوں سے الجھتے گھاس پھوس کے ڈھیروں کو ہٹاتے بہ مشکل شگاف کو پار کرتے ہیں۔ مگر باہر کی طرف شہر پناہ سے ملی ہوئی ندی آتی ہے۔ مجبوراً دونوں ندی میں گھوڑے ڈال دیتے ہیں۔ اور تیرتے ہوئے ندی کے پار ہو جاتے ہیں۔ دوسری جانب پہنچ کر دونوں ذرا دم لیتے ہیں۔ اور تب پھر بھاگتے ہیں۔ بہت دور چلنے کے بعد انھیں ایک مندر ملتا ہے۔ دونوں وہیں گھوڑے کھول دیتے ہیں۔ اور رات بسر کرتے ہیں۔ صبح کو دونوں وہاں سے پیادہ پاروانہ

ہوتے ہیں۔ اور دوپہر ہوتے ہوتے ایک بڑے گاؤں میں پہنچتے ہیں۔ وہاں گاؤں کا زمیندار برات لے کر اپنی شادی کرنے جا رہا ہے۔ ہزاروں آدمی جمع ہیں۔ دوسرے موضعوں کے لوگ بھی تماشا دیکھنے آئے ہیں۔ برات چلنے کو تیار ہے۔ دولہاں گھر سے نکل کر موٹر پر بیٹھتا ہے۔ اور موٹر چلنا چاہتی ہے کہ ایک عورت آ کر موٹر کے سامنے لیٹ جاتی ہے۔ یہ زمیندار صاحب کی پہلی بیوی ہے جسے انھوں نے پندرہ سال سے چھوڑ رکھا ہے۔ آج وہ اپنی شادی کرنے جاتے ہیں، تو بیوی ان کے راستہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ میاں بیوی میں سخت کلامیوں کی نوبت آتی ہے۔ شوہر بیوی کو دھمکا کر راستہ سے ہٹ جانے کا حکم دیتا ہے۔ بیوی پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ تب وہ غصّہ میں آ کر موٹر چلا دیتا ہے عورت کچلی جاتی ہے۔ اس وقت ہزاروں آدمی غضب ناک ہو کر زمیندار صاحب پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور اسے مار ڈالتے ہیں۔ اندرا اور ہری ہر افسوس کرتے ہیں کہ اور پہلے یہاں نہ پہنچے۔ ورنہ شاید سمجھا بجھا کر دونوں میں میل کرا دیتے۔ ذرا دیر اس گاؤں میں ٹھہر کر دونوں پھر آگے بڑھتے ہیں۔ جہاں ناچ ہو رہا ہے۔ اندرا وہاں گاتی ہے اور انھیں لوگوں کے ساتھ رات بسر کرتی ہے۔

کئی دن کے بعد دونوں اس ریاست کی حدود سے باہر نکل جاتے ہیں اور سانگلی کی ریاست میں پہنچتے ہیں۔ یہیں دونوں ایک گاؤں میں رہنے لگتے ہیں۔ دونوں گاؤں کی خدمت کرتے ہیں۔ اور ان کی خدمت سے گاؤں والے بڑے خوش ہیں۔

گاؤں میں ایک ٹھاکر دوارہ ہے۔ وہیں دونوں رات کو کیرتن کرتے ہیں۔ ان کی خدمت اور بھگتی کا شہرہ قرب و جوار مواضعات میں پھیل جاتا ہے۔ اور عقیدت مندوں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے۔ ان دہقانوں کی نگاہ میں یہ دونوں آسمانی وجود ہیں۔ اور وہ ان کی دل و جان سے پرستش کرتے ہیں۔ اور نغمہ و شعر کی اس دنیا میں دونوں حقیقی وجود کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ اور دنیاوی کدورتیں اور خواہشیں ان کے دلوں سے نکل جاتی ہیں۔ انھیں ہر ایک وجود میں ایک ہی حقیقت کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔ ہری ہر کبھی کبھی آبشار کے کنارے جا نکلتا ہے۔ اور اس کے نغمہ میں حقیقت کی آواز سنتا ہے۔ اور روحانیت کے جذبات سے اس کا دل لبریز ہو جاتا ہے۔ کبھی کسی جنگلی پھول کو دیکھ کر وہ وجد میں آ جاتا ہے۔ اور اس میں معبود کا جلوہ دیکھتا ہے۔

ایک دن سانگلی کے کنور صاحب شکار کھیلنے آتے ہیں۔ ان کے ہمراہ برق انداز شکاری وغیرہ خیمے لے کر آ پہنچتے ہیں۔ شام کا وقت ہے۔ کنور صاحب اپنے ہاتھی پر گاؤں میں آتے ہیں۔ اور شکار کی تیاریاں ہونے لگتی ہیں۔ اسی وقت اندرا ان کے روبرو جاکر ایک معرفت کا پد گاتی ہے۔ کنور صاحب کے دل میں لڑکی کی محبت تازہ ہو جاتی ہے۔ پہلی بار جب انھوں نے اندرا کو دیکھا تھا، اسے پہچان گئے تھے۔ لیکن اس حالت میں اپنی لڑکی کو تسلیم کرنے کی انھیں ہمت نہ ہوئی تھی۔ تب سے برابر انھیں اپنی پیاری بیٹی کی یاد بے چین کرتی رہتی تھی۔ لیکن اس دوران میں ان کی محبت ان خیالات پر غلب آچکی ہے۔ وہ اب ضبط نہیں کر سکتے۔ اور اندرا کو سینے سے لگا کر کہتے ہیں۔ ''تو میری کھوئی ہوئی پیاری بیٹی ہے''۔ وہ اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے اصرار کرتے ہیں۔ مگر ہری ہر ثروت اور تمول کے جال میں نہیں پھنسنا چاہتا۔ اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ثروت میں اندرا کو نہ کھو بیٹھے۔ اندرا سے وہ کچھ نہیں کہتا۔ مگر اس کے بشرہ سے اس کی دل کی کیفیت عیاں ہو جاتی ہے۔ اور اندرا اپنے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کرتی ہے۔ مندر کے سامنے جھونپڑی میں دونوں بیٹھے ہوے ہیں۔ گھر میں کوئی سامان نہیں۔ ادھر شاہی محل میں ثروت ہے۔ جاہ و حشم ہے۔ مگر اندرا یہ سب کچھ محبت پر نثار کر دیتی ہے۔

(15)

اندرا کو محل سے نکال کر اور اس کی طرف سے بے فکر ہو کر پدما کی طبعی شرافت جو کچھ دنوں حسد کے باعث پس پردہ ہوگئی تھی، نمودار ہو جاتی ہے۔ اور دل و جان سے گیان سنگھ کی خدمت کرتی ہے۔ اس یاس و غم کی حالت میں اگر وہ کچھ کھاتا ہے، تو اسی کے اصرار سے۔ سیر کرنے جاتا ہے، تو اسی کے کہنے سے۔ ریاست کے کاروبار دیکھتا ہے، تو اسی کے ایماء سے۔ وہ کبھی گیت گا کر، کبھی افسانے سنا کر اس کا دل بہلاتی ہے۔ لیکن اکثر راتوں کو راجہ کی نیند کھل جاتی ہے۔ اور اندرا کو یاد کر کے بے تاب ہو جاتا ہے۔ تب حسد کی آگ اس کے سینہ میں مشتعل ہو جاتی ہے۔ اندرا کسی غیر کی ہو کر رہے۔ یہ خیال اس کے لیے نا قابل برداشت ہے۔ وہ تپسونی بن کر رہتی تو غالبًا اس کے قدموں کی خاک ماتھے پر لگاتا۔ مگر وہ کسی غیر کے پہلو میں ہے۔ یہ خیال کر کے اس کے جسم میں آگ لگ جاتی ہے۔

گیان سنگھ کے مخبر اور جاسوس چاروں طرف چھوٹے ہوئے ہیں۔ ایک دن اسے خبر ملتی ہے کہ اندرا سانگلی کے ایک موضع میں ہے۔ گیان سنگھ اسی وقت چند آزمودہ سپاہیوں اور جان نثار رفیقوں کو لے کر اندرا اور ہری ہر کی تلاش میں چل کھڑا ہوتا ہے۔ پدما اسے روکتی ہے۔ منتیں کرتی ہے۔ مگر وہ مطلق پروا نہیں کرتا۔ آخر مجبور ہو کر وہ بھی اس کے ساتھ چل کھڑی ہوتی ہے۔ سبھی آدمی گھوڑوں پر سوار ہیں۔ اور ڈبل چال چل رہے ہیں۔ دشوار گزار پہاڑی راستہ ہے۔ گیان سنگھ اور پدما ہمراہیوں سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ دفعتاً کئی مسلح ڈاکوؤں سے ان کا سامنا ہو جاتا ہے۔ پدما اپنے پستول سے دو آدمیوں کو واصل جہنم کر دیتے ہیں۔ باقی ڈاکو بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ کئی دن کے بعد یہ جماعت اس موضع میں پہنچ جاتی ہے۔ جہاں اندرا اور ہری ہر اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

دم کے دم میں خبر پھیل جاتی ہے کہ راجہ گیان سنگھ اندرا اور ہری ہر کو گرفتار کرنے چڑھ آئے ہیں۔ قرب وجوار کے دہقانی لاٹھیاں، گنڈ اسے اور کلہاڑے لے کر آتے ہیں۔ اندرا اور ہری ہر دونوں جماعتوں کے بیچ میں آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی گیان سنگھ تلوار کھینچ کر ان پر جھپٹتا ہے۔ اندرا اور ہری ہر وہیں سر جھکا کر بیٹھ جاتے ہیں اور پرماتما کا دھیان کرنے لگتے ہیں۔ قریب ہے کہ تلوار ہری ہر کی گردن پر پڑے کہ پدما آجاتی ہے اور لپک کر راجہ کے ہاتھ سے تلوار چھین لیتی ہے۔ دونوں محبت کے شیدائیوں کی یہ جاں بازی اور بے نفسی دیکھ کر گیان سنگھ کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اس کے دل میں دفعتاً اس روشنی کا ظہور ہوتا ہے۔ جس کے سامنے کمزوریاں اور نفس کی سر کشیاں مٹ جاتی ہیں۔ وہ ایک منٹ تک خاموش کھڑا رہتا ہے۔ پھر اندرا کے قدموں پر گر پڑتا ہے۔ پدما اسے ایک ایسے فعل سے باز رکھ کر، جو راجہ صاحب کی زندگی کا خاتمہ کر دیتا، ان کے دل پر فتح پا جاتی ہے۔

گیان سنگھ ایک لمحہ میں اندرا کے قدموں سے اٹھ کر پدما کو گلے لگا لیتا ہے۔ اندرا بھی پدما کو سینہ سے لگا لیتی ہے۔ پھر ہری ہر اور گیان سنگھ بغلگیر ہوتے ہیں۔

(یہ افسانہ 'آخری تحفہ' میں شائع ہوا۔ ہندی میں ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔)

سکون قلب

مرحوم سری ناتھ میرے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ آج بھی جب ان کی یاد آجاتی ہے، تو وہ پُر لطف صحبتیں آنکھوں میں پھر جاتی ہیں اور ذرا دیر رو لیتا ہوں۔ ہمارے درمیان دو ڈھائی سو میل کا فاصلہ تھا۔ میں لکھنؤ میں، وہ دہلی میں، مگر شاید ہی کوئی ایسا مہینہ گزرتا ہو کہ ہم آپس میں نہ مل جاتے۔ آزاد، روشن خیال، زندہ دل، یار باش اور وفا پرور آدمی تھے۔ جس نے اپنے اور پرائے میں کبھی امتیاز نہیں کیا۔ دنیا کیا چیز ہے اور یہاں ظاہر داریوں کا کیسے نباہ ہوتا ہے۔ یہ اس شخص نے کبھی نہ جاننے کی کوشش کی۔ زندگی میں ایسے موقعے بار بار آئے، جب انھیں آئندہ کے لیے عبرت ہونی چاہیے تھی۔ دوستوں نے ان کی علو ہمّتی سے ناجائز فائدے اُٹھائے۔ کئی بار شرمندگی بھی ہوئی۔ لیکن اس مرد خدا نے زندگی سے کوئی سبق لینے کی قسم کھالی تھی۔ اس کی روش میں کوئی تغیّر نہ ہوا۔ وہ جیسے سہل اعتقاد جئے، ویسے ہی سہل اعتقاد مَرے۔ جس وقت میں وہ رہتے تھے، وہ نرالی دنیا تھی جس میں بدگمانی اور دوراندیشی اور حیلہ سازی کا شائبہ تک نہ تھا۔ سب اُن کے اپنے تھے۔ کوئی غیر نہ تھا۔ میں نے انھیں حقائق زندگی سے متنبہ کرنے کی بار بار کوشش کی۔ مگر اس کا اثر ہمیشہ توقع کے خلاف ہوا۔ وہ کبیدہ خاطر ہو جاتے اور معلوم ہوتا تھا کہ انھیں مصلحت آمیزانہ خیر اندیشیوں سے رُوحانی صدمہ ہوتا ہے۔ مجھے اکثر یہ فکر ہوتا تھا کہ ان کی فیاضیوں کا اگر یہی حال رہا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ مگر مصیبت یہ تھی کہ ان کی بیوی گویا بھی کچھ اس سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ہماری دیویوں میں جو احتیاط عموماً برتی جاتی ہے اور ہمیشہ ایسے ہی لااُبالی مزاج مردوں کی کم اندیشیوں پر ہر ایک کام کرتی ہے۔ وہ گویا مفقود تھی یہاں تک کہ اُسے زیور اور کپڑوں سے بھی کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ چنانچہ جب مجھے سری ناتھ کی وفات کی خبر ملی اور میں دہلی گیا تو گھر میں بجز برتن بھانڈے اور مکان کے کوئی اثاثہ باقی نہ تھا اور ابھی مرحوم کی عمر ہی کیا تھی۔ چالیس

سال بھی تو پورے نہ ہوئے تھے۔ پہلے ایک لڑکی ہوئی تھی، اس کے بعد دو لڑکے تو کم عمر ہی میں داغ دے گئے۔ لڑکی بچ رہی تھی۔ اس کا چودہواں سال تھا۔ اور یہی اس ناٹک کا سب سے خطرناک حصّہ تھا۔ جس معاشرت کا یہ کنبہ عادی تھا، اس کے لیے اس اختصار کے باوجود کم سے کم سو روپیہ ماہوار کی ضرورت تھی، اور آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اور دو ڈھائی سال میں لڑکی کی شادی بھی کرنی ہے۔ اس کی سبیل کیا ہوگی؟ میری عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ مجھے اس وقت یہ بیش بہا تجربہ ہوا کہ جو لوگ واقعی بے لوث، نیک طینت اور دوست پرور ہوتے اور قرض سے ہمیشہ پاک رہتے ہیں، اُن کے پسماندوں کو آڑ دینے والوں کی کمی نہیں رہتی۔ یہ کوئی عام قاعدہ نہیں ہے۔ میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے، جنھوں نے زندگی میں بہتوں کے ساتھ سلوک کیے مگر ان کے بعد کسی نے ان کے عیال کی بات تک نہ پوچھی۔ لیکن چاہے کچھ بھی ہو، سری ناتھ کے احباب نے قابل تعریف وفاداری سے کام لیا۔ اور گوپا کے گزران کے لیے ایک مستقل رقم جمع کر دینے کی تجویز کی۔ اور ایک صاحب تو اس سے شادی کرنے کو بھی تیّار تھے۔ مگر گوپا نے اس خودداری کا ثبوت دیا جو ہماری دیویوں کا جوہر ہے۔ اور کسی کی دست نگر نہ بنی۔ اس نے اپنے مکان کا بڑا حصّہ کرایہ پر اُٹھا دیا۔ اور خود اس کے ایک حصّہ میں گزارا کرنے لگی۔ پچیس روپے اس کے لیے کافی تھے۔ لڑکی ایک مدرسہ میں پڑھتی تھی۔ جو کچھ خرچ تھا، اس کی ذات سے تھا۔ گوپا کے لیے تو اب زندگی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

(2)

اس کے ایک ہی مہینے بعد مجھے کاروبار کے سلسلہ میں یورپ جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں مجھے امید کے خلاف دو سال لگ گئے۔ وہاں میں برابر گوپا سے خط و کتابت کرتا رہتا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کی زندگی اطمینان سے بسر ہو رہی ہے... کا کوئی موقعہ نہیں ہے۔ حالانکہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گوپا نے یہاں بے ضرورت پردہ داری برتی اور مجھے غیر سمجھ لیا۔ انگلینڈ سے واپس آنے پر میں سیدھا دہلی پہنچا۔ دروازہ پر پہنچتے ہی مجھے بے اختیار رونا آ گیا اور درو دیوار سے حسرت برس رہی ہے۔ جس کمرے میں احباب کے جمگھٹے رہتے تھے اس کے دروازے بند تھے۔ اور مکڑیوں کے جالے ان کی

پاسبانی کر رہے تھے۔ مرحوم کی وہ مانوس آواز جسے سُن کر میں اپنے سارے غم بھول جاتا تھا، اس کی جگہ ایک ماتمی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ سری ناتھ دروازے پر کھڑے میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ میں باطل پرست نہیں ہوں، اور ارواح کی جسمانیت میں مجھے شبہ ہے۔ لیکن اس وقت ذرا دیر کے لیے میں چونک ضرور پڑا۔ اور میرے دل میں ایک ارتعاش سا ہونے لگا۔ لیکن دوسری نظر میں وہ صورت غائب ہو چکی تھی۔ میں نے زنجیر کھٹکھٹائی۔ دروازہ کھلا۔ گوپا کے سوا کھولنے والا ہی کون تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر دل تھام لیا۔ اگرچہ اسے میرے آنے کی خبر تھی۔ اور آج میری آمد کے انتظار میں اس نے نئی ساڑی پہن لی تھی۔ اور شاید بالوں میں کنگھی بھی کر لی تھی۔ لیکن ان دو برسوں میں قدرت نے اس کے ساتھ جو ستم کیا تھا۔ اسے کیا کرتی؟ یہ وہ سِن ہے جب حُسن اپنے پورے شباب پر آتا ہے۔ جب اس میں بے نیازی اور الّھڑ پن اور استغنا کی جگہ کشِش اور حلاوت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن گوپا بوڑھی ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر جھرّیاں تھیں، جسے ارادی بشاشت بھی دور نہ کر سکتی تھی۔ بالوں پر سفیدی دوڑ چلی تھی۔ اور ایک ایک عضوخستہ حالی کی شہادت دے رہا تھا۔ سوگوار آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میں نے رقّت آمیز لہجہ میں پوچھا۔

''کیا تم بیمار تھیں گوپا''؟

گوپا نے جواب دیا۔ ''نہیں تو۔ مجھے سر کا دَرد بھی کبھی نہیں ہوا''۔

''تو تمھاری یہ کیا حالت ہے؟ بالکل بوڑھی ہو گئی ہو''۔

''تو اب جوانی لے کر کیا کروں گی؟ میری عمر بھی تو پینتیس سے اوپر ہو گئی''۔

''پینتیس کی عمر تو بہت زیادہ نہیں ہوتی''۔

''ہاں ان کے لیے جو بہت جینا چاہتے ہیں۔ میں تو چاہتی ہوں جتنی جلدی ہو سکے زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ بس سنی کے بیاہ کی فکر ہے۔ اس سے نجات پا جاؤں۔ پھر مجھے زندگی کی پرواہ نہ رہے گی''۔

اب معلوم ہوا کہ جو صاحب اس گھر میں کرایہ دار ہوئے وہ چند مہینوں کے بعد تبدیل ہو کر چلے گئے اور جب سے کوئی دوسرا کرایہ دار نہ آیا۔ میرے دل میں برچھی سی چُبھ گئی۔ ان دو برس تک ان غریبوں کی کیونکر بسر ہوئی۔ یہ خیال ہی جگر دوز تھا۔

میں نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا۔ ''لیکن تم نے مجھے ان حالات کی بالکل اطلاع نہ دی۔ تم نے مجھے بالکل غیر سمجھ لیا۔''

گوپا نے نادم ہو کر کہا: ''میں نے سمجھا تم پردیس میں خود ہی پریشانیوں میں مُبتلا ہوگے۔ تمھیں کیوں ستاؤں۔ کسی نہ کسی طرح دن کٹ گئے۔ گھر میں اور کچھ نہ تھا تو تھوڑے سے زیور تو تھے ہی۔ اب سنیتا کی شادی کی فکر ہے۔ پہلے میں نے سمجھا تھا اس مکان کو بیچ کر دوں گی۔ بیس بائیس ہزار مل جائیں گے۔ شادی بھی ہو جائے گی اور شاید کچھ میرے لیے بچ رہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ مکان پہلے ہی رہن ہو چکا ہے، اور اصل اور سود مل کر بیس ہزار ہو گیا ہے۔ مہاجن کی اتنی ہی عنایت کیا کم تھی کہ مجھے گھر سے نکال دیا۔ اس لیے اب ادھر سے بھی کوئی امید نہیں ہے۔ شاید منّت سماجت کرنے پر دو ہزار اور مل جائیں۔ اتنے میں کیا ہوگا۔ اسی فکر میں گھلی جا رہی ہوں۔ لیکن میں بھی کتنی خود غرض ہوں۔ تمھیں ہاتھ دھونے کو پانی بھی نہ دیا۔ کچھ ناشتہ بھی نہ لائی۔ اور اپنا دُکھڑا لے بیٹھی۔ آپ کپڑے اُتاریئے۔ کچھ کھانے کو پکاؤں۔ کھا پی لیجیے۔ تب باتیں ہوں۔ مکان پر تو سب خیریت ہے''؟

میں نے کہا: ''میں تو سیدھا ممبئی سے یہاں آرہا ہوں۔ گھر کہاں گیا''۔

گوپا نے مجھے ملامت آمیز آنکھوں سے دیکھا۔ مگر اس ایک جُملہ میں خدا جانے کیا جادو تھا، معجزہ تھا، اس کے چہرے کی ساری جھریاں مٹ گئیں۔ اور زرد چہرہ پر ایک ہلکی سی سُرخی دوڑ گئی۔ اور ملامت میں کتنا اِستحسان، کتنی محبت، کتنا اعتماد، کتنی مسرّت بھری ہوئی تھی۔ وہ حُسن جو کسم پرسی اور عُسرت و بے نوائی کے ہاتھوں پامال ہو رہا تھا، نمودار ہو گیا۔

''اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمھاری دیوی جی تمھیں کبھی یہاں نہ آنے دیں گی''۔

''میں کسی کا غلام نہیں ہوں''۔

''کسی کو اپنا غلام بنانے کے لیے خود بھی اس کا غلام بننا پڑتا ہے''۔

شام ہو رہی تھی۔ جاڑوں کے دن تھے۔ سُنیتا مدرسے سے آئی۔ دو سال پہلے کی الّھڑ چھوکری، اس وقت حسین اور خوش قامت لڑکی تھی۔ جس کی ہر ایک جنبش، ہر ایک نگاہ، ہر ایک بات ایک ادا تھی۔ جسے میں گود میں اُٹھا کر پیار کرتا تھا۔ اس کی طرف

آنکھیں نہ اُٹھا سکا۔ اور وہ جو میرے گلے سے لپٹ کر خوش ہوتی تھی آج میرے سامنے کھڑی بھی نہ رہ سکی۔ جیسے مجھ سے کوئی چیز چھپانا چاہتی ہے۔ اور جیسے میں اس چیز کو چھپانے کا موقعہ نہ دے رہا ہوں۔

میں نے پوچھا۔ ''اب تم کس درجہ میں پہنچیں سُنی''؟

''اس نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔ دسویں میں ہوں''۔

''گھر کا بھی کچھ کام کاج کرتی ہو''؟

''اماں جب کرنے بھی دیں''۔

گوپا بولی۔ ''میں ہی نہیں کرنے دیتی یا تو خود کسی کام کے قریب نہیں جاتی''۔

سُنی منہ پھیر کر ہنستی ہوئی چلی گئی۔ ماں کی دُلاری لڑکی تھی۔ جس دن وہ رسوئی میں جاکر کچھ کام کرتی، اس دن شاید گوپا رو رو کر آنکھیں پھوڑ لیتی۔ وہ خود لڑکی کو کوئی کام نہ کرنے دیتی تھی، مگر سب سے شکایت کرتی تھی کہ وہ کوئی کام نہیں کرتی۔ شکایت بھی اس کے پیار کا ہی ایک کرشمہ تھی۔

میں کھانا کھا کر لیٹا تو گوپا نے سُنی کی تیاریوں کا ذکر شروع کیا۔ اس کے سوا اس کے پاس اور بات ہی کیا تھی؟ لڑکے تو بہت ملتے تھے۔ لیکن کچھ حیثیت بھی تو ہو۔ لڑکی کو یہ سوچنے کا موقعہ ہی کیوں ملے کہ دادا زندہ ہوتے تو شاید میرے لیے زیادہ اچھا گھر تلاش کرتے۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے لالہ مداری لال کے لڑکے کا ذکر کیا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ لالہ مداری لال پہلے ایگزیکٹوانجینیر تھے۔ اب پنشن پاتے تھے۔ لاکھوں روپے جمع کر لیے تھے۔ پر اب تک ان کی حرص کی پیاس نہ بجھی تھی۔ ساری دنیا کی دولت کھینچ کر اپنے گھر میں بھر لینا چاہتے تھے۔ گوپا نے گھر بھی وہ چھانٹا جہاں اس کی رسائی مشکل تھی۔ میں نے اعتراض کیا۔ لالہ مداری لال تو بڑے بد دماغ آدمی ہیں۔

گوپا نے تردید کی۔ ''نہیں! تم نے ابھی انھیں پہچانا نہ ہوگا۔ میرے اوپر بہت مہربان ہیں۔ کبھی کبھی آکر خیر و عافیت پوچھ جاتے ہیں۔ لڑکا ایسا قبول صورت ہے کہ میں تم سے کیا کہوں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھگوان نے اسے سُنی ہی کے لیے بنایا ہے۔ انجینیر صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے میں تم سے جہیز وغیرہ نہیں چاہتا۔ میں نے

سمجھا وہ سہل اعتقادی جس نے سری ناتھ کو تباہ کیا، گوپا پر بھی غالب ہے۔ میں نے بھی خیال کیا کہ کیوں کسی سے بدگمانی کروں؟ ممکن ہے مداری لال کی طبیعت دولت سے سیر ہو گئی ہو۔ میں نے نیم راضی ہو کر کہا:

''مگر یہ تو سوچو کہ ان کی حیثیت تم سے کتنی زیادہ ہے۔ شاید تم اپنا سب کچھ قربان کر کے بھی ان کا منہ نہ سیدھا کر سکو''۔ لیکن گوپا کے دل میں بات جم گئی تھی۔ مداری لال نے اس پر جادو ڈال دیا تھا۔ سُنی کو وہ ایسے گھر میں بیاہنا چاہتی تھی جہاں وہ رانی بن کر رہے۔

گوپا نے میری باتوں پر التفات نہ کیا۔ وہ بولی۔ ''مداری لال بہت ہی شریف اور بے لوث آدمی ہیں۔ تم ان سے مل کر خوش ہو گے۔ صبح ان کے پاس جاکر اس معاملہ کو طے کرو۔ میں اب تک ان سے صاف کچھ نہیں کہہ سکی۔ لیکن مجھے امید ہے کہ جہیز کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ میں بیوہ ہوں، غریب ہوں، بیکس ہوں، مجھ پر رحم کریں گے''۔

دوسرے دن سویرے میں لالہ مداری لال کے پاس گیا اور ان سے میری گفتگو ہوئی۔ اسی نے مجھے ان کا مدّاح بنا دیا۔ کسی زمانے میں وہ سخت گیر رہتے ہوں گے۔ اس وقت تو بہت منکسرالمزاج، بے حد خلیق، نہایت وضعدار بزرگ تھے۔ بولے۔ ''بھائی صاحب میں سری ناتھ جی سے واقف ہوں۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ ان کی لڑکی میرے گھر میں آئے، یہ میری خوش نصیبی ہے۔ آپ اس کی ماں سے کہہ دیں کہ مداری لال ان سے کسی چیز کا طالب نہیں۔ ایشور کا دیا ہوا میرے گھر میں بہت کچھ ہے۔ وہ کوئی تردّد نہ کریں۔ میں انھیں زیر بار نہیں کرنا چاہتا''۔

میرے دل کا بوجھ اُتر گیا۔ ہم سُنی سُنائی باتوں سے دوسروں کے متعلق کتنی غلط رائے قائم کر لیا کرتے ہیں۔ اس کا خوشگوار تجربہ ہوا۔ میں خوش لوٹا اور گوپا کو اس خوش قسمتی پر مبارک باد دی۔ یہ فیصلہ ہوا کہ گرمیوں میں شادی ہوجائے۔ اسی ....

(3)

یہ چار مہینے گوپا نے شادی کی تیاریوں میں صرف کیے۔ میں مہینہ میں ایک بار ضرور اس سے مل آتا تھا۔ لیکن ہر بار غمناک اثر لے کر آتا۔ گوپا نے اپنی خاندانی

عظمت کا خدا جانے کیا معیار دل میں قائم کر لیا تھا۔ غریب اس وہم میں پڑی ہوئی تھی کہ اس کی علوہمّتی شہر میں اپنی یاد گار چھوڑ جائے گی۔ یہ نہ جانتی تھی کہ یہاں ایسے تماشے روز ہوتے ہیں۔ اور دوسرے ہی دن بھلا دیے جاتے ہیں۔ شاید وہ دنیا سے یہ خراج لینا چاہتی ہے کہ اس بے نوائی اور بے سرو سامانی میں بھی لُٹا ہوا ہاتھی نولاکھ کا ہے۔ قدم قدم پہ سری ناتھ کی یاد آتی۔ وہ ہوتے تو یہ کام یوں ہوتا، یوں نہ ہوتا اور پھر وہ روتی۔ مداری لال شریف آدمی ہیں۔ اس سے کسی چیز کے خواستگار نہیں، لیکن اس کا بھی تو لڑکی کے ساتھ کچھ فرض ہے۔ سُنی کے لیے اس نے جتنے زیور اور جوڑے تیار کیے انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ جب دیکھیے کچھ نہ کچھ سی رہی ہے۔ کبھی سُناروں کی دُکان پر بیٹھی ہوئی ہے۔ کبھی بازار سے مہمانوں کی ضیافت کے سامان خرید رہی ہے۔ محلے میں شاید ہی کوئی ایسا خوش حال آدمی تھا۔ جس سے اس نے قرض نہ لیا ہو۔ وہ اسے قرض سمجھتی تھی، مگر دینے والے امداد سمجھ کر دیتے تھے۔ سارا محلّہ اس سے ہمدردی کر رہا تھا۔ سُنی اب محلّہ کی لڑکی تھی۔ گوپا کی عزّت کے ساتھ محلّے والوں کی عزت بھی وابستہ ہے اور گوپا کے لیے تو نیند اور آرام حرام۔ درد سے سر پھٹا جا رہا ہے۔ آدھی رات ہوگئی ہے، مگر وہ بیٹھی کچھ نہ کچھ سی رہی ہے۔ کتنا بلند حوصلہ تھا۔ کسی بات کی مطلق پروا نہ کرتی۔ اکیلی عورت اور وہ بھی نیم جان اور نحیف، کیا کیا کرے۔ جو کام خود نہیں کرتی اسی میں کچھ کسر رہ جاتی ہے۔ مگر اس کی ہمت ہے کہ کسی طرح نہیں ہارتی۔ پچھلی بار کی ملاقات میں بھی اس کی حالت دیکھ کر مجھے بڑی فکر ہوئی۔ میں نے کہا۔ گوپا اگر مرنا ہی چاہتی ہو تو شادی ہو جانے کے بعد مرو۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں اس سے قبل ہی پروانہ نہ آجائے۔

گوپا کا پژ مردہ چہرہ کِھل اُٹھا۔ بولی۔ اس کی فکر نہ کرو بھیّا۔ بیوہ بڑی سخت جان چیز ہے، لیکن آرزو یہی ہے کہ سُنی کا ٹھکانہ لگا کر میں بھی چل دوں۔ اب اور جی کر کیا کروں گی۔ اگر کسی طرح کی بے عنوانی ہوئی تو کس کی بد نامی ہوگی۔ ان چار مہینوں میں مشکل سے رات کو ایک گھنٹے سوئی ہوں گی۔ نیند ہی نہیں آتی۔ مگر میرا دل خوش ہے۔ میں مَروں یا جیوں، مجھے اطمینان تو ہوگا کہ سنی کے لیے جو کچھ کر سکتی تھی وہ میں نے کر دیا۔ مداری لال نے شرافت کا ثبوت دیا تو مجھے بھی ان کی شرافت کا جواب دینا ہے۔

اسی وقت ایک دیوی نے آکر گوپا سے کہا۔ ''بہن چل کر ذرا دیکھ لو، چاشنی ٹھیک ہو گئی ہے یا نہیں''۔ گوپا اس کے ساتھ چاشنی کا معائنہ کرنے گئی، اور ایک لمحہ کے بعد آکر بولی۔ ''جی چاہتا ہے سر پیٹ لوں۔ تم سے ذرا باتیں کرنے لگی، ادھر چاشنی اتنی سخت ہو گئی کہ لڈو دانتوں سے مڑیں گے، کس سے کیا کہوں''۔ میں نے کہا۔ ''تم ناحق یہ درد سری مول لے رہی ہو۔ کیوں نہیں کسی حلوائی کو بلا کر مٹھائیوں کا ٹھیکہ دے دیتیں۔ پھر تمھارے یہاں مہمان ہی کتنے آئیں گے جن کے لیے یہ طومار باندھ رہی ہو۔ دس پانچ روپے کی مٹھائی ان کے لیے کافی ہوگی''۔

گوپا نے میری طرف درد ناک آنکھوں سے دیکھا۔ ان میں آنسو کے قطرے بھرے ہوئے تھے۔ ''بھیّا، تم یہ باتیں نہ سمجھو گے۔ تمھیں نہ ماں بننے کا اتفاق ہوا ہے نہ بیوی بننے کا۔ سنی کے بابو جی کا کتنا نام تھا، ان کی کتنی عزّت تھی، کتنے آدمیوں کو اُن سے فیض پہنچتا تھا! وہ پگڑی میرے ہی تو سر بندھی ہے۔ تمھیں شاید یقین نہ آئے مگر میں تو انھیں ہمیشہ اپنے اندر بیٹھا ہوا پاتی ہوں۔ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ کر رہے ہیں۔ میں بے عقل اکیلی عورت کیا کر لیتی؟ وہی میرے رہبر ہیں۔ وہی میرے مشیر ہیں۔ وہی میرے مددگار ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ یہ قالب میرا ہے۔ لیکن اس کے اندر جو روح ہے وہ اُن کی ہے۔ تم ان کے دوست ہو۔ لیکن تم نے اپنے سینکڑوں روپے بھی خرچ کیے اور دادو دہش بھی کر رہے ہو۔ میں تو ان کی بیوی ہوں، دُنیا میں بھی اور عاقبت میں بھی''۔ یہ سن کر میں لاجواب ہو گیا۔

(4)

جون میں شادی ہو گئی۔ گوپا نے بہت کچھ دیا۔ اور اپنی حیثیت سے بہت زیادہ دیا۔ لیکن اسے تسکین نہ تھی۔ آج سنی کے دادا ہوتے تو نہ جانے کیا کرتے۔ برابر روتی رہی۔ جاڑوں میں میں پھر دہلی گیا۔ میں نے سمجھا تھا کہ اب گوپا خوش ہوگی لڑکی اچھے گھر میں پہنچ گئی ہے اور آرام سے ہے۔ گوپا کے لیے اس کے سوا اور کیا چاہیے۔ لیکن خوشی شاید اس کی تقدیر میں نہ تھی۔

میں اطمینان سے بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے شکایتوں کا دفتر کھول دیا۔ گھر بار

سب اچھا ہے۔ ساس سسر سب اچھے ہیں، لیکن داماد آوارہ مزاج ہے۔ سُنی بے چاری رو رو کر دن کاٹ رہی ہے۔ تم اسے دیکھو تو پہچان نہ سکو، بالکل سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ ابھی کئی دن ہوئے آئی تھی۔ جیسے زندگی میں اپنا راستہ کھو بیٹھی ہو۔ نہ تن بدن کی سُدھ ہے، نہ کپڑے لتّے کی۔ میری سُنی کی یہ حالت ہوگئی، اس کا تو مجھے خواب میں بھی گمان نہ تھا۔ بالکل گم سُم ہو گئی ہے۔ کتنا پوچھا۔ بیٹی وہ تجھ سے کس بات سے ناراض ہے۔ لیکن جواب ہی نہیں دیتی۔ آنکھوں سے آنسو گرتے رہتے ہیں۔ میری سُنی کنوئیں میں گر گئی"۔

میں نے پوچھا۔ "لیکن اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی ہی۔ تم نے کسی اور سے نہیں دریافت کیا؟"

گوپا بولی۔ "پوچھا کیوں نہیں بھیّا۔ سب حال معلوم ہو گیا۔ وہ کہتا ہے میں جو چاہوں کروں، مگر سنی میری پوجا کرتی رہے۔ سنی بھلا اسے کیوں برداشت کرنے لگی۔ اسے تو تم جانتے ہو کتنی خوددار لڑکی ہے۔ وہ ان عورتوں میں نہیں ہے جو شوہر کو دیوتا سمجھتی ہیں۔ اور اس کی ہر ایک جابے جا حرکت کو برداشت کرتی ہیں۔ اس نے ہمیشہ لاڈ اور پیار پایا ہے۔ باپ بھی ہمیشہ اس پر جان دیتا تھا۔ میں بھی اس کی ناز برداری کرتی تھی۔ شوہر ملا رنگین مزاج جو آدھی رات تک مارا مارا پھرتا ہے۔ دونوں میں نہ معلوم کیا بات ہوئی۔ لیکن مجھے تو ایسا اندیشہ ہو رہا ہے کہ دونوں میں کوئی گانٹھ پڑ گئی ہے۔ نہ وہ سنی کی پرواہ کرتا ہے، نہ سُنی اس کی پرواہ کرتی ہے۔ مگر وہ تو اسی طرح اپنے رنگ میں مست ہے۔ سُنی رو رو کر آنکھیں پھوڑے ڈالتی ہے"۔

میں نے کہا۔ "لیکن تم نے سنی کو سمجھایا نہیں۔ لڑکے کا کیا بگڑ گیا۔ وہ تو کل دوسری شادی کر لے گا۔ سُنی کی زندگی تو خراب ہو جائے گی"۔ گوپا کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ "بھیا کس دل سے سمجھاؤں، اسے دیکھ کر تو میری چھاتی پھٹنے لگتی ہے۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ اسے اپنے کلیجے میں رکھ لوں کہ اسے کوئی گرمائی آنکھ سے دیکھ ہی نہ سکے۔ سنی آرام طلب ہوتی، بدسلیقہ ہوتی، تند مزاج ہوتی تو سمجھاتی بھی۔ کیا یہ سمجھاؤں کہ تیرا شوہر گلی گلی آوارہ پھرتا پھرے، پھر بھی تو اس کی پوجا کیا کر۔ میں کیا یہ ذلت پسند کرتی۔ میاں بیوی میں نباہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ دونوں بالکل ایک ہو جائیں۔ ایسے مرد تو بہت کم ہیں جو عورت میں جوہر انحراف بھی گوارا کر سکیں۔ لیکن ایسی عورتیں بھی ہیں جو

شوہر کو آزاد سمجھتی ہیں۔ سُنی ان عورتوں میں نہیں ہے۔ وہ اگر دل و جان شوہر کی نذر کرتی ہے۔ تو یہ چاہتی ہے کہ وہ اپنا دل و جان اس کی نذر کرے۔ اور اگر شوہر بے وفا ہو تو اس سے کوئی تعلق نہ رکھے گی۔ چاہے اس کی زندگی رو رو کٹے''۔

مجھ سے یہ کہہ کر گوپا اندر گئی اور ایک صندوقچہ اٹھا لائی۔ اور مجھے اس کے اندر کے زیور دکھا کر بولی۔ ''سُنی اب کے اسے یہیں چھوڑ گئی۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو میں نہ جانے کن کن پریشانیوں سے بنوائی تھیں۔ ان کے پیچھے مہینوں ماری ماری پھری تھی۔ سُنی ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتی ہے۔ پہنے تو کس کے لیے، سنگار کرے تو کس پر۔ پانچ صندوق کپڑوں کے دیے تھے۔ کپڑے سیتے سیتے میری آنکھیں پھوٹ گئیں۔ سُنی اب کے سارے کپڑے اُٹھا لائی۔ ان چیزوں سے اسے جیسے نفرت ہوگئی ہے۔ بس ہاتھ میں کانچ کی دو چوڑیاں اور معمولی ساری یہی اس کا سنگار ہے۔

میں نے گوپا کو تشفّی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں جاکر ذرا سُنی کے شوہر سے ملوں گا۔ اور اسے سمجھا بجھا کر راستے پر لانے کی کوشش کروں گا''۔

گوپا نے میری طرف ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''نہیں بھیّا۔ بھول کر بھی نہ جانا۔ سُنی سنے گی تو جان ہی دے دے گی۔ بڑی مغرور ہے، وہ بیحد مغرور ہے۔ اسے رسّی سمجھ لو جس کے جل جانے پر بھی بل نہیں جاتا۔ جن پیروں نے اسے ٹھکرایا ہے وہ انھیں کبھی نہ سہلائے گی۔ اسے اپنا بنا کر کوئی چاہے تو لونڈی بنالے۔ لیکن حکومت تو اس نے میری نہیں برداشت کی۔ دوسروں کی کیا کرے گی''۔ میں نے گوپا سے تو اس وقت کچھ نہ کہا۔ لیکن موقعہ ملتے ہی لالہ مداری لال کے پاس گیا۔ میں چاہتا تھا کہ اصلی حقیقت کا پتہ لگاؤں۔ اتفاق سے لالہ صاحب اور ان کے صاحبزادے کیدار دونوں ایک ہی جگہ مل گئے۔ شاید ان میں کسی مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کیدار نے اس طرح جھک کر میرے قدم چھوئے کہ میں اس کی سعادت مندی پر فریفتہ ہو گیا۔ چائے، پان، مٹھائی اور مربے سے میری خاطر کی۔ اتنا مؤدّب، اتنا شائستہ اور سلیم الطبع تو جوان میری نظر سے نہ گزرا تھا۔ یہ گمان ہی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ شخص ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ اور ہو سکتا ہے۔ جب میں کچھ پوچھتا بڑے ادب سے سر جھکا کر جواب دیتا اور بلا ضرورت ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالتا۔

جب کیدار ٹینس کھیلنے چلا گیا تو میں نے لالہ مداری لال سے کہا کہ مجھے کو کیدار بابو بہت شائستہ مزاج معلوم ہوتے ہیں۔ پھر میاں بیوی میں کیوں یہ بد مزگی پیدا ہو گئی ہے"۔

مداری لال نے تامّل کے ساتھ کہا۔ "اس کا سبب اس کے سوا اور کیا بتاؤں کہ دونوں اپنے ماں باپ کے لاڈلے ہیں۔ اور پیار بچّوں کو شوریدہ سر بنا دیتا ہے۔ میری ساری زندگی کش مکش میں گزری۔ اب ضعیفی میں جاکر ذرا اطمینان نصیب ہوا ہے۔ نفس پروری کا کبھی موقعہ نہ ملا۔ دن بھر مزدوری کرتا تھا۔ شام کو پڑکر سو رہتا تھا۔ صحت خراب تھی ہی، ہمیشہ یہ فکر سوار رہتا تھا کہ کچھ جمع کر لوں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے بعد بیوی بچّے دوسروں کے دست نگر ہو جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان حضرت کو مفت کی دولت ملی، جو فرمائش کرتے تھے وہ پوری ہو جاتی تھی۔ ڈراما کھیلنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس پر ہزاروں روپے پھونک دیے۔ پڑھنا لکھنا تو درکنار۔ بس ڈرامہ کی دھن رہنے لگی۔ رنگ اور گہرا ہوا۔ اپنی زندگی کا ڈرامہ کھیلنے لگے۔ میں نے یہ دیکھا تو سوچا کہ جلدی سے شادی کردوں۔ راہ راست پر آجائے گا۔ گوپا دیوی نے پیغام دیا تو میں نے فوراً منظور کرلیا۔ میں نے ان کی لڑکی کو دیکھا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ حسین بیوی پا کر اس کی طبیعت یکسو ہو جائے گی۔ مگر وہ بھی لاڈلی لڑکی تھی۔ زمانہ کے نشیب وفراز سے نا واقف۔ رواداری کی حقیقت سے محروم۔ وہ احتراز سے اسے زیر کرنا چاہتی ہے، یہ بے اعتنائی سے۔ میں تو صاحب اس معاملہ میں بہو کو زیادہ خطاوار سمجھتا ہوں۔ لڑکوں میں بالعموم ذمّہ داری کا خیال کم ہوتا ہے۔ لڑکیاں فطرتاً زیادہ ذمّہ دار ہوتی ہیں۔ اور اپنی خدمت اور قربانی سے شوہر کو اپنی جانب مائل کر لیتی ہیں۔ بہو میں یہ بات نہیں، بس یہی بد مزگی کا سبب ہے۔ بظاہر دونوں بڑے مہذّب، بڑے نیک، بڑے متحمل مزاج، لیکن ایک کے باطن میں خودداری اور تکبّر کا جنون ہے۔ دوسرے کے باطن میں آزاد روی، کج فہمی کا فتور۔ کشتی کیسے پار ہوگی؟ یہ خدا ہی جانے"۔

یکا یک سُنی اندر سے آگئی۔ چہرہ زرد، آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے۔ گویا جسم میں خون ہی نہیں ہے۔ پامال آرزوؤں کی اس سے بہتر تصویر نہیں ہو سکتی۔ شکوہ آمیز لہجہ میں بولی۔ "آپ نہ جانے کب سے بیٹھے ہیں اور مجھے خبر تک نہ دی۔ اور شاید آپ باہر ہی باہر چلے بھی جاتے"۔

میں نے کہا۔ ''نہیں سُنی۔ یہ کس طرح ممکن تھا۔ تمھارے پاس آہی رہا تھا کہ تم خود آ گئیں''۔

لالہ مداری لال کمرہ کے باہر جا کر اپنی کار کی صفائی کا انتظام کرنے لگے۔ شاید مجھے موقعہ دینا چاہتے تھے کہ سُنی سے کچھ باتیں کروں۔

سُنی نے پوچھا۔ ''اماں تو اچھی طرح ہیں''؟

''ہاں اچھی طرح ہیں۔ لیکن تم نے یہ کیا گت بنا رکھی ہے''؟

''میں تو بہت اچھی طرح ہوں''۔

''یہ بات کیا ہے؟ تم لوگوں میں یہ اَن بن کیوں ہے؟ گوپا دیوی فکر میں جان دیے ڈالتی ہیں۔ تم خود اپنی جان دینے کو تیار معلوم ہو رہی ہو۔ کچھ دور اندیشی سے کام لو''۔

''آپ نے یہ ناگوار بحث چھیڑ دی چچا جی! میں نے تو اس خیال سے اپنے کو تسکین دے لی کہ میری تقدیر خراب ہے۔ بس اس کا علاج میرے امکان میں نہیں۔ میں اس زندگی سے مَوت کو بدر جہا بہتر سمجھتی ہوں جہاں اپنی قدر نہ ہو۔ میں وفا کے بدلے وفا چاہتی ہوں۔ زندگی کی کوئی اور صورت میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس معاملہ میں کسی کا سمجھوتہ کرنا میرے لیے غیر ممکن ہے۔ نتیجہ کی پرواہ نہیں کرتی''۔

''لیکن ...''

''نہیں چچا جی! اس معاملہ میں آپ کچھ نہ کہیے۔ ورنہ میں چلی جاؤں گی''۔

''آخر سوچو تو...''

''میں سب سوچ چکی اور طے کر چکی۔ حیوان کو آدمی بنانا میری قدرت سے باہر ہے۔''

اس کے بعد میرے لیے بجز خاموشی کے اور کیا رہ گیا تھا؟

(5)

مئی کا مہینہ تھا۔ میں منصوری گیا ہوا تھا کہ گوپا کا تار پہنچا۔ ''فوراً آیئے بہت ضروری کام ہے۔ میں گھبرا تو گیا۔ لیکن اتنا یقین تھا کہ کوئی سانحہ نہیں ہوا ہے۔ دوسرے

ہی دن دہلی پہنچا۔ گویا میرے روبرو آکر کھڑی ہو گئی۔ بے زبان، بے حِس، بے جان، جیسے تپ دق کی مریض ہو۔

میں نے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے۔ میں تو گھبرا اُٹھا''۔

اس نے بجھی بجھی آنکھوں سے دیکھا اور بولی۔ ''سچ!''

''سُنی خیرت سے تو ہے؟''

''ہاں اچھی طرح ہے؟''

''اور کیدار ناتھ؟''

''وہ بھی اچھی طرح ہیں۔''

''تو پھر ماجرا کیا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں!''

''تم نے تار دیا اور کہتی ہو کچھ بھی نہیں''۔

''دل گھبرا رہا تھا اس لیے تمھیں بلا لیا۔ سُنی کو کسی طرح سمجھا بجھا کر یہاں لانا ہے۔ میں تو سب کچھ کرکے تھک گئی۔''

''کیا کوئی نئ بات ہوگئی؟''

''کیدار ایک ایکٹریس کے ساتھ کہیں بھاگ گیا ہے۔ ایک ہفتہ سے اس کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ سُنی سے کہہ گیا ہے کہ جب تک تم رہوگی گھر نہ آؤں گا۔ سارا گھر سُنی کا دشمن ہو رہا ہے۔ لیکن وہ وہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لیتی۔ سُنا ہے بینک سے اپنے باپ کے دستخط بنا کر کئی ہزار روپے اُڑا لے گیا ہے''۔

''تم سُنی سے مل تو آئیں؟ تو پھر اسے زبردستی کیوں بلا رہی ہو۔ وہ نہیں آنا چاہے تو رہنے دو''۔

''وہاں گھٹ کر مر جائے گی''۔

میں اُلٹے قدموں لالہ مداری لال کے گھر پہنچا تو دیکھا کہرام مچا ہوا ہے۔ میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ وہاں جنازہ تیار ہو رہا تھا۔ محلّہ کے صدہا آدمی جمع تھے۔ گھر میں ہائے ہائے صدا آرہی تھی۔ یہ سُنی کی لاش تھی۔

مداری لال مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ گئے۔ ''بھائی صاحب! میں تو لُٹ گیا۔ لڑکا

بھی گیا۔ بہو بھی گئی۔ افسوس''!

معلوم ہوا جب سے کیدار چلا گیا تھا، سُنی پہلے سے بھی زیادہ مغموم رہتی تھی۔ اس نے اسی دن اپنی چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں اور مانگ کا سیندور پونچھ ڈالا تھا۔ ساس نے جب اُسے بُرا بھلا کہا تو اُن سے بھی اُلجھ گئی۔ مداری لال نے سمجھانا چاہا تو ان کو بھی جلی کٹی سُنائیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ دماغ میں فتور آ گیا ہے۔ لوگوں نے اس سے کچھ کہنا چھوڑ دیا۔ آج صبح جمنا اشنان کرنے گئی۔ اندھیرا تھا۔ سارا گھر سو رہا تھا۔ کسی کو جگایا بھی نہیں۔ جب یہاں گھر میں نہ ملی تو تلاش ہونے لگی۔ بڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ جمنا گئی ہے۔ لوگ اُدھر بھاگے۔ وہاں بہت تلاش کے بعد اس کی لاش ملی ہے۔ ابھی تھوڑے دن پہلے جو پالکی پر سوار ہو کر آئی تھی، آج چار کے کاندھے پر جا رہی ہے۔ میں میّت کے ساتھ ہو لیا۔ اور وہاں سے لوٹا تو رات کے دس بج گئے تھے۔ لالہ مداری لال کو تشفی دے کر میں گوپا کے پاس آیا۔ میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔ معلوم نہیں گوپا کی کیا حالت ہوگی۔ اس سے زیادہ دل شکن حادثہ اس کے لیے کیا ہو سکتا، سُنی اس کی جان تھی۔ اس کا ارمان تھی۔ سنی ہی اس کی حیات اور منزل مقصود تھی۔ اس کے اجڑے ہوئے گلزار میں یہی ایک پودا اپج رہا تھا۔ اس کو وہ خونِ جگر سے سینچتی تھی۔ اس کی بہار کے سُنہرے خواب ہی اس کی زندگی تھی۔ اس میں کونپلیں نکلیں گی۔ پھول کھلیں گے۔ پھل لگیں گے۔ چڑیاں اس کی شاخوں پر بیٹھ کر میٹھے نغمے گائیں گی۔ لیکن آج انقلاب کے ظالم ہاتھوں نے اس پودے کو اُکھاڑ کر پھینک دیا؛ اور اب اس کی زندگی میں کوئی مدار نہ تھا۔ وہ مرکز ہی غائب ہو گیا تھا۔ جس پر زندگی کے سارے خطوط جمع ہوتے تھے۔

دل کو دونوں ہاتھوں سے تھامے میں نے زنجیر کھٹکھٹائی۔ گوپا نکلی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لالٹین تھی۔ اس کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ گوپا کے چہرے پر ایک نئی مسرّت جھلک رہی تھی۔ میری غمناک صورت دیکھ کر اُس نے مادرانہ الفت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ''آج تو تمھیں سارا دن ہی روتے کٹا۔ جنازہ کے ساتھ بہت سے آدمی ہوں گے۔ میرے جی میں بھی آیا کہ چل کر سُنی کا آخری دیدار کرلوں۔ لیکن میں نے سوچا کہ جب سُنی نہ رہی تو اس کی لاش میں کیا رکھا ہے؟ نہ گئی''۔

میں حیرت سے گوپا کا مُنہ تکنے لگا کہ اسے اس سانحہ کی خبر مل چکی ہے۔ پھر بھی

یہ سکون اور یہ اطمینان! بولا۔ ''اچھا کیا نہ گئیں۔ رونا ہی تو تھا''۔

''ہاں اور کیا۔ روئی تو یہاں بھی۔ لیکن تم سے سچ کہتی ہوں دل سے نہیں روئی۔ نہ جانے کیسے آنسو نکل آئے۔ مجھے تو اس کی موت سُن کر خوشی ہوئی۔ دکھیا اپنی عزت آبرو سے دنیا سے رخصت ہوگئی۔ نہیں تو جانے کیا کیا مصیبتیں جھیلنی پڑتیں۔ اس خیال سے خوش ہوں کہ اس نے اپنی آن نباہ دی! عورت کی زندگی میں پیار اور عزّت نہ ملے تو اس کا ختم ہو جانا ہی اچھا۔ تم نے سُنی کا چہرہ دیکھا تھا۔ لوگ کہتے ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مسکرا رہی ہے۔ میری سُنی سچ مچ دیوی تھی۔ آدمی اس لیے تھوڑا ہی جینا چاہتا ہے کہ روتا رہے۔ جب معلوم ہو گیا کہ زندگی میں دُکھ کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو آدمی جی کر کیا کرے؟ یہ میں نہیں کہتی کہ مجھے سُنی کی یاد نہ آئے گی۔ اور میں اسے یاد کرکے روؤں گی نہیں۔ لیکن وہ رنج کے آنسو نہ ہوں گے۔ خوشی کے آنسوں ہوں گے۔

''بہادر بیٹے کی ماں اس کی بہادری پر خوش ہوتی ہے۔ سُنی نے کچھ کم بہادری کی ہے؟ سوچو! میں آنسو بہا کر اس کی روح کو صدمہ پہنچاؤں! رات زیادہ ہوگئی ہے۔ جاکر اوپر سو رہو۔ میں نے تمھاری چار پائی بچھا دی ہے۔ مگر دیکھو اکیلے پڑے پڑے رونا نہیں۔ سُنی نے وہی کیا جو آسے کرنا چاہیے تھا۔

میں اوپر جاکر لیٹا تو میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ مگر رہ رہ کر دل میں یہ شبہہ پیدا ہوتا تھا کہ گوپا کا یہ سکونِ قلب ہے یا شدّتِ درد!

(یہ افسانہ دلّی کے اردو ماہنامہ 'عصمت' 1934 کے سالگرہ نمبر میں شائع ہوا۔ 'دودھ کی قیمت' میں شامل ہے۔ یہ 'واردات' میں بھی ''شانتی'' کے عنوان سے شامل ہے۔ ہندی میں یہ 'مان سروور' نمبر 1 میں شامل ہے۔)

نشہ

ایشوری ایک بڑے زمیندار کا لڑکا تھا اور میں ایک غریب کلرک تھا، جس کے پاس محنت مجوری کے سوا اور کوئی جائداد نہ تھی۔ ہم دونوں میں پرسپر بحثیں ہوتی رہتی تھی۔ میں زمینداری کی برائی کرتا، انھیں ہنسک پشو اور خون چوسنے والی جونک اور ورکشوں کی چوٹی پر پھولنے والا بنجھا کہتا۔ وہ زمینداروں کا پکشِ لیتا، پر سوبھاوِتہ اس کا پہلو کچھ کمزور ہوتا تھا، کیوں کہ اس کے پاس زمینداروں کے انوکول کوئی دلیل نہ تھی۔ یہ کہنا کہ سبھی مُنشیہ برابر نہیں ہوتے۔ چھوٹے بڑے ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ لچر دلیل تھی۔ کسی مُنشیہ یا نیتک نیم سے اس ویوستھا کا اوچیتہ سِدّھ کرنا کٹھن تھا۔ میں اس واد وِواد کی گرما گرمی میں اکثر تیز ہوجاتا اور لگنے والی بات کہہ جاتا، لیکن ایشوری ہار کر بھی مسکراتا رہتا تھا۔ میں نے اسے کبھی گرم ہوتے نہیں دیکھا۔ شاید اس کا کارن یہ تھا کہ وہ اپنے پکشِ کی کمزوری سمجھتا تھا۔ نوکروں سے وہ سیدھے منھ بات نہ کرتا تھا۔ امیروں میں جو ایک بے دردی اور اُدنڈتا ہوتی ہے۔ اس کا اُسے بھی پرچُر بھاگ ملا تھا۔ نوکر نے بستر لگانے میں ذرا بھی دیر کی، دودھ ضرورت سے زیادہ گرم یا ٹھنڈا ہوا، سائکل اچھی طرح صاف نہیں ہوئی، تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا۔ سُستی یا بدتمیزی اُسے ذرا بھی برداشت نہ تھی، پر دوستوں سے اور وِشیش کر مجھ سے اس کا وِیوہار سوہارد اور نرمتا سے بھرا ہوتا تھا۔ شاید اس کی جگہ میں ہوتا، تو مجھ میں بھی وہی کٹھورتائیں پیدا ہوجاتی، جو اس میں تھی، کیونکہ میرا لوک پریم سدھانتوں پر نہیں نجی دشاؤں پر ٹکا ہوا تھا، لیکن وہ میری جگہ ہو کر بھی شاید امیر ہی رہتا، کیونکہ وہ پراکرتی سے ہی وِلاسی اور ایشوریہ پریہ تھا۔

اب کی دشہرے کی چھٹیوں میں مین نے نشچے کیا کہ گھر نہ جاؤں گا۔ میرے پاس کرایے کے لیے روپئے نہ تھے اور نہ میں گھروالوں کوتکلیف دینا چاہتا تھا۔ میں جانتاہوں، وے مجھے جو کچھ دیتے ہیں وہ ان کی حیثیت سے بہت زیادہ ہے۔ اس کے

ساتھ ہی پریکشا کا بھی خیال تھا۔ ابھی بہت کچھ پڑھنا باقی تھا اور گھر جاکر کون پڑھتا ہے۔ بورڈنگ ہاؤس میں بھوت کی طرح اکیلے پڑے رہنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ لیکن جب ایشوری نے مجھے اپنے گھر چلنے کا نیوتہ دیا، تو میں بنا آگرہ کے راضی ہوگیا۔ ایشوری کے ساتھ پریکشا کی تیاری خُوب ہوجائے گی۔ وہ امیر ہو کر بھی محنتی اور ذہین ہے۔

اس نے اس کے ساتھ ہی کہا۔ لیکن بھائی ایک بات کا خیال رکھنا۔ وہاں اگر زمینداروں کی نِندا کی تو معاملہ بگڑ جائے گا اور میرے گھروالوں کو بُرا لگے گا۔ وہ لوگ تو آسامیوں پر اسی داعوے سے شاسن کرتے ہیں کہ ایشور نے آسامیوں کو ان کی سِوا کے لیے ہی پیدا کیا ہے۔ آسامی بھی یہی سمجھتا ہے۔ اگر اسے سُوجھا دیا جائے کہ زمیندار اور آسامی میں کوئی مولک بھید نہیں ہے، تو زمینداری کا کہیں پتہ نہ لگے۔

میں نے کہا۔ تو کیا تم سمجھتے ہو کہ میں وہاں جاکر کچھ اور ہوجاؤں گا۔؟

ہاں میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

تو تم غلط سمجھتے ہو۔

ایشوری نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔کداچت اس نے اس معاملے کو میرے وِوِیک پر چھوڑ دیااور بہت اچھا کیا۔ اگر وہ اپنی بات پر اڑتا تو میں بھی ضد پکڑ لیتا۔

(2)

سِکنڈ کلاس تو کیا میں نے کبھی انٹر کلاس میں بھی سفر نہ کیا تھا۔ اب کی سِکنڈ کلاس میں سفر کرنے کا سوبھاگیہ پراپتِ ہوا گاڑی تو نو بجے رات کو آتی تھی۔ پریاترا کے ہرش میں ہم شام کو ہی اسٹیشن جا پہنچے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر سیر کرنے کے بعد رِفریش مینٹ روم میں جاکر ہم لوگوں نے بھوجن کیا۔ میری وِیش بھوشا اور رنگ ڈھنگ سے پارکھی خانساموں کو یہ پہچاننے میں دیر نہ لگی کہ مالک کون ہے اور پچھلگو کون، لیکن نہ جانے مجھے اُن کی گستاخی بُری لگ رہی تھی۔ پیسے ایشوری کے جیب سے گئے۔ شاید میرے پتا کو جو ویتن ملتا ہے، اس سے زیادہ اِن خانساموں کو اِنعام اِکرام میں مل جاتا ہو۔ ایک اُٹھنّی تو چلتے سے ایشوری ہی نے دی۔ پھر بھی میں اُن سبھوں سے اُسی تتپرتا اور وِنئے کی پرتیکشا کرتا تھا۔ جس سے وے ایشوری کی سیوا کر رہے تھے۔ ایشوری کے حکم پر سب سے

سب کیوں دوڑتے ہیں، لیکن میں کوئی چیز مانگتا ہوں تو اتنا اتساہ نہیں دکھاتے ؟ مجھے بھوجن میں کچھ سواد نہ ملا۔ وہ بھید میرے دھیان کو سمپوڑن روپ سے اپنی اُور کھینچے ہوئے تھا۔

گاڑی آئی، ہم دونوں سوار ہوئے۔ خانساموں نے ایشوری کو سلام کیا۔ میری اور دیکھا بھی نہیں ۔

ایشوری نے کہا۔ کتنے تمیزدار ہیں یہ سب۔ ایک ہمارے نوکر ہیں کہ کوئی کام کرنے کا ڈھنگ نہیں۔

میں نے کھٹّے من سے کہا: اسی طرح اگر تم اپنے نوکروں کو بھی آٹھ آنے روز انعام دیا کرو تو شاید اس سے زیادہ تمیزدار ہوجائے۔

'تو کیا تم سمجھتے ہو، یہ سب کیول انعام کی لالچ سے اتنا ادب کرتے ہیں ؟'

'جی نہیں، کداپی نہیں ، تمیز اور ادب تو ان کے رکت میں مل گیا ہے ۔'

گاڑی چلی۔ ڈاک تھی۔ پریاگ سے چلی تو پرتاپ گڑھ جاکر روکی ۔ ایک آدمی نے ہمارا کمرہ کھولا ۔ میں ترنت چلا اٹھا، دوسرا درجہ ہے ، سیکنڈ کلاس ہے۔

اس مسافر نے ڈبے کے اندر آکر میری اُور ایک وچتر اُپیکشا کی درشٹی سے دیکھ کر کہا، جی ہاں سیوک بھی اتنا سمجھتا ہے اور بیچ والے برتھ پر بیٹھ گیا ۔ مجھے کتنی لجّا آئی کہہ نہیں سکتا۔

بھور ہوتے ہوتے ہم لوگ مرادآباد پہنچے ۔اسٹیشن پر کئی آدمی ہمارا سواگت کرنے کے لیے کھڑے تھے ۔ دو بھدر پُروش تھے ۔ پانچ بیگار، بیگاروں نے ہمارا لگیج اُٹھایا۔ دونوں بھدر پُروش پیچھے پیچھے چلے ۔ ایک مسلمان تھا۔ ریاست علی، دوسرا براہمن تھا۔رام ہرکھ ، دونوں نے میری اُور اپریچت نیتروں سے دیکھا، مانو کہہ رہے ہیں ، تم کوئے ہوکرہنس کے ساتھ کیسے ؟

ریاست علی نے ایشوری سے پوچھا، یہ بابو صاحب کیا آپ کے ساتھ پڑھتے ہیں؟

ایشوری نے جواب دیا ۔ ہاں ،ساتھ پڑھتے بھی ہیں، اور ساتھ رہتے بھی ہیں؟ یوں کہیے کہ آپ ہی کی بدولت میں الٰہ آباد پڑا ہوا ہوں، نہیں کب کا لکھنؤ چلا آیا ہوتا۔ اب کی میں انھیں گھسیٹ لایا ۔ ان کے گھر سے کئی تار آچکے تھے۔ مگر میں نے انکاری جواب دلوادیے ۔ آخری تار تو ارجینٹ تھا ، جس کی فیس چار آنے پرتی شبد ہے۔ پر

یہاں سے بھی اس کا جواب انکاری ہی گیا۔

دونوں بجنوں نے میری اُور چکت نیتروں سے دیکھا۔ آتنکت ہو جانے کی چیشٹا کرتے ہوئے جان پڑے۔

ریاست علی نے اردھ شنکا کے سور میں کہا، لیکن آپ بڑے سادے لباس میں رہتے ہیں۔

ایشوری نے شنکا نوارن کی۔ مہاتما گاندھی کے بھکت ہیں صاحب! کھدر کے سوا کچھ پہنتے ہی نہیں۔ پرانے سارے کپڑے جلا ڈالے! یوں کہو کہ راجا ہیں۔ ڈھائی لاکھ سالانہ کی ریاست ہے، پر آپ کی مورت دیکھو تو معلوم ہوتا ہے ،ابھی اناتھالیہ سے پکڑ کر آئے ہیں۔

رام ہرکھ بولے ، امیروں کا ایسا سوابھاو بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ کوئی بھانپ ہی نہیں سکتا ۔

ریاست علی نے سمرتھن کیا، آپ نے مہاراج چانگلی کو دیکھا ہوتا، تو دانتوں انگلی دباتے۔ ایک گاڑھے کی مرجئی اور چمرودھے جوتے پہنے بازاروں میں گھوما کرتے تھے۔ سنتے ہیں، ایک بار بیگار میں پکڑ گئے تھے اور انھیں نے دس لاکھ سے کالج کھول دیا۔

میں من میں کٹا جارہا تھا، پر نہ جانے کیا بات تھی کہ یہ سفید جھوٹ اس وقت مجھے ہاسیہ اسپد نہ جان پڑا۔ اس کے پرتیک واکیہ کے ساتھ مانو میں اس کلپت وَیبھَو کے سمیپ تر آتا جاتا تھا۔

میں شہسوار نہیں ہوں۔ ہاں ، لڑکپن میں کئی بار لدو گھوڑوں پر سوار ہوا ہوں، یہاں دیکھا تو دو کلاں راس گھوڑے ہمارے لیے تیار کھڑے تھے۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ سوار تو ہوا، پر بوٹیاں کانپ رہی تھیں۔ میں نے چہرے پر شکن نہ پڑنے دیا۔ گھوڑے کو ایشوری کے پیچھے ڈال دیا خیریت یہ ہوئی کی ایشوری نے گھوڑے کو تیز نہ کیا، ورنہ شاید مین ہاتھ پاؤں تڑوا کر لوٹتا۔ سمبھو ہے، ایشوری نے سمجھ لیا ہو کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔

(3)

ایشوری کا گھر کیا تھا، قلعہ تھا۔ امام باڑے کا سا پھاٹک ،دوار پر پہرے دار ٹہلتا

ہوا، نوکروں کا کوئی حساب نہیں، ایک ہاتھی بندھا ہوا۔ ایشوری نے اپنے پتا، چاچا، تاؤ آدی سب سے میرا پریچے کرایا، اور اسی آتشیوکت کے ساتھ ایسی ہوا باندھی کہ کچھ نہ پوچھیے نوکر چاکر ہی نہیں گھر کے لوگ بھی میرا سمان کرنے لگے۔ دیہات کے زمیندار، لاکھوں کا منافع مگر پولس کانسٹبل کو بھی سمجھنے والے۔ کئی مہاشے تو مجھے حضور حضور کہنے لگے۔

جب ذرا اکانت ہوا تو میں نے ایشوری سے کہا، 'تم بڑے شیطان ہو یار، میری مٹی کیوں پلید کر رہے ہو؟'

ایشوری نے سدڑھ مسکان کے ساتھ کہا، ان گدھوں کے سامنے یہی چال ضروری تھی، ورنہ سیدھے منھ بولتے بھی نہیں۔

ذرا دیر بعد ایک نائی ہمارے پاؤں دبانے آیا ۔ کنور لوگ اسٹیشن سے آئے ہیں تھک گئے ہوں گے۔ ایشوری نے میری اُور اشارہ کرکے کہا ، پہلے کنور صاحب کے پاؤں دبا۔

میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ میرے جیون میں ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو کہ کسی نے میرے پاؤں دبائے ہوں۔ میں اسے امیروں کے چونچلے، رئیسوں کا گدھاپن اور بڑے آدمیوں کی مُٹ مردی اور جانے کیا کیا کہہ کر ایشوری کا پریہاس کیا کرتا اور آج میں پوتڑوں کا رئیس بننے کا سوانگ بھر رہا تھا۔

اتنے میں دس بج گئے۔ پرانی سبھیتہ کے لوگ تھے۔ نئی روشنی ابھی کیول پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ پائی تھی۔ اندر سے بھوجن کا بلاوا آیا ہم اسنان کرنے چلے ۔ میں ہمیشہ اپنی دھوتی خود چھانٹ لیا کرتا ہوں، مگر یہاں میں نے ایشوری کی ہی بھانتی اپنی دھوتی بھی چھوڑ دی ۔اپنے ہاتھوں اپنی دھوتی چھانٹتے شرم آرہی تھی۔ اندر بھوجن کرنے چلے ۔ ہوٹل میں جوتے پہنے میز پر ڈٹتے تھے۔ یہاں پاؤں دھونا آویشک تھا۔ کہار پانی لیے کھڑا تھا۔ ایشوری نے پاؤں بڑھا دیے ۔ کہار نے اس کے پاؤں دھوئے ۔ میں نے بھی پاؤں بڑھادیے۔ کہار نے میرے پاؤں بھی دھوئے۔ میرا وہ وچار نہ جانے کہاں چلا گیا تھا ۔

(4)

سوچا تھا، وہاں دیہات میں اِکاگر ہوکر خوب پڑھیں گے۔ پر وہاں سارا دن سیر

سپاٹے میں کٹ جاتا تھا۔ کہیں ندی میں بجرے پر سیر کررہے ہیں۔ کبھی مچھلیوں یا چڑیوں کا شکار کھیل رہے ہیں، کہیں پہلوانوں کی کشتی دیکھ رہے ہیں۔کہیں شطرنج پر جمے ہوئے ہیں ۔ایشوری خوب انڈے منگواتا اور کمرے میں اسٹوب پر آملیٹ بنتے۔ نوکروں کا ایک جتھا ہمیشہ گھیرے رہتا۔ اپنے ہاتھ پاؤں کو ہلانے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ کیول ایک زبان ہلا دینا کافی ہے۔ نہانے بیٹھے تو آدمی نہلانے کو حاضر، لیٹے تو آدمی پنکھا جھلنے کو کھڑے۔ میں مہاتما گاندھی کا کنور چیلا مشہور تھا۔ بھیتر سے باہر تک میری دھاک تھی ۔ ناشتے میں ذرا بھی دیر نہ ہونے پائے ۔ کہیں کنور صاحب ناراض نہ ہوجائیں۔ بچھاون ٹھیک سمے پر لگ جائے۔ کنور صاحب کے سونے کا سمے آگیا۔ میں ایشوری سے بھی زیادہ نازک دیماغ بن گیا تھا، یا بننے پر مجبور کیا گیا تھا۔ ایشوری اپنے ہاتھ سے بستر بچھا لے ۔لیکن کنور مہمان اپنے ہاتھوں سے کیسے اپنا بچاون بچھا سکتے ہیں! ان کی مہانتا میں بٹا لگ جائے گا۔

ایک دن سچ مچ یہی بات ہوگئی، ایشوری گھر میں تھے۔ شاید اپنی ماتا سے کچھ بات چیت کرنے میں دیر ہوگئی۔ یہاں دس بج گئے۔ میری آنکھیں نیند سے جھپک رہی تھیں ۔ مگر بستر کیسے لگاؤں ؟ کنور جو ٹھہرا ۔کوئی ساڑھے گیارہ بجے مہرا آیا بڑا منھ لگا نوکر تھا۔ گھر کے دھندوں میں میرا بستر لگانے کی اسے سدھی ہی نہ رہی ۔ اب جو یاد آئی،تو بھاگا ہوا آیا۔ میں نے ایسی ڈانٹ بتائی کہ اس نے بھی یاد کیا ہوگا۔

ایشوری میری ڈانٹ سن کر باہر نکل آیا اور بولا تم نے بہت اچھا کیا ۔ یہ سب حرام خور اسی ویوہار کے یوگیہ ہیں۔

اسی طرح ایشوری ایک دن ایک جگہ دعوت میں گیا ہوا تھا۔ شام ہوگئی، پر لیمپ نہ جلا،لیمپ میز پر رکھا ہوا تھا۔ دیاسلائی بھی وہیں تھی۔ لیکن ایشوری خود کبھی لیمپ نہیں جلاتا، پھر کنور صاحب کیسے جلائیں؟ میں جھنجھلا رہا تھا۔ سماچار پتر آیا رکھا ہوا تھا ۔جی ادھر لگا ہوا تھا۔ پر لیمپ ندارت۔ دیو یوگ سے اسی وقت منشی ریاست علی آنکلے۔ میں انھیں پر ابل پڑا۔ ایسی پھٹکار بتائی کی بے چارا الو ہوگیا ۔ تم لوگوں کو اتنی فکر بھی نہیں کہ لیمپ جلوا دو۔ معلوم نہیں ایسے کام چور آدمیوں کا یہاں کیسے گزر ہوتا ہے۔ میرے یہاں گھنٹے بھر نرواہ نہ ہو۔ ریاست علی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لیمپ جلادیا۔

وہاں ایک ٹھاکر اکثر آیا کرتا تھا۔ کچھ منچلا آدمی تھا۔ مہاتما گاندھی کا پرم بھکت۔ مجھے مہاتما جی کا چیلا سمجھ کر میرا بڑا لحاظ کرتا تھا۔ پر مجھ سے کچھ پوچھتے سنکوچ کرتا تھا۔ ایک دن مجھے اکیلا دیکھ کر آیا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔ سرکار تو گاندھی بابا کے چیلے ہیں نہ؟ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں سوراج ہوجائے گا تو زمیندار نہ رہیں گے۔

میں نے شان جمائی، زمینداروں کے رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ لوگ غریبوں کا خون چوسنے کے سوا اور کیا کرتے ہیں؟

ٹھاکر نے پھر پوچھا، تو کیوں سرکار، سب زمینداروں کی زمین چھین لی جائیں گی؟

میں نے کہا بہت سے لوگ خوشی سے دے دیں گے۔ جو لوگ خوشی سے نہ دیں گے۔ ان کی زمین چھیننی ہی پڑے گی۔ ہم لوگ تو تیار بیٹھے ہوئے ہیں۔ جیوں ہی سوراجیہ ہوا اپنے سارے علاقے اسامیوں کے نام ہبہ کردیں گے۔

میں کرسی پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ ٹھاکر میرے پاؤں دبانے لگا ۔ پھر بولا آج کل زمیندار لوگ بڑا ظلم کرتے ہیں۔ سرکار! ہمیں بھی حضور اپنے علاقے میں تھوڑی سی زمین دے دیں، تو چل کر وہیں آپ کی سیوا میں رہیں۔

میں نے کہا ابھی تو میرا کوئی اختیار نہیں ہے بھائی، لیکن جیوں ہی اختیار ملا ، میں سب سے پہلے تمھیں بلاؤں گا۔ تمھیں موٹر ڈرائیوری سکھا کر اپنا ڈرائیور بنا لوں گا۔

سنا،اس دن ٹھاکر نے خوب بھنگ پی اور اپنی استری کوخوب پیٹا اور گاؤں کے مہاجن سے لڑنے پر تیار ہوگیا۔

(5)

چھٹی اس طرح تمام ہوئی اور ہم پھر پریاگ چلے۔ گاؤں کے بہت سے لوگ ہم لوگوں کو پہنچانے آئے ۔ ٹھاکر تو ہمارے ساتھ اسٹیشن تک آیا۔ میں نے بھی اپنا پارٹ خوب صفائی سے کھیلا اور اپنی کُبیر وِچت وینے اوردیوتیہ کی مہر ہر ایک ہردَے پر لگا دی ۔ جی تو چاہتا تھا ، ہر ایک کو اچھا انعام دوں ، لیکن یہ سامرتھ کہاں تھی؟ واپسی ٹکٹ تھا ہی کیول گاڑی میں بیٹھنا تھا۔ پر گاڑی آئی تو ٹھساٹھس بھری ہوئی۔ درگا پوجا کی چھٹیاں بھوگ کر سبھی لوگ لوٹ رہے تھے۔ سیکنڈ کلاس میں تل رکھنے کی جگہ نہیں ، انٹر کلاس کی

حالت اس سے بھی بدتر ! یہ آخری گاڑی تھی۔ کسی طرح رک نہ سکتے تھے۔ بڑی مشکل سے تیسرے درجہ میں جگہ ملی۔ ہمارے ایشوریہ نے وہاں اپنا رنگ جمالیا، مگر مجھے اس میں بیٹھنا برا لگ رہا تھا۔ آئے تھے آرام سے لیٹے لیٹے، جارہے تھے سکڑے ہوئے۔ پہلو بدلنے کی بھی جگہ نہ تھی۔

کئی آدمی پڑھے لکھے بھی تھے۔ آپس میں انگریزی راجیہ کی تعریف کرتے جارہے تھے۔ ایک مہاشے بولے، ایسا نیائے تو کسی راجیہ میں نہیں دیکھا ۔ چھوٹے بڑے سب برابر۔ راجہ بھی کسی پر انیائے کرے تو عدالت اس کی بھی گردن دبادیتی ہے۔

دوسرے سجّن نے سمرتھن کیا ، ارے صاحب آپ خود بادشاہ پر دعوا کرسکتے ہیں! عدالت میں بادشاہ پر ڈگری ہوجاتی ہے۔

ایک آدمی،جس کی پیٹھ پر بڑا سا گٹھر بدھا تھا کلکتے جارہا تھا۔ کہیں گٹھری رکھنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ پیٹھ پر باندھے ہوئے تھا۔ اس سے بے چین ہوکر بار بار دُوار پر کھڑا ہوجاتا ۔ میں دوار کے پاس ہی بیٹھاہوا تھا۔ اس کا بار بار آکر میرے منھ کو اپنی گھٹری سے رگڑنا مجھے بہت برا لگ رہاتھا ۔ ایک ہوا یوں ہی کم تھی،دوسری اس گنوار کا آکر میرے منھ پر کھڑا ہوجانا مانو میرا گلا دبانا تھا۔ میں کچھ دیر تک ضبط کیے بیٹھا رہا۔ یکا یک مجھے کرودھ آگیا ۔ میں نے اسے پکڑ کر ڈھکیل دیااور دو تماچے زور زور سے لگائے۔

اس نے آنکھیں نکال کر کہا ، کیوں مارتے ہو بابوجی، ہم نے بھی کرایہ دیا ہے۔

میں نے اٹھ کر دو تین تماچے اور جڑ دیے ۔

گاڑی میں طوفان آگیا۔ چاروں اور سے مجھ پر بوچھار پڑنے لگی۔

'اگر اتنے نازک مزاج ہوتو اول درجے میں کیوں نہیں بیٹھے؟'

'کوئی بڑا آدمی ہوگا تو اپنے گھر کا ہوگا۔ مجھے اس طرح مارتے تو دکھادیتا ۔

'کیا قصور کیا تھا بے چارے نے ؟ گاڑی میں سانس لینے کی جگہ نہیں ، کھڑکی پر ذرا سانس لینے کھڑا ہوگیا تو اس پر اتنا کرودھ ! امیر ہو کر کیا آدمی اپنی انسانیت بالکل کھو دیتا ہے؟

'یہ بھی انگریزی راج ہے جس کا آپ بکھان کررہے تھے ! '

ایک گرامین بولا۔ دفترن ماگھسن تو پاوت نہیں ،اس پر اتنا مزاج !

ایشوری نے انگریزی میں کہا : ! What an idiot you are Bir
اور میرا نشہ کچھ کچھ اُترتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

(یہ افسانہ پہلی بار الہ آباد کے ہندی ماہنامہ 'چاند' کے فروری 1934 کے شمارے میں شائع ہوا۔ اردو میں یہ 'رہنمائے تعلیم ہندی' جنوری 1934 میں شائع ہوا۔ 'مان سرودر 1' میں شامل ہے۔)

منووِرتی

ایک سُندر یووتی پراتہ کال، گاندھی پارک میں بلوّر کے بیچ پر گہری نیند میں سوئی پائی جائے، یہ چونکا دینے والی بات ہے۔ سندریاں پارکوں میں ہوا کھانے آتی ہیں، ہنستی ہیں، دوڑتی ہیں، پھول پودوں سے کھیلتی ہیں، کسی کا اِدھر دھیان نہیں جاتا، لیکن کوئی یُووتی روِش کے کنارے والے بیچ پر بے خبر سوئے، یہ بالکل غیر معمولی بات ہے، اپنی اُور بل پوُروک آکرشت (مبذول) کرنے والی روِش پر کتنے آدمی چہل قدمی کر رہے ہیں، بوڑھے بھی، جوان بھی، سبھی ایک چھن کے لیے وہاں ٹھٹھک جاتے ہیں، ایک نظر وہ درِشیہ دیکھتے ہیں اور تب چلے جاتے ہیں۔ یوّوک وِرند رہسیہ بھاؤ سے مسکرا تے ہوئے، وِرِدّھ جن چنتا بھاؤ سے سر ہلاتے ہوئے اور یووتیاں لجّا سے آنکھیں نیچی کیے ہوئے۔

(2)

بسنت اور ہاشم نیکر اور بنیائن پہنے ننگے پاؤں دوڑ رہے ہیں۔ بڑے دن کی چھٹیّوں میں اولمپین ریس ہونے والا ہے، دونوں اسی کی تیاری کر رہے ہیں۔ دونوں اس استھل پر پہنچ کر رُک جاتے ہیں اور دبی آنکھوں سے یووتی کو دیکھ کر آپس میں خیال دوڑانے لگتے ہیں۔

بَسنت نے کہا۔ اِسے اور کہیں سونے کی جگہ ہی نہیں ملی۔

ہاشم نے جواب دیا۔ کوئی ویشیا ہے۔

'لیکن ویشیائیں بھی تو اس طرح بے شرمی نہیں کرتیں۔

ویشیا اگر بے شرم نہ ہو تو ویشیا نہیں۔

'بہت سی ایسی باتیں ہیں، جن میں کلُ وَدھو اور ویشیا دونوں ایک ویوہار کرتی ہیں۔ کوئی ویشیا معمولی طور پر سڑک پر سونا نہیں چاہتی۔

'روپ چھوی دیکھانے کا نیا آرٹ ہے۔'

'آرٹ کا سب سے سندر روپ چھپاؤ ہے، دکھاؤ نہیں۔ وِشیّا اس رہسیہ کو خوب سمجھتی ہے۔'

'اس کا چھپاؤ کیول آکرشن بڑھانے کے لیے ہے۔'

'ہوسکتا ہے، مگر کیول یہاں سو جانا یہ پرمانت نہیں کرتا کہ یہ وشیّا ہے۔'

اس کی مانگ میں سِندور ہے۔

'وشیّائیں اُوسر پڑنے پر سوبھاگیہ شالی بنَ جاتی ہیں۔ رات بھر پیالے کے دور چلے ہوں گے، کام ۔کرنائیں ہوئی ہوں گی۔ اوشاد کے کارَن ، ٹھنڈک پا کر سوگئی ہوگی۔'

'مجھے تو کل وذھو سی لگتی ہے۔'

'کلُ وذھو پارک میں سونے آئے گی؟'

'ہوسکتا ہے، گھر سے روٹھ کر آئی ہو۔'

'چل کر پوچھ ہی کیوں نہ لیں۔'

'نرے احمق ہو۔ بغیر پریچے کے آپ کسی کو جگا کیسے سکتے ہیں۔'

'اجی چل کر پریچے کر لیں گے۔ اُلٹے اور اِحسان جتائیں گے۔'

'اور کہیں جو جھڑک دیں؟'

'جھڑکنے کی کوئی بات بھی ہو۔ اس سے سوجَنیہ اور سہردیتا میں ڈوبی ہوئی باتیں کریں گے۔ کوئی یووتی ایسی باتیں سن کر چڑھ نہیں سکتی۔ اجی، گت یونائیں تک تو رس بھری باتیں سن کر پھول ہی اُٹھتی ہیں۔ یہ تو نویونا ہے۔ میں نے روپ اور یوون کا ایسا سندر سنیوگ نہیں دیکھا تھا۔'

'میرے ہردَے پر تو یہ روپ اب جیون پَریَنت کے لیے اَنکت ہوگیا۔ شاید کبھی نہ بھول سکوں۔'

'میں تو پھر یہی کہتا ہوں کہ کوئی وِشیّا ہے۔'

'روپ کی دیوی وِشیّا بھی ہو، اپاسیہ ہے۔'

'یہیں کھڑے کھڑے کویوں کی سی باتیں کروگے، ذرا وہاں چلتے کیوں نہیں۔ تم کیول کھڑے رہنا، پاش تو میں ڈالوں گا۔'

'کوئی کلں ودھو ہے۔'

'کلں ودھو پارک میں آکر سوئے تو اِس کا اس کے سِوا کوئی ارتھ نہیں کہ وہ آکرشت کرنا چاہتی ہے اور یہ ویشیا منووِرتی ہے۔'

'آج کلں کی یووتیاں تو فارورڈ ہونے لگی ہیں۔'

فارورڈ یووتیاں یووکوں سے آنکھیں نہیں چُراتیں۔'

'ہاں، لیکن ہے، کلں ودھو، کلں ودھو سے کسی طرح کی بات چیت کرنا میں بے ہودگی سمجھتا ہوں۔'

'تو چلو پھر دوڑ لگاویں۔'

'لیکن دل میں تو وہ مورت دوڑ رہی ہے۔'

'تو آؤ بیٹھیں۔ جب وہ اٹھ کر جانے لگے تو اس کے پیچھے چلیں، میں کہتا ہوں ویشیا ہے۔'

'اور میں کہتا ہوں کلں ودھو ہے۔'

'تو دس دس کی بازی رہی۔'

(3)

'دو وِرِدّھ پُرُوش دھیرے دھیرے زمین کی اُور تاکتے آرہے ہیں۔ مانو کھوئی جوانی ڈھونڈ رہے ہو۔ ایک کی کمر جھکی، بال کالے، شریر ستھول، دوسرے کے بال پکے ہوئے، پر کمر سیدھی، اکہرا شریر۔ دونوں کے دانت ٹوٹے، پر نقلی دانت لگائے، دونوں کی آنکھوں پر عینک۔ موٹے مہاشے وکیل ہیں، چھریرے مہودے ڈاکٹر۔

وکیل ۔ دیکھا، یہ بیسویں صدی کی کرامات۔

'ڈاکٹر ۔ جی ہاں دیکھا، ہندوستان دنیا سے الگ تو نہیں ہے۔'

'لیکن آپ اسے شِشٹتا تو نہیں کہہ سکتے ؟'

'شِشٹتا کی دہائی دینے کا اب سمے نہیں۔'

'ہے کسی بھلے گھر کی لڑکی۔'

'ویشیا ہے صاحب۔'

'آپ اتنا بھی نہیں سمجھتے۔'
'ویشیا اتنی پھوہڑ نہیں ہوتی۔'
'اور بھلے گھر کی لڑکیاں پھوہڑ ہوتی ہیں؟'
'نئی آزادی ہے، نیا نشہ ہے۔'
' ہم لوگوں کی تو بری بھلی کٹ گئی ۔ جن کے سر آئے گی وہ جھیلیں گے۔'
'افسوس جوانی رخصت ہوگئی۔'
'زندگی جہنّم سے بدتر ہو جائے گی۔'
'مگر آنکھ تو نہیں رخصت ہوگی، وہ دِل تو نہیں رخصت ہوگیا۔'
'بس آنکھ سے دیکھا کرو، دل جلایا کرو۔'

میرا تو پھر جوان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ سچ پوچھو تو آج کل کے جیون میں ہی زندگی کی بہار ہے۔ ہمارے وقتوں میں تو کہیں کوئی صورت ہی نظر نہ آتی تھی۔آج تو جدھر جاؤ، حُسن ہی حُسن کے جلوے۔

'سنا یووتیوں کو دنیا میں جس چیز سے سب سے زیادہ نفرت ہے، وہ بوڑھے مرد ہیں۔'

'میں اس کا قائل نہیں۔ پرُوش کا جوہر اس کی جوانی نہیں، اس کا شکتی سمپّن ہونا ہے۔ کتنے ہی بوڑھے جوانوں سے زیادہ کڑیّل ہوتے ہیں۔ مجھے تو آئے دن اِس کے تجربے ہوتے رہتے ہیں۔ میں ہی اپنے کو کسی جوان سے کم نہیں سمجھتا۔

'یہی سب سہی ہے۔ پر بوڑھوں کا دل کمزور ہوجاتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس رَمنی کو اِس طرح دیکھ کر ہم لوگ یوں نہ چلے جاتے۔ میں تو آنکھوں بھر دیکھ بھی نہیں سکا۔ ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں اس کی آنکھیں کھل جائیں اور وہ مجھے تاکتے، دیکھ لے تو دل میں کیا سمجھے۔'

'خوش ہوتی کہ بوڑھے پر بھی اس کا جادو چل گیا۔'
'اَجی رہنے بھی دو۔'
'آپ کچھ دنوں ، اُوکا سا، کا سیون کیجیے۔'
'چندرُودے کھا کر دیکھ چکا ۔ سب لوٹنے کی باتیں ہیں۔'

'مَنکی گلینڈ لگوا لیجیے نا؟
'آپ اِس یووتی سے میری باتیں پکّی کرا دیں۔ میں تیار ہوں۔'
'ہاں یہ میرا ذمّہ ہے، مگر بھائی ہمارا حصّہ بھی رہے گا۔'
'اَرتھات؟'
'اَرتھات یہ کہ کبھی کبھی آپ کے گھر آکر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لوں گا۔'
'اگر آپ اِس ارادے سے آئیں تو میں آپ کا دشمن ہو جاؤں۔'
'او، ہو، آپ تو منکی گلینڈ کا نام سنتے ہی جوان ہو گئے۔'
'میں تو سمجھتا ہوں، یہ بھی ڈاکٹروں نے لوٹنے کا ایک لٹکا نکالا ہے۔'
'سچ۔'

'ارے صاحب، اس رمنی کے اِسپرش میں جوانی ہے، آپ ہیں کس پھیر میں۔ اس کے ایک ایک انگ میں، ایک ایک چتون میں، ایک ایک مسکان میں، ایک ایک وِلاس میں جوانی بھری ہوئی ہے۔ نہ سو مَنکی گلینڈ نہ ایک رَمنی کا باہو پاش۔'

'اچھا قدم بڑھایئے، موکّل آکر بیٹھے ہوں گے۔'
'یہ صورت یاد رہے گی۔'
'پھر آپ نے یاد دِلا دی۔'

'وہ اس طرح سوئی ہے اس لیے کہ لوگ اس کے روپ کو، اُس کے انگ وِنیاس کو، اس کے بکھرے ہوئے کیشوں کو، اس کی کھلی ہوئی گردن کو دیکھیں اور اپنی چھاتی پیٹیں۔ اس طرح چلے جانا، اس کے ساتھ انّیائے ہے۔ وہ بلا رہی ہے اور آپ بھاگے جا رہے ہیں۔'

'ہم جس طرح دل سے پریم کر سکتے ہیں، جوان کبھی کر سکتا؟'

'بالکل ٹھیک۔' مجھے تو ایسی عورتوں سے سابقہ پڑ چکا ہے، جو رسک بوڑھوں کو کھو جا کرتی ہیں۔ جوان تو چھچھورے، اُچھنکھل، اَستھر، اور گرویلے، ہوتے ہیں۔ وے پریم کے بدلے میں کچھ چاہتے ہیں۔' یہاں نِہ سوارتھ بھاؤ سے آتم سمرپن کرتے ہیں۔
'آپ کے باتوں سے دل میں گدگدی ہو گئی۔'

'مگر ایک بات یاد رکھیے، کہیں اُس کا جوان پریمی مل گیا تو؟'

'تو ملا کرے، یہاں ایسوں سے نہیں ڈرتے۔'

'آپ کی شادی کی کچھ بات چیت تھی تو؟'

'ہاں تھی، مگر اپنے ہی لڑکے جب دشمنی پر کمر باندھیں، تو کیا ہو۔

میرا بڑا لڑکا یَشونت تو مجھے بندوق دکھانے لگا۔ یہاں زمانے کی خوبی ہے۔'

اکتوبر کی دھوپ تیز ہو چلی تھی۔ دونوں مِتر نکل گئے۔'

(4)

دو دیویاں، ایک وِردّھا، دوسری نویَونا پارک کے پھاٹک پر موٹر سے اُتری اور پارک میں ہوا کھانے آئیں۔ ان کی نگاہ بھی اس نیند کی ماتی یووتی پر پڑی۔

وِردّھا نے کہا۔ بڑی بے شرم ہے۔

'نویونا نے تِرسکار بھاؤ سے اس کی اُور دیکھ کر کہا۔ ٹھاٹ تو بھلے گھر کی دیووں کے ہیں۔'

'بس ٹھاٹ ہی دیکھ لو۔ اِسی سے مرد کہتے ہیں۔ استریوں کو آزادی نہ ملنی چاہیے۔'

'مجھے تو کوئی ویشیا معلوم ہوتی ہے۔'

وِیشیا ہی سہی، پر اسے اتنی بے شرمی کر کے اِستری سماج کو لجّت کرنے کا کیا ادھیکار ہے؟'

'کیسے مزے سے سورہی ہے، مانو اپنے گھر میں ہے۔'

'بے حیائی ہے، میں پردہ نہیں چاہتی، پُروش کی غلامی نہیں چاہتی، لیکن عورتوں میں جو گورَوشیلتا اور سجلّتا ہے، اسے نہیں چھوڑنا چاہتی، میں کسی یووتی کو سڑک پر سگریٹ پیتے دیکھتی ہوں، تو میرے بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ اسی طرح آدھی چھاتی کا جمفر بھی مجھے نہیں سوہاتا ہے۔ کیا اپنے دھرم کی لاج چھوڑ دینے سے ہی ثابت ہوگا کہ ہم بہت فارورڈ ہیں؟ پُروش اپنی چھاتی یا پیٹھ کھولے تو نہیں گھومتے؟'

'اِسی بات پر بائی جی، جب میں آپ کو آڑے ہاتھوں لیتی ہوں، تو آپ بگڑنے لگتی ہیں۔ پروش سُوادھین ہے وہ دل میں سمجھتا ہے کہ میں سوادھین ہوں۔ وہ سوادھینتا کا

سوانگ نہیں بھرتا۔

استری اپنے دل میں سمجھتی رہتی ہے کہ وہ سوادھین نہیں ہے اس لیے وہ اپنے سوادھینتا کا ڈھونگ کرتی ہے۔ جو بلوان ہیں، وِے اکڑتے نہیں۔ جو دُربل ہیں، وہی اَکڑ دکھاتے ہیں۔ کیا آپ اِنھیں اپنے آنسو پونچھنے کے لیے ادھیکار بھی نہیں دینا چاہتیں؟

'میں تو کہتی ہوں اِستری اپنے کو چھپا کر پُروش کو جتنا نچا سکتی ہے، اپنے کو کھول کر نہیں نچا سکتی۔'

'استری ہی پروش کے آکرشن کی فِکر کیوں کرے؟ پُروش کیوں اِستری سے پردہ نہیں کرتا؟'

'اب منھ نہ کھلواؤ مینو۔ اس چھوکری کو جاکر کہہ دو۔ جاکر گھر میں سوئے۔ اتنے آدمی آجا رہے ہیں اور یہ نرلج ٹانگ پھیلائے پڑی ہے۔ یہاں اِسے نیند کیسے آگئی؟'

'رات کی گرمی تھی بائی جی۔ ٹھنڈک پا کر بیچاری کی آنکھ لگ گئی ہے۔'

'رات بھر یہیں رہی ہے، کچھ کچھ بدتی ہوں؟'

مینو یووتی کے پاس جا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلاتی ہے۔ یہاں کیوں سو رہی ہو دیوی جی۔ اتنا دن چڑھ آیا، اُٹھ کر گھر جاؤ۔

یووتی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ اُو ہو، اِتنا دن چڑھ آیا؟ کیا میں سو گئی تھی؟ میرے سر میں چکر آجایا کرتا ہے۔ میں نے سمجھا شاید ہوا سے کچھ لابھ ہو۔ یہاں آئی، پر ایسا چکّر آیا کہ میں اس بینچ پر بیٹھ گئی، پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ اب بھی میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔ معلوم ہوتا ہے میں گر پڑوں گی۔ بہت دوا کی، پر کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ آپ ڈاکٹر شیام ناتھ کو جانتی ہوں گی، وہ میرے سُسر ہیں۔

یووتی نے آشچریہ سے کہا۔ اچھا؟ وہ تو ابھی اِدھر ہی سے گئے ہیں۔'

'سچ، لیکن مجھے پہچان کیسے سکتے ہیں؟ ابھی میرا گونا نہیں ہوا ہے۔'

'تو کیا آپ اُن کے لڑکے وسنت لال کی دھرم پتنی ہیں؟'

یووتی نے شرم سے سر جھکا کر سویکار کیا۔ مینو نے ہنس کر کہا۔

وسنت لال تو ابھی ادھر سے گئے ہیں؟ میرا ان سے یونیورسٹی کا پریچے ہے۔'

'اچھا۔ لیکن مجھے انھوں نے دیکھا کہاں ہے؟'

'تو میں دوڑ کر ڈاکٹر کو خبر دے دوں۔'

'جی نہیں ، میں تھوڑی دیر میں بالکل اچھی ہو جاؤں گی۔'

وسنت لال بھی وہ کھڑا ہے، اسے بلا دوں۔'

'جی نہیں ِکسی کو نہ ُبلا یئے۔'

'تو چلو ، اپنے موٹر پر تمھیں تمھارے گھر پہنچا دوں۔'

'آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔'

'کس محلّے میں ؟'

'بیگم گنج، مسٹر جے رام داس کے گھر؟'

'میں آج ہی میاں وَسنت لال سے کہوں گی۔'

'میں کیا جانتی تھی کہ وہ اس پارک میں آتے ہیں۔'

'مگر کوئی آدمی تو ساتھ لے لیا ہوتا؟'

'کس لیے؟ کوئی ضرورت نہ تھی۔'

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں مارچ 1934 میں شائع ہوا۔'مان سروور حصہ 1' میں شامل ہے۔ اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔)

جادُو

نیلا : تم نے اُسے کیوں لکھا؟

مینا : کس کو؟

'اُسی کو؟'

'میں نہیں سمجھتی!'

'خوب سمجھتی ہو'

'جس آدمی نے میرا اپمان کیا۔ گلی گلی میرا نام بیچتا پھرا، اسے تم منہ لگاتی ہو۔ کیا یہ اُچت ہے؟'

'تم غلط کہتی ہو'

'تم نے اسے خط نہیں لکھا ؟'

'کبھی نہیں'

'تو میری غلطی تھی، چھما کرو۔ تم میری بہن نہ ہوتی ،تو میں تم سے یہ سوال بھی نہ پوچھتی۔'

'میں نے کسی کو خط نہیں لکھا۔'

'مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی ،تم مسکرائی کیوں ؟'

'میں'

'جی ہاں آپ'

'میں تو ذرا بھی نہیں مسکرائی ۔'

'کیا میں اندھی ہوں ؟'

'یہ تو تم اپنے منہ سے ہی کہتی ہو'

'تم کیوں مسکراتی ہو؟'

'میں سچ کہتی ہوں، ذرا بھی نہیں مسکرائی۔'
'میں نے اپنی آنکھوں دیکھا۔'
'اب میں کیسے تمھیں وشواس دلاؤں۔'
'تم آنکھوں میں دھول جھونکتی ہو۔'
'اچھا مسکرائی، بس یا، جان لوگی۔'
'تمھیں کسی کے اُوپر مسکرانے کا کیا ادھیکار ہے؟'
تیرے پیروں پڑتی ہوں نیلا، میرا گلا چھوڑ دے، میں بالکل نہیں مسکرائی'
میں ایسی انیلی نہیں ہوں'
'یہ میں جانتی ہوں'
'تم نے مجھے ہمیشہ جھوٹی سمجھا ہے؟'
'تو آج کس کا منہ دیکھ کر اٹھی ہے؟'
'تمھارا'
تو مجھے تھوڑا سنکھیا کیوں نہیں دے دیتی۔'
'ہاں میں تو ہتیارن ہوں ہی؟'
'میں تو نہیں کہتی'
'اب اور کیسے کہوگی، کیا ڈھول بجا کر؟ میں ہتیارن ہوں'
ںمد ماتی ہوں! دیدہ دلیر ہوں، تم سر وگنا گری ہو' سیتا ہو ساوتری ہو۔ اب خوش ہوئی؟
لو کہتی ہوں میں نے انھیں پتر لکھا پھر تم سے مطلب ؟تم کون ہوتی ہو مجھ سے جواب طلب کرنے والی ؟'
'اچھا کیا۔' لکھا، سچ مچ میری بے وقوفی تھی کہ میں نے تم سے پوچھا، ہماری خوشی، ہم جس کو چاہیں گے خط لکھیں گے۔ جس سے چاہیں گے بولیں گے۔
تم کون ہوتی ہو روکنے والی؟ تم سے تو میں نہیں پوچھنے جاتی۔ حالانکہ روز تمھیں پُلندوں پتر لکھتے دیکھتی ہوں۔ جب تم نے شرم ہی بھُن کھائی، تو جو چاہو کرو اختیار ہے۔
'اور اب تم کب سے بڑی لجاوتی بن گئی؟ سوچتی ہوگی؟ اماں سے کہہ دوں گی، یہاں اس کی پرواہ نہیں ہے۔ میں نے انھیں پتر بھی نہیں لکھا، ان سے پارک میں بھی ملی

تھی۔ بات چیت بھی کی، جاکر امّاں سے، دادا سے اور سارے محلّے سے کہہ دو۔'
'جو جیسا کرے گا،آپ بھوگے گا ،میں کیوں کسی سے کہنے جاؤں؟'
'او ہو، بڑی دھیر یہ والی، یہ کیوں نہیں کہتی انگور کھٹے ہیں؟'
'جوتم کہو وہی ٹھیک ہے۔'
'دل میں جلی جاتی ہو'
'میری بلا جلے'
'رو دو ذرا'
'تم خود روؤ میرا انگوٹھا روئے۔'
'مجھے انھوں نے ایک رِسٹ واچ بھینٹ دی ہے،دکھاؤں؟'
'مبارک ہو'
'میری آنکھوں کا سنیچر نہ دور ہوگا،
'میں کہتی ہوں ،تم اتنی جلتی کیوں ہو؟'
'اگر میں تم سے جلتی ہوں تو میری آنکھیں پٹم ہوجائیں،
تم جتنا ہی جلوگی میں اتنا ہی جلاؤں گی۔'
'میں جلوں گی ہی نہیں'
جل رہی ہو صاف'
'کب سندیشہ آئے گا'
'جل مرو'
'پہلے تیری بھانورے دیکھ لوں۔'
'بھانوروں کی چاٹ تمھیں ہی رہتی ہے۔'
'اچھا !تو کیا بنا بھانوروں کے بیاہ ہوگا؟'
'یہ ڈھکوسلے تمھیں مبارک رہے۔ میرے لیے پریم کافی ہے۔'
'تو کیا سچ مچ '
'میں کسی سے نہیں ڈرتی۔'
'یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے اور تو کہہ رہی تھی، میں نے اسے پتر نہیں لکھا اور

قسمیں کھا رہی تھی؟'

'کیوں اپنے دل کا حال بتلاؤں۔'

'میں تو تجھ سے پوچھتی نہ تھی، مگر تو آپ ہی آپ بک چلی؟'

'تم مسکرائی کیوں؟'

'اس لیے کہ وہ شیطان تمھارے ساتھ بھی وہی دغا کرے گا جو اس نے میرے ساتھ کیا اور پھر تمھارے رِشتے میں بھی ویسی ہی باتیں کہتا پھرے گا اور پھر تم میری طرح اس کے نام کو روؤ گی۔'

'تم سے انھیں پریم نہیں تھا۔'

'مجھ سے! میرے پیروں پر سر رکھ کر روتا تھا اور کہتا تھا کہ میں مرجاؤں گا اور زہر کھالوں گا۔'

'سچ کہتی ہو؟'

'بالکل سچ'

'یہ تو وہ مجھ سے بھی کہتے ہیں۔'

'سچ'

'تمھارے سر کی قسم'

اور میں سمجھ رہی تھی ،ابھی وہ دانے بکھیر رہا ہے۔'

'کیا وہ سچ مچ۔'

'پکّا شکاری ہے۔'

'بینا سر پر ہاتھ رکھ کر چنتا میں ڈوب جاتی ہے۔'

(ہندی میں ماہنامہ 'ہنس' اپریل مئی 1934 کے شمارے میں شائع ہوا۔ 'مان سروور حصہ 2' میں شامل ہے۔)

ریاست کا دیوان

مسٹر مہتا ان بدنصیبوں میں تھے جو اپنے آقا کو خوش نہیں رکھ سکتے۔ وہ دل سے اپنا کام کرتے تھے۔ بڑے یکسوئی اور ذمہ داری کے ساتھ! اور یہ بھول جاتے تھے کہ وہ کام کے نوکر تو ہیں ہی، اپنے آقا کے نوکر بھی ہیں۔ جب ان کے دوسرے بھائی دربار میں بیٹھے خوش گپیاں کرتے، وہ دفتر میں بیٹھے کاغذوں سے سرماتے۔ اور اس کا نتیجہ تھا کہ جو آقا پرور تھے ان کی ترقیاں ہوتی تھیں۔ انعام و اکرام پاتے تھے۔ اور یہ حضرت جو فرض پرور تھے، راندۂ درگاہ سمجھے جاتے تھے اور کسی نہ کسی الزام میں نکالی دیے جاتے تھے۔

زندگی میں ایسے تلخ تجربے انھیں کئی بار ہوئے تھے۔ اس لیے جب اب کی راجہ صاحب سیتا نے انھیں اپنے ہاں ایک معزز عہدہ دے دیا تو انھو ں نے عہد کر لیا کہ اب میں بھی آقا کا رُخ دیکھ کر کام کروں گا۔ اور ان کی مزاج داری کو اپنا شعار بناؤں گا۔ لگن کے ساتھ کام کرنے کا پھل پا چکا، اب ایسی غلطی نہ کروں گا۔

دو سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ راجہ صاحب نے انھیں اپنا دیوان بنا لیا۔ ایک مختار ریاست کی دیوانی کا کیا کہنا۔ تنخواہ تو بہت کم تھی، مگر اختیارات غیر محدود۔ راجہ صاحب اپنے سیر و شکار اور عیش و نشاط میں مصروف رہتے تھے۔ ساری ذمہ داری مسٹر مہتا پر تھی۔ ریاست کے حکّام ان کے سامنے سرِ نیاز خم کرتے۔ رؤسا نذرانے دیتے۔ تجّار سجدے بجا لاتے۔ یہاں تک کہ رانیاں بھی ان کی خوشامد کرتی تھیں۔ راجہ صاحب بھی بدمزاج آدمی تھے۔ اور بد زبان بھی۔ کبھی کبھی سخت سُست کہہ بیٹھتے۔ مگر مسٹر مہتا نے اپنا وظیرہ بنا لیا تھا کہ صفائی یا عذر میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالتے۔ سب کچھ سر جھکا کر سن لیتے۔ راجہ صاحب کا غصہ فرو ہو جاتا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ پولیٹیکل ایجنٹ کا دورہ تھا۔ ریاست میں ان کے خیر مقدم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ راجہ صاحب نے مسٹر مہتا کو بلا کر کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ

صاحب بہادر یہاں سے میرا کلمہ پڑھتے ہوئے جائیں۔
مہتا نے سر اٹھا کر کہا۔ ''کوشش تو ایسی ہی کر رہا ہوں اَن داتا۔''
''میں کوشش نہیں چاہتا۔ جس میں ناکامی کا پہلو بھی شامل ہے۔ قطعی وعدہ چاہتا ہوں۔''
''ایسا ہی ہوگا۔''
''روپیہ کی پرواہ مت کیجیے۔''
''جو حکم۔''
''کسی کی فریاد یا شکایت پر کان نہ دیجیے۔''
''جو حکم۔''
''ریاست میں جو چیز ہے وہ ریاست کی ہے۔ آپ اس کا بے دریغ استعمال کر سکتے ہیں۔''
''جو حکم۔''

(2)

ادھر تو پولٹیکل ایجنٹ کی آمد تھی۔ ادھر مسٹر مہتا کا لڑکا جے کرشن گرمیوں کی تعطیل میں گھر آیا۔ الہ آباد یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ ایک بار 1932 میں کوئی تقریر کرنے کے جرم میں چھ مہینے جیل ہو آیا تھا۔ اور تب سے کسی قدر خود سر ہوگیا تھا۔ مسٹر مہتا کے تقرر کے بعد جب وہ ریاست میں پہلی بار آیا تھا تو راجہ صاحب نے بڑی بے تکلفی سے باتیں کی تھیں۔ اسے اپنے ساتھ شکار کھیلنے کے لیے لے گئے تھے۔ اور روزانہ اس کے ساتھ کھیلتے تھے۔ جے کرشن راجہ صاحب کے قوم پرورانہ خیالات سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ راجہ صاحب سچے محبّ وطن ہی نہیں انقلاب کے حامیوں میں سے ہیں۔ روس اور فرانس کے انقلاب پر دونوں میں خوب مباحثے ہوئے۔ لیکن اب کی یہاں اس نے کچھ اور ہی رنگ دیکھا۔ علاقہ کے ہر ایک کاشتکار اور زمیندار سے اس تقریب کے لیے جبراً چندہ وصول کیا جا رہا تھا۔ رقم کا تعین دیوان صاحب کرتے۔ وصول کرنا پولیس کا کام تھا۔ فریاد اور احتجاج کی مطلق سنوائی نہ ہوتی تھی۔ ہزار مزدور سرکاری

عمارتوں کی صفائی، سجاوٹ اور سڑکوں کی مرمت میں بیگار تھے۔ نبیوں سے رسد جمع کی جا رہی تھی۔ ساری ریاست میں واویلا مچا ہوا تھا۔ جے کرشن کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ راجہ صاحب کے مزاج میں اتنا تغیر کیسے ہوگیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ راجہ صاحب کو ان زبردستیوں کی خبر نہ ہو، اور انھوں نے جن تیاریوں کا حکم دیا ہو اس کی تعمیل میں کار پردازوں کی جانب سے اس سرگرمی کا اظہار کیا جا رہا ہو۔ رات بھر تو اس نے ضبط کیا، اور دوسرے دن صبح ہی اس نے دیوان صاحب سے پوچھا۔ ''آپ نے راجہ صاحب کو ان زیادتیوں کی اطلاع نہیں دی؟''

مسٹر مہتا رعایا پرور آدمی تھے۔ انھیں خود ان بے عنوانیوں سے کوفت ہو رہی تھی۔ مگر حالات سے مجبور تھے۔ بے کسانہ انداز سے بولے۔ ''راجہ صاحب کا یہی حکم ہے تو کیا کیا جائے؟''

''تو آپ کو ایسی حالت میں کنارہ کش ہو جانا چاہیے تھا۔ آپ جانتے ہیں یہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی ذمہ داری آپ کے اوپر عائد ہو رہی ہے۔ رعایا آپ ہی کو مجرم سمجھتی ہے۔''

''میں مجبور ہوں۔ میں نے اہلکاروں سے بار بار کنایۃً کہا ہے کہ ضرورت سے زیادہ سختی نہ کی جائے۔ لیکن ہر ایک موقعہ پر میں موجود تو نہیں رہ سکتا۔ اگر زیادہ مداخلت کروں تو شاید اہلکار میری شکایت راجہ صاحب سے کر دیں۔ اہلکار ایسے ہی موقعوں کے منتظر رہتے ہیں۔ انھیں تو عوام کے لوٹنے کا کوئی بہانہ چاہیے۔ جتنا سرکاری خزانہ میں داخل کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ اپنے گھر میں رکھتے ہیں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔''

جے کرشن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ''تو آپ استعفیٰ کیوں نہیں دے دیتے۔''

مسٹر مہتا ہمدردانہ لہجہ میں بولے۔ ''بے شک۔ میرے لیے مناسب تو یہی تھا۔ لیکن زندگی میں اتنے دھکّے کھا چکا ہوں کہ اب برداشت کی طاقت نہیں رہی۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ ملازمت کر کے میں اپنے ضمیر کو بے داغ نہیں رکھ سکتا۔ نیک و بد اور فرض اور ایمانداروں کے جھمیلوں میں پڑ کر میں نے بہت سے تلخ تجربات حاصل کیے۔ میں نے دیکھا کہ دنیا، دنیا داروں کے لیے ہے جو موقعہ و محل دیکھ کر کام کرتے ہیں۔ اصول پرستوں کے لیے دنیا مناسب جگہ نہیں ہے۔''

جے کرشن نے پوچھا۔ ''میں راجہ صاحب کے پاس جاؤں؟''

مہتا نے اس سوال کا جواب نہ دے کر پوچھا۔ ''کیا تمھارا خیال ہے کہ راجہ صاحب کو ان واقعات کا علم نہیں ہے؟''

''کم سے کم ان پر حقیقت تو روشن ہو جائے گی۔''

''مجھے خوف ہے تمھارے منھ سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکل جائے جو مہاراج کی ناراضگی کا باعث ہو۔''

جے کرشن نے انھیں یقین دلایا کہ اس کی جانب سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوگی۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ آج کے مہاراج صاحب وہ نہیں ہیں، جو ایک سال قبل تھے۔ ممکن ہے پولٹیکل ایجنٹ کے رخصت ہو جانے کے بعد ہو جائیں۔ ان کے لیے آزادی اور انقلاب کی گفتگو بھی اسی طرح تفریح کا باعث تھی، جیسے قتل اور ڈاکہ کی وارداتیں ، یا بازارِ حُسن کی دل آویز خبریں۔ اس لیے جب اس نے مہاراج کی خدمت میں اطلاع کرائی، تو معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت اس وقت ناساز ہے۔ لیکن وہ لوٹ ہی رہا تھا کہ مہاراج کو خیال آیا۔ شاید اس سے فلمی دنیا کی تازہ ترین خبریں معلوم ہو جائیں۔ اسے بلا لیا، اور مسکرا کر بولے۔ ''تم خوب آئے بھئی۔ کہو تم نے ایم سی سی کا میچ دیکھا یا نہیں؟ میں تو ان پریشانیوں میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ ہل نہ سکا۔ اب تو یہی دعا کر رہا ہوں کہ کسی طرح ایجنٹ صاحب خوش خوش رخصت ہو جائیں۔ میں نے جو تقریر تیار کروائی ہے وہ ذرا تم بھی دیکھ لو۔ میں نے ان قومی تحریکوں کی خوب خبر لی ہے۔ اور ہریجن تحریک کے بھی چھینٹے اڑا دیے ہیں۔''

جے کرشن نے اعتراض کیا۔ ''لیکن ہریجن تحریک سے سرکار کو بھی اتفاق ہے۔ اسی لیے اس نے مہاتما جی کو رہا کر دیا۔ اور جیل میں بھی انھیں اس تحریک کے متعلق لکھنے پڑھنے کی کامل آزادی دے رکھی تھی۔''

راجہ صاحب نے عازماً تبسم کے ساتھ کہا۔ ''تم ان رموز سے واقف نہیں ہو۔ یہ بھی سرکار کی ایک مصلحت ہے۔ دل میں گورنمنٹ خوب سمجھتی ہے کہ بالآخر یہ تحریک بھی قوم میں ہیجان پیدا کرے گی۔ اور ایسی تحریکوں سے اسے فطرتاً کوئی ہمدردی نہیں ہوسکتی۔ سرکار اس کیفیت کو بڑے غور سے دیکھ رہی ہے۔ لائلٹی میں جتنی سرگرمی کا اظہار کرو،

چاہے وہ حماقت کے درجہ تک ہی کیوں نہ پہنچ جائے۔ سرکار کبھی بُرا نہ مانے گی۔ اسی طرح جیسے شعرا کی مبالغہ آمیز مدح سرائیاں ہماری خوشی کا باعث ہوتی ہیں، چاہے ان میں تضحیک کا پہلو کیوں نہ ہو۔ ہم ایسے شاعر کو خوشامدی سمجھیں، احمق بھی سمجھ سکتے ہیں مگر اس سے ناراض نہیں ہو سکتے۔ وہ جتنا ہی مبالغہ کرے، اتنا ہی ہمارے قریب آجاتا ہے۔''

راجہ صاحب نے اپنے خطبہ کی ایک خوبصورت کاپی میز کی دراز سے نکال کر جے کرشن کے ہاتھ میں رکھ دی۔ مگر جے کرشن کے لیے اب اس تقریر میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اگر وہ موقعہ شناس ہوتا تو ظاہر داری کے لیے ہی اس تقریر کو بڑے غور سے دیکھتا۔ اس کی عبارت آرائیوں کی داد دیتا۔ اس کا موازنہ مہاراجہ صاحب بیکانیر یا پٹیالہ کی تقریروں سے کرتا۔ مگر ابھی وہ اس کوچہ سے ناآشنا تھا۔ جس چیز کو برا سمجھتا تھا، اسے برا کہتا تھا۔ جس چیز کو اچھا اُسے اچھا اور اچھے کو بُرا کہنا ابھی اسے نہ آیا تھا۔ اس نے تقریر پر سرسری نظر ڈالی، اور میز پر رکھ دیا۔ اور آپنی آزاد روی کا بگل بجاتا ہوا بولا۔

''میں ان عقدوں کو کیا سمجھوں گا۔ لین میرا خیال ہے کہ حکّام پکّے نبض شناس ہوتے ہیں۔ اور تصنع سے مطلق متاثر نہیں ہوتے بلکہ اس سے انسان ان کی نظروں میں اور بھی گر جاتا ہے۔ اگر پولٹیکل ایجنٹ کو معلوم ہو جائے کہ اس خیر مقدم کے لیے رعایا پر کتنے ستم کیے جا رہے ہیں تو شاید وہ یہاں سے خوش ہو کر نہ جائے گا۔ پھر ایجنٹ کی خوشنودی آپ کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ رعایا کو اس سے نقصان ہی ہوگا۔''

راجہ صاحب دیگر فرماں رواؤں کی طرح اپنے سے زیادہ طاقتوروں کے سامنے تو انکسار کے پُتلے تھے، لیکن کمزوروں کی جانب سے نکتہ چینی، انھیں مطلق برداشت نہ تھی۔ ان کے غصے کی ابتدائی صورت جرح ہوتی تھی۔ پھر استدلال کا درجہ آتا تھا۔ جو فوراً تردید کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ اس کے بعد وہ زلزلہ کی حرکتوں میں نمودار ہوتا۔ سُرخ ترچھی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''کیا نقصان ہوگا؟ ذرا سنوں۔''

جے کرشن سمجھ گیا کہ غصہ کی مشین گن گردش میں آگئی۔ سنبھل کر بولا۔

''اسے آپ مجھ سے زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔''

''نہیں میں اتنا زود فہم نہیں ہوں۔''

''آپ برا نہ مان جائیں گے۔''

''کیا تم سمجھتے ہو میں بارود کا ڈھیر ہوں؟''

''بہتر ہو اگر آپ مجھ سے یہ سوال نہ کریں۔''

''تمھیں بتلانا پڑے گا۔'' اور اضطراری طور پر اُن کی مٹھیاں بندھ گئیں۔''فوراً اسی وقت۔''

جے کرشن پر رُعب کیوں طاری ہونے لگا۔ بولا۔ ''آپ ابھی پولیٹکل ایجنٹ سے ڈرتے ہیں۔ جب وہ آپ کا ممنون ہو جائے گا۔ تب آپ مطلق العنان ہو جائیں گے اور رعایا کی فریاد سننے والا کوئی نہ رہے گا۔''

راجہ صاحب شعلہ بار آنکھوں سے تاکتے ہوئے بولے۔ ''میں ایجنٹ کا غلام نہیں ہوں کہ اس سے ڈروں۔ بالکل کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں ایجنٹ کی محض اس لیے خاطر کرتا ہوں کہ وہ شہنشاہ کا قائم مقام ہے۔ میرے اور شہنشاہ کے درمیان برادرانہ تعلقات ہیں۔ محض آئین سلطنت کی پابندی کر رہا ہوں۔ میں ولایت جاؤں تو اسی طرح ہر مجیسٹی بھی میری تواضع و تکریم کریں گے۔ میں ڈروں کیوں؟ میں اپنی ریاست کا خود مختار راجہ ہوں۔ جسے چاہوں پھانسی دے سکتا ہوں۔ میں کسی سے کیوں ڈرنے لگا۔ ڈرنا بزدلوں کا کام ہے۔ میں خدا سے بھی نہیں ڈرتا۔ ڈر کیا چیز ہے۔ یہ میں آج تک نہ جان سکا۔ میں تمھاری طرح غیر ذمہ دار کالج کا طالب علم نہیں ہوں کہ انقلاب اور آزادی کی صدا لگاتا پھروں۔ حالانکہ تم نے ان چیزوں کا محض ابھی نام سنا ہے۔ اس کے خونی مناظر آنکھوں سے نہیں دیکھے۔ تم خوش ہوگے اگر میں ایجنٹ سے پنجہ آزمائی کروں، میں اتنا احمق نہیں ہوں، میں اندھا نہیں ہوں۔ رعایا کی حالت کا مجھے تم سے کہیں زیادہ علم ہے۔ میں شادی و غم میں ان کا شریک اور ہمدرد رہا ہوں۔ ان سے جو محبت مجھے ہو سکتی ہے، وہ تمھیں کبھی نہیں ہو سکتی۔ تم میری رعایا کو انقلاب کے خواب دکھا کر گمراہ نہیں کر سکتے۔ تم میری ریاست میں فساد اور شورش کے بیج نہیں بو سکتے۔ تمھیں اپنی زبان پر خاموشی کی مہر لگانی ہوگی۔''

آفتاب مغرب میں ڈوب رہا تھا اور اس کی کرنیں محرابوں کے رنگین شیشوں سے گزر کر راجہ کے چہرہ کو غضبناک بنا رہی تھیں۔ ان کے بال نیلے ہوگئے تھے۔ آنکھیں زرد

تھیں۔ چہرہ سرخ اور جسم سبز ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی دوسری دنیا کی ہیبت ناک مخلوق ہے، جے کرشن کی ساری انقلاب پسندی غائب ہوگئی۔ راجہ صاحب کو اتنے طیش میں اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا مردانہ وقار اس للکار کا جواب دینے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ جیسے حلم کا جواب حلم ہے، ویسے ہی غصہ کا جواب غصہ ہے۔ جب وہ رُعب، خوف، لحاظ اور ادب کی بندشوں کو توڑ کر بدمست ہو کر باہر نکلتا ہے، پھر چاہے وہ اس بدمستی میں سرنگوں ہی کیوں نہ ہو جائے، اس نے بھی راجہ کو مجروح نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''میں اپنی آنکھوں سے یہ ظلم وستم دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا۔''

راجہ صاحب نے دانت پیس کر کہا۔ ''تمھیں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

''ہر ذی ہوش انسان کو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق ہے۔ آپ مجھے اس سے محروم نہیں کر سکتے۔''

''میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میں تمھیں ابھی جیل میں بند کر سکتا ہوں۔''

''آپ کو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔ میں آپ کی رعایا نہیں ہوں۔''

اسی وقت مسٹر مہتا نے ایک وحشت کے عالم میں کمرے میں قدم رکھا، اور جے کرشن کی طرف قہر کی آنکھوں سے دیکھ کر بولے۔ ''کرشنا نکل جا یہاں سے، ناخلف تجھے خبر ہے تو کس سے زبان درازی کر رہا ہے۔ ابھی میری نظروں سے دور ہو جا۔ احسان فراموش کہیں کا۔ جس تھال میں کھاتا ہے، اسی میں سوراخ کرتا ہے۔ دیوانہ! اگر اب زبان کھولی تو میں تیرا خون پی جاؤں گا۔

جے کرشن ایک لمحہ تک مہتا کے غضب ناک چہرے کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور تب فاتحانہ غرور سے اکڑتا ہوا دیوان خانہ سے نکل گیا۔

راجہ صاحب نے کوچ پر لیٹ کر کہا۔ ''مفسد آدمی ہے۔ انتہا درجہ کا مفسد۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسا خطرناک آدمی میری ریاست میں ایک لمحہ بھی رہے۔ تم اس سے جا کر کہہ دو کہ اسی وقت یہاں سے چلا جائے، ورنہ اس کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ میں خود سر کی گوشمالی کرنا جانتا ہوں۔ میں محض آپ کی مروت سے اتنا تحمل کر گیا، ورنہ اسی وقت اس کی فتنہ انگیزیوں کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ آپ کو اسی وقت فیصلہ کرنا ہوگا۔ یہاں رہنا ہے یا

نہیں، اگر رہنا منظور ہے تو طلوع سحر کے قبل اسے میرے قلمرو سے باہر نکل جانا چاہیے۔ ورنہ آپ حراست میں ہوں گے اور آپ کا سارا مال و اسباب ضبط کر لیا جائے گا۔''

مسٹر مہتا نے خطاوارانہ انداز سے کہا۔ ''آج ہی ارشاد کی تعمیل کروں گا۔''

راجہ صاحب نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ''آج نہیں، اسی وقت۔''

مہتا نے ذلت کو نگل کر جواب دیا۔ ''اسی وقت نکال دوں گا۔''

راجہ صاحب بولے۔ ''اچھی بات ہے۔ تشریف لے جائیے۔ اور آدھ گھنٹہ کے اندر آکر مجھے اطلاع دیجیے۔''

مسٹر مہتا گھر چلے تو انھیں جے کرشن پر بے انتہا طیش آرہا تھا۔ احمق چلا ہے یہاں آزادی کا راگ الاپنے۔ اب بچہ کو معلوم ہوگا، یہ راجے کس آب و گِل کے بنے ہوتے ہیں۔ میں اس کے پیچھے دنیا میں رسوا و ذلیل نہیں ہوسکتا وہ خود اپنے فعل کا خمیازہ اٹھائے۔ یہ بے عنوانیاں مجھے بُری لگتی ہیں۔ جب کسی بات کا علاج میرے امکان میں نہیں تو اسی ایک معاملہ کے پیچھے کیوں اپنی زندگی خراب کروں۔''

گھر میں قدم رکھتے ہی انھوں نے کرخت لہجہ میں پکارا ۔ جے کرشن۔''

جے کرشن ابھی تک گھر نہ آیا تھا۔ سُجاتا نے کہا۔ ''وہ تو تم سے پہلے ہی راجہ صاحب سے ملنے گیا تھا۔ تب سے کب آیا۔ بیٹھا گپ شپ کر رہا ہوگا۔''

اسی وقت ایک سپاہی نے ایک رقعہ لا کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ مہتا نے پڑھا۔

''اس ذلّت کے بعد میں اس ریاست میں ایک لمحہ بھی رہنا گوارا نہیں کر سکتا۔ میں جاتا ہوں۔ آپ کو اپنا عہدہ اور اعزاز اپنے ضمیر سے زیادہ عزیز ہے۔ آپ شوق سے رہیں۔ میں پھر اس ریاست میں قدم نہ رکھوں گا۔ اماں جی سے میرا پر نام کہیے گا۔''

مسٹر مہتا نے پُرزہ بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور مایوسانہ انداز سے بولے۔

''اس لونڈے کو نہ جانے کب عقل آئے گی۔ جا کر مہاراجہ صاحب سے اُلجھ پڑا۔ وہ تو یہ کہو میں پہنچ گیا، ورنہ راجہ صاحب اسی وقت اسے حراست میں لے لیتے۔ یہ خود مختار راجہ ہیں۔ انھیں کس کا خوف، انگریزی سرکار بھی تو انھیں کی سنتی ہے۔ مگر بہت اچھا ہوا بچہ کو سبق مل گیا۔ اب معلوم ہو گیا ہوگا، دنیا میں کس طرح رہنا چاہیے، اور اپنے جذبات پر قابو نہ رکھنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ میں یہ تماشے بہت دیکھ چکا اور ان خرافات

کے پیچھے اپنی زندگی نہیں برباد کرنا چاہتا۔''
اور اسی وقت وہ راجہ صاحب کو اس واقعہ کی اطلاع دینے چلے۔

(3)

ایک لمحہ میں ساری ریاست میں یہ خبر مشہور ہوگئی۔ جے کرشن اپنی غریب دوستی کے باعث عوام میں بہت مقبول تھا۔ لوگ بازاروں میں اور چورستوں پر کھڑے ہو کر اس واقعہ پر رائے زنی کرنے لگے۔ ''اجی وہ آدمی نہیں تھا بھائی میرے کسی دیوتا کا اوتار سمجھو اُسے۔ مہاراجہ صاحب سے جا کر بولا۔ ابھی بیگار بند کیجیے، ورنہ شہر میں آفت آجائے گی۔ راجہ صاحب کو تو اس کے سامنے زبان بند ہوگئی۔ صاحب بغلیں جھانکنے لگے۔ شیر ہے شیر، اور وہ بیگار بند کرا کے رہتا۔ راجہ صاحب کو بھاگنے کی راہ نہ ملتی۔ سنا ہے کھسیانے لگے تھے۔ مگر اسی بیچ میں دیوان صاحب نے جا کر اس کے دیس نکالے کا حکم دے دیا۔ یہ حکم سن کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا، لیکن باپ کی بے عزتی کیسے کرتا۔''
''ایسے باپ کو تو گولی مار دینی چاہیے۔ یہ باپ ہے یا دشمن۔''
''وہ کچھ بھی ہے، ہے تو باپ ہی۔''

جے کرشن کی ماں کا نام سُجاتا تھا۔ بیٹے کی جلا وطنی اس کے جگر میں برچھیاں چبھونے لگی۔ ابھی تو اس سے جی کھول کر باتیں بھی نہ کرنے پائی تھی۔ سوچا تھا۔ اس سال بیاہ رچائیں گے۔ چنی منی بہو گھر میں آئے گی۔ ادھر یہ بجلی گر پڑی نہ جانے بے چارا کہاں گیا۔ رات کو کہاں رہے گا۔ اس کے پاس روپے بھی تو نہیں ہیں۔ غریب پاؤں پاؤں بھاگا چلا جاتا ہوگا۔ دل میں ایسا طوفان اٹھا کہ گھر اور شہر چھوڑ کر ریاست سے نکل جائے انھیں اپنا عہدہ پیارا ہے۔ لے کر رہیں۔ وہ اپنے لخت جگر کے ساتھ فاقے کرے گی، اسے آنکھوں سے دیکھتی رہے گی، لیکن نہیں وہ جا کر فریاد کرے گی۔ انھیں بھی ایشور نے بچے دیے ہیں۔ ماں کا درد ہی سمجھ سکتی ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار مہارانی کے قدم بوس ہو چکی تھی۔ فوراً سواری منگوائی اور مہارانی کے پاس جا پہنچی۔

مہارانی کے تیور آج بدلے ہوئے تھے۔ منھ لٹکا ہوا تھا۔ راجہ صاحب کے اقلیم دل پر تو ان کا راج نہ تھا، مگر وہ ولی عہد کی ماں تھیں اور یہ غرور انھیں مہاراجہ سے بے نیاز

رکھنے کے لیے کافی تھا۔ بولیں۔ ''بہن! تمھارا لڑکا بڑا بدزبان ہے۔ ذرا بھی ادب نہیں، کس سے کس طرح بات چیت کرنی چاہیے۔ اس کا اسے ذرا بھی سلیقہ نہیں۔ مہاراج نے پہلی بار ذرا اُسے منھ لگایا تو اب کی سر چڑھ گیا۔ کہنے لگا بیگار بند کر دیجیے۔ اور ایجنٹ صاحب کے استقبال اور مہمانداری کی کوئی تیاری نہ کیجیے۔ اتنی سمجھ اسے نہیں ہے کہ اس طرح ہیکڑی جتا کر ہم کتنے گھنٹے گدّی پر رہ سکتے ہیں۔ پھر یہ خیال بھی تو ہونا چاہیے کہ ایجنٹ کا رتبہ کیا ہے۔ ایجنٹ بادشاہ سلامت کا قائم مقام ہے۔ اس کی خاطر تواضع کرنا ہمارا فرض ہے۔ یہ بیگار آخر کس دن کام آئیں گے۔ اسی موقعہ کے لیئے ریاست سے ان کو جاگیریں مقرر ہیں۔ رعایا میں ایسی بغاوت پھیلانا کوئی بھلے آدمی کا کام ہے۔ جس تھال میں کھاؤ اسی میں سوراخ کرو۔ مہاراجہ صاحب نے دیوان صاحب کا لحاظ کیا، ورنہ اسی وقت اسے حراست میں ڈال دیتے۔ وہ اب کوئی بچہ نہیں ہے۔ خاصا جوان ہے۔ سب کچھ دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ سوچو حاکموں سے بیر کریں تو کے دِن ہمارا نباہ ہو۔ اس کا کیا بگڑتا ہے، کہیں سو پچاس کی نوکری پا ہی جائے گا۔ یہاں تو ریاست تباہ ہو جائے گی۔''

سجاتا نے آنچل پھیلا کر کہا۔ ''مہارانی بجا فرماتی ہیں، مگر اب تو اس کی خطا معاف کیجیے۔ بے چارہ شرم اور خوف سے گھر نہیں گیا۔ نہ جانے کدھر نکل گیا۔ ہماری زندگی کا یہی ایک سہارا ہے۔ مہارانی! ہم دونوں رو رو کر مر جائیں گے۔ آنچل پھیلا کر آپ سے بھیک مانگتی ہوں۔ اس کی خطا معاف کیجیے۔ ماں کے درد کو آپ سے زیادہ کون سمجھے گا۔ آپ ہی میرے رنج کا اندازہ کرسکتی ہیں۔ آپ مہاراج سے سفارش کر دیں تو...''

مہارانی نے بات کاٹ کر کہا۔ ''کیا کہتی ہو سجاتا دیوی، مہاراج سے اس کی سفارش کروں! آستین میں سانپ پالوں۔ تم کس منھ سے مجھ سے ایسی درخواست کرتی ہو۔ اور مہاراج مجھے کیا کہیں گے۔ میں تو ایسے لڑکے کا منھ نہ دیکھتی اور تم ایسے کپوت بیٹے کی سفارش لے کر آئی ہو۔''

''ایک بدنصیب ماں کیا مہارانی کے دربار سے مایوس ہو کر جائے گی''؟

یہ کہتے کہتے سجاتا کی آنکھیں آبگوں ہو گئیں۔ مہارانی کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ مگر وہ مہاراج کے مزاج سے واقف تھیں۔ اس وقت وہ کوئی سفارش نہ سنیں گے، اس لیے مہارانی کوئی وعدہ کر کے شرمندگی کی ذلت نہ اٹھانا چاہتی تھیں۔

''میں کچھ نہیں کر سکتی سجاتا دیوی۔''

''سفارش کا ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکال سکتیں؟''

''میں مجبور ہوں۔''

سجاتا آنکھوں میں غصہ کے آنسو لا کر بولی۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں مظلوموں کے لیے فریاد کی کوئی جگہ نہیں ہے۔''

مہارانی کو رحم دیر میں آتا تھا۔ غصہ ناک پر رہتا تھا۔ گرم ہو کر بولیں۔ ''اگر تم نے سوچا تھا کہ میں تمھارے آنسو پونچھوں گی تو تم نے غلطی کی تھی۔ جو قاتل ہماری جان لینے پر آمادہ ہو، اس کی سفارش لے کر آنا، اس کے سوا اور کیا کہنا ہے کہ تم اس جرم کو خفیف سمجھتی ہو۔ اگر تم نے اس کی اہمیت کا اندازہ کیا ہوتا تو ہرگز میرے پاس نہ آتیں۔ جس نے ریاست کا نمک کھایا وہ ریاست کے ایک بدخواہ سے ہمدردی کرے، یہ خود بہت بڑا جرم ہے۔''

سجاتا بھی گرم ہوئی۔ جذبہ مادری مصلحت پر غالب آگئی۔ بولی۔ ''راجہ کا کام محض اپنے حکام کو خوش کرنا نہیں ہے، رعایا پروری کی ذمہ داری بھی اس کے سر ہے۔ اور یہ اس کا مقدم فرض ہے۔''

اسی وقت مہاراج نے کمرہ میں قدم رکھا۔ رانی نے اٹھ کر ان کی تعظیم کی، اور سُجاتا گھونگھٹ نکال کر سر جھکائے دم بخود کھڑی رہ گئی۔ کہیں مہاراجہ صاحب نے تو اس کی بات نہیں سن لی۔

راجہ نے پوچھا۔ ''یہ کون عورت تمھیں راجوں کے فرائض کی تعلیم دے رہی تھی۔''

رانی نے کہا۔ ''یہ دیوان صاحب کی بیوی ہیں۔''

راجہ نے مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ ''جب ماں ایسی زبان دراز ہو تو لڑکا کیوں نہ گستاخ اور باغی ہو۔ دیوی جی میں تم سے یہ تعلیم نہیں لینا چاہتا کہ راجہ کے اپنی رعایا کے ساتھ کیا فرائض ہیں۔ مجھے یہ تعلیم کئی پشتوں سے ملتی چلی آئی ہے۔ بہتر ہو کہ تم کسی سے یہ تعلیم حاصل کر لو کہ آقا کی جانب اس کے نمک خواروں کے کیا فرائض ہیں۔ اور جو نمک حرام ہیں، ان کے سامنے اسے کیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔''

راجہ صاحب طیش کے عالم میں باہر چلے گئے۔ مسٹر مہتا جا ہی رہے تھے کہ راجہ

صاحب نے تند لہجہ میں پکارا۔ ''سنیے مسٹر مہتا۔ آپ کے صاحبزادے تو رخصت ہو گئے۔ لیکن مجھے ابھی معلوم ہوا کہ غداری کے میدان میں آپ کی دیوی جی ان سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ وہ محض ریکارڈ ہے، جس میں دیو.جی جی کی آواز بول رہی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جو شخص، ریاست کی ذمہ داریوں کا مرکز ہے۔ اس کے سایہ میں ریاست کے ایسے بدخواہوں کو پناہ ملے۔ آپ خود اس ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتے۔ یہ ہرگز میری بے انصافی نہ ہوگی۔ اگر میں خیال کروں کہ آپ کی چشم پوشی نے ہی یہ حالات پیدا کیے ہیں۔ میں یہ خیال کرنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ نے صریحاً نہیں تو کنایۃً ضرور ان خیالات کی تحریک کی ہے۔''

مسٹر مہتا اپنی ذمہ داری اور آقا پروری پر یہ جملہ برداشت نہ کر سکے۔ فوراً مردانہ تردید کی۔ ''یہ میں کس زبان سے کہوں کہ اس معاملہ میں حضور بے انصافی کر رہے ہیں، لیکن میں بے قصور ہوں۔ اور مجھے یہ دیکھ کر ملال ہوتا ہے کہ میری وفاداری پر یوں شبہ کیا جائے۔''

مہاراج نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ ''اس کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے دیوان صاحب!''

''کیا ابھی ثبوت کی ضرورت ہے؟ میرا خیال ہے میں ثبوت دے چکا۔''

''نہیں نئے انکشافات کے لیے نئے ثبوت کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ اپنی دیوی جی کو ہمیشہ کے لیے ریاست سے رخصت کر دیں۔ میں اس میں کسی طرح کا عذر نہیں سننا چاہتا۔''

''لیکن مہاراج......''

''میں ایک حرف نہیں سننا چاہتا۔''

''میں کچھ عرض نہیں کر سکتا''؟

''ایک لفظ بھی نہیں۔''

مسٹر مہتا یہاں سے چلے تو انھیں سجاتا پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ ان سب کے دماغ میں نہ جانے کیوں یہ خبط سما گیا ہے۔ جے کرشن تو خیر لڑکا ہے۔ آزمودہ کار اس بڑھیا کو کیا حماقت سوجھی۔ نہ جانے رانی سے کیا کیا کہہ آئی۔ میرے ہی گھر میں کسی کو مجھ سے

ہمدردی نہیں۔ سب اپنی اپنی دُھن میں مست ہیں۔ کس مصیبت سے میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں۔ یہ کوئی نہیں سوچتا۔ کتنی پریشانیوں اور ناکامیوں کے بعد ذرا اطمینان سے سانس لینے پایا تھا کہ ان سب نے یہ نئی مصیبت کھڑی کر دی۔ حق اور انصاف کا ٹھیکہ کیا ہم نے لے لیا ہے۔ یہاں بھی وہی ہو رہا ہے جو ساری دنیا میں۔ غریب اور کمزور ہونا مجرم ہے۔ اس کی سزا سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ باز کبوتر پر کبھی رحم نہیں کرتا۔ حق اور انصاف کی حمایت انسان کی شرافت کا ایک جزو ہے۔ بے شک اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن جس طرح اور سب لوگ صرف زبان سے اس کی حمایت کرتے ہیں۔ کیا اسی طرح ہم بھی نہیں کر سکتے۔ اور جن لوگوں کی حمایت کی جائے ان کی نگاہ میں کچھ اس حمایت کی قدر بھی تو ہو۔ آج راجہ صاحب انھیں مظلوم مزدوروں سے ذرا ہنس کر باتیں کرلیں تو یہ لوگ ساری شکایتیں بھول جائیں۔ اور ہماری ہی گردن کشی پر آمادہ ہو جائیں گے۔ سجاتا کی بھویں چڑھی ہوئی تھیں۔ ضرور اس نے مہارانی صاحبہ سے بدزبانی کی ہوگی۔ خوب اپنے دل کا غبار نکالا ہوگا۔ یہ نہ سمجھیں کہ دنیا میں کس طرح عزت اور آبرو کے ساتھ بیٹھا جائے، اس کے سوا ہمیں اور کیا چاہیے۔ اگر تقدیر میں نیک نامی لکھی ہوتی تو اس طرح دوسروں کی غلامی کیوں کرتا؟ لیکن سوال یہ ہے کہ سُجاتا کو بھیجوں کہاں؟ میکے میں کوئی نہیں ہے۔ میرے گھر میں کوئی نہیں۔ اونہہ۔ اب میں اس کی کہاں تک فکر کروں۔ جہاں جی چاہے جائے۔

وہ اس غم و غصہ کی حالت میں گھر میں داخل ہوئے۔ سجاتا ابھی ابھی آئی تھی کہ مہتا نے پہنچ کر دل شکن انداز سے کہا۔ ''آخر تمھیں بھی وہی حماقت سوجھی جو اس لونڈے کو سوجھی تھی۔ میں کہتا ہوں آخر تم لوگوں کو کبھی عقل آئے گی یا نہیں؟ کیا ساری دنیا کی اصلاح کا بیڑا ہم ہی نے اٹھایا ہے؟ کون راجہ ہے جو اپنی رعایا پر ظلم نہ کرتا ہو؟ ان کے حقوق نہ پامال کرتا ہو۔ راجہ ہی کیوں؟ ہم تم دوسروں کے حقوق پر دست درازی کر رہے ہیں۔ تمھیں کیا حق ہے کہ تو درجنوں خدمت گار رکھو اور انھیں ذرا ذرا سے قصور پر سزائیں دو۔ حق اور انصاف مہمل لفظ ہیں، جن کا مصرف اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ چند عقلمندوں کو شہادت کا درجہ ملے۔ اور بہت سے احمقوں کو ذلت و رسوائی کا۔ تم مجھے اپنے ساتھ دبائے دیتی ہو۔ حالانکہ میں تم سے بار بار کہہ چکا ہوں کہ میں اپنی زندگی میں

مہاراجہ سے پرخاش نہ کروں گا۔ حق کی حمایت کرکے دیکھ لیا۔ پشیمانی اور بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ میں صاف کہتا ہوں کہ میں تمھاری حماقتوں کا خمیازہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

سجاتا نے خودداری کی شان سے کہا۔ ''میں یہاں سے چلی جاؤں، یہی تو تمھاری منشا ہے؟ میں بڑی خوشی سے جانے کو تیار ہوں۔ میں ایسے ظالم کی عملداری میں پانی پینا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔''

''اس کے سوا مجھے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں پوشیدہ طور پر تمھارے اخراجات کے لیے روپے بھیجتا رہوں گا۔''

''نہیں۔ مجھے تمھارے روپیوں کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنے روپے جمع کرنا اور بینک کا اکاؤنٹ دیکھ دیکھ کر خوش ہونا۔ کون جانے کہیں راز فاش ہوجائے تو آقائے نامدار کا قہر تمھارے اوپر نازل ہوجائے۔ میرا لڑکا اور کچھ نہ کر سکے گا تو شام کی نمک روٹی لے ہی آئے گا۔ میں اسی میں خوش ہوں گی۔ میں بھی دیکھوں گی کہ تمھاری آقاپروری کب تک نبھتی ہے۔ اور تم کہاں تک اپنے ضمیر کا خون کرتے ہو۔''

مہتا نے ہاتھ مل کر کہا۔

''تم کیا چاہتی ہو کہ پھر اسی طرح چاروں طرف ٹھوکریں کھاتا پھروں؟''

سجاتا نے طنز کے ساتھ کہا۔ ''ہرگز نہیں۔ اب تک میرا خیال تھا کہ عہدے اور روپے سے عزیز تر بھی تمھارے پاس کوئی چیز ہے۔ جس کے لیے تم ٹھوکریں کھانا اچھا سمجھتے ہو۔ اب معلوم ہوا تمھیں عہدہ اور مروّت اپنے ضمیر سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ پھر کیوں ٹھوکریں کھاؤ۔ کبھی کبھی اپنی خیریت کا خط بھیجتے رہنا یا اس کے لیے بھی راجہ صاحب کی اجازت لینی پڑے گی؟''

مہتا نے آقاپروری کے جوش کے ساتھ کہا۔ ''راجہ صاحب اتنے ظالم نہیں ہیں کہ میرے جائز حق میں دست اندازی کریں۔''

''اچھا، راجہ صاحب میں اتنی انسانیت ہے، مجھے تو اعتبار نہیں آتا۔''

''تم نے کہاں جانے کا ارادہ کیا ہے؟''

''جہنم میں!''

(4)

جس وقت سجاتا گھر سے رخصت ہونے لگی تو میاں بیوی دونوں خوب روئے۔ اور ایک طرح سے سجاتا نے اپنی غلطی تسلیم کر لی کہ واقعی اس بیکاری کے زمانے میں مہتا کا یہی طرزِ عمل مناسب تھا۔ سچ مچ بے چارے کہاں کہاں مارے پھریں۔

اس طرح شوہر سے علیحدہ ہونے سے اسے روحانی صدمہ ہو رہا تھا۔ اور اگر مہتا نے جھوٹوں اصرار کیا ہوتا تو وہ گھر سے باہر پاؤں نہ نکالتی۔ مگر ادھر راجہ صاحب پل پل بھر بعد دریافت کر رہے تھے کہ دیوی جی گئیں یا نہیں؟ اور اب قدم پیچھے ہٹانے کے لیے کوئی بہانہ نہ تھا۔

پولٹیکل ایجنٹ صاحب تشریف لائے۔ خوب دعوتیں کھائیں۔ خوب شکار کھیلے۔ اور خوب سیریں کیں۔ مہاراجہ صاحب نے ان کی تعریف کی، انھوں نے مہاراجہ صاحب کی تعریف کی۔ اور ان کے انصاف اور رعایا پروری اور تنظیم کی خوب دل کھول کر داد دی۔ مسٹر مہتا کی کارگذاری نے بھی تحسین کا خراج وصول کیا۔ ایسا وفاشعار اور کارگذار افسر اس ریاست میں کبھی نہ آیا تھا۔ ایجنٹ صاحب نے ایک گھڑی انھیں انعام دی۔

اب راجہ صاحب کو کم سے کم تین سال کے لیے فراغت تھی۔ ایجنٹ ان سے خوش تھا۔ اب کس بات کا غم اور کس کا خوف۔ عیاشی کا دور دورہ انہماک کے ساتھ شروع ہوا۔ نت نئے حسینوں کی بہم رسانی کے لیے خفیہ خبررسانی کا ایک محکمہ قائم ہو گیا۔ اور اسے زنانہ تعلیم کا نام دیا گیا۔ نئی نئی چڑیاں آنے لگیں۔ کہیں تخویف کام کرتی تھی۔ کہیں تحریص، اور کہیں تالیف۔ لیکن ایسا موقعہ بھی آیا جب اس تثلیث کی ساری انفرادی اور اجتماعی کوششیں ناکام ہوئیں۔ اور خفیہ محکمہ نے فیصلہ کیا کہ اس نازنین کو اس کے گھر سے بہ جبر اٹھا لایا جائے۔ اور اس خدمت کے لیے مہتا صاحب کا انتخاب ہوا۔ جس سے زیادہ جاں نثار خادم ریاست میں دوسرا نہ تھا۔ ان کی جانب سے مہاراجہ صاحب کو کامل اطمینان تھا۔ کمتر درجہ کے اہلکار ممکن ہے، رشوت لے کر شکار چھوڑ دیں۔ یا افشاء راز کر بیٹھیں۔ یا امانت میں خیانت۔ مسٹر مہتا کی جانب سے کسی قسم کی بے عنوانی کا اندیشہ نہ تھا۔ رات کو نو بجے چوبدار نے ان کو اطلاع دی۔

''اَن داتا نے یاد کیا ہے۔''

مہتا صاحب جب ڈیوڑھی پر پہنچے تو راجہ صاحب باغیچے میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ مہتا کو دیکھتے ہی بولے۔

''آیئے مسٹر مہتا! آپ سے ایک اہم معاملہ میں مشورہ لینا ہے۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ آپ کا مجسمہ اسی باغ کے وسط میں نصب کیا جائے۔ جس سے آپ کی یادگار ہمیشہ قائم رہے۔ آپ کو تو غالباً اس میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

مہتا نے بڑے انکسار کے ساتھ کہا۔ ''یہ اَن دات کی غلام نوازی ہے۔ میں تو ایک ذرّۂ ناچیز ہوں۔''

''میں نے لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ اس کے لیے فنڈ جمع کریں۔ ایجنٹ صاحب نے اب کی جو خط لکھا ہے، اس میں آپ کو خاص طور سے لکھا ہے۔''

''یہ ان کی غریب پروری ہے۔ میں تو ادنیٰ خادم ہوں۔''

راجہ صاحب ایک لمحہ تک سگار پیتے رہے۔ تب اس انداز سے بولے گویا کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

''تحصیل خاص میں ایک موضع جگن پور ہے۔ آپ وہاں کبھی گئے ہیں؟''

مہتا نہ مستعدی سے جواب دیا۔ ''ہاں اَن داتا۔ ایک بار گیا ہوں۔ وہاں ایک متموّل ساہوکار ہے اسی کے دیوان خانہ میں ٹھہرا تھا۔ معقول آدمی ہے۔''

''ہاں ظاہر میں بہت اچھا آدمی ہے۔ مگر دل کا نہایت خبیث۔ آپ کو معلوم ہے مہارانی صاحبہ کی صحت بہت خراب ہوتی جاتی ہے۔ اور اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اپنی دوسری شادی کر لوں۔ راجاؤں کا یہ عام وطیرہ ہے کہ کسی نہ کسی حیلہ سے روز نئی نئی شادیاں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے اس ہَوس پروری سے ہمیشہ احتراز کیا ہے، اور اب تک بڑی تن دہی سے رانی صاحبہ کا علاج کرتا رہا۔ لیکن ان کی حالت روز بروز گرتی جاتی ہے۔ اور اب میں مجبور ہو گیا ہوں۔ ایک لڑکی بھی تجویز کر لی ہے، جو ہر اعتبار سے رانی بننے کے قابل ہے۔ وہ اسی ساہوکار کی لڑکی ہے۔ میں ایک بار ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے اسے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے دیکھا۔ مجھے معاً خیال آیا کہ اگر یہ حسینہ رنواس میں آجائے تو میری عمر دراز ہو جائے۔ میں نے خاندان کے

آدمیوں سے اس بارے میں صلاح کی اور اس ساہوکار کے پاس پیغام بھیج دیا۔ مگر اسے مفسدوں نے کچھ ایسی پٹی پڑھائی ہے کہ وہ کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔ کہتا ہے کہ لڑکی کی شادی ہو چکی ہے۔ مجھے جہاں تک معلوم ہوا ہے، اس کی بہانہ بازی ہے۔ لیکن بالفرض اس کی شادی بھی ہو چکی ہو تو راجہ ہونے کی حیثیت سے میرا حق فائق ہے۔ اور پھر میں ہر قسم کا تاوان بھی برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن وہ مفسد برابر انکار کیے جاتا ہے۔ مجھے اس لڑکی کا ہر وقت خیال رہتا ہے۔ مجھے ایسا اندیشہ ہو رہا ہے کہ اگر ناکام رہا تو شاید جان بَر نہ ہوسکوں۔ اندیشہ ہی نہیں، یہ اس قسم کا یقینی امر ہے۔ آپ کو بھی شاید اس قسم کا کبھی تجربہ ہوا ہو۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ خواب حرام ہے۔ ہمیشہ اسی کی یاد میں محو رہتا ہوں۔ اور ایسی حالت میں مجھے آپ کے سوا کوئی دوسرا آدمی نظر نہیں آتا۔ جو اس مسئلہ کو حل کر سکے۔ آپ جانتے ہیں محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ تھوڑے سے معتبر آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر جائیں، اور اس حسینہ کو راضی کرکے لائیں۔ خوشی سے آئے خوشی سے، جبر سے آئے جبر سے، اس کی پرواہ نہیں، میں ریاست کا مالک ہوں۔ اس میں جس چیز پر میری نظر ہو، اس پر کسی دوسرے شخص کا کوئی قانونی یا اخلاقی حق نہیں ہو سکتا۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ میری زندگی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اور آپ کی خوش تدبیری سے میری جان بچ گئی تو آپ ہمیشہ ریاست کے محسنوں میں شمار کیے جائے گے اور...''

مسٹر مہتا کے مدت سے منجمد خون میں یکا یک اُبال آیا۔ بولے۔ ''آپ کا منشا ہے میں اسے کِڈنیپ کر لاؤں؟''

راجہ صاحب نے ان کے تیور دیکھ کر تبسم کے ساتھ کہا۔ ''ہرگز نہیں میں تو آپ کو اپنا معتمد سفیر بنا کر بھیجتا ہوں۔ حصول مقصد کے لیے آپ کو ہر ممکن تدبیر سے کام لینے کا اختیار ہے۔''

مسٹر مہتا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''مجھ سے یہ کمینہ فعل نہیں ہوسکتا۔''

''کسی حسینہ سے شادی کی درخواست کمینہ فعل ہے؟''

''جبری اغوا بے شک کمینہ فعل ہے۔''

''آپ اپنے ہوش میں ہیں؟''

''خوب اچھی طرح۔''

''میں آپ کو خاک میں ملا سکتا ہوں۔''

''اگر آپ مجھے خاک میں ملا سکتے ہیں، تو میں بھی آپ کو خاک میں ملا سکتا ہوں۔''

''میری نیکیوں کا یہی صلہ ہے نمک حرام......''

''آپ اب احترام کی حد سے آگے بڑھے جاتے ہیں راجہ صاحب۔ میں نے اب تک ضمیر کا خون کیا ہے۔ اور آپ کے ہر ایک جا اور بے جا حکم کی تعمیل کی ہے، لیکن ضمیر فروشی کی بھی حد ہوتی ہے، جس کے آگے کوئی بھی ذی ہوش آدمی نہیں جا سکتا۔ آپ ایک فعل کا راجہ کے شایانِ شان نہیں اور اس میں جو شخص اعانت کرے وہ قابلِ گردن زدنی ہے۔ میں ایسے فعل پر لعنت بھیجتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ گھر آئے۔ اور راتوں رات سامانِ سفر درست کرکے ریاست سے نکل گئے۔ مگر اس سے قبل اس معاملہ کا کچّا چٹھا ایجنٹ کے نام بھیج دیا۔

(یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ 'ہنس' کے مئی 1934 کے شمارے میں شائع ہوا۔ 'مان سروور 2' میں شامل ہے۔ اردو میں یہ 'دودھ کی قیمت' میں شامل ہے۔)

پنڈت موٹے رام کی ڈائری

کیا نام کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈیری اور ڈیری فارم میں کیا سمبندھ؟ ڈیری تو کہتے ہیں اس چھوٹی سی سادی سجلد پوتھی کو، جس پر روز روز کا[1] ورتانت لکھا جاتا ہے اور جو پرایہہ سبھی مہاپرش لکھا کرتے ہیں اور ڈیری فارم اس استھان کو کہتے ہیں جہاں گائیں بھینسیں پالی جاتی ہیں اور ان کا دودھ مکھن، گھی تیار کیا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، ڈیری فارم اس لیے نام پڑا کہ جیسے ڈیری میں نتیہ پرت کا سماچار لکھا جاتا ہے، اس طرح وہاں نتیہ پرت دودھ مکھن بنتا ہے۔ جو کچھ ہو، میں نے اب ڈیری لکھنے کا نشچے کر لیا ہے۔ کئی سال پہلے ایک بار ایک پستک والے نے مجھے ایک ڈیری بھینٹ کی تھی۔ تب میں نے اس پر ایک مہینے تک اپنا حال لکھا، لیکن مجھے اس میں لکھنے کو کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ رات کو سونے کے پہلے گھنٹوں بیٹھا سوچتا۔ کیا لکھوں۔ لکھنے لائق کوئی بات بھی ہو؟ یہ لکھنا کہ پراتہہ کال اٹھا، منہ ہاتھ دھویا، اسنان کیا، تلک چندن لگایا، پوجن کیا، ججمانوں سے ملا، کہیں ساعت بانچنے گیا، پھر لوٹ کر بھوجن کیا اور سویا۔ تیسرے پہر پھر اٹھا، بھنگ چھانی، پھر اسنان کیا، پھر تلک لگایا اور کتھا بانچنے چلا گیا، لوٹ کر پھر بھوجن کیا اور سو رہا۔ یہ سب لکھنا مجھے اچھا نہ لگتا تھا۔ اس لیے اس ڈیری پر میں نے دھوبی کے کپڑوں اور آمدنی خرچ لکھ کر اسے پورا کیا۔ جب سے وہ ڈیری سماپت ہوئی تب سے خرچ آمدنی کا حساب لکھنا چھوڑ دیا اور دھوبی کے کپڑوں کا حساب پنڈتائن کے ذمہ ڈال دیا۔

لیکن اب سے پھر ڈیری لکھنا آرمبھ کر رہا ہوں، اس کا کیا کارن ہے؟ میں نے سنا ہے کہ اس سے آیو بڑھتی ہے، اور چاروں پدارتھ ہاتھ آجاتے ہیں۔ اس لیے جب میں پھر بھگوان کا نام لے کر، اور گنیش جی کے سامنے شیش جھکا کر ڈیری لکھنا آرمبھ کرتا ہوں۔ اوم شانتی : شانتی: شانتی:۔

---

1. روداد 2. اشتراکیت 3. اجتماعیت

کیا نام کہ آج کل سامیہ[2] واد اور سمشٹی[3] واد کی بڑی چرچا سن رہا ہوں۔ سامیہ واد کا ارتھ یہ ہے کہ سبھی منشیہ برابر ہوں۔ تو میں اپنے سامیہ وادی وِدّانوں سے جو اس وشے کے آچاریہ ہیں، جیسے شری سمپورنانند، آچاریہ نریندر دیو.جی اور آچاریہ شری پرکاش .جی سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ سب منشیہ کیسے برابر ہوسکتے ہیں؟ آچاریہ نریندر دیو.جی مجھے چھما کریں یا نہ کریں، مگر ان کے جیسے تین آچاریہ میرے پیٹ میں سما سکتے ہیں، پھر یہ کیسا سامیہ واد؟ اس کا مطلب تو یہی ہوسکتا ہے کہ یا میں وامن روپ دھارن کر لوں گا وہ وراٹ روپ دھارن کر لیں۔

اچھا اب دوسری بات لیجیے۔ دھن تو آپ سب کا برابر کر دینا چاہتے ہیں۔ لیکن کرپا کر کے یہ بتلائیے کہ آپ سب کے پیٹ کیسے برابر کر دیں گے؟ آچاریہ نریندر دیو.جی ایک دو پھلکے اور ایک آدھ گھونٹ دودھ پی کر رہ سکتے ہیں، مگر مجھے تو پوجا کرنے کے بعد مدھیانہ[4] تیسرے پہر اور رات کو چار بار ترمال چکا چک چاہیے۔ جس میں لڈو، حلوہ، ملائی بادام، قلاقند آدِ کا پرادھانیہ ہو۔ اگر آپ کا سامیہ واد اس کی گارنٹی کرے کہ وہ مجھے اِچھّا پورن بھوجن دے گا تو میں اس پر وچار کر سکتا ہوں اور اگر آپ چاہتے ہوں کہ میں بھی دو پھلکے اور تولے بھر دودھ اور دو تولے بھاجی کھا کر رہوں تو ایسے سامیہ واد کو میرا دور ہی سے پرنام ہے۔ میں دھن نہیں مانگتا لیکن بھوجن آنت پھاڑ چاہتا ہوں، اگر اس طرح کی گارنٹی دی گئی تو وچن دیتا ہوں کہ میں اور میرے انیک متر سامیہ وادی بننے کو تیار ہو جائیں گے۔

لیکن ایک بھوجن ہی سے تو کام نہیں چلتا۔ کپڑا ہی لے لیجیے۔ آپ کو ایک کرتا اور ٹوپی چاہیے۔ کرتے میں ایک گز سے ادھک کھدر نہ لگے گا۔ میں لمبی انگرکھی پہنتا ہوں، جس میں سات گز سے کم کپڑا نہیں لگتا۔ میں نے درزی کے سامنے بیٹھ کر خود کٹوایا ہے اور اس کا وشواس دلاتا ہوں کہ اس سے کم سے میری انگرکھی نہیں بن سکتی۔ پھر بارہ گز کا صافہ، پانچ گز کی چادر اوپر سے۔ سامیہ واد اس کی گارنٹی لے سکتا ہے؟ دھن لے کر مجھے کیا کرنا ہے، لیکن بھوجن اور وستر تو چاہئیں ہی۔

آپ کہیں گے، کام سب کے برابر کرنا پڑے گا۔ میں اسے سویکار کرتا ہوں، اگر

---

[1] روداد [2] اشتراکیت [3] اجتماعیت [4] دوپہر

کوئی سجن گھڑی بھر پوجا کریں، تو میں دو گھڑی کردوں گا، وہ گھڑی بھر اسنان کریں تو میں دو گھڑی پانی میں رہ سکتا ہوں، وہ ایک گھڑی شاشترارتھ[5] کریں تو میں بھوجن پوجن آدِ کو چھوڑ کر دن بھر شاشتر ارتھ کر سکتا ہوں۔ اس میں میں کسی سے پیچھے ہٹنے والا نہیں۔

ایک بات اور۔ استھان کی مجھے پرواہ نہیں، جھونپڑی بھی ہو تو میں اپنا نباہ کر سکتا ہوں۔ لیکن ریل یاترا کرتے سمے اگر مجھے سب کے برابر جگہ ملی تو پٹری پر بیٹھنے والوں کو چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا، کیوں کہ میں ایک پوری پٹری سے کم میں سما ہی نہیں سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں سناٹا مار کر نہیں سوسکتا۔ ندرا میں ایک وچتر پرکار کا خراٹا لیتا ہوں۔ کبھی کوئی سجن میرے سمیپ سوتے ہیں تو انھیں رات کو اٹھ کر بھاگنا پڑتا ہے۔ اس لیے اپنے ہت کے لیے نہیں، دوسروں کے ہت کے لیے میں یہ چاہوں گا کہ مجھے ایک پوری کوٹھری سونے کو ملے۔ اگر سامیہ واد اس میں مین میخ نکالے تو میں اس کی اور آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا۔

اتنا لکھ چکا تھا کہ پنڈتائن آکر کھڑی ہوگئیں اور پوچھنے لگیں۔ آج سویرے سویرے یہ کیا لکھنے بیٹھ گئے۔ سیٹھ جی کے لڑکے کی کنڈلی کیوں نہیں بنا ڈالتے؟ ویرتھ شاشترارتھ کر کے اپنا مونڈ کیوں دکھاتے ہو۔

میں استریوں کا اپمان نہیں کرتا۔ انھیں گھر کی دیوی سمجھتا ہوں۔ وے گھر کی لکشمی ہیں، لیکن گھر گرہستی کے سوا ان سے کسی اور بات میں صلاح نہیں لیتا۔ گھر کی لکشمی کو گھر تک ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ راج نِت، سماج، دھرم، آدِ کے وشے سے انھیں کیا مطلب۔ استریوں کو سر چڑھانے کی ان مٹھی بھر پڑھے لکھے بابوؤں کو جو سنک سوار ہوئی ہے، میں اسے پسند نہیں کرتا۔ پنڈتائن بھی ایک دن آدھی بانہہ کی جمپر پہنے ہوئے نکلیں جس سے آدھی چھاتی دکھائی دے رہی تھی، تو میں نے اسی دم وہ جمپر اتروا کر چھوڑا۔ وہ بہت بگڑیں لیکن میں نے بھی رودر روپ دکھایا۔ آخر کار جب میں ڈنڈا لینے دوڑا، تو انھوں نے دھیرے سے جمپر اتار دیا اور منہ پھلا بیٹھیں۔ میں نے کہا چاہے منہ پھلاؤ چاہے گال پھلاؤ چاہے ساری دیہہ پھلا کر کُپّا ہوجاؤں لیکن اس بھیس میں میں تمھیں گھر سے نکلنے نہ دوں گا۔ خیر، جب انھوں نے آکر مجھے ڈانٹ بتائی تو میں نے کہہ دیا تم یہ

---

[5] مذہبی مناظرہ

باتیں نہیں سمجھ سکتیں۔ جا کر اپنا کام دیکھو۔

پنڈتائن بولیں، تم نے چار اکشر پڑھ لیا تو بڑے سمجھدار ہوگئے؟ ابھی ایک جون چولہا نہ جلاؤں تو ساری سمجھداری نکل جائے۔

کتنا بے تکا جواب تھا۔ مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ لیکن مجھے آشچر یہ نہیں ہوا۔ ان سے میں ایسے جواب سننے کا ابھیست ہوگیا ہوں۔ میں نے ذرا اکڑائی کے ساتھ کہا۔ تمھارے مطلب کی کوئی بات نہیں ہے دیوی، نہیں تو میں تمھیں سنا دیتا۔

کوئی کویتائی کرتے ہوں گے۔ یہی تو تمھیں روگ ہے۔

کویتا کرنے کا روگ مجھے کب تھا؟ بے بات کی بات کرتی ہو۔ میں کویتائی سے اتنی دور ہوں، جتنا پورب پچھّم سے۔ یہ ویش بھوشا یہ ڈیل ڈول کویوں کا ہے؟ تم کیا جانو، کوی کسے کہتے ہیں؟ کوِی وہ ہے جس کی صورت سے کویتا برستی ہو۔ بس میں کویتائی نہیں کر رہا ہوں، ایک ساماجک پرشن پر کچھ شنکائیں اُپستھت کرنے کا سوبھاگیہ سندور پراپت کر رہا ہوں۔

پنڈت کے پانڈتیہ پورن[٦] کتھن سے وہ کچھ رعب میں آگئی۔ لیکن میں تھوڑا سا بدّھو بھی ہوں۔ اسی وقت مجھے ہنسی آگئی۔ بس، پنڈتائن لوٹ پڑیں اور میرے ہاتھ سے لیکھ چھین کر بولیں۔ میں سمجھ گئی کسی کو پریم پتر لکھ رہے ہو؟

اب نہیں تو اب بنی۔ میں گنگا جل لے کر شپتھ کھا سکتا ہوں کہ میں نے آج تک نہ جانا، پریم کس چڑیا کا نام ہے۔ میری پریمکا ترمال ہے۔ دوسرا پریم میری سمجھ میں ہی نہیں آتا، لیکن پنڈتائن کو نہ جانے کیوں مجھ پر سندیہہ ہوتا رہتا ہے۔ پریمیوں کی دشا دیکھ کر تو مجھے ان پر ہنسی آتی ہے۔ جب دیکھو، رو رہے ہیں۔ ٹھنڈی سانسیں کھینچ رہے ہیں۔ نہ کچھ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، خاصے لق لق بنے ہوئے ہیں، پھونک دو تو اڑ جائیں۔ اس طرح کا پریم کر کے تو میں تیسرے دن سنسار سے ودا ہوجاؤں۔ لیکن اس سندیہہ کا نوارن کرنا اب لازم ہوگیا؟

میں نے تھوڑے سے شبدوں میں پنڈتائن کو سامیہ واد کا تتو سمجھانے کی چیشٹا کی۔ جب میں اپنا کتھن سماپت کر چکا تو وہ آنکھیں مٹکا کر بولیں۔ اے نوج تمھارا سامیہ واد۔

---

٦ عالمانہ

کچھ گھاس تو نہیں کھا گئے ہو۔ جس کے بال ونش نہ ہوں، وہ سامیہ واد کی بات سوچیں۔ مجھے تو بھگوان نے پانچ پانچ پتر دیے ہیں اور چھٹھواں آنے والا ہے۔ میں سامیہ واد کے پھیر میں کیوں پڑوں؟ میرے برابر ہو پڑوسن، گوداروٹی کھائے۔ اچھا سامیہ واد ہے۔ میرے لال جیتے جی رہیں گے، تو مانگ کھائیں گے۔

وہ اور بھی نہ جانے کیا کیا اناپ شناپ بکتی رہیں۔ لیکن ان کی باتوں سے میرے من میں ایک شنکا اتپن ہوگئی۔ سامیہ واد میں کہیں سنتان نگرہ[7] کا بندھن تو نہیں؟ کیوں کہ اس طرح کا کوئی سمبندھ ہوا تو پھر میرا اس سے کوئی سمپرک نہ رہے گا۔ میں اس وشے میں کسی سے سمجھوتہ نہ کروں گا۔ پیچھے سے ٹھگا فضیحت کرنا مجھے پسند نہیں۔ آچاریہ مجھے اسپشٹ بتلا دیں کہ مجھے گرہستھاشرم کا تیاگ تو نہ کرنا پڑے گا؟ میں اس کی سوادھینتا[8] چاہتاہوں کہ جتنی سنتانیں آویں، ان کا سواگت کروں، کیوں کہ میں جانتا ہوں، جنم دینے والے بھگوان ہیں اور پالن کرنے والے بھی بھگوان ہیں۔ میں تو نمت[9] ماتر ہوں۔

(2)

کیا نام ہے کہ میں پنڈت موٹے رام ولد پنڈت چھوٹے رام سورگ واسی، ساکن وشوناتھ پوری جو شنکر بھگوان کے ترسول پر بسی ہے۔ آج بمبئی میں دندنا رہا ہوں۔ ایک ججمان سیٹھ جی نے تار بھیجا، ہم بڑے سنکٹ میں ہیں، ترنت آؤ۔ تار کے ساتھ ڈبل تیسرے درجے کا کرایہ بھی۔ اس لیے ہم نے چٹ پٹ بمبئی کو پرستھان کر دیا۔ اپنے ججمان پر سنکٹ پڑے، تو ہم کیسے رک سکتے ہیں۔ سیٹھ جی ایک بار کاشی آئے تھے۔ وہاں میں بھی نمنترن میں گیا تھا۔ وہیں میری ان کی جان پہچان ہوئی۔ بات کرنے میں میں پکا پھکیت ہوں۔ بس یہی سمجھ لو کہ کوئی مجھے نمنترن بھر دے دے، پھر میں اپنی باتوں سے گیان گھولتا ہوں، ویدوں شاشتروں کی ایسی ویاکھیا کرتا ہوں کہ کیا مجال کہ ججمان الو نہ ہوجائے۔ یوگاسن، ہست ریکھا، سنتان شاشتر، وشی کرن آدِ سبھی ودھائیں جن پر سیٹھ مہاجنوں کا پکا وشواس ہے میری جھوا پر ہیں۔ اگر پوچھو کہ کیوں پنڈت موٹے رام

---

[7] ضبط تولید [8] آزادی

شاستری آپ نے ان ودھاوؤں کو پڑھا بھی ہے؟ تو میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں میں نے کبھی نہیں پڑھا۔ ان ودھاوؤں کا کیا رونا، ہم نے کچھ نہیں پڑھا، پورے لنٹھ ہیں، نرکشر، مہان: لیکن پھر بھی کسی بڑے سے بڑے پستک چاٹو، شاستر گھونٹو، پنڈت کا سامنا کرا دو، چپیٹ نہ دوں تو موٹے رام نہیں۔ جی ہاں چپیٹ دوں، ایسا چپیٹوں ایسا رگیدوں کہ پنڈت جی کو بھاگنے کا راستہ نہ ملے۔ پاٹھک کہیں گے یہ اسمبھو ہے، بھلا ایک مورکھ آدمی مہان پنڈت کو کیسے رگیدے گا۔ میں کہتا ہوں پر یہ ورپستک چاٹنے سے کوئی ودوان نہیں ہوجاتا۔ جو ودوان آج اس یُگ میں شرادّھ پنڈ دان اور ورنام شرم میں وشواس رکھتا ہے ، جو آج گوبر اور گئو مُتر کو پوتر سمجھتا ہے جو دیو پوجا کو مکتی کا سادھن سمجھتا ہے، وہ ودوان کیسے ہوسکتا ہے؟ میں خود جمانوں سے یہ سب کرتیہ کراتا ہوں نِسّند یہہ جانتا ہوں، حلوہ اور قلاقند کسی آتما کے پیٹ میں نہیں، میرے پیٹ میں جاتا ہے، پھر بھی جمانوں کو مونڈتا ہوں تو اس لیے کہ میری یہ جیوکا ہے۔ جیوکا نہیں چھوڑی جاتی، اور اس لیے جمان خود بے وقوف بننا چاہتا ہے۔ پانچ پیسے کا گئودان کر کے بھوساگر پار اترنا چاہتا ہے تو مجھے کیا کتّے نے کاٹا ہے جو کہوں کہ یہ سب متھیہ ہے۔ سراسر متھیہ ہے۔ آتی ہوئی لکشمی کو کون دھتکارتا ہے؟ لیکن پنڈتوں کے بیچ میں دوسری بات ہوجاتی ہے۔ وہاں مجھے اپنی جیوکا کا ڈر نہیں رہتا اور میں بھگو بھگو کر لگاتا ہوں، کبھی داہنے، کبھی بائیں، چوندھیا دیتا ہوں، سانس نہیں لینے دیتا، بس پنڈتوں کے پاس اس کے سوا اور جواب نہیں رہتا کہ تم ناستک ہو۔

مگر میں اپنے وشے سے بہک کر کہاں جاپہنچا۔ جب میں بمبئی چلنے کو تیار ہوا، تو پنڈتائن رونے لگیں۔ کہنے لگیں، بتاؤ کے دن میں آؤ گے۔ دو تین دن میں ضرور لوٹ آنا۔ میں جو اس وقت بتادوں کہ دو دن پہنچنے میں لگ جائیں گے، تو پھر وہ میرا پنڈ نہ چھوڑتیں۔ اس لیے بڑے پریم بھرے شبدوں میں کہا۔ پر یہ میرا جی تم ہی میں لگا رہے گا۔ کھاؤں گا تو تمھارے کرکملوں کی گدگدی روٹیاں اور پتلی دال یاد آئے گی۔ پانی پیوں گا تو تمھارے پپر یائے ہوئے اڈھروں کا دھیان بنا رہے گا۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، بس تمھارے ہی پاس من منڈراتا رہے گا۔ اس سے انھیں کچھ ڈھارس ہوا۔ لیکن کیا نام کہ استری کا ہردے کچھ اٹپٹا ہوتاہے۔ یکایک بول اٹھیں۔ مجھے تمھارے اوپر وشواس نہیں

آتا۔ کون جانے تم وہاں کیسے ہوجاؤ؟ کہیں تم کچھ گڑبڑ نہ کر بیٹھو۔ میں نے تُرنت سمجھایا۔ پران پریہ مجھے تمھارے پریم میں پگے لگ بھگ 45 سال ہوئے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ اتنے دنوں میں جو رنگ جما ہے، وہ دو چار دن میں پھیکا پڑجائے گا؟ کہاں تمھارا خیال ہے۔ بولی۔ کیا جانے بھائی، تم مردوں کا حال کون جانے؟ یہاں تو ایسی میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہو، وہاں جا کر کیا جانے کیا کر بیٹھو؟ میں وہاں تھوڑی بیٹھی رہوں گی کہ تمھاری دیکھ بھال کرتی رہوں۔ میں تو ایک ہی شرط پر جانے دوں گی کہ تم گنگا جل ہاتھ میں لے کر کہو کہ وہاں کچھ گڑبڑ سڑبڑ نہ کروں گا۔ میں من میں ہنسا اور گنگا جل لے کر قسم کھائی۔ تب جا کے پنڈتائن کا چت شانت ہوا۔

چلنے کو تو چلا لیکن ہردے میرا بھی کانپتا تھا۔ پریاگ تک تو میرا من ٹھکانے رہا، لیکن جب پھر بھی بمبئی کا کہیں پتا نہ چلا تو مجھے رونا آگیا۔ بھگوان! یہ تو کالا پانی ہے۔ دن بھر چلا، بمبئی ندارد۔ رات بھر چلا، بمبئی ندارد، سمجھ گیا کہ کاشی میں مرنا نہ بدا تھا۔ مزے سے گنگا اسنان کرتا تھا۔ وشوناتھ کے درشنوں کا پُن لوٹتا تھا اور دھیلی بارہ آنے کہیں نہ کہیں سے پیٹ ہی لاتا تھا اور یہاں گاڑی میں بیٹھے نہ جانے کس لوک کو چلے جارہے ہیں۔ اتنی دور تو چندرما بھی نہ ہوں گے۔ مجھے بھرم ہوگیا کہ یاتری اور ریل کرمچاری سب مجھے دھوکا دے رہے ہیں۔ بمبئی ضرور پیچھے چھوٹ گئی۔ بارے کوئی دس بجے بمبئی کا نام سنا۔ جان آئی۔ دیکھا تو ججمان سیٹھ جی میرا سواگت کرنے کے لیے کھڑے تھے۔ انھوں نے پالاگن کیا مگر اسیس کون دیتا ہے، یہاں تو پُھولا بھسم ہورہا تھا۔ میں نے برہم تیج سے گرج کر کہا۔ تم نے مجھے لکھا کیوں نہیں کہ بمبئی لنکا کے پاس ہے؟ ابھی تک جل نہیں گرہنڑ کیا۔ پران چھٹپٹا کے نکلنے جا رہا تھا، بارے میں نے یوگ بل سے روک لیا۔ میں جھوٹ بول رہا تھا۔ میں راستے بھر پھلا ہاری کھاتا رہا اور ریل سے اتر کر پانی پیتا چلا آرہا تھا لیکن ایسے ججمانوں کے سامنے اپنے نیم کا ڈنکا بجا دینا پھل دایک ہوتا ہے۔ سیٹھ جی نے دوڑ کر میری ادھاری کندھے پر رکھی اور لگے گھگھیانے۔ مہاراج، چھما کیا جائے ، میں کیا جانتا تھا کہ مہاراج کو بمبئی......

میں نے پھر ڈانٹا۔ مہاراج کو بمبئی سے کیا سمبندھ؟ اپنے لوگ تیرتھ استھانوں میں رہتے ہیں کہ راکچھسوں کے دیس میں؟ یہاں وہ رہے، جو دھن کا لوبھی ہو۔ ہم برہمنوں

کو اپنا دھرم پیارا ہے۔

اس ڈانٹ سے سیٹھ جی کی نانی مر گئی۔ باہر آئے تو موٹر کھڑی تھی۔ بیٹھ کر ججمان کے گھر چلے۔ واہ رے بمبئی وہاں تو آدمی پاگل ہوجائے۔ سڑکیں نہ جانے کیوں اتنی چوڑی بنائی ہیں۔ ہماری چوکھمبے والی کتنی گلزار گلی ہے کہ واہ! یہاں کی سڑکیں ہیں کہ بالے میاں کا میدان ہے۔ مگر بمبئی کا حال پھر لکھیں گے۔ اس وقت تو سیٹھ جی کے سنکٹ کی کتھا کہنی ہے، جس کے لیے ہم اتنی دور سے بلائے گئے ہیں۔ سنکٹ یہ کہ سیٹھ جی نے سٹہ کھیلا ہے اور چاہتے ہیں: میں کوئی ایسا انشٹھان کروں کہ سیٹھ جی کے پو بارہ ہوجائیں۔ معاملہ گہرا ہے، کوئی ڈیڑھ لاکھ کا۔ میں نے یہ ورتانت[1] سن کر ایسا گمبھیر منہ بنایا، مانو سب کچھ میرے ہاتھ میں ہے۔ پھر بولا۔ سیٹھ جی، آپ جو ہیں میرے ججمان ہیں اور مجھے جو کچھ وِدّیا آتی ہے، اس میں کچھ اٹھا نہ رکھوں گا اور یہ آپ جانتے ہیں کہ مجھے کسی بات سے ممتا نہیں رہی۔ برہمن کو دھن سے کیا پریوجن،[2] دھن چاہتا تو اب تک لاکھوں بٹور لیتا۔ کتنے ججمان میرے انشٹھانوں سے کروڑ پتی ہوگئے۔ لکھپتیوں کی تو گنتی ہی نہیں۔ میں وہی برہمن کا برہمن بنا ہوں۔ تو بات کیا ہے؟ ہم ممتا کو پاس نہیں آنے دیتے۔ ساڑھے سات سو کوس سے للکارتے ہیں، خبردار جو ادھر منہ کیا، ہاں، بات اتنی ہے کہ انشٹھانوں میں پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ اگر یہی انشٹھان ودھی پروک کروں تو ڈیڑھ دو سو سے کم نہ خرچ ہوں گے۔ یہ سمجھ لیجیے۔

لیکن میں اس 65 سال کی اوستھا میں بھی پونگاہی رہا۔ میں نے ڈیڑھ دو سو اپنی سمجھ میں بہت کہے تھے۔ اس سے اونچے جانے کی مجھے ہمت ہی نہ پڑی۔ کبھی اتنا بڑا شکار تو پھنسا نہیں تھا۔ اس کے داؤں گھات کیا سمجھتا؟ سیٹھ جی کا منہ لٹک گیا۔ انھوں نے دس بارہ ہزار کا انومان کیا تھا۔ ڈیڑھ سو سن کر میری ساری پرتشٹھا ان کے ہردے پر سے نکل بھاگی۔ کیا سورن سنیوگ دیا تھا بھگوان وشوناتھ نے، لیکن تقدیر کھوٹی ہے تو ان کا کیا بس؟ دس ہزار کہہ دیتا تو جنم بھر کے لیے ایاچیہ[3] ہوجاتا۔ بولتے بولتے بولا کیا؟ ڈیڑھ دو سو! دھت تیرے پونگاپن کا ستیاناش ہو! اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ جا کر سمندر میں کود پڑوں۔ اسی دن ایک دوسرے گھونگھاناتھ شاستری کے نام تار گیا۔ اب یہ پٹھا آکر

---

[1] روداد [2] غرض [3] نامحتاجی

ان سیٹھ جی کو مونڈے گا۔ 20 ہزار سے کم نہ لے گا، لیکن اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ پھر بھی میں نے سوچا، بلا سے میں نہیں پا رہا ہوں۔ کوئی دوسرا کیوں لے جاوے؟ میرا کیا؟ یہ دھرم نہیں ہے کہ اپنے ججمان کی لٹیروں سے رکشا کروں؟ بولا، میں نے کیول سامگری کا مولیہ دیا۔ دَکشنا میں لیتا نہیں۔ ایک ہزار روپے وپروں[۴] کی دَکشِنا بھی سمجھ لیجیے۔

سیٹھ بولے: اس سے کوئی مطلب نہیں، وہ تو یہاں سے الگ دیا جائے گا۔ آپ کی سامگری تو کل -/200 کی ہوگی؟

میں نے کہا بس، اس سے ادھک نہیں۔ ہاں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں، جو اسی انشٹھان کے لیے 10 ہزار، 15 ہزار تک لے لیں گے۔ لگے گا تو ڈھائی تین سو، شیش اپنے پیٹ میں ٹھونس لیں گے۔ اس لیے ایسے دھورتوں سے سچیت رہیے گا۔

لیکن سیٹھ کے کنٹھ تلے یہ بات نہ دھنسی۔ بولا یہ آپ کیا کہتے ہو شاستری جی؟ گڑ جتنا ہی ڈالو اتنا ہی میٹھا پکوان ہوگا۔ آپ کا انشٹھان -/200 کا ہے۔ آپ کیجیے۔ لیکن بنا بڑے انشٹھان کے میرا کام نہ چلے گا۔

اب بھی مجھے اپنا اُلو پھانسنے کا موقعہ تھا۔ کہہ سکتا تھا سیٹھ جی، آپ کا کام تو چھوٹے انشٹھان سے ہی نکل سکتا ہے۔ لیکن آپ کی اِچھا ہے تو میں مہامہامہامر تنجے[۵] پاٹھ اور بَرہم پرویکشک[۶] کریا بھی کر سکتا ہوں۔ ہاں اس میں کوئی ساڑھے تیرہ ہزار کا خرچ ہے، مگر یہ تو اب سوجھ رہی ہے۔ اس وقت عقل پر پتھر پڑ گیا تھا۔ میری بھی وچتر کھوپڑی ہے۔ جب سوجھتی ہے اوسر نکل جانے پر، ہاں میں نے یہ نشچے کرلیا کہ پنڈت گھونگھا ناتھ کو بنا دس پانچ گھسّے دیے نہ چھوڑوں گا۔ یا تو بیٹا سے آدھا رکھا لوں گا، یا پھر یہیں بمبئی کے میدان میں ہماری ان کی ٹھنے گی۔ وہ وِدوان ہوں گے۔ یہاں ساری جوانی اکھاڑے میں کٹی ہے۔ بھرکُس نکال دوں گا۔

اپنی اس اُچھل سوجھتا پرچھتا رہا تھا کہ ڈاکیہ ایک تکونہ سا بیرنگ لفافہ لاکر مجھے دے گیا۔ سمجھ گیا پنڈتائن کی کرپا ہے۔ آج یہ پتر ہاتھ میں لے کر مجھے سچ مچ ان کی یاد آگئی۔ بے چاری نے میرے ساتھ 45 سال کاٹ دیے، اور میں برابر اسے باتوں میں

---

[۴] برہمنوں [۵] فاتح موت [۶] برہم (خدا) کا دیدار

ٹالتا رہا۔ آنکھیں سجل ہوگئیں۔ پتر کھولا لکھا تھا، سوستِ[7] شری سَرو اپمایوگ ...... سو تم جائے کے بمبئ میں بیٹھِ رہو، کان میں تیل ڈارِ کئے۔ ہم کا روز سپنا دکھات ہے۔ ڈَرنَ کے مارے نیند نہیں آوتِ ہے۔ کتوں تم کچھ گڑبڑی نہ کر بیٹھو یہی چنتا میں ہمارا پران سوکھا جات ہے۔ تم کہہ ہو ہم 65 سال کے ہوئے گین، اب کا جنم بھر گڑبڑے کرت رہبے، ملائینت ہے، بَیدن سب آئس آئس بروانکارین ہیں کہ اوہکا کھائیکے منئی بورائے جات ہے۔ ایک بَید جھانسی ماں ہے، ایک اور کتنوں ہے۔ تمھار ہاتھ جورت ہیں، تم کُوئو اوکھد نہ کھایو۔ تم گنگا جل اٹھائے کے جون پرن کی کیہو اُوہکا کا نباہ کرے کا پری۔ ہم تم کا سانڈ نہ بنے دیب۔

لیجیے صاحب، اب میں سانڈ ہوگیا۔ کمر سیدھی ہوتی نہیں، ڈیڑھ سیر ملائی بھی نہیں پچپائے پچتی، اور وہاں پنڈتائن مجھے سانڈ بنا رہی ہیں۔ سو یہاں بھی اپنی ہی بھول ہے۔ میں پنڈتائن کے سامنے اپنی جواں مردی اور پرشارتھ کی ڈینگ مارا کرتا ہوں۔ وہ گئو کیا جانے، یہ لباڑیا ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں، اسے برہم واکیہ سمجھ بیٹھتی ہیں، اور اس کا یہ پھل ہے۔ اس یاترا میں سمھوتبہ تہہ میری درشٹِ کچھ سوکشم[8] ہو رہی ہے۔

(3)

کیا نام کہ جب میں نے دیکھا کہ اب تو مجھ سے بھول ہو ہی گئی اور بہت کھینچ تان کرنے پر بھی دو سو سے بیشی نہ ملیں گے تو میں نے سوچا لاؤ اور کچھ نہ سہی تو اس کے سو پچاس روپے بھوجنوں میں ہی بگاڑ دو۔ یہ بھی کیا سمجھے گا کہ کسی سے پالا پڑا تھا۔ بس میں نے شنکر بھگوان کا سُمرن کیا اور ونتی کی ۔ ہے اُماپتی، اب تم ہی میری رکشا کرو، میں تو اب پرانوں سے ہاتھ دھوکر بھوجن پر جُٹتا ہوں۔ ناشتہ آیا تو میں نے کہہ دیا۔ مجھے آپ کے مہاراج کے ہاتھ کی بنی چیزوں میں کوئی سواد نہیں آتا، مجھے تو آپ سامگری دے دیجیے۔ میں اپنا بھوجن آپ پکالوں گا۔ بھنڈاری نے کہا جیسی آپ کی اِچھا، جو آگیا ہو وہ حاضر کروں۔ میں نے ناشتے کا نسخہ بتایا۔ سوا سیر تازہ مکھن، آدھ سیر بادام، آدھر سیر پستے، آدھا تولے کیسر، سیر بھر سوجی، اور سیر بھر شکر۔ بھنڈاری میرا منہ تاکنے لگا۔ میں

---

[7] دعائیہ کلمہ [8] کمزور

نے کہا منہ کیا تاکتے ہو، کیا باندھ کر لے جانے کو مانگتا ہوں۔ جاکر چٹ پٹ لاؤ۔ بس میں نے گھوٹی بھنگ اور چڑھایا گولا اور وشوناتھ کا نام لے کر حلوہ بنانے میں بیٹھ گیا۔ شنکر کی دیا سے ایسا سوادشٹ پدارتھ بنا کہ کیا کہوں۔ پلتھی مار کے جو بیٹھا تو آدھ گھنٹے میں صاف۔ مکھی کے لیے بھی نہ بچا۔ بھنڈاری کے ہوش اڑ گئے۔ دوپہر کو پھر میں نے پوریاں پکائیں۔ آدھو آدھ موین دے کر۔ رات کو کچھ کھانے کی اچھا نہ ہونے پر بھی میں نے سوا سیر ملائی چڑھا لی۔ لیکن اب وہ جوانی تو ہے نہیں کہ اینٹ پتھر جو پیٹ میں پہنچ جائے وہ سب بھسم، تیسرے ہی دن مجھے ادروکار[ا] کے لکشن دیکھے۔ میں نے سوچا یہاں کسی سے کہتا ہوں تو سب یہی کہیں گے کہ برہمن کی ذات کھانے کے پیچھے پران دے رہا ہے۔ اس لیے محلے ہی میں ایک ڈاکٹر کے پاس کوئی پاچک بٹی لینے چلا گیا۔ بڑا بھاری مکان، موٹر فون۔ میں نے اپنا پریچے دیا تو ڈاکٹر نے مجھے غور سے دیکھا اور بولے۔ کاشی سے آتا ہے؟

میں نے کہا ہاں صاحب وشوناتھ جی آپ کو پرسن رکھیں، یہاں کچھ بھوجن پرکرتی کے انوکول نہ ملنے کے کارن پاچن دوشت ہوگیا ہے۔ کوئی اوشدھ پردان کیجیے۔

ڈاکٹر مجھے ایک الگ کمرے میں لے گیا اور میز پر لٹا کر میرا پیٹ ٹٹولنے لگا۔ پھر سینے کی پریکشا کی، پیٹھ ٹھونکی، آنکھیں دیکھیں، جیبھ نکلوا کر پریکشا لی۔ اس طرح کوئی آدھ گھنٹے تک میری دلیل کرنے کے بعد بولا۔ ویل پنڈت جی، آپ کو کچھ ٹی بی کا آثار معلوم دیتا ہے۔ آپ کو اس کا دوائی کرنے ہوگا۔ ہم ٹی۔بی کا اسپیشلسٹ ہے۔ آپ کو اچھا کرنے سکتا ہے۔ پر آپ کو ابھی ایک دوسرا ڈاکٹر کے پاس اپنے خون کو ملاحظہ کرانا ہوگا۔ بنا خون دیکھے ہم کچھ نہیں کر سکتا۔ ہم آپ کو چٹھی دیتا ہے۔ آپ ڈاکٹر صوبے دار کے پاس جائیں، وہ چوپاٹی میں رہتا ہے۔ ہم چٹھی دیتے ہیں۔ آپ کے بلڈ کا ملاحظہ کرکے ہم کو لکھے گا۔

میرے ہوش فاختہ ہوگئے۔ پنڈتائن کی یاد آئی۔ بھگوان کیا بمبئی میں میری مٹی کی دُردشا کروگے۔ آیا تھا کہ کچھ کما کر جاؤں گا، سو یہاں جان پر بیتا چاہتی ہے۔ ابھی کاشی سے چلا ہوں تو کوئی بات نہ تھی۔ خاصہ ساٹھا پاٹھا بنا ہوا تھا کہ بمبئی کا پانی ہے، اور کچھ

[ا] پیٹ کی خرابی

نہیں۔ دوبے وجیانند نے کہا تھا۔ بمبئ کا پانی خراب ہے۔ ذرا سنبھل کر رہنا۔ لیکن یہ کیا جانتا تھا کہ دس پانچ دن میں ہی سل دھرے لیتا ہے۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوتا ہے۔ چلو، لہو بھی دکھا لو، اور پھر ڈرکس بات کا ہے۔ مر ہی تو جائیں گے۔ یہاں امر کون ہے۔ ذرا کچی گرہستی ہے، یہی چنتا ہے۔ اگر جانتا کہ انت اتنا نکٹ ہے تو پچھلے دو لڑکے کیوں ہوتے اور تیسرا گربھ کیوں رہتا۔ لیکن ہری کی اچھا۔ تلسی داس جی نے کہا بھی تو ہے۔

ست بنِتا دِجانِ سوارتھرت نہ کرو نیہہ سبھی تے

انت ہوں تو ہی تجیں گے پامر تو نہ تجے ابہی تے

(بیٹا بیٹی سے لگاؤ اور سبھی سے محبت مناسب نہیں۔ ارے بے وقوف آخرکار یہ لوگ تجھے چھوڑدیں گے تو تم ہی ابھی ان کو کیوں نہ چھوڑ دو)

میں یہاں سے چلا تو دل بہت چھوٹا ہو گیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے ترنت ٹوکا۔

ہمارا فیس 32 روپیے ہوا۔ سیٹھ جی کے پاس بل بھیج دے گا نا؟

اگر ابھی تک یمراج نہ آئے تھے، تو اب آگئے 32 روپیے فیس! جو عمر میں کبھی نہیں دی! بید، ڈاکٹر کو امیر لوگ پیسہ دیتے ہیں؟ ہم شنکر کے اپاسک تو کیول آشیرواد سے کام نکالتے ہیں۔ کاشی میں جب کبھی کام پڑتا تھا، ڈاکٹر چودھری، ڈاکٹر بنرجی، ڈاکٹر سیٹھ آدِ جس کے پاس چلا گیا دوائی لے آیا، اوپر سے روپیے آٹھ آنے بدائی جھٹک آیا اور یہاں ذرا سی پریکشا کی تو بتیس روپیے فیس۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ لیکن پھر سوچا اب تو مر ہی رہے ہو روپیے پیسے کے مایا موہ میں کیا پڑے ہو۔ بتیس روپیے خرچ ہوئے تو ہوئے، معلوم تو ہوگیا کہ تپ دق ہو گیا ہے۔ نہیں یوں ہی ایک دن چل دیتے ، کسی کو پتہ نہ چلتا۔ دوا دارو کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ بھلا دوا کرنے کا اوسر مل گیا اور آدمی کماتا ہی کس لیے ہے۔ لیکن یہ پوچھ لینا آوشیک معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صوبیدار کو تو کچھ نہ دینا پڑے گا۔ ات ایو میں نے اس وشے کا پرشن کیا۔

ڈاکٹر صاحب زور سے ہنسے۔ بولے تم کاشی کا وِدوان لوگ بڑا مجاک کرتا ہے۔ کاشی کے ایک پنڈت کو دَچھنا دینے سے سب پنڈت تو نہیں پرسن ہوجائے گا بولے؟

ہم نے کلیجہ تھام کر پوچھا۔ تو ان کی کیا فیس ہوگی؟

اس کا فیس کیول دس روپیے ہے۔

میں نے من سے کہا۔ چلو من یہ دس روپے بھی غم کھاؤ بمبئی میں جو کمانا ہے وہ سب دے کر بھی پران بچے تو سمجھنا چاہیے نیا جیون پایا۔ نہیں یہیں بیٹھے بیٹھے ٹیں ہو جائیں گے، کوئی رونے والا بھی نہ ملے گا۔ اس وقت ایسا ویراگیہ سوار ہوا کہ سب چھوڑ چھاڑ کر نکل بھاگوں، کبیر کا وہ پد یاد آیا جسے پڑھ کر میں کبھی کبھی ہنسا کرتا تھا۔ دھورتّ تائی میں جیون کٹ گیا۔ اب اس کایا کی کیا دُردسا ہوگی بھگوان۔

دیوانے من بھجن بنا دکھ پیہو
پہلا جنم بھوت کا پیہو، سات جنم پچھتے ہو
کیرا پر کے پانی پیہو، پیاسن کی مری جے ہو!
دوجا جنم سواکا پیہو، باگ بسیرا لیہو
ٹوٹے پنکھ باج منڈرانے، ادھپھڑ پران گنویہو!
باجی گر کے بانر ہوئی ہو، لکڑن ناچ نچیہو
اونچ نیچ کے ہاتھ پسری ہو، مانگے بھیک نہ پیہو!
تیلن کے گھر بیلا ہوئی ہو، آکھن ڈھانپ ڈھپیہو
کوس پچاس گھرے ماں چلہو، باہر ہون نہ پیہو
پانچواں جنم اونٹ کا پیہو بن تولے بو لدیہو
بیٹھے تو اٹھن نہ پیہو، گھرچ گھرچ مرجیہو!
دھوبی گھاٹ کے گدہا ہوئی ہو، کٹی گھاس نہ پیہو!
لادی لادِ آپو چڑھ بیٹھے، لے کے گھاٹ پہونچیہو!

آخر کار یہی کہنا پڑا کہ ہاں سیٹھ جی کے پاس بل بھیج دینا۔ پھر وہاں کا پتہ پوچھتا ہوا ڈاکٹر صوبیدار کے پاس پہنچا۔ کوئی دس بج گئے تھے، پیٹ میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا تھا۔ لیکن سوچا اس جھمیلے سے نبٹ لو، پھر وشوناتھ جی کی جیسی اچھا ہوگی وہ تو ہوگا ہی۔

ڈاکٹر صوبیدار یووک سے لگتے ، کوٹ پینٹ سے لیس۔ میں نے پتر جو دیا، آپ نے لے جا کر بھیتر کے کمرے میں لِٹا دیا اور ایسے زور سے میری بانہہ میں سوئی چبھودیا کہ میں اینٹھ کر رہ گیا۔ بانہہ میں سے رکت نکل پڑا، اس نے ایک شیشے کی نلکی میں لے لیا اور میری بانہہ میں کچھ پوت کر ایک تیسری کوٹھری میں جاکر نہ جانے کیا کرتا رہا۔ پھر

آ کر بولا۔ ویل پنڈت جی، آپ کے بلڈ میں ٹی۔بی کا جرم دکھائی دیتا ہے۔ آپ کو کسی پہاڑ پر جانا ہوگا اور وہاں آرام سے رہنا ہوگا۔ آپ کو پڑھنا لکھنا بند کرنا ہوگا، لیکن ابھی ہم کچھ ٹھیک نہیں کہہ سکتا، آپ ڈاکٹر گھوڑے پرکر کے پاس جائیے، وہ آپ کا یورین دیکھے گا، اس کا رپورٹ لے کر تب ہم اپنا رپورٹ دے گا۔ تب آپ ڈاکٹ لمپٹ کے پاس جائے گا پھر وہ جو کچھ کہے گا، وہ آپ کو کرنا ہوگا۔

میرے بدن میں آگ لگ گئی۔ جی میں تو آیا، ماروں گولی ان ڈاکٹروں کو اور چل کر دو پیسے کی ہڑ منگوا کر اس کی پھنکی پھانک لوں، مرنا ہی بدا ہے تو ساری دنیا کے ڈاکٹر بھی تو نہیں جلا سکتے، لیکن جان کا لوبھ بڑا بلوان ہوتاہے۔ ان کی چٹھی لے کر پتہ پوچھتا ہوا چلا، ڈاکٹر گھوڑے پرکر کے پاس۔ اس نے مجھ سے ایک چونگے میں لگھو شنکا کروائی اور بڑی دیر تک نہ جانے کیا کرتا رہا۔ پھر مجھے رپورٹ لکھ کر دی اورکہا ڈاکٹر صوبیدار کے پاس جائیے۔ صوبیدار کے پاس پھر پہنچا تو تین بج گئے تھے۔ آپ نے اپنی رپورٹ دی تو آیا ڈاکٹر لمپٹ کے پاس۔ ڈاکٹر لمپٹ نے دونوں رپورٹوں کو بڑے دھیان سے دیکھا اور بولے۔ میرا انومان ٹھیک تھا پنڈت جی آپ کو ٹی۔بی ہوگیا ہے۔

میں نے سجل نیتر ہو کر پوچھا۔ تو میں مر جاؤں گا۔

'نہیں نہیں' ہم آپ کو مرنے نہیں دے گا۔ آپ کو پہاڑ پر رہنا ہوگا۔ اچھا بھوجن کرنے سے آپ بچ سکتا ہے۔ آپ کو انڈوں کا سیون کرنا ہوگا۔

میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ کیا کہا، انڈوں کا ؟ میں انڈے ہاتھ سے نہیں چھو سکتا۔ کھانے کی کون کہے!

اوہ! یہ سب آرتھوڈاکسی یہاں نہیں چلے گا۔ تم کو انڈے کھانا ہوگا۔

انڈے میں کسی طرح نہیں کھا سکتا'

'تم مر جاؤ گے'

'کوئی چنتا نہیں'

'ہم دوائی دیتا ہے، اسے تو پی سکتا ہے۔'

'نا! اب نہ کوئی دوا کھاؤں گا نہ کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔

یہ کہہ کر میں سیٹھ جی کی کوٹھی پر لوٹ آیا۔ دن بھر جو کچھ بھوجن نہ کیا تھا تو بھوک چم چما اٹھی تھی۔ بوٹی چھانی، شوچ گیا اور پھر خوب ڈٹ کر بھوجن کیا۔

سہسا سیٹھ جی گھبرائے ہوئے آئے اور بولے۔ پنڈت جی، کیا آپ کا ملاحظہ کیا تھا لمپٹ صاحب نے؟ آپ کو تو ٹی۔بی بتاتے ہیں۔

میں نے کہا۔ وہ آپ کے گھر آنے کا پرسکار ہے اور کیا؟

آپ آج ہی کاشی چلے جایئے۔

میں بنا انوشٹھان پورا کیے نہیں جا سکتا۔

نہیں نہیں کوئی درکار نہیں، آپ اسی نو بجے کی گاڑی سے چلے جائیں۔

میں نے اس کی گھبراہٹ دیکھی تو سمجھ گیا، وہ برہم ہتیا سے ڈر رہا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ میری لہہ گئی۔

میں نے کہا۔ بنا انوشٹھان پورا کیے لوٹ جانے میں پرانوں کا بھے ہے۔ اس کا اُپچار کرنے میں کم سے کم ایک ہزار کا خرچ ہے۔ میں وہ کہاں سے لاؤں گا۔ پھر مرنے کا کیا ڈرنا۔ یہیں مر جاؤں گا تو کیا چنتا۔

سیٹھ جی کانپتے ہوئے بولے۔نہیں پنڈت جی آپ کا جو کچھ خرچ پڑے، وہ لیجیے اور آج ہی چل دیجیے۔ بس منیم جی بلائے گئے اور پھر سو سو کے دس نوٹ میرے چرنوں پر رکھ دیے۔ میں نے وشوناتھ جی کو دھنیہ واد دیا، نوٹ گانٹھ میں کیے اور ٹی۔بی کو ایسا بھولا کہ وہ بھی مجھے بھول گیا۔

(4)

کیا نام کہ میں جہاں جاتا ہوں، وہیں کچھ نہ کچھ لوگ میرے پیچھے پڑجاتے ہیں، اور آ آ کر مجھے دق کرتے ہیں۔ بمبئی میں بھی بھلے آدمیوں سے گلا نہ چھوٹا۔ یہ تو ہوتا نہیں کہ آکر ایک مہر میرے چرنوں پر رکھیں اور اپنی کتھا سنائیں۔ بس آکر لگتے ہیں اپنی کتھا سنانے اور چاہتے ہیں کہ میں سینت مینت میں انھیں انشٹھان بتادوں۔ تو یہاں ایسے اُلو نہیں ہیں۔ سننے کو سن لیتے ہیں، لیکن انوشٹھمان بتانے کے لیے پچاسوں بار دوڑاتے ہیں، ایسا پداتے ہیں کہ وہ بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ جب کوئی ڈاکٹر سینت مینت میں کسی

روگی کو نہیں دیکھتا کوئی وکیل سینت میں کوئی مِسل نہیں چھوتا تو میں کیوں سینت میں اپنی وِدّیا لٹاتا پھروں؟ وہ وِدّیا کیا ہے یہ میں جانتا ہوں، اُسی طرح وکیل اور ڈاکٹر اپنی وِدّیا کو جانتے ہیں، لیکن بھائی ایک دوسرے کا پردہ کیوں کھولو۔ سنسار اس کا ہے جو اسے بے وقوف بنائے، جسے یہ کلا نہیں آتی، وہ کوڑی کا تین ہے۔

کل بھنگ بوٹی سے نپٹ کر ملائی پر ہاتھ صاف کر رہا تھا کہ ایک سجّن آکر بیٹھ گئے ، کوٹ پینٹ، کالر، بوٹ، ہیٹ خاصے صاحب بہادر تھے۔ چہرہ لٹکا ہوا مانو پتنی مرگئی ہو، بولے۔ آپ کا نام پنڈت موٹے رام شاشتری ہے؟

میں نے کہا۔ ہاں میرا ہی نام ہے۔ کہیے آپ کی کیا سیوا کروں؟

صاحب بہادر نے جیب سے رومال نکالا اور سر کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ میں بڑے سنکٹ میں پڑ گیا ہوں مہاشے! کچھ عقل کام نہیں کرتی۔ اب آپ ہی بیڑا پار لگایئے تو لگے۔

میرے ہردے میں گدگدی ہوئی۔ یہ تو کوئی شکار معلوم ہوتا ہے۔ بولا۔ بھگوان کی دیا سے ساری بادھائیں دور ہو جائیں گی، کچھ چنتا مت کیجیے۔

کیا کہوں مہودے، کہتے سنکوچ ہو رہا ہے۔

سنکوچ کی کوئی بات نہیں، سنتان تو میری مٹھی میں ہے۔ کہیے تو بالکوں سے آپ کا گھر بھردوں۔ بس ایک انشٹھان ......

جی نہیں بالکوں سے تو مجھے پریم نہیں۔ میں سنتان ورودھی ہوں۔

اچھا تو کیا دھن کی اچھا ہے؟

دھن کی اچھا کسے نہ ہوگی۔ لیکن اس وقت میں اس ہیئت سے آپ کی سیوا میں نہیں آیا تھا۔

تو کہونا؟ پوشٹک انشٹھان کی بھی میرے پاس کمی نہیں۔ چورن اولیہہ ، گولی، بھسم، آسو، کواتھ، کسی چیز کے سیون کرنے کی آوشیکتا نہیں، بس پانچ بار اس منتر کا جپ کر کے سو جایئے پھر اس کی کرامات دیکھیے۔

میں اس سے ایک دوسرے ہی کام سے سیوا میں آیا تھا۔

مجھے کچھ نراشا ہونے لگی۔ ہتھے پر چڑھنے والا نہیں جان پڑتا۔ پھر بھی میں نے

دلاسہ دیا۔ جو اچھا ہو وہ نسنکوچ کہو۔

اس نے پوچھا۔ آپ اس میں اپنا اپمان تو نہ سمجھیں گے۔؟

اب میرے کان کھڑے ہوئے اُتسکتا اور بڑھی۔

اپمان کی بات ہوگی، تو اوشیہ اپمان سمجھوں گا۔

بات یہ ہے کہ کل سندھیا سمے میرے ماتا پتا دیش سے آگئے ہیں۔

بہت اچھی بات ہے تمھیں ان کا آدرستکار کرنا چاہیے۔

لیکن کروں کیسے یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کل سے انھوں نے بھوجن نہیں کیا۔

بھوجن نہیں کیا! یہ تو بڑا انرتھ ہے۔ کچھ اُدر وِکار[1] ہوگیا ہے؟ میں آیوروید بھی جانتا ہوں۔

نہیں نہیں شاستری جی، وہ تو آپ سے بھی بھاری ڈیل ڈول کے ہیں۔

بھاری ڈیل ڈول کے لوگ کیا بیمار نہیں پڑتے؟

پڑتے ہوں گے، پر فادر کبھی بیمار نہیں پڑتے اور مدر کے سر میں تو کبھی درد بھی نہیں ہوا۔

تو وہ اور آپ دونوں بھاگیوان ہیں۔

سمسّیا یہ ہے کہ وے دونوں ہی بڑے نیم سے رہتے ہیں۔

بڑے ہرش کی بات ہے۔ آپ واستو میں بھاگیہ شالی ہیں۔

لیکن وہ میرے خانساماں کے ہاتھ کا بھوجن تو نہیں کرسکتے۔

تو ایک دو دن تمھاری استری ہی بھوجن پکا لے گی تو کیا چھوٹی ہو جائے گی؟ ساس سسر کی سیوا کرنا ہی استری کا پرم دھرم ہے۔

میں اسے نہیں سویکار کرتا، مہودے۔ برا نہ مانیے گا۔ آپ سو برس کی پرانی بات کہہ رہے ہیں۔ ساس سسر کو ایسی ذرا ذرا سی باتوں کے لیے پُتر اور پُتر ودھو کو سنکٹ میں نہ ڈالنا چاہیے۔ سمے بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ اب ایسے ماتا پتا کے لیے استھان نہیں رہا۔

یہ آپ بہت ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن جب ماتا پتا دو ہی چار دن کے لیے آئے ہیں تو استری کو تھوڑا سا کشٹ بھی ہو تو سہہ لینا چاہیے۔ اس پر سجّن نے کچھ بھنویں سکوڑ

---

[1] پیٹ کی خرابی

کر کہا۔ لیکن بھوجن پکانے کا انھیں بالکل ابھیاس نہیں ہے۔ شریمان جب کبھی خانساماں بیٹھ رہتا ہے تو ہم لوگ ہوٹل میں کھا لیتے ہیں۔ ایک بار گھر میں روپیے نہ تھے، اور ہوٹل میں نقد دام دینا پڑتا ہے۔ اس لیے استری نے سوچا کچھ پکالیں تو صاحب آٹا ایسا ہوگیا جیسے گاڑھا دودھ اور چاول جل کر کوئلہ ہو گیا۔ اس پر تین دن شریمتی جی کے سر میں درد ہوتا رہا، ہار کر ہمیں فاقہ کرنا پڑا۔ تو صاحب پھر وہ وپتی نہیں مول لینا چاہتا۔ نہ جانے کیوں ہوٹل میں کھانا کھاتے ان لوگوں کی نانی مرتی ہے۔ میں اسے ان کی کوری ضد سمجھتا ہوں۔ ماں باپ ہیں کیا کہوں؟ کیا آپ اتنی کرپا نہ کریں گے کہ ایک دو دن جب تک وہ لوگ یہاں رہیں، ان کا بھوجن پکا دیں؟ آپ کو کشٹ تو ہوگا، لیکن آپ برہمن ہیں اور برہمن کو پروپکار کے لیے اپنے کشٹ کی پرواہ نہیں ہوتی۔

میرا خون کھول اٹھا۔ جی میں آیا اٹھا کے پٹک دوں، لیکن میں نے صبر کیا۔ کیا قدر کی ہے آپ نے برہمن کی اور مزہ یہ ہے کہ اس مورکھ کو مجھ سے ایسی بات کہتے سنکوچ بھی نہ ہوا۔ مجھے چپ دیکھ کر اس نے کہا۔ کیا برا مان گئے؟

میں نے کہا۔ نہیں برا کیا مانوں گا، لیکن آپ نے اس کام کے لیے کسی پانی پانڈے کو پکڑا ہوتا، مجھے آپ شاید نہیں جانتے۔

اس نے کہا۔ میں آپ کو خوب جانتا ہوں۔ آپ کاشی کے شاستری ہیں۔ جب میں ہوسٹل میں تھا تو ایک کاشی کے شاستری میرے سہہ پاٹھی تھے۔ وہ برابر اپنا بھوجن آپ پکایا کرتے تھے اور جب کبھی ہمارے میس کا رسوئیہ دار بیمار پڑجاتا تھا یا بھاگ جاتا تو وہ میرا بھوجن پکا دیتے تھے اور آگرہ کر کے کھلاتے تھے۔ اسی لیے میں نے آپ سے یہ پرارتھنا کی۔

میرے پاس اس کا کیا جواب تھا۔ پرکھوں نے جو کچھ کیا ہے، اس کا تاوان تو دینا ہی پڑے گا۔

میں نے کہا۔ آپ کی اِچھا ہے تو میں چل کر بھوجن بنادوں گا۔ لیکن ایک شرط ہے، اگر آپ اسے سویکار کریں۔

کہیے کہیے آپ جو کچھ کہیں گے وہ مجھے سویکار ہے۔ آپ نے آج میری لاج رکھ لی۔

میں رسوئی میں بیٹھ کر بتاتا جاؤں گا، کام شریمتی جی کو کرنا پڑے گا۔

لیکن ان کے سر میں درد ہوا تب؟

اس کی میرے پاس دوا ہے۔ سر میں چکر آجائے، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاجائے، میں بات کی بات میں اچھا کر سکتا ہوں۔

اور جو انھیں گرمی لگے؟

آپ کھڑے پنکھا جھلتے رہیے گا۔

اور انھوں نے کرودھ میں آکر آپ کو کچھ کہہ دیا؟

تو مجھے بھی کرودھ آجائے گا اور کرودھ میں میں لاٹ صاحب کو بھی کچھ نہیں سمجھتا۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس کے بعد انھیں پھر کبھی کرودھ نہ آئے گا۔

اور جو انھوں نے بحث شروع کر دی؟ ان کی دلیلوں کا آپ جواب دے سکتے ہیں؟

واہ! اور میں نے عمر بھر کیا کیا ہے۔ پہلے تو دلیل کا جواب دلیل سے دیتا ہوں۔ جب اس سے کام نہیں چلتا تو ہاتھ پاؤں سے بھی کام لے لیتا ہوں۔ کتنے ہی شاستر ارتھوں میں سمّلت ہوا ہوں اور کبھی پراست ہو کر نہیں آیا۔ بڑے بڑے مہامہو پادھیاؤں کو گُڑ ہلدی پلا کر چھوڑ دیا۔

سجّن نے ایک چھن تک وچار کیا اور پھر آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے تب سے اب تک صورت نہیں دکھائی۔

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں 'جاگرن' جولائی 1934 میں شائع ہوا۔ کفن میں شامل ہے اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔)

دُودھ کی قیمت

اب بڑے بڑے شہروں میں دائیاں اور نرسیں سبھی نظر آتی ہیں۔ لیکن دیہاتوں میں ابھی تک زچّہ خانہ روشِ قدیم کی طرح بھنگیوں کے ہی دائرہ اقتدار میں ہے۔ اور ایک عرصہ دراز تک اس میں اصلاح کی کوئی امید نہیں۔ بابو مہیش ناتھ اپنے گاؤں کے زمیندار ضرور تھے، تعلیم یافتہ بھی تھے، زچّہ خانہ کی اصلاح کی ضرورت کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ لیکن عملی مشکلات کو کیا کرتے۔ دیہات میں جانے کو کوئی نرس راضی بھی ہوئی تو ایسا معاوضہ طلب کیا کہ بابو صاحب کو سر جھکا کر چلے آنے کے سوا کوئی تدبیر نہ سوجھی۔ لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانے کی انھیں ہمّت ہی کیونکر ہوسکتی۔ ان کا حق الخدمت تو غالبًا بابو صاحب کی نصف ملکیت بیچ ہونے پر بھی نہ پورا ہوتا۔ آخر جب تین لڑکیوں کے بعد یہ چوتھا لڑکا پیدا ہوا تو پھر وہی گوڈر تھا اور وہی گوڈر کی بہو۔ بچے بیشتر رات ہی کو پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ آدھی رات کو بابو صاحب کے چپراسی نے گوڈر! کوڈر کی ہانک لگائی کہ چماروں کی ٹولی جاگ اٹھی۔

گوڈر کے گھر میں اس روز سعید کی مہینوں سے تیاری تھی۔ خدشہ تھا تو یہی کہ کہیں بیٹی نہ ہو جائے۔ نہیں تو پھر وہی بندھا ہوا ایک روپیہ اور وہی ایک ساڑی مل کر رہ جائے گی۔ اس مسئلہ پر میاں بیوی میں بار ہا تبادلۂ خیالات ہو چکا تھا۔ شرطیں لگ چکی تھیں۔ گودڑ کی بہو کہتی تھی کہ اگر اب کے بیٹا نہ ہو تو منہ نہ دکھاؤں۔ ہاں ہاں۔ منہ نہ دکھاؤں اور گودڑ کہتا تھا کہ دیکھو بیٹی ہو گی۔ اور بیچ کھیت بیٹی ہوگی۔ بیٹا پیدا ہوا تو مونچھیں منڈوا لوں گا۔ شاید گوڈر سمجھتا تھا کہ اسی طرح بھنگی میں مخالفانہ جوش پیدا کرکے وہ بیٹے کی آمد کے لیے راستہ تیار کر رہا ہے۔

بھنگی بولی۔ ''اب منڈالے مونچھیں ڈاڑھی جا۔ کہتی تھی بیٹا ہوگا، پر سُنے ہی نہیں۔ اپنی رَٹ لگائے۔ کھد تیری مونچھیں مونڈوں گی۔ کھونٹی تو رکھوں نہیں''۔

گوڈر نے کہا۔ ''اچھا مونڈ لینا بھلی مانُس، مونچھیں کیا پھر نکلیں ہی نہیں۔ تیسرے دن پھر دیکھے گی جوں کی توں ہیں۔ مگر جو کچھ ملے گا اس میں آدھا رکھ لوں گا۔ کہے دیتا ہوں''۔

بھنگی نے انگوٹھا دکھایا اور اپنے تین مہینے کے بچے کو گوڈر کے سپرد کر، سپاہی کے ساتھ چل دی۔

گوڈر نے پکارا۔ ''سُن تو۔ کہاں بھاگی جاتی ہے؟ مجھے بھی تو روشن چوکی بجانے جانا پڑے گا''۔

بھنگی نے دور ہی سے کہا۔ ''تو کون بڑی مشکل ہے۔ وہیں دھرتی پر لٹا دینا اور روشن چوکی بجانا۔ میں آکر دودھ پلا دیا کروں گی''۔

(2)

مہیش ناتھ کے ہاں اب کے بھنگی کی خوب خاطر کی گئی۔ صبح کو حریرہ ملتا۔ دوپہر کو پوریاں اور حلوا۔ تیسرے پہر کو پھر اور رات کو پھر۔ اور گوڈر کو بھی بھر پور پروسا ملتا تھا۔ بھنگی اپنے بچے کو دن بھر میں دوبار سے زیادہ دودھ نہ پلا سکتی۔ اس کے لیے اوپر کا دودھ مہیا کر دیا جاتا۔ بھنگی کا دودھ بابو صاحب کا بچہ پیتا تھا، اور یہ سلسلہ بارہویں دن بھی نہ بند ہوا۔ مالکن موٹی تازی عورت تھیں، مگر اب کی کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ لڑکیوں کو بدہضمی ہو جاتی تھی۔ اب کی ایک بوند نہیں۔ بھنگی جنائی بھی تھی اور دودھ پلائی بھی۔

مالکن نے کہا۔ ''بھنگی ہمارے بچّے کو پال دے۔ پھر جب تک جئے بیٹھی کھاتی رہنا پانچ بیگھے معافی دلوادوں گی۔ تیرے پوتے تک کھائیں گے''۔

اور بھنگی کا لاڈلا اوپر کا دودھ نہ ہضم کر سکنے کے باعث بار بار قے کرتا اور روز بروز لاغر ہوتا جاتا تھا۔ بھنگی کہتی۔ ''اور مونڈن میں چوڑے لوں گی بہو جی! کہے دیتی ہوں''۔

بہو جی۔ ''ہاں ہاں چوڑے لینا بھائی۔ دھمکاتی کیوں ہے؟ چاندی کے لے گی، یا سونے کے''؟

''واہ بہو جی واہ۔ چاندی کے چوڑے پہن کے کسے منہ دکھاؤں گی؟''

''اچھا سونے کے لینا بھئی! کہتی تو ہوں''۔

''اور بیاہ میں کنٹھالوں گی۔ اور چودھری (گوڈر) کے لیے ہاتھوں کے توڑے۔''

بہو.جی۔ ''وہ بھی لینا۔ وہ دن تو بھگوان دکھائیں۔''

گھر میں مالکن کے بعد بھنگی کی حکومت تھی۔ مہریاں، مہراجن، مزدورنیں، سب اس کا رُعب مانتی تھیں، یہاں تک کہ خود بہو.جی اس سے دب جاتی تھیں ایک بار تو اس نے مہیش ناتھ کو بھی ڈانٹا تھا۔ ہنس کر ٹال گئے۔ بات چلی تھی بھنگیوں کی۔ مہیش ناتھ نے کہا تھا۔ ''دُنیا میں اور چاہے جو کچھ ہو جائے بھنگی بھنگی رہیں گے۔ انھیں آدمی بنانا مشکل ہے''۔

اس پر بھنگی نے کہا تھا۔ ''مالک! بھنگی تو بڑے بڑوں کو آدمی بناتے ہیں۔ انھیں کیا کوئی آدمی بنائے گا؟''

یہ گستاخی کر کے کسی دوسرے موقعہ پر بھلا بھنگی سلامت رہتی۔ سر کے بال اُکھاڑ لیے جاتے لیکن آج بابو صاحب ہنسے۔ قہقہہ مار کر بولے:

''بھنگی بات بڑے پتے کی کہتی ہے''۔

(3)

بھنگی کی حکومت سال بھر تک قائم رہی۔ پھر چھن گئی۔ بچّے کا دودھ چھڑا دیا گیا۔ اب برہمنوں نے بھنگی کا دودھ پینے پر اعتراض کیا۔ موٹے رام شاستری تو پرائشچت کی تجویز کر بیٹھے۔ لیکن مہیش ناتھ احمق نہ تھے۔ پھٹکار بتائی۔ پرائشچت کی خوب کہی آپ نے شاستری جی۔ کل تک اسی بھنگن کا خون پی کر پلا۔ اب پرائشچت کرنا چاہیے۔ واہ!''

شاستری جی بولے۔ ''بے شک کل تک بھنگن کا خون پی کر پلا۔ گوشت کھا کر پلا۔ یہ بھی کہہ سکتے ہو لیکن کل کی بات کل تھی آج کی بات آج ہے۔ جگن ناتھ پور میں تو چھوت اچھوت سب ایک ساتھ کھاتے ہیں۔ مگر یہاں تو نہیں کھا سکتے۔ کھچڑی تک کھا لیتے ہیں بابو.جی اور کیا کہیں؟ پوری تک نہیں رہ جاتے۔ لیکن اچھے ہو جانے پر تو نہیں کھا سکتے''۔

''تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دھرم بدلتا رہتا ہے۔ کبھی کچھ کبھی کچھ''۔

''اور کیا! راجہ کا دھرم الگ پرجا کا دھرم الگ، امیر کا دھرم الگ غریب کا دھرم

الگ، راجے مہاراجے جو چاہیں کھائیں، جس کے ساتھ چاہیں کھائیں، جس کے ساتھ چاہیں شادی بیاہ کریں۔ ان کے لیے کوئی قید نہیں۔ راجہ ہیں۔ مگر ہمارے اور تمھارے لیے تو قدم قدم پر بندشیں ہیں۔ اس کا دھرم ہے"۔ پرائشچت تو نہ ہوا۔ لیکن بھنگی سے اس کی سلطنت چھینی گئی۔ برتن، کپڑے، اناج اتنی کثرت سے ملے کہ وہ اکیلی نہ لے جاسکی۔ اور سونے کے چوڑے بھی ملے اور ایک دو نئی اور خوبصورت ساڑھیاں، معمولی نین سکھ کی نہیں جیسی لڑکیوں کی بار ملی تھیں۔

(4)

اسی سال چیچک کا زور ہوا۔ گوڈر پہلے ہی زد میں آگیا۔ بھنگی اکیلی رہ گئی۔ مگر کام جوں کا توں چلتا رہا۔ بھنگی کے لیے گوڈر اتنا ضروری نہ تھا جتنا گوڈر کے لیے بھنگی۔ لوگ منتظر تھے کہ بھنگی اب گئی اب گئی۔ فلاں بھنگی سے بات چیت ہوئی۔ فلاں چودھری آئے۔ لیکن بھنگی کہیں نہ گئی۔ یہاں تک کہ پانچ سال گزر گئے۔ اور منگل دُبلا، کمزور اور دائم المریض رہنے پر بھی دوڑنے لگا۔ ماں کا دودھ نصیب ہی نہ ہوا۔ دائم المریض کیوں نہ ہوتا؟

ایک دن بھنگی مہیش ناتھ کے مکان کا پرنالہ صاف کر رہی تھی۔ مہینوں سے غلاظت جمع ہوگئی تھی۔ آنگن میں پانی بھرا رہنے لگا تھا۔ پرنالے میں ایک لمبا موٹا بانس ڈال کر زور سے ہلا رہی تھی۔ پورا داہنا ہاتھ پرنالے کے اندر تھا کہ یکا یک اس نے چلاّ کر ہاتھ باہر نکال لیا اور اسی وقت ایک لمبا سا کالا سانپ پرنالے سے نکل کر بھاگا۔ لوگوں نے دوڑ کر اسے تو مار ڈالا لیکن بھنگی کو نہ بچا سکے۔ خیال تھا کہ پانی کا سانپ ہے، زیادہ زہریلا نہ ہوگا۔ اس لیے پہلے کچھ غفلت کی گئی۔ جب زہر جسم میں پیوست ہوا اور لہریں آنے لگیں تب پتہ چلا کہ پانی کا سانپ نہیں کالا سانپ تھا۔

منگل اب یتیم تھا۔ دن بھر مہیش بابو کے دروازے پر منڈ لایا کرتا۔ گھر میں اتنا جھوٹا بچتا تھا کہ ایسے ایسے دس پانچ بچے سیر ہو سکتے تھے۔ منگل کو کوئی تکلیف نہ تھی۔ ہاں دور ہی سے اسے مٹی کے ایک سکورے میں کھانا ڈال دیا جاتا اور گاؤں کے لڑکے اس سے دور دور رہتے تھے۔ یہ بات اسے اچھی نہ لگتی تھی۔ سب لوگ اچھے اچھے برتنوں میں

کھاتے ہیں۔ اس کے لیے مٹی کے سکورے! یوں اسے اس تفریق کا مطلق احساس نہ ہوتا۔ لیکن لڑکے اسے چڑھا چڑھا کر اس ذلت کے احساس کو سان پر چڑھاتے رہتے تھے۔ مکان کے سامنے ایک نیم کا درخت تھا۔ اسی کے نیچے منگل کا ڈیرا تھا۔ ایک پھٹا پھٹا سا ٹاٹ کا ٹکڑا، دو سکورے اور ایک دھوتی جو مہیش بابو کے خوش نصیب فرزند سریش کے اتارے کپڑوں میں سے ایک تھی۔ جاڑا، گرمی، برسات، ہر موسم کے لیے وہ ایک سی آرام دِہ تھی۔ یہی اس کی خصوصیت تھی۔ اور سخت جان منگل جھلتی ہوئی لو اور کڑا کے کے جاڑوں اور موسلا دھار بارش میں بھی زندہ تھا۔ اور تندرست تھا۔ بس اس کا کوئی رفیق تھا تو گاؤں کا ایک کتا جو اپنے ہم چشموں کی بد مزاجیوں اور تنگ ظرفیوں سے عاجز آ کر منگل کے زیر سایہ آپڑا تھا۔ کھانا دونوں کا ایک تھا۔ کچھ طبیعت بھی یکساں تھی اور غلباً دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے واقف ہو گئے تھے۔

منگل نے اس کا نام رکھا تھا ٹامی۔ مگر ٹامی مہیش ناتھ کے انگیزی کتّے کا نام تھا۔ اس لیے اس نام کا استعمال وہ اسی وقت کرتا جب دونوں رات کو سونے لگتے۔

منگل کہتا۔ ''دیکھو ٹامی، ذرا اور کھسک کر سوؤ۔ آخر میں کہاں لیٹوں۔ سارا ٹاٹ تو تم نے گھیر لیا''۔ ٹامی کُوں کُوں کرتا اور دُم ہلاتا، بجائے اس کے کہ کھسک جائے اور اوپر چڑھ آتا اور منگل کا منہ چاٹنے لگتا۔ شام کو وہ ایک بار روز اپنا گھر دیکھنے اور تھوڑی دیر رونے جاتا۔ پہلے سال پھوس کا چھپّر گرا۔ دوسرے سال ایک دیوار گری اور اب صرف آدھی آدھی دیواریں کھڑی تھیں۔ جن کا اوپر کا حصّہ نوکدار ہو گیا تھا۔ یہیں اسے محبت کی دولت ملی تھی۔ وہی مزا، وہی یاد، وہی کشش اسے ایک بار ہر روز اس ویرانے میں کھینچ لے جاتی۔ اور ٹامی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ کھنڈر کی مخروطی دیوار پر بیٹھ جاتا اور زندگی کے آنے والے اور گذشتہ خواب دیکھنے لگتا۔ اور ٹامی دیوار پر کود جانے کی بار بار ناکام کوشش کرتا۔

(5)

ایک دن کئی لڑکے کھیل رہے تھے۔ منگل بھی پہنچ کر دور کھڑا ہو گیا۔ سریش کو اس پر رحم آیا یا کھیلنے والوں کی جوڑی پوری نہ پڑتی تھی۔ کچھ ہی ہو، اس نے تجویز کی، کہ

آج منگل کو بھی کھیل میں شریک کر لیا جائے۔ یہاں کون دیکھنے آتا ہے۔

سریش نے منگل سے پوچھا۔ ''کیوں رے کھیلے گا؟''

منگل بولا۔ ''کھلاؤ گے تو کیوں نہ کھیلوں گا۔''

سریش نے کہا۔ ''اچھا تو ہم تینوں سوار بنتے ہیں۔ تم ٹٹو بن جاؤ۔ پھر ہم لوگ تمھارے اوپر سوار ہو کر گھوڑا دوڑائیں گے''۔

منگل نے پوچھا۔ ''میں برابر گھوڑا ہی رہوں گا کہ سواری بھی کروں گا۔''

یہ مسئلہ ٹیڑھا تھا۔ سریش نے ایک لمحہ غور کرکے کہا۔ ''تجھے کون اپنی پیٹھ پر بٹھائے گا۔ سوچ آخر تو بھنگی ہے کہ نہیں؟''

منگل نے کسی قدر دلیر ہو کر کہا۔ ''میں کب کہتا ہوں کہ میں بھنگی نہیں ہوں۔ لیکن جب تک مجھے بھی سواری کرنے کو نہ ملے گی گھوڑا نہ بنوں گا۔ تم لوگ سوار بنو گے اور میں گھوڑا ہی بنا رہوں گا؟''

سریش نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ ''تجھے گھوڑا بننا پڑے گا''۔ اس نے منگل کو پکڑنا چاہا۔ منگل بھاگا۔ سُریش بھی دوڑا۔ منگل نے قدم اور تیز کیا۔ سریش نے بھی زور لگایا مگر بسیار خوری نے اسے تھل تھل بنا دیا تھا۔ اور دوڑ نے سے اس کا سانس پھولنے لگتا تھا۔ آخر سریش نے رُک کر کہا۔ ''آکر گھوڑا بنو منگل۔ ورنہ کبھی پاؤں گا تو بری طرح پیٹوں گا''۔

''تمھیں بھی گھوڑا بننا پڑے گا''۔

''اچھا ہم بھی بن جائیں گے''۔

''تم بعد میں بھاگ جاؤ گے۔ اس لیے پہلے تم بن جاؤ۔ میں سواری کرلوں۔ پھر میں بنوں گا''۔

سریش نے چکمہ دیا۔ منگل کے اس مطالبہ نے بر ہم کردیا۔ ساتھیوں سے بولا۔ ''دیکھو اس کی بدمعاشی! بھنگی ہے''۔ تینوں نے اب کی منگل کو گھیر لیا اور زبردستی گھوڑا بنا دیا۔ سریش اپنا وزنی جسم لے کر اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ اور ٹک ٹک کرکے بولا۔ ''چل گھوڑے چل''۔ مگر اس بوجھ کے نیچے غریب منگل کے لیے ہلنا بھی مشکل تھا۔ دوڑنا تو دور کی بات تھی۔ ایک لمحہ تو وہ ضبط کیے چوپایہ بنا کھڑا رہا۔ لیکن ایسا معلوم ہونے لگا کہ

ریڑھ کی ہڈّی ٹوٹی جاتی ہے۔ اس نے آہستہ سے پیٹھ سکوڑی اور سریش کی ران کے نیچے سے سرک گیا۔ سریش گد سے گر پڑے، اور بھوپنو بجانے لگے۔ ماں نے سُنا سریش کیوں رو رہا ہے؟ گاؤں میں کہیں سریش روئے اُن کے ذکی الحس کانوں میں ضرور آواز آجاتی تھی، اور اس کا رونا تھا بھی دوسرے لڑکوں سے بالکل نرالا جیسے چھوٹی لائن کے انجن کی آواز۔

ایک منٹ میں سریش آنکھیں ملتا ہوا گھر میں آیا۔ آپ کو جب کبھی رونے کا اتفاق ہوتا تھا تو گھر میں فریاد لے کر ضرور آتے تھے۔ ماں چُپ کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ دے دیتی تھی۔ آپ تھے تو آٹھ سال کے، مگر بہت بیوقوف، حد سے زیادہ پیارے۔ ماں نے پوچھا۔ ''کیوں رو رہا ہے سریش؟ کس نے مارا''؟ سریش نے روتے ہوئے کہا۔ منگل نے چھُوا دیا''۔

پہلے تو ماں کو یقین نہ آیا۔ لیکن جب سریش قسمیں کھانے لگا تو یقین لانا لازم ہوگیا۔ اُس نے منگل کو بُلوایا۔ اور ڈانٹ کر بولی۔ ''کیوں رے منگلوا۔ اب تجھے بدمعاشی سوجھنے لگی۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ سریش کو چھونا نہیں۔ یاد ہے کہ نہیں؟ بول''۔ منگل نے دبی آواز سے کہا ''یاد ہے''۔

''تو پھر تونے اسے کیوں چھوا؟...تونے نہیں چھوا تو یہ روتا کیوں تھا''؟

''یہ گر پڑے اس لیے رونے لگے''۔

''چوری اور سینہ زوری''۔ دیوی دانت پیس کر رہ گئیں۔ مارتیں تو اسی وقت اشنان کرنا پڑتا۔ قمچی تو ہاتھ میں لینا ہی پڑتی اور چھوت کی بَرقی رَو قمچی کے راستہ ان کے جسم میں سرایت کر جاتی۔ اس لیے جہاں تک گالیاں دے سکیں دیں اور حکم دیا کہ ''اسی وقت یہاں سے نکل جا۔ پھر جو تیری صورت نظر آئی تو خون ہی پی جاؤں گی۔ مفت کی روٹیاں کھا کھا کر شرارت سوجھتی ہے۔

منگل میں غیرت تو کیا ہوگی خوف تھا۔ چپکے سے اپنے سکورے اُٹھائے، ٹاٹ کا ٹکڑا بغل میں دبایا، دھوتی کندھے پر رکھی اور روتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ یہی تو ہوگا کہ بھوکوں مرجائے گا۔ کیا ہرج ہے، اس طرح جینے سے فائدہ ہی کیا؟ گاؤں میں اور کہاں جاتا۔ بھنگی کو کون پناہ دیتا۔ وہی اپنے بے در و دیوار

کی آڑ تھی، جہاں پچھلے دنوں کی یادیں اس کے آنسو پونچھ سکتی تھیں۔ وہیں جاکر پڑ رہا اور خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ ٹامی بھی اسے ڈھونڈتا ہوا آپہنچا۔

(6)

لیکن جوں جوں شام ہوتی گئی، اس کا احساس ذلت بھی غائب ہوتا گیا۔ بچپن کی بیتاب کرنے والی بھوک جسم کا خون پی پی کر اور بھی بے پناہ ہوتی جاتی تھی۔ آنکھیں بار بار سکوروں کی طرف اُٹھ جاتیں۔ اس نے مشورتاً ٹامی سے کہا۔ ''کھاؤ گے کیا؟ میں تو بھوکا ہی لیٹ رہوں گا۔ ٹامی نے کوں کوں کرکے شاید کہا۔ ''اس طرح کی ذلتیں تو ساری زندگی سہنی ہیں۔'' پھر ذرا دیر کے بعد دُم ہلاتا ہوا اس کے پاس جاپہنچا۔ ہماری زندگی اسی لیے ہے بھائی۔

منگل بولا۔ ''تم جاؤ جو کچھ مل جائے کھالو۔ میری پرواہ نہ کرو''۔ ٹامی نے پھر اپنی سکستانی بولی میں کہا۔ ''اکیلا نہیں جاتا۔ تمھیں ساتھ لے کر چلوں گا''۔ ایک لمحہ بعد بھوک نے تالیف کا ایک نیا پہلو اختیار کیا۔ ''مالکن تلاش کر رہی ہوں گی۔ کیوں ٹامی''۔ اور ''کیا بابو جی اور سریش کھا چکے ہوں گے؟ کہار نے ان کی تھالی کا جھوٹا نکال لیا ہوگا اور ہمیں پکار رہا ہوگا''— ''بابو جی اور سریش دونوں کی تھالیوں میں گھی اور وہ میٹھی میٹھی چیز۔ ہاں ملائی۔ ہماری آواز نہ سُنائی دے گی تو سب کا سب گھوڑا پر ڈال دیں گے۔ ذرا دیکھ لیں کہ ہمیں کوئی پوچھنے آتا ہے''۔ ''یہاں کون پوچھنے آئے گا۔ کوئی برہمن ہو''۔

''اچھا تو چلو وہیں چلیں مگر چھپے ہوئے رہیں گے۔ اگر کسی نے نہ پکارا تو میں لوٹ آؤں گا، یہ سمجھ لو''۔

دونوں وہاں سے نکلے اور آکر مہش ناتھ کے دروازے پر ایک کونے میں دبک کر کھڑے ہو گئے۔ ٹامی شاید اِدھر اُدھر کی خبر لانے چلا گیا۔ مہیش بابو تھالی پر بیٹھ گئے تھے۔ نوکر آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ ایک نے کہا: ''آج منگلوا نہیں دکھائی دیتا۔ بھوکا ہوگا بچارا۔ مالکن نے ڈانٹا تھا، اسی لیے بھاگا ہے شاید''۔ منگل کے جی میں آیا چل کر اس آدمی کے قدموں پر گر پڑے۔ دوسرے نے جواب دیا۔ ''اچھا ہوا نکالا گیا نہیں تو

سیرے سیرے بھنگی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا''۔ منگل اور اندھیرے میں کھسک گیا۔ اب کیا امید کی جاسکتی تھی۔ مہیش اور سریش تھالی سے اُٹھ گئے۔ نوکر ہاتھ منہ دھلا رہا ہے۔ اب بابو جی حقہ پئیں گے۔ سریش سوئے گا۔ غریب منگل کی کسے فکر ہے۔ اتنی دیر ہوگئی کسی نے نہیں پکارا۔ کون پکارے گا۔ منگل آدھ گھنٹے تک وہاں دبکا رہا۔ کسی نے اس کا نام نہ لیا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور جانا ہی چاہتا تھا کہ اس نے اسی کہار کو ایک تھال میں جوٹھا کھانا لے جاتے دیکھا۔ شاید گھورے پر ڈالنے جا رہا تھا۔ منگل اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آگیا۔ اب صبر نہ ہوسکتا تھا۔ کہار نے کہا۔ ''ارے تو یہاں تھا۔ ہم نے کہا کہیں چلا گیا لے کھا لے۔ میں پھینکنے لے جارہا تھا''۔ منگل نے کہا۔ ''میں تو بڑی دیر سے یہاں کھڑا تھا''۔ کہار نے کہا ''تو بولا کیوں نہیں''؟ منگل بولا۔ ''ڈر لگتا تھا''۔ منگل نے کہار کے ہاتھ سے تھال لے لیا اور اسے ایسی نظر سے دیکھا جس میں شکر اور احسان مندی کی ایک دنیا چھپی ہوئی تھی۔ پھر وہ دونوں نیم کے درخت کے نیچے حسب معمول کھانے لگے۔ منگل نے ایک ہاتھ سے ٹامی کا سر سہلا کر کہا۔ ''دیکھا پیٹ کی آگ ایسی ہوتی ہے۔ لات کی ماری ہوئی روٹیاں بھی نہ ملتیں تو کیا کرتے''۔ ٹامی نے دُم ہلائی۔ ''سریش کو اماں ہی نے پالا ہے ٹامی''۔ ٹامی نے پھر دُم ہلا دی۔ ''لوگ کہتے ہیں دودھ کا دام کوئی نہیں چکا سکتا''۔ ٹامی نے پھر دُم ہلا دی۔ ''اور مجھے دودھ کا یہ دام مل رہا ہے'' ٹامی نے پھر دُم ہلا دی۔

(یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ 'ہنس' کے جولائی 1934 کے شمارے میں شائع ہوا۔ 'مان سروور نمبر 2' میں شامل ہے۔ اردو میں اسی نام کے مجموعہ میں شامل ہے۔)

مُفت کرم داشتن

ان دنوں حسنِ اتفاق سے حاکم ضلع ایک صاحب ذوق بزرگ تھے جنھوں نے تاریخ اور قدیم سکہ جات میں اچھی تفتیش کی ہے۔ خدا جانے کیسے دفتری کاموں سے انھیں ان مشاغل کے لیے فرصت مل جاتی ہے۔ میں نے ان کے کارنامے پڑھے تھے اور ان کا غائبانہ مداح تھا لیکن ان کی افسری مزید تعلقات میں مانع تھی۔ مجھے یہ تکلف تھا کہ اگر میری جانب سے پیش قدمی ہوئی تو عام تجربے کے مطابق وہ میری حکام جوئی پر محمول کی جائے گی اور میں کسی حالت میں بھی یہ الزام اپنے سر پر نہیں لینا چاہتا تھا۔ میں تو حکام کو دعوتوں اور عام تقریبوں میں مدعو کرنے کا بھی مخالف ہوں اور جب کبھی سنتا ہوں کہ کسی افسر کو کسی رفاہ عام کے جلسے کا صدر بنایا گیا یا کوئی اسکول یا شفاخانہ یا بدھوا آشرم کسی گورنر کے نام سے منسوب ہوا تو برادرانِ وطن کی غلامانہ ذہنیت پر گھنٹوں افسوس کرتا ہوں۔ مگر جب ایک دن حاکم ضلع نے خود میرے نام ایک رقعہ بھیجا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرے بنگلے پر تشریف لانے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے، تو میں بڑے شش و پنج میں پڑ گیا، کیا جواب دوں؟ اپنے دو ایک دوستوں سے مشورہ لیا، انھوں نے کہا صاف کہہ دیجیے مجھے فرصت نہیں، وہ حاکم ضلع ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ کوئی سرکاری یا ضابطے کا کام ہوتا تو آپ کا جانا مناسب تھا۔ لیکن ذاتی ملاقات کے لیے آپ کا جانا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ آخر وہ خود آپ کے مکان پر کیوں نہیں آئے۔ اس سے کیا ان کی شان میں بٹہ لگا جاتا تھا۔ اسی لیے تو خود نہیں آئے اور آپ کو بلایا کہ وہ حاکم ضلع ہیں۔ ان احمق ہندوستانیوں کو بھی یہ سمجھ نہ آئے گی کہ دفتر کے باہر وہ بھی ویسے ہی انسان ہیں جیسے ہم یا آپ۔ شاید یہ لوگ اپنی بیوی سے بھی افسری جتاتے ہوں گے۔ انھیں اپنا عہدہ کبھی نہیں بھولتا۔

ایک صاحب نے جو لطیفوں کے خزانچی ہیں، ہندوستانی افسروں کے کئی پُر مزاق

تذکرے سنائے۔ ایک افسر صاحب سسرال گئے، شاید بیوی کو رخصت کرانا تھا جیسا عام رواج ہے۔ خُسر صاحب نے اس موقع پر رخصت کرنے سے انکار کیا۔ کہا۔ ''بیٹا! ابھی اتنے دنوں کے بعد آئی ہے۔ تین مہینے بھی نہیں ہوئے۔ بھلا اور نہیں تو چھ مہینے تو رہنے دو''۔ ادھر بیوی نے بھی نائن کے ذریعے پیغام کہلا بھیجا۔ ''ابھی میں جانا نہیں چاہتی۔ آخر ماں باپ سے مجھے بھی تو محبت ہے۔ کچھ تمھارے ہاتھ بک تھوڑی ہی گئی ہوں''۔ میاں داماد ڈپٹی کلکٹر تھے جامے سے باہر ہو گئے۔ خُسر پر سمن جاری کر دیا۔ بے چارہ بڈھا آدمی دوسرے دن صاحب زادی کو لے کر داماد کے خدمت میں حاضر ہوئے، تب جا کے اس کی جان بچی''۔ یہ لوگ ایسے خر دماغ ہوتے ہیں اور پھر تمھیں حاکم ضلع سے لینا کیا ہے۔ اگر تم کوئی باغیانہ یا اشتعال انگیز قصہ یا مضمون لکھو گے، فوراً گرفتار ہو جاؤ گے۔ مطلق رعایت نہ کی جائے گی۔ اپنے لڑکے کے لیے قانون گوئی نائب تحصیلداری کی فکر تمھیں ہے نہیں۔ پھر خواہ مخواہ کیوں دوڑے جاؤ''۔

لیکن میں نے دوستوں کی صلاح پر کار پیرا ہونا تہذیب کے خلاف سمجھا۔ ایک شریف آدمی قدر افزائی کرتا ہے تو اس سے محض اس بنا پر بے اعتنائی کرنا کہ وہ حاکم ضلع ہے تنگ ظرفی ہے۔ بیشک حاکم ضلع صاحب میرے غریب خانے پر آتے تو ان کی شان کم نہ ہوتی۔ وضع دار آدمی بے تکلف چلا آتا۔ لیکن بھئی ضلع کی افسری بڑی چیز ہے اور قصہ نگار کی ہستی ہی کیا ہے۔ انگلینڈ یا امریکہ میں فسانہ نگاروں کی میز پر مدعو ہونے میں وزیر اعظم بھی اپنا اعزاز سمجھتے ہوں گے، لیکن یہ ہندوستان ہے، جہاں ہر ایک رئیس کے دربار میں شاعروں کا ایک انبوہ قصیدہ خوانی کے لیے جمع رہتا تھا۔ اور اب بھی تاجپوشی کے موقع پر ہمارے اہل قلم بن بلائے رئیسوں کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ قصیدہ پیش کرتے ہیں۔ انعام پاتے ہیں تو ایسے کہاں کے ہو کہ حاکم ضلع تمھارے گھر پر چلا آئے۔ وہ افسر ہے تم معمولی مضمون نگار ہو جب تم میں اس قدر لڑکپن اور تنک مزاجی ہے تو پھر وہ تو ضلع کا بادشاہ ہے۔ اگر اسے کچھ غرور بھی ہے تو جائز ہے۔ کمزوری کہو، جہالت کہو، خر دماغی کہو؛ لیکن پھر بھی جائز ہے اور خدا کا شکر کرو کہ افسر صاحب تمھارے گھر نہیں آئے، ورنہ ان کی خاطر و مدارات کا سامان تمھارے یہاں کہاں تھا؟ گت کی ایک کرسی بھی تو نہیں ہے۔ تین پیسے کی چوبیس بیڑیاں پی کر دل خوش کر لیتے ہو۔ ہے

توفیق روپے کی دو سگار پینے کی؟ کہاں وہ سگار ملتا ہے، اس کا کیا نام ہے، اس کی خبر ہے تمھیں؟ اپنی تقدیر کو سرا ہو کہ وہ خود نہیں آئے تمھیں بلا لیا۔ چار پانچ روپے بگڑ ہی جاتے اور شرمندگی بھی ہوتی۔ خدانخواستہ اور تمھاری شامت اعمال سے کہیں ان کی اہلیہ بھی ہمراہ ہوتیں، تو قیامت ہی آجاتی۔ ان کی مہماں نوازی تم یا تمھاری دھرم پتنی جی کر سکتی تھیں؟ وہ تمھارے گھر میں یقیناً جاتیں اور تمھارے لیے موت کا سامان ہوتا۔ تم اپنے گھر میں پھٹے پرانے پہن کر اپنی بے نوائی میں مگن رہ کر زندگی بسر کر سکتے ہو، لیکن کوئی بھی خوددار شخص یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی خستہ حالی دوسروں کے لیے مایۂ تفریح ہو۔ ان لیڈی صاحبہ کے سامنے تمھاری تو زبان بند ہو جاتی اور یہی جی چاہتا کہ زمین پھٹ جاتی اور تم اس میں سما جاتے۔

چنانچہ میں نے حاکم ضلع کی دعوت قبول کی اور باوجود یہ کہ اس میں کسی قدر ناگوار رعونت تھی، لیکن شفقت اور خلوص نے اسے ظاہر نہ ہونے دیا۔ کم سے کم انھوں نے مجھے شکایت کا موقع نہ دیا۔ افسرانہ فطرت کو تبدیل کرنا ان کے امکان سے باہر تھا۔

میں نے سوچا یہ ذاتی معاملہ ہے، انھوں نے مجھے بلایا میں چلا گیا۔ کچھ ادبی گپ شپ کی اور واپس آیا، کسی سے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں نے اس واقعہ کو ذرا اہمیت نہ دی۔ گویا بازار سبزی خریدنے گیا تھا۔

لیکن مخبروں نے جانے کیسے اس کی خبر لگائی۔ خاص حلقوں میں یہ چرچے ہونے لگے کہ افسر ضلع سے میرے بہت دوستانہ تعلقات ہیں اور وہ میری بڑی عزت کرتے ہیں۔ مبالغہ نے میری وقعت میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ یہاں تک مشہور ہوا کہ وہ مجھ سے صلاح لیے بغیر کوئی تجویز یا رپورٹ نہیں لکھتے۔

کوئی ذی ہوش آدمی اس قسم کی شہرت سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اہلِ غرض باؤلے ہوتے ہیں، تنکے کا سہارا ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ انھیں اس کا یقین دلانا کچھ بھی مشکل نہیں تھا کہ میرے ذریعے ان کی مطلب براری ہو سکتی ہے۔ لیکن میں ایسی حرکتوں کو ذلیل سمجھتا ہوں۔ صدہا اصحاب اپنی اپنی داستانیں لے کر میرے پاس آئے۔ کسی کے ساتھ پولیس نے بے جا زیادتی کی تھی، کوئی انکم ٹیکس والوں کی سختی سے نالاں تھا۔ کسی کو یہ شکایت تھی کہ دفتر میں اس کی حق تلفی ہو رہی ہے اور اس کے بعد کے آدمیوں کو

ترقیاں مل رہی ہیں۔ اس کا نمبر جب آتا ہے کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا علیٰ ہذا اس قسم کی کوئی داستان روز ہی مجھ تک پہنچنے لگی۔ لیکن میرے پاس ان سب کے لیے ایک ہی جواب تھا۔ ''مجھ سے کوئی مطلب نہیں''۔

ایک دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ میرے بچپن کے ایک ہم جماعت دوست وارد ہوئے۔ ہم دونوں ایک ہی مکتب میں پڑھنے جایا کرتے تھے۔ کوئی 45 سال کی پرانی بات ہے۔ میری عمر 8 ، 9 سال سے زیادہ نہ تھی، وہ بھی قریب قریب اسی عمر کے مگر مجھ سے کہیں تو انا اور فربہ تھے۔ میں ذہین تھا وہ حد درجے کے غبی۔ مولوی صاحب ان سے عاجز تھے اور انھیں سبق پڑھانے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی تھی میں اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھتا تھا اور مولوی صاحب کی قچی جہاں لاچار تھی وہاں میری ہمدردی کامیاب ہوگئی۔ بلدیو چل نکلا اور خالق باری تک آپہنچا۔ مگر اسی درمیان میں مولوی صاحب کی وفات نے اس مکتب کا خاتمہ کر دیا اور طلبہ بھی منتشر ہو گئے۔ تب سے بلدیو کو میں نے صرف دو تین بار رات میں دیکھا (میں اب بھی وہی منحنی ہوں۔ وہ اب بھی دیو قامت) رام رام ہوئی۔ ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھی اور اپنی اپنی راہ چلے۔ میں نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''آؤ بھئی بلدیو مزے میں تو ہو۔ کیسے یاد کیا، کیا کرتے ہو آج کل''؟

بلدیو نے دردناک انداز سے کہا۔ ''زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں اور کیا، تم سے ملنے کا بہت دنوں سے اشتیاق تھا۔ یاد کرو وہ مکتب والی بات جب تم مجھے پڑھایا کرتے تھے۔ تمھاری بدولت چار حرف پڑھ گیا اور اپنی زمینداری کا کام سنبھال لیتا ہوں، نہیں تو مورکھ بنا رہتا۔ تم میرے گرو ہو بھائی۔ سچ کہتا ہوں مجھ جیسے گدھے کو پڑھانا تمھارا ہی کام تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ مولوی صاحب سے سبق پڑھ کر اپنی جگہ پر آیا نہیں کہ بالکل صاف، کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا تم تو تب بھی بڑے ذہین تھے''۔

یہ کہہ کر انھوں نے مجھے پُرعزت نظروں سے دیکھا۔ میں نے باچشم تر کہا۔ ''میں تو جب تمھیں دیکھتا ہوں تو یہی جی میں آتا ہے کہ دوڑ کر تمھارے گلے سے لپٹ جاؤں، 45 سال کی مدت گویا بالکل غائب ہو جاتی ہے، وہ مکتب آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے اور بچپن ساری دلفریبیوں کے ساتھ تازہ ہو جاتا ہے''۔

بلدیوں نے بھی رقت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے تو بھئی تمھیں ہمیشہ اپنا مربّی اور رہنما سمجھا ہے۔ جب تمھیں دیکھتا ہوں تو چھاتی گز بھر کی ہو جاتی ہے کہ وہ میرا بچپن کا دوست جاتا ہے جو وقت پڑنے پر کبھی دغا نہ دے گا۔ تم کچھ کھاتے پیتے کیوں نہیں، سوکھتے کیوں جاتے ہو۔ گھی نہ ملتا ہو تو ایک دو کنستر بھجوا دوں۔ اب تم بوڑھے ہوئے خوب ڈٹ کر کھایا کرو۔ اب تو بدن میں جو کچھ طاقت ہے وہ کھانے پینے کی بدولت ہے۔ میں تو اب بھی سیر بھر دودھ اور پاؤ بھر گھی اڑائے جاتا ہوں۔ ادھر تھوڑا مکھن بھی کھانے لگا ہوں۔ عمر بھر بال بچوں کے لیے مر مٹے کوئی پوچھتا ہے تمھاری کیا حالت ہے؟ اگر آج کندھا ڈال دوں تو کوئی ایک لوٹا پانی کو نہ پوچھے، اس لیے خوب کھاتا ہوں اور سب سے زیادہ کام کرتا ہوں۔ وہی جو بڑا لڑکا ہے اس پر پولیس نے ایک جھوٹا مقدمہ چلا دیا ہے۔ اچھا خاصا پہلوان ہے۔ کسی سے دبتا نہیں۔ داروغہ جی سے ایک بار کچھ کہا سُنی ہو گئی تب سے اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ ادھر گاؤں میں ایک ڈاکہ پڑ گیا داروغہ جی نے تحقیقات میں اسے بھی پھانس لیا۔ ایک ہفتے سے حراست میں ہے۔ مقدمہ محمد خلیل صاحب ڈپٹی کلکٹر کے اجلاس میں ہے اور محمد خلیل اور داروغہ کی گہری دوستی ہے۔ ضرور سزا ہو جائے گی۔ اب تم ہی بچاؤ تو اس کی جان بچ سکتی ہے۔ ہمیں اور کوئی امید نہیں ہے۔ سزا تو ہوگی ہی عزت خاک میں مل جائے گی۔ تم جاکر حاکم ضلع سے اتنا کہہ دو کہ مقدمہ جھوٹا ہے۔ آپ خود تحقیقات کریں۔ بس دیکھو بچپن کے ساتھی ہو، انکار مت کرنا۔ جانتا ہوں کہ تم ان معاملات میں نہیں پڑتے اور نہ پڑنا چاہیے۔ افسر ضلع سے تمھاری دوسری طرح کی ملاقات ہے۔ تم کیوں ان قضیوں میں پڑو گے؟ لیکن یہ گھر کا معاملہ ہے اتنا سمجھ لو اور بالکل جھوٹا ہے نہیں تو میں تمھارے پاس نہیں آتا۔ لڑکے کی ماں رو رو کر جان دیے ڈالتی ہے۔ بیوی نے دانہ پانی چھوڑ رکھا ہے۔ سات دن سے گھر میں چولھا نہیں جلا۔ میں دودھ پی لیتا ہوں، لیکن دونوں ساس بہو بے آب و دانہ پڑی ہوئی ہیں۔ اگر سزا ہوئی، تو دونوں مر جائیں گی۔ میں نے یہی کہہ کر سب کو ڈھارس دی ہے کہ جب تک ہمارا بچپن کا دوست زندہ ہے کوئی ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا''۔

میں بڑی مشکل میں پڑا۔ میری جانب سے جتنے اعتراضات ہو سکتے تھے ان کا

جوب بلدیو سنگھ نے پہلے ہی دے دیا تھا۔ اگر ان کا اعادہ کرتا ہوں تو سر ہو جائے گا۔ گلا نہ چھوڑے گا۔ کوئی جواب نہ سوجھا آخر مجھے مجبور ہو کر کہنا پڑا کہ میں جا کر صاحب سے اس کا ذکر کروں گا۔ مگر مجھے امید نہیں کہ اس کا کچھ نتیجہ ہو۔ حکام ماتحتوں کے معاملے میں بہت کم دخل دیا کرتے ہیں۔

''تم جاکر کہہ دو۔ تقدیر میں جو ہے وہ تو ہوگا ہی''۔

''اچھی بات ہے''۔

''تو کل جاؤ گے''۔

''کل ہی جاؤں گا''۔

بلدیو سنگھ کو رخصت کر کے میں نے اپنا مضمون ختم کیا اور آرام سے کھانا کھا کر لیٹا۔ میں نے بلدیو سنگھ کو جھانسا دیا تھا۔ میں پہلے سے بتا چکا تھا کہ عام طور پر پولیس کا اعتبار کرتے ہیں۔ یہ کہنے کی کافی گنجائش تھی کہ صاحب نے اس معاملہ میں دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔ صاحب کے پاس جانے کا میں نے خواب میں بھی خیال نہ کیا تھا۔

میں اس واقعہ کو بالکل بھول گیا تھا کہ آٹھویں دن بلدیو سنگھ اپنے پہلوان بیٹے کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ بیٹے نے میرے قدموں پر سر رکھ دیا اور ایک کنارے کھڑا ہو گیا۔ بلدیو سنگھ بولے۔ ''بالکل بری ہو گیا بھائی، صاحب نے داروغہ جی کو بلا کر خوب ڈانٹا کہ تم بھلے آدمیوں کو ستاتے اور بدنام کرتے ہو۔ اگر پھر ایسی شرارت کی تو برخاست کردیے جاؤ گے۔ داروغہ بہت پشیمان ہوئے۔ جب صاحب نے اسے بری کر دیا تو میں نے داروغہ صاحب کو جھک کر سلام کیا۔ بچارے پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ یہ تمھاری سفارش کی برکت ہے برادر اگر تم نے مدد نہ کی ہوتی تو ہم تباہ ہو گئے تھے۔ یہ سمجھ لو چار آدمیوں کی جان بچ گئی۔ میں تمھارے پاس بہت ڈرتے ڈرتے آیا تھا۔ لوگوں نے کہا تھا کہ ان کے پاس ناحق جاتے ہو، وہ بڑا بے مرّوت آدمی ہے۔ اس کی ذات سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ آدمی وہ کہلاتا ہے جس سے ضرورت مندوں کا کام نکلے وہ کیا آدمی ہے جو کسی کی کچھ سنے ہی نہیں۔ یہی کہے مجھ سے کچھ مطلب نہیں لیکن بھائی میں نے کسی کی نہ سنی۔ میرے دل میں مرا رام بیٹھا کہہ رہا تھا کہ تم چاہے کتنے ہی روکھے بے مروّت ہو۔ لیکن مجھ پر ضرور رحم کرو گے''۔

یہ کہہ کر بلدیو سنگھ نے اپنے لڑکے کو اشارہ کیا۔ وہ باہر گیا اور ایک بڑا سا گٹھرا اٹھا لایا۔ جس میں انواع و اقسام کی دیہاتی سوغاتیں بندھی ہوئی تھیں حالانکہ میں برابر کہے جاتا تھا۔ ''کوئی ضرورت نہیں، کوئی ضرورت نہیں''؟

مگر اس وقت بھی مجھے یہ تسلیم کرنے کا حوصلہ نہ ہوا کہ میں صاحب کے پاس گیا نہیں۔ جو کچھ ہوا خود بخود ہوا۔ مفت کا احسان چھوڑنا طبیعت نے گوارا نہ کیا۔

(یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ 'ہنس' کے اگست 1934 کے شمارے میں شائع ہوا، عنوان تھا 'مفت کا لیش'۔ 'مان سرور نمبر 2' میں شامل ہے۔ اردو میں یہ 'واردات' میں شامل ہے۔)

قہر خدا کا

(1)

شام کو جب دینا ناتھ نے گھر آکر گوری سے کہا۔ ''مجھے ایک دفتر میں پچاس روپے کی جگہ مل گئی ہے تو اس کا ایک ایک عضو شگفتہ ہوگیا۔ آنکھیں چمکیں، ہونٹ کھلے۔ چہرہ دمک اٹھا دیوتاؤں پر اس کا اعتقاد مضبوط ہو گیا۔ ادھر ایک سال سے ان غریبوں کا برا حال تھا۔ نہ کوئی روزی نہ روزگار۔ گھر میں جو تھوڑے بہت گہنے پاتے تھے وہ کب کے بک چکے تھے۔ جن دوستوں سے قرض مل سکتا تھا سب سے لے چکے تھے۔ جن نبیوں سے ادھار چیزیں مل سکتی تھیں۔ ان سے آنکھیں چراتے پھرتے تھے۔ اب یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ کئی مہینہ کا مکان کا کرایہ سر پر لدھا ہوا تھا۔ گوالے نے تقاضے سے تنگ آکر دودھ بند کر دیا۔ اور بچّہ دن بھر دودھ سے بلکتا رہتا۔ ایک وقت کسی طرح کھانا میسّر ہو جاتا تو اسے کھینچ تان کر دو تین وقت چلاتے، تقاضوں کے مارے دیناناتھ کا گھر سے نکلنا مشکل تھا۔ گھر سے نکلے نہیں کہ چاروں طرف سے چھتاڑ مچ جاتی۔ واہ بابو.جی واہ! دو دن کا وعدہ کرکے سودا لے گئے اور آج دو مہینہ سے صورت نہیں دکھائی۔ ایسے دس پانچ گاہک اور مل جائیں تو دیوالہ ہی نکل جائے واہ بھائی صاحب یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ اپنی ضرورتوں کا تو آپ کو خیال رہے لیکن دوسروں کی ضرورت کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ اسی لیے بزرگوں نے کہا ہے دشمن کو چاہے قرض دے دو۔ مگر دوستوں کو کبھی مت دو۔ قرض دیا اور دوست دشمن ہوا۔ دینا ناتھ کو یہ فقرے تیروں سے زیادہ لگتے تھے اور اس کا جی چاہتا تھا کہ اس زندگی کا خاتمہ کر دے۔ مگر بے زبان عورت اور بے سمجھ بچے کا منہ دیکھ کر دل تھام کر رہ جاتا تھا۔ بارے آج ایشور نے اس پر رحم کیا اور مصیبت کے ایّام کٹ گئے۔

گوری نے خوش ہو کر کہا۔ ''میں کہتی نہ تھی کہ ایشور سب کی سدھ لیتا ہے اور کبھی نہ کبھی ہماری سُدھ بھی لے گا۔ مگر تمھیں یقین نہ آتا تھا۔ اب تو ایشور کی رحیمی کے قائل ہوئے''۔

دینا ناتھ نے ہٹ دھرمی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری دوا دوش کا نتیجہ ہے۔ ایشور نے کیا کیا۔ ایشور کو تو جب مانتا کہ کہیں سے چھپر پھاڑ کر بھیج دیتے''۔

''ایشور جب دیتا ہے کسی نہ کسی حیلہ سے دیتا ہے۔ سنا نہیں ہے۔ ''حیلہ روزی بہانے موت''۔

''جب تک یہ دنیا کا نظام قائم ہے مجھے ایشور پر وشواس نہیں آنے کا''۔

لیکن ہم اسے چاہے کچھ کہیں اس میں شک نہیں کہ اس کے اوسر کفر میں بھی بیج پڑ چکے تھے اور اس میں اکھوے بھی نکل آئے تھے۔

(2)

دیناناتھ کا آقا نہایت ہی کج خلق آدمی تھا اور کام میں بڑا چُست۔ اسی کی عمر پچاس سے زیادہ تھی اور صحت بھی رخصت ہوچکی تھی۔ ساگو دانے کے سوا اور کوئی چیز ہضم نہ ہوتی تھی۔ پھر بھی دفتر میں سب سے زیادہ جفاکش تھا۔ مجال نہ تھی کہ کوئی ملازم ایک منٹ کی بھی دیر کرے یا ایک منٹ بھی وقت معیّن سے پہلا جائے۔ خود نہ جانے کب آتا تھا، اور نہ جانے کب جاتا تھا۔ عملے والے جب دفتر آتے وہ اپنی کرسی پر بیٹھا نظر آتا تھا۔ جب جاتے جب بھی وہ اپنی کرسی پر موجود رہتا۔ لوگ اس کے سامنے جاتے ایسا ڈرتے تھے گویا کاٹ کھائے گا۔ دس منٹ تک کلیجہ مضبوط کرتے اور فراغت پاتے ہی ایسا بگٹٹ بھاگتے گویا قید سے چھوٹے ہوں۔ ملنے کی تو کسی کو مہلت نہ تھی۔ بس اپنی جگہ پر بیٹھے لوگ اس کی نقلیں کیا کرتے۔ نہ جانے اس کے کتنے نئے نام رکھ لیے، اس کی حرکات و سکنات کی تضحیک کرنا ہی لوگوں کی دلچسپی کا مشغلہ تھا۔ صرف ایک بجے عملہ کو 10 منٹ کا وقفہ ملتا تھا اس میں جس کا جی چاہے پان کھائے سگریٹ پیئے یا چائے۔ اس کے بعد ایک منٹ کا بھی موقع نہ ملتا تھا۔ قاعدہ کی بڑی سختی سے پابندی کی جاتی تھی اور حالانکہ تنخواہ پہلی تاریخ کو ملتی تھی۔ تعطیلوں میں دفتر بند رہتا اور معینہ اوقات سے زیادہ

ایک منٹ بھی کام نہ لیا جاتا۔ سب کو بونس ملتا تھا اور پراویڈنٹ فنڈ کی بھی سہولت تھی اور پھر بھی کوئی آدمی خوش نہ تھا۔ کام کی کثرت یا پابندی اوقات کی کسی کو شکایت نہ تھی۔ شکایت صرف مالک کے تھوتھے پن کی تھی۔ کتنا بھی دل لگا کر کام کرو، جان بھی کیوں نہ دے دو، شکریہ کا لفظ یا حوصلہ افزائی کا ایک کلمہ بھی اس شخص کی زبان سے نہ نکلتا۔

مگر اور لوگ چاہے کتنے ہی شاکی ہوں۔ دینا ناتھ کو مالک سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اس فاقہ کشی کے مقابلہ میں اس کے روکھے پن یا ترش روئی کی کیا حقیقت تھی، وہ شریک نہ ہوتا۔ احسان سے اس کا ایک ایک رواں گرانبار ہو رہا تھا۔ سال بھر میں ہی اس نے اپنی کفایت شعاری کی بدولت قرضے چکا دیے اور کچھ پس انداز بھی کر لیا۔ وہ ان لوگوں میں تھا جو تھوڑے میں بھی خوش رہ سکتے ہیں، اگر معین وقت پر ملتا جائے۔ چار روپے روز میں شاید وہ برکت نہ ہوتی جو پچاس روپے ماہوار میں تھی۔ ضروری مصارف کی مدیں مقرر ہوگئی تھیں۔ زندگی کی ایک لکیر بن گئی تھی اور اس پر وہ آنکھیں بند کیے بے کھٹکے چلا جاتا تھا۔ غیر معین آمدنی میں وہ بجٹ کیسے بناتا، کیسے اس کی پابندی کرتا۔ کبھی ایک چیز آتی تو دوسری چیز کم پڑ جاتی۔ دوسری آتی تو تیسری کا روناہوتا۔ کمرے میں مستقل روشنی چاہے کم ہو، اس بجلی کے لیمپ سے بہتر ہے جو کبھی جلے اور کبھی بجھ جائے۔ کبھی ہنی ہنا اور کبھی بھر چنا والی زندگی اسے مطلق پسند نہ تھی۔ مقررہ خرچ کے علاوہ ایک روپیہ بھی کسی خاص کے لیے خرچ کرنا پڑتا تو میاں بیوی میں گھنٹوں بحث و تمحیص ہوتی اور بڑی جھاؤں جھاؤں کے بعد کہیں منظوری ملتی تھی۔ بل گوری کی طرف سے پیش ہوتا تھا تو دینا ناتھ مخالفت کرتا۔ دینا ناتھ کی طرف سے پیش ہوتا تو گوری اس کا بخیہ ادھیڑتی۔ بل کو پاس کرا لینا مجوز کی لیاقت اور وکالت قاصر تھا۔ سرٹیفائی کرانے والی کوئی تیسری طاقت نہ تھی۔ دینا ناتھ اب خدا پرست بن گیا تھا۔ اس کے رحم و انصاف میں اب اسے کوئی شک نہ تھا۔ روز سُندھیا کرتا اور بلا ناغہ گیتا پڑھتا۔ ایک دن اس کے منکر دوست نے جب ایشور کی مزمت کی تو اس نے کہا۔ ''بھائی صاحب اس کا تو آج تک فیصلہ نہ ہو سکا کہ ایشور ہے یا نہیں۔ منکر اور موحد دونوں کے پاس فولاد کی سی دلیلیں موجود ہیں، لیکن میرے خیال میں موحد رہنا منکر رہنے سے کہیں زیادہ مصلحت آمیز ہے، اگر ایشور کا وجود ہے تب تو منکروں کو دوزخ کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں۔ موحد کے

دونوں ہاتھوں میں لڈو ہیں۔ اگر ایشور ہے تب تو پوچھنا ہی کیا ہے، اس کے لیے جنت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ایشور نہیں تب بھی اس کا کیا بگڑتا ہے۔ دو چار منٹ کا وقت ہی تو جاتا ہے۔ منکر دوست اس کی دورخی دلیل پر منہ بنا کر چپ ہوگیا۔ ایشور کے لیے اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

دیوالی کا دن تھا۔ گوری نے اب کے ہزار چراغ جلانے کا بندوبست کیا۔ دس سیر تیل لیا اور سارا دن بیٹھی بتیاں بناتی رہی۔ شام کو جب دینا ناتھ دفتر سے آگئے اور یہ تیاریاں دیکھیں تو چیں بہ جبیں ہوکر بولے۔ ''تمھیں بھی سنک سوار ہوگئی۔ بل پیش کرنے سے پہلے ہی اس پر عمل در آمد شروع کر دیا۔ اتنا تیل جلانے سے فائدہ؟ آٹھ آنے کے تیل میں کیا کام نہ چل سکتا تھا۔

گوری مُسکراتی ہوئی بولی۔ ''اسے کبھی غصہ نہ آتا۔ کام کیوں نہ چل سکتا تھا۔ پچھلے سال تو دھیلے کا بھی نہ آیا، کیا تب کام نہ چلا''۔

''میں یہ تو نہیں کہتا کہ تیل لیا ہی کیوں؟ یہی کہتا ہوں کہ اتنا زیادہ تیل کیوں لیا۔ یہ تو فضول خرچی ہے''۔

''میرا دل آج فضول خرچی ہی پر مائل ہے۔ سو چو ایک دن وہ تھا کہ دیوالی کے دن میں اندھیرا پڑا رہا! ایک دن آج ہے کہ ہم ایک ہزار چراغ جلانے کے لائق ہیں۔ کیا بھگوان نے ہنسنے کا موقع دیا ہے تب بھی روئے جائیں، یہ کتنی بڑی ناشکری ہے۔

''اچھا! یہ خیال ہے۔ تب ضرور جلاؤ۔ تمھارا بل پاس ہوگیا''۔

ایک دن دینا ناتھ شام کو دفتر سے چلنے لگے تو سیٹھ جی نے انھیں اپنے کمرے میں اور بڑی خاطر سے کرسی پر بٹھا کر بولے۔ ''تمھیں یہاں کام کرتے کتنے دن ہو گئے۔ سال تو ہوگیاہوگا''۔ دینا ناتھ نے ادب سے جواب دیا۔ ''جی ہاں تیرھواں مہینہ چل رہا ہے''۔

''آرام سے بیٹھو۔ اس وقت گھر جاکر کچھ چائے وائے پیتے ہو؟''

''جی نہیں! میں چائے کا عادی نہیں ہوں''۔

''پان وان تو کھاتے ہی ہو گے۔ جوان آدمی ہوکر ابھی سے اتنا پرہیز''۔

''یہ کہہ کر سیٹھ جی نے گھنٹی بجائی اور اردلی سے پان اور کچھ مٹھائیاں لانے کو کہا۔

حالانکہ دیناناتھ برابر انکار کرتا رہا۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ آج یہ غیر معمولی خاطر داری کیوں ہو رہی ہے۔ کہاں تو حضرت سلام ہی نہ لیتے تھے، کہاں آج مٹھائیاں اور پان سبھی کچھ ہو رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے میری خدمات سے خوش ہو گئے ہیں۔ اس خیال سے انھیں اپنے اوپر کچھ اعتماد ہوا اور ایشور کی یاد آگئی۔ پرماتما حاضر و ناظر ہے، ورنہ مجھے کون پوچھتا۔ دفتر میں میرا عہدہ بھی تو اونچا نہیں ہے۔

اردلی پان اور مٹھائیاں لایا۔ دینا ناتھ اصرار سے مجبور ہو کر مٹھائیاں کھانے لگا۔

سیٹھ جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھے بہت خشک اور بے مروّت پایا ہوگا۔ میرے ملازموں کو مجھ سے یہ عام شکایت ہے۔ مگر میں مجبور ہوں، ہمارے یہاں ابھی لوگوں میں اپنی ذمہ داری کا احساس اتنا کم ہے کہ افسر ذرا بھی نرم پڑ جاتے تو ملازمین اس کی شرافت اور انسانیت سے نا جائز فائدہ اٹھانے لگتے ہیں اور اپنے کام سے بے توجہی برتنے لگتے ہیں۔ انھیں اپنے کام کی اتنی پرواہ نہیں رہتی جتنی اپنے افسر کی خوشامد اور مصاحبت کی۔ کچھ ایسے خوش نصیب بھی ہیں جو نوکروں سے میل جول بھی رکھتے ہیں۔ ان سے ہنستے بولتے بھی ہیں۔ ان کی مجلسوں میں شریک بھی ہوتے ہیں۔ پھر بھی نوکروں کو ان سے زیادہ بے تکلف ہونے کا حوصلہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ اور بھی تندہی سے اپنا کام کرتے ہیں اور مالک سے انھیں ہمدردی ہو جاتی ہے۔ میں ایسا خوش نصیب نہیں ہوں۔ مجھ میں وہ گن نہیں ہے۔ اس لیے میں اپنے آدمیوں سے کچھ الگ رہنے ہی میں خیریت سمجھتا ہوں اور اب تک مجھے اس طرز عمل سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ لیکن آدمیوں سے الگ رہ کر بھی ان کے رنگ ڈھنگ دیکھتا رہتا ہوں اور ان کی فطرت کا امتحان لیا کرتا ہوں اور میں تم پر بھروسہ کر سکتا ہوں۔ اس لیے میں اب تمھیں زیادہ ذمہ داری کا کام دینا چاہتا ہوں، جہاں تمھیں خود بہت کم کام کرنا ہوگا۔ صرف نگرانی کرنی ہوگی۔ تمھاری تنخواہ میں پچاس روپے کا اضافہ ہو جائے گا اور اختیارات بڑھ جائیں گے۔ مجھے یقین ہے اب تک جس تندہی سے تم نے کام کیا ہے آئندہ اس سے بھی زیادہ توجہ اور خلوص سے اپنا کام کروگے''۔

دینا ناتھ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور حلق کی مٹھائی کچھ نمکین ہو گئی۔ جی میں آیا اپنے آقا کے قدموں پر سر رکھ دے اور عرض کرے آپ کی خدمت کے لیے میری

جان حاضر ہے۔ آپ نے جو میری عزّت افزائی کی ہے اور جو اعتبار کیا ہے میں اس کے لائق بننے کی کوشش کروں گا۔ آواز قابو میں نہ تھی، جذبات اس پر حاوی ہو گئے تھے۔ صرف احسان مند نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔ مگر ان خاموش نظروں نے جتنا اظہار کیا شاید وفاداری اور تشکر کے مرصع الفاظ نے نہ کیا ہوتا، تب سیٹھ جی نے ضخیم لیجر نکال کر اس کے اوراق الٹتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک ایسے کام میں تمھاری مدد چاہتا ہوں۔ جس پر اس کاروبار کا سارا مستقبل اٹکا ہوا ہے۔ اتنے آدمیوں میں میں نے تمھیں کو قابل اعتماد سمجھا ہے اور مجھے یقین ہے تم مجھے مایوس نہ کرو گے، یہ سال گزشتہ کا لیجر ہے اور اس میں کچھ ایسے اندراجات ہیں جن کے مطابق کمپنی کو کئی لاکھ کا نفع ہوتا ہے لیکن حقیقت حال سے تم واقف ہو۔ ہم کئی مہینوں سے خسارہ اٹھاتے جاتے ہیں۔ جس نے یہ لیجر لکھا تھا اس کی تحریر تمھاری تحریر سے بہت ملتی ہے۔ اگر دونوں تحریریں آمنے سامنے رکھ دی جائیں تو کسی ماہر فن کو بھی ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہوں ان اعداد کے مطابق ایک نیا صفحہ لکھو اور اس صفحہ کو لیجر سے نکال کر نیا ورق چسپاں کر دو۔ میں نے صفحہ کا نمبر چھپوا لیا ہے۔ ایک باہر کا دفتری بھی ٹھیک کر لیا ہے۔ جوں راتوں رات شیرازہ بندی کر دے گا۔ کسی کو پتہ نہ چلے گا۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ تم وہ نیا صفحہ ان اعداد کے مطابق نقل کر دو''۔

دیناناتھ نے اس تجویز کے خطرہ سے آگاہ ہو کر کہا۔ ''اگر انھیں اعداد کی نقل کرنا ہے تو نیا صفحہ جوڑنے کی کیا ضرورت ہے''؟

سیٹھ جی اس کی سادگی پر ہنس کر بولے۔ ''تو کیا تم سمجھتے اس صفحہ کی بجنسہ نقل کرنا ہوگی۔ میں کچھ نئے اعداد دوں گا، جنھیں تم نشان کردہ رقموں کی جگہ درج کر دوگے۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں محض اس دفتر کی بہتری کے خیال سے یہ کارروائی کر رہا ہوں، اگر یہ ردّ و بدل نہ کیا گیا تو اس سے دفتر کے ایک سو آدمیوں کی روزی خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہاں کچھ پس وپیش کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ یہ ایک سو ملازموں اور کم سے کم پانچ سو مزدوروں کی روٹی کا سوال ہے۔ تم بہت زودنویش ہو اور تمھارے لیے یہ محض آدھ گھنٹہ کا کام ہے''۔

بڑا مشکل مسئلہ تھا۔ یہ ظاہر تھا کہ اسے صریح جعل سازی کی ترغیب دی جارہی

تھی۔ اس کے پاس اس حقیقت کو دریافت کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ سیٹھ جی نے جو تجویز پیش کی ہے۔ اس میں ان کی ذاتی غرض ہے یا صرف دفتر کے آدمیوں کی بہتری کا خیال ہے۔ لیکن بہرحال ہے یہ تحریف اور تلبیس۔ تو کیا وہ ذاتی نفع کے لیے اپنے ضمیر کا خون کرے گا، نہیں ہرگز نہیں۔

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''آپ مجھے معاف کریں، میں یہ خدمت نہیں بجا لا سکوں گا۔ میں اپنے اصول کے خلاف سمجھتا ہوں''۔

سیٹھ جی کو مطلق غصہ نہیں آیا، اسی سکون آمیز تبسم کے ساتھ بولے۔ ''کیوں''؟

''اس لیے کہ یہ سراسر جعل ہے''۔

''جعل کسے کہتے ہیں''؟

''نقل کو اصل بنا کر دکھانا جعل نہیں تو اور کیا ہے''۔

''لیکن اگر اس تغیر سے سو آدمیوں کی روزی بنی رہے تو اس حالت میں بھی یہ جعل ہے۔ کمپنی کی اصلی حالت کچھ ہے، کاغذی حالت کچھ اور ہے۔ اگر تغیر نہ کیا گیا تو فوراً کئی لاکھ روپے کے نفع دینے پڑجائیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ کمپنی کا دیوالہ ہو جائے گا اور یہ سارے آدمی بیکار ہو جائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ تھوڑے سے مالدار حصہ داروں کے لیے اتنے غریبوں کا خون کیا جائے۔ غریبوں کی بہتری کے لیے اگر کچھ جعل بھی کرنا پڑے تو میں اسے ضمیر کا خون نہیں سمجھتا۔ اگر میرے جھوٹ بولنے سے کسی آدمی کی جان بچتی ہو تو مجھے جھوٹ بولنے میں مطلق تامل نہ ہوگا۔ میں ہر ایک فعل کو اس کے اسباب تحریک کے اعتبار سے دیکھتا ہوں، جس سے دوسروں کا بھلا ہو وہی سچ ہے اور جس سے دوسروں کو نقصان ہو وہی جھوٹ ہے''۔

دیناناتھ کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ اگر سیٹھ جی کا قول صحیح ہے اور اس تحریف سے ایک سو آدمیوں کی روزی قائم رہ سکتی ہے تو اسے جعل کرنا پڑے گا۔ لیکن ضمیر کو سمجھا لینے کے بعد اس کو اپنے مواخذہ کا خیال آیا۔ قانون کی نظر میں تو جعل جعل ہی ہے، خواہ کسی نیت سے بھی کیا جائے۔

بولا۔ ''لیکن کہیں یہ راز کھل گیا تو مجھے چودہ سال کا کالا پانی رکھا ہوا ہے''۔

سیٹھ جی نے زور سے قہقہہ مارا۔ ''اگر راز کھل گیا تو تم نہ پھنسو گے میں

پھنسوں گا، تم صاف انکار کر سکتے ہو''۔

''تحریر میں کچھ نہ کچھ امتیاز تو رہے گا''۔

''پتہ ہی کیسے چلے گا کہ کون سا صفحہ بدلا گیا ہے۔ اگر تحریر میں کچھ امتیاز ہے بھی تو ناقابلِ احساس''۔

دیناناتھ لا جواب ہو گیا۔ اسی وقت اس صفحہ کو نئے اعداد کے مطابق لکھنے لگا۔ پھر بھی دینا ناتھ کے دل میں چور بیٹھا ہوا تھا۔ گوری کو اس نے شریک راز نہ کیا۔ ایک مہینہ بعد اس کی ترقی ہو گئی سو روپے ملنے لگے۔ دو سو بونس کے بھی ملے۔ یہ سب کچھ ہوا، گھر میں فارغ البالی کے آثار نظر آنے لگے۔ لیکن دینا ناتھ کا مجرم ضمیر ایک بوجھ سے دبا رہتا تھا۔ جن دلیلوں سے سیٹھ جی نے اس کی زبان بند کردی تھی۔ ان دلیلوں سے گوری کی زبان بند کر سکنے کا یقین اسے نہ تھا۔ اب خود اسے ان دلیلوں کا اصلی پہلو نظر آنے لگا تھا۔ اس کی خدا پرستی روحانی تقویت کے بدلے اسے اب پاگل کرتی رہتی تھی، قہر الٰہی کا خوف اس کے دل میں سمایا رہتا تھا۔ اس کے گناہ کی سزا اسے ضرور ملے گی، کسی توبہ کسی کفارہ سے وہ اس سزا سے بچ نہیں سکتا۔ ابھی نہ ملے، سال دو سال نہ ملے، دس پانچ سال نہ ملے۔ لیکن جتنی دیر میں ملے گی اتنی ہی خوفناک ہو گی۔ زرِ اصل سود کے ساتھ بڑھتا جائے گا۔ وہ اکثر پچھتاتا تھا۔ میں سیٹھ جی کی ترغیب میں کیوں آ گیا۔ کارخانہ ٹوٹتا یا رہتا میری بلا سے مجھے یہ روحانی خلش تو نہ ہوتی۔ لیکن اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اور سزا ضرور ملے گی۔ اس خوف سے اس کا سکونِ قلب، اس کی طبعی بشاشت اس کی زندہ دلی رخصت ہو گئی۔ وہ اب گنہگار تھا۔ جس کا فردِ جرم جلی حرفوں میں اس کی نظروں کے سامنے لٹکتا رہتا تھا، وہ ایک پل کے لیے بھی اس کی طرف سے آنکھیں بند نہ کرسکتا تھا۔

ملیریا پھیلا ہوا تھا، بچّے کو بخار آ گیا۔ دینا ناتھ کی جان ناخن میں سما گئی۔ کہاں جائے کیا کرے جیسے عقل سلب ہوگئی ہو۔

گوری نے کہا۔ ''جا کر کوئی دوا لاؤ یا کسی ڈاکٹر کو دکھا دو۔ تین دن تو ہو گئے''۔

دینا ناتھ نے تشویشناک انداز سے جواب دیا۔ ''ہاں جاتا ہوں لیکن مجھے بڑا اندیشہ ہو رہا ہے''۔

''اندیشہ کی کون سی بات ہے، بے بات کی بات منہ سے نکالتے ہو۔ آج کل کسے بخار نہیں آتا۔

''ایشور اتنا بے رحم کیوں ہے''؟

''ایشور بے رحم ہے گنہگاروں کے لیے۔ ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے''؟

''کیا ایشور گنہگاروں کو کبھی معاف نہیں کرتا''؟

''گنہگاروں کو سزا نہ ملے تو دنیا میں کوئی زندہ رہنے نہ پائے''۔

''لیکن آدمی ایسے کام بھی تو کرتا ہے جو ایک خیال سے گناہ ہوتے ہیں دوسرے خیال سے عین ثواب''۔

''میں نہیں سمجھی''۔

''مان لو میرے جھوٹ بولنے سے کسی کی جان بچتی ہو تو وہ گناہ ہے''۔

''میں سمجھتی ہوں ایسا جھوٹ ثواب ہے''۔

دیناناتھ کو تھوڑی دیر کے لیے سکون ہو گیا۔ ڈاکٹر بلا لایا۔ علاج شروع کیا۔ ایک ہفتہ میں بھلا چنگا ہو گیا۔ مگر تھوڑے ہی دن بعد خود بیمار پڑا۔ اب کے ضرور اس پر خدا کا قہر نازل ہوا ہے اور وہ جاں بر نہیں ہو سکتا۔ معمولی فصلی بخار تھا لیکن دینا ناتھ کے خوفِ سزا نے اسے سرسام کی صورت دے دی۔ بخار میں حالتِ نشہ کی طرح یوں بھی واہمہ بہت بلند پرواز ہو جایا کرتا ہے۔ پہلے جو محض وہم تھا وہ شکلِ حقیقت بن گیا۔ تخیّل نے موت کے فرشتے بنا کر کھڑے کر دیے۔ ان کے بھالے اور کوہ پیکر گرز بنا ڈالے۔ دوزخ کے اگن کنڈ دہکا دیے، ڈاکٹر کی ایک گھونٹ دوا ایک ایک ہزار من کے گرز کی چوٹ اور آگ کے ابلتے ہوئے سمندر کی جلن پر کیا اثر کرتی۔ دینا ناتھ وہم پرست نہیں تھا۔ پرانوں کے دور از قیاس قصوں پر اسے مطلق ایمان نہ تھا۔ نہ ہی وہ معقولات کا دلدادہ تھا، اور خدا پر بھی اسے اسی وقت یقین آیا جب اس کی عقل نے اس کے وجود کو تسلیم کر لیا۔ لیکن ایشور آیا تو اس کے ساتھ رحم بھی آیا، قہر بھی آیا، رحم کی بدولت اسے روزی ملی۔ خدا کا رحم نہ ہوتا تو شاید وہ بھوکوں مر جاتا۔ لیکن زخم کی صورت کتنی کمزور اور حقیر ہے، قہر کی صورت کس قدر ہیبت ناک کہ مر جانا اگن کنڈ میں دھکیل دیے جانے کی نسبت کتنا آسان ہے۔ بالکل کھیل ہے۔ سزا کا تخیّل بزرگوں سے متوارث ہوتے ہوتے

اتنا راسخ ہو گیا تھا۔ گویا اس کی روح اور عقل کا ایک جزو ہو گیا ہو،اس کا استدلال اس کے جمے ہوئے تاثرات پر سمندر کی اونچی لہروں کی طرح آتا تھا اورانھیں ایک لمحہ کے لیے غرقاب کر کے پھر لوٹ جاتا تھا اور وہ پہاڑ جوں کا توں کھڑا رہ جاتا تھا۔

زندگی باقی تھی بچ گیا۔ طاقت آتے ہی دفتر جانے لگا۔

ایک دن گوری بولی۔ ''جب تم بیمار تھے تو ایک دن تمھاری حالت نازک ہو گئی تھی اور میں نے گھبرا کر بھگوان سے منوتی کی تھی کہ اگر یہ اچھے ہو جائیں گے پچاس براہمنوں کو بھوجن کراؤں گی۔ دوسرے ہی دن سے تمھاری حالت سنبھلنے لگی۔ ایشور نے میری سن لی۔ آج بازار سے سامان لادو تو وہ مانتا پوری کردوں۔ پچاس برہمنوں کا نیوتہ دو گے تو سو ضرور ہی آجائیں گے۔ پچاس کنگلے بھی سمجھ لو اور دوستوں میں بھی پچیس تیس نکل ہی آئیں گے۔ دو سو آدمیوں کا تخمینہ ہے۔ میں جنس کی مقدار لکھے دیتی ہوں''۔

دینا ناتھ نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا۔ ''تو تمھارا خیال ہے میں ایشور کے رحم سے اچھا ہو گیا''۔

''اور کیسے اچھے ہوئے''؟

''اچھا ہوا اس لیے کہ زندگی تھی''۔

''ایسی باتیں نہ کرو۔ مانتا پوری کرنی ہو گی''۔

''ہرگز نہیں! میں بھگوان کو رحیم نہیں سمجھتا''۔

''پھر کیا بھگوان بے رحم اور ظالم ہے''؟

''اس سے زیادہ بے رحم اور سنگدل ہستی دنیا میں نہ ہوگی جو اپنے بنائے ہوئے کھلونوں کو ان کی غلطیوں اور حماقتوں کی سزایہ دے کہ انھیں دوزخ کے اگن کنڈ میں دھکیل دے، وہ بھگوان رحیم نہیں ہو سکتا۔ ایسے بھگوان کے تخّیل سے ہی میری روح کو لرزہ آتا ہے۔ محبت دنیا کی سب سے بڑی طاقت کہی گئی ہے۔ عقلمندوں نے محبت ہی کو زندگی کی اور دنیا کی علت قرار دیا ہے۔ برتاوات میں نہ سہی تخّیل میں سہی، محبت ہی ہماری زندگی کی حقیقت ہے۔ مگر تمھارا ایشور اپنے قہر اور عذاب کے خوف سے دنیا پر حکومت کرتا ہے۔ پھر اس میں اور معمولی انسان میں کیا فرق ہوا۔ ایسے ایشور کی عبادت میں نہیں کرنا چاہتا، نہیں کر سکتا۔ جو لوگ موٹے ہیں ان کے لیے رحیم ہوگا۔ کیونکہ وہ دنیا کو اس کی

رحیمی کی بدولت لوٹتے ہیں۔ ہم جیسوں کو تو ایشور کی دیا کہیں نظر نہیں آتی۔ ہاں اس کی سزا کا خوف قدم قدم پر کھڑا گھورا کرتا ہے۔ یہ مت کرو نہیں تو ایشور سزا دے گا۔ وہ مت کرو نہیں تو دوزخ میں جاؤ گے۔ ایسے ایشور سے کم از کم مجھے عقیدت نہیں ہو سکتی۔ محبت سے حکومت کرنا انسانیت ہے۔ خوف سے حکومت کرنا بربریت ہے۔ ایسے قہار وجبار خدا سے تو خدا کا نہ رہنا کہیں زیادہ اچھا ہے۔ اسے دل سے نکال کر میں اس کے رحم اور اس کے قہر دونوں سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ ایک کلمہ سخت برسوں کے پریم کو خاک میں ملا سکتا ہے۔ میں تمھارے اوپر برابر جان دیتا رہتا ہوں۔ کسی دن ایک طعنہ دے دوں تو میری صورت دیکھنا گوارا نہ کروگی۔ ایسی پُر عذاب، ایسی پُر خوف زندگی کے لیے میں کسی ایشور کا احسان لینا نہیں چاہتا۔ اگر تم نے براہمنوں کے بھوج پر زور دیا تو میں زہر کھا لوں گا''۔

گوری اس کی طرف خوفزدہ نظروں سے تکتی رہ گئی۔

(یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ 'ہنس' کے اکتوبر 1934 کے شمارے میں شائع ہوا، عنوان تھا 'باسی بھات میں خدا کا ساجھا'۔ 'مان سروور 2' میں شامل ہے۔ اردو میں یہ 'زادِ راہ' میں شامل ہے۔)

انصاف کی پُولیس

(1)

سیٹھ نانک چند نے آج پھر وہی لفافہ پایا اور وہی تحریر دیکھی تو ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ خط کھولتے ہی ہاتھ اور دل کانپنے لگے۔ خط میں کیا لکھا ہے، ساتھیوں نے قیافے سے معلوم کر لیا تھا۔ اسی لفافہ اور اسی تحریر کے کئی خط یکے بعد دیگرے انھیں مل چکے تھے۔ اس خط کا بھی وہی مضمون ہوگا، اس میں مطلق شبہ نہ تھا۔ وہ خط کو کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لیے ہوئے آسمان کی طرف تاکنے لگے، گویا اسم میں اپنا نوشتہ تقدیر پڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ دل کے مضبوط آدمی تھے۔ مُردوں سے بھی اپنی رقم وصول کر لیتے تھے۔ رحم یا رعایت یا دوسری کمزوریاں انھیں چھو بھی نہیں گئی تھیں۔ ورنہ مہاجن ہی کیسے بنتے؟ وہ ہر پور نماشی کو سیتہ نارائن کی کتھا سنتے تھے۔ پچھلے پندرہ سال میں اس معمول میں ایک ناغہ بھی نہ ہوا تھا۔ منگل یا کسی خاص دن مہابیر جی کو لڈو چڑھاتے تھے، روزانہ جمنا میں اشنان کرتے اور شیوجی کو جل چڑھاتے تھے۔ مہینے میں دو بار برہمنوں کو بھوجن بھی کراتے تھے اور جب سے گھی کے کاروبار میں نفع کثیر ہونے لگا تھا، ایک دھرم شالہ بنوانے کی فکر میں تھے۔ زمین طے کر لی تھی اور کسی اچھی مہورت کے منتظر تھے۔ انھوں نے خوب حساب کر کے دیکھ لیا تھا۔ اس کار خیر میں ان کی جیب سے ایک کوڑی بھی نہ خرچ ہوگی۔ زمین ایک بیوہ کی تھی جس پر انھوں نے پہلے اپنی گائے بھینسوں کے لیے ایک مختصر سا چھپّر ڈال لیا تھا، اور جب بیوہ ایک نا بالغ لڑکا چھوڑ کر مر گئی تو وقف زمین اس کے قبضے میں آ گئی۔ لڑکا اپنے ننہیال میں تھا اور ننہیال والوں کو توفیق نہ تھی، نہ اتنی فرصت کہ سیٹھ جی سے مقدمہ بازی کرتے۔ معمار سب ان کے آسامی تھے۔ اور مزدوری کر کے سود ادا کرنا چاہتے تھے۔ اینٹ والا بھی ان سے کئی سال پہلے قرض لے

گیا تھا اور اصل کی دو چند رقم ادا کر چکنے کے بعد بھی اس پر ان کے ہزاروں روپے نکلتے تھے، اس لیے یہ مرحلہ بھی طے تھا۔ صرف سیمنٹ اور چونے والے بیوپاری کے پھنسنے کا انتظار تھا۔ وہ دس بیس ہزار کی دستاویز لکھالے، بس دھرم شالہ تیار ہے۔ ہر ایک کامیاب آدمی کی طرح دیوتاؤں پر ان کا پکا اعتقاد تھا جن کی دعا اور برکت سے انھیں کسی کاروبار میں گھاٹا نہیں ہوا۔ مگر جب سے یہ خطوط ملنے لگے تھے، انھیں ایک وہم آمیز تشویش پیدا ہو گئی تھی۔ رات کو ان کے دروازے پر محض ایک چوکیدار رہتا ہے۔ اگر دس پانچ مسلح آدمی آجائیں تو وہ اکیلا کیا کر سکتا ہے۔ شاید انھیں دیکھ کر بھاگ کھڑا ہو۔ ہمسایوں میں ایسا کوئی نظر نہ آتا تھا جو خطرے کے وقت کام آئے۔ حالانکہ سب ہی ان کے آسامی تھے، یا رہ چکے تھے۔ لیکن یہ فرقہ احسان فراموشوں کا ہے جس کے دروازے پر ضرورت کے وقت ناک اور پیشانی رگڑتا ہے۔ اسی کے درپے آزار ہو جاتا ہے۔ احسان ماننا تو دور رہا، الٹا اور بدخواہ ہو جاتا ہے۔ انھوں نے سوچا اگر رات کو دس پانچ آدمی آجائیں تو واقعی بڑی مشکل کا سامنا ہو۔ بے شک دروازہ مضبوط ہے اور اسے توڑنا آسان نہیں۔ جوڑیاں بھی جرمن ساخت کی ہیں جن پر کوئی حربہ اثر نہیں کر سکتا اور دیواریں اتنی اونچی ہیں کہ ان پر کوئی کیا کھا کے چڑھے گا۔ نقب تو امر محال ہے۔ بیرونی دیوار خالص پتھر کی ہے۔ ایک ایک پتھر دس دس من کا ہے۔

اس خیال سے انھیں قدرے تشفی ہوئی۔ اپنی رائفل نکال کر انھوں نے اس کا خوب معائنہ کیا۔ موقع پڑنے پر اس سے بھی دس پانچ آدمیوں کو منٹوں میں بھون سکتے ہیں۔ پھر بھی ان پر ایک دہشت سی طاری ہو گئی۔ کون جانے یہ چوکیدار بھی انھی میں مل گیا ہو۔ خدمت گار بھی تھوڑے سے لالچ سے آستین کے سانپ ہو سکتے ہیں۔

آخر کئی منٹ کے روحانی انتشار کے بعد انھوں نے خط کھولا اور ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ سانس تیز چلنے لگی۔ فوراً دروازہ بند کر دیا اور خط لیے اندر آکر کیسر سے بولے:۔

''دیکھتی ہو آج پھر وہی خط آیا۔ آج تو تاریخ بھی مقرر کر دی۔ پرسوں ان کا دھاوا ہو گا۔ لکھا ہے اگر اپنی جان عزیز ہے تو پچیس ہزار روپے نقد رامیشور کے مندر کے سامنے درخت کے نیچے آٹھ بجے رات کو رکھ دو۔ یہ سب سمجھتے ہوں گے کہ ان گیدڑ

بھبکیوں سے ڈر جاؤں گا''۔

کیسر پڑھنا نہ جانتی تھی، پھر بھی اس نے ان کے ہاتھ سے خط لے لیا اور اس پر ایک نظر ڈال کر بولی۔

''میں تو سوچتی ہوں مہینے دو مہینے کے لیے یہاں سے کہیں چلے چلیں، کاشی پریاگ، ہردوار کہیں بھی۔ تیرتھ کا تیرتھ ہو جائے گا اور ذرا چین بھی نصیب ہوگا۔ مجھے تو مارے خوف کے رات کو نیند نہیں آتی''۔

سیٹھ جی دلیرانہ انداز سے بولے:-

''اس طرح ایک ایک دھمکی میں بھاگنے لگوں تو مہاجنی کر چکا۔ یہ سب میرے ہی اسامی ہیں۔ جن کی جائدادیں میں نے نیلام کرائی ہیں۔ رائفل کی ایک آواز جہاں کی ہرن ہو جائیں گے۔ پولیس کو بھی اطلاع کئے دیتا ہوں۔ میں نے ابھی تک پولیس کو خبر نہیں دی، وہ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑا بنا دیں گے۔ اور دو چار ہزار روپے میری حفاظت کے بہانے سے وصول کر لیں گے۔ اور حفاظت جیسی وہ کریں گے، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ لیکن اب اطلاع دے دوں گا۔ دوچار سو روپیوں کا منہ نہ دیکھوں گا۔ اپنی طرف سے ہوشیار رہنا اچھا ہے''۔

کیسر دو ہرے بدن کی عورت تھی۔ نخل بے ثمر جو پت جھڑ میں بھی ہری ہری پتیوں سے لدا رہتا ہے۔ اولاد کی ناکام آرزو میں زندگی کا بڑا حصّہ گزار چکنے کے بعد اب اس پر ہمیشہ ایک پر خوف مایوسی طاری رہتی تھی۔ معلوم نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں پھر یہ زرو مال کس کے ہاتھ لگے گا۔ سب سے زیادہ خوف اسے بیماری کا تھا اسے وہ موت کا پیش خیمہ سمجھتی تھی اور اس جامۂ ہستی کو اس وقت تک اتارنا نہ چاہتی تھی جب تک ایک تار بھی باقی رہے۔ بال بچے ہوتے تو وہ خوشی سے مرتی، موت کو بلاتی، لیکن اب تو اس کی زندگی ہی اس کا خاتمہ تھا۔ پھر کیوں نہ وہ زیادہ سے زیادہ زندہ رہے۔ اب تک تو صرف بیماری کا خوف تھا۔ اسے وہ دواؤں اور دعاؤں سے دور کرتی رہتی تھی اور گویا ایشور پر اپنی بے نیازی کا اظہار کرنے کے لیے ہمیشہ بنی ٹھنی رہتی تھی، لیکن جب سے یہ خطوط آنے لگے تھے، اس کا خوف بھوت کی طرح اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ منت آمیز لہجے میں بولی:

''پولیس کو اطلاع کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ میری بات مانو، یہاں سے بھاگ چلو۔ میری بات کیوں نہیں مانتے۔ کیا کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ چور کوئی گھر کو تو اٹھا نہ لے جائے گا''۔

سیٹھ جی نے کیسر کی بدحواسی پر ترس کھا کر کہا:۔

''تم ناحق اتنا ڈرتی ہو کیسر! پولیس کو جب ضابطے کے ساتھ اطلاع دی جائے گی تو اس کا فرض ہو جائے گا کہ ہماری حفاظت کرے۔ ہم ہزار سالانہ ٹیکس دیتے ہیں۔ اگر پولیس نے سماعت نہ کی تو میں لاٹ صاحب سے کہوں گا۔ جب سرکار ہم سے ٹیکس لیتی ہے تو ہماری جان و مال کی حفاظت کرنا اس کا قانونی فرض ہے''۔

سیاسیات کا یہ مسئلہ کیسر کی سمجھ میں کیا آتا۔ وہ کسی طرح اس خوف سے نجات پانا چاہتی تھی جو اس کے دل میں سانپ کی طرح بیٹھا پھنکار رہا تھا۔ پولیس کا اسے اب تک جو تجربہ تھا، اس سے دل کو تقویت نہ ہوتی تھی۔ بولی:۔

''پولیس والے واردات کے وقت تو نظر نہیں آتے۔ جب واردات ہو جاتی ہے تب البتہ شان جتانے کے لیے آپہنچتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ پولیس اور دھنش طوفان ختم ہو جانے کے بعد دکھائی دیتی ہے''۔

سیٹھ جی نے پولیس کی حمایت کی۔ ''پولیس والے تو سرکار کا راج چلا رہے ہیں، تم کیا جانو''۔

کیسر نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''اور میں کہتی ہوں کہ اگر واردات کل ہونے والی ہے تو پولیس کو خبر دینے سے آج ہو جائے گی۔ لوٹ کے مال میں ان کا ساجھا ہوتا ہے''۔

''جانتا ہوں۔ دیکھ چکا ہوں اور روز دیکھتا ہوں، لیکن کیا سرکار کو پانچ ہزار ٹیکس نہیں دیتے۔ اس پر داروغہ جی کو برابر پاپڑ و اچار وغیرہ پہنچاتا رہتا ہوں۔ ابھی جاڑوں میں سپرنٹنڈنٹ صاحب شکار کھیلنے آئے تھے تو میں نے کتنی رسد پہنچائی تھی، ایک کنستر گھی، اور ایک بوری شکر تو ایک ہی دن بھیجی تھی۔ یہ سب کھلانا پلانا کس دن کام آئے گا۔ ہاں یہ مانتا ہوں کہ بالکل دوسروں کے بھروسے نہ بیٹھا رہنا چاہیے۔ اپنے قوت بازو سے بھی کام لینا چاہیے۔ میرا نشانہ تو بے خطا ہوتا ہی ہے۔ آؤ تمھیں بندوق چلانا

سکھادوں''۔

یہ ایک مضحکہ خیز تجویز تھی۔ کیسر ہنس کر بولی۔

''ہاں اور کیا۔ اب آج میں بندوق چلانا سیکھوں گی۔ تم کو جب دیکھو ہنسی ہی سوجھتی ہے''۔

سیٹھ جی نے کہا۔ ''اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔ آج کل تو عورتیں فوج میں بھرتی ہو رہی ہیں؛ سپاہیوں کی طرح عورتیں بھی قواعد کرتی ہیں۔ بندوق چلاتی ہیں''۔

کیسر نے اعتراض کیا۔ ''ولایت کی عورتیں چلاتی ہوں گی۔ یہاں کی عورتیں بھی کیا چلائیں گی۔ ہاں انگل بھر کی زبان چاہیے چلالیں۔''

سیٹھ جی نے اس فاسد خیال کی تصحیح کی۔ ''اب یہاں کی عورتیں بھی چلاتی ہیں۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ ہم تم دونوں بندوق لے کر کھڑے ہو جائیں گے تو پچاس آدمی بھی اندر گھسنے کی ہمت نہ کرسکیں گے۔ عورت کے ہاتھ میں بندوق توپ سے بھی زیادہ قاتل ہو جاتی ہے''۔

کیسر نے آخری فیصلہ کیا۔ ''نا بابا! میں تو چور کی آواز سنتے ہی چکر کھا کر گر پڑوں گی''۔

اس وقت چوکیدار نے آکر کہا۔ ''داروغہ جی نے کئی کانسٹبل بھیجے ہیں۔ وہ آپ کو بُلا رہے ہیں''۔

(2)

سیٹھ جی باہر آئے تو کانسٹبلوں نے انھیں ادب سے سلام کیا اور ان میں سے ایک نے کہا۔ ''ہمیں داروغہ جی نے آپ کے پاس یہ دریافت کرنے کو بھیجا ہے کہ آپ کے پاس دھمکی کی چٹھیاں تو نہیں آرہی ہیں۔ آج کل باہر سے ڈاکو اس علاقے میں آگئے ہیں اور لوٹ مار کی کئی وارداتیں ہو چکی ہیں''۔

سیٹھ جی نے کانسٹبلوں کو کرسیوں پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''داروغہ جی کو کیسے معلوم ہوگیا۔ میرے پاس تو ایسے کئی خط آچکے ہیں۔ ایک آج بھی آیا ہے۔ میں خود داروغہ جی کو اطلاع دینے آرہا تھا''۔

ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ''حضور یہ نہ پوچھیں کہ داروغہ جی کو کیسے معلوم ہو گیا۔ علاقے کے سب سے بڑے سیٹھ کے پاس ایسے خط آئیں اور پولیس کو خبر نہ ہو۔ بھلا کوئی بات ہے۔ حکام کی برابر تاکید ہوتی رہتی ہے کہ سیٹھ جی کو شکایت کا کوئی موقع نہ دیا جائے۔ حضور پانچ ہزار روپے سالانہ انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ ہمارے ہوتے مجال ہے کہ آپ کا بال بھی بیکا ہو جائے۔ آج داروغہ جی بڑی دیر تک اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہے۔ یہ ڈاکو اتنے دلیر اور تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ تھانے کے باہر ان سے مقابلہ کرنا دشوار ہے۔ داروغہ جی نے سوچا تھا گارڈ منگالیں گے۔ مگر ڈاکو کہیں ایک جگہ تو رہتے نہیں آج یہاں ہیں تو کل یہاں سے دو سو کوس پر پہنچ گئے۔ گارڈ منگا کر ہی کیا کر سکتے تھے۔ رعایا کی تو ہمیں فکر نہیں۔ کس کے پاس اتنا مال اسباب رکھا ہے کہ ڈاکوؤں کا اندیشہ ہو اور اگر کسی کے پاس دو چار سو روپے نکل ہی آئے تو اس کے لیے پولیس ڈاکوؤں کے پیچھے اپنی جان ہتھیلی پر لیے نہ پھرے گی۔ ڈاکوؤں پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ وہ تو بے دریغ گولی چلا دیتے ہیں اور اکثر چھپ کر۔ ہمارے لیے تو ہزار بندشیں اور قیدیں ہیں۔ کوئی بات بگڑ جائے تو الٹی اپنی جان آفت میں پھنس جائے۔ اس لیے داروغہ جی نے ہمیں یہ پیغام دے کر آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ آپ کو جس مال و اسباب کے بارے میں خطرہ ہو اُسے لاکر تھانے کے خزانے میں جمع کر دیجیے۔ آپ اپنی مہر لگا دیجیے گا۔ جب یہ ہنگامہ ٹھنڈا ہو جائے تو آپ اپنی چیزیں واپس لے لیجیے گا۔ اس کے لیے سرکار آپ سے کسی قسم کی فیس نہیں لینا چاہتی۔ محض آپ کی حفاظت کے خیال سے یہ تجویز کی گئی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ گورنمنٹ کے دفتر سے اس قسم کا کوئی حکم آیا ہے کہ جو لوگ ایک ہزار یا اس سے زیادہ ٹیکس دیتے ہوں ان کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے، ورنہ سخت جواب طلب کیا جائے گا۔ ورنہ آپ جانتے ہیں پولیس اتنا بڑا جوکھم کیوں اپنے سر لیتی۔ اس سے آپ کو بھی بے فکری ہو جائے گی اور ہم بھی ذمہ داری سے بچ جائیں گے۔ ورنہ خدانخواستہ کوئی واردات ہو جائے تو حضور کا جو نقصان ہو وہ تو ہو ہی، ہمارے اوپر بھی جواب دہی آجائے۔ یہ ڈاکو اتنے ظالم ہیں کہ محض مال و اسباب لے کر ہی جان نہیں چھوڑتے بلکہ خون بھی کر ڈالتے ہیں۔ اس لیے داروغہ جی نے بہت زور دے کر کہا ہے کہ آپ آج ہی خطرے والی چیزیں لے کر تھانے میں

تشریف لے آئیں اور انھیں خزانے میں داخل کر کے رسید لے لیں۔ مزید اطمینان کے لیے آپ چاہیں تو اپنا ایک آدمی بھی وہاں تعینات کر سکتے ہیں، حضور کے پاس موٹر تو ہے ہی ہم چار آدمی آپ کے ساتھ ہوں گے راستے میں کوئی خطرہ نہیں، تحقیقی خبر ملی ہے کہ ڈاکوؤں کا غول اس علاقے میں کل آگیا ہے۔ بیس آدمی ہیں اور سب کے سب مسلح۔ دو سادھو بنے ہوئے ہیں۔ دو پنجابیوں کے بھیس میں ہیں اور الوان اور دھسّے بیچتے پھرتے ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ دو بھنگی بردار بھی ہیں۔ دو ڈاکو بلوچیوں کے بھیس میں چھریاں اور تالے بیچتے ہیں اور کہاں تک گاؤں، ہمارے یہاں تو ان کا پورا حلیہ آگیا ہے"۔

خطرے میں انسان کا دل کمزور ہو جاتا ہے اور ایسی باتوں کا بھی یقین کر لیتا ہے جو شاید ہوش و حواس کی حالت میں وہ نہ کرتا۔ یہاں تو شبہے کا موقع ہی نہ تھا۔ ممکن ہے اس میں داروغہ جی کی کوئی غرض شامل ہو اور وہ اس خدمت کا کچھ صلہ بھی چاہتے ہوں۔ اس کے لیے سیٹھ جی تیار تھے کہ اگر دوچار سو روپے دینے پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسے واقعے تو زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔ موجودہ حالت میں اس سے بہتر کوئی انتظام خیال میں نہیں آتا تھا۔ بلکہ اسے امداد غیب سمجھنا چاہیے۔ انھیں کانسٹبلوں کو کچھ دے دلا کر ساری چیزیں نکلوالیں گے۔ دوسروں کا کیا بھروسہ، کہیں ڈاکوؤں سے مل جائیں تو غضب ہی ہو جائے۔ راستے ہی میں گھیر لیے جائیں۔ بیس کے مقابلے میں چار آدمی کر ہی کیا سکتے ہیں اور کون جانے کہ ڈاکوؤں کے پاس کار نہ ہوگی۔

پھر بھی اس انداز سے بولے گویا داروغہ جی نے ان پر کوئی خاص عنایت نہیں کی ہے۔ "یہ تو ان کا فرض ہی تھا۔ میں اس عنایت کے لیے داروغہ جی کا تہ دل سے مشکور ہوں۔ مگر میں نے یہاں ایسا انتظام کر لیا تھا کہ اگر ڈاکو یہاں آتے تو ان کے دانت کھٹے کر دیے جاتے۔ سارا محلّہ مقابلے کے لیے تیار تھا۔ سب ہی سے تو اپنا یارانہ ہے، مگر داروغہ جی کی تجویز مجھے پسند ہے۔ اس سے وہ بھی اپنی ذمہ داری سے بری ہو جاتے ہیں اور میرے سر سے بھی فکر کا بوجھ اتر جاتا ہے۔ جیسا آپ نے خود کہا۔ لیکن اندر سے چیزوں کو نکال نکال کر باہر لانا اور کار میں رکھنا میرے بوتے کی بات نہیں، آپ کی دُعا سے آدمی تو کافی ہیں مگر کس کی نیت کیسی ہے یہ کون جانتا ہے۔ آپ لوگ کچھ مدد کریں تو کام آسان ہو جائے۔ (مسکرا کر) آپ کی محنت رائیگاں نہ جائے گی"۔

کیسر نے اس تجویز کو لبیک کہا۔ کانسٹبلوں نے بھی اپنی خدمات خوشی سے پیش کیں۔ ہیڈ کانسٹبل نے کہا۔

''ہم حضور کے تابعدار ہیں۔ اس میں مدد کی کون سی بات ہے۔ تنخواہ سرکار سے ضرور پاتے ہیں مگر دیتے تو حضور ہی ہیں۔ آپ ضرور بتاتے جایئے۔ ہم لوگ آن کی آن میں سارا سامان نکال کر رکھ دیں گے''۔

کیسر نے خوش ہو کر کہا۔

''بھگوان نے مدد کر دی، نہیں میں تو بہت گھبرا رہی تھی۔ جان نکلی جاتی تھی''۔

سیٹھ جی نے ہمہ دانی کے انداز سے کہا۔ ''اسی کو کہتے ہیں سرکار کا انتظام! اسی مستعدی کی بدولت سرکاری راج تھما ہوا ہے۔ میں تو سوچتا ہوں کوئی قیمتی چیز یہاں نہ چھوڑی جائے تاکہ وہ آئیں تو اپنا سامنہ لے کر چلے جائیں''۔

کیسر نے جھک کر کہا۔ ''کنجی ان سبھوں کے سامنے پھینک دینا کہ جو چیز چاہو نکال لے جاؤ''۔

دو کانسٹبلوں نے اندر جاکر صندوقچے اور پٹارے نکالنے شروع کیے۔ ایک باہر سامان کار پر لاد رہا تھا اور ہیڈ کانسٹبل نوٹ بک پر ہر ایک چیز کا اندراج کررہا تھا۔ زیورات۔ اشرفیاں۔ نوٹ۔ بیش قیمت کپڑے۔ شال دوشالے نقرئی ظروف۔ سب کار میں رکھ دیے گئے۔ معمولی فرنیچر، برتن، فرش فروش اور غلّہ وغیرہ کے سوا گھر میں اور کچھ نہ بچا اور یہ چیزیں ڈاکوؤں کے لیے بے مصرف ہیں۔ کیسر کا سنگار دان سیٹھ جی خود لائے اور ہیڈ کانسٹبل کو دے کر بولے۔

''بھئی اسے بڑی حفاظت سے رکھنا''۔

ہیڈ کانسٹبل نے سنگار دان لے کر کہا۔

''میرے لیے ہر ایک تنکا اتنا ہی بیش قیمت ہے''۔

سیٹھ جی کے دل میں ایک شبہ پیدا ہوا۔ کہا۔

''اس فہرست کی ایک نقل مجھے بھی دے دیجیے گا''۔

ہیڈ کانسٹبل نے کہا۔ ''واہ آپ کو تھانے میں باضابطہ دی جائے گی''۔

''کیوں نہ یہیں دے دیجیے''؟

''یہاں لکھنے میں دیر ہوگی اور پھر جب تک داروغہ جی کے دستخط نہ ہوں۔ اس رسید کی وقعت ہی کیا؟ مگر آپ کے دل میں یہ شبہ کیوں پیدا ہوا''؟

سیٹھ جی نے نادم ہو کر کہا۔

''شبہ نہیں تھا۔ میں نے سمجھا ایک رسید میرے پاس بھی ہوتی تو اچھا تھا''۔

ہیڈ کانسٹبل نے بے رخی سے کہا۔ ''اگر آپ کے دل میں کسی قسم کا شبہ ہو تو آپ چیزیں اپنے گھر ہی میں رکھیں۔ ہم یہاں بھی آپ کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ مگر ہاں! اس حالت میں ذمہ داری آپ کی رہے گی''۔

''سیٹھ جی اور نادم ہوئے۔ ''نہیں نہیں صاحب! شبہے کی بات نہیں تھی۔ یوں ہی ایک خیال آگیا۔ آپ کہتے ہیں رسید تھانے میں مل جائے گی، میں بھی مانتا ہوں''۔

کار پر سارا سامان رکھ دیا گیا۔ محلے کے سیکڑوں آدمی تماشا دیکھ رہے تھے۔ کار بہت بڑی تھی، مگر بالکل بھر گئی۔ پانچ آدمیوں کے لیے بڑی مشکل سے جگہ نکلی۔ سیٹھ جی تو پیچھے والی جگہ پر بیٹھے۔ باقی چاروں آدمی اگلی سیٹ پر سمٹ کر بیٹھ گئے۔ کیسر دروازے پر اس انداز سے کھڑی تھی، گویا اس کی لڑکی رخصت ہو رہی ہو۔

(3)

پانچ میل کا سفر تھا۔ قصبے سے باہر نکلتے ہی پہاڑوں کی خاموش اور اودی بلندیاں نظر آئیں جن کے دامن میں ہرا بھرا سبزہ زار تھا اور اس میدان کے بیچ سے سُرخ بجری کی سڑک سیندور بھری مانگ کی طرح نکل گئی تھی۔ ایک میل جانے کے بعد ہیڈ کانسٹبل نے سیٹھ جی سے پوچھا۔

''یہ کہاں تک صحیح ہے سیٹھ جی کہ پچیس سال پہلے آپ یہاں بالکل خالی ہاتھ آئے تھے؟''

نانک چند تفاخر کے انداز سے بولے۔

''بالکل صحیح ہے خاں صاحب! میرے پاس کل تین روپے تھے۔ لٹیا ڈور کندھے پر تھی اور چھڑی ہاتھ میں۔ بس بھگوان کا بھروسہ تھا۔ بالکل تقدیر کا کھیل ہے۔ اور بھگوان کی مرضی چاہیے۔ آدمی کے بنتے بگڑتے دیر نہیں لگتی''۔

''میں نے سُنا ہے آپ دوسرے سیٹھ ساہوکاروں کی طرح بخیل نہیں ہیں''۔

''میرا اصول ہے کہ اصلی بچت وہی ہے جو آرام سے زندگی بسر کرنے کے بعد بچ رہے۔ جب بہت تھوڑی آمدنی تھی تب بھی میرا یہی اصول تھا''۔

''آخر یہ دولت آپ کو ملی کہاں سے؟''

''آڑھت، لین دین، رہن، بیع سب ہی کچھ تو ہے خاں صاحب! یہ سمجھ لیجیے کہ صبح سے آدھی رات تک سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ صرف کھانا کھانے اندر جاتا ہوں''۔

''آپ بجا فرماتے ہیں۔ محنت کے بغیر کسی کام میں کامیابی نہیں ہوتی۔ آپ کو اپنے ہاتھ سے بھی بہت سا کام کرنا پڑتا ہوگا''۔

''کچھ نہیں صاحب! نوکر چاکر سب کچھ کر لیتے ہیں۔ میں تو بیٹھا نگرانی کرتا ہوں''۔

''آپ نے کئی لاکھ پیدا کئے ہوں گے''۔

''دو سوا دو لاکھ کی جائداد ہے خاں صاحب! بیس ہزار کا تو مکان ہی کھڑا ہے۔ آج بیچوں تو پچاس ہزار سے کم نہ ملے''۔

''لیکن اصل سرمایہ وہی آپ کے تین روپے تھے''؟

''سرمایہ تو آدمی کی ساکھ ہے خاں صاحب! آج چاہوں تو کہیں سے لاکھوں کا مال منگا سکتا ہوں''۔

''آپ کی زندگی واقعی ہمارے لیے نمونہ ہے''۔

''اپ لوگوں کی دُعا سے اب تک تو آرام سے کٹ گئی ہے۔ آگے بھگوان جانے''۔

''اب تو اور بھی آرام سے کٹے گی کیوں کہ آپ کی ساکھ بہت بڑھ گئی ہے''۔

''اس میں کیا شک ہے خاں صاحب! اپنی ساکھ تو بنانے سے بنتی ہے''۔

یہ مال و اسباب اور جائداد آپ کے لیے فضول ہے۔ آپ اپنی ساکھ سے اپنا روزگار کر سکتے ہیں''۔

''بہت اچھی طرح خاں صاحب! یہ سب تو مایا جال ہے، جس میں پھنس جانے کے بعد پھر نجات نہیں ملتی۔ مر کر ہی گلا چھوٹتا ہے۔ اب دھرم شالہ بنوانے کا ارادہ ہے۔ سامان کر لیا ہے۔ کوئی اچھی مہورت دیکھ کر ہاتھ لگا دینا ہے۔ ایک لڑکا بھی گود لینا چاہتا

ہوں۔ بس پھر بھگوان کا بھجن کروں گا''۔

''آپ کے کوئی اولاد ہوتی ہی نہیں''؟

''تقدیر میں نہ تھی، خاں صاحب! اور کیا کہوں۔ جن کے گھر میں بھونی بھانگ نہیں ان کے ہاں تو گھاس پھوس کی طرح بچے نکلتے آتے ہیں۔ جنھیں بھگوان نے کھانے کو دیا ہے وہ اولاد کے لیے ترس ترس کر رہ جاتے ہیں''۔

''آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں، سیٹھ جی! آپ کی باتیں بڑی پر مغز ہوتی ہیں۔ اگر ہم آپ کو اس مایا جال سے چھڑا دیں تو یقیناً آپ ہمارے احسان مند ہوں گے''۔

سیٹھ جی ہنسے اور بولے۔ ''بھگوان کے سوا اس مایا جال سے کون چھڑا سکتا ہے، خاں صاحب!''

ہیڈ کانسٹبل نے سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا۔ ''بھگوان کیوں چھڑانے لگے۔ آپ خود کیوں نہیں چھوٹ جاتے۔ جس دولت سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں، اسے کیوں نہ غریبوں میں تقسیم کر دیجیے۔ بے فائدہ سینے پر بوجھ لادنے سے کیا مطلب''!

''بھلا ایسا کہیں ہو سکتا ہے خاں صاحب! مایا جال کہیں ٹوٹ سکتا ہے''؟

''میں تو توڑنے کو تیار ہوں اسی وقت''۔

اسی دولت کے لیے آدمی اپنا خون پسینہ ایک کر دیتا ہے۔ خاں صاحب! دغا، فریب، بے ایمانی اور ظلم سب کچھ اسی کے لیے کرتا ہے۔ بغیر اپنا ضمیر بیچے دولت نہیں ملتی۔ ایسی بیش قیمت چیز کون چھوڑ سکتا ہے''۔

''لیکن آپ نے فرمایا ہے کہ صرف آپ کے اقبال کا ظہور ہے۔ آپ نے کوئی خاص محنت نہیں کی''۔

''نگرانی میں کچھ کم محنت ہے خاں صاحب!''

''آپ دن بھر دھوپ میں ٹھیلہ کھینچنا پسند کریں گے یا گدی پر بیٹھے نگرانی کرنا''۔

''مگر سب آدمی سب ہی کام تو نہیں کر سکتے''۔

''آخر یہ روپیہ آپ کے پاس آیا کہاں سے؟ آپ نے کسی آسامی کو سو روپے قرض دیے یقیناً اس سے کچھ نہ کچھ سود لیا ہی ہوگا۔ کبھی کبھی تو سو کے دو سو، تین سو، چار سو تک وصول کیے ہوں گے۔ آپ کے روپے نے تو بچے دیے نہیں۔ آسامی کی محنت

کے روپے آپ کے ہاتھ لگے۔ بسا اوقات دو چار سو روپے قرض دے کر آپ نے پورے خاندان کو اپنا غلام بنالیا ہوگا۔ اور ان کی شبانہ روز کی مشقت کی کمائی آپ کے ہاتھ لگی ہوگی"۔

سیٹھ جی نے حیرت کی نگاہ سے۔ خاں صاحب کی طرف دیکھا۔ یہ تو کوئی بڑا عجیب آدمی ہے، خواہ مخواہ بحث کر رہا ہے۔ مانا میں نے دوسروں کی محنت سے ہی دولت پیدا کی تو پھر؟ جو سب کرتے ہیں وہی میں نے کیا۔ کوئی نئی بات نہیں کی۔ بولے۔

"اس طرح تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے سب ہی دولت مند مفت خور ہیں"۔

خاں صاحب نے اس کی تائید کی "بے شک، میں بڑے زور سے یہ دعویٰ کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ سب ہی سلطنتیں اسی ذیل میں آجاتی ہیں۔ فرق یہی ہے کہ آپ آسامیوں سے روپے وصول کر کے جمع رکھ چھوڑتے ہیں، سرکار اس سے ملک کا انتظام کرتی ہے۔ عدالتیں اور پولیس قائم کرتی ہے کہ آپ اور آپ کے بھائی بہ اطمینان غرباء کا خون چوس سکیں۔ اگر کوئی غریب سرکشی کرے اور آپ کی مدد کرے۔ دراصل آپ نے سو دیا نفع یا مال گزاری کی شکل میں جو کچھ بھی پایا ہے وہ غریبوں کی کمائی ہے جو آپ نے اُن سے جبراً چھین لی ہے۔ اور جو آپ ہی کے لفظوں میں آپ کے پاس بے کار پڑی ہوئی ہے۔ آپ کو مسروقہ مال گھر میں رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ ان چیزوں کو پولیس کے حوالے کرکے گھر کی راہ لیجیے۔ ہم سرکاری پولیس کے سپاہی نہیں، انصاف کی پولیس کے سپاہی ہیں۔ ہم نے متواتر خطوط سے آپ کو آگاہ کیا۔ یہاں تک کہا کہ آپ ہمیں صرف پچیس ہزار روپے دے دیجیے۔ لیکن آپ سرکاری امداد کے زعم میں بیٹھے رہے۔ مجبوراً ہمیں یہ چال چلنی پڑی"۔

سیٹھ جی کا خون خشک ہو گیا۔ لیکن نہیں یا یہ پولیس والے مجھے ڈرا رہے ہیں اور اب میری بزدلانہ بدحواسی کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔ بولے۔

"خاں صاحب! آپ بڑے دل لگی باز ہیں، لیکن سچ مچ ڈاکوؤں نے یہ چال چلی ہوتی تو اس وقت میں دھوکے میں آچکا ہوتا"۔

"تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ڈاکوؤں نے سچ مچ آپ کے ساتھ وہ چال چلی ہے اور آپ دھوکے میں آگئے ہیں۔ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں"۔

گاڑی رُک گئی۔ سیٹھ جی ڈھکیل کر نیچے گرا دیے گئے اور دروازہ بند کر لیا گیا۔ موٹر آہستہ آہستہ چلی۔ سیٹھ جی چلاتے ہوئے موٹر کے پیچھے دوڑے۔

''حضور، سرکار، بھائیو! بالکل تباہ ہو جاؤں گا۔ رحم کیجیے۔ میں خوشی سے آپ کو پچیس ہزار دے دوں گا۔ آپ نے کہا ہے آپ انصاف کی پولیس ہیں۔ یہ بے انصافی نہ کیجیے''۔

خاں صاحب نے دروازے سے سر نکال کر کہا۔

''کاش! یہ پچیس ہزار آپ نے پہلے دے دیے ہوتے۔ اب تو میعاد گزر گئی۔ اپنے کو کتنے خطرے میں ڈال کر ہم نے یہ دولت پائی ہے۔ اس کا خیال کیجیے، آپ کو ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوتیں اور بے بھاؤ کی پڑ رہی ہوتی۔ اب آپ آرام سے تشریف لے جائیے۔ یہ وہ تین روپے ہیں جو آپ ساتھ لے کر یہاں آئے تھے۔ اب جا کر پھر دولت جمع کیجیے۔ دس پانچ برس میں ہم پھر آپ کو مایا جال سے نکال لیں گے''۔

موٹر تیز ہو گئی اور سیٹھ جی چیختے رہ گئے۔

''دوڑو، دوڑو! ڈاکو مجھے لوٹے لیے جا رہے ہیں''۔

لیکن وہ ساری فریاد فریادِ صحرا تھی۔

(یہ افسانہ پہلی بار الٰہ آباد کے ہندی ماہنامہ 'چاند' کے نومبر 1934 کے شمارے میں شائع ہوا، عنوان تھا 'خدائی فوجدار'۔ 'مان سرووَر نمبر 2' میں شامل ہے۔ اردو میں یہ 'واردات' میں شامل ہے۔)

بڑے بھائی صاحب

(1)

میرے بھائی صاحب مجھ سے پانچ سال بڑے تھے۔ لیکن صرف تین درجے آگے۔ انھوں نے بھی اسی عمر میں پڑھنا شروع کیا تھا۔ جب میں نے شروع کیا۔ لیکن تعلیم جیسے اہم معاملہ میں وہ جلد بازی سے کام لینا پسند نہ کرتے تھے۔ اس عمارت کی بنیاد پختہ خوب مضبوط ڈالنا چاہتے تھے، ایک سال کا کام دو سال میں کرتے تھے تاکہ پختہ ہو جائے۔

میں چھوٹا تھا۔ وہ بڑے تھے، میری عمر نو سال تھی، وہ چودہ سال کے تھے، انھیں میری تنبیہ اور نگرانی کا پورا اور پیدائشی حق تھا۔ اور میری سعادت مندی اس میں تھی کہ ان کو حکم کے قانون سمجھوں۔

وہ بڑے محنتی واقع ہوئے تھے۔ ہر وقت کتاب کھولے بیٹھے رہتے، اور شاید دماغ کو آرام دینے کے لیے کبھی کاپی پر، کبھی کتاب کے حاشیوں پر چڑیوں، کتوں، بلیوں کی تصویریں بنایا کرتے۔ کبھی کبھی ایک ہی نام کو دس بیس بار لکھ جاتے، کبھی ایک شعر کو دس بیس بار خوشخط حروف میں نقل کرتے، کبھی ایسی عبارتیں لکھتے جن میں کوئی ربط ہوتا نہ کوئی معنی۔ مثلاً ایک بار ان کی کاپی میں میں نے عبارت دیکھی، اسپیشل، آئینہ، بھائیو، بھائیوں، دراصل بھائی بہن رادھے شیام، شری جت رادھے شیام، ایک گھنٹے تک، اس کے بعد ایک انسان کا چہرہ تھا، میں نے ہر چند کوشش کی اس عبارت میں کوئی معنی نکالوں، لیکن ناکام رہا۔ اور ان سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی، وہ نویں جماعت میں تھے، میں پانچویں جماعت میں، ان کی تحریر سمجھنا میرے لیے چھوٹا منہ بڑی بات تھی۔

میرا جی پڑھنے میں بالکل نہ لگتا، ایک گھنٹہ بھی کتاب لے کر بیٹھنا بارِ خاطر تھا، موقع پاتے ہی ہوسٹل سے نکل کر میدان میں آجاتا، اور کبھی کنکریاں اچھالتا، کبھی کاغذ کی

تیلیاں اڑاتا اور کہیں کوئی ساتھی مل گیا تو پوچھنا ہی کیا، کبھی چہار دیواری پر چڑھ کر نیچے کود رہے ہیں۔ کبھی پھاٹک پر سوار ہو کر موٹر کا لطف اٹھا رہے ہیں، لیکن کمرہ میں آتے ہی بھائی صاحب کی صورت دیکھ کر روح فنا ہو جاتی، اور سارا مزا کرکرا ہو جاتا۔ پہلا سوال ہوتا، کہاں تھے؟ اس کا جواب خاموشی کے سوا میرے پاس کچھ نہ ہوتا، نہ جانے میری زبان سے یہ بات کیوں نہ نکلتی کہ ذرا باہر کھیل رہا تھا۔ میری خاموشی اعتراف گناہ سمجھی جاتی۔ اور بھائی صاحب بزرگانہ محبت اور تندی سے ملے ہوئے لہجہ میں کہتے، اس طرح انگریزی پڑھو گے تو زندگی بھر پڑھتے رہو گے، اور ایک حرف نہ آئے گا۔ انگریزی پڑھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے کہ جو چاہے پڑھ لے، اس طرح انگریزی آتی تو سبھی پڑھ لیتے۔ یہاں رات دن آنکھیں پھوڑنی پڑتی ہیں، خون جلانا پڑتا ہے تب جا کر کہیں انگریزی آتی ہے، اور میں کہتا ہوں کہ تم کتنے کوڑ مغز ہو کہ مجھے دیکھ کر بھی سبق نہیں لیتے۔ میں کتنی محنت کرتا ہوں، یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو، اگر نہیں دیکھتے تو یہ تمھارا قصور ہے، تمھاری عقل کا قصور ہے۔ اتنے میلے تماشے ہوتے ہیں میں کبھی نہیں جاتا، روز کرکٹ اور ہاکی کے میچ ہوتے ہیں میں قریب نہیں پھٹکتا، ہمیشہ پڑھتا رہتا ہوں، اس پر بھی دو دو تین تین سال ایک درجہ میں پڑا رہتا ہوں، پھر تم کیسے اُمید کرتے ہو کہ تم یوں کھیل کود میں وقت گنوا کر پاس ہو جاؤ گے۔ مجھے دو ہی تین سال لگتے ہیں۔ تم ساری زندگی اسی درجے میں پڑے سڑتے رہو گے۔ اگر تمھیں اس طرح عمر گنوانی ہے تو بہتر ہے گھر چلے جاؤ اور مزے سے گلی ڈنڈا کھیلو، دادا کی گاڑھی کمائی کے روپے کیوں برباد کرتے ہو۔

میں یہ پھٹکار سن کر آنسو بہانے لگتا۔ جواب ہی کیا تھا۔ بھائی صاحب کو نصیحت کے فن میں کمال تھا۔ ایسی ایسی لگتی باتیں کہتے تھے کہ میرے جگر کے ٹکڑے ہو جاتے اور ہمت ٹوٹ جاتی، اس طرح جان توڑ کر محنت کرنے کی طاقت میں اپنے میں نہ پاتا، اور ذرا دیر کے لیے مجھ پر مایوسی آجاتی اور میں سوچتا کیوں نہ گھر چلا جاؤں، جو کام میرے بوتے کے باہر ہے، اس میں ہاتھ ڈال کر کیوں اپنی زندگی خراب کروں۔ اس کے ساتھ ہی آئندہ سے خوب جی لگا کر پڑھنے کا ارادہ کرتا، ٹائم ٹیبل بناتا، صبح اٹھنا، منہ دھو کر ناشتہ کرتا، پھر انگریزی مطالعہ سات سے آٹھ تک، حساب آٹھ سے نو تک، تاریخ نو سے

ساڑے نو تک، کھانا کھا کر اسکول جانا، ساڑھے تین بجے اسکول سے واپس آدھ گھنٹے تک آرام، پانچ تک جغرافیہ اور نقشہ، پانچ سے چھ تک گرائمر، آدھ گھنٹہ آرام، چھ سے ساڑھے سات تک انگریزی کمپوزیشن، پھر کھانا کھا کر آٹھ سے نو تک انگریزی، نو سے دس تک اُردو، دس سے گیارہ تک متفرق مضامین۔

مگر ٹائم ٹیبل بنا لینا ایک بات تھی، اس پر عمل کرنا دوسری بات، پہلے ہی دن سے اس کی خلاف ورزی شروع ہو جاتی، میدان کی وہ فرحت انگیز ہوا، وہ دلا ویز ہریالی، وہ پر لطف آزادی مجھے اضطراری طور پر کھینچ لے جاتی، اور بھائی صاحب کو نصیحت اور فضیحت کرنے کا موقع مل جاتا، میں ان کے سایہ سے بھاگتا۔ ان کی نگاہوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا، کمرہ میں اس طرح دبے پاؤں آتا کہ انھیں خبر نہ ہو، ان کی نظر میری جانب اٹھی اور میری روح فنا ہوئی، ہمیشہ سر پر ایک برہنہ شمشیر سی لٹکتی معلوم ہوتی، کتابوں سے نفرت سی ہوتی جاتی تھی۔

(2)

سالانہ امتحان ہوا، بھائی صاحب فیل ہوگئے، میں پاس ہو گیا، اور درجہ میں اوّل آیا میرے اور ان کے درمیان صرف دو درجوں کا تفاوت ہوگیا، جی میں آیا، بھائی صاحب کو آڑے ہاتھ لوں۔ آپ کی وہ شبانہ روز کی دیدہ ریزی کہاں گئی، مجھے دیکھیے مزے سے کھیلتا بھی رہا اور درجہ میں اّوّل ہوں، لیکن وہ اس قدر پژ مردہ شکستہ خاطر تھے کہ مجھے اُن سے دلی ہمدردی ہوئی، اور ان کے زخم پر نمک چھڑکنے کا خیال ہی شرمناک معلوم ہوا، ہاں اب مجھے خود پر کچھ اعتماد پیدا ہوا، اور بھائی صاحب کا وہ رعب مجھ پر نہ رہا، آزادی سے کھیل کود میں شریک ہونے لگا۔ دل مضبوط تھا۔ اگر انھوں نے پھر نصیحت کی تو صاف کہہ دوں گا آپ نے اپنا خون جلا کر کون سا تیر مار لیا۔ میں تو کھیلتے کودتے درجہ میں اوّل آگیا۔ زبان سے یہ ہیکڑی جتانے کی ہمّت نہ ہونے پر بھی میری بشرے اور انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میں بھائی صاحب سے اتنا مرعوب نہیں ہوں۔ بھائی صاحب نے اسے بھانپ لیا اور ایک روز جب میں صبح کا سارا وقت گلّی ڈنڈے کی نذر کرکے ٹھیک کھانے کے وقت لوٹا تو بھائی صاحب نے گویا میان سے تلوار کھینچ لی اور مجھ

پر ٹوٹ پڑے۔ دیکھتا ہوں امسال پاس ہوگئے اور درجہ اوّل میں آگئے تو اب تمھیں دماغ ہوگیا ہے۔ مگر بھائی جان گھمنڈ تو بڑے بڑوں کا نہیں رہا، تمھاری کیا ہستی ہے۔ تاریخ میں راون کا حال توپڑھا ہی ہوگا۔ اس کی زندگی سے تم نے آخر کیا نتیجہ نکالا۔ یوں ہی بڑھ گئے۔ محض امتحان پاس کر لینا تو کوئی بڑی چیز نہیں، اصل چیز ہے تاریخ سے سبق حاصل کرنا۔ راون ساری دنیا کا مہاراجہ تھا۔ ایسے راجوں کو چکرورتی کہتے ہیں۔ آج کل انگریزوں کا راج بہت وسیع ہے۔ مگر انھیں چکرورتی راجہ نہیں کہہ سکتے۔ راون چکرورتی راجہ تھا۔ بڑے بڑے دیوتا اس کی غلامی کرتے تھے، آگ اور پانی کے دیوتا بھی اس کے غلام تھے، مگر اس کا انجام کیا ہوا۔ غرور نے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا، کوئی اسے ایک چلو پانی دینے والا تک نہ بچا، انسان اور چاہے جو بُرائی کرے غرور کیا اور دین و دنیا سے گیا۔ ابلیس کا حال بھی پڑھا ہوگا۔ اسے بھی غرور ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنت سے دوزخ میں ڈھکیل دیا گیا۔ شاہ روم نے بھی ایک بار غرور کیا تھا۔ بھیک مانگ کر مر گیا۔ تم نے ابھی صرف ایک درجہ پاس کیا، اور ابھی سے تمھارا سر پھر گیا، تب تو تم آگے بڑھ چکے، یہ سمجھ لو کہ تم اپنی محنت سے نہیں پاس ہوئے، اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی۔ مگر بٹیر صرف ایک بار ہاتھ لگ سکتی ہے، بار بار نہیں لگ سکتی۔ کبھی کبھی گلی ڈنڈے میں بھی اندھے کا چوٹ نشانہ پڑ جاتا ہے۔ اس سے کوئی کامیاب کھلاڑی نہیں ہو جاتا۔ کامیاب کھلاڑی وہ ہے جس کا کوئی نشانہ خالی نہ جائے۔ میرے فیل ہونے پر مت جاؤ۔ میرے درجے میں آؤ گے تو دانتوں پسینہ آجائے گا۔ جب الجبرا اور جامیٹری کے لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے اور انگلستان کی تاریخ پڑھنی پڑے گی۔ بادشاہوں کے نام یاد رکھنا آسان نہیں، آٹھ آٹھ ہنری ہوکر گزرے ہیں، کون سا واقعہ کس ہنری کے زمانہ میں ہوا، کیا اسے یاد رکھنا آسان سمجھتے ہو۔ ہنری ساتویں کی جگہ ہنری آٹھویں لکھا اور سب نمبر غائب، صفر بھی نہ ملے گا، صفر بھی! ہو کس خیال میں، درجنوں تو جیمس ہوئے ہیں اور درجنوں ولیم، کوڑیوں چارلس، دماغ چکر کھانے لگتا ہے، ان کم بختوں کو نام بھی نہ جڑتے تھے۔ ایک ہی نام کے پیچھے دوم، سوم، چہارم، پنجم لگاتے چلے گئے اور جامیٹری تو بس خدا کی پناہ! اب ج کی جگہ اج ب لکھ دیا اور سارے نمبر کٹ گئے۔ کوئی ان بے رحم ممتحنوں سے نہیں پوچھتا کہ آخر اب ج اور اج ب میں کیا فرق ہے اور کیوں اس مہمل بات کے

لیے طالب علموں کا خون کرتے ہو؟ دال بھات روٹی اور دال روٹی بھات میں کون سا فرق ہے۔ مگر ممتحنوں کو کیا پرواہ۔ وہ تو وہی دیکھتے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے۔ چاہتے ہیں کہ سب لڑکے رٹو ہو جائیں۔ اسی رٹ کا نام تعلیم رکھ چھوڑا ہے اور آخر ایسی بے سر پیر کی باتیں پڑھانے سے فائدہ ہی کیا، اس خطہ پر دو عموداً گرا دو تو قاعدہ عمود سے دوگنا ہوگا۔ پوچھئے اس سے کیا مطلب؟ دوگنا نہیں چوگنا ہوجائے، آٹھ گنا ہو جائے میری بلا سے، لیکن پڑھنا ہے تو یہ ساری باتیں یاد رکھنی پڑیں گی۔ انگریزی مضامین لکھتے پڑھتے ہیں، کہہ دیا۔ ''وقت کی پابندی'' پر ایک مضمون لکھو جو چار صفحے سے کم نہ ہو، اب کاپی کھولے ہوئے اس کے نام کو روئیے۔ کون نہیں جانتا کہ وقت کی پابندی اچھی بات ہے، لیکن اس پر چار صفحے کیسے لکھئے؟ جو بات ایک جملے میں کہی جاسکے، اس کے لیے چار صفحے لکھنے کی کیا ضرورت۔ میں تو اسے حماقت کہتا ہوں مگر نہیں آپ کو چار صفحے لکھنے پڑیں گے، چاہے جیسے لکھیے اور صفحے بھی پورے فلسکیپ سائز کے، یہ لڑکوں پر ستم ناروا نہیں ہے تو کیا ہے؟ ظالم اس پر بھی یہ کہے جاتے ہیں کہ اختصار سے کام لو۔ تیز بھی دوڑیئے اور آہستہ آہستہ بھی، ہے متضاد یا نہیں۔ بچہ بھی سمجھ سکتا ہے، لیکن ان ماسٹروں کو اتنی بھی تمیز نہیں، اس پر دعویٰ ہے کہ ہم ماسٹر ہیں میرے درجہ آؤ گے تو یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے اور تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ اس درجہ میں اوّل آگئے ہو تو اتنا اتراتے ہو، میرا کہنا مانیے، لاکھ فیل ہو گیا، لیکن تم سے بڑا ہوں۔ دنیا کا تم سے زیادہ تجربہ حاصل کیا ہے۔ میرا کہنا مانو۔ جو کچھ کہتا ہوں اسے گرہ سے باندھو، ورنہ پچھتاؤ گے۔

اسکول کا وقت قریب تھا، ورنہ خدا جانے یہ نصیحت کب ختم ہوئی، مجھے آج کا کھانا بالکل بے مزہ معلوم ہوا۔ جب پاس ہو جانے پر یہ لتاڑ پڑتی ہے، تو کہیں فیل ہو جاؤں تو یہ حضرت زندہ ہی نہ چھوڑیں گے۔ انھوں نے اپنے درجہ کی پڑھائی کی جو ہیبتناک تصویر کھینچی اس نے مجھے سچ مچ لرزا دیا، کیسے اسکول چھوڑ کر گھر نہیں بھاگا، یہی تعجب ہے، لیکن یہ سب درگت ہونے پر بھی کتابوں سے میری بیزاری بدستور قائم رہی۔ کھیل کود کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ پڑھتا بھی تھا، مگر بہت کم، بس اتنا کہ روز کا کام ختم ہو جائے اور درجہ میں ذلیل نہ ہونا پڑے۔ اپنے اوپر جو اعتماد پیدا ہوا تھا وہ پھر فنا ہو گیا اور پھر چوروں کی سی زندگی بسر ہونے لگی۔

(3)

پھر سالانہ امتحان ہوا، اور کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ میں پھر پاس ہو گیا اور بیچارے بھائی صاحب پھر فیل ہو گئے۔ میں نے محنت زیادہ نہیں کی، مگر خدا جانے کیسے درجہ میں اوّل آ گیا۔ مجھے خود تعجب ہوا۔ بھائی صاحب نے حیرت انگیز محنت کی تھی، دس بجے رات تک، اِدھر چار بجے صبح سے، پھر اُدھر چھ بجے سے ساڑھے نو تک، اسکول جانے کے قبل، چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ مگر فیل، مجھے ان پر رحم آتا تھا۔ نتیجہ سنایا گیا تو رو پڑے اور میں بھی رونے لگا۔

میرے اور بھائی صاحب کے درمیان اب صرف ایک درجہ کا تفاوت رہ گیا تھا۔ میرے دل میں ایک بیہودہ خیال یہ پیدا ہوا کہ کہیں بھائی صاحب ایک سال اور فیل ہو جائیں تو میں ان کے برابر ہو جاؤں، پھر کس بنا پر میری نصیحت کر سکیں گے۔ لیکن میں نے اس خیال کو دل سے فوراً نکال دیا، آخر وہ مجھے ڈانٹتے ہیں تو میری بھلائی کے لیے، مجھے اس وقت ناگوار لگتا ہے، ضرور مگر شاید ان کی تنبیہ کا ہی اثر ہو کہ میں یوں دنا دن پاس ہوتا جاؤں اور اتنے اچھے نمبروں سے۔

اب کے بھائی صاحب کچھ نرم پڑ گئے تھے، کئی بار مجھے ڈانٹنے کا موقع پا کر بھی انھوں نے تحمل سے کام لیا، شاید اب انھیں خود محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ مجاز اب انھیں نہیں رہا، یا رہا تو بہت کم۔ میری بدمعاشی بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ میں ان کے تحمل کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگا۔ مجھے ایسا گمان ہوا کہ میں تو پاس ہو ہی جاؤں گا، پڑھوں یا نہ پڑھوں، میری تقدیر اچھی ہے۔ اس لیے بھائی صاحب کے خوف سے جو تھوڑی بہت کتابیں دیکھ لیا کرتا تھا، وہ بھی جاتا رہا۔ مجھے کنکوے اڑانے کا نیا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اور اب زیادہ تر کیا بلکہ سارا وقت اسی مشغلہ کی نذر ہوتا تھا۔ پھر بھی میں بھائی صاحب کا ادب کرتا تھا۔ اور ان کی نظر بچا کر کنکوے اڑاتا تھا، ساری جزئیات در پردہ عمل میں آتی تھیں، میں انھیں یہ گمان کرنے کا موقع نہ دینا چاہتا تھا کہ بھائی صاحب کی وقعت اور عزّت میری نظروں میں کچھ کم ہو گئی ہے۔

ایک روز شام کے وقت ہاسٹل سے دور میں ایک کنکوا لوٹنے دوڑا جا رہا تھا کہ

بھائی صاحب سے میری مڈبھیڑ ہو گئی، شاید وہ بازار سے لوٹ رہے تھے۔ انھوں نے وہیں میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور مجھے حقارت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولے، ان بازاری لونڈوں کے ساتھ دھیلے کے کنکوے کے لیے دوڑتے تمھیں شرم نہیں آتی، تمھیں اس کا بھی کچھ لحاظ نہیں کہ اب نیچی جماعتوں میں نہیں ہو، بلکہ آٹھویں جماعت میں آگئے ہو، اور مجھ سے صرف ایک درجہ پیچھے ہو، آخر کچھ تو اپنی پوزیشن کا خیال کرنا چاہیے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ آٹھواں درجہ پاس کر کے تحصیلدار ہو جاتے تھے، میں کتنے ہی مڈلچیوں کو جانتا ہوں جو آج اوّل درجہ کے ڈپٹی کلکٹر یا سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ کتنے ہی ہمارے لیڈر ہیں۔ بی.اے. اور ایم.اے. والے ان کے ماتحت اور ان کے پیروں ہیں۔ اور تم اسی آٹھویں درجہ میں آکر بازاری لونڈوں کے ساتھ کنکوے کے لیے دوڑتے ہو۔ افسوس ہے تمھاری اس ناعقلی پر، تم ذہین ہو اس میں شک نہیں، لیکن وہ ذہن کس کام کی جس سے آدمی اپنا وقار کھو بیٹھے۔ تم اپنے دل میں سمجھتے ہوگے میں ان سے محض ایک درجہ پیچھے ہوں، اور اب انھیں مجھ کو کچھ کہنے کا حق نہیں ہے۔ میں تمھارے اس خیال کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں۔ اور چاہے آج تم میری ہی جماعت میں آجاؤ، اور ممتحنوں کا یہی حال ہے تو یقیناً اگلے سال میرے ہم جماعت ہو جاؤ گے اور شاید ایک سال بعد مجھ سے آگے نکل جاؤ لیکن مجھ میں اور تم میں جو پانچ سال کا تفاوت ہے، اسے تم کیا خدا بھی نہیں مٹا سکتا۔ میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں، اور ہمیشہ بڑا رہوں گا، مجھے دنیا اور زندگی کا جو تجربہ ہے تم اس کے برابر کبھی نہیں آسکو گے، چاہے تم ایم. اے. اور ایل. ایل. ڈی. ہی کیوں نہ ہو جاؤ۔ عقل کتابیں پڑھ لینے ہی سے نہیں آتی۔ ہماری اماں نے کوئی درجہ پاس نہیں کیا اور دادا بھی شاید پانچویں چھٹی جماعت سے آگے نہیں گئے لیکن ہم دونوں آج ساری دنیا کا علم کیوں نہ پڑھ لیں اماں اور دادا کو ہمیں تنبیہ کرنے کا ہمیشہ اختیار رہے گا۔ محض اس لیے نہیں کہ وہ بزرگ ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ہم سے زیادہ تجربہ کار ہیں اور رہیں گے۔ امریکہ میں کس طرح کی حکومت ہے؟ اور ہنری ہشتم نے کتنی شادیاں کیں اور آسمان میں کتنے ستارے ہیں، یہ باتیں انھیں نہ معلوم ہوں، لیکن تمھاری جگہ دادا ہوں گے تو کسی کو تار نہ دیں گے بلکہ پہلے خود مرض پہچانیں گے اور خود علاج کریں گے اور اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو کسی ڈاکٹر کو بلائیں گے،

گھبرائیں گے نہیں، بدحواس نہ ہوں گے۔ ہمارے خرچ کے لیے وہ جو کچھ بھیجتے ہیں اسے ہم بیس بائیس تاریخ تک خرچ کر کے پیسے پیسے کو محتاج ہو جاتے ہیں، ناشتہ بند کر دیتے ہیں، دھوبی اور نائی سے منہ چراتے ہیں۔ لیکن جتنا آج ہم اور تم خرچ کر رہے ہیں اس کے نصف میں دادا نے اپنی زندگی کا بڑا حصّہ عزت اور نیک نامی کے ساتھ بسر کیا ہے۔ اور ایک کنبہ کی پرورش کی ہے جس میں سب ملا کر نو آدمی تھے۔ یہ غرور دل سے نکال ڈالو کہ تم قریب آگئے اور اب خود مختار ہو۔ میرے دیکھتے تم کبھی اپنی زندگی برباد نہ کرنے پاؤ گے۔ میں جانتا ہوں تمھیں میری بات زہر لگ رہی ہے۔

میں نے ان کی بزرگی کا احساس کرتے ہوتے اپنی ناسعادت مندی پر نادم ہو کر باچشم نم کہا ''ہرگز نہیں۔ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ معقول ہے۔ اور آپ کو اس کے کہنے کا حق ہے۔''

بھائی صاحب نے مجھے شفقت کی نظروں سے دیکھا اور مجھے گلے لگا لیا۔ اور بولے ''میں کنکوے اڑانے کو منع نہیں کرتا، میرا جی بھی کبھی کبھی کنکوے اڑانے کو للچاتا ہے۔ کروں گا خود بے رہ چلوں گا تو تمھیں ہدایت کیسے کروں، یہ فرض تو میرے سر پر ہے''۔

اتفاق سے اسی وقت ایک کنکوا ہمارے اوپر سے گزرا، اس کی ڈور لٹک رہی تھی بھائی صاحب لمبے تھے، اُچھل کر اس کی ڈور پکڑ لی. اور اسے لیے ہوئے ہوسٹل کی طرف دوڑے، میں پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

(یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ 'ہنس' کے نومبر 1934 کے شمارے میں شائع ہوا۔ 'مان سروور نمبر 2' میں شامل ہے۔ اردو میں 'زادِ راہ' میں شامل ہے۔)

سوانگ

راجپوت خاندان میں پیدا ہو جانے ہی سے کوئی سورما نہیں بن جاتا۔ اور نہ نام کے پیچھے 'سنگھ' کی دُم لگا دینے ہی سے بہادری آتی ہے۔ گجندر سنگھ کے بزرگ کسی زمانہ میں راجپوت تھے۔ اس میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن ادھر تین پشتوں سے تو نام کے سوا ان میں راجپوتی کے کوئی علامت نہ تھی۔ گجندر سنگھ کے جد بزرگوار وکیل تھے اور جرح یا بحث میں کبھی کبھی راجپوتی کا مظاہرہ کر جاتے تھے۔ پدر بزرگوار نے کپڑے کی دکان کھول کر اس مظاہرے کی بھی گنجائش نہ رکھی۔ اور گجندر سنگھ نے تو لٹیا ہی ڈبودی۔ قدو قامت میں بھی فرق آتا گیا۔ بھوپندر سنگھ کا سینہ فراخ تھا۔ نریندر سنگھ کا شکم فراخ تھا۔ لیکن گجندر کا کچھ بھی فراخ نہ تھا۔ وہ ہلکے پھلکے، گورے چٹے، عینک باز، ناز بدن، فیشنیبل بابو تھے۔ انھیں علمی مشاغل سے خاص دلچسپی تھی۔

مگر راجپوت کیسا ہی ہو، اس کی شادی تو راجپوت خاندان ہی میں ہوگی۔ گجندر کی شادی جس خاندان میں ہوئی تھی اس میں راجپوتی جوہر بالکل فنا نہ ہوا تھا۔ ان کے خسر پنشنر صوبہ دار تھے۔ سالے شکاری اور کشتی باز۔ شادی ہوئے دو سال ہوگئے تھے۔ لیکن ابھی تک ایک بار بھی سسرال نہ آسکا تھا۔ امتحانات سے فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ لیکن اب تعلیم ختم ہو چکی تھی، ملازمت کی تلاش تھی۔ اس لیے اب کی ہولی کے موقع پر سسرال سے بلاوا آیا تو اس نے کوئی حیلہ حجت نہ کی۔ صوبے دار کی بڑے بڑے افسروں سے شناسائی تھی۔ فوجی افسروں کی حکام کتنی قدر و منزلت کرتے ہیں یہ اسے خوب معلوم تھا۔ سمجھا ممکن ہے صوبہ دار صاحب کی سفارش سے نائب تحصیلداری میں نام زد ہو جائے۔ شیام دلاری سے بھی سال بھر سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ ایک نشانہ سے دو شکار ہو رہے تھے۔ نیا دیشی کوٹ بنوایا اور ہولی کے ایک دن پہلے سسرال جا پہنچا۔ اپنے گرانڈیل سالوں کے سامنے بچہ معلوم ہوتا تھا۔

تیسرے پہر کا وقت تھا۔ گجندر سنگھ اپنے سالوں سے زمانہ طالب علمی کے کارنامے بیان کر رہا تھا۔ فٹ بال میں کس طرح ایک دیو قامت گورے کو ٹنگنی دی۔ ہاکی میچ میں کس طرح تنہا گول کر لیا، کہ صوبہ دار صاحب دیو کی طرح آکر کھڑے ہو گئے اور بڑے لڑکے سے بولے۔ ارے سنو، تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ بابو جی شہر سے آئے ہیں۔ انھیں لے جا کر ذرا جنگل کی سیر کرا لاؤ۔ کچھ شکار وِکار کھلاؤ۔ یہاں ٹھیٹر وتھیٹر تو ہے نہیں۔ ان کا جی گھبراتا ہوگا۔ وقت بھی اچھا ہے۔ شام تک لوٹ آؤ گے۔

شکار کا نام سنتے ہی گجندر سنگھ کی نانی مر گئی۔ بے چارے نے عمر بھر کبھی شکار نہ کھیلا تھا۔ یہ دیہاتی اُجڈ لونڈے اسے نہ جانے کہاں کہاں دوڑائیں گے۔ کہیں کسی جانور کا سامنا ہو گیا تو کہیں کے نہ رہے۔ کون جانے ہرن ہی چوٹ کر بیٹھے۔ ہرن بھی تو راہ فرار نہ پا کر کبھی کبھی پلٹ پڑتا ہے۔ کہیں بھیڑیا نکل آئے تو کام تمام ہی کر دے۔ بولے۔ میرا تو اس وقت شکار کھیلنے کو جی نہیں چاہتا۔ بہت تھک گیا ہوں۔

صوبہ دار صاحب نے فرمایا۔ تم گھوڑے پر سوار ہو لینا۔ یہی تو دیہات کی بہار ہے۔ چنو جا کر بندوق لا۔ میں بھی چلوں۔ کئی دن سے باہر نہیں نکلا۔ میرا رائفل بھی لیتے آنا۔

چنو اور منو خوش خوش بندوق لینے دوڑے۔ ادھر گجندر کی جان سوکھنے لگی۔ پچھتا رہا تھا کہ ناحق ان لونڈوں کے ساتھ گپ شپ کرنے لگا۔ جتنا کہ یہ بلا سر پر آنے والی ہے تو آتے ہی فوراً بیمار بن کر چارپائی پر پڑ رہتا۔ اب تو کوئی حیلہ بھی نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑی مصیبت گھوڑے کی سواری دیہاتی گھوڑے یوں ہی تھان پر بندھے ٹرے ہو جاتے ہیں۔ اور آسن کا کچا سوار دیکھ کر تو وہ اور بھی شوخیاں کرنے لگتے ہیں۔ کہیں الف ہو گیا یا مجھے لے کر کسی نالے کی طرف بے تحاشا بھاگا تو خیریت نہیں۔

دونوں سالے بندوقیں لے کر آپہونچے۔ گھوڑا بھی کھینچ کر آ گیا۔ صوبہ دار صاحب شکاری کپڑے پہن کر تیار ہو گئے۔ اب گجندر کے لیے کوئی حیلہ نہ رہا۔ اس نے گھوڑے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ بار بار زمین پر پیر پٹکتا تھا، ہنہناتا تھا۔ اٹھتی ہوئی گردن، لال لال آنکھیں، کنوتیاں کھڑی۔ بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ گجندر دل میں سہم اٹھا۔ مگر بہادری دکھانے کے لیے گھوڑے کے پاس جا کر

اس کی گردن پر اس طرح تھپکیاں دیں گویا پکا شہسوار ہے۔ اور بولا۔ جانور تو جان دار ہے۔ مگر مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آپ لوگ تو پیدل چلیں اور میں گھوڑے پر بیٹھوں۔ ایسا کچھ بہت تھکا نہیں ہوں۔ میں بھی پیدل ہی چلوں گا۔ اس کی مجھے مشق ہے۔

صوبہ دار نے کہا۔ بیٹا جنگل دور ہے۔ تھک جاؤ گے۔ بڑا سیدھا جانور ہے۔ بچہ بھی سوار ہو سکتا ہے۔

گجندر نے کہا۔ جی نہیں۔ مجھے بھی یوں ہی چلنے دیجیے۔ گپ شپ کرتے ہوئے چلے چلیں گے۔ سواری میں وہ لطف کہاں۔ آپ بزرگ ہیں۔ سوار ہو جائیں۔

چاروں آدمی پیادہ چلے۔ لوگوں پر گجندر کے اس انکسار کا بہت اچھا اثر ہوا۔ تہذیب اور اخلاق تو شہر والے ہی جانتے ہیں۔ اس پر علم کی برکت!

تھوڑی دور کے بعد پتھریلا راستہ ملا۔ ایک طرف ہرا بھرا میدان، دوسری طرف پہاڑ کا سلسلہ دونوں طرف ہی ببول، کریل، کروندے اور ڈھاک کے جنگل تھے۔ صوبے دار صاحب اپنی فوجی زندگی کے پامال تھے کہتے چلے آتے تھے۔ گجندر تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن بار بار پچھڑ جاتا تھا۔ اور اسے دو چار قدم دوڑ کر ان کے برابر ہونا پڑتا تھا۔ پسینے سے تر، ہانپتا ہوا، اپنی حماقت پر پچھتاتا، چلا جاتا تھا، یہاں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ شیام دلاری مہینے دو مہینے میں جاتی ہی۔ مجھے اس وقت کتوں کی طرح دوڑے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ابھی سے یہ حال ہے۔ شکار نظر آ گیا تو نہ معلوم کیا آفت آئے گی۔ میل دو میل کی دوڑ تو ان کے لیے معمولی بات ہے۔ مگر یہاں تو کچومر نکل جائے گا۔ شاید بیہوش ہو کر گر پڑا۔ پیر ابھی سے من من بھر کے ہو رہے ہیں۔

یکا یک راستے میں سیمل کا ایک درخت نظر آیا۔ نیچے نیچے لال لال پھول بچھے ہوئے تھے۔ اوپر درخت گلنار ہو رہا تھا۔ گجندر وہیں کھڑا ہو گیا اور اس لالہ زار کو مستانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

چنو نے پوچھا۔ کیا ہے جیجا جی۔ رک کیسے گئے؟

گجندر سنگھ نے عاشقانہ وارفتگی سے کہا۔ کچھ نہیں، اس درخت کا حسن دلآویز دیکھ کر دل باغ باغ ہوا جا رہا ہے۔ اہا! کیا بہار ہے، کیا رونق ہے، کیا شان ہے، گویا جنگل کی دیوی نے شفق کو شرمندہ کرنے کے لیے زعفرانی جوڑا زیب تن کیا ہو، یا رشیوں کی پاک

روحیں سفر جا وداں میں یہاں آرام کر رہی ہوں، یا قدرت کا نغمہ شیریں شکل پذیر ہو کر دنیا پر موہنی منتر ڈال رہا ہو۔ آپ لوگ شکار کھیلنے چلیے مجھے اس آبِ حیات سے شاد کام ہونے دیجیے۔

دونوں نوجوان فرطِ حیرت سے گجندر کا منھ تاکنے لگے۔ ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ یہ حضرت کہہ کیا رہے ہیں۔ دیہات کے رہنے والے جنگلوں میں گھومنے والے، سیمل ان کے لیے کوئی انوکھی چیز نہ تھی۔ اسے روز دیکھتے تھے، کتنی ہی بار اس پر چڑھتے تھے۔ اس کے نیچے دوڑتے تھے۔ اس کے پھووں کے گیند جا کر کھیلتے تھے۔ ان پر یہ مستی کبھی نہ طاری ہوئی تھی۔ حسن پرستی وہ کیا جانیں!

صوبہ دار صاحب آگے بڑھ گئے تھے۔ ان لوگوں کو ٹھہرا ہوا دیکھ کر لوٹ آئے اور بولے۔ کیوں بیٹا، ٹھہر کیوں گئے۔

گجندر نے دست بستہ گزارش کی۔ آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں۔ میں شکار کھیلنے نہ جا سکوں گا۔ اس گلزار کو دیکھ کر مجھ پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ میری روح نغمہ جنت کا مزہ لے رہی ہے۔ آہا! یہ میرا ہی دل ہے جو پھول بن کر چمک رہا ہے، مجھ میں وہی سرخی ہے، وہی حسن ہے، وہی لطافت ہے، میرے دل پر صرف اگیان کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ کس کا شکار کریں یا جنگل کے معصوم جانوروں کا۔ ہمیں تو جانور ہیں، ہمیں تو پرند ہیں، یہ ہمارے تصورات کا آئینہ ہے جس میں عالم اجسام کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ کیا اپنا ہی خون کریں! نہیں۔ آپ لوگ شکار کھیلنے جائیں۔ مجھے اس مستی و بہار میں محو ہونے دیں۔ بلکہ میں تو عرض کروں گا کہ آپ بھی شکار سے باز آئیں۔ زندگی مسرت کا خزانہ ہے۔ اس کا خون نہ کیجیے۔ نظارہائے قدرت سے چشم باطن کو سرور کیجیے۔ قدرت کے ایک ایک ذرے میں، ایک ایک پھول میں، ایک ایک ہستی میں مسرت کی شعائیں چمک رہی ہیں۔ خون ریزوں سے مسرت کے اس لازوال چشمے کو ناپاک نہ کیجیے۔

اس تصوف آمیز تقریر نے سبھی کو متاثر کر دیا۔ صوبہ دار صاحب نے چنو سے آہستہ سے کہا۔ عمر تو کچھ نہیں ہے لیکن کتنا گیان بھرا ہوا ہے۔ چنو نے بھی اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ علم سے روح بیدار ہو جاتی ہے۔ شکار کھیلنا ہے برا۔

صوبہ دار نے عارفانہ انداز سے کہا۔ ہاں برا تو ہے۔ چلو لوٹ چلیں۔ جب ہر ایک

چیز میں اسی کا جلوہ ہے تو شکاری کون اور شکار کون۔ اب کبھی شکار نہ کھیلوں گا۔

پھر وہ گجندر سے بولے۔ بھیا تمھارے اپدیش نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ قسم کھاتے ہیں اب کبھی شکار نہ کھیلیں گے۔

گجندر پر مستانہ کیفیت طاری تھی۔ اسی سرور کے عالم میں بولے۔ ایشور کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ لوگوں کو یہ توفیق عطا کی۔ مجھے خود شکار کا کتنا شوق تھا عرض نہیں کر سکتا۔ انگنت جنگلی سور، ہرن، تیندوے، نیل گائیں، مگر ہلاک کیے ہوں گے۔ ایک بار ایک چیتے کو مار ڈالا تھا۔ مگر آج مئے عرفان کا وہ نشہ ہوا کہ ماسوا کا کہیں وجود ہی نہیں رہا۔

(2)

ہولی جلنے کی مہورت نو بجے رات کو تھی۔ آٹھ ہی بجے سے گاؤں کی عورتیں مرد، بوڑھے، بچے، گاتے بجاتے کبیریں اڑاتے ہولی کی طرف چلے۔ صوبہ دار صاحب بھی بال بچوں کو لیے ہوئے مہمان کے ساتھ ہولی جلانے چلے۔

گجندر نے ابھی تک کسی بڑے گاؤں کی ہولی نہ دیکھی تھی۔ اس کے شہر میں تو ہر محلے میں لکڑی کے موٹے موٹے دو چار کندے جلا دیے جاتے تھے جو کئی کئی دن جلتے رہتے تھے۔ یہاں کی ہولی ایک وسیع میدان میں کسی کوہسار کی بلند چوٹی کی طرح آسمان سے باتیں کر رہی تھی، جوں ہی پنڈت جی نے منتر پڑھ کر نئے سال کا خیر مقدم کیا، آتش بازی چھوٹنے لگی۔ چھوٹے بڑے سبھی پٹاخے، یہ چھچھوندیں ہوائیاں، چھوڑنے لگے۔ گجندر کے سر پر سے کئی چھچھوندیں سنسناتی ہوئی نکل گئیں۔ ہر ایک پٹاخے پر بے چارہ دو دو چار چار قدم پیچھے ہٹ جاتا تھا اور دل میں ان اجڈ دیہاتیوں کو بد دعائیں دیتا تھا۔ یہ کیا بے ہودگی ہے! بدوو کہیں کپڑے میں لگ جائے کوئی اور واردات ہو جائے تو ساری شرارت نکل جائے۔ روز ہی ایسی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ مگر ان دہقانیوں کو کیا خبر، یہاں تو دادا نے جو کچھ کیا وہی کریں گے چاہے اس میں کچھ تک ہو یا نہ ہو۔

دفعتاً نزدیک سے ایک بم گولے کے چھوٹنے کی فلک شگاف آواز آئی۔ گویا بجلی کڑکی ہو۔ گجندر سنگھ چونک کر کوئی دو فیٹ اونچے اچھل گئے۔ اپنی زندگی میں وہ شاید کبھی

اتنا نہ کودے تھے۔ دل دھک دھک کرنے لگا، گویا توپ کے نشانے کے سامنے کھڑے ہوں۔ فوراً دونوں کان انگلیوں سے بند کر لیے اور دس قدم اور پیچھے ہٹ گئے۔

چنو نے کہا، جیجا جی۔ آپ چھوڑیں گے، کیا لاؤں؟

منو بولا، ہوائیاں چھوڑیے جیجا جی۔ بہت اچھی ہیں۔ آسمان میں نکل جاتی ہیں۔

چنو۔ ہوائیاں بچے چھوڑتے ہیں کہ یہ چھوڑیں گے۔ آپ بم گولہ چھوڑیے بھائی صاحب۔

گجندر بھئی مجھے ان چیزوں کا شوق نہیں۔ مجھے تو تعجب ہو رہا ہے کہ بوڑھے بھی کتنی دلچسپی سے آتش بازیاں چھڑا رہے ہیں۔

منو۔ دو چار ماہتابیاں تو ضرور چھوڑیے۔

گجندر کو ماہتابیاں بے ضرر معلوم ہوئیں۔ ان کی سرخ، سبز، سنہری چمک کے سامنے، ان کے گورے چہرے اور خوبصورت بالوں اور ریشمی کرتے کی دلفریبی کتنی بڑھ جائے گی۔ کوئی خطرے کی بات بھی نہیں۔ مزے سے ہاتھ میں لیے کھڑے ہیں۔ گل ٹپ ٹپ نیچے گر رہا ہے، اور سب کی نگاہیں ان کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ ان کا فلسفی دماغ بھی خودنمائی کے شوق سے خالی نہ تھا۔ فوراً ماہتابی لے لی گو ایک شان بے نیازی کے ساتھ۔ مگر پہلی ہی ماہتابی چھوڑنا شروع کی تھی کہ دوسرا بم گولہ چھوٹا، آسمان کانپ اٹھا۔ گجندر کو ایسا معلوم ہوا گویا کان کے پردے پھٹ گئے۔ یا سر پر کوئی ہتھوڑا سا گر پڑا۔ ماہتابی ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی، اور سینے میں اختلاج ہونے لگا۔ ابھی اس دھماکے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ دوسرا دھماکہ ہوا۔ جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ ساری فضا متلاطم ہوگئی۔ چڑیاں گھونسلوں سے نکل نکل کر شور مچاتی ہوئیں بھاگیں۔ جانور رسیاں تڑا تڑا کر بھاگے اور گجندر بھی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ سرپٹ اور سیدھے گھر پر آکر دم لیا۔ چنو اور منو دونوں گھبرا گئے۔ صوبہ دار صاحب کے ہوش اڑ گئے۔ تینوں آدمی بگٹٹ دوڑے ہوئے گجندر کے پیچھے چلے۔ دوسروں نے جو انھیں بھاگتے ہوئے دیکھا تو سمجھے کوئی شدید واردات ہوگئی۔ سب کے سب ان کے پیچھے ہو لیے۔ گاؤں میں ایک معزز مہمان کا آنا معمولی بات نہ تھی۔ سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ مہمان کو ہو کیا گیا؟ ماجرا کیا ہے؟ کیوں یہ لوگ دوڑے جا رہے ہیں۔

ایک لمحہ میں سینکڑوں آدمی صوبہ دار صاحب کے دروازے پر پرسش حال کے لیے جمع ہوگئے۔ گاؤں کا داماد کم رو ہونے پر بھی قابل زیارت اور بد حال ہوتے ہوئے بھی منظور نظر ہوتا ہے۔

صوبہ دار نے سہمی ہوئی آواز سے پوچھا۔ تم وہاں سے کیوں بھاگ آئے بھیا؟

گجندر کو کیا معلوم تھا کہ اس کے چلے آنے سے یہ تہلکہ مچ جائے گا۔ مگر اس کے حاضر دماغ نے جواب سوچ لیا تھا۔ اور جواب بھی ایسا کہ گاؤں والوں پر اس کی ضما رسی کا سکہ بٹھا دے۔

بولا۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔ دل میں کچھ ایسا ہی آیا کہ یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔

''نہیں کوئی بات ضرور تھی۔''

''آپ پوچھ کر کیا کریں گے؟ میں اسے ظاہر کر کے آپ کے جشن میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا۔''

''جب تک بتلا نہ دو گے بیٹا ہمیں تسلی نہ ہوگی۔ سارا گاؤں گھبرایا ہوا ہے۔''

گجندر نے پھر صوفیوں کا سا چہرہ بنایا۔ آنکھیں بند کر لیں، جمہائیاں لیں اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولے۔

بات یہ ہے کہ جوں ہی میں نے ماہتابی ہاتھ میں لی، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اسے میرے ہاتھ سے چھین کر پھینک دیا۔ میں نے کبھی آتش بازیاں نہیں چھوڑیں۔ ہمیشہ اس کی مذمت کرتا رہا ہوں۔ آج میں نے وہ فعل کیا جو میرے ضمیر کے خلاف تھا۔ بس غضب ہی تو ہوگیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میری روح مجھ پر نفریں کر رہی ہے۔ شرم سے میری گردن خم ہوگئی۔ اور میں اسی عالم میں وہاں سے بھاگا۔ اب آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں۔ میں آپ کے جشن میں نہ شریک ہوسکوں گا۔

صوبہ دار صاحب نے اس انداز سے گردن ہلائی گویا ان کے سوا وہاں کوئی اس تصوف کا راز نہیں سمجھ سکتا۔ ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں، ''آتی ہیں تم لوگوں کو سمجھ میں یہ باتیں۔ تم بھلا کیا سمجھوگے۔ ہم بھی کچھ کچھ ہی سمجھتے ہیں۔''

ہولی تو وقت معینہ پر جلائی گئی، مگر آتش بازیاں دریا میں ڈال دی گئیں۔ شریر لڑکوں

نے کچھ اس لیے چھپا کر رکھ لیں کہ گجندر چلے جائیں گے تو مزے سے چھڑائیں گے۔

شیام دلاری نے تخلیہ میں کہا۔ تم تو وہاں سے خوب بھاگے۔

گجندر اکڑ کر بولے۔ بھاگتا کیوں، بھاگنے کی تو کوئی بات نہ تھی۔

''میری تو جان نکل گئی کہ نہیں معلوم کیا ہوگیا۔ تمھارے ہی ساتھ میں بھی دوڑی آئی۔ ٹوکری بھر آتش بازیاں پانی میں پھینک دی گئیں۔

''یہ تو روپیہ کو آگ میں پھونکنا ہے۔''

''ہولی میں بھی نہ چھوڑیں تو کب چھوڑیں۔ تیوہار اسی لیے تو آتے ہیں۔''

''تیوہار میں گاؤ بجاؤ۔ اچھی اچھی چیزیں پکاؤ کھاؤ۔ خیرات کرو۔ غریبوں سے ملو۔ سب سے محبت سے پیش آؤ۔ بارود اڑانے کا نام تیوہار نہیں ہے۔''

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ کسی نے دروازہ پر دھکا مارا۔

گجندر نے چونک کر پوچھا۔ یہ دھکا کس نے مارا؟

شیاما نے لاپروائی سے کہا۔ بلی ولی ہوگی۔

کسی آدمیوں کے کھٹ پٹ کرنے کی آوازیں آئیں۔ پھر کیواڑ پر دھکا پڑا۔ گجندر کو لرزہ آگیا۔ لالٹین لے کر دراز سے جھانکا تو چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ چار پانچ آدمی کرتے پہنے، پگڑیاں باندھے، ڈاڑھیاں لگائے شانے پر بندوق رکھے کیواڑ کو توڑ ڈالنے کی سرگرم کوشش میں مصروف تھے۔ گجندر کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگا۔

''دونوں سوگئے ہیں۔ کواڑے توڑ ڈالو۔ مال الماری میں ہے۔''

''اور اگر دونوں جاگ گئے؟''

''عورت کیا کرسکتی ہے۔ مرد کو چارپائی سے باندھ دیں گے۔''

''سنتے ہیں گجندر کوئی بڑا پہلوان ہے۔''

''کیسا ہی پہلوان ہو۔ چار ہتھیار بند آدمیوں کے سامنے کیا کرسکتا ہے۔''

گجندر کے کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ شیام دلاری سے بولے۔ یہ ڈاکو معلوم ہوتے ہیں۔ اب کیا ہوگا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں۔

''چور چور پکارو۔ جاگ ہو جائے گی۔ آپ بھاگ جائیں گے۔ نہیں میں چلاتی ہوں۔ چور کا دل آدھا۔''

''نانا، کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ ان سبھوں کے پاس بندوقیں ہیں۔ گاؤں میں اتنا سناٹا ہے؟ گھر کے آدمی کیا ہوئے؟''

''بھیا اور منو دادا کھلیان میں سونے گئے ہیں۔ کاکا دروازے پر پڑے ہوں گے۔ ان کے کانوں پر توپ چھوٹے تب بھی نہ جاگیں گے۔''

''اس کمرہ میں کوئی دوسری کھڑکی بھی تو نہیں ہے کہ باہر آواز پہنچے۔ مکان ہیں یا قید خانے۔''

''میں تو چلاتی ہوں۔''

''ارے نہیں جانی کیوں جان دینے پر آمادہ ہو۔ میں تو سوچتا ہوں ہم دونوں چپ سادہ لیٹ جائیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ بدمعاشوں کو جو کچھ لے جانا ہو لے جائیں۔ جان تو بچے۔ دیکھو کہ اڑیل ہیں۔ کہیں ٹوٹ نہ جائیں۔ یا ایشور، کہاں جاؤں۔ اس مصیبت میں تمھارا ہی بھروسا ہے۔ کیا جانتا تھا کہ آفت آنے والی ہے، نہیں آتا ہی کیوں۔ بس چپی سادھ لو۔ اگر ہلائیں دلائیں تو بھی سانس مت لینا۔

''مجھ سے تو چپی سادھ کر پڑے نہ رہا جائے گا۔''

''زیور اتار کر رکھ کیوں نہیں دیتیں۔ شیطان زیور ہی تو لیں گے۔''

''زیور تو نہ اتاروں گی چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہوجائے۔''

''کیوں جان دینے پر تلی ہوئی ہو؟''

''خوشی سے تو زیور نہ اتاروں گی۔ زبردستی کی اور بات ہے۔''

''خاموش۔ سنو سب کیا باتیں کر رہیں ہیں۔''

باہر سے آواز آئی۔ کواڑ کھول دو۔ نہیں ہم کواڑ توڑ کر اندر آجائیں گے تو......

گجندر نے شیام دلاری کی منت کی۔ میری بات مانو شیاما۔ زیور اتار کر رکھ دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں بہت جلد نئے زیور بنوا دوں گا۔

باہر سے آواز آئی۔ کیوں شامتیں آئی ہیں۔ بس ایک منٹ کی مہلت اور دیتے ہیں۔ اگر کواڑ نہ کھولے تو خیریت نہیں۔

گجندر نے شیام دلاری سے پوچھا۔ کھول دوں؟

''ہاں بلا لو تمھارے بھائی بند ہیں نہ۔ وہ دروازے کو باہر سے ڈھکیلتے ہیں۔ تم اندر

سے باہر کو ٹھیلو۔

''اور جو دروازہ میرے اوپر گر پڑے۔ پانچ پانچ جوان ہیں۔''

''کونے میں لاٹھی رکھی ہے۔ لے کر کھڑے ہو جاؤ۔''

''تم پاگل ہوگئی ہو۔''

''چنو دادا ہوتے تو پانچوں کو گرا دیتے۔''

''میں لٹھ باز نہیں ہوں۔''

''تو آؤ منہ ڈھانپ کر لیٹ جاؤ۔ میں ان سبھوں سے سمجھ لوں گی۔''

''تمھیں تو عورت سمجھ کر چھوڑ دیں گے۔ ماتھے میرے جائے گی۔''

''میں تو چلاتی ہوں۔''

''تم میری جان لے کر چھوڑوگی۔''

''مجھ سے تو اب صبر نہیں ہوتا۔ میں کواڑ کھولے دیتی ہوں۔''

اس نے دروازہ کھول دیا۔ پانچوں چور کمرے میں بھڑا بھڑا کر گھس آئے۔

ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔ میں اس لونڈے کو پکڑے ہوئے ہوں۔ تم عورت کے سارے گہنے اتارلو۔

دوسرا بولا۔ اس نے تو آنکھیں بند کرلیں۔ ارے تو آنکھیں کیوں نہیں کھولتے جی۔

تیسرا۔ یار عورت تو حسین ہے۔

چوتھا۔ سنتی ہے او مہریا۔ زیور دے دے نہیں گلا گھونٹ دوں گا۔

گجندر دل میں بگڑ رہے تھے کہ چڑیل زیور کیوں نہیں اتار دیتی۔

شیام دلاری نے کہا۔ گلا گھونٹ دو چاہے گولی مار دو زیور نہ اتاروں گی۔

پہلا۔ اسے اٹھا لے چلو۔ یوں نہ مانے گی۔ مندر خالی ہے۔

دوسرا۔ بس یہی مناسب ہے۔ کیوں رے چھوکری۔ ہمارے ساتھ چلے گی؟''

شیام دلاری۔ تمھارے منہ میں کالکھ لگا دوں گی۔

تیسرا: نہ چلے گی تو اس لونڈے کو لے جا کر بیچ ڈالیں گے۔

شیام: ایک ایک کے ہتھکڑی ڈلوادوں گی۔

چوتھا۔ کیوں اتنا بگڑتی ہے مہارانی۔ ذرا ہمارے ساتھ چلی کیوں نہیں چلتی۔ کیا ہم

اس لونڈے سے بھی گئے گزرے ہیں۔ کیا رہ جائے گا اگر ہم تجھے زبردستی اٹھا لے جائیں گے۔ یوں سیدھی طرح نہیں مانتی ہو۔ تم جیسی ماہ رو پر ظلم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

پانچواں۔ یا تو سارے زیور اتار کر دے دو۔ یا ہمارے ساتھ چل۔

شیام دلاری۔ کاکا آجائیں گے تو ایک ایک کی کھال اُدھیڑ ڈالیں گے۔

پہلا۔ یہ یوں نہ مانے گی۔ اس لونڈے کو اٹھا لے چلو۔ تب آپ ہی پیرو ں پڑے گی۔

دو آدمیوں نے ایک چادر سے گجندر کے ہاتھ پانوں باندھے۔ گجندر بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ سانس تک نہ آتی تھی۔ دل میں جھنجھلا رہے تھے۔ ہائے! کتنی بے وفا عورت ہے۔ زیور نہ دے گی چاہے یہ سب مجھے جان سے مارے ڈالیں۔ اچھا زندہ بچوں گا تو دیکھوں گا۔ بات تک پوچھوں نہیں۔

جب ڈاکوؤں نے گجندر کو اٹھا لیا اور لے کر آنگن میں جا پہنچے تو شیام دلاری دروازے پر کھڑی ہو کر بولی۔ انھیں چھوڑ دو میں تمھارے ساتھ چلنے کو تیارے ہوں۔

پہلا۔ پہلے ہی کیوں نہ راضی ہوگئی تھی۔ چلے گی نہ؟

شیام دلاری۔ چلوں گی، کہتی تو ہوں۔

تیسرا۔ اچھا تو چل۔ ہم اسے چھوڑے دیتے ہیں۔

دونوں چوروں نے گجندر کو لا کر چارپائی پر لٹا دیا اور شیام دلاری کو لے کر چل دیے۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ گجندر نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ کوئی نہ نظر آیا۔ اٹھ کر دروازے سے جھانکا صحن میں بھی کوئی نہ تھا۔ تیر کی طرح نکل کر صدر دروازے پر آئے۔ لیکن باہر نکلنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ چاہا کہ صوبہ دار صاحب کو جگائیں۔ منھ سے آواز نہ نکلی۔

اسی وقت قہقہے کی آواز آئی۔ پانچ عورتیں چہل کرتی ہوئی شیام دلاری کے کمرے میں آئیں۔ گجندر کا وہاں پتہ نہ تھا۔

ایک۔ کہاں چلے گئے؟

شیام دلاری۔ باہر چلے گئے ہوں گے،

دوسری ۔ بہت شرمندہ ہوں گے۔

تیسری ۔ مارے خوف کے ان کی سانس تک بند ہوگئی تھی۔

گجندر نے بول چال سنی تو جان میں جان آئی سمجھے شاید گھر میں جاگ ہوگئی۔ لپک کر کمرے کی دروازے پر آئے اور بولے۔

ذرا دیکھیے شیاما کہاں ہے۔ میری تو نیند ہی نہ کھلی۔ جلد کسی کو دوڑائیے۔

یکا یک انھیں عورتوں کے بیچ شیاما کو کھڑی ہنستے دیکھ کر حیرت میں آگئے۔

پانچوں سہیلیوں نے ہنسنا اور تالیاں پیٹنا شروع کر دیا۔

ایک نے کہا۔ واہ جیجا جی۔ دیکھ لی آپ کی بہادری۔

شیام دلاری۔ تم سب کی سب شیطان ہو۔

تیسری۔ بیوی تو چوروں کے ساتھ چلی گئی اور آپ نے سانس تک نہ لی۔

گجندر سمجھ گئے بڑا دھوکا کھایا۔ مگر زبان کے شیر تھے۔ فوراً بگڑی بات بنا لی۔ بولے۔ تو کیا کرتا تمھارا سوانگ بگاڑ دیتا۔ میں بھی اس تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ اگر سبھوں کو پکڑ کر مونچھیں اکھاڑ لیتا تو تم کتنی شرمندہ ہوتیں۔ میں اتنا بے رحم نہیں ہوں۔

سب کی سب گجندر کا منھ دیکھتی رہ گئیں۔

(یہ 'جامعہ' 1935 میں شائع ہوا۔ 'واردات' میں شامل ہے اور 'گپت دھن' 2 میں شامل ہے۔)

وفا کی دیوی

(1)

بڈھوں میں جو ایک طرح کی بے شرمی، قریب قریب خلوص سے ملتی ہوئی پیدا ہوجاتی ہے وہ تلیا میں اس وقت تک نہ آئی تھی۔ حالانکہ اس کے سر کے بال چاندی ہوگئے تھے اور گال لٹک کر ڈاڑھوں کے نیچے آگئے تھے۔ لوگ اس کی عمر کا اندازہ سو سے اوپر کرتے تھے۔ وہ خود تحقیق سے کچھ نہ کہہ سکتی تھی لیکن اب بھی وہ کسی سے اپنے دل کی بات نہ کہتی تھی۔ چلتی تو ساڑی سے سرڈھانک کر، آنکھیں نیچی کیے ہوئے۔ گویا نویلی بہو ہے۔ ذات کی چمارن تھی، لیکن کیا مجال کہ کسی غیر کے گھر کا پکوان دیکھ کر اس کا جی للچائے۔ گاؤں میں اونچی نیچی ذاتوں کے بہت سے گھر تھے۔ تلیا کی سب جگہ آمد و رفت تھی، سارا گاؤں اس کی عزت کرتا تھا اور عورتیں تو دل سے اس کے ساتھ عقیدت رکھتی تھیں۔

اسے اصرار کر کے اپنے گھر بلاتیں، اس کے سر میں تیل ڈالتیں، مانگ میں سیندرو بھرتیں۔ کوئی اچھی چیز پکائی ہوتی، جیسے پھلوریاں، کھیر یا حلوا، تو اسے کھلانا چاہتیں، لیکن بڑھیا کبھی نہ کھاتی تھی۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ چماروں کے ٹولے میں ایک آدمی بھی نہ تھا۔ کچھ گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے، کچھ پلیگ اور ملیریا کے نذر ہو گئے۔ ان کے ماتم میں تھوڑے سے کھنڈر کھڑے تھے، برہنہ سر، چھاتی سے پیٹتے ہوئے، صرف تلیا کی جھونپڑی زندہ تھی اور تلیا۔ حالانکہ تلیا مسافرت کا وہ حصہ طے کر چکی تھی جہاں انسان تمام ظاہری اور مذہبی قیود سے نجات پا جاتا ہے۔ اور اب اونچی ذات والوں کو بھی اس کی ذات کی بنا پر اس سے کوئی پرہیز نہ تھا۔ سب ہی اسے اپنے گھر میں گوشہ دینے کو تیار تھے۔ مگر وہ وضع دار بڑھیا کیوں کسی کا احسان لے۔ کیوں اپنے شوہر مرحوم کی عزت کو

بٹہ لگائے جس کی اس نے کبھی صورت بھی نہ دیکھی تھی، صرف نام سنا تھا۔ ہاں! صرف نام سنا تھا۔ جب اس کی شادی ہوئی تو اس کی عمر کل پانچ سال کی تھی۔ اس کا شوہر اٹھارہ سال کا خوش رو گٹھیلا نوجوان۔ شادی کے بعد وہ یورپ کی طرف کمانے چلا گیا۔ سوچا تھا ابھی بیوی کے بالغ ہونے میں دس بارہ سال کی دیر ہے۔ اتنے دنوں کچھ نہ کچھ روپے جمع کر لیں اور پھر ساری زندگی مزے سے گھر پر رہ کر کھیتی باڑی کریں، لیکن بیوی بالغ بھی ہوگئی، جوان بھی ہوگئی۔ بوڑھی بھی ہوئی، وہ لوٹ کر نہ آیا۔ اس کے خطوط ہر تیسرے مہینے آتے تھے اور خط کے ساتھ تیس روپے کا منی آرڈر بھی ہوتا۔ خط کے لفافے کے اندر جواب کے لیے ایک خالی لفافہ بھی رکھا ہوتا تھا۔ یہی وہ رشتہ تھا جو ان میاں بیوی کا تعلق قائم رکھے ہوئے تھا۔ خط میں وہ اپنی مجبوری اور بدنصیبی کا اظہار کرتا اور لکھتا۔ کیا کروں ''تولا'' دل میں یہی ارمان ہے کہ ایک بار تم سے مل لیتا۔ اپنی جھونپڑی آباد کر دیتا، مگر سب کچھ نصیب کے ہاتھ میں اپنا کوئی بس نہیں ہے۔ جب بھگوان لائیں گے تب آؤں گا تم صبر کرنا، میرے جیتے جی تمھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ تمھاری انگلی پکڑی ہے تو مرتے دم تک اس کا نباہ کروں گا۔ جب آنکھیں بند ہو جائیں گی تب کیا ہوگا؟ کون جانے قریب قریب یہی مضمون الفاظ کے خفیف تغیر کے ساتھ ہر ایک خط میں ہوتا اور یہ خط تلیا کے حرزِ جان تھے۔ ایک خط بھی اس نے نہ پھاڑا تھا ایسے شگون کے خط کہیں پھاڑے جاتے ہیں۔ ان کا ایک چھوٹا سا دفتر جمع ہوگیا، بوسیدہ، بے رنگ سیاہی تک اڑ گئی تھی۔ کاغذ کا رنگ بھی اڑ گیا تھا، مگر سب کے سب جوں کے توں اس کی پٹاری میں ایک لال ڈورے سے تہ بتہ بندھے ہوئے رکھے تھے۔ ان خطوط کو پاکر تلیا کو بے اندازہ مسرت ہوتی۔ اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے۔ بار بار پڑھواتی اور بار بار روتی، اور اس دن ضرور سر میں تیل ڈالتی۔ سیندور سے مانگ بھرواتی۔ رنگین ساڑی پہنتی۔ اس کا سہاگ جاگ اٹھتا تھا۔ بہویں مذاق سے پوچھتیں، کیوں تولا بوا! تم نے پھوپا کو دیکھا تو ہوگا۔ ان کی کچھ یاد آتی ہے۔ اور تلیا کے پرشکن چہرے پر جوانی عود کر آتی۔ آنکھوں میں ایک سرور پیدا ہو جاتا۔ کہتی یاد کیوں نہیں آتی۔ بیٹا ان کی صورت تو اب بھی میرے سامنے ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں لال لال، اونچا ماتھا، چوڑی چھاتی، ایسا تو اب یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ موتیوں کے سے دانت تھے بیٹا! لال لال کرتا پہنے ہوئے

تھے۔ جب بیاہ ہو گیا تو میں نے ان سے کہا۔ ''میرے لیے بہت سے گہنے بناؤ گے نا؟ نہیں تو میں تمھارے گھر نہ آؤں گی۔'' لڑکپن تھا بیٹا۔ سرم لہاج کچھ تھوڑے ہی تھے۔ وہ میری بات سن کر بڑے جور سے ہنسے اور مجھے اپنے کندھے پر بٹھا کر بولے: میں تجھے گہنوں سے لاد دوں گا۔ تلیا کتنے گہنے پہنے گی تو۔ میں پردیس کمانے جاتا ہوں۔ وہاں سے روپے بھیجوں گا، تو بہت سے گہنے بنوانا اور جب میں آؤں گا تو اپنے ساتھ بہت سے گہنے لاؤں گا۔ میرا ڈولا گیا تھا بیٹا! ماں باپ کی ایسی حیثیت کہاں تھی کہ انھیں برات کے ساتھ بلاتے۔ انھیں کے گھر ان سے بیاہ ہوا، اور ایک دن میں وہاں رہی۔'' اسی ایک دن میں وہ مجھے کچھ ایسے بھائے کہ جب وہ چلنے لگے تو ان کے گلے لپٹ کر روتی تھی اور کہتی تھی: ''مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں تمھارا کھانا پکاؤں گی۔ تمھاری کھاٹ بچھاؤں گی۔ وہاں انھیں کی عمر کے دو تین آدمی اور بیٹھے تھے۔ انھیں کے سامنے وہ مسکرا کر میرے کان میں بولے: ''اور میرے ساتھ سوئے گی نہیں۔'' بس میں ان کا گلا چھوڑ کر الگ کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ''گالی دو گے تو کہے دیتی ہوں، ہاں!''

لاکھوں ہی بار اس کے منھ سے یہ الفاظ نکل چکے تھے، مگر اس کے لیے وہ ہمیشہ تازہ تھے۔ اس کے جگر کے عزیز ترین گوشے میں محفوظ، جہاں ہوا کا گزر نہ تھا، ان میں وہی لطافت تھی، وہی لذت، وہی شرینی، آہ! اس وقت کوئی اس کا چہرہ دیکھتا، کھلا پڑتا تھا۔ گھونگھٹ نکال کر، بھاؤ بنا کر، منھ پھیر کر اور ایک دلآویز تبسم کے ساتھ دل میں اس کا مزہ لیتی ہوئی وہ اس واقعہ کو بیان کرتی جو اس کی عمر طویل کی بہترین یادگار تھی۔ شبنم میں کھلے ہوئے پھول کی طرح دل آویز، وہ پھول اب بھی تازہ تھا۔ اس میں وہی خوشنمائی تھی، وہی خوشبو، واقعاتی زندگی کی جھلسانے والی آلائشوں سے پاک تمنا۔ ابھی تک تمنا کی سرخوشیوں اور کیفیتوں سے مرصع تھی جسے کشاکش حیات نے بے جان نہ کر پایا تھا۔

(2)

تلیا کسی زمانہ میں حسین تھی، کافر ادا تھی، قاتل ادا تھی۔ اور اپنے کشتگانِ ناز کی درد بھری داستانیں جب وہ بہ چشمِ پرنم کہتی تو شاید کشتوں کی روحیں عالمِ زیریں یا عالمِ بالا میں وجد کرتی ہوں گی۔ زندگی میں جن کی اس نے بات نہ پوچھی انھیں یہ ہمدری

اور وفا کے پھول نثار کرتی۔ اس کی اُٹھتی ہوئی جوانی تھی کہ ماں باپ رخصت ہوگئے۔ بھائی بھی پردیس چلا گیا۔ وہ گھر میں اکیلی رہ گئی۔ وہ جدھر سے نکل جاتی تھی، نوجوان کلیجہ تھام کر رہ جاتے تھے۔ تب بنسی سنگھ نام کا ایک ٹھاکر تھا۔ بڑا چھبیلا، بڑا رسیلا۔ دن میں سینکڑوں بار اس کے گھر کے چکر لگاتا۔ تالاب کے کنارے کھیت میں کھلیان، کنویں پر جہاں وہ جاتی سایہ کی طرح اس کے پیچھے لگا رہتا۔ کبھی دودھ لے کر اس کے گھر جاتا، کبھی گھی لے کر، کبھی ساڑیاں لے کر۔ کہتا: تلیا میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتا۔ تو میری بھینٹ لے لے۔ تو مجھ سے بولنا نہیں چاہتی، مت بول۔ میری صورت دیکھنا نہیں چاہتی، مت دیکھ۔ لیکن جو کچھ میں لاؤں اسے لے لے۔ بس اسی میں میرا دل بھر جائے گا۔ بھولی بھالی تلیا ایسی انیلی نہ تھی۔ جانتی تھی یہ انگلی پکڑنے کی باتیں ہیں۔ انگلی پکڑتے ہی پہنچا پکڑنے کی باتیں ہونے لگیں گی۔ لیکن نہ جانے کیسے وہ اس کے دھوکے میں آگئی۔ نہیں دھوکے میں نہیں آئی۔ اُسے اس کی جوانی پر ترس آیا۔ ایک دن وہ پکّے ہوئے آم لایا۔ تلیا نے اپنی زندگی میں قلمی آم نہ کھائے تھے۔ آم اس نے لے لیے۔ پھر تو روزانہ آم کے ٹوکرے آنے لگے اور آم لے کر بنسی سنگھ خود آتا اور چھپ کر رات کو آتا کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ گاؤں میں شور مچ جائے گا۔ ایک دن جب تلیا آم کی ٹوکری لے کر گھر میں جانے لگی تو بنسی سنگھ نے اس کا ہاتھ آہستہ سے پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور چٹ اس کے پیروں پر گر پڑا اور بولا۔ ’’تلیا اگر اب بھی تجھے مجھ پر دیا نہیں آتی، تو آج مجھے مار ڈال، اپنے ہاتھوں سے مار ڈال۔ بس اب یہی تمنا ہے۔ تلیا نے آم کی ٹوکری پٹک دی اور اپنے پاؤں چھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور اس کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ ’’اچھا ٹھاکر اب یہاں سے چلے جاؤ، نہیں تو یا تو تم نہیں رہوگے یا میں نہ رہوں گی۔ تمھارے آموں کو آگ لگے اور تم کو کیا کہوں ’’میرا آدمی کالے کوسوں میرے نام پر بیٹھا ہوا ہے۔ اسی لیے کہ میں یہاں اس کے نام کو کلنک لگاؤں۔ وہ مرد ہے، چار پیسے کماتا ہے، کیا وہ دوسری نہ رکھ سکتا تھا۔ عورتوں کی سنسار میں کمی ہے، لیکن وہ میرے نام پر بیٹھا ہوا ہے۔ مرد ہو کر بیٹھا ہوا ہے۔ تم سے کم پٹھا نہیں۔ تمھارا جیسا سندر چاہے نہ ہو۔ پڑھوگے اس کی چٹھیاں، وہ میرے نام بھیجتا ہے۔ آپ چاہے جس حال میں ہو، میں کون یہاں بیٹھی دیکھتی ہوں۔ لیکن ہر تیسرے مہنے

میرے لیے روپے بھیج دیتا ہے۔ اسی لیے کہ میں دوسروں سے بہار کروں؟ وہ ایک پیسہ بھی نہ بھیجے۔ جب تک وہ اس پریم سے بھری چھٹیاں بھیجتا رہے گا، جب تک وہ مجھ کو اپنی اور اپنے کو میرا سمجھتا رہے گا، تلیا اس کی رہے گی۔ دل میں بھی، دکھاوے میں بھی۔ جب میرا اس سے بیاہ ہوا تھا تب میں پانچ برس کی الھڑ چھوکری تھی۔ تمھارے دروازے پر جاتی تھی تو تم دھتکار دیتے تھے۔ اس نے میرے ساتھ کیا سکھ اٹھایا، جو میرے لیے اتنا کر رہا ہے۔ بس ایک بانہہ پکڑنے کی لاج کو نبھا رہا ہے، تو میں عورت ہو کر اس کے ساتھ دگا کروں۔''

یہ کہہ کر وہ اندر گئی اور چھٹیوں کی پٹاری لاکر ٹھاکر کے سامنے پٹک دی۔ مگر ٹھاکر کو چھٹیوں کے پڑھنے کا ہوش کہاں تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ ہونٹ پچکے ہوئے تھے۔ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا۔

ایک لمحہ کے بعد اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''مجھ سے بہت بڑا قصور ہو گیا تولا! میں نے تم کو پہچانا نہ تھا۔ اب اس کی سزا یہی ہے کہ تم مجھے اپنے ہاتھ سے مار ڈالو۔ اسی وقت مار ڈالو۔ ایسے رو سیاہ آدمی کا زندہ رہنا کس کام کا۔ میں کسی کو منھ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔ بس اب یہی آرزو ہے کہ تمھارے ہاتھوں قتل جاؤں۔''

تلیا کو اس پر رحم نہیں آیا۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ یہ ابھی تک شرارت کیے جاتا ہے۔ جھلاّ کر بولی۔ ''مرنے کو جی چاہتا ہے تو مر جاؤ۔ کیا دنیا میں کنویں تالاب نہیں ہیں، یا تمھارے پاس تلوار کٹار نہیں ہے۔ میں کسی کو کیوں ماروں۔''

ٹھاکر نے مایوس نظروں سے دیکھا۔ تو تمھارا یہی حکم ہے؟

''میرا حکم کیوں ہونے لگا۔ مرنے والے کسی سے حکم نہیں لیتے۔''

وہ چلا گیا اور دوسرے دن ندی میں اس کی لاش تیرتی ہوئی ملی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے ڈوب گیا۔ یہی خیال ہوا کہ نہانے آیا ہوگا۔ پاؤں پھسل گیا ہوگا۔ کئی دن تک کیا کئی مہینوں تک گاؤں میں اس کا چرچا رہا۔ تلیا نے زبان تک نہ کھولی۔ ٹھاکر کے مرتے ہی بھائی نے جائداد پر قبضہ کر لیا اور اس کی بیوی اور بچے کو ستانے لگا۔ دیورانی طعنے دیتی۔ دیور عیوب لگاتا۔ آخر غریب بیوہ ایک دن زندگی سے تنگ آکر بچے کو لے کر گھر سے نکل پڑی۔ رات کا وقت تھا۔ تلیا اپنے دروازے پر کھڑی تھی۔ لالٹین جل

رہی تھی۔ ارزانی کے دن تھے۔ سہ ماہی تیس روپے میں اس کی بڑی فراغت سے گذران ہوتی تھی۔ جو وہ کھاتی اور پہنتی تھی، وہ ٹھکرانیوں کو بھی نصیب نہ تھا۔ گائے پالی تھی، اس کی روٹی کھلانے نکلی تھی کہ اس نے ٹھکرائن کو بچے کے ساتھ جاتے دیکھا۔ ٹھکرائن سسکتی اور آنچل سے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ تین سال کا بچہ گود میں تھا۔

تلیا نے پوچھا۔ ''اس وقت کہاں جاتی ہو، ٹھکرائن! سنو، سنو! کیا بات ہے، تم تو رو رہی ہو۔

ٹھکرائن جا تو رہی تھی مگر کہاں یہ اسے خود معلوم نہ تھا۔ وہ یہاں رہنا نہ چاہتی تھی۔ اپنی اور اپنے بچے کی جان کا خوف تھا۔ ان دنوں یہ پولیس کی تحقیقاتیں کہاں تھیں۔ دیور اسے اور اس کے بچے کو مار ڈالتا۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوتی۔ مگر اس چمارن سے اپنا دکھڑا کیسے کہے۔ آخر تھی ٹھکرائن! ایک بار تلیا کی طرف دیکھا اور بلا کچھ جواب دیے آگے بڑھی۔ جواب کیسے دیتی۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور وہ اس وقت نہ جانے کیوں اور زیادہ اُمڈ آئے تھے۔

تلیا نے گائے کے سامنے روٹی پھینکی، لوٹے سے ہاتھ دھویا اور قریب آکر بولی: ''جب تک مجھے نہ بتلا دوگی کہاں جا رہی ہو میں تمھیں نہ جانے دوں گی۔''

ٹھکرائن رک گئی اور آنسو بھری آنکھوں میں غصہ بھر کر بولی۔ ''تو کیا کرے گی پوچھ کر؟ تجھ سے مطلب؟''

''مجھ سے کوئی مطلب ہی نہیں؟ میں تمھارے گاؤں میں نہیں رہتی؟ گاؤں والے ایک دوسرے کے دکھ درد میں نہ ساتھ دیں گے تو کون دے گا۔''

''اس زمانہ میں کون کس کا ساتھ دیتا ہے تلیا! جب اپنے گھر والوں نے ساتھ نہ دیا اور تیرے بھیا کے مرتے ہی خون کے پیاسے ہو گئے تو پھر میں کس سے امید رکھوں۔ کیا تو میرے گھر کا حال نہیں جانتی، تجھ سے کیا چھپا ہے، وہاں نائن کہارن کے لیے روٹیاں ہیں، میرے لیے نہیں ہیں۔ اور لاتوں کی مار روٹیاں کون کھائے۔ میں کسی سے خیرات نہیں مانگتی۔ اپنا حق مانگتی ہوں۔ میں رکھیلی نہیں ہوں، اڑھری نہیں ہوں، بیاہتا ہوں۔ دس گاؤں کے آدمیوں کے بیچ بیاہ کے آئی ہوں۔ اپنا رتی بھر حق نہ چھوڑوں گی۔ آج کوئی نہ دے، میں اناتھ ہوں، لیکن چاہے میری آبرو جائے ان کو مٹا کر چھوڑوں گی

اور اپنا حصہ لے کر رہوں گی۔''

''تیرے بھیا!'' یہ تو دو لفظ تلیا کو اتنے پیارے لگے کہ اس نے ٹھکرائن کو گلے سے لگا لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ''تو بہن میرے گھر میں چل کر رہو اور کوئی تمھارا ساتھ دے یا نہ دے، تلیا مرتے دم تک تمھارا ساتھ دے گی۔ میرا گھر تمھارے رہنے کے لائق نہیں ہے، میں بھی غریب ہوں، لیکن گھر میں چاہے اور کچھ نہ ہو شانتی تو ہے۔ اور میں کتنی ہی غریب سہی لیکن تمھاری بہن تو ہوں۔''

ٹھکرائن نے اس کے چہرے کو حیرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ ''ایسا نہ ہو کہ میرے پیچھے میرا دیور تمھارا دشمن ہو جائے۔

تلیا نے دلیرانہ انداز میں کہا۔ ''میں دشمنوں سے نہیں ڈرتی اور پھر ان سے کہنے ہی کون جاتا ہے اور تم پردہ میں رہتی ہو۔''

ٹھکرائن تلیا کے ساتھ اس کے گھر میں آکر بیٹھ گئی۔ وہاں ایک ہی کھاٹ تھی۔ تلیا نے اس پر بچے کو لٹا دیا۔ چمارن کے برتن میں ٹھکرائن کیسے کھانا پکائے، کیسے پانی پیے۔ تلیا دوسرے ہی دن بازار سے برتن بھانڈے لائی اور ٹھکرائن کے لیے ایک کوٹھری الگ کر دی۔ ٹھکرائن مغرور تھی، آرام پسند تھی، مگر دھن کی پوری۔ تلیا اس کے برتن دھوتی، اس کے کپڑے صاف کرتی، اس کا بچہ کھلاتی۔ ٹھکرائن اس سے اس طرح کام لیتی تھی، گویا وہ اس کی لونڈی ہے۔ لیکن تلیا کشتۂ ناز عاشق کے ساتھ وفا کا نباہ کر رہی تھی۔ اس کا من نہ کبھی میلا ہوتا، نہ ماتھے پر کبھی بل پڑتا۔

ایک دن ٹھکرائن نے کہا۔ ''تولا! تم بچے کو دیکھتی رہنا۔ میں دو چار دن کے لیے ذرا باہر جاؤں گی۔ اس طرح تو یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ زندگی بھر پڑی رہوں گی، مگر دل کی آگ ٹھنڈی نہ ہوگی۔ اس بے حیا کو اتنی شرم کہاں کہ اس کی بھاوج کسی غیر کے ٹکڑوں پر پڑی ہوئی ہے۔ وہ تو اسی کوشش میں ہے کہ کسی طرح مجھے یہاں سے نکلوا دے اور ممکن ہو تو بدنام کرکے۔ اتنے دن تو آرام کر چکی اب کچھ کام کرنا چاہیے۔''

تلیا نے پوچھا۔ ''کہاں جانا چاہتی ہو بہن! کوئی حرج نہ ہو تو میں بھی ساتھ چلوں۔ اکیلی کہاں جاؤ گی؟''

''اس سانپ کو کچلنے کے لیے کسی کی مدد کے بغیر کام نہ چلے گا۔''

''وہ مدد کہاں ملے گی؟''

''میں جانتی ہوں اور پھر تجھ سے کیا چھپاؤں۔ میں اپنے روپ کی جادو سے ان کا گھمنڈ توڑ دوں گی۔ میرے پاس دوسرا کون ہتھیار ہے۔ میں جوان ہوں اور ایسی بری بھی نہیں ہوں۔ میں آج اپنا روپ بیچنے پر آجاؤں تو جانتی ہو اس کے دام کیا ہوں گے۔ اس بھڑیے کا سر اور میں نے یہی طے کیا ہے۔ اس پرگنہ کا حاکم جو کوئی بھی ہو اسی پر میرا جادو چلے گا اور ایسا کوئی مرد نہیں ہے جو کسی خوبصورت عورت کے جادو سے بچ سکے، چاہے وہ اسّی سال کا بڈھا ہی کیوں نہ ہو۔ چاہے وہ رشی ہی کیوں نہ ہو۔ دھرم جاتا ہے جائے، مجھے پروا نہیں ہے۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتی کہ میں بن بن پتیاں توڑوں اور شہدا مونچھوں پر تاؤ دے کر راج کرے۔ اور یہ کل تین چار دن کا کام ہے۔ تلیا کل تین چار دن کا کام، تو بچہ کی دیکھ بھال کرنا، بچہ تجھ سے ملا ہوا بھی ہے۔ میرے لیے بہت نہ ہرائے گا۔ کوئی پوچھے کہاں گئی تو کہہ دینا میکے چلی گئی۔

تلیا کو معلوم ہوا اس خوددار عورت کے دل پر کتنی گہری چوٹ ہے۔ اس جلن کو مٹانے کے لیے وہ جان ہی نہیں کھیل رہی ہے۔ دھرم پر کھیل رہی ہے جسے وہ جان سے زیادہ عزیز سمجھتی ہے۔ بنسی سنگھ کی وہ صورت التجا اس کی نظروں کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ طاقتور تھا۔ اپنے فولادی قویٰ سے وہ بڑی آسانی سے اس پر جبر کر سکتا تھا اور اس رات کے سنّاٹے میں اس کی حمایت کرنے والا کون تھا۔ مگر اس کی عفت آمیز تنبیہ نے بنسی سنگھ کو کس طرح رام کر لیا۔ گویا کوئی خونخوار اژدہا سریلا راگ سن کر مست ہو گیا او راپنا خونی ارادہ ترک کرکے اس راگ کی تانوں پر ناچنے لگا۔ اسی سچے سورما کی آبرو آج خطرہ میں ہے۔ کیا تلیا اس کی آبرو کو لٹنے دے گی اور خاموش بیٹھی رہے گی۔ نہیں! نہیں! نہیں!

بنسی سنگھ کا وہ سرفروشانہ ضبط، وہ مردانہ تحمل، وہ ذوقِ شہادت، وہ سچا عشق، وہ اپنی شمع حیات بجھا کر سوزِ نہاں کو ٹھنڈا کرنے کا شجاعانہ عمل۔ وہ اس کے فیصلے پر جان نثار کر دینے کا جذبہ اسے یاد آ گیا۔ بنسی سنگھ نے اس کی آبرو کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھا تو وہ بھی اس کی آبرو کو اپنی آبرو سے زیادہ عزیز ثابت کر دے گی۔ اپنی سحر طرازیوں سے، اپنی محبت نوازیوں سے، اپنی اداؤں سے، اپنی عصمت کو گوشہ جگر میں محفوظ رکھے ہوئے، وہ اپنی وفا کا حق ادا کرے گی۔

تلیا نے ٹھکرائن کو تشفی دیتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تم مت جاؤ بہن! کہیں مت جاؤ۔ پہلے مجھے اپنی طاقت آزما لینے دو۔ میری آبرو چلی بھی گئی تو کون ہنسے گا۔ تمھاری آبرو کے پیچھے ایک خاندان کی آبرو ہے۔''

ٹھکرائن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ اس نے کہا۔ ''تو یہ فن کیا جانے تلیا!''

''کون سا فن؟''

''یہی مردوں کو الو بنانے کا۔''

''یہ فن سبھی عورتوں کو آتا۔ بہن کہیں سیکھے جانے کا کام نہیں۔''

''اچھا بتاؤ تو کیا کروگی؟''

''وہی جو تم کرنے جا رہی ہو۔ تو حاکم پرگنہ پر اپنا جادو ڈالنا چاہتی ہو۔ میں تمھارے دیور پر جادو ڈالوں گی۔''

''بڑا گھاگھ ہے۔''

''گھاگھوں کو پھانسنا اور بھی زیادہ آسان ہے۔''

(3)

تلیا نے آزمودہ کار جنرل کی طرح جارحانہ عمل اور مدافعت اور مراجعت کے نقشے تیار کیے اور تسخیر کی تیاریاں کرنے لگی۔ عمل کے مدارج اور کامیابی کی منزل جتنی صفائی سے اسے نظر آئی تھی۔ شاید سکندر یا نپولین کو بھی نظر نہ آئی ہوگی۔ پیش بندی کے لیے اس نے مدافعت اور مراجعت کے پہلو بھی سوچ لیے، مگر اس میں شک نہ تھا کہ یہ ''بڑھے چلو'' والی جنگ ہوگی۔ غنیم بالکل بے خبر تھے۔ بالکل غیر مسلح اور اس فن حرب سے بالکل غیر معروف۔

بنسی سنگھ کا چھوٹا بھائی گردھر کندھے پر چھ فٹ کا موٹا ڈنڈا رکھے اکڑتا چلا آتا تھا، کہ تلیا نے پکارا ''ٹھاکر جی جرا یہ گھاس کا گٹھا اٹھوا کر میرے سر پر رکھ دو، مجھ سے نہیں اٹھتا۔''

اندھیرا ہوگیا تھا۔ کسان اپنے اپنے کھیتوں سے لوٹ کر گھر آچکے تھے۔ راستے میں

سناٹا تھا۔ اس وقت تلیا کا آنچل کھسک گیا اور سرخ چولی کے اندر کا ابھار جھلک پڑا۔ تلیا نے جھٹ آنچل سنبھال لیا۔ مگر اس کوشش میں اس کا سر کھل گیا اور اس کے جوڑے میں گتھی پھولوں کی بینی بجلی کی طرح آنکھوں میں کوندھ گئی۔ گردھر پر خود فراموشی کی کیفت طاری ہو گئی۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز مٹ گیا۔ آنکھوں میں ہلکا سا نشہ نمودار ہوا اور چہرہ پر ہلکی سی سرمئی اور خفیف سا تبسم، رگ رگ میں نغمہ سا گونج گیا۔

اس نے تلیا کو ہزاروں بار دیکھا تھا آرزو اور التجا کی آنکھوں سے۔ مگر تلیا اپنے حسن اور عصمت کے غرور میں کبھی اس کی طرف مخاطب نہ ہوئی تھی۔ اس کے انداز و بشرے میں کچھ ایسی بے نیازی، کچھ ایسی سرد مہری تھی کہ ٹھاکر کے سارے حوصلے پست ہو جاتے تھے۔ سارا شوق ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ آسمان پر اُڑنے والے طائر پر اس کے لاسے اور دانے اور جال کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ مگر آج وہ طائر اس کے مکان کے سامنے والی شاخ پر آبیٹھا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھوکا تھا۔ پھر کیوں نہ وہ دانہ اور جال لے کر دوڑے۔

''اس نے مخمور ہو کر کہا۔'' میں پہنچائے دیتا ہوں تلیا! تو کیوں سر پر اٹھائے۔''

تلیا نے شکار پر وار کیا۔ ''اور کوئی دیکھ لے تو یہی کہے گا ٹھاکر کو کیا ہوگیا ہے۔''

''مجھے کتوں کے بھونکنے کی پرواہ نہیں۔''

''لیکن مجھے تو ہے۔''

ٹھاکر نے نہ مانا اور گٹھا سر پر رکھ لیا اور اس طرح چلا گویا کونین کا خزانہ لیے جاتا ہو۔

(4)

ایک مہینہ گزر گیا۔ تلیا ٹھاکر پر موہنی ڈال رہی تھی اور اب اسے مچھلی کی طرح کھلا رہی تھی۔ کبھی ڈھیلی کر دیتی کبھی کھینچ لیتی۔ لگاوٹ بازی بھی تھی اور پرہیز بھی، اور ٹھاکر کی آتشِ شوق تیز سے تیز تر ہوتی جاتی تھی۔ اپنا ایمان اور دھرم سب فنا کر کے بھی وہ حصول مدعا کے قریب نہ آیا تھا۔ تلیا آج بھی اس سے اتنی ہی دور تھی جتنی پہلے۔

ایک دن وہ تلیا سے بولا۔ ''اس طرح کب تک جلائے گی تلیا! چل کہیں

بھاگ چلیں۔

تلیا نے پھندے کو اور کسا۔ ''ہاں! اور کیا جب تم منھ پھیرو تو کسی کام کی نہ رہوں۔ دین سے بھی جاؤں اور دنیا سے بھی۔''

ٹھاکر نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا۔ ''اب بھی تجھے مجھ پر وشواس نہیں آتا؟''

'' بھنورے پھول کا رس لے کر اڑ جاتے ہیں۔''

''اور پتنگے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔''

''پتیاؤں کیسے؟''

''میں نے ترا کوئی حکم ٹالا ہے؟''

''تم سمجھے ہوگے تلیا کو ایک رنگین ساڑی اور دو ایک چھوٹے چھوٹے گہنے دے کر پھنسا لوں گا۔ میں ایسی انیلی نہیں ہوں۔''

تلیا نے ٹھاکر کے دل کی بات بھانپ لی تھی۔ ٹھاکر حیرت میں آکر اس کے منھ کی طرف تکنے لگا۔

تلیا نے پھر کہا۔ ''آدمی گھر چھوڑتا ہے تو پہلے کہیں بیٹھنے کا ٹھکانہ کر لیتا ہے۔''

ٹھاکر نے خوش ہو کر کہا۔ ''تو تو چل، میرے گھر میں مالکن بن کر رہ۔''

تلیا آنکھیں مٹکا کر بولی۔ ''آج مالکن بن کر رہوں اور کل لونڈی بن کر بھی نہ رہنے پاؤں، کیوں؟''

''تو جس طرح تیرا من بھرے وہ کر، میں تیرا غلام ہوں۔''

''بچن دیتے ہو۔''

''ہاں دیتا ہوں۔''

''پھر تو نہ جاؤں گے؟''

''بچن دے کر پھر جانا مردوں کا کام نہیں ہے۔''

''تو اپنی آدھی جمین جائیداد میرے نام لکھ دو۔''

ٹھاکر اپنے گھر میں ایک کوٹھری، دس پانچ بیگھے کھیت، گہنے، کپڑے اور اپنی عزت تو اس کے قدموں پر نثار کرنے کو تیار تھا، لیکن آدھی جائیدار اس کے نام منتقل کرنے کی اس کی ہمت نہ تھی۔ کل کو تلیا اس سے کسی بات پر ناراض ہو جائے تو اسے آدھی جائیدار

سے ہاتھ دھونا پڑے۔ عورت کا کیا اعتبار، اسے یہ گمان تک نہ تھا کہ تلیا اس سے اتنا سنگین فیصلہ کرے گی۔ اسے تلیا پر غصہ آیا۔ یہ چمارن ذات سا سندر کیا ہوگئی ہے کہ سمجھتی ہے کہ میں اپسرا ہوں۔ اس کی محبت ایک بے تاب خواہش تھی اور بس وہ محبت جو اپنے کو فنا کر دیتی ہے اور فنا ہو جانا ہی زندگی کا حاصل سمجھتی ہے، اس میں نہ تھی۔

اس نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ تجھے میری زمین جائیداد ہی سے محبت ہے تلیا! مجھ سے نہیں۔

تلیا نے برجستہ جواب دیا۔ ''تو کیا میں نہ جانتی تھی کہ تمھیں میرے روپ اور جوانی ہی سے محبت ہے۔''

''تو محبت کو بازار کا سودا سمجھتی ہے۔''

''ہاں سمجھتی ہوں۔ تمھارے لیے محبت چار دن کا تماشہ ہوگی۔ میں تو کہیں کی نہ رہوں گی۔ میں اپنا سب کچھ تمھیں دے رہی ہوں تو اس کے بدلے میں سب کچھ لینا چاہتی ہوں۔ اگر مجھ سے محبت ہوتی تو آدھی کیا ساری جائیداد میرے نام لکھ دیتے۔ لیکن تمھاری نیت معلوم ہوگئی۔ ہاں بھگوان نہ کرے کہ ایسا کوئی سمے آئے۔ لیکن دن کسی کے برابر نہیں جاتے۔ اگر کوئی ایسا سمے آیا کہ تمھارے پاس کچھ نہ رہا تو تلیا دکھا دے گی کہ عورت کیا کچھ کر سکتی ہے۔''

تلیا جھلائی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ مگر مایوس نہ تھی، نہ بے دل۔ آگے کیا ہونے والا ہے، اس کے متعلق اسے مطلق شبہ نہ تھا۔

ٹھاکر نے جائیداد تو اپنی دانست میں بچالی تھی مگر بڑے مہنگے داموں۔ اس کا اطمینانِ قلب رخصت ہو چکا تھا۔ زندگی میں جیسے کوئی لطف ہی نہ رہ گیا تھا۔ جائیداد آنکھوں کے سامنے تھی۔ تلیا دل کے اندر روز سامنے آکر بیٹھنے والی تلیا، اب آرزو تھی جو حقیقت سے کہیں زیادہ دلآویز اور نشہ خیز ہے۔

تلیا اسے کبھی کبھی خواب کی ایک جھلک کی طرح نظر آجاتی اور خواب ہی کی طرح غائب ہو جاتی۔ گردھر اس سے اپنا دردِ دل کہنے کا موقع ڈھونڈھتا رہتا ہے لیکن تلیا اس کے سایہ سے بھی پرہیز کرتی۔ گردھر کو اب محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی میں مسرت پیدا کرنے کے لیے اس کی زمین کے مقابلہ میں تلیا کہیں زیادہ لازمی ہے۔ اسے اپنی

تنگ ظرفی پر غصہ آتا۔ زمین اور جائیداد کیا تلیا کے نام رہی، کیا اس کے نام۔ اس ذرا سی بات پر کیا رکھا ہے۔ تلیا تو اس وقت کے لیے پیش بندی کر رہی تھی جب میں اس کے ساتھ بے وفائی کرتا، جب میں اس کا بن کوڑی غلام ہوں تو بے وفائی کیسی۔ میں اس کے ساتھ بے وفائی کروں گا جس کی ایک نگاہِ کرم کے لیے ترستا رہتا ہوں۔ کاش وہ ایک بار مل جاتی تو اس سے کہہ دیتا تولا میرے پاس جو کچھ ہے، وہ سب تمھارا ہے کہو ہبہ نام لکھ دوں، کہو بیع نامہ لکھ دوں، مجھ سے جو غلطی ہوئی ہے اس کے لیے نادم ہوں۔ جائداد سے انسان کو جو ایک رواجی الفت ہے اسی کے زیرِ اثر میں نے وہ حماقت کی تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ دنیا میں وہی چیز سب سے بیش قیمت ہے جس سے زندگی میں کیف اور سرور پیدا ہو۔ اگر فقر اور بے نوائی میں سرور حاصل ہو تو وہی سب سے بیش قیمت ہے، جس پر زمین اور ملکیت سب قربان کر دی جاتی ہے۔ آج بھی لاکھوں خدا کے بندے ہیں جو دنیا کی نعمتوں پر لات مار کر جنگل بیابان کی سیر کرنے میں مست ہیں اور اس وقت میں اتنی ذرا سی بات نہ سمجھا۔ ہائے رے میری کمبختی۔"

(5)

ایک دن ٹھاکر کے پاس تلیا نے پیغام بھیجا۔ میں بیمار ہوں آکر مجھے دیکھ جاؤ، کون جانے بچوں کہ نہ بچوں۔

رات کے دس بجے ہوں گے۔ ٹھاکر نے سنا اور دوڑا۔ اس کی چھاتی دھڑک رہی تھی اور سر اڑا جاتا تھا۔ تلیا بیمار ہے۔ تلیا اس کی آنکھوں سے دور تھی، لیکن دل میں بسی ہوئی اور دل و جان سے بھی زیادہ عزیز۔ دل تو محض اس کا مکان تھا۔ اور وہی تلیا بیمار ہے۔ کیا ہوگا بھگوان! تم مجھے کیوں نہیں بیمار کر لیتے۔ میں تو اس جگہ مرنے کو تیار ہوں۔ تلیا کی بیماری اس کے ذہن میں ہر لمحہ خوفناک ہوتی جاتی تھی۔ اور بیماری میں تلیا نے مجھے بلایا ہے، کہا ہے کہ آکر دیکھ جاؤ، کون جانے بچوں کہ نہ بچوں۔" تو اگر نہ بچے گی تو میں بھی نہ بچوں گا تلیا! دیوار سے سر پھوڑ کر جان دے دوں گا۔ پھر میری اور تیری چتا ایک ساتھ بنے گی، ایک ساتھ دونوں کے جنازے نکلیں گے۔

اس نے قدم اور تیز کیا اور تھرتھراتے ہوئے پاؤں سے تلیا کے گھر میں داخل ہوا۔

تلیا ایک کھاٹ پر چادر اوڑھے سمٹی پڑی تھی اور اس تاریکی میں جاں بلب معلوم ہو رہی تھی۔ گردھر نے اس کے قدموں پر سر رکھ دیا اور کانپتی ہوئی اشک میں ڈوبی ہوئی آواز سے بولا۔ ''تلیا یہ بدنصیب تمھارے قدموں پر پڑا ہوا ہے۔''

تلیا نے آنکھیں کھولیں اور نحیف آواز سے بولی۔ ''تم ہو گردھر سنگھ! تم آگئے، اب میں آرام سے مروں گی۔ تمھیں ایک بار دیکھنے کے لیے جی بہت بے چین تھا۔ میرا کہا ماپھ کر دینا اور میرے لیے رونا مت۔ اس مٹی کی دیہہ میں کیا رکھا ہے گردھر! یہ تو مٹی میں مل جائے گا لیکن میں کبھی تمھارا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ پرچھائیں کی طرح سدا تمھارے ساتھ رہوں گی۔ تم مجھے نہ دیکھ سکوگے، میری باتیں سن نہ سکو گے۔ لیکن تلیا آٹھوں پہر، سوتے جاگتے تمھارے ساتھ رہے گی۔ میرے لیے اپنے کو بدنام مت کرنا۔ گردھر کبھی کسی کے سامنے میرا نام جبان پر مت لانا۔''

گردھر زار و قطار رو رہا تھا۔ ہاتھ میں کٹار ہوتی تو اسی وقت جگر میں مار لیتا اور اس کے سامنے تڑپ کر مر جاتا۔

تلیا نے ذرا دم لے کر پھر کہا۔ ''میں بچوں گی نہیں گردھر! تم سے ایک بنتی کرتی ہوں، مانوگے۔''

گردھر نے چھاتی ٹھونک کر کہا۔ ''اب جیوں گا تو اس لیے کہ تیرا حکم پورا کروں، نہیں تو اس جندگی میں کیا رکھا ہے۔

اسے ایسا معلوم ہوا کہ تلیا مسکرائی۔

نہیں، نہیں، ایسا مت کہو! تمھارے بال بچے ہیں ان کی پرورش کرنا اور مجھے بھول جانا۔ میری یہی بنتی ہے کہ اپنی بھابھی اور اس کے بچے کو اسی طرح رکھنا جیسے وہ بنسی سنگھ کے سامنے رہتی تھیں۔ ان کا آدھا حصہ انھیں دے دینا۔''

گردھر بولا۔ ''لیکن بھاوج تو دو مہنے سے اپنے میکے میں ہیں اور کہہ گئی ہیں کہ اب کبھی نہ آویں گی۔''

''یہ تم نے برا کیا گردھر بہت برا۔ اب میں سمجھی کہ کیوں مجھے برے برے سپنے آرہے تھے۔ اگر چاہتے ہو کہ میں جی اٹھوں تو جلدی لکھا پڑھی کرکے کاغذ میرے پاس رکھ دو۔ تمھاری بے انصافی ہی میری جان کی گاہک ہو رہی ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ

تمھاری بھاوج کیوں بار بار مجھے سپنے میں دکھائی دیتی تھی اور بنسی سنگھ کیوں مجھ سے سپنے میں کہتے تھے ''گردھر نے میری مکت بگاڑ دی بس ابھی جاؤ گردھر اور لکھا پڑی کر کے کاغذ لاؤ۔ اگر دیر کی تو مجھے جیتا نہ پاؤ گے۔''

گردھر نے دبی زبان سے کہا۔ ''لیکن رات کو کیسے لکھا پڑھی ہوگی تلیا۔ اسٹامپ کہاں ملے گا؟ لکھے گا کون؟ گواہ کہاں ہیں؟ بتلاؤ۔''

''کل سانجھ تک یہ کام کر لوگے تو میں بچ جاؤں گی گردھر۔ بنسی سنگھ مجھے لگے ہوئے ہیں۔ وہی مجھے ستا رہے ہیں۔ وہی میری جان لے رہے ہیں۔ اگر تم نے دیر کی تو تلیا مر جائے گی۔''

''میں کل سانجھ تک آجاؤں گا تلیا۔ تیرا حکم سر اور آنکھوں پر لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ تو......''

''نہیں نہیں، میں کل سانجھ تک نہیں مروں گی اس کا وشواس رکھو۔''

گردھر اسی وقت وہاں سے نکلا۔ راتوں رات پچیس کوس کی منزل طے کر کے صدر پہنچا۔ وکیلوں سے مشورہ کیا، اسٹامپ لیا، بھاوج کے نام آدھی جائداد منتقل کرائی اور چراغ جلتے جلتے حیران وپریشان، تھکن سے چور امید وبیم سے معمور آکر تلیا کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

تلیا نے روحانی شگفتگی کے عالم میں کہا۔ ''تم آگئے گردھر، کام کر آئے۔''

گردھر نے کاغذ اس کے سامنے رکھ کر کہا۔ ''ہاں تلیا کر آیا اور اگر اب بھی تم اچھی نہ ہوئیں تو تمھارے ساتھ گردھر کی جان نکل جائے گی۔''

تلیا اٹھ بیٹھی اور کاغذ کو اپنے سرہانے رکھ کر بولی۔ ''میں بہت اچھی ہوں گردھر! تم جب رات یہاں سے چلے گئے تب ہی میری طبیعت سنبھلنے لگی اور اب میں اچھی ہوں۔ سویرے تک بالکل اچھی ہو جاؤں گی۔ لیکن ابھی ابھی میں سو گئی تھی اور بنسی سنگھ مجھے سپنے میں کہہ رہے تھے تلیا تو بیاہتا ہے۔ تیرا آدمی ہجار کوس پر بیٹھا تیرے نام کی مالا جپ رہا ہے۔ چاہتا تو دوسری شادی کر لیتا، لیکن تیرے نام پر بیٹھا ہوا ہے اور جنم بھر بیٹھا رہے گا۔ اگر تو نے اس سے دغا کی تو میں تیرا دشمن ہو جاؤں گا۔ تو نے اپنے آدمی کے ساتھ کپٹ کیا، اسی دن میں تیری جان لے لوں گا۔ بس یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور میری آنکھ

کھل گئی۔

گردھر نے ایک لمحہ تلیا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اس وقت ایک روحانی جلال چمک رہا تھا اور دفعتاً جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا اور ساری سازش سمجھ میں آگئی۔ اس نے سچی عقیدت سے تلیا کے قدموں کو بوسہ دیا اور بولا۔ ''سمجھ گیا تلیا تو دیوی ہے۔''

(یہ افسانہ پہلی بار الٰہ آباد کے ہندی ماہنامہ 'چاند' کے اپریل 1935 کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ 'گپت دھن' 2 میں شامل ہے۔ عنوان ہے 'دیوی'۔)

زاویۂ نگاہ

جب ماں بیٹے سے بہو کی شکایتوں کا دفتر کھول دیتی ہے اور یہ سلسلہ کسی طرح ختم ہوتا نظر نہیں آتا، تو بیٹا اکتا جاتا ہے اور دن بھر کی تکان کے باعث کچھ جھنجھلا کر ماں سے کہتا ہے۔ ''تو آخر تم مجھ سے کیا کرنے کو کہتی ہو اماں۔ میرا کام بیوی کو تعلیم دینا تو نہیں ہے۔ یہ تو تمھارا کام ہے۔ تم اسے ڈانٹو، مارو، جو سزا چاہو دو، میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ تمھاری کوشش سے اسے سلیقہ، تمیز، ادب، خدمت سب کچھ آجائے۔''

ماں: ''واہ زبان سے بات تو نکلنے دیتی نہیں، ڈانٹوں تو مجھے نوچ ہی کھائے۔ اس کے سامنے اپنی آبرو بچاتی پھرتی ہوں کہ کسی کے منھ پر کوئی نا زیبا بات نہ کہہ بیٹھے۔''

بیٹا: ''تو پھر اس میں میری کیا خطا ہے۔ میں تو اس کو سکھا نہیں دیتا کہ تم سے بے ادبی کرے۔''

ماں: ''تو اور کون سکھاتا ہے؟''

بیٹا: ''تم اندھیر کرتی ہو ماں۔''

ماں: ''اندھیر نہیں کرتی حقیقت کہتی ہوں۔ تمھاری ہی شہ پا کر وہ اتنی دلیر ہوگئی ہے۔ جب وہ تمھارے پاس جا کر لٹو سے ہو جاتی ہے تو کبھی تم نے اسے ڈانٹا، کبھی سمجھایا کہ ساری خطا تیری ہے۔ تم خود اس کے غلام ہوگئے ہو۔ وہ بھی سمجھتی ہے کہ میرا شوہر کماتا ہے، پھر میں کیوں نہ حکومت کروں۔ کیوں کسی سے دبوں۔ مرد جب تک شہ نہ دے، عورت کا اتنا گردہ ہو ہی نہیں سکتا۔''

بیٹا: ''تو کیا میں اس سے کہہ دوں کہ میں تو کچھ نہیں کماتا، بالکل نکھٹو ہوں۔ کیا تم سمجھتی ہو، تب وہ مجھے ذلیل نہ سمجھے گی۔ ہر مرد چاہتا ہے کہ اس کی بیوی اسے کماؤ، لائق نیک نام سمجھے، اور قدرتاً وہ جتنا ہے، اس سے بڑھ کر اپنے کو ظاہر کرتا ہے۔ میں نے یہ

حماقت کبھی نہیں کی، لیکن بیوی کی نگاہوں میں اتنا وقار تو کوئی بھی کھونا نہ چاہے گا۔''

ماں : ''تم کان لگا کر، دھیان دے کر، ہمہ تن گوش بن کر اور حسرت خیز تبسم کے ساتھ اس کی باتیں سنو گے تو وہ کیوں نہ شیر ہوگی۔ تم خود چاہتے ہو کہ بیوی کے ہاتھوں مجھے ذلیل کراؤ۔ معلوم نہیں میرے کن گناہوں کی یہ سزا تم مجھے دے رہے ہو۔ کن کن ارمانوں سے کیسی کیسی قربانیاں کرکے میں نے تمھیں پالا، خود نہیں پہنا، تمھیں پہنایا، خود نہیں کھایا تمھیں کھلایا۔ میرے لیے تم اس مرنے والے کی محبت کی یادگار تھے، اور میری ساری آرزوؤں کے مرکز، تمھاری تعلیم پر میں نے اپنے ہزاروں کے زیور قربان کر دیے۔ بیوہ کے پاس دوسرا کون اثاثہ تھا، اس کا تم مجھے یہ صلہ دے رہے ہو۔''

بیٹا : ''میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ آپ کے احسانوں کو میں کب فراموش کرتا ہوں۔ آپ نے مجھے صرف تعلیم نہیں دی۔ مجھے زندگی عطا کی۔ زیور ہی نہیں قربان کیے اپنا خون تک پلایا۔ اگر میں سو بار جنم لوں تو بھی اس کا صلہ نہیں دے سکتا۔ میں اپنے علم میں آپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔ آپ کی خدمت میں حتی الامکان دریغ نہیں کرتا۔ جو کچھ پاتا ہوں، آپ کے ہاتھوں میں لا کر رکھ دیتا ہوں۔ اور آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ خدا نے ہمیں اور آپ کو اور ساری دنیا کو پیدا کیا۔ اس کا ہم اسے کیا صلہ دیتے ہیں؟ کیا صلہ دے سکتے ہیں؟ اس کا نام بھی تو نہیں لیتے اس کے احسانوں کا اعتراف تک نہیں کرتے۔ اس سے کیا خدا کے احسانوں کا بار کچھ کم ہو جاتا ہے۔ ماں کی قربانیوں کا صلہ کیا کوئی بیٹا دے سکتا ہے۔ چاہے وہ ساری دنیا کا مہاراج ہی کیوں نہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ میں آپ کی دلجوئی ہی تو کر سکتا ہوں، اور مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے اس میں کچھ اٹھا رکھا ہو۔''

ماں : ''تم میری دلجوئی کرتے ہو! تمھارے گھر میں اس طرح رہتی ہوں جیسے کوئی مزدورنی۔ تمھاری بیوی کبھی میری بات بھی نہیں پوچھتی۔ میں بھی کبھی بہو تھی۔ رات کو گھنٹہ بھر تک ساس کا بدن دباتی۔ سر میں تیل ڈالتی، تب بستر پر پاؤں رکھتی تھی۔ تمھاری بیوی نو بجے اپنی کتابیں لے کر صحنچی پر بیٹھتی ہے۔ دونوں کھڑکیاں کھول لیتی ہے۔ اور مزے سے ہوا کھاتی ہے۔ میں مروں یا جیوں اسے مطلب نہیں اسی لیے میں نے تمھیں پالا تھا۔''

بیٹا : ''تم نے مجھے پالا تھا تو تمھیں مجھ سے یہ شکایت ہونی چاہیے تھی۔ مگر تم نے

مجھ سے کبھی شکایت نہیں کی۔ میرے اور احباب ہیں، ان میں کسی کو اپنی ماں کے بدن پر مکیاں لگاتے نہیں دیکھتا۔ آپ میرے فرض یا خدمت کا بار میری بیوی پر کیوں ڈالتی ہیں؟ یوں اگر وہ آپ کی خدمت کرے تو مجھ سے زیادہ خوش اور کوئی نہ ہوگا۔ اس کی عزت میری نظروں میں بڑھ جائے گی۔ شاید اس سے محبت بھی زیادہ کرنے لگوں۔ لیکن اگر وہ آپ کی خدمت نہیں کرتی تو آپ کو ناراض ہونے کا کوئی موقعہ نہیں ہے۔ شاید میں اس کی جگہ ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔ ساس مجھے اپنی لڑکی کی خاطر پیار کرتی۔ مجھ پر جان نثار کرتی تو میں بھی جان و دل سے خدمت کرتا۔ اس لیے نہیں کہ وہ میرے شوہر کی ماں ہوتی۔ بلکہ اس لیے کہ وہ مجھ پر مادرانہ شفقت رکھتی۔ مجھے یہ برا معلوم ہوتا ہے کہ بہو ساس کے پیر دبائے۔ کچھ دن پہلے عورتیں اپنے شوہروں کے پیر دبایا کرتی تھیں۔ شاید آج بھی ایسی عورتیں موجود ہوں۔ لیکن میری بیوی میرا جسم دبائے تو مجھے روحانی تکلیف ہو۔ میں اس سے کوئی ایسی خدمت نہیں لینا چاہتا جو میں اس کی نہ کر سکوں۔ یہ رسم اس زمانہ کی یادگار ہے، جب عورت شوہر کی لونڈی سمجھی جاتی تھی۔ اب مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ کم سے کم میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔''

ماں: ''وہ تو میں کہتی ہوں کہ تمھیں نے اسے پڑھا کر شیر کر دیا ہے۔ تم ہی مجھ سے دشمنی کر رہے ہو۔ ایسی بے ادب، ایسی دیدہ دلیر، ایسی بد زبان، ایسی پھوہڑ چھوکری زمانہ میں نہ ہوگی۔ گھر میں اکثر محلّہ کی بہنیں آتی رہتی ہیں۔ یہ راجہ کی بیٹی نہ جانے دہقانوں میں پلی ہے کہ کسی کی خاطر و تعظیم نہیں کرتی۔ کمرے سے نکلتی تک نہیں۔ وہ بیچاریاں کبھی کبھی اسے دیکھنے کے لیے اس کے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ مگر یہ مزے سے پڑی رہتی ہے۔ اٹھتی تک نہیں۔ پیر چھونا تو دور کی بات ہے۔''

بیٹا: ''وہ بڑی بوڑھی عورتیں تم سے ملنے آتی ہوں گی۔ تمھارے اور ان کے بیچ میں نہ جانے کیا باتیں ہوتی ہوں۔ اگر تمھاری بہو بیچ میں آکو دے تو میں اسے بدتمیز کہوں گا۔ کم سے کم میں تو کبھی پسند نہ کروں گا کہ جب میرے احباب بیٹھے ہوں، تو تم جا کر کھڑی ہو جاؤ۔ بیوی بھی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی ہو تو میں ہرگز بغیر بلائے نہ جاؤں گا، یہ تو آج کل کی تہذیب ہے۔''

ماں: ''تم تو ہر بات میں اسی کی پچ کرتے ہو بیٹا۔ نہ جانے اس نے کون سی

جڑی سونگھا دی ہے تمھیں۔ یہ کون کہتا ہے کہ ہم لوگوں کے بیچ میں آ کودے لیکن اسے بڑوں کی تعظیم و تکریم تو کرنی چاہیے۔''

بیٹا: ''کیونکر؟''

ماں: ''جا کر آنچل سے ان کے قدم چھوئے، پرنام کرے، پان کھلائے، پنکھا جھلے، کیا اس سے اتنا بھی نہیں ہوتا۔ ان ہی باتوں سے بہو کی قدر ہوتی ہے۔ جو دیکھتا ہے تعریف کرتا ہے۔ اب سب کی سب یہی کہتی ہوں گی کہ بہو کو گھمنڈ ہوگیا ہے۔ کسی سے بات کرنے تک کی روادار نہیں۔''

بیٹا (غور کر کے) ہاں یہ ضرور اس کی خطا ہے، میں سمجھا دوں گا۔''

ماں (خوش ہو کر) ''تم سے سچ کہتی ہوں بیٹا! چارپائی سے اٹھتی تک نہیں، بلکہ اور پردہ گرا لیتی ہے۔ سب عورتیں تھڑی تھڑی کرتی ہیں۔ مگر اسے تو شرم جیسے چھو ہی نہیں گئی اور میں ہوں کہ مارے شرم کے مری جاتی ہوں۔''

بیٹا۔ ''یہی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ہر بات میں اپنے کو اس کے فعلوں کا ذمہ دار کیوں سمجھ لیتی ہو۔ کیوں اپنی جان ضیق میں ڈالتی ہو۔ مجھ پر دفتر میں جانے کتنی گھڑکیاں پڑتی ہیں۔ روز ہی تو جواب طلب ہوتا ہے۔ لیکن تمھیں الٹی میرے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو افسروں کو مجھ سے کوئی کد ہے۔ جو خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ یا انھیں جنون ہو گیا ہے جو بے وجہ مجھے کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ نہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ میں اپنے کام میں چوکس نہیں ہوں۔ غلطیاں کرتا ہوں۔ جہاں افسر سامنے سے ٹلا اور اخبار بینی شروع ہوئی۔ یا مل کر لوگ تاش کھیلنے لگے۔ کیا اس وقت ہمیں یہ خیال نہیں رہتا کہ کام کرنے کو پڑا ہے۔ اور کھیلنا مناسب نہیں۔ لیکن کون پرواہ کرتا ہے۔ سوچتے ہیں صاحب ڈانٹ ہی تو بتائیں گے۔ سر جھکا کر سن لیں گے۔ اور تم مجھے خطاوار سمجھ کر بھی مجھ سے ہمدردی کرتی ہو۔ اور تمھارا بس چلے تو ہمارے بڑے بابو کو مجھ سے جواب طلب کرنے کے جرم کالے پانی بھیج دو''۔

ماں۔ (شگفتہ ہو کر) ''میرے لڑکے کو کوئی ڈانٹے گا تو کیا میں پان پھول سے اس کی پوجا کروں گی''!

بیٹا۔ ''ہر ایک بیٹا اپنی ماں سے اسی طرح کی اندھی ہمدردی کی توقع رکھتا ہے۔ اور

سب مائیں اپنے لڑکوں کے عیبوں پر پردہ ڈالتی ہیں۔ مگر بہو کی جانب سے کیوں دل سخت ہو جاتا ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تمھاری بہو کی بے ادبیوں پر محلّہ کی خواتین برہم ہوتی ہیں تو تمھیں چاہیے، بہو کی جانب سے معذرت کرو۔ اس کی طبیعت نا ساز ہے، ابھی نادان بھولی بھالی ہے یا اور کوئی بہانہ۔ اس باز پرس میں تم کیوں دوسروں کی شریک ہو جاتی ہو؟ تم کو اس کی تذلیل میں کیوں مزا آتا ہے۔ میں بھی تو ہر ایک برہمن بڑے بوڑھے کی تعظیم نہیں کرتا۔ میں کسی ایسے شخص کے روبرو سر جھکا ہی نہیں سکتا، جس سے مجھے عقیدت نہ ہو۔ محض سفید بال اور جلد کی جھرّیاں، پوپلا منہ اور خمیدہ کمر کسی کو قابلِ تعظیم نہیں بنا دیتی۔ اور نہ جنیو اور تلک یا پنڈت اور شرما کا لقب ہی احترام کی چیز ہے۔ میں رسمی تعظیم کو اخلاقی جرم سمجھتا ہوں۔ میں تو اسی کی عزت کروں گا جو اپنے قول و فعل اور نیت، ہر اعتبار سے میری نظروں میں برگزیدہ ہے۔ جسے میں جانتا ہوں، مکاری و بد گوئی کے سوا اور کچھ نہیں کرتا، جو رشوت سود اور خوشامد کی کمائی کھاتا ہے، وہ اگر خضر کی عمر بھی لے کر آئے تو میں اسے سلام نہ کروں۔ اسے تم تکبّر کہہ سکتی ہو۔ لیکن جب تک میرا دل نہ جھکے، میرا سر بھی نہ جھکے گا۔ ممکن ہے تمھاری بہو کے دل میں بھی ان بڑی بوڑھیوں کی طرف سے کچھ اسی قسم کے خیالات ہوں۔ ان میں سے دو چار کو میں بھی جانتا ہوں۔ ہیں وہ سب بڑے گھر کی۔ لیکن نمائش اور نخوت کی پتلیاں۔ کوئی غیبت میں فرد، کوئی خوشامد میں یکتا، کوئی بدزبانی میں بے مثل۔ سب کی سب رسوم کی غلام۔ حسد سے جلنے والی۔ تم سے بہو کی شکایت کریں گی اور بہو سے تمھاری برائی شروع کر دیں گی۔ ایک بھی ایسی نہیں جس نے اپنے گھر کو دوزخ کا نمونہ نہ بنا رکھا ہو۔ اگر تمھاری بہو ایسی عورتوں کے آگے سر نہیں جھکاتی تو میں اس سے باز پرس نہیں کر سکتا"۔

ماں۔ "اچھا اب چپ رہو بیٹا۔ دیکھ لینا اگر ایک دن تمھاری بہو تم سے چولھا نہ جلوائے، گھر میں جھاڑو نہ لگوائے تو سہی۔ عورتوں کو بہت سر پر چڑھانا اچھا نہیں۔ اس بے حیائی کی بھی کوئی حد ہے کہ بوڑھی ساس تو کھانا پکائے اور بہو بیٹھی قصے پڑھتی رہے۔"

بیٹا۔ "بے شک یہ بری بات ہے اور میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم کھانا پکاؤ اور وہ قصے پڑھے۔ چاہے وہ قصے پریم چند ہی کے کیوں نہ ہوں۔ لیکن یہ خیال کرنا ضروری ہے کہ اس نے اپنے گھر میں کبھی کھانا نہیں پکایا۔ اس کے گھر میں مہاراج رسوئیا ہے۔ اور

جب چولہے کے سامنے جانے اسے اس کے سر میں درد ہونے لگتا ہے تو اسے کھانا پکانے کے لیے مجبور کرنا اس پر ظلم کرنا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں، جوں جوں ہمارے گھر کی حالت اس پر روشن ہوگی، اس کی عادتوں میں خود بخود اصلاح ہوتی جائے گی۔ یہ اس کے گھر والوں کی غلطی ہے کہ انھوں نے اس کی شادی کسی متموّل گھر میں نہ کی۔ ہم نے بھی یہ غلطی کی کہ اپنی اصلی حالت اُن سے چھپائی۔ اور یہ ظاہر کیا کہ ہم پرانے رئیس ہیں۔ اب ہم کس منھ سے کہہ سکتے ہیں کہ تو کھانا پکا۔ یا برتن مانجھ یا جھاڑو لگا۔ ہم نے ان لوگوں کو دھوکا دیا، اور اس کا خمیازہ ہمیں اٹھانا پڑے گا۔ اب تو ہماری خیریت اسی میں ہے کہ اپنی کم مائیگی کو انکساری، ہمدردی اور دلجوئی سے ڈھانکیں اور اسے اپنے دل کو یہ تسلی دینے کا موقعہ دیں کہ بلا سے دولت نہیں ملی۔ گھر کے آدمی تو اچھے ملے۔ اگر یہ تسلی بھی ہم نے اس سے چھین لی تو تم ہی سوچو اسے کتنا دلخراش صدمہ ہوگا۔ وہ ہم لوگوں کی صورت سے نفرت کرنے لگے۔"

ماں۔ "اس کے گھر والوں کو سو دفعہ غرض تھی تب ہمارے ہاں شادی کی۔ ہم کچھ ان کی خوشامد کرنے گئے تھے۔"

بیٹا۔ "ان کو اگر لڑکے کی غرض تھی تو ہمیں روپے اور لڑکی دونوں کی غرض تھی۔"

ماں۔ "یہاں کے بڑے بڑے رئیس ہم سے رشتہ کرنے کو منھ پھیلائے ہوئے تھے۔"

بیٹا۔ "اسی لیے کہ ہم نے رئیسوں کا سا سوانگ بنا رکھا ہے۔ گھر کی اصلی حالت کھُل جائے تو کوئی بات بھی نہ پوچھے۔"

ماں۔ "تو تمھارے سسرال والے ایسے کہاں کے خاندانی رئیس ہیں۔ ادھر ذرا لالہ کی وکالت چل گئی تو رئیس ہوگئے۔ یہیں تمھارے سُسر کے باپ میرے سامنے محرّری کرتے تھے اور لڑکی کو یہ دماغ کہ کھانا پکانے سے سر میں درد ہوتا ہے۔ اچھے اچھے گھروں کی لڑکیاں غریبوں کے گھر آتی ہیں، اور گھر کی حالت دیکھ کر ویسا ہی برتاؤ کرتی ہیں۔ یہ نہیں کہ اپنی تقدیر کو کوسا کریں۔ اس چھوکری نے ہمارے گھر کو اپنا گھر سمجھا ہی نہیں۔"

بیٹا۔ "جب تم سمجھنے بھی دو۔ جس گھر میں گھر کیوں، خفگیوں اور نکتہ چینیوں کے سوا اور کچھ نہ ملے، اسے اپنا گھر کون سمجھے۔ گھر تو وہ ہے جہاں محبت اور پیار ملے۔ کوئی بھی لڑکی آتے ہی اپنی ساس کو ماں نہیں سمجھ سکتی۔ ماں جب ہی سمجھے گی جب ساس پہلے اس

کے ساتھ ماں کا برتاؤ کرے، بلکہ اپنی لڑکی سے زیادہ عزیز سمجھے۔''

ماں۔ ''اچھا اب چپ رہو جی نہ جلاؤ۔ یہ زمانہ ہی ایسا ہے کہ لڑکوں نے بیوی کا منہ دیکھا اور اس کے غلام ہوئے۔ یہ سب نہ جانے کون سا منتر سیکھ کر آتی ہیں۔ یہ بھی بہو بیٹی کے لچھن ہیں کہ پہر دن اُٹھے سو کر اٹھیں۔''

بیٹا۔ ''میں بھی تو دیر میں سو کر اٹھتا ہوں اماں۔ مجھے تو تم نے کبھی نہیں کوسا۔''

ماں۔ ''بیٹا تم ہر بات میں اس سے اپنی برابری کرتے ہو۔''

بیٹا۔ ''جو اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ کیونکہ جب تک وہ اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتی تب تک اس کی حیثیت مہمان کی ہے، اور مہمان کی ہم خاطر کرتے ہیں، اس کے عیب نہیں دیکھتے۔''

ماں۔ ''ایشور نہ کرے کسی کو ایسی بہو ملے۔''

بیٹا۔ ''وہ تو تمھارے گھر میں رہ چکی۔''

ماں۔ ''کیا دنیا میں عورتوں کی کمی ہے؟''

بیٹا۔ ''عورتوں کی تو کمی نہیں مگر دیویوں کی کمی ضرور ہے۔''

ماں۔ ''نوج ایسی عورت، سونے لگتی ہے تو بچہ چاہے روتے روتے مر جائے، مسکتی تک نہیں۔ پھول سا بچہ لے کر میکے گئی تھی۔ تین مہینے میں لوٹی تو بچہ آدھا بھی نہیں ہے۔''

بیٹا۔ ''تو کیا میں یہ مان لوں کہ تمھیں لڑکے سے جتنی محبت ہے، اتنی اسے نہیں ہے؟ یہ تو قدرت کے قانون کے خلاف ہے۔ اور مان لو وہ نرموہن ہی ہے تو یہ اس کی خطا ہے۔ تم کیوں اس کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہو۔ اسے کامل آزادی ہے۔ جس طرح چاہے اپنے بچے کو پالے۔ اگر وہ تم سے کوئی صلاح پوچھے خندہ پیشانی سے بتلا دو۔ نہ پوچھے تو سمجھ لو کہ اسے تمھاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر ماں اپنے بچے کو پیار کرتی ہے اور وہ مستثنیٰ نہیں ہے۔''

ماں۔ ''تو میں سب کچھ دیکھوں اور زبان نہ کھولوں؟ گھر میں آگ لگتے دیکھوں اور خاموش کھڑی رہوں۔''

بیٹا۔ ''تم اس گھر کو بہت جلد چھوڑنے والی ہو۔ اسے بہت دن رہنا ہے۔ گھر کے نفع نقصان کی جتنی فکر اسے ہو سکتی ہے، اتنی تمھیں نہیں ہو سکتی۔ پھر میں کر ہی کیا سکتا

ہوں۔ ڈانٹ بتا سکتا ہوں۔ لیکن وہ ڈانٹ کی پرواہ نہ کرے، اور مجھے دو بدو جواب دے تو میرے پاس ایسا کون سا ذریعہ ہے جس سے اسے راستہ پر لاسکوں؟''

ماں۔ ''تم دو دن نہ بولو تو دیوتا سیدھے ہو جائیں۔ سامنے ناک رگڑے۔''

بیٹا۔ ''مجھے اس کا یقین نہیں ہے۔ میں اس سے نہ بولوں گا وہ مجھ سے نہ بولے گی۔ زیادہ سختی کروں گا تو اپنے گھر چلی جائے گی۔''

ماں۔ ''ایشور وہ دن لائے، میں تمھارے لیے نئی بیوی لاؤں۔''

بیٹا۔ ''ممکن ہے وہ اس سے بھی زیادہ نالائق ہو۔''

دفعتاً بہو آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ماں بیٹے دونوں پر ایک ہیبت طاری ہو جاتی ہے، گویا کوئی بم کا گولہ آگرا ہو۔ حسین اور نازک مزاج اور مغرور عورت ہے۔ رخسارے تمتمائے ہوئے ہیں۔ مگر ہونٹوں پر زہر آلود تبسم ہے اور آنکھوں میں طنز آمیز تمسخر۔

ماں (اپنی خفت کو چھپا کر) ''تمھیں کون بلانے گیا تھا؟''

بہو۔ ''کیوں؟ یہاں جو تماشہ ہو رہا ہے، اس کا لطف میں نہ اٹھاؤں؟''

بیٹا۔ ''ماں بیٹے کے بیچ میں تمھیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

(بہو کا تمسخر غصہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے)

بہو۔ ''اچھا آپ خاموش رہیے۔ جو شوہر اپنی بیوی کی برائیاں سنتا رہے، وہ شوہر بننے کے قابل نہیں۔ وہ شوہریّت کا الف بے بھی نہیں جانتا۔ مجھ سے اگر کوئی تمھاری برائی کرنا چاہے وہ میری پیاری ماں ہی کیوں نہ ہوتی تو میں اس کی زبان پکڑ لیتی۔ تم میرے گھر جاتے ہو تو وہاں تو جسے دیکھتی ہوں، تمھاری تعریف ہی کرتا ہے۔ چھوٹے سے بڑے تک غلاموں کی طرح دوڑتے پھرتے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو لوگ تمھارے لیے سرگ کے تارے توڑ لائیں۔ اور اس کا جواب مجھے یہاں یہ ملتا ہے کہ بات بات پر نکتہ چینی، عیب جوئی، خفگی، گالیاں اور طعنے۔ میرے گھر تو تم سے کوئی نہیں کہتا کہ آج تم دیر سے کیوں اٹھے، تم نے فلاں کو کیوں نہیں سلام کیا۔ فلاں کے قدموں پر سر کیوں نہیں پٹک دیا۔ میرے بابوجی یہ کبھی نہ گوارا کریں گے کہ تم ان کے جسم پر ٹکیاں لگاؤ یا ان کی دھوتی چھانٹو یا انھیں کھانا پکا کر کھلاؤ۔ میرے ساتھ یہ برتاؤ کیوں؟ میں لونڈی بن کر نہیں آئی ہوں۔ تمھاری رفیق حیات بن کر آئی ہوں۔ مگر رفیق کے معنی یہ تو نہیں کہ تم میری

برائیاں خاموشی سے سنو۔ یہ میرے اوپر منحصر ہے کہ جس طرح چاہوں تمھارے ساتھ رفاقت کا حق ادا کروں۔ اس کی تحریک میرے دل سے ہونی چاہیے، مجبوری یا جبر سے نہیں۔ اگر کوئی مجھ کو سکھانا چاہتا ہے تو ماں کی طرح سکھائے، میں سیکھوں گی۔ لیکن امرت بھی کوئی زبردستی میری چھاتی پر چڑھ کر میرے حلق میں ٹھونسنا چاہے تو میں ہونٹ بند کر لوں گی۔ میں اب تک کب کی اس گھر کو اپنا سمجھ چکی ہوئی۔ کب کی تقدیر کی شاکر ہوچکی ہوتی۔ مگر یہاں تو ہر گھڑی، ہر وقت، ہر لمحہ ٹھونکے اور کچوکے دے دے کر یاد دلایا جاتا ہے کہ تو اس گھر کی لونڈی ہے۔ تیرا اس گھر سے کوئی ناتا نہیں۔ تو صرف غلامی کرنے کے لیے یہاں لائی گئی ہے۔ اور میرا خون کھول کھول کر رہ جاتا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو ایک دن تم میری جان لے کر رہوگے۔''

ماں۔ ''سن رہے ہو اپنی چہیتی بیگم کی باتیں۔ یہاں لونڈی بن کر نہیں رانی بن کر آئی ہے۔ دونوں اس کی خدمت کرنے کے لیے ہیں۔ اس کا کام ہمارے اوپر حکومت کرنا ہے۔ اسے کچھ کام کرنے کو کوئی نہ کہے۔ میں خود مرا کروں اور تم اس کی باتیں کان لگا کر سنتے رہو۔ تمھارا منھ کبھی نہیں کھلتا کہ اسے ڈانٹو یا سمجھاؤ۔ تھر تھر کانپتے ہو۔''

بیٹا۔ ''اچھا اماں، ٹھنڈے دل سے سوچو۔ میں اس کی باتیں نہ سنوں تو کون سنے۔ کیا تم اس کے ساتھ ہمدردی بھی نہیں دیکھنا چاہتیں۔ آخر بابو جی زندہ تھے تب وہ تمھاری باتیں سنتے تھے یا نہیں؟ تمھیں پیار کرتے تھے یا نہیں۔ پھر اگر میں اپنی بیوی کی باتیں سنتا ہوں تو کون سی نئی بات کرتا ہوں۔ اور اس میں برا ماننے کی کون سی بات ہے۔''

ماں۔ ''ہائے بیٹا! تو اپنی بیوی کے روبرو مجھے ذلیل اور شرمندہ کر رہا ہے اسی دن کے لیے میں نے تجھے پال پوس کر بڑا جوان کیا تھا۔ کیوں میری چھاتی نہیں پھٹ جاتی۔''

میاں۔ ''ماں کا دل......''

بیوی۔ ''ماں کا دل نہیں، عورت کا دل۔''

میاں۔ ''یعنی؟''

بیوی۔ ''جو آخر دم تک مرد کا سہارا چاہتا ہے۔ ناز برادری چاہتا ہے۔ اور اس پر کسی عورت کا اثر دیکھ کر حسد سے جل اٹھتا ہے''

میاں۔ ''تم بالکل غلط زاویۂ نگاہ سے دیکھتی ہو۔ اور اس کا تجربہ تمھیں تب ہوگا

جب تم خود ساس بنوگی''۔

بیوی۔ ''مجھے ساس نہیں بننا ہے۔ لڑکا اپنے ہاتھ پیر کا ہو جائے تب شادی کرے اور اپنا گھر سنبھالے۔ مجھے بہو سے کیا مطلب''؟

میاں۔ ''کیا تمھیں یہ ارمان بالکل نہیں ہے کہ تمھارا لڑکا لائق ہو، سعاوت مند ہوا اور اس کی زندگی خوشی سے گزرے''۔

بیوی۔ ''کیا میں ماں نہیں ہوں''؟

میاں۔ ''ماں اور ساس میں کیا کوئی فرق ہے''؟

بیوی۔ ''اتنا ہی جتنا زمین اور آسمان میں ہے، سیاہ اور سفید میں ہے، ماں پیار کرتی ہے۔ ساس حکومت کرتی ہے۔ کتنی ہی نیک، شریف اور حلیم عورت ہو، ساس بنتے ہی گویا مزاج کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ جسے بیٹے سے جتنی ہی زیادہ محبت ہے وہ بہو پر اتنی ہی سختی سے حکومت کرتی ہے۔ مجھے بھی اپنے اوپر اعتبار نہیں ہے۔ حکومت پا کر کسے خوف رہتا ہے۔ اس لیے میں نے طے کر لیا ہے کہ ساس بنوں گی ہی نہیں۔ عورت کی غلامی ساسوں کے بل پر قائم ہے۔ جس دن ساسیں نہ رہیں گی، عورت کی غلامی کا بھی خاتمہ ہو جائے گا''۔

میاں۔ ''میرا خیال ہے تم ذرا دنیاوی عقل سے کام لو تو اماں پر حکومت کرسکتی ہو۔ تم نے ہماری باتیں کچھ سنی تھیں''؟

بیوی۔ بغیر سنے ہی میں سمجھ گئی کیا باتیں ہو رہی ہوں گی۔ وہی بہو کا رونا''۔

میاں۔ ''نہیں نہیں۔ تم نے بالکل غلط سمجھا۔ اماں کے مزاج میں آج یہ حیرت انگیز انقلاب دیکھا بالکل حیرت انگیز۔ آج وہ اپنی بے مہریوں پر نادم ہو رہی تھیں۔ ہاں علانیہ نہیں کنایۃً۔ اب تک وہ تم سے اس لیے ناراض رہتی تھیں کہ تم دیر میں اٹھتی ہو۔ اب انھیں اندیشہ ہے کہ کہیں سویرے اٹھنے سے سردی نہ ہو جائے۔ تمھارے لیے پانی گرم کر دیا کریں گی''۔

بیوی۔ (خوش ہو کر) ''سچ''؟

میاں۔ ''ہاں۔ سن کر مجھے بھی تعجب ہوا''۔

بیوی۔ ''اب میں منہ اندھیرے اٹھوں گی۔ ایسی سردی کیا لگ جائے گی۔ لیکن تم

مجھے چکمہ تو نہیں دے رہے ہو''۔

میاں۔ ''اب اس بدگمانی کا کیا علاج ہے۔ انسان کو کبھی کبھی اپنی بے انصافیوں پر افسوس تو ہوتا ہی ہے''۔

بیوی۔ ''تمھارے منہ میں گھی شکر۔ میں گجردم اٹھوں گی۔ وہ غریب میرے لیے کیوں پانی گرم کریں۔ میں خود گرم کر لوں گی۔ آدمی کرنا چاہے تو کیا نہیں کرسکتا''۔

میاں۔ ''مجھے تو آپ کی باتیں سن کر ایسا معلوم ہو رہا ہے، جیسے کسی غیبی تحریک نے آپ کے ضمیر کو روشن کر دیا ہو۔ وہ تمھارے اکھڑپن پر، تمھاری خوشیوں پر کتنا برہم ہوتی تھیں۔ چاہتی تھیں کہ جب کوئی بڑی بوڑھی گھر میں آجائے تو تم اس کے قدم چومو۔ لیکن اب شاید انھیں معلوم ہونے لگا ہے کہ اس عمر کا یہی تقاضا ہے۔ شاید انھیں خود اپنی جوانی یاد آرہی ہے۔ کہتی تھیں یہ شوق سنگار کے، پہننے اوڑھنے کے، کھانے کھیلنے کے دن ہیں۔ بوڑھیوں کا تو دن بھر تانتا لگا رہتا ہے۔ کوئی کہاں تک ان کے پیر چھوئے اور کیوں چھوئے۔ کہاں کی بڑی دیویاں ہیں''۔

بیوی۔ ''مجھے تو شادی مرگ ہوا چاہتی ہے''۔

میاں۔ ''میں تو مرتے مرتے بچا''۔

بیوی۔ ''اتنے دنوں کے بعد اب آئی ہیں راہ پر''؟

میاں۔ ''کوئی غیبی تحریک یا الہام سمجھو''۔

بیوی۔ ''میں کل سے ٹھیٹھ بہو بن جاؤں گی۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوگی کہ میں کب اپنا میک اپ کرتی ہوں۔ سنیما دیکھنے کے لیے ہفتہ میں ایک دن کافی ہے۔ بوڑھیوں کے پاؤں چھو لینے ہی میں کیا ہرج ہے۔ وہ دیویاں چڑیلیں سہی، مجھے دعا تو دیں گی ہی۔ میری تعریف تو کریں گی ہی''۔

میاں۔ ''لیکن سوچو۔ تم نے کتنی اونچی تعلیم پائی ہے۔ کس خاندان کی ہو''۔

بیوی۔ ''تعلیم کے یہ معنی نہیں کہ آدمی خواہ مخواہ دوسروں کو ذلیل سمجھے۔ بوڑھے کتنے ہی جاہل ہوں، لیکن دنیا کا تجربہ رکھتے ہی ہیں۔ خاندان کی عزت بھی انکسار اور خوش خلقی سے ہوتی ہے۔ غرور اور کج خلقی سے نہیں''۔

میاں۔ ''مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ اتنی جلد ان کی کایا پلٹ کیونکر ہو گئی۔ اب انھیں

بہوؤں کا ساس کے پاؤں دبانا، یا ان کی ساڑھی دھونا یا مکیّاں لگانا معیوب معلوم ہو رہا ہے۔ کہتی تھیں۔ بہو کوئی لونڈی تھوڑے ہی ہے کہ بیٹھی پاؤں دبائے''۔

بیوی۔ ''میری قسم''۔

میاں۔ ''ہاں جی۔ سچ کہتا ہوں، اور تو اور اب وہ تمھیں کھانا بھی پکانے نہ دیں گی۔ کہتی تھیں۔ جب بہو کے سر میں درد ہونے لگتا ہے تو کیوں اسے دق کیا جائے کوئی مہراج رکھ لو''۔

بیوی (باغ باغ ہو کر) میں تو آسمان میں اڑی جا رہی ہوں۔ مگر تم نے پوچھا نہیں۔ اب تک تم کیوں اسے کھانا پکانے کے لیے زور دیتی تھیں''۔

میاں۔ ''پوچھا کیوں نہیں۔ بھلا میں یوں چھوڑنے والا تھا۔ بولیں میری غلطی تھی۔ میں نے ہمیشہ کھانا پکایا ہے۔ پھر بہو کیوں نہ پکائے۔ لیکن اب ان پر روشن ہوا ہے کہ وہ غریب باپ کی بیٹی تھیں۔ تم رئیس کی بیٹی ہو''۔

بیوی۔ ''اماں دل کی بری نہیں ہیں''۔

میاں۔ ''بس ذرا پرانی لکیر پر جان دیتی ہیں''۔

بیوی۔ ''اسے میں قابل معافی سمجھتی ہوں۔ جس آب و گل سے ہماری پرورش ہوئی ہے اسے ہم یکبارگی نہیں بدل سکتے۔ جن آداب و رسوم کی وہ عادی ہو گئی ہیں۔ انھیں یکلخت چھوڑ دینا ان کے لیے مشکل ہے۔ وہ کیا کوئی بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ تو پھر بھی بہت روشن خیال ہیں۔ تم مہراج مت رکھو۔ خواہ مخواہ پریشانی کیوں مول لو۔ جب ترقی ہو جائے تو رکھ لینا۔ ابھی میں خود پکا لیا کروں گی۔ تین چار آدمی کا کھانا ہی کیا۔ میں جانتی سب ہوں۔ لیکن کوئی حکومت کرنا چاہے تو پھر مجھ سے برا کوئی نہیں''۔

میاں۔ ''مگر یہ تو مجھے برا لگے گا کہ تم رات کو اماں کے پاؤں دبانے بیٹھو''۔

بیوی۔ ''برا لگنے کی کون سے بات ہے۔ جب انھیں میرا اتنا خیال ہے تو مجھے بھی ان کا خیال کرنا چاہیے۔ جس دن میں ان کے پاؤں دبانے بیٹھوں گی، وہ مجھ پر جان دے دیں گی۔ آخر بہو بیٹے کا کچھ سکھ انھیں بھی تو ہو۔ بڑوں کی خدمت کرنے میں ہیٹی نہیں ہوتی۔ ہاں برا جب لگتا جب وہ حکومت کرتے ہیں''۔

میاں۔ ''اب تو اماں کو تمھاری فضول خرچی بھی بری نہیں لگتی۔ کہتی تھیں روپے پیسے

بہو کے ہاتھ میں دیا کرو‘‘۔

بیوی۔ ’’چڑھ کر تو نہیں کہتی تھیں‘‘؟

میاں۔ نہیں نہیں۔ مشورتاً کہتی تھیں۔ انھیں اب خیال ہو رہا ہے کہ ان کے ہاتھ میں پیسے رہنے سے تمھیں تکلیف ہوتی ہوگی۔ بار بار ان سے مانگتی شرماتی ہوگی اور تمھیں اپنی ضرورتوں کو روکنا ہوتا ہوگا‘‘۔

بیوی۔ ’’نا بھیّا۔ میں یہ جنجال اپنے سر نہ لوں گی۔ تمھاری تھوڑی سی آمدنی ہے، کہیں جلدی سے خرچ ہو جائے تو گھر کا خرچ چلنا مشکل ہو جائے۔ تھوڑے میں نباہ کرنے کی وِدّیا انھیں کو آتی ہے۔ میری ایسی کون سی ضرورتیں ہیں۔ میں تو صرف اماں کو چڑھانے کے لیے باربار ان سے روپے مانگتی تھی۔ میرے پاس خود سو پچاس روپے کے نوٹ ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے اب ہاتھ روکنا پڑے گا۔ آخری بابو جی مجھے کب تک دیتے رہیں گے اور یہ کون اچھی بات ہے کہ میں ہمیشہ ان پر ٹیکس لگاتی رہوں‘‘۔

میاں۔ ’’دیکھ لینا، اماں اب تمھیں کتنا پیار کرتی ہیں‘‘۔

بیوی۔ ’’تم بھی دیکھ لینا۔ میں ان کی کتنی خدمت کرتی ہوں‘‘۔

میاں۔ ’’مگر شروعات تو ان کی جانب سے ہوئی‘‘۔

بیوی۔ عملی شروعات میری ہی جانب سے ہوگی۔ کھانا پکانے کا وقت آگیا، میں چلتی ہوں۔ آج کوئی خاص چیز تو نہ کھاؤ گے‘‘؟

میاں۔ ’’تمھارے ہاتھوں کی روکھی روٹیاں بھی پکوان کا مزا دیں گی‘‘۔

بیوی۔ ’’اب تم شرارت کرنے لگے‘‘۔

(یہ افسانہ پہلی بار الٰہ آباد کے ہندی ماہنامہ ’چاند‘ کے اگست 1935 کے شمارے میں شائع ہوا، عنوان تھا ’گرہ نیتی‘۔ ’مان سروور 2‘ میں شامل ہے۔ اردو میں یہ ’دودھ کی قیمت‘ میں شامل ہے۔)

لعنت

کاؤس جی نے اخبار نکالا اور شہرت کمانے لگے۔ شاپور جی نے روئی کی دلالی شروع کی اور دولت کمانے لگے۔ کمائی دونوں ہی کر رہے تھے لیکن شاپور جی خوش تھے۔ کاؤس جی دل گرفتہ شاپور جی کو دولت کے ساتھ عزت اور شہرت خود بخود مل رہی تھی۔ کاؤس جی کو شہرت کے ساتھ دولت دوربین سے دیکھنے پر بھی کہیں نظر نہ آتی تھی۔ اس لیے شاپور جی کی زندگی میں سکون تھا، عافیت تھی، امید تھی، درد تھا اور چہل پہل تھی۔ کاؤس کی زندگی میں تلخی تھی، ناکامی تھی، مایوسی تھی، بیزاری تھی، بے دردی تھی، دولت کو حقیر سمجھنے کی وہ بہت کوشش کرتے تھے، لیکن جو عیاں تھا اس کی جانب سے آنکھیں بند کر لینا غیر ممکن تھا۔ شاپور جی کے دولت کدہ میں جو فراخدلی اور مہمان نوازی اور شرافت تھی اس کے مقابلے میں انھیں اپنے گھر کی بے سر وسامانی، تنگ دلی، نزاع اور بدنظمی سے نفرت ہوتی تھی، شیریں بیاں اور خوش خلق مسز شاپور کے سامنے انھیں اپنی گلشن بانو کم ظرف اور حسد کی پتلی معلوم ہوتی تھی، جسے مہمانوں سے گویا کوئی پرخاش ہو، جو سیدھی سی بات بھی کہتی تو طنز اور جگر خراش کنایوں کے ساتھ، شاپور جی گھر میں آتے تو شیریں بائی تبسم اور گرمجوشی سے خیر مقدم کرتی، کاؤس جی خود تھکے ماندے پریشان حال گھر آتے تو گلشن اپنا دکھڑا سنانے بیٹھ جاتی اور ان کو خوب ملامت کرتی، تم بھی اپنے کو انسان کہتے ہو، میں تمھیں بیل سمجھتی ہوں، نر چار پیروں والا بیل بڑا غریب ہے، سیدھا ہے۔ محنتی ہے۔ صابر ہے، مانا، لیکن پھر اسے شادی کرنے کا کیا حق تھا، کاؤس جی سے ایک لاکھ بار یہ سوال کیا جا چکا تھا کہ جب تمھیں اخبار نکال کر اپنی زندگی برباد کرنی تھی تو تم نے شادی کیوں کی، اپنے ساتھ مجھے کیوں لے ڈوبے، جب تمھارے گھر میں دو روٹیاں نہ تھیں تو مجھے کیوں لائے۔ اس سوال کا جواب دینے کی غریب کاؤس میں ہمت نہ تھی، نہ طاقت اور نہ صلاحیت، انھیں کوئی جواب ہی نہ سوجھتا تھا۔ وہ خود اپنی غلطی پر پچھتاتے تھے۔ ایک بار

بہت تنگ آکر انھوں نے کہا تھا۔ اچھا بھئی اب تو جو ہونا تھا ہو چکا، لیکن میں تمھیں باندھے ہوئے تو نہیں ہوں۔ تمھیں جو مرد زیادہ آرام سے رکھ سکے اس کے ساتھ جا کر رہو اور میں کیا کروں؟ دولت نہیں ملتی تو کیا جان دے دوں، اس گلشن نے ان کے دونوں کان پکڑ کے زور سے اینٹھے اور گالوں پر دو طمانچے لگائے، اور شعلہ بار نظروں سے دیکھ کر بولی اچھا، اب زبان سنبھالو ورنہ برا ہوگا۔ ایسی شرمناک بات کہتے تمھیں شرم نہیں آتی، مگر غیرت ہوتی تب تو، تم نے شرم جیسی بھون کھائی۔ تب سے بے چارے کاؤس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ رہا کہاں تو یہ بد مزاجی، سرکشی اور دست درازی، کہاں وہ تپاک اور خلوص اور تہذیب کی دیوی شیریں، جو کاؤس جی کو دیکھتے ہی پھول کی طرح کھل جاتی، میٹھی میٹھی باتیں کرنی چاہیے، مربّے اور پھلوں سے خاطر کرتی، اور اکثر انھیں اپنی کار پر سیر کرنے لے جاتی، کاؤس جی نے کبھی اس خیال کو اپنے دل میں جگہ دینے کی ہمت نہیں کی، مگر وہ خیال ایک آرزو کی صورت میں ان کے دل میں چھپا ہوا تھا، کاش گلشن کی طرح شیریں ان کی رفیق حیات ہوتی تو ان کی زندگی کتنی قابل رشک ہوتی، کبھی کبھی گلشن کی بدزبانیوں سے وہ اتنے رنجیدہ ہوتے کہ موت کا دروازہ کھٹکھٹاتے گھر ان کے لیے قید خانے سے کم دل فگار نہ تھا۔ اور انھیں جب موقع ملتا سیدھے شیریں کے گھر جا کر اپنے دل کی جلن ٹھنڈی کر آتے۔

ایک دن کاؤس جی علی الصباح گلشن سے برگشتہ خاطر ہو کر شاپور منزل پہنچے تو دیکھا شیریں بانو کی آنکھیں سرخ ہیں اور چہرہ تمتمایا ہوا ہے، گویا حرارت ہو گھبرا کر پوچھا آپ کی طبیعت کیسی ہے بخار تو نہیں ہے۔

شیریں نے مایوس نظروں سے دیکھ کر دردناک لہجہ میں کہا۔ نہیں نہیں، بخار نہیں کم سے کم جسمانی بخار تو نہیں ہے۔

کاؤس جی اس معمے کو نہ سمجھ سکے۔

شیریں نے ایک لمحہ خاموش رہ کر پھر کہا۔ ''آپ کو میں مہربان سمجھتی ہوں، کاؤس جی آپ سے کیا چھپاؤں؟ میں اب زندگی سے عاجز آگئی ہوں۔ میں نے اب تک دل کی آگ دل کے اندر رکھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے باہر نہ نکالیں گی تو شاید میری ہڈیاں تک جل جائیں گی۔ اس وقت آٹھ بجے ہیں۔ لیکن میرے رنگیلے پیا کا کہیں پتہ

نہیں۔ رات کا کھانا کھا کر وہ ایک دوست سے ملنے کا بہانہ کرکے گھر سے نکلے تھے اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے اور آج کوئی یہ نئی بات نہیں ہے۔ ادھر کئی مہینوں سے یہ ان کی روز کی عادت ہے۔ میں نے آج تک کبھی آپ سے اپنا درد دل نہیں کہا۔ مگر اس وقت بھی جب میں آپ سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھی، میرا دل روتا رہتا تھا اور میں آپ سے ایک دوست کی حیثیت سے پوچھتی ہوں، میرے لیے اب کون سا راستہ ہے۔ اس نے منتظر نگاہوں سے کاؤس کی طرف دیکھا۔

شیریں کی آنکھیں لبریز ہوگئیں تھیں۔ مگر چہرے پر ایک جلال سا نمایا تھا، اپنی بے کسی کا یہ اظہار اسے کتنا ناگوار گزر رہا تھا۔ یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

کاؤس جی نے ہمدردانہ انداز سے پوچھا۔ آپ نے ان سے پوچھا نہیں۔

''پوچھنے سے کیا لوگ اپنے دل کی باتیں بتا دیا کرتے ہیں۔''

''تم سے تو انھیں کوئی بات چھپانی نہ چاہیے۔

''گھر سے انسان بیزار ہو تو کیا کرے۔''

''مجھے یہ سن کر حیرت ہو رہی ہے۔ تم جیسی پاکیزہ صفت خاتون جس گھر میں ہو وہ جنت ہے۔ شاپور جی کو تو تمھاری پرستش کرنی چاہیے تھی۔''

شیریں مسکرائی۔ ستم ظریفانہ انداز سے۔ اس تبسم میں رازِ دل تھا۔

''آپ کے یہ جذبات اس وقت تک ہیں جب تک آپ کے پاس دولت نہیں ہے، آج آپ کو کہیں سے دو چار لاکھ مل جائیں تو تم یوں نہ رہوگے، تمھارے دل کی یہ حالت نہ رہے گی۔ دولت کی سب سے بڑی لعنت یہی ہے، سطح کے سکون اور ہریالی فضا کے نیچے کتنی حرارت ہے، یہ تو اس وقت کھلتا ہے۔ جب زمین میں شگاف ہوجاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں گھر میں دولت کا انبار لگا کر انھوں نے وہ سب کچھ کر دیا جو ان کا فرض تھا، میرے ساتھ اور اب مجھے شکایت کا کوئی موقع نہیں، میرا زبان کھولنا بھی حق بجانب نہیں، وہ نہیں جانتے کہ یہ سارے امارت کے لوازم مصری تہہ خانوں میں مدفون تکلفات کی طرح ہیں، جو ان سونے والی روحوں کے عیش و آرام کے لیے رکھے جاتے ہیں۔

کاؤس جی آج ایک نئی بات سن رہے تھے۔ انھیں اب تک زندگی کا جو تجربہ تھا وہ یہ تھا کہ عورت طبعاً عشرت پسند اور خویش پرور ہوتی ہے اس پر لاکھ جانثار کرو، اس کے

لیے مر ہی کیوں نہ مٹو، لیکن جب تک تمھاری جان نثاریوں کا کوئی عملی اظہار نہ ہو، مرصع زیورات کی صورت میں، ریشمی ملبوسات کی صورت میں، بیش قیمت تحائف کی صورت میں، فرمائشوں کی تکمیل کی صورت میں، ابلتے ہوئے کیش بکس کی صورت میں، اسے تسکین نہیں ہوتی، وہ محض کھریرا نہیں چاہتی، دانہ اور گھاس بھی چاہتی ہے، لیکن ایک یہ بھی دیوی ہے جو دنیا کی نعمتوں کو حقیر سمجھتی ہے اور مرتی ہے مہرو وفا کے لیے، خلوص و محبت کے لیے، دلسوزی اور دلجوئی کے لیے، ان کے دل میں گدگدی سی ہوئی۔

مسز شاپور کی آواز تلخ ہوگئی تھی اور پیشانی پر بل پڑ گئے تھے، ذرا دم لے کر بولیں ان کی یہ ہوس پروری میری برداشت کے باہر ہوگئی ہے۔ مسٹر کاؤس جی میرے دل میں سوزش ہے، ہیجان ہے اور میں دین اور شرع، ننگ و ناموس کسی کی آڑ لے کر بھی اپنے کو پابند نہیں رکھ سکتی، عصمت کی حفاظت کس لیے، جب کوئی اس کی قدر نہیں کرتا، جنگل میں کیوں کوئی گائے جب کوئی سننے والا نہیں، دل کو سمجھاتی ہوں، کیا دنیا میں لاکھوں بیوائیں نہیں پڑی ہوئی ہیں، جوان حسین، ناز و نعمت میں پلی ہوئی، کیا میں انھیں کی طرح یاس اور محرومی قسمت کا دامن پکڑ کر زندگی کی منزل طے نہیں کرسکتی لیکن دل کی آگ نہیں بجھتی، اب مجھے یقین آجاتا ہے کہ شاپور مجھے پردۂ عصمت کو چاک کر ڈالنے کی تحریک کر رہے ہیں۔ دیدۂ و دانستہ شاید کسی خاص منشا سے میں نے اب تک ان کی چنوتی منظور نہیں کی ہے۔ لیکن پانی سر کے اوپر چڑھ گیا ہے اور میں کسی تنکے کے سہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، وہ جو چاہتے ہیں وہی ہوگا، نہیں اس سے کچھ زیادہ ہوگا، ناموس کی زنجیر سے آزاد ہوکر آدمی کیا کچھ نہیں کرسکتا۔ آپ ان کے دوست ہیں۔ آپ سے بن پڑے تو انھیں سمجھایئے میں اس عصمت کی بیڑی کو اب اور نہیں پہن سکتی۔

مسٹر کاؤس جی نے آنے والی مسرتوں کی ایک جنت بنا رہے تھے، روشن، پرفضا، روحانی خوشیوں سے پر بولے، ہاں ہاں، میں ضرور سمجھاؤں گا یہ تو میرا فرض ہے لیکن مجھے امید نہیں کہ میرے سمجھانے کا ان پر کوئی اثر ہو، جس کے پاس دولت نہیں اسے ایک صاحب دولت کو سمجھانے کا حق ہی کیا ہے، آپ کا خیال درست ہے، ضرور انھوں نے کسی منشا سے یہ روش اختیار کی ہے۔

یوں تو وہ مجھ پر بڑی عنایت رکھتے ہیں، میری خاطرداری میں کوئی بات اٹھا نہیں

رکھتے مگر ان کی یہی عادت مجھے پسند نہیں۔''

تم نے اتنے دنوں تحمل سے کام لیا۔ یہی تعجب ہے کوئی دوسری خاتون ایک دن بھی برداشت نہ کرتی۔

''ان کے ساتھ زیادہ سختی نہ کیجیے۔ مسٹر کاؤس جی۔ یہ عادت تو کم و بیش ہر مرد میں ہوتی ہے۔ لیکن ایسے مردوں کی بیویاں بھی اسی مزاج کی ہوتی ہیں۔ اور عوض معاوضہ گلہ ندارد کے اصول پر دونوں اپنے اپنے رنگ میں خوش رہتے ہیں، عملاً نہ ہوں، دلاً ضروری ہوتی ہیں یہ دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ میری حالت بالکل مختلف ہے۔ میں نے ہمیشہ انھیں اپنا معبود سمجھا۔''

لیکن مرد اس وفاداری کی قدر ہی نہ کرے تو مجبوری ہے مجھے اندیشہ ہے۔ انھوں نے دل میں کوئی اور تہیہ نہ کر لیا ہو۔''

''اور کیا تہیہ کر سکتے ہیں۔''

''کیا آپ ان کا قیاس نہیں کر سکتیں؟''

''اچھا وہ بات، لیکن میری کوئی خطا؟''

''شیر اور میمنے والی کہانی کیا آپ نے نہیں سنی؟''

مسز شاپور یکایک خاموش ہوگئیں، سامنے سے شاپور جی کی کار نظر آئی، انھوں نے کاؤس جی کو ممنون اور ملتجی نظروں سے دیکھا اور دوسرے دروازہ سے نکل کر اندر چلی گئیں۔ مسٹر شاپور جی آنکھوں میں خمار کی سرخی اور سستی بھرے ہوئے کار سے اترے، اور مسکرا کر کاؤس جی سے ہاتھ ملایا۔ اور اپنا ہیٹ کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے کہا۔ معاف کیجیے گا، میں رات ایک دوست کے گھر رہ گیا۔ دعوت تھی، کھانے میں دیر ہوئی، کچھ گانے بجانے کا بھی انتظام تھا۔ میں نے سوچا اب کون گھر جائے۔

کاؤس جی نے طنز آمیز تبسم کے ساتھ پوچھا، کس کے ہاں دعوت تھی، میرے رپورٹر نے تو اس کی کوئی خبر نہیں دی، ذرا مجھے نوٹ کرا دیجیے گا۔

انھوں نے جیب سے نوٹ بک نکالی۔

شاپور جی نے سنبھل کر کہا۔ ایسی کوئی بڑی دعوت نہیں تھی جی، دو چار بے تکلف احباب جمع ہوگئے تھے۔

''پھر بھی اس کی خبر تو اخباروں میں آنی چاہیے۔ جس بے تکلف جلسہ میں آپ جیسے باوقار اصحاب شریک ہوں، اسے اخبار والے کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے اور عوام کو بھی ایسی خبروں سے خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ میزبان کون صاحب تھے؟''

شاپور جی نے ایک پر معنی تبسم کے ساتھ پوچھا۔ ''آپ چونکیں گے تو نہیں۔''

''فرمایئے تو۔''

''مس گوہر۔''

''مس گوہر۔''

''جی ہاں وہی، آپ چونکے کیوں؟ کیا آپ اسے تسلیم نہیں کرتے کہ دن بھر کے درد سر کے بعد مجھے تازہ ہونے کے لیے کچھ تفریح کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ یہ زندگی عذاب ہو جائے۔

کاؤس جی نے زاہدانہ استحکام کے ساتھ کہا۔ میں اسے نہیں مانتا۔

''کیوں؟''

اس لیے کہ میں کسی قسم کی نفسیاتی تفریح کو اپنی منکوحہ کے ساتھ بے انصافی سمجھتا ہوں۔

شاپور جی ہنسے، ایک پر معذرت انداز کے ساتھ بولے، وہی دقیانوسی خیال،

کاؤس جی نے جوش کے ساتھ کہا۔ آپ کو واضح ہونا چاہیے کہ آج کی تہذیب پہلے کی تہذیب سے کہیں زیادہ قرین انصاف ہے۔ اب عورتوں کے حقوق اس حد تک پامال نہیں کیے جاتے، اب عورت کو مرد سے باز پرس کرنے کا حق ہے۔''

''بالفاظ دیگر، اب عورتیں مردوں پر حکومت کر سکتی ہیں۔''

''اس طرح جیسے کہ مرد عورتوں پر حکومت کر سکتے ہیں۔''

''میں اسے نہیں مانتا، مرد عورت کا محتاج نہیں ہے، عورت مرد کی محتاج ہے۔''

''آپ کا مطلب یہی تو ہے کہ عورت اپنی گزر اوقات کے لیے مرد کی دست نگر ہے۔''

''اگر آپ اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، مگر اختیار کی عنان سیاست کی طرح مدنیات میں بھی ہمیشہ ثروت کے ہاتھ رہی ہے

اور رہے گی۔"

کاؤس جی اس مسئلہ پر بہت کچھ لکھ پڑھ چکے تھے اور اس کے ہر پہلو پر غور کیا تھا، بولے۔

"اس اعتبار سے تو اگر خدانخواستہ کسب معاش کا بار عورت اٹھا رہی ہو تو اسے بھی اختیار ہے کہ جس طرح چاہے تفریح کر سکے، آپ کو اس میں کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے۔"

شاپور جی کی زندہ دلی نے متانت کی صورت اختیار کی۔

"میں عورت کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا۔"

"تو یہ آپ کی سراسر بے انصافی ہے۔"

"مطلق نہیں، عورت پر فطرت نے ایسی بندشیں عائد رکھیں ہیں کہ وہ بے حد امکانی کوشش کرنے پر بھی مرد کی طرح مطلق العنان نہیں رہ سکتی اور نہ حیوانی طاقت میں ہی مرد کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ ہاں نسائیت کو ترک کر کے اور غیر فطری زندگی کی حمایت میں جا کر وہ سب کچھ کر سکتی ہے اور آج بھی لاکھوں کروڑوں عورتیں اس آزادانہ روش پر چل رہی ہیں۔"

"آپ لوگ اسے مجبور کر رہے ہیں کہ وہ نسائیت کو ترک کر کے یہ آزادانہ روش اختیار کرے۔"

"میں اس آنے والے زمانے کا قیاس بھی نہیں کرسکتا۔ جب مردوں کی حکومت اور فضیلت کو تسلیم کرنے والی عورتوں کا قحط پڑجائے، قانون اور تہذیب سے مجھے بحث نہیں۔ میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ مردوں نے عورتوں پر ہمیشہ راج کیا ہے اور کریں گے۔"

دفعتاً کاؤس جی نے پہلو بدلا، اتنی تھوڑی سی دیر میں ترغیب نفس نے ان پر تسخیر کا عمل شروع کر دیا تھا۔ شاپور جی کو تحسین کی نظروں سے دیکھ کر بولے۔ تو اس معاملہ میں میں اور آپ دونوں ہم خیال ہیں، میں صرف آپ کی تھاہ لے رہا تھا۔ میں عورت کو بیوی ماں بہن کی صورت ہی میں دیکھ سکتا ہوں۔ اسے مطلق العنان نہیں دیکھ سکتا۔ اگر کوئی عورت آزاد رہنا چاہتی ہے تو اسے میرے نظام تمدن میں کوئی جگہ نہیں ہے، ابھی مسز شاپور کی باتیں سن کر میں حیرت میں آگیا مجھے اس کا خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ کوئی

عورت اتنے فاسد خیالات کو دل میں جگہ دے سکتی ہے۔

شاپور جی کی گردن کی رگیں تن گئیں، نتھنے پھول کھل گئے، آنکھیں مشتعل ہوگئیں، تنفس تیز ہوگیا۔ کرسی سے اٹھ کر بولے، اچھا تو شیریں نے اب یہ پر نکالے ہیں، میں ابھی اس سے پوچھتا ہوں، آپ کے رو برو پوچھتا ہوں، ابھی فیصلہ کر ڈالوں گا۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے، کسی کی پرواہ نہیں ہے، بیوفا عورت، تنگ نظر، کور باطن، جس کے دل میں ہمدردی کا شائبہ تک نہیں، جو میری تاریک زندگی میں روشنی کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکتی، جو مجھے زندگی کی جگر کا دیوں سے ایک لمحہ بھی مہلت نہیں دینا چاہتی، کیا وہ چاہتی ہے کہ میں ہمیشہ اس کے آنچل سے بندھا گھوموں، شاپور سے وہ یہ امید رکھتی ہے، بیوقوف بھول جاتی ہے کہ اگر میں ذرا سا آنکھوں کا اشارہ کردوں تو ایک سو شیریاں آکر میری ناز برداری کریں۔ جی ہاں میرے تلوے سہلائیں۔ میں نے اس کے لیے جو کچھ کیا شاید ہی کسی مرد نے کسی عورت کے لیے کیا ہوگا۔ میں نے... میں نے...

انھیں معاً خیال آگیا، کہ وہ ضرورت سے زیادہ بہکے جا رہے ہیں، شیریں کی وہ محبت آمیز قربانیاں، وہ بے نفس خدمتیں یاد آگئیں، ضبط کرکے بولے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی سمجھ سے کام لے سکتی ہے۔ میں اس کا دل دکھانا نہیں چاہتا، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتی ہے وہ احباب سے میری شکایت ہے۔ اپنی مجبوری کا اظہار اس سے آگے قدم اٹھانے کی حماقت سرزد نہیں ہوسکتی، اس کی غیرت قبول نہ کرے گی، میں اسے منالوں گا، عورتوں کا منا لینا بہت مشکل ہے، کم سے کم مجھے تو یہی تجربہ ہے۔

کاؤس جی نے تردید کی، میرا تجربہ تو کچھ اور ہے۔

''ممکن ہے، لیکن آپ کے پاس خالی خولی باتیں ہیں۔ میرے پاس دولت کا تریاق ہے۔''

''انحراف کا اثر تریاق سے رد نہیں ہوسکتا۔''

شاپور جی نے خطرہ کا صحیح اندازہ کرنے کی کوشش کرکے کہا، شاید آپ کا خیال درست ہو۔

کئی دنوں کے بعد کاؤس جی کی ملاقات شریں سے ہوئی، پارک میں وہ اسی موقع

کے منتظر تھے۔ ادھر وہ شیریں کے گھر نہ گئے تھے، اندیشہ تھا، شاپور جی بدگمان نہ ہو جائیں، ان کی جنت تعیر ہو چکی تھی، اس میں صرف شیریں کو مسند پر بٹھانے کی کسر تھی، اس روز سعید کے تصور میں وہ پاگل ہو رہے تھے، بالکل خبر نہ تھی کہ اس جنت کی بنیادیں بالوں پر ہیں یا پانی پر ہیں۔ امید کا سراب دیکھ کر بڑے بڑے دانا بھی، شیخ چلی ہو جاتے ہیں، گلشن کو انھوں نے میکے بھیج دیا تھا، بھیج کیا دیا تھا۔ وہ روٹھ کر چلی گئی تھی۔ جب شیریں ان کی غربت اور بے سرو سامانی کی دعوت قبول کر رہی ہے تو گلشن کی ناز برداری کیوں کی جائے، لپک کر شیریں سے ہاتھ ملایا، اور بولے آپ خوب ملیں، میں تو آج آنے والا تھا۔

شیریں نے شکایت کی آپ کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئیں، شاید آپ بھی زبانی ہمدردی ہی کرنا جانتے ہیں۔ آپ کو کیا خبر ان دنوں میں میری آنکھوں سے کتنے آنسو بہے۔

کاؤس جی نے شیریں کا حسین چہر اشتیاق سے چمکتا ہوا اور التجا سے زہد شکن دیکھا تو ان کا دل اندر سے دبا ہوا معلوم ہوا، اس طالب علم کی سی حالت ہوئی جو آج تعلیم کی آخری منزل طے کر چکا ہو، زندگی کا مسئلہ اپنی خوفناک صورت میں اس کے سامنے کھڑا ہو، کاش وہ کچھ دن اور امتحانوں کی بھولی بھلیاں میں زندگی کے میٹھے سنہرے خوابو ں کا لطف اٹھا سکتا، اس خواب کے سامنے یہ حقیقت کتنی دلدوز تھی، کتنی ہمت شکن، ابھی تک کاؤس جی نے مہاکھی کا شہد ہی چکھا تھا۔ اس وقت وہ ان کے چہرہ پر منڈلا رہی تھی اور وہ ڈر رہے تھے، کہیں ڈنک نہ مارے۔

دبی ہوئی آواز سے بولے، مجھے یہ سن کر دلی صدمہ ہوا۔ میں نے تو شاپور کو بہت سمجھایا تھا شیریں نے ان کا ہاتھ بے تکلفی سے پکڑ کر ایک بنچ پر بٹھا دیا اور آنکھوں میں اصرار اور التجا بھر کر بولی۔ ان پر اب سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوگا، اور مجھے ہی کیا غرض پڑی ہے کہ میں ان کی خوشامد کرتی رہوں آج میں نے عہد کر لیا ہے کہ اب لوٹ کر اس گھر میں نہ جاؤں گی، اگر انھیں عدالت میں ذلیل ہونے کا شوق ہے تو مجھ پر حق شوہریت کا دعویٰ کریں میں تیار ہوں۔ جس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی اس کے ساتھ رہنے کے لیے خدا مجھے مجبور نہیں کر سکتا، عدالت کیا چیز ہے، اگر تم میں، تمھارے دل

میں خلوص اور محبت ہے جس کا تم اشاروں میں بارہا اظہار کر چکے ہو، اور جسے میں نے ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے، جسے میں نے پیغام سمجھا ہے تو آج سے میں تمھاری بن کر رہنے کو تیار ہوں۔ جب تک تم میرے رہو گے میں دولت کی بھوکی نہیں، یہ تم جانتے ہو، میں صرف وفا اور محبت چاہتی ہوں، لیکن اگر تم میں اتنی اخلاقی ہمت نہیں ہے تو میرے لیے وسیع دنیا ہے، میں جیسی کچھ بھی ہوں اتنا جانتی ہوں کہ میرے قدر دانوں کی کمی نہیں ہے، صاف صاف بتاؤ، کیاوہ ساری ہمدردیاں محض زبانی تھیں۔

کاؤس جی نے کلیجہ مضبوط کر کے کہا۔ ''نہیں نہیں، شیریں، خدا جانتا ہے، میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ تم میری جنت کی دیوی ہو، میری زندگی کا روشن ستارہ......

''زیادہ لفاظی نہیں۔ گلشن کو کیا کروگے؟''

''اسے طلاق دے دوں گا۔''

''ہاں میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ اور مجھے اس کا افسوس نہیں ہے، میں اس کا بنا بنایا آشیانہ برباد نہیں کر رہی ہوں۔ میں صرف اس آشیانہ کو آباد کر رہی ہوں جس کی اس نے کبھی قدر نہیں کی تو میں تمھارے ساتھ چلوں گی، اس وقت، خوب سوچ لیا، شاپور سے اب میرا کوئی تعلق نہیں نہ دین کا نہ دنیا کا۔

کاؤس جی کو اپنے دل میں ایک رعشہ کا احساس ہوا، گدی گدی نہیں تھی، رعشہ نہیں تھا، لرزہ، کپکپی، بولے ''لیکن ابھی تو میرے گھر میں کوئی تیاری نہیں ہے۔''

شیریں نے بنچ سے اٹھ کر گویا دریا میں کودتے ہوئے کہا۔ ''میرے لیے کسی تیاری کی ضرورت نہیں، تم سب کچھ ہو۔ ایک ٹیکسی لے لو، میں اسی وقت چلوں گی، تمھارے گھر سے شاپور کو ایک رقعہ لکھ دوں گی، تم مجھ سے سیر ہوگئے۔اس لیے جاتی ہوں۔ پھر نہ آؤں گی۔''

کاؤس جی ٹیکسی کی تلاش میں پارک سے نکلے۔ وہ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے تھوڑی سی مہلت چاہتے تھے۔ اس بہانہ سے وہ مہلت مل گئی، اب ان پر جوانی کا وہ نشہ نہیں تھا جو کبھی کبھی ہمیں گڈھوں میں گرا دیا کرتا ہے، ذلت کے، رسوائی کے، اگر کچھ نشہ ہوا بھی تو وہ اب تک ہرن ہو چکا تھا، بے شک انھیں پریشانی ہوگی، تباہی کے سامان بھی ہوسکتے ہیں اور رسوائی کے بھی، شاپور جی ان کے قاتل دشمن ہو جائیں گے، اور انھیں

خاک میں ملا دینے کے لیے اپنی ثروت اور اختیار کے سارے وسائل کام میں لائیں گے، گلشن بھی خاموش بیٹھنے والی نہیں، وہ گلی گلی، کوچے کوچے میں انھیں رسوا کرے گی۔ اخباروں میں کہرام مچ جاوے گا، حریفوں کی قسمت جاگ اٹھے گی، اس واقعہ کو جلی سرخیوں سے شائع کریں گے، بوالہوسی کے کرشمے، ایک شکاری اڈیٹر کی رنگین مزاجی، نئی تہذیب کا دیوالہ وغیرہ۔ مگر یہ سب مصیبتیں جھیلنے کے لیے وہ تیار تھے، شاپور جی کی زبان بند کرنے کے لیے ان کے پاس کافی دلیلیں تھیں، شہادتیں تھیں، گلشن کو بھی طبقہ اناث میں ذلیل کرنے کا ان کے پاس کافی سامان تھا۔شیریں جیسی پاک نفس عورت کے لیے وہ اس سے کہیں سخت آزمائش کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے۔ خوف تھا تو یہ کہ شیریں کی اس محبت میں قیام بھی ہے یا نہیں۔ ابھی تک شیریں نے انھیں صرف انصاف اورحق کے وکیل کی حیثیت سے دیکھا ہے، صرف ان کے بیدار مغزانہ مضامین پڑھے ہیں، صرف ان کی شرافت اور ہمدردی سے بھری ہوئی باتیں سنی ہیں۔ اس میدان میں تو انھیں شاپور سے کسی قسم کا اندیشہ نہ تھا، اخلاقی، ذہنی جذباتی اوصاف میں شاپور ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے، لیکن ان کی شرافت ذکاوت کا وہ رنگ ان کی بے سروسامانی اور بدحالی میں کچھ عرصہ تک قائم رہے گا۔ اس میں انھیں شک تھا، حلوے کی جگہ چپڑی روٹیاں بھی ملیں تو آدمی صبر کر سکتا ہے، روکھی بھی مل جائے تو شاید وہ قناعت کرے۔ لیکن سوکھی گھاس سامنے دیکھ کر تو فرشتے بھی جامے سے باہر ہو جائیں گے۔ شیریں کو ان سے محبت ہے۔ اس میں شک نہیں۔ لیکن محبت کی قربانی کی بھی تو کوئی حد ہے، دو چار دن یا دو مہینے تو شعریت کے نشہ میں وہ خاموشی سے کاٹ لے گی لیکن شعریت اور کیف قائم رہنے والی چیزیں تو نہیں۔ حقیقتوں کی یورش کے مقابلے میں شعریت کتنے دن ٹکے گی۔ اس چھپھالیدر کا تصور کرکے وہ کانپ اٹھے، اب تک وہ محل میں رہی ہے اب اسے ایک پھونس کی جھونپڑی ملے گی۔ جس کی فرش پر ایرانی قالینوں کی جگمگاہٹ بھی نہیں، کہاں وردی پوش ملازموں کی پلٹن کہاں ایک بڑھیا ماما کی کج بحثیاں، جو بات بات پر بھنبھناتی ہے، کوستی ہے اور چھوڑ کر بیٹھ جانے کی دھمکی دیتی ہے،ان کی آدھی آمدنی تو موسیقی کے ماسٹر کی نذر ہو جائے گی، جو اسے گانا سکھانے آتا ہے اور کہیں شاپور جی نے سفلہ پن سے کام لیا تو انھیں بدمعاشوں سے پٹوا سکتے ہیں، قتل کرا سکتے ہیں، خیر ان باتوں سے وہ

نہیں ڈرتے یہ تو ان کی فتح ہوگی، لیکن شیریں کی نفاست پسندی اور شوق نمود پر کیسے فتح پائیں، بڑھیا ماما جب منہ پھلائے آکر اس کے سامنے روٹیاں اور سالن رکھ دے گی، چاندی کی ظروف میں نہیں چینی کی 'شتریوں میں، تب شیریں کے شگفتہ چہرے پر کیسی مظلوم مایوسی طاری ہو جائے گی، کہیں، وہ اس برانگیختگی کے عالم میں ان کو اور اپنی قسمت کو لعنت نہ بھیجنے لگے، تمول کی کمی نازبرداریوں سے نہیں پوری کی جاسکتی۔

دفعتاً سامنے سے ایک کار نظر آئی، کاؤس جی نے دیکھا، شاپور جی رونق افروز تھے انھوں نے ہاتھ اٹھا کر کار روک لیا اور پیچھے دوڑتے ہوئے آکر شاپور جی سے بولے۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''یوں ہی ذرا گھومنے نکلا ہوں۔''

''شیریں بانو پارک میں ہیں انھیں لیتے جایئے۔''

''وہ تو مجھ سے لڑ کر آئی ہیں کہ اب گھر میں کبھی قدم نہ رکھوں گی۔''

''اور آپ سیر کرنے جا رہے ہیں؟''

''تو آپ کیا چاہتے ہیں بیٹھ کر رووٴں۔''

''بہت رو رہی ہیں''

''ہمدردی کرنے کو تو آپ ہیں ہی۔''

''آپ انھیں منائیں، ذرا ان کے آنسو پونچھیں وہ ضرور آپ کے ساتھ چلی جائیں گی۔''

''میں امتحان لینا چاہتا ہوں کہ وہ بغیر منائے مانتی ہیں یا نہیں۔''

''میری جان بڑے عذاب میں ہے، آپ مجھ پر رحم کیجیے آپ کے پیروں پڑتا ہوں۔''

''شیریں جیسی حسینہ کو اپنی حمایت میں لینا عذاب نہیں ہے جناب، نہایت خوشگوار فرض ہے۔ اور بہت سعی کے بعد آپ کو یہ موقع ہاتھ آیا ہے۔ میں تو روٹھنے منانے کے تماشوں میں اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا،اس کا بھی ایک زمانہ تھا، مگر مدت ہوئی ہے۔ بزم چراغاں کیے ہوئے۔

کار چل دی اور کاؤس جی مخمصے کی حالت میں وہیں کھڑے رہ گئے۔ دیر ہو رہی

تھی، سوچنے لگے، کہیں شیریں یہ نہ سمجھنے لگے کہ انھوں نے بھی اس کے ساتھ دغا کی، لیکن جائیں کیسے اس امیر زادی کو اپنی اس سنسان کٹیا میں لے جانے کا خیال ہی انھیں مضحکہ خیز معلوم ہوا۔ حیرت یہی تھی کہ پہلے یہ خیال ان کے دل میں کیونکر آیا وہ کٹیا تو اسی لیے ہے کہ ایک ایڈیٹر عابدانہ محویت کے ساتھ حق اور انصاف اور آزادی کی پرستش کرے، امارت اور نفاست کے لیے وہاں جگہ کہاں؟ بلبل کے لیے گلشن چاہیے ویرانے میں اس کی دلچسپی کے سامان کہاں۔ اس کٹیا کے لیے تو گلشن ہی موزوں ہے کڑھتی ہے، کوستی ہے، جلاتی ہے، لیکن ذلت پر کھانا تو دے دیتی ہے، پھٹے ہوئے کپڑوں کا رفع کر دیتی ہے کوئی مہمان آجاتا ہے تو خندہ پیشانی سے اس کی خاطر و تعظیم کرتی ہے، کوئی چھوٹی سی سوغات بھی دے دو کتنی خوش ہو جاتی ہے۔ تھوڑی سی تعریف کرکے چاہے اس سے غلامی کرو الو، اب انھیں اپنا ذرا ذرا سی باتوں پر جھنجھلا پڑنا اس کی سیدھی باتوں کا ٹیڑھا جواب دینا، شیریں کی شرافت کی نظریں دیکھ کر اسے ذلیل کرنا یاد آنے لگا، ان کی حق پژدہی اور عالی نفسی کیا محض تحریر کے لیے وقف ہے، محض ان کے لیے جو ان سے دور ہیں، بے تعلق ہیں، اس دن گلشن نے یہی تو کہا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن کی سالگرہ کے موقع پر کوئی تحفہ بھیجنا چاہیے، اس میں برس پڑنے کی کون سی بات تھی، مانا وہ ادارتی مقالہ لکھنے میں محو تھے لیکن ان کے لیے ادارتی مقالہ جتنا اہم اور ضروری ہے کیا اتنا ہی یا اس سے زیادہ ضروری اور اہم گلشن کے لیے تحفہ بھیجنا نہیں ہے۔ بے شک ان کے پاس اس وقت روپے نہ تھے، معمولی سوغات سے گلشن کو تسکین نہ ہوتی، لیکن وہ میٹھے الفاظ میں یہ نہ کہہ سکتے تھے کہ ڈارلنگ مجھے افسوس ہے اس وقت میں تنگ دست ہوں لیکن دو چار روز میں کوئی انتظام کر دوں گا۔ یہ جواب سن کر وہ خاموش ہو جاتی اور اگر کچھ بھنبھنا ہی لیتی تو ان کا کیا بگڑ جاتا، ترکِ موالات تو نہ کر بیٹھتی اپنے مقالات اور مضامین میں وہ کتنی ملاحت اور فصاحت اور خوش بیانی سے کام لیتے تھے۔ ایک بھی دل آزار کاسہ ان کے قلم سے نہ نکلتا تھا، دنیائے فصاحت میں ان کا قلم اپنی لطافت کے لیے مشہور تھا، کیا محض اس خوف سے کہ وہ گورنمنٹ اور پبلک دونوں ہی سے ڈرتے تھے۔ جانتے تھے کہ ذرا بھی سخت کلامی کی اور گردن ناپی گئی، ان کے آئین صحافت میں غصہ اور ہٹ دھرمی بہت بڑے گناہ تھے۔ پھر وہ گلشن پر کیوں برہنہ شمشیر کی طرح ٹوٹ پڑتے تھے، کیا اس

لیے کہ وہ ان کی دست نگر ہے اور روٹھ جانے کے سوا انھیں اور کوئی سزا نہیں دے سکتی، کتنی کمینہ خودغرضی ہے کہ وہ اقتدار اور اختیار والوں کے سامنے دم ہلائیں اور جو ان کے لیے اپنی زندگی قربان کر سکتی ہے اور کرتی ہے، اسے کاٹنے ڈوڑیں۔

ان کا دھیان اس تانگہ کی طرف گیا جو یکایک سامنے رک گیا تھا۔ کتنے بدمعاش ہوتے ہیں یہ تانگے والے، اندھا دھند دوڑا چلا جاتا ہے، اچھا، اس پر تو کوئی لیڈی صاحب سوار ہیں۔ غالباً آپ کو تانگے پر کا لطف اٹھانے کا خبط سوار ہوا ہوگا، ارے یہ تو گلشن ہے، ہاں وہی اور میری ہی طرف آرہی ہے انھوں نے تپاک سے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ اور بولے تم اس وقت یہاں کیسے آئیں، میں ابھی ابھی تمھارا ہی خیال کر رہا تھا۔

گلشن نے رقت آمیز لہجہ میں کہا۔ تمھارے ہی پاس آ رہی تھی۔ شام کو بر آمدے میں بیٹھی تمھارا مقالہ پڑھ رہی تھی کہ نہ جانے کب جھپکی آگئی، اور میں نے ایک وحشت ناک خواب دیکھا مارے خوف آنکھ کھل گئی اور تم سے ملنے چل پڑی۔ دل بے چین ہو رہا تھا۔ تم اس وقت یہاں کیوں کھڑے ہو کوئی حادثہ تو نہیں ہوگیا، میرا سینہ دھک دھک کر رہا ہے ہاتھ رکھ کر دیکھو۔

کاؤس جی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ میں تو خدا کے فضل سے بہت اچھی طرح ہوں خواب دیکھا تم نے؟

میں نے دیکھا جیسے تم ایک عورت کے پیروں پر سر رکھے ہوئے ہو اور وہ تمھیں پائے حقارت سے ٹھکرا رہی ہے، پھر دیکھا کہ پولس آگئی ہے اور تمھیں گھسیٹے لیے جا رہی ہے۔"

"کتنا بیہودہ اور مہمل خواب ہے اور تمھیں اس پر یقین بھی آگیا میں تم سے کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ خواب محض فکر مند دل کے اوہام ہیں۔"

"گلشن نے ان کی طرف شبہ کی نظروں سے دیکھا، "تم مجھ سے چھپا رہے ہو، کوئی نہ کوئی بات ہوئی ہے ضرور، اچھا تم اس وقت یہاں کیوں کھڑے ہو؟ یہ تو تمھارے کہنے کا وقت ہے۔"

"یوں ہی ذرا گھومنے چلا آیا تھا۔ اکیلے گھر میں جی نہ لگا۔"

''جھوٹ بولتے ہو، کھا جاؤ میرے سر کی قسم۔''

''اب تمھیں اعتبار نہ آئے تو اس کا کیا علاج۔''

''قسم کیوں نہیں کھاتے۔''

''قسم کو میں کذب کی تائید سمجھتا ہوں۔''

''گلشن نے پھر ان کے چہرے پر متجسس نگاہ ڈالی، پھر ایک لمحہ کے بعد بولی۔

''اچھی بات ہے چلو گھر چلیں۔''

کاؤس جی نے مسکرا کر کہا۔ ''تم پھر مجھ سے لڑائی کروگی۔''

گلشن نے برجستہ کہا، سرکار سے لڑ کر بھی تم سرکار کی عملداری میں رہتے ہو کہ نہیں؟

''ہم اسے کب مانتے ہیں کہ یہ سرکار کی عملداری ہے۔''

''یہ تو محض زبان سے کہتے ہو۔ تمھارا رواں رواں اسے تسلیم کر رہا ہے، نہیں تو تم اس وقت جیل میں ہوتے۔''

''اچھا تو چلو، میں ، ذرا دیر میں آتا ہوں۔''

''میں اکیلی نہیں جانے کی، آخر سنو، تم یہاں کیا کر رہے ہو۔''

کاؤس جی نے بہت کوشش کی کہ گلشن یہاں سے کسی طرح چلی جائے، لیکن وہ جتنا ہی اس پر زور دیتے تھے اتنی ہی گلشن اور ضد پکڑتی تھی۔ آخر مجبور ہو کر کاؤس جی کو شاپور اور شیریں کی خانہ جنگیوں کی داستان کہنی پڑی۔ ہاں اسی ناٹک میں ان کا اپنا جو حصہ تھا اسے انھوں نے بڑی ہوشیاری سے چھپا دینے کی کوشش کی۔

گلشن نے الہامی انداز سے کہا۔ ''تو تمھیں یہ جنون بھی سوار ہوا۔''

کاؤس جی نے فوراً اپنی صفائی دی۔ ''کیسا جنون۔ میری اس میں کیا خطا ؟''

''تم کیوں بیچ میں پڑے، آخر شیریں نے تم سے کیوں داد خواہی کی۔''

''اب یہ تو انسانیت نہیں ہے کہ ایک دوست کی بیوی مجھ سے فریاد کرے۔ اور میں بغلیں جھانکتا پھروں۔''

گلشن نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا۔ ''جھوٹ بولنے کے لیے بڑی عقل کی ضرورت ہوتی ہے پیارے، اور وہ عقل تم میں نہیں ہے، سمجھے تم اپنا اخبار لکھے جاؤ اور حق و

انصاف کے نعرے لگائے جاؤ۔ ان خانہ جنگیوں میں پڑ کر تمھاری زندگی تلخ ہو جائے گی اور تمھارے ساتھ میری بھی، چپکے سے جا کر شیریں بانو کو سلام کرو اور کہو کہ جا کر اپنے گھر میں آرام سے بیٹھیں۔ مسرت کامل کا دنیا میں وجود ہی نہیں، مشیت اتنی بے انصافی نہیں کر سکتی، جس طرح غم میں کچھ خوشی ہوتی ہے اسی طرح خوشی میں کچھ غم بھی شامل ہوتا ہے۔ اگر مسرت کا لطف اٹھانا ہے تو اس کے کانٹوں اور داغوں اور خامیوں کے ساتھ اٹھانا پڑے گا۔ ابھی سائنس نے کوئی ایسی ایجاد نہیں کی جس سے ہم مسرت کو اس کے کانٹوں سے علیٰحدہ کر سکیں۔ مفت کا مال اڑانے والوں کو عیاشی کے سوا اور کیا سوجھے گا؟ دولت اگر ساری دنیا کی لذتوں کو خریدنا چاہے تو وہ دولت ہی کیسی، اس کی اشتہائیں میسر نہیں ہوتیں، کبھی نہیں، کیا شیریں کے لیے بھی وہی دروازے نہیں کھلے ہیں، جو شاپور جی کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ اس سے کہو شاپور جی کی چھاتی پر مونگ دلے۔ ان کی دولت سے حظ اٹھائے اور بھول جائے کہ وہ شاپور جی کی بیوی ہے، اسی طرح جیسے شاپور بھول گیا ہے کہ وہ شیریں کا شوہر ہے، جلنا اور کڑھنا چھوڑ کر دولت کے مزے لوٹے، اس کی دولت ایک سے ایک حسین اور رنگین مزاج نوجوانوں کو کھینچ لائے گی۔ تم نے ہی مجھ سے کہا تھا کہ ایک زمانہ میں فرانس میں باثروت اور عیاش عورتوں کا سارے سماج پر راج تھا، ان کے شوہر سب کچھ دیکھتے تھے اور منھ نہ کھول سکتے تھے اور خود اس دھن میں مست تھے، یہی دولت کا فیض ہے، آج سے نہیں ازل سے تم سے نہ بنے تو چلو میں شیریں کو سمجھا دوں، عیاش مرد کی بیوی اگر عیاش نہ ہو تو یہ اس کی بے حسی اور بے شرمی ہے۔''

کاؤس جی کے لیے یہ فلسفہ بالکل اچھوتا تھا۔ گلشن کی ذکاوت نے کبھی اتنی اونچی پرواز نہ کی تھی، حیرت میں آکر بولے، ''لیکن تم بھی دولت کے پرستاروں میں ہو۔''

گلشن نے شرمندہ ہو کر کہا، یہی تو زندگی کی لعنت ہے، ہم اسی چیز پر لپکتے ہیں جو ہمیں جہنم اور بربادی کی طرف لے جاتی ہے۔ میں پاپا کے ساتھ عرصہ تک دیہات میں رہی ہوں۔ وہاں چاروں طرف مزدور اورکسان رہتے تھے۔ بچارے دن بھر پسینہ بہاتے تھے شام کو جیسے مر جاتے تھے۔ عیاشی اور بدمعاش کا کہیں نام نہ تھا، اور یہاں شہر میں دیکھتی ہوں کہ سبھی بڑے گھروں میں یہی رونا ہے۔ سبھی لوگ ہتھکنڈوں سے پیسے کماتے

ہیں، بے منت بے مشقت اور غیر فطری زندگی بسر کرتے ہیں۔ انھیں عیاشی نہ سوجھے تو کسے سوجھے۔ اگر آج تمھیں کہیں سے دولت مل جائے تو تم بھی شاپور بن جاؤ گے یقیناً۔''

کاؤس جی نے شرارت سے پوچھا، ''تب شاید تم بھی یہ نیا طرزِ عمل اختیار کروگی۔''

گلشن نے متبسم آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔

''شاید نہیں یقیناً۔''

(یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ 'ہنس' کے جون 1935 کے شمارے میں شائع ہوا۔ 'مان سرووَر' 2 میں شامل ہے۔ عنوان ہے 'جیونی کا شاپ'۔ اردو میں یہ 'زادِ راہ' میں شامل ہے۔)

جرمانہ

ایسا شاید ہی کوئی مہینہ جاتا کہ اللہ رکھی کے ویتن سے کچھ جرمانہ نہ کٹ جاتا۔ کبھی کبھی تو اسے 6 روپیے کے 5 ہی روپیے ملتے، لیکن وہ سب کچھ سہہ کر بھی صفائی کے داروغہ محمد خیرات علی خاں کے چنگل میں کبھی نہ آئی۔ خاں صاحب کی ماتحتی میں سیکڑوں مہترانیاں تھیں۔ کسی کی بھی طلب نہ کٹتی، کسی پر جرمانہ نہ ہوتا۔ نہ ڈانٹ ہی پڑتی۔ خاں صاحب نیک نام تھے، دیالو تھے، مگر اللہ رکھی ان کے ہاتھوں برابر تاڑنا پاتی رہتی تھی۔ وہ کام چور نہیں تھی، بے ادب نہیں تھی، پھوہڑ نہیں تھی، بدصورت بھی نہیں تھی، پہر رات کو اس ٹھنڈ کے دنوں میں وہ جھاڑو لے کر نکل جاتی اور نو بجے تک ایک چت ہوکر سڑک پر جھاڑو لگاتی رہتی۔ پھر بھی اس پر جرمانہ ہو جاتا۔ اس کا پتی حسینی بھی اوسر پاکر اس کا کام کردیتا لیکن اللہ رکھی کی قسمت میں جرمانہ دینا تھا۔ طلب کا دن اوروں کے لیے ہنسنے کا دن تھا، اللہ رکھی کے لیے رونے کا۔ اس دن اس کا من جیسے سولی پر ٹنگا رہتا۔ نہ جانے کتنے پیسے کٹ جائیں گے؟ وہ پریکشا والے چھاتروں کی طرح بار بار جرمانہ کی رقم کا تخمینہ کرتی۔

اس دن وہ تھک کر ذرا دم لینے کے لیے بیٹھ گئی تھی۔ اسی وقت داروغہ جی اپنے یکّے پر آرہے تھے۔ وہ کتنا کہتی رہی حضور عالی میں پھر کام کروں گی لیکن انھوں نے ایک نہ سنی تھی، اپنی کتاب میں اس کا نام نوٹ کر لیا تھا۔ اس کے کئی دن بعد پھر ایسا ہی ہوا۔ وہ حلوائی سے ایک پیسے کے سیوڑے لے کر کھا رہی تھی اسی وقت داروغہ نہ جانے کدھر سے نکل پڑا تھا اور پھر اس کا نام لکھ لیا گیا تھا۔ نہ جانے کہاں چھپا رہتا ہے ذرا بھی ستانے لگے کہ بھوت کی طرح آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ نام تو اس نے دو ہی دن لکھا تھا پر جرمانہ کتنا کرتا ہے، اللہ جانے۔ آٹھ آنے سے بڑھ کر ایک روپے نہ ہو جائے وہ سر جھکائے ویتن لینے جاتی اور تخمینے سے کچھ زیادہ کٹا ہوا پاتی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے

روپیے لے کر آنکھوں میں آنسو بھرے لوٹ آتی۔ کس سے فریاد کرے، داروغہ کے سامنے اس کی سنے گا کون؟

آج پھر وہی طلب کا دن تھا۔ اس مہینے میں اس کی دودھ پیتی بچی کو کھانسی اور جُور آنے لگا تھا۔ ٹھنڈ بھی خوب پڑی تھی۔ کچھ تو ٹھنڈ کے مارے اور کچھ لڑکی کے رونے چلّانے کے کارن اسے رات، رات بھر جاگنا پڑتا تھا۔ کئی دن کام پر جانے میں دیر ہوگئی تھی۔ داروغہ نے اس کا نام لکھ لیا تھا اب کی آدھے روپیے کٹ جائیں گے۔ آدھے بھی مل جائیں تو غنیمت ہے۔ کون جانے، کتنا کٹا ہے؟ اس نے تڑکے بچی کو گود میں اٹھایا اور جھاڑو لے کر سڑک پر جاپہنچی۔ مگر وہ دشٹ گود سے اترتی ہی نہ تھی۔ اس نے بار بار داروغہ کے آنے کی دھمکی دی۔ ابھی آتا ہوگا، مجھے بھی مارے گا، تیرے بھی ناک کان کاٹ لے گا لیکن لڑکی کو اپنے ناک کان کٹوانا منظور تھا۔ گود سے اترنا منظور نہ تھا، آخرجب وہ ڈرانے دھمکانے، پیارنے، پچکارنے، کسی اپائے سے نہ اتری تو اللہ رکھی نے اسے گود سے اتار دیا اور اسے روتی چلاتی چھوڑ کر جھاڑو لگانے لگی۔ مگر وہ اَبھاگنی ایک جگہ بیٹھ کر من بھر روتی بھی نہ تھی۔ اللہ رکھی کے پیچھے لگی ہوئی بار بار اس کی ساڑی پکڑ کر کھینچتی، اس کی ٹانگ سے لپٹ جاتی، پھر زمین پر لوٹ جاتی اور ایک چھن میں اٹھ کر پھر رونے لگتی۔

اس نے جھاڑو تان کر کہا چپ ہو جا، نہیں تو جھاڑو سے ماروں گی، جان نکل جائے گی، ابھی داروغہ داڑھی جار آتا ہوگا۔ پوری دھمکی منھ سے نکل بھی نہ پائی تھی کہ داروغہ خیراتِ علی خاں سامنے آکر سائیکل سے اتر پڑا۔ اللہ رکھی کا رنگ اڑ گیا، کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ یا میرے اللہ کہیں اس نے سن نہ لیا ہو۔ میری آنکھ پھوٹ جائے۔ سامنے سے آیا اور میں نے دیکھا نہیں، کون جانتا تھا۔ آج پیر گاڑی پر آرہا ہے؟ روز تو یکّے پر آتا تھا۔ ناڑیوں میں رکت کا دوڑنا بند ہوگیا۔ جھاڑو ہاتھ میں لیے، نِستبدھ کھڑی رہ گئی۔

داروغہ نے ڈانٹ کر کہا۔ کام کرنے چلتی ہے تو ایک پوچھلا ساتھ لے لیتی ہے۔ اسے گھر پر کیوں نہیں چھوڑ آئی؟

اللہ رکھی نے کاتر سور میں کہا۔ اس کا جی اچھا نہیں ہے حضور، گھر پر کس کے پاس

چھوڑ آتی۔

'کیا ہوا ہے اس کو۔'

'بخار آتا ہے حضور۔'

'اور تو اسے یوں چھوڑ کر رلا رہی ہے۔ مرے گی کہ جئے گی۔'

'گود میں لیے لیے کام کیسے کروں حضور۔'

'چھٹی کیوں نہیں لے لیتی۔'

'طلب کٹ جاتی حضور، گزارا کیسے ہوتا؟'

اسے اٹھا لے اور گھر جا۔ حسینی لوٹ کر آئے تو ادھر جھاڑو لگانے کے لیے بھیج دینا۔

اللہ رکھی نے لڑکی کو اٹھالیا اور چلنے کو ہوئی، تب داروغہ جی نے پوچھا 'مجھے گالی کیوں دے رہی تھی؟'

اللہ رکھی کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ کاٹو تو لہو نہیں۔ تھر تھر کانپتی بولی۔ نہیں حضور، میری آنکھیں پھوٹ جائیں جو تم کو گالی دی ہو۔'

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سندھیا سمے حسینی اور اللہ رکھی دونوں طلب لینے چلے۔ اللہ رکھی بہت اداس تھی۔

حسینی نے سانتونا دی۔ 'تو' اتنی اداس کیوں ہے؟ طلب ہی نہ کٹے گی، کاٹنے دے، اب کی سے تیری جان کی قسم کھاتا ہوں، ایک گھونٹ دارو یا تاڑی نہیں پیوں گا۔'

'میں ڈرتی ہوں، برخاست نہ کر دے، میری جیبھ جل جائے، کہاں سے کہاں...'

برخاست کردے گا، کردے، اس کا اللہ بھلا کرے۔ کہاں تک روئیں۔

تم مجھے ناحق لیے چلتے ہو۔ سب کی سب ہنسیں گی۔

'برخاست کرے گا تو پوچھوں گا نہیں کہ کس الزام پر برخاست کرتے ہو، گالی دیتے کس نے سنا۔'

'کوئی اندھیر ہے، جسے چاہے برخاست کردے اور جو کہیں سنوائی نہ ہوئی تو پنچوں سے فریاد کروں گا۔ چودھری کے دروازے پر سر پٹک دوں گا۔'

'ایسی ہی ایکتا ہوتی تو داروغہ اتنا جری مانہ کرنے پاتا؟'

'جتنا بڑا روگ ہوتا ہے اتنی دوا ہوتی ہے، پگلی۔'

پھر بھی اللہ رکھی کا من شانت نہ ہوا۔ مکھ پر وشاد کا دھواں سا چھایا ہوا تھا۔ داروغہ کیوں گالی سن کر بھی بگڑا نہیں۔ اسی وقت اسے کیوں نہیں برخاست کردیا۔ یہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ وہ کچھ دیالو بھی معلوم ہوتا تھا۔ اس کا رہسیہ وہ نہ سمجھ پائی تھی، اور جو چیز ہماری سمجھ میں نہیں آتی، اسی سے ہم ڈرتے ہیں۔ کیول جرمانہ کرنا ہوتا تو اس نے کتاب پر اس کا نام لکھا ہوتا۔ اس کو نکال باہر کرنے کا نشچیہ کر چکا ہے تبھی دیالو ہو گیا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ جنھیں پھانسی دی جاتی ہے انھیں انت سمے خوب پوری مٹھائی کھلائی جاتی ہے۔ جس سے ملنا چاہیں اس سے ملنے دیا جاتا ہے۔ نشچے برخاست کرے گا۔

میونسی پلٹی کا دفتر آ گیا۔ ہزاروں مہترانیاں جمع تھیں، رنگ برنگ کے کپڑے پہنے، بناؤ، سنگار کیے، پان سگریٹ والے بھی آ گئے تھے، کھونچے والے بھی۔ پٹھانوں کا ایک دل بھی اپنے اسامیوں سے روپیے وصول کرنے آ پہنچا تھا۔ وہ دونوں بھی جا کر کھڑے ہو گئے۔

ویتن بٹنے لگا۔ پہلے مہترانیوں کا نمبر تھا۔ جس کا نام پکارا جاتا تھا وہ لپک کر جاتی اور اپنے روپیے لے کر دروغہ جی کو مفت کی دعائیں دے کر چلی جاتی۔ چمپا کے بعد اللہ رکھی کا نام برابر پکارا جاتا تھا۔ آج اللہ رکھی کا نام اڑ گیا تھا۔ چمپا کے بعد ظہورن کا نام پکارا گیا جو اللہ رکھی کے نیچے تھا۔

اللہ رکھ نے ہتاش آنکھوں سے حسینی کو دیکھا۔ مہترانیاں اسے دیکھ دیکھ کر کانا پھوسی کرنے لگیں۔ اس کے جی میں آیا، گھر چلی جائے، یہ اپہاس نہیں سہا جاتا۔ زمین پھٹ جاتی کہ اس میں سما جاتی۔

ایک کے بعد دوسرا نام آتا گیا اور اللہ رکھی سامنے کے برکچھوں کی اُور دیکھتی رہی۔ اسے اب اس کی پرواہ نہ تھی کہ کس کا نام آتا ہے، کون جاتا ہے کون اس کی اُور تاکتا ہے، کون اس پر ہنستا ہے۔

سہسا اپنا نام سن کر وہ چونک پڑی۔ دھیرے سے اٹھی اور نویلی بہو کی بھانتی پگ اٹھاتی ہوئی چلی۔ خزانچی نے پورے چھ روپیے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

اسے آشچریہ ہوا۔ خزانچی نے بھول تو نہیں کی؟ ان تین برسوں میں پورا ویتن تو کبھی ملا نہیں اور اب کی آدھا بھی ملے تو بہت ہے۔ وہ ایک سیکنڈ وہاں کھڑی رہی کہ

شاید خزانچی اس سے روپے واپس مانگے۔ جب خزانچی نے پوچھا 'اب کیوں کھڑی ہے' جاتی کیوں نہیں؟ تب وہ دھیرے سے بولی۔ 'یہ تو پورے روپے ہیں۔'

خزانچی نے چکت ہوکر اس کی اُور دیکھا۔

'تو اور کیا چاہتی ہے کم ملے؟'

'کچھ جری مانہ نہیں ہے؟'

'نہیں، اب کی کچھ جری مانہ نہیں ہے۔'

اللہ رکھی چلی، پر اس کا من پرسن نہ تھا۔ وہ پچھتا رہی تھی کہ داروغہ جی کو گالی کیوں دی۔

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی مجموعہ 'کفن' میں شائع ہوا۔ اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔)

موٹر کی چھینٹیں

کیا نام کہ پراتہ کال اشنان پوجا سے نپٹ، تِلک لگا، پیتامبر پہن، کھڑاؤں پاؤں میں ڈال، بغل میں پترا دبا، ہاتھ میں موٹا سا سَترُوَستک بھنجک لے ایک ججمان کے گھر چلا۔ وِواہ کی سائت وِچارنی تھی۔ کم سے کم ایک کلدار کا ڈول تھا۔ جل پان اوپر سے اور میرا جل پان معمولی جل پان نہیں ہے۔ بابوؤں کو تو مجھے نمنترت کرنے کی ہمّت ہی نہیں پڑتی۔ ان کا مہینے بھر کا ناشتہ میرا ایک دن کا جل پان ہے۔ اس وشے میں تو ہم اپنے سیٹھوں ساہوکاروں کے قائل ہیں، ایسا کھلاتے ہیں، ایسا کھلاتے ہیں اور اتنے کھلے من سے کہ چولا آنندِت ہو اُٹھتا ہے۔ ججمان کا دل دیکھ کر ہی میں اُن کا نمنترن سویکار کرتا ہوں۔ کھلاتے سمے کسی نے رونی صورت بنائی اور میری چھدھا غائب ہوئی۔ رو کر کسی نے کھلایا تو کیا؟ ایسا بھوجن کم سے کم مجھے نہیں پچتا۔ ججمان ایسا چاہیے کہ للکارتا جائے۔ لو شاستری جی، ایک بالو شاہی اور میں کہتا جاؤں۔ نہیں ججمان اب نہیں۔

رات خوب ورشا ہوئی تھی، سڑک پر جگہ جگہ پانی جمع تھا۔ میں اپنے وِچاروں میں مگن چلا جاتا تھا کہ ایک موٹر چھپ چھپ کرتی ہوئی نکل گئی۔ منہ پر چھینٹیں پڑے۔ جو دیکھتا ہوں تو دھوتی پر مانو کسی نے کیچڑ گھول کر ڈال دیا ہو۔ کپڑے بھرشٹ ہوئے، وہ الگ ، دیہہ بھرشٹ ہوئی وہ الگ، آرتھک چھتی ہوئی، وہ الگ۔ اگر موٹر والوں کو پکڑ پاتا، تو ایسی مرمّت کرتا کہ وے بھی یاد کرتے۔ من مسوس کر رہ گیا۔ اس وِیش میں ججمان کے گھر تو جا نہیں سکتا تھا، اپنا گھر بھی میل بھر سے کم نہ تھا۔ پھر آنے جانے والے سب میری اُور دیکھ دیکھ کر تالیاں بجا رہے تھے۔ ایسی درگتی میری کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اب کیا کروگے من؟ گھر جاؤ گے، تو پنڈتائن کیا کہیں گی؟

میں نے چٹ پٹ اپنے کرتویہ کا نشچیہ کر لیا۔ اِدھر اُدھر سے دس بارہ پتّھر کے ٹکرے بٹور لیے اور دوسری موٹر کی راہ دیکھنے لگا۔ برہم تیز سر پر چڑھ بیٹھا! ابھی دس

منٹ بھی نہ گذرے ہوں گے کہ ایک موٹرآتی ہوئی دکھائی دی! اُو ہو وہی موٹر تھی۔ شاید سوامی کو اِسٹیشن سے لے کر لوٹ رہی تھی۔ جیوں ہی سمیپ آئی، میں نے ایک پتّھر چلایا، بھر پور زور لگا کر چلایا۔ صاحب کی ٹوپی اُڑ کر سڑک کے اس بازو پر گری۔ موٹر کی چال دھیمی ہوئی۔ میں نے دوسرا فیر کیا۔ کھڑکی کے شیشے چور چور ہو گئے اور ایک ٹکڑا صاحب بہادر کے گال میں بھی لگا۔ خُون بہنے لگا، موٹر رکی اور صاحب اُتر کر میری طرف آئے اور گھُونسا تان کر بولے۔ سُوَر ہم تم کو پولیس میں دے گا۔ اتنا سننا تھا کہ میں نے پوتھی پترا زمین پر پھینکااور صاحب کی کمر پکڑ کر اَڑنگی لگائی، تو کیچڑ میں بھد سے گرے، میں نے چٹ سواری گانٹھی اور گردن پر ایک پچیس رَدّے تابڑ توڑ جمائے کہ صاحب چوندھیا گئے۔ اتنے میں ان کی پتنی جی اُتر آئیں۔

اونچی اِیڑی کا جوتا، ریشمی ساڑی، گالوں پر پاؤڈر، ہونٹوں پر رنگ، بھوَں پر سیاہی، مجھے چھاتے سے گودنے لگیں۔میں نے صاحب کو چھوڑ دیااور ڈنڈا سنبھالتا ہوا بولا۔ دیوی جی، آپ مردوں کے بیچ میں نہ پڑیں، کہیں چوٹ چپیٹ آجائے، تو مجھے دکھ ہوگا۔

صاحب نے اوسر پایا، تو سنبھل کر اٹھے اور اپنے بوٹ دار پیروں سے مجھے ایک ٹھوکر جمائی۔ میرے گھٹنے میں بڑی چوٹ لگی۔ میں نے بوکھلا کر ڈنڈا اُٹھا لیا اور صاحب کے پاؤں میں جما دیا۔ وہ کٹے پیڑ کی طرح گرے۔ میم صاحب چھتری تان کر دوڑی۔ میں نے دھیرے سے ان کی چھتری چھین کر پھینک دی۔ڈرائیور ابھی تک بیٹھا ہوا تھا۔ اب وہ بھی اُترا اور چھڑی لے کر مجھ پر پل پڑا۔ میں نے ایک ڈنڈا اس کے بھی جمایا، لُوٹ گیا۔ پچاسوں آدمی تماشا دیکھنے جمع ہوگئے۔ صاحب بھومی پر پڑے پڑے بولے۔ رِسکیل، ہم تم کو پولیس میں دے گا۔

میں نے پھر ڈنڈاسنبھالا اور چاہتا تھا کہ کھوپڑی پر جماؤں کہ صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ 'نہیں نہیں ، بابا، ہم پولیس میں نہیں جائے گا معافی دو۔'

میں نے کہا۔ 'ہاں پولیس کا نام نہ لینا، نہیں تو یہیں کھوپڑی رنگ دوں گا۔ بہت ہوگا چھ مہینے کی سزا ہوجائے گی، مگر تمھاری عادت چھُڑا دوں گا۔ موٹر چلاتے ہو، تو چھینٹیں اُڑاتے چلتے ہو، مارے گھمنڈ کے اندھے ہو جاتے ہو۔ سامنے یا بغل میں کون جارہا ہے، اس کا کچھ دھیان ہی نہیں رکھتے۔'

ایک درشک نے آلوچنا کی۔ 'ارے مہاراج! موٹر والے جان بوجھ کر چھینٹیں اُڑاتے ہیں اور جب آدمی لتھ پتھ ہوجاتا ہے، تو سب اس کا تماشا دیکھتے ہیں اور خوب ہنستے ہیں۔ آپ نے بڑا اچھا کیا، کہ ایک کو ٹھیک کر دیا۔'

میں نے صاحب کو للکار کر کہا۔ 'سنتا ہے کچھ، جنتا کیا کہتی ہے۔ صاحب نے اس آدمی کی اُور لال لال آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ تم جھوٹ بولتا ہے' بالکل جھوٹ بولتا ہے۔

میں نے ڈانٹا۔ 'ابھی تمھاری ہیکڑی کم نہیں ہوئی، آؤں پھر اور دوں ایک سوُنٹا کس کے؟

صاحب نے گھگھیا کر کہا۔ 'ارے نہیں بابا، سچ بولتا ہے، سچ بولتا ہے۔ اب تو خوش ہوا۔'

دوسرا درشک بولا۔ 'ابھی جو چاہے کہہ دے، لیکن جیوں ہی گاڑی پر بیٹھے، پھر وہی حرکت شروع کر دیں گے۔ گاڑی پر بیٹھتے ہی سب اپنے کو نواب کا ناتی سمجھنے لگتے ہیں۔'

دوسرے مہاشے بولے۔ 'اس سے کہیے تھوک کر چاٹے۔'

تیسرے نے کہا۔ 'نہیں کان پکڑ کر اٹھائیے بٹھائیے۔'

چوتھا بولا۔ 'ارے ڈرائیور کو بھی۔ یہ سب اور بد معاش ہوتے ہیں۔' 'مالدار آدمی گھمنڈ کرے، تو ایک بات ہے، تم کس بات پر اکڑتے ہو۔ چکّر ہاتھ میں لیا اور آنکھوں پر پردہ پڑا۔'

میں نے یہ پرستاؤ سویکار کیا۔ ڈرائیور اور مالک دونوں ہی کا کان پکڑ کر اٹھانا بیٹھانا چاہیے اور میم صاحب گنیں۔ 'سنو میم صاحب، تم کو گننا ہوگا۔ پوری سو بیٹھکیں۔ ایک بھی کم نہیں، زیادہ جتنی چاہے ،ہو جائیں۔'

دو آدمیوں نے صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا، دو نے ڈرائیور مہودے کا ۔ ڈرائیور بے چارے کی ٹانگ میں چوٹ تھی، پھر بھی وہ بیٹھکیں لگانے لگا۔ صاحب کی اکڑ ابھی کافی تھی۔ آپ لیٹ گئے اور اُول جلُول بکنے لگے۔ میں اس سمے رُدر بنا ہوا تھا۔ دل میں ٹھان لیا تھا کہ اس سے بِنا سو بیٹھکیں لگوائے نہ چھوڑوں گا۔ چار آدمیوں کو حکم دیا کہ گاڑی کو ڈھکیل کر سڑک کے نیچے گرادو۔

حکم کی دیر تھی ۔ چار کی جگہ پچاس آدمی لپٹ گئے اور گاڑی کو ڈھکیلنے لگے۔ وہ

سڑک بہت اونچی تھی۔ دونوں طرف کی زمین نیچی ۔ گاڑی نیچے گرتی اور ٹوٹ ٹاٹ کر ڈھیر ہو جاتی۔ گاڑی سڑک کے کنارے تک پہنچ چکی تھی، کہ صاحب کانکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ بابا ،گاڑی کو مت توڑو ہم، اٹھے بیٹھے گا۔

میں نے آدمیوں کو الگ ہٹ جانے کا حکم دیا، مگر سبھوں کو ایک دِلّگی مل گئی تھی۔ کسی نے میری اُور دھیان نہ دیا۔ لیکن جب میں ڈنڈا لے کر دوڑا تب سب گاڑی چھوڑ کر بھاگے اور صاحب نے آنکھیں بند کر کے بیٹھکیں لگانی شروع کیں۔

میں نے دس بیٹھکوں کے بعد میم صاحب سے پوچھا۔ 'کتنی بیٹھکیں ہوئیں؟'

میم صاحب نے رعب سے جواب دیا۔ 'ہم نہیں گنتا۔'

'تو اس طرح صاحب دن بھر کانکھتے رہیں گے اور میں نہ چھوڑوں گا۔ اگر ان کو کُشل سے گھر لے جانا چاہتی ہو، تو بیٹھکیں گِن دو۔ میں ان کو رہا کر دوں گا۔' صاحب نے دیکھا کہ بنا دنڈا بھوگے جان نہ بچے گی، تو بیٹھکیں لگانے لگے۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ۔

سہسا ایک دوسری موٹر آتی دکھائی دی۔ صاحب نے دیکھا اور ناک رَگڑ کر بولے۔ پنڈت جی! 'آپ میرا باپ ہے مجھ پر دیا کرو، اب ہم کبھی موٹر پر نہ بیٹھیں گے۔' مجھے بھی دَیا آگئی بولا۔ 'نہیں موٹر پر بیٹھنے سے میں نہیں روکتا، اِتنا ہی کہتا ہوں کہ موٹر پر بیٹھ کر بھی آدمیوں کو آدمی ہی سمجھو۔'

دوسری گاڑی تیز چلی آتی تھی۔ میں نے اِشارہ کیا۔ سب آدمیوں نے دو دو پتھّر اُٹھا لیے۔ اس گاڑی کا مالک سویم ڈرائیو کر رہا تھا۔ گاڑی دھیمی کر کے دھیرے سے سَرک جانا چاہتا تھا کہ میں نے بڑھ کر اس کے دونوں کان پکڑے اور خوب زور سے ہلا کر اور دونوں گالوں پر ایک ایک پڑاکا دے کر بولا۔ 'گاڑی سے چھینٹا نہ اُرایا کرو، سمجھے، چپکے سے چلے جاؤ۔'

یہ مہودے بک جھک تو کرتے رہے، مگر ایک سو آدمیوں کو پتھّر لیے کھڑا دیکھا، تو بنا کان پُونچھ ڈلائے چلتے ہوئے۔

ان کے جانے کے ایک ہی منٹ بعد دوسری گاڑی آئی ۔ میں نے پچاس آدمیوں کو راہ روک لینے کا حکم دیا۔گاڑی رُک گئی، میں نے انھیں بھی چار پڑاکے دے کر وِداع

کیا، مگر یہ بے چارے بھلے آدمی تھے۔ مزے سے چاٹے کھا کر چلتے ہوئے۔ سہسا ایک آدمی نے کہا۔ پولیس آ رہی ہے۔

اور سب کے سب ہُر ہوگئے۔ میں بھی سڑک کے نیچے اُتر گیا اور ایک گلی میں گھُس کر غائب ہوگیا۔

(اس کہانی کی پہلی اشاعت معلوم نہیں ہے۔ 'مان سرودر حصہ 2' میں شامل ہے۔)

قاتل کی ماں

(1)

رات کو رامیشوری سوئی تو کیا خواب دیکھتی ہے کہ ونود نے کسی آفیسر کو مار ڈالا ہے اور کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ پولس اس کی تلاش میں بے گناہوں کو زد و کوب کر رہی ہے اور تمام شہر میں شور و شر بپا ہے۔ اسی گھبراہٹ میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو ونود سو رہا تھا۔ اٹھ کر ونود کے پاس گئی۔ پیار سے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اور سوچنے لگی میں نے کیا بے سر پیر کا خواب دیکھا۔ اس کے ساتھ کچھ متفکر بھی ہوگئی۔ پھر لیٹی۔ مگر نیند نہ آئی۔ دل میں ایک خوف سا گیا تھا۔

صبح کو ونود نے ماں کو متفکر دیکھ کر پوچھا۔ ''اماں آج اداس کیوں ہو؟''

ماں ونود کو محبت سے لبریز آنکھوں سے دیکھ کر بولی۔ ''بیٹا! تم سے کیا کہوں۔ رات کو میں نے ایک بہت برا خواب دیکھا ہے، جیسے تم کسی افسر کو مار کر بھاگ گئے ہو۔ اور بے گناہوں پر مار پڑ رہی ہے۔''

ونود نے ہنس کر کہا۔ ''کیا تم چاہتی تھیں کہ میں پکڑ لیا جاتا؟''

ماں نے کہا۔ ''میں تو چاہتی ہوں کہ تم ایسے کاموں کے نزدیک ہی نہ جاؤ۔ پکڑے جانے کا سوال ہی کیوں اٹھے۔ ہمارا دھرم ہے کہ خود جئیں اور دوسروں کو بھی جینے دیں۔ دوسروں کو مار کر جینا میرے دھرم کے خلاف ہے۔''

ونود۔ ''دھرم اور نیتی کا زمانہ نہیں ہے۔''

ماں۔ ''دھرم اور نیتی کو ہمیشہ فتح حاصل ہوئی ہے۔ اور آئندہ بھی ہوگی۔ سوراجیہ قتل، خون سے نہیں ملتا، تیاگ، تپ اور آتم شدھی سے ملتا ہے۔ لالچ چھوڑتے نہیں، بری خواہشات چھوڑتے نہیں، اپنی برائیاں دیکھتے نہیں۔ اس پر دعویٰ ہے سوراجیہ لینے کا! یہ سمجھ

لو جو سوراجیہ قتل و خون سے ملے گا وہ قتل و خون پر ہی قائم رہے گا۔ عوام کی کوشش سے جو سوراجیہ ملے گا وہ ملک کی چیز ہوگی۔ افراد کی چیز ہوگی اور تھوڑے سے آدمیوں کا ایک گروہ تلوار کے زور سے انتظام کرے گا۔ ہم عوام کا سوراجیہ چاہتے ہیں، قتل و خون کی طاقت رکھنے والے گروہ کا نہیں۔''

ونود نے کہا۔ ''تم تو اسٹیج پر کھڑی ہو کر بولتی ہو۔ یہاں کون سننے والا ہے۔''

ماں نے کہا۔ ''بیٹا! تم ہنستے ہو اور میرا جی دکھی ہے۔ کئی دن سے دائیں آنکھ برابر پھڑک رہی ہے۔ یقیناً کوئی مصیبت آنے والی ہے۔''

ونود نے کہا۔ ''میں مصیبت سے نہیں ڈرتا۔ ابھی کون سا سکھ بھوگ رہے ہیں، جو مصیبتوں سے ڈریں۔''

یہ کہتا ہوا ونود باہر چلا گیا۔

(2)

آج صبح ہی سے ونود کا پتہ نہ تھا۔ معلوم نہیں کہاں گیا۔ رامیشوری نے پہلے تو سمجھا کہ کانگریس کے دفتر میں ہوگا لیکن جب ایک بج گیا اور وہ لوٹ کر نہ آیا تو اسے فکر ہوئی۔ دس بجے کے بعد وہ کہیں نہ رکتا تھا۔ پھر سوچا شاید کسی کام سے چلا گیا ہو۔ رات کا خواب اسے بے چین و پریشان کرنے لگا اور وقت کے ساتھ ساتھ بے چینی بھی بڑھنے لگی۔ جب شام ہوگئی تو اس سے نہ رہا گیا۔ کانگریس کے دفتر گئی۔

وہاں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آج ونود صبح سے ایک بار بھی نہیں آیا۔

رامیشوری کا دل کسی نامعلوم خوف سے پریشان ہوگیا اور وہ خواب مجسم بن کر اسے ڈرانے لگا۔ کچھ دیر تک وہ حواس باختہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ پھر خیال آیا، شاید گھر گیا ہو۔ فوراً گھر لوٹی۔ لیکن یہاں ونود کا اب تک پتہ نہ تھا۔

جوں جوں اندھیرا ہوتا جاتا تھا، اس کی جان خشک ہوتی جاتی تھی۔ اس پر دائیں آنکھ بھی پھڑکنے لگی۔ خیالات اور بھی خوفناک صورت اختیار کرنے لگے۔ کوئی دیوی یا دیوتا نہ بچا جس کی اس نے منت نہ مانی ہو۔ کبھی صحن میں آکر بیٹھ جاتی۔ کبھی دروازے پر جاکر کھڑی ہوتی۔ اس کا دل کسی خوف زدہ طائر کی مانند کبھی نشیمن میں آبیٹھتا اور کبھی

شاخ پر۔ کھانا پکانے کا خیال کسے تھا۔ بار بار یہی سوچتی بھگوان! میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے، جس کی سزا دے رہے ہو۔ اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کرو۔ میں تو خود ہی مصیبت زدہ ہوں۔ اب اور برداشت کرنے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔

رامیشوری سر پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔ آسمان پر سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے۔ ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بے کس کے ساتھ کوئی رونے والا نہ دیکھ کر اس کا ساتھ دیتی ہوں۔

(3)

نصف شب گزر چکی تھی۔ رامیشوری ابھی تک دروازے پر کھڑی ونود کا راستہ دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں کوئی شخص نہایت تیزی سے ڈوڑا ہوا آیا اور دروازے پر کھڑا ہوگیا۔ اس کے جسم پر ایک سیاہ کمبل تھا جسے اس نے اس طرح اوڑھ لیا تھا کہ منھ کا بڑا حصہ چھپ گیا تھا۔

رامیشوری نے ڈر کر پوچھا ''کون ہے؟''

وہ ونود تھا۔ جلدی سے اندر داخل ہوکر ماں سے دروازہ بند کرنے کو کہا، پھر آنگن میں آکر کمبل کو رکھ دیا اور کھانے کو مانگا۔

رامیشوری نے خائف ہوکر پوچھا۔ ''تم آج دن بھر کہاں تھے؟ میں تمام دن تمھیں ڈھونڈتی رہی۔''

ونود نے قریب آکر کہا۔ ''میں ایک نہایت ضروری کام سے گیا تھا اور ابھی پھر لوٹ جانا ہے۔ صرف تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اب دو چار مہینے میں یہاں نہ رہ سکوں گا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے وہی کیا ہے جو میں اپنا دھرم سمجھتا تھا۔ حفاظت جان کی خاطر مجھے یہاں سے بھاگ جانا ضروری ہے۔

رامیشوری کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، بولی۔ ''کیوں بیٹا! تم نے وہی کیا جس کا مجھے خوف تھا۔ ایشور نے تمھاری بدھی کیوں ہر لی؟''

ونود نے کہا۔ ''نہ ایشور نے میری بدھی ہری ہے، نہ مجھ پر کوئی آفت آئی ہے۔ میں نے آج چھاؤنی میں ایک آفیسر کو مار، ڈالا ہے۔ ایسا نشانہ مارا ایک ہی گولی میں

ٹھنڈا ہوگیا۔ ہلا تک نہیں۔''

''کیا وہاں کوئی اور نہ تھا؟''

''کوئی نہیں، بالکل سناٹا تھا۔''

''پولس کو خبر تو ہوگئی ہوگی؟''

''ہاں کئی شخص پکڑے گئے ہیں۔ میں تو صاف بچ نکلا۔''

رامیشوری کی حالت بدل گئی۔ بیٹے کی محبت میں اشکبار آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں۔ بولی۔ ''میں اسے بچنا نہیں کہتی کہ مجرم تو منہ چھپا کر بھاگ جائے اور بے گناہوں کو سزا ملے۔ تم خونی ہو۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری کوکھ سے ایسا سپوت پیدا ہوگا۔ ورنہ پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتی۔ اگر مرد ہے تو جا کر عدالت میں اپنا قصور تسلیم کر لے، ورنہ ان بے گناہوں کا خون بھی تیرے سر پر ہوگا۔''

یہ پھٹکار سن کر ونود کو غصہ آگیا۔ بولا۔ ''تمھارے کہنے سے میں خونی نہیں ہو جاتا اور لوگ یہی کام کرتے ہیں تو لیڈر ہو جاتے ہیں۔ ان کی جے جے کار ہوتی ہے۔ لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں۔ میں نے کیا تو ہتیارا ہوگیا۔''

رامیشوری۔ ''ہتیارا تو تو ہے ہی۔ اور جو دوسروں کی ہتیا کرتے ہیں وہ تمام کے تمام ہتیارے ہیں۔ تیری ماں ہو کر میں بھی پاپ کی حصے دار ہوگئی، میرے منہ میں بھی سیاہی لگ گئی۔ لیڈر وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کے لیے مرتے ہیں۔ جو دوسروں کی حفاظت کرے وہی بہادر اور سورما ہے۔ انھیں کا جنم مبارک ہے۔ انھیں کی مائیں خوش نصیب ہیں۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ تو خون کر کے اپنی بڑائی کر رہا ہے۔''

ونود نے پھر کمبل اٹھا لیا اور بولا۔ ''تم میری ماں نہ ہوتیں تو اسی وقت لگے ہاتھ تمھارا کام بھی تمام کر دیتا۔ جیتے جی پھر تمھارا منہ نہ دیکھوں گا۔''

یہ کہتا ہوا وہ جوش میں گھر سے نکل پڑا۔

(4)

دم بھر بعد رامیشوری بھی اس جوش میں گھر سے نکلی۔ بیٹا ہے تو کیا، وہ یہ ناانصافی نہیں گوارا کر سکتی۔ وہ اسی وقت کوتوالی میں جا کر اس خون کی خبر دے دے گی۔ ونود کا

پھانسی پر چڑھنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ بے گناہوں کو پھانسی ہو۔"

لیکن کچھ دور چلنے کے بعد ماں کا دل بے چین ہوگیا، وہ لوٹ پڑی اور گھر آ کر خوب روئی۔ جس بیٹے کو اس نے ایسی ایسی مصیبتیں جھیل کر پالا، کیا اسے پھانسی دلا دے گی۔

لیکن پھر خیال آیا، ان بے چاروں کی مائیں بھی تو ہوں گی جو بے گناہ پھانسی پائیں گے انھیں بھی تو اپنے بیٹے اتنے ہی پیارے ہوں گے۔ نہیں نہیں وہ یہ ظلم نہیں کر سکتی۔ اسے بغیر بیٹے کے ہونا منظور ہے۔ مگر اس کے دیکھتے بے گناہوں کا خون نہ ہوگا۔

رامیشوری اسی الجھن میں پڑی ہوئی تھی، جب کوئی راستہ نہ نظر آتا تو وہ رونے لگ جاتی تھی، پھر سوچتی، کیوں نہ خودکشی کر لوں کہ تمام دکھوں سے نجات مل جائے۔ لیکن اس کی موت سے ان بے گناہوں کی جان تو نہ بچ گئی۔ ان ماتاؤں کا کلیجہ تو نہ ٹھنڈا ہوگا۔ وہ اس پاپ سے تو نہ آزاد ہوں گے۔ وہ اپنے آپ ہی بول اٹھی خواہ کچھ ہو میں بے گناہوں کا خون نہ ہونے دوں گی۔ اجلاس میں جاکر صاف صاف کہہ دوں گی کہ گنہگار میں ہوں، کیونکہ میرے بیٹے نے یہ خون کیا ہے۔ ہم دونوں ہی قصور وار ہیں۔ دونوں کو پھانسی دیجیے۔ میں اپنے دھرم سے منحرف نہ ہوں گی۔ خواہ میری آنکھوں کے سامنے ہی ونود کی بوٹی بوٹی کیوں نہ کر ڈالی جائے۔ ہاں! میں اپنی آنکھوں سے اس کو پھانسی پر چڑھتا دیکھوں گی، کیوں کہ میں نے اس کو جنم دیا ہے۔ بھگوان! مجھے طاقت دو کہ اپنے فرض پر ڈٹی رہوں۔ میں کمزور ہوں، پاپن ہوں، ہتیاری ہوں۔

رامیشوری بے ہوش ہوکر گر پڑی۔

(5)

جب رامیشوری کو ہوش آیا تو اس کا ارادہ مستحکم ہو چکا تھا، مگر دلی تکلیف ہو رہی تھی۔ کیا اسی لیے بیٹے کو جنم دیا تھا، اسی لیے پالا پوسا تھا کہ ایک دن اسے پھانسی پر چڑھتے دیکھوں گی۔ ونود اس کی زندگی کا سہارا تھا۔ آج اسی ونود سے اس کا ناتا ٹوٹ رہا ہے۔ ونود کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ ایک دن وہ تھا کہ وہ اسے چھاتی سے لگائے پھرتی تھی، بڑے دکھ جھیل کر بھی خوش تھی۔ ایک دن یہ ہے کہ اسے

پھانسی دلانے جا رہی ہے۔ ونود کی کتابیں اور کپڑے کمرے میں رکھے تھے۔ اس نے ایک ایک چیز کو چھاتی سے لگایا آہ! فرض کا راستہ کس قدر دشوار گزار ہے۔ ونود کو آخری بار گلے لگانے اور اس کا آخری بوسہ لینے کے لیے اس کا دل بے چین ہوگیا۔ کیا لڑکے کو سزا دیتے ہوئے ماں محبت چھوڑ دیتی ہے؟

رامیشوری ونود کو سزا دینے جا رہی تھی، جوشِ محبت سے بھری ہوئی۔

(6)

ایک ہفتہ گزر گیا۔ پولس نے سازش کا پتہ لگا لیا۔ شہر کے دس جوان گرفتار کر لیے گئے۔ انھیں میں سے ایک سرکاری گواہ بھی بن گیا اور مجسٹریٹ کے اجلاس میں مقدمہ دائر ہوگیا۔

ونود کا اسی دن سے پتہ نہ تھا۔ رامیشوری محبت اور فرض کے درمیان اس کشتی کی مانند ڈانواڈول ہو رہی تھی جس کے اوپر طوفانی آسمان ہو اور نیچے طوفانی سمندر! کبھی فرض کلیجے کو مضبوط کردیتا، کبھی محبت دل کو کمزور کر دیتی۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے تھے۔ فرض پسپا ہوتا جاتا تھا۔ نئی نئی دلیلیں اس کے احساس فرض کو کمزور کرتی جاتی تھیں۔ جب تمام کام ایشور کی مرضی سے ہوتا ہے تو اس میں بھی اس کی مرضی ہوگی۔ یہی سب سے زبردست دلیل تھی۔ ان سات دنوں میں اس نے صرف پانی پی کر دن کاٹے تھے اور وہ پانی بھی آنکھوں کے راستے نکل جاتا تھا۔ ایسی ہوگئی تھی جیسے برسوں کی مریضہ۔

دس بجے کا وقت تھا۔ وہ کانگریس کے دفتر کی طرف چلی۔ اسی وقت روزانہ ایک بار ونود کا پتہ لینے کے لیے یہاں آیا کرتی تھی۔

ناگہاں اس نے نو دس جوانوں کو ہتھکڑیاں پہنے ایک درجن مسلح پولس کے سپاہیوں کے پنجے میں گرفتار دیکھا۔ پیچھے تھوڑی دور پر کچھ مرد عورت سر جھکائے، رنج و یاس کی تصویر بنے، آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔

رامیشوری نے دوڑ کر ایک سپاہی سے پوچھا۔ ''کیا یہ کانگریس کے آدمی ہیں؟''

سپاہی نے کہا۔ ''کانگریس والوں کے سوا انگریزوں کو کون مارے گا؟''

''کون مارا گیا؟''

ایک پولس کے سارجنٹ کو ان سب نے قتل کر دیا۔ آج آٹھواں دن ہے۔''
''کانگریس کے آدمی ہتیا نہیں کرتے۔''
''قصور نہ ثابت ہوگا تو آپ چھوٹ جائیں گے۔''
رامیشوری دم بھر وہیں کھڑی رہی۔ پھر انھیں لوگوں کے پیچھے پیچھے کچہری کی طرف چلی۔ فرض یہ نئی طاقت پاکر سنبھل گیا۔ نہیں! وہ اتنے بے قصور نوجوانوں کو موت کے منھ میں نہ جانے دے گی۔ اپنے خونی بیٹے کی حفاظت کے لیے اتنے بے گناہوں کا خون نہ ہونے دے گی۔

کچہری میں بہت بڑا مجمع تھا۔ رامیشوری نے ایک اردلی سے پوچھا۔ ''کیا صاب آ گئے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ابھی نہیں آئے۔ آتے ہی ہوں گے۔''
''بہت دیر سے آتے ہیں، بارہ تو بجے ہوں گے۔''
اردلی نے جھنجھلا کر کہا۔ ''تو کیا وہ تمھارے نوکر ہیں کہ جب تمھاری مرضی ہو آ کر بیٹھ جائیں؟ بادشاہ ہیں جب مرضی ہوگی آئیں گے۔''
رامیشوری چپ ہوگئی۔
اس کے پاس ہی کئی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک نے پوچھا۔ ''کیوں بہن! تمھارے گھر کا بھی کوئی لڑکا پکڑا گیا ہے؟''
رامیشوری اپنی فکروں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کچھ نہ بولی۔
اس عورت نے پھر کہا۔ ''کیا کہوں، نہ جانے کس پاپی نے خون کیا؟ آپ تو منھ میں سیاہی لگا کر چھپ رہا اور ہم لوگوں کے متھے گئی۔''
کئی عورتیں رو رہی تھیں۔ رامیشوری بھی رونے لگی۔
ایک ضعیف عورت اسے سمجھانے لگی۔ ''بہن چپ ہو جاؤ جو ہماری قسمت میں لکھا ہے، وہی ہوگا۔ میرا بیٹا بالکل بے قصور پکڑا گیا ہے۔ کانگریس میں کام کرتا تھا۔ تمھارا کون گرفتار ہے؟''
رامیشوری نے اسے بھی کچھ جواب نہ دیا۔ بار بار لوگوں سے پوچھتی تھی۔ ''صاحب کب تک آئیں گے؟''

دو بجے صاحب کی موٹر آئی۔ اجلاس میں ہل چل مچ گئی۔ جوں ہی صاحب کرسی پر بیٹھے، سرکاری وکیل نے یہ خون کا مقدمہ پیش کر دیا۔ پولس کے افسر آ گئے۔ ملزم بھی سامنے کھڑے کر دیے گئے۔

عین اسی وقت رامیشوری نے اجلاس کے رو برو آکر سلام کیا اور صاف لفظوں میں بولی۔ ''حضور! اس مقدمے کے پیش ہونے سے پہلے میں کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔''

سب کے سب اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

صاحب نے اس کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''کیا بات ہے؟''

رامیشوری۔ ''میں اس لیے آپ کے سامنے آئی ہوں کہ اس مقدمے کا سچا حال بیان کروں۔ سارجنٹ کا خون کرنے والا میرا بیٹا ہے۔ یہ تمام ملزم بے گناہ ہیں۔''

صاحب نے متحیر ہو کر پوچھا۔ ''تم اپنے ہوش میں ہو یا نہیں؟''

رامیشوری نے کہا۔ ''میں اپنے ہوش میں ہوں اور بالکل سچ کہتی ہوں۔ سارجنٹ کو میرے بیٹے نے مارا ہے۔ اس کا نام ونود بہاری ہے۔ میرے گھر میں اس کا فوٹو رکھا ہوا ہے۔ وہ اسی دن سے لا پتہ ہوگیا ہے۔ میں اپنے ہوش میں ہوں۔ اپنے بیٹے سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں اسے اسی طرح پیار کرتی ہوں جیسے ہر ایک بیوہ اپنے اکلوتے بیٹے کو۔ ایک ہفتے پیشتر وہی میرا سب کچھ تھا۔ لیکن جب میرے ہرچند منع کرنے پر بھی اس نے یہ خون کیا تو میں نے سمجھ لیا میرے کوئی بیٹا نہ تھا۔ اس کی جان بچانے کے لیے میں اتنے گھر برباد نہ ہونے دوں گی۔ میری ان بہنوں کو بھی تو اپنی اولاد اتنی ہی پیاری ہے۔ انھیں بے اولاد بنا کر میں اولاد والی نہیں رہنا چاہتی۔ میں نے اصل واقعہ بیان کر دیا۔ انصاف آپ کے ہاتھ ہے۔''

کمرے میں ہل چل مچ گئی۔ مرد عورت سب نے رامیشوری کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کئی عورتیں اس کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگیں۔ اپنی خوشی میں کسی کو اس بات کا خیال تک نہ رہا کہ اس بدنصیب کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ بے حس و حرکت درمیان میں کھڑی تھی۔ نہ کچھ سوجھتا تھا! نہ کچھ سنائی دیتا تھا۔ بس ونود کی صورت آنکھوں کے سامنے تھی۔

یکا یک مجمع میں سے ایک آدمی نکل کر رامیشوری کے سامنے آیا اور اس کے سینے

میں خنجر اتار دیا۔ رامیشوری چیخ مار کر گر پڑی اور حملہ آور کے چہرے کی طرف دیکھ کر چونک پڑی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''ارے تو ہے ونود!''

اس کی آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے نکلے اور آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

(یہ افسانہ 'واردات' میں شائع ہوا۔ ہندی میں 'اپراپیہ ساہتیہ' میں شامل ہے۔)

مس پدما

(1)

پدما کار سے اتر کر اپنی بہن سے گلے ملی، تو اسے خوشی کے بجائے روحانی صدمہ ہوا۔ یہ وہ رتنا نہ تھی جسے اس نے سال بھر پہلے چچا جی کے ساتھ خوش خوش گھر سے آتے دیکھا تھا۔ شگفتہ اور مخمور اور متبسم، وہ پھول مرجھا گیا تھا۔ بہن کے خطوں سے پدما کو اتنا ضرور معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں ہے اور اس کی زندگی تلخ ہوگئی، لیکن اس کی حالت اتنی خراب ہوگئی ہے، اس کا اسے گمان نہ تھا، جیسے تصویر مٹ گئی ہو، صرف اس کا خاکہ باقی ہو۔

اس نے پوچھا یہ تمھاری کیا حالت ہے بہن! کیا تم بیمار ہو؟ اپنی بیماری کی اطلاع تو تم نے کبھی نہ دی۔ رتنا حسرتناک تبسم کے ساتھ بولی: ''کیا کرتی لکھ کر، تقدیر میں جو تھا وہ ہوا، اور آئندہ ہوگا۔ تمھیں اور اماں کو اپنی داستان غم سنا کر خواہ مخواہ کیوں رنجیدہ کرتی، تجھ سے ملنے کو دل بہت بے قرار تھا اور تو اتنی شیطان ہے کہ بار بار آنے کا وعدہ کر کے ٹال جاتی تھی ایسا غصہ آتا تھا کہ تجھے پا جاؤں تو خوب پیٹوں، مہینوں کا غبار جمع ہے، چل کر ہاتھ دھولے کچھ کھا پی کر مضبوط ہو جا۔''

مگر پدما کو مطلق بھوک نہیں ہے۔ دوپہر کو اس نے صرف ایک پیالہ چائے اور ٹوسٹ کھایا تھا، سہ پہر کو ایک سنترا اور اب شام ہوگئی ہے۔ گاڑی سے اتری تو اس کا جی کچھ کھانے کو چاہتا تھا۔ لیکن اب جیسے بھوک غائب ہوگئی ہے۔ اب تو رتنا سے اس کے دل کی باتیں سننے کی بھوک جاگ گئی ہے۔ اس نے کرسی پر لیٹ کر کہا: ''جیجا جی تو تم سے بڑی محبت کرتے تھے، یکایک کیوں برہم ہوگئے۔''

رتنا نے بے نور آنکھوں سے تاکتے ہوئے کہا۔ ''اب میں کسی کے دل کا حال کیا

جانوں۔ شاید اتنی حسین نہیں ہوں، یا اتنی سلیقہ ور نہیں ہوں، یا اتنی غلام نہیں ہوں، کیونکہ اب مجھے تجربہ ہوا ہے کہ عورتوں کی آزادی کا دم بھرنے والے مرد بھی عام مردوں سے کچھ بہتر نہیں ہوتے، بلکہ وہ اپنی اس فراخ دلی کے معاوضہ میں اور بھی کامل بے زبان اطاعت چاہتے ہیں۔

پدما نے حقیقت کو اور بھی واضح کرنے کے ارادہ سے پوچھا: ''لیکن تم دونوں تو ایک دوسرے سے خوب خوب واقف تھے۔''

رتنا تھکی ہوئی سی بولی: ''یہی تو رونا ہے، ہماری شادی بزرگوں کی طے کردہ نہ تھی۔ ہم ایک دوسرے کے مزاج اور عادت اور خیالات سے خوب واقف تھے، برسوں ہمسائے رہے تھے۔ ایک دوسرے کے عیب و ہنر پہچاننے کے جتنے مواقع ہمیں ملے۔ بہت کم کسی کو ملتے ہوں گے۔ ہم نے گھڑے کو خوب ٹھونک بجا کر اپنا اطمیان کر لیا تھا، ظرف میں کہیں شگاف یا دراز تو نہیں۔ آواز اس کی سچی تھی، ٹھوس، دھات کی آواز کی طرح مترنم۔ لیکن ظرف میں پانی پڑتے ہی نہ جانے کدھر سے بال نکل آئے، اور سارا پانی بہہ گیا۔ اور اب گھڑا پھوٹی تقدیر کی طرح خشک پڑا ہوا ہے۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ عورت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ شادی کو لعنت کا طوق سمجھے اور مطلق العنان رہ کر زندگی بسر کرے۔ عورت کے لیے ہی کیوں، مرد کے لیے بھی میں شادی کو اتنا ہی مہلک سمجھتی ہوں، اگر شیامو کی طبیعت مجھ سے سیر ہوگئی تو میری طبیعت بھی ان سے کچھ کم سیر نہیں ہوئی۔ ان کی جن اداؤں اور خوش فعلیوں پر فدا تھی، اب ان سے مجھے نفرت ہے۔ کیوں دل کی یہ حالت ہے، کہہ نہیں سکتی۔ لیکن اب میں ان کے ساتھ ایک دن بھی نہیں رہنا چاہتی۔ وہ ہنستے ہیں تو مجھے ان کی ہنسی میں چھچھورے پن کی بو آتی ہے، باتیں کرتے ہیں تو ان میں بناوٹ کا رنگ جھلکتا ہے، اچکن اور پائجامہ پہنتے ہیں تو میراثیوں جیسے لگتے ہیں، کوٹ اور پتلون پہنتے ہیں تو جیسے کوئی کرنٹا ہو۔ ان کے ساتھ جتنی دیر رہتی ہوں دل پر بہت جبر کرکے رہتی ہوں۔ لیکن ہم دونوں میں یہ فرق ہے کہ وہ اپنی مرضی کے بادشاہ ہیں، میں ان کی مرضی کی غلام ہوں۔ ان کے لیے میری جیسی اور مجھ سے بدرجہا حسین دل بستگی کے لیے موجود ہیں، کوشاں ہیں، طالب ہیں۔ میرے پاؤں میں زنجیر ہے، قانون کی بھی احساسات کی بھی اور وقار کی بھی۔ وہ آزاد ہیں، اس لیے خوش ہیں،

متحمل ہیں، ظاہردار ہیں، میں مقید ہوں۔ میرا ایک ایک ذرہ، ایک ایک نقطہ نفی ہے، ستم یہ ہے کہ میں ظاہرداری کبھی نہیں کر سکتی۔ میں خلوص چاہتی ہوں، خلوص کا غصہ بھی برداشت کر سکتی ہوں، تصنع کی دلجوئی بھی نہیں برداشت کر سکتی، اور جب خلوص پاتی نہیں تو خلوص دوں کہاں سے۔ تجھے میں یہی صلاح دوں گی کہ کبھی یہ بیڑی اپنے پاؤں میں نہ ڈالنا۔ عورتوں نے شادی کو ذریعہ معاش سمجھ لیا ہے۔ میں نے بڑی غلطی کی، اپنے کو کسی پیشے کے لیے تیار نہ کیا، لیکن تیرے لیے ابھی بہت وسیع موقع ہے۔ تو ذہین ہے، زود فہم ہے، ذی حوصلہ ہے۔ تو اگر وکالت کرے تو مجھے یقین ہے تھوڑے ہی دنوں میں تیرا رنگ جم جائے۔ مرد حسن پرست ہوتے ہیں، حسن ان کے دل کی ازلی بھوک ہے۔ کیوں نہ ہم ان کی حماقت سے فائدہ اٹھائیں۔ جس مقدمہ میں مرد وکیل ایک پائے اس میں تو ستم کے ساتھ دو پا سکتی ہے۔ یہ پیارا چاند سا مکھڑا کسی مرد کی نظر میں نہ بس جائے گا، لیکن وہی شخص جو ابھی تیرے قدموں پر سر رکھے گا اور تیری اداؤں پر قربان ہوگا۔ تجھ سے شادی ہو جانے پر ستر غمزے کرے گا۔ تجھ پر رعب جتائے گا۔

بے وقوف رتنا لینا سب کچھ چاہتی تھی، دینا کچھ نہیں، محض اپنی نسائیت کے بوتے پر، اپنے حسن اور انداز کے بل پر۔ وہ حسین ہے، خوش ادا ہے، نازک اندام ہے، اس لیے خلوص پانے کا حق ہے۔ تسلیم کا حق ہے۔ وفا کا حق ہے، کوڑیاں دے کر جواہر پا لینا چاہتی ہے۔

مسٹر شیام ناتھ جھلا آتے ہوئے نظر آئے پدما نے کمرہ سے نکل کر ان سے ہاتھ ملایا۔

(2)

پدما خود انھیں خیالات کی لڑکی تھی، اور بہن کی تاکید نے اس کے خیالات اور بھی مستحکم کر دیے۔ بی. اے. میں تو تھی ہی، امتحان میں اس نے اول درجہ حاصل کیا۔ قانون کا دروازہ کھلا ہوا تھا دو سال میں اس نے قانون بھی پاس کر لیا اور وکالت شروع کر دی۔ اس ذہانت اور ذکاوت نے اس کے حسن کے ساتھ مل کر سال بھر میں اسے جونیر وکیلوں کی اول صف میں بٹھا دیا۔ وہ جس اجلاس میں پہنچ جاتی، ایک ہنگامہ مچ جاتا۔

نوجواں وکلا چاروں طرف سے آ کر بیٹھ جاتے اور سائلانہ نظروں سے اسے دیکھتے۔ عدالت اس کی رعنائیوں اور شیریں بیانوں سے بے نیاز نہ رہ سکتی تھی۔ زاہد طبیعت ججوں کی نظریں بھی مسرور ہو جاتی، چہروں پر رونق آ جاتی، سبھی اس کے ایک نظر کے متمنی تھے۔ اور اس کی وکالت کیوں نہ کامیاب ہوتی، وہ شکستوں سے ناآشنا تھی، ان میں بھی فتح کا پہلو چھپا ہوا تھا اس کے موکل ملزم کو الزام ہو جانے پر بھی سزا بہت نرم ملتی، یا اس کا مقدمہ کمزور ہونے پر بھی فریق مخالفت کا شدید ترین مواخذہ ہوتا۔ اس کے خلاف ڈگریاں بھی ہوتیں، تو اس سے عدالت کا خرچہ نہ لیا جاتا۔ شرح سود میں معقول تخفیف ہو جاتی اور موافق ڈگریوں میں فریق ثانی کی شامت ہی آ جاتی۔ اس کے حسن کا جادو نہ معلوم طور پر اپنا اثر ڈالتا رہا تھا۔

لیکن اس کی دھاک جمی اس استغاثہ کی پیروی میں جو اس کی بہن رتنا نے مسٹر جھلا پر علاحدگی کے لے دائر کیا۔ میاں بیوی کے تعلقات اس درجہ کشیدہ ہوگئے تھے کہ رتنا کو اب قانون کے سوا چارہ نہ رہا۔ اس کا مقدمہ ہر ایک پہلو سے کمزور تھا۔ علاحدگی کے لیے جن قانون اسباب کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کا یہاں نشان نہ تھا۔ لیکن پدما نے کچھ ایسی دقت نظری سے کام لیا کہ مقدمہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ جس وقت پدما اجلاس میں کھڑی ہوتی اور اپنے موثر لہجہ میں خطیبِ کامل کی روانی اور انہاک و استدلال کی وضاحت اور جامعیت کے ساتھ اپنی تقریر شروع کرتی تو سامعین چشم حیرت سے دیکھتے رہ جاتے اور آپس میں کہتے یہ قدرت کی دین ہے۔ بلاشک اس کی بحث میں استدلال کے مقابلہ میں جذبات کا پہلو غالب ہوتا۔ لیکن اس میں نفسیات کی جگہ صداقت اور خلوص کا اتنا پختہ رنگ ہوتا کہ عدالت بھی اس سے متاثر نہ رہ سکی۔ رتنا کی ڈگری ہوئی اور پدما کے لیے عروج کے دروازے کھل گئے۔

دونوں بہنیں اب ایک ساتھ رہنے لگیں۔ اس شہر میں یہ خاندان ممتاز تھا، پدما کے والد پنڈت اُماناتھ کول کامیاب بیرسٹر تھے اور اگرچہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور عین عالم شباب میں دو یتیم لڑکیاں چھوڑ کر رحلت فرماگئے۔ لیکن اتنا اثاثہ چھوڑ گئے کہ بیوہ ماں کو لڑکیوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ اُماناتھ خود شوقین، آزاد مشرب، رنگین مزاج آدمی تھے لیکن ان کی متاہل زندگی پرسکون تھی، باہر وہ کچھ کریں، گھر کے اندر ان

کی بیوی کا راج تھا، اور وہ خوش تھی۔ بدمزگیاں ہوتیں، لیکن سوال جواب تک رہ جاتیں۔ سخت زبانیوں کی نوبت نہ آتی۔ کول صاحب جاہا سپر اندا‌ختن کے اصول سے واقف تھے۔ انھیں یقین تھا وہ کتنی ہی بے عنوانیاں کریں۔ بیوی کو وفا، خلوص اور اعتماد پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اور آج ان کو مرے بیس سال ہوگئے، مگر وہ دیوی ابھی تک ان کی پرستش کرتی جاتی تھی۔ وہ صرف ایک بار کھانا کھاتی اور وہ بھی نمک، زمین پر سوتی اور مہینہ کے آدھے دن برت رکھتی، جیسے کوئی سنیاسی ہو۔ دونوں لڑکیوں کی اس روش پر اسے روحانی قوت ہوتی تھی، مگر انھیں سمجھانے کی اس کے پاس عقل نہ تھی، نہ ہمت۔ وہ دونوں اپنی ماں کا مضحکہ اڑاتیں اور اسے سادہ لوح بے زبان فرسودہ خیال سمجھ کر اس پر رحم کرتی تھیں۔ ان میں سے کسی کو ایسا نفس پرور، بے وفا، سرد مہر شوہر ملا ہوتا تو اسے ٹھوکر مارتیں اور اس کی صورت نہ دیکھتیں اور اسے دکھا دیتیں کہ اگر تم کجروی کر سکتے ہو تو ہم بھی تم سے کم نہیں ہیں۔ نہ جانے اماں ایسے وحشی، بے درد، ناشناس آدمی کے ساتھ رہ سکتی تھیں اور اب بھی اس کا احترام کرتی ہیں۔ تعلیم نہ پانے کی یہی برکت ہے۔ وہی طوفانِ نوح کے زمانے کے خیالات ہیں۔ دنیا کتنی دور نکل گئی ہے، اس غریب کو کیا خبر!

پدما نے وکالت شروع کرتے ہی علاحدہ مکان لے لیا تھا۔ ماں کے ساتھ اسے بہت سی قیدیوں کی پابندی، شرما حضوری، اس کے پاس خاطر سے کرنا پڑتی اور وہ آزاد رہنا چاہتی تھی۔ وہ کسی کے رو برو جواب دہ کیوں ہو؟ وہ اپنے نیک و بد کی مختار ہے۔ کسی کو اس کے معاملے میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ بیوہ اسی مکان میں رہتی تھی۔ تنہا مرحوم کی یاد کی پرستش کرتی ہوئی۔ رتنا شوہر سے علاحدہ ہو کر پدما کے ساتھ رہنے لگی لیکن چند ہی مہینوں میں اسے معلوم ہوگیا کہ اس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ پدما نے خود ہی کوشش کر کے مفصل کے ایک شہر میں اسے ایک مدرسہ میں جگہ دلوادی۔ پدما نے تعلیم سے جو فیض اٹھایا تھا اس میں نفسیاتی خواہشات کی تکمیل ہی حیات کا مقصد تھا۔ بندش بالیدگی کے لیے زہر تھی۔ فرائڈ اس کا معبود تھا اور فرائڈ کے نظریے اس کی زندگی کے نئے مشعلِ ہدایت۔ کسی عضو کو باندھ دو، تھوڑے ہی دنوں میں دورانِ خون بند ہو جانے کے باعث بے کار ہو جائے گا۔ فاسد مادہ پیدا کر کے زندگی کو معرض خطر میں ڈال دے گا۔ یہ جو جنون اور مراق اور اختلال دماغ کی اتنی کثرت ہے، محض اس لیے کہ خواہشات میں رکاوٹ ڈالا گیا۔

نفسیات کی یہ نئی تنقیح پدما کی زندگی کا مسلمہ اصول تھی۔

اور بڑی آزادی سے پرسونالٹی کی تکمیل کر رہی تھی، پیشہ کی ابتدائی کشمکش ختم ہو جانے کے بعد، اس کی وکالت اس طرح تھی جیسے مچھلی کے لیے پانی۔ بیشتر مقدمات اپنی نوعیت کے اعتبار سے یکساں ہوتے تھے۔ صرف جزئیات میں کچھ امتیاز ہوتا تھا۔ ان کی پیروی کے لیے کسی قسم کی تیاری یا تحقیق کی ضرورت نہ تھی۔ محرر ضابطے کی تکمیل کر دیتا۔ وہ اجلاس میں جا کھڑی ہوتی اور وہی ہزار کی دہرائی ہوئی دلیلیں اور منجھے ہوئے الفاظ۔ اس لیے اب اسے فرصت بھی کافی تھی۔ اس کے ہوا خواہوں میں کئی نوجوان رئیس تھے جو محض اس کے دیدار سے محظوظ ہونے کے لیے نئے نئے مقولات لاتے رہتے تھے اور وکالت کے مندر کی تو وہ دیوی تھی اور کتنے ہی نوجوان وکیل اس کی چوکھٹ پر جبۂ سائی رہتے تھے۔ نوجوان ہی کیوں، جہاں دیدہ بھی، پکے ہوئے بال اور پکی ہوئی عقل والے جس پر اس کی نظر کرم ہو جاتی، پاس ہو جاتا۔

مگر انسان کوشش کرنے پر بھی بالکل حیوان نہیں ہو سکتا۔ پدما شباب کی پہلی امنگ میں تو دلوں سے کھیلتی رہی۔ ناز و ادا، رعنائی و دلبرائی کے کرشمے تھے اور جدا فگنی کی کھاس، مگر رفتہ رفتہ اس خرمستیوں سے اسے نفرت ہونے لگی اور دل ایک وجود کی تلاش کرنے لگا، جس میں درد ہو، وفا ہو، گہرائی ہو، جس پر وہ تکیہ کر سکے۔ ان شہیدوں میں بھی بھونرے تھے۔ پھول کا رس لے کر اڑ جانے والے۔ جو اس کے رسوخ اور اثر اور کرم کے لیے اس کے عاشق بنے ہوئے تھے۔ وہ اب ایسا چاہنے والا چاہتی تھی جو اس کے لیے زندگی قربان کر سکے۔ جو اس کی محبت کو اپنی زندگی کی آرزو بنا لے اور جس پر وہ خود اپنے کو مٹا سکے۔

اتفاق سے اسے ایک دن مسٹر جھلا نظر آ گئے۔ اس نے اپنی کار روک لی اور بولی: ''آپ تشریف لائیے!'' رشتہ ٹوٹ جانے پر بھی تو کج اخلاقی نہ کی جاسکتی تھی۔

جھلا نے اشتیاق سے کہا۔ ''آج ہی آیا تھا۔ اور تم سے ملنا چاہتا تھا۔ جب سے تمھاری وہ بحث سنی ہے اور تمھارا وہ انداز دیکھا ہے۔ تمھارا مداح ہو گیا ہوں۔ کسی وقت تمھیں فرصت ہو تو آؤں۔''

پدما کو ان سے ہمدردی ہوئی۔ وہ ثابت کرنا چاہتی تھی گو میں اپنی بہن کی حمایت

میں تمھارے خلاف بہت سی غلط بیانیاں کیں، غلط الزامات لگائے لیکن وہ پیشہ کی بات تھی۔ اس میں مجھے تم سے مطلق ملال نہیں ہے۔ بولی: ''شوق سے آیئے۔ میرے ساتھ ہی چلیے، میں گھر ہی چل رہی ہوں۔''

جھلا آکر بیٹھ گئے اور اس مختصر سی ملاقات میں پدما کو معلوم ہوا کہ جھلا شریف روشن خیال اور صاف گو آدمی ہیں۔

دونوں چائے پر بیٹھے تو جھلا نے شکایت آمیز تبسم کے ساتھ کہا: ''آپ نے تو بحث کے دوران میں مجھے پورا شیطان بنا کر کھڑا کر دیا۔''

پدما ہنس کر بولی: ''اس کا ذکر نہ کیجیے۔ وہ پروفیشنل معاملہ تھا۔''

''تو کیا میں یہ باور کرلوں کہ آپ فی الواقع مجھے اتنا مکروہ انسان نہیں سمجھتیں۔''

''آپ کے برعکس میں آپ کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔ مجھے تعجب ہے کہ آپ کی رتنا سے کیوں نہ پٹی۔''

''اگر آپ انسانوں کو انسان نہ سمجھ کر فرشتہ دیکھنا چاہیں تو یقیناً مایوسی ہوگی۔ شادی کر کے خوش رہنے کے لیے جس بے حسی کی ضرورت ہے اتنی شاید رتنا میں نہ تھی، اب مجھے یہی تجربہ کرنا ہے کہ آزاد رہ کر خوشی مل سکتی ہے یا نہیں، شادی کر کے دیکھ لیا۔''

''میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے۔''

''لسانی ہمدردی کی میری نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں۔''

پدما نے عشوہ طراز نظروں سے دیکھا۔

''ایسے بیوفاؤں کو زبانی ہمدردی کے سوا اور کیا مل سکتا ہے۔''

''یہ بھول نہ جایئے کہ یہ عدالت نہیں ہے۔''

''صفائی کا بار آپ کے اوپر ہے۔''

''مجھے موقع عطا کیجیے۔''

دوسرے دن جھلا پھر آئے اور زیادہ دیر تک رہے اور اس کے بعد روزانہ کسی نہ کسی وقت ضرور آجاتے، پدما روز بروز ان کی جانب ملتفت ہوتی جاتی تھی۔ ان میں وہ سارے اوصاف نظر آتے تھے جن کی اسے بھوک تھی۔ ان میں خیالات کی مناسبت تھی۔ نیک نیتی تھی۔ ایثار تھا۔ جذبات تھے۔ اور کوئی ذاتی غرض نہ تھی۔

ایک دن جھلا نے کہا۔ ''میرا جی چاہتا ہے، یہیں آکر پریکٹس کروں مجھے اب محسوس ہو رہا ہے کہ میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔''

پدما خوش ہو کر بولی ''ضرور آجایئے۔ میری بھی یہی تمنا ہے اور اسی مکان میں ٹھہریے۔''

''یعنی آپ کے سایہ میں، غیر ممکن؟''

''مجھ سے محبت اور میرے سایہ سے نفرت۔''

''آپ کی آزادی میں مخل ہونا نہیں چاہتا۔''

''یوں کہیے کہ آپ کو میری جانب سے اپنی آزادی میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔''

''میں تائب ہو چکا۔''

''دل سے۔''

''تو مجھ سے معاہدہ کر لیجیے نہ۔''

''دل سے۔''

''ہاں دل سے۔''

(5)

رتنا نے پدما کو غصہ اور تنبیہ سے بھرا ہوا خط لکھا تو نے یہ کہاوت نہیں سنی۔ ''آزمودہ را آزمودن جہل است۔'' مجھے حیرت ہوتی ہے تو اس شخص کے ساتھ کیوں ملتفت ہوئی۔ یہ شخص دغا دے گا۔ مکّار ہے، نفسانیت سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن پدما پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جھلا کو وہ خط دکھا دیا۔ جھلا بولے تم لکھ دو میں ان سے شادی کر رہی ہوں اور کبھی طلاق نہ دوں گی۔

جھلا کی ڈاکٹری پریکٹس برائے نام تھی۔ ایک کمرہ ان کے لیے مخصوص تھا۔ دروازہ پر اپنا سائن بورڈ لگا دیا تھا اور صبح کو دو تین گھنٹہ اپنے کمرے میں بیٹھے ناول پڑھا کرتے تھے جس کا انھیں بے حد شوق تھا۔ مریض عنقا تھے پدما ان پر کچھ ایسی فریفتہ ہوگئی تھی کہ وہ جتنا چاہیں خرچ کریں، وہ مطلق معترض نہ ہوتی۔ ان کے لیے ایک نہ ایک تحفہ روز لاتی رہتی تھی۔ ایسی بیش قیمت گھڑی شہر کے بڑے سے رئیس کے پاس نہ ہوگی۔ ان کے

لیے ایک علاحدہ کار تھی۔ دوسرے الگ نوکروں کو سخت تاکید تھی کہ ان کے کسی حکم کی تعمیل میں دیری نہ ہو۔ ذرا سی شکایت ہوئی اور تم گئے۔ روز ان کے لیے اچھی اچھی شرابیں آتیں اور پدما کو بھی شراب کا چسکہ پڑ گیا تھا۔ جنت کے مزے لوٹے جا رہے تھے۔

اور اتنا ہی نہیں، پدما جھلا کی رضا کی چیری تھی۔ جھلا کا نام ہی جھلا نہ تھا۔ مزاج کے بھی جھلا تھے ذرا ذرا سی بات پر برانگیختہ ہو جاتے تھے اور پدما ان کا مناوں کرتی۔ ان کا عتاب اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ جھلا کو اپنی طاقت کا علم تھا۔ اور اس کا اظہار کرتے تھے۔ پدما کو اپنی کمزوری کا علم نہ تھا۔ وہ اسے دلجوئی سمجھتی تھی۔ محبت میں جبر کرنے کی بے انتہا قوت ہے اور صبر کرنے کی بھی بے انتہا قوت ہے جھلا جبر کرتے تھے، پدما صبر کرتی تھی۔ جھلا کا ایک تبسم۔ شکریہ کا ایک لفظ یا محض مسرت خاموش اسے باغ باغ کرنے کے لیے کافی تھی۔ سیاسیات کی طرح آئین محبت میں ایک حاکم ہوتا ہے۔ دوسرا محکوم۔ محکوم پسینہ نکالتا ہے، مرتا ہے، سہتا ہے اور زبان نہیں کھول سکتا۔ حاکم سزائیں دیتا ہے، رعب جماتا ہے، رلاتا ہے، اور ابروؤں کا شکن بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

دیکھنے والے دیکھتے اور حیرت میں آجاتے تھے۔ یہ وہی پدما ہے، وہی غرور کی پتلی، وہی نازک مزاج، فسوں طراز، مگر کتنی متحمل ہو گئی ہے۔ اس طرح تو کوئی بوالہوس مرد بھی کسی حسینہ کی ناز برداری نہیں کرتا۔ کیا بوٹی سنگھا دی ہے اس ڈاکٹر نے۔ دل جلے حاسد پدما پر آواز کستے۔ پدما ہنس کر رہ جاتی۔ اس کے راندے ہوئے جو عشاق تھے انھیں اس کے بے زبان حلقہ بگوشی دیکھ کر مسرت ہوتی تھی۔ کہتے تھے: ''جیسے کو تیسا۔''

ایک دن جھلا کا ایک خط پدما نے غلطی سے کھول ڈالا۔ جھلا نے غضبناک ہو کر پوچھا: ''میرا خط کس نے کھولا؟''

پدما شاید اپنی غلطی کا اعتراف نہ کر سکی: ''شاید محرر کی غلطی ہوگی۔''

میں تمھیں اس کا ذمہ دار سمجھتا ہوں اور تمھیں اس کا جرمانہ دینا ہوگا۔

حاضر ہوں سر جھکائے ہوئے۔

جھلا نے اسے آغوش میں لے لیا...... اور پدما پر گھڑوں نشہ چڑھ گیا، دنیا اس کی نظروں میں حقیر تھی۔

(5)

دو سال گزر گئے اور پھول مرجھانے لگا۔ اس میں پھل آرہا تھا۔ نازک پدما لاغر ہوگئی۔ چہرہ زرد، رخسار بے رنگ، آنکھوں میں تکان، جسم میں ڈھیلاپن، فکر و مغموم اس پر ایک ہیبت سی طاری رہتی، متوحش خواب دیکھتی، آئینہ میں اپنی صورت دیکھتی اور آہ کھینچ کر رہ جاتی۔ ساری دنیا کے رنگ و روغن اور بہترین مقویات اور ممات فطرت کے اس تغیر کے سامنے ہیچ تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقہ، غذا کی اشتہا غائب۔ مگر اسی تناسب سے پیار کی بھوک تیز۔ اب وہ ناز برداری چاہتی تھی۔ کوئی اسے پان کی طرح پھیرے۔ اسے سینے سے لگائے رکھے۔ کبھی علاحدہ نہ کرے۔ اپنے اوپر اعتماد تھا، وہ رخصت ہوگیا۔

مگر جھلا اس تغیر سے بے خبر اور بے اثر اپنی روش پر چلے جا رہے تھے، وہی طنطنہ تھا وہی دماغ۔ پدما کیوں انھیں ڈنر کے لیے بلانے نہیں آئی، انھیں بھوک نہیں ہے۔ وہ کیوں خود پان لے کر ان کے پاس نہیں آتی، یہ مزاج حسن تو غائب ہو گیا، وہ ادائیں ہیں، نہ وہ شوخی نہ وہ ملاحت اور دماغ آسمان پر ہے۔ وہ چاہتے تھے پدما ظاہر کی طرح ان پامالیوں کو مزید التفات سے پورا کرے۔ ان پر قربان ہو، بلائیں لے۔ اس طرح دونوں میں کشیدگی بڑھنے لگی۔ پدما سوچتی کتنا بے درد آدمی ہے اورجھلا سوچتا کتنی بے اعتنائی ہے، انھیں اب اس سے گریز ہوتا۔ ان کے لیے اب یہاں دلبستگی کا کوئی سامان نہ تھا۔ جانتے تھے ہی کہ پدما ان کی لونڈی ہے پھر وہ کیوں نہ لطفِ زندگی اٹھائیں۔ کیوں نہ رنگ رلیاں منائیں۔

پدما اپنے کمرے میں اداس بیٹھی رہتی۔ وہ سیر کرنے نکل جاتے اور آدھی رات کو آتے۔ وہ ان کا انتظار کیا کرتی۔

ایک دن اس نے شکایت کی۔ تم اتنی رات تک کہاں غائب رہتے ہو۔ تمھیں خیال بھی نہیں ہوتا۔ مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔

جھلا نے منھ بنایا، اچھا اب آپ کو میرا ذرا سا انتظار کرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ بے اعتنائی سے بولے۔ تو کیا چاہتی ہو کہ میں تمھارے آنچل سے رات دن بندھا بیٹھا رہوں۔

''کچھ ہمدردی تو چاہتی ہوں۔''

''میں اپنی عادتوں کو تبدیل نہیں کر سکتا۔''

پدما خاموش ہوگئی۔ بدمزگی ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ وہ اپنے تئیں اور بھی ان کی محتاج پاتی تھی۔ کہیں ناراض نہ ہو جائیں، کہیں چلے نہ جائیں۔ اس خیال سے ہی اسے وحشت ہوتی تھی۔ رتنا کا بھی خوف تھا۔ وہ آج بھی رقیبانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جھلا کہیں چلے گئے تو وہ کتنے طعنے دے گی۔ اسے کتنا ذلیل کرے گی۔ وہ رتنا کو دکھانا چاہتی تھی تو جہاں ناکامیاب ہوئی میں وہاں کامیاب ہوں۔ تو نے جھلا کو حسن سے باندھنا چاہا ناکامیاب ہوئی۔ میں نے انھیں اپنی محبت سے باندھا ہے اور باوجود کسی رسمی یا قانونی یا روحانی معاہدہ نہ ہونے کے اب تک باندھے ہوئے ہوں۔ وہ سب کچھ جھیل کر بھی محبت کی فتح دکھانا چاہتی تھی۔ اسے اپنے سے زیادہ فکر اس نظریے کی فتح کی تھی۔

وہ درد سے بے چین تھی۔ لیڈی ڈاکٹر آئی۔ نرس آئی، دایہ آئی۔ جھلا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بار بار جی ڈوب جاتا۔ کرب سے بے ہوش ہو جاتی۔ روتی تھی، تڑپتی تھی، بدن پسینہ میں تر معلوم ہوتا تھا، جان نکل جائے گی۔ جھلا کو بار بار پوچھتی جیسے انھیں کے پاس اس کے درد کا علاج ہے۔ ہاں اگر وہ آ کھڑے ہو جاتے۔ اس کا سر سہلاتے، اسے پیار کرتے تو وہ اس سے بھی جانگزا درد جھیل لیتی۔ لیکن وہ کہاں ہیں؟ اب تک نہیں آئے۔ اب تو بارہ بجے ہوں گے۔

لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ ''ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ اور وہ ابھی تک نہیں آئے ہیں۔ کوئی ذرا جا کر انھیں بلا لائے۔''

''کہاں گئے کچھ آپ کو معلوم ہے؟''

''نہیں مجھے معلوم نہیں، مگر کسی کو بھیج دو۔ تلاش کر لائے۔''

لیڈی ڈاکٹر نے کہا آپ اپنے کو اس طرح پریشان نہ کریں، اس سے درد اور بڑھتا ہے۔ پدما چپ ہوگئی۔ پھر تڑپنے لگی اور بے ہوش ہوگئی۔ جب ہوش آیا تو بولی: ''میں اب نہ بچوں گی! مس جم یہ درد میری جان لے کر رہے گا۔ شیام بابو آئیں تو انھیں کہہ دینا میں نے انھیں معاف کیا مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں، بچہ آپ انھیں دے دیجیے گا۔ اور میری طرف سے کہنا اسے پالو، یہ تمھاری بدنصیب پدما کی نشانی ہے۔''

اور اسے معلوم ہوا جیسے تاریک نزع کا پہاڑ اس پر ٹوٹ پڑا۔

اس کی آنکھیں کھلی تو کہاں! کہاں! کہاں! خوش آیند پیاری، میٹھی، جان بخش، ضیا بارِ صدا کانوں میں آئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے بچہ کو اس کے سامنے کر دیا جیسے اس کی آنکھوں میں ٹھنڈک آگئی اور وہ ٹھنڈک حلق سے ہوتی ہوئی دل اور جگر تک پہنچ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بچہ کو گود میں لے لیا، اور بولی: ''شیام بابو آگے۔'' ایں ابھی تک نہیں آئے۔

اس کا چہرہ افسردہ ہوگیا جیسے چراغ بجھ جائے۔ زندگی کی سب سے بڑی مسرت جس کے سامنے اور سب کچھ ناچیز تھا، ناز اور ادا، بناؤ اور سنگار، بوس و کنار، کہیں یہ لطف نہیں، وہ اس سے محروم ہوگئی، وہ تو نوزائیدہ فرشتے کو گود میں اٹھا کر غرور اور تشکر بھرے ہوئے جذبات کے ساتھ اسے جھلا کی گود میں نہ دے سکی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

(6)

صبح ہوئی، جھلا نہیں آئے۔ شام ہوئی، رات ہوئی، پھر صبح ہوئی، پھر شام ہوئی، یہاں تک کہ چھ صبحیں آئیں اور گئیں۔ جھلا نہ آئے۔ نہ کچھ کہہ گئے، نہ کوئی خط دے گئے۔ پدما مارے فکر اور خوف سے سوکھی جاتی تھی۔

ساتویں دن اس نے منشی جی کو بینک بھیجا، کچھ روپے نکالنے تھے، منشی جی بینک سے ناکام لوٹے۔ بینک کے سب روپے ڈاکٹر جھلا نکال لے گئے۔ پدما نے انھیں بینک سے لین دین کرنے کا اختیار دے رکھا تھا۔

اس نے تعجب سے پوچھا: ''مگر میرے بیس ہزار جمع تھے۔''

''جی ہاں سب کا سب نکال لے گئے۔''

''اور کچھ معلوم ہوا کہاں گئے۔''

''جی وہاں تو کسی کو خبر نہیں۔''

پدما اسی طیش سے جھلا کے کمرے میں گئی اور اس کی قد آدم تصویر کو، جو ایک ہزار میں بنوائی تھی، اٹھا کر اتنے زور سے پٹکا کہ شیشہ چور چور ہو گیا پھر اس تصویر کو دونوں

ہاتھوں سے پھاڑ کر اسے پیروں سے خوب کچلا اور دیا سلائی لگا دی۔ پھر جھلا کے کپڑے، کتابیں، صندوق، جوتے، سگریٹ، کیس اور صدہا سامان جو وہاں رکھے ہوئے تھے، سب کو ایک جگہ جمع کر کے اس پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگا دی اور بلند آواز میں بولی '' شہدا، بدمعاش، حرام خور، خر دماغ، خرنفس...... ایں جھلا تم تم؟''

ہاں ڈاکٹر جھلا نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑے تھے اور دروازے پر کھڑے یہ تباہ کاریاں دیکھ رہے تھے دلچسپ اور غیر فانی نظروں سے۔

پدما حیرت، خفت اور غصہ میں ڈوبی ہوئی کھڑی ہوگئی اور پوچھا: ''تم اب تک کہاں تھے اور تم نے میرے روپے کیوں اڑا لیے شہدا بے ایمان!''

جھلا نے ظرافت آمیز انداز سے کہا:''دل کا بخار اتر گیا یا ابھی باقی ہے۔''

پدما جھلا کر بولی۔ ''تم نے میرے روپے اڑا لیے، احسان فراموش ، میں تمھیں جیل کی سیر کرا کے چھوڑوں گی۔ دغا باز!''

جھلا نے نوٹوں کا ایک پلندہ اس کی طرف حقارت سے پھینک دیا اور بولے: ''یہ لو اپنے روپے اور میرا سلام قبول کرو۔ یہ تھی تمھاری محبت جس کا اس شدومد سے اظہار کیا جا رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے تم اپنے بلڈاگ کے ساتھ کرتی ہو، اسے گود میں کھلاتی ہو۔ چومتی ہو۔ ساتھ لے کر سیر کو جاتی ہو، اپنی بغل میں بٹھا کر خوش ہوتی ہو۔ اسے اپنے ہاتھوں سے نہلاتی ہو۔ ڈارلنگ اور جانے کیا کیا کہتی ہو لیکن کتا ذرا دانت دکھا دے تو اس پر ہنٹروں کی بارش کر دوگی اور شاید گولی مار دو۔ میں بھی تمھارا بلڈاگ تھا، اتنا ہی عزیز اور اتنا ہی حقیر۔ میں دیکھتا تھا۔ اور امتحان لینا چاہتا تھا اور اب مجھے اطمیان ہوگیا کہ میرا خیال صحیح تھا کہ ایک ہفتہ غائب رہنا اتنا بڑا جرم نہ تھا۔ نہ بیس ہزار روپوں کی کوئی حقیقت ہے، مگر تمھاری محبت دیکھ لی، رتنا مجھ سے علاحدہ ہے، مگر محض قانوناً۔ اس کا مجھ سے روحانی رشتہ ہے اور وہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ آج بھی مسز جھلا ہے اور میں جانتا ہوں جس وقت میں نادم ہو کر اس کے سامنے جاؤں گا وہ پھر میری بیوی ہوگی اور میں اس کا غلام شوہر۔ تمھاری آزادی تمھیں مبارک۔ دیکھنا چاہتی ہو رتنا کے خطوط، یہ دیکھو اور شرماؤ۔ وہ آج بھی میرے نام پر بیٹھی ہوئی ہے اور تم کل، ہاں کل کوئی دوسرا طائر پھانسوگی اور پھر اس پر اپنی محبتوں کی بارش کروگی، اور بدمزاج اور غصہ ور اور سخت گیر رتنا۔ یوں ہی مجھ

سے جلتی رہے گی اور میری رہے گی۔
پدما بت کی طرح کھڑی تھی۔ جھلا چلے جا رہے تھے جیسے قید سے چھوٹ گئے ہوں۔

(یہ افسانہ پہلی بار 'زادِ راہ' میں شائع ہوا۔ ہندی میں یہ 'مان سروور 2' میں شامل ہے۔)

روشنی

آئی۔ سی۔ ایس پاس کرکے ہندوستان آیاتو مجھے ممالک متحدہ کے ایک کوہستانی علاقے میں ایک سب ڈویزن کا چارج ملا۔ شکار کا بہت شوق تھا، اور کوہستانی علاقے میں شکار کی کیا کمی۔ میری دلی مراد برآئی۔ ایک پہاڑ کے دامن میں میرا بنگلہ تھا۔ بنگلے ہی پر کچہری کر لیا کرتا تھا۔ اگر کوئی شکایت تھی تو یہ کہ سوسائٹی نہ تھی، اس لیے سیر و شکار اور اخبارات ورسائل سے اس کمی کو پورا کیا کرتا تھا۔ امریکہ اور یورپ کے کئی اخبار اور رسالے آتے تھے۔ ان کے مضامین کی شگفتگی اور جدّت اور خیال آرائی کے مقابلے میں ہندوستانی اخبار اور رسالے بھلا کیا جچتے! سوچتا تھا وہ دن کب آئے گا کہ ہمارے یہاں بھی ایسے ہی شاندار رسالے نکلیں گے۔

بہار کا موسم تھا، پھاگن کا مہینہ۔ میں دورے پر نکلا اور لندھوار کے تھانے کا معائنہ کرکے گجن پور کے تھانے کو چلا۔ کوئی اٹھارہ میل کی مسافت تھی، مگر منظر نہایت سہانا۔ دھوپ میں کسی قدر تیزی تھی مگر ناخوشگوار نہیں۔ ہوا میں بھینی بھینی خوشبو تھی۔ آم کے درختوں میں بور آگئے تھے اور کوئل کوکنے لگی تھی۔ کندھے پر بندوق رکھ لی تھی کہ کوئی شکار مل جائے تو لیتا چلوں، کچھ اپنی حفاظت کا بھی خیال تھا۔ کیونکہ اُن دنوں جابجا ڈاکے پڑ رہے تھے۔ میں نے گھوڑے کی گردن سہلائی اور کہا۔ چلو بیٹا چلو۔ ڈھائی گھنٹے کی دوڑ ہے، شام ہوتے ہوتے گجن پور پہنچ جائیں گے اور ساتھ کے ملازم پہلے ہی روانہ کر دیئے گئے تھے۔

جابجا کاشتکار کھیتوں میں کام کرتے نظر آتے تھے۔ ربیع کی فصل تیا ہو چلی تھی۔ اوکھ اور خربوزے کے لیے زمین تیار کی جارہی تھی۔ ذرا ذرا سے مرزعے تھے۔ وہی باوا آدم کے زمانے کے بوسیدہ ہل، وہی افسوسناک جہالت، وہی شرم ناک نیم برہنگی، اس قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔ گورمنٹ لاکھوں روپے زراعتی اصلاحوں پر صرف کرتی ہے۔

نئی نئی تحقیقاتیں اور ایجادیں ہوتی ہیں۔ ڈائرکٹر، انسپکٹر سب موجود، اور حالت میں کوئی اصلاح، کوئی تغیّر نہیں۔ تعلیم کا طوفان بے تمیزی برپا ہے۔ یہاں مدرسوں میں کتے لوٹتے ہیں۔ جب مدرسے میں پہنچ جاتا ہوں تو مدرس کو کھاٹ پرنیم عنودگی کی حالت میں لیٹے پاتا ہوں۔ بڑی دوا دوش سے دس بیس لڑکے جوڑے جاتے ہیں۔ جس قوم پر جمود نے اس حد تک غلبہ کرلیا ہو، اس کا مستقبل انتہا درجہ مایوس کن ہے۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ آدمیو ں کو سلف کی یاد میں آنسو بہاتے دیکھتا ہوں، مانا کہ ایشیا کے جزائر میں آرین مبلغوں نے مذہب کی روح پھونکی تھی۔ یہ بھی مان لیا کہ کسی زمانے میں آسٹریلیا بھی آرین تہذیب کا ممنون تھا۔ لیکن اس سلف پروری سے کیا حاصل۔ آج تو مغرب دنیا کا مشعل ہدایت ہے۔ ننھا سا انگلینڈ نصف کرہ زمین پر حاوی ہے۔ اپنی صنعت و حرفت کی بدولت بیشک مغرب نے دنیا کو ایک نیا پیغام عمل عطا کیا ہے اور جس قوم میں اس پیغام پر عمل کرنے کی قوت نہیں ہے، اس کا مستقبل تاریک ہے۔ جہاں آج بھی نیم برہنہ گوشہ نشین فقیروں کی عظمت کے راگ الاپے جاتے ہیں۔ جہاں آج بھی شجرو حجر کی عبادت ہوتی ہے۔ جہاں آج بھی زندگی کے ہر ایک شعبے میں مذہب گھسا ہوا ہے۔ اس کی اگر یہ حالت ہے تو تعجب کا کوئی مقام نہیں۔

میں انھیں تصورات میں ڈوبا ہوا چلا جارہا تھا۔ دفعتًا ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا جسم میں لگا تو میں نے سر اوپر اٹھا یا۔ مشرق کی جانب منظر گرد آلود ہورہا تھا، افق گرد و غبار کے پردے میں چھپ گیا تھا۔ آندھی کی علامت تھی۔ میں نے گھوڑے کو تیز کیا لیکن لمحہ بہ لمحہ غبار کا پردہ وسیع اور بسیط ہوتا جاتا تھا، اور میرا راستہ بھی مشرق ہی کی جانب تھا۔ گویا میں یکہ و تنہا طوفان کا مقابلہ کرنے دوڑا جا رہا تھا۔ ہوا اتنی ہوگئی، وہ پردہ غبار سر پر آ پہنچا اور دفعتًا میں گرد کے سمندر میں ڈوب گیا، ہوا اتنی تند تھی کہ کئی بار میں گھوڑے سے گرتے گرتے بچا۔ وہ سر سراہٹ، اور گڑگڑاہٹ تھی کہ الامان گویا فطرت نے آندھی میں طوفان کی روح ڈال دی ہے۔ دس بیس ہزار توپیں ایک ساتھ چھوٹتیں تب بھی اتنی ہولناک صدا نہ پیدا ہوتی۔ مارے گرد کے کچھ نہ سوجتا تھا، یہاں تک کہ راستہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ اُف ایک قیامت تھی جس کی یاد سے آج بھی کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ میں گھوڑے کی گردن سے چمٹ گیا، اور اس کے ایالوں میں منہ چھپا لیا۔ سنگر یزے گرد کے ساتھ اڑ

کر منہ پر اس طرح لگتے تھے، جیسے کوئی کنکریوں کو پچکاری میں بھر کر مار رہا ہو۔ ایک عجیب دہشت مجھ پر مسلط ہوگئی۔ کسی درخت کے اکھڑنے کی آواز کانوں میں آجاتی تو پیٹ میں میری آنتیں تک سمٹ جاتیں، کہیں کوئی درخت پہاڑ سے میرے اوپر گرے تو یہیں رہ جاؤں۔ طوفان میں ہی بڑے بڑے تودے بھی ٹوٹ جاتے ہیں، کوئی ایسا تو وہ لڑھکتا ہوا آجائے تو بس خاتمہ ہے، ہلنے کی بھی تو گنجائش نہیں۔ پہاڑی راستہ کچھ سوجھائی دیتا نہیں۔ ایک قدم داہنے بائیں ہو جاؤں تو ایک ہزار فیٹ گہرے کھڈ میں پہنچ جاؤں۔ عجیب ہیجان میں مبتلا تھا۔ کہیں شام تک طوفان جاری رہا تو موت ہی ہے۔ رات کو کوئی درندہ آکر صفایا کر دے گا۔ دل پر بے اختیار رقت کا غلبہ ہوا۔ موت بھی آئی تو اس حالت میں کہ لاش کا بھی پتہ نہ چلے۔ افوہ! کتنی زور سے بجلی چمکی ہے کہ معلوم ہوا ایک نیزہ، سینے کے اندر گھس گیا۔ دفعتاً جھن جھن کی آواز سُن کر میں چونک پڑا۔ اس ارراہٹ میں بھی جھن جھن کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی، جیسے کوئی سانڈنی دوڑی آرہی ہو۔ سانڈنی پر کوئی سوار تو ہوگا ہی، مگر اُسے راستہ کیوں کر سوجھ رہا ہے۔ کہیں سانڈنی ایک قدم بھی ادھر ادھر ہوجائے تو بچہ تحت الثریٰ میں پہنچ جائیں۔ کوئی زمیندار ہوگا۔ مجھے دیکھ کر شاید پہچانے بھی نہیں، چہرے پر منوں گرد پڑی ہوئی ہے، مگر ہے بلا کا ہمّت والا۔

ایک لمحے میں جھن جھن کی آواز قریب آگئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک جوان عورت سر پر ایک کھانچی رکھے قدم بڑھاتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ ایک گز کے فاصلے سے بھی اس کا صرف دھندلا سا عکس نظر آیا۔ وہ عورت ہو کر اکیلی مردانہ وار چلی آ رہی ہے، نہ آندھی کا خوف ہے نہ ٹوٹنے والے درختوں کا اندیشہ نہ چٹانوں کے گرنے کا غم، گویا یہ بھی کوئی روز مرّہ کا معمولی واقعہ ہے۔ مجھے دل میں غیرت کا احساس کبھی اتنا شدید نہ ہوا تھا۔

میں نے جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھا، اور اس سے بولا۔ ''او عورت! گجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''

میں پوچھا تو بلند لہجے میں، مگر آواز دس گز نہ پہنچی۔ عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔

میں نے چیخ کر پکارا۔ ''او عورت! ذرا ٹھہر جا۔ گجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''

عورت رک گئی۔ اس نے میرے قریب آکر، مجھے دیکھ کر، ذرا سر جھکا کر کہا۔

''کہاں جاؤ گے؟''

''گجن پور کتنی دور ہے؟''

''چلے آؤ۔ آگے ہمارا گاؤں ہے۔ اس کے بعد گجن پور ہے''۔

''تمھارا گاؤں کتنی دور ہے؟''

''وہ کیا آگے دکھائی دیتا ہے''۔

''تم اس آندھی میں کہیں رک کیوں نہیں گئیں؟''

''چھوٹے چھوٹے بچے گھر پر ہیں۔ کیسے رک جاتی۔ مرد تو بھگوان کے گھر چلا گیا''۔ آندھی کا ایسا زبردست ریلا آیا کہ میں شاید دو تین قدم آگے کھسک گیا، گرد و غبار کی ایک دھونکنی سی منہ پر لگی۔ اس عورت کا کیا حشر ہوا مجھے خبر نہیں۔ میں پھر وہیں کھڑا رہ گیا، فلسفے نے کہا، اس عورت کے لیے زندگی میں کیا راحت ہے۔ کوئی ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا ہوگا، دو تین فاقہ کش بچے۔ بیکسی میں موت کا کیا غم۔ موت تو اُسے باعث نجات ہوگی۔ میری حالت اور ہے۔ زندگی اپنی تمام دل فریبیوں اور رنگینیوں کے ساتھ میری نازبرداری کر رہی ہے، حوصلے ہیں، ارادے ہیں۔ میں اسے کیوں کر خطرے میں ڈال سکتا ہوں۔

میں نے پھر گھوڑے کے ایالوں میں منہ چھپا لیا۔ شترمرغ کی طرح جو خطرے سے بچنے کی کوئی راہ نہ پا کر بالوں میں سر چھپا لیتا ہے۔

(2)

وہ آندھی کی آخری سانس تھی۔ اس کے بعد بتدریج زور کم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ کوئی پندرہ منٹ میں مطلع صاف ہو گیا۔ نہ گرد و غبار کا نشان تھا نہ ہوا کے جھونکوں کا... ہوا میں ایک فرحت بخش خنکی آ گئی تھی۔ ابھی مشکل سے پانچ بجے ہوں گے۔ سامنے ایک پہاڑی تھی، اس کے دامن میں ایک چھوٹا سا موضع تھا۔ میں جوں ہی اس گاؤں میں پہنچا، وہی عورت ایک بچے کو گود میں لیے میری طرف آ رہی تھی، مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''تم کہاں رہ گئے تھے؟ میں ڈری کہ تم رستہ نہ بھول گئے ہو۔ تمھیں ڈھونڈھنے جا رہی تھی''۔

میں نے اس کی انسانیت سے متاثر ہو کر کہا۔ ''میں اس کے لیے تمھارا بہت ممنون ہوں۔ آندھی کا ایسا ریلا آیا کہ مجھے رستہ نہ سوجھا۔ میں وہیں کھڑا ہو گیا یہی تمھارا گاؤں ہے؟ یہاں سے گجن پور کتنی دور ہوگا؟''

''بس کوئی دھاپ بھر سمجھ لو۔ راستہ بالکل سیدھا ہے، کہیں دہنے بائیں مُڑ یو نہیں۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے پہنچ جاؤ گے''۔

''یہی تمھارا بچّہ ہے''۔

''نہیں ایک اور اس سے بڑا ہے جب آندھی آئی تو دونوں نمبردار کی چوپال میں جاکر بیٹھے تھے کہ جھونپڑیا کہیں اُڑ نہ جائے۔ جب سے آئی ہوں یہ میری گود سے نہیں اترتا۔ کہتا ہے تو پھر کہیں بھاگ جائے گی۔ بڑا شیطان ہے۔ لڑکوں میں کھیل رہا ہے۔ محنت مزدوری کرتی ہوں بابو جی! ان کو پالنا تو ہے، اب میرے کون بیٹھا ہوا ہے، جس پر ٹیک کروں۔ گھاس لے کر بیچنے گئی تھی۔ کہیں جاتی ہوں من ان بچّوں میں لگا رہتا ہے''۔

میرا دل اتنا اثر پذیر تو نہیں ہے، لیکن اس دہقان عورت کے بے لوث انداز گفتگو، اس کی سادگی اور جذبۂ مادری نے مجھ پر تسخیر کا سا عمل کیا اس کے حالات سے مجھے گو نہ دلچسپی ہوگئی۔ پوچھا۔ ''تمھیں بیوہ ہوے کتنے دن ہو گئے''۔

عورت کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے بچے کے رخسار کو اپنی آنکھوں سے لگا کر بولی:-

''ابھی تو کل چھ مہینے ہیں بابو جی''۔ بھگوان کی مرضی میں آدمی کا کیا۔ بس بھلے چنگے ہل لے کر لوٹے، ایک لوٹا پانی پیا، قے ہوئی۔ بس آنکھیں بند ہوگئیں۔ نہ کچھ کہا نہ سُنا۔ میں سمجھی تھکے ہیں، سو رہے ہیں۔ جب کھانا کھانے کو اٹھانے لگی تو بدن ٹھنڈا۔ تب سے بابو جی! گھاس چھیل کر پیٹ پالتی ہوں اور بچّوں کو کھلاتی ہوں۔ کھیتی میرے مان کی نہ تھی۔ بیل بدھئے بیچ کر انھیں کے کریا کرم میں لگا دیئے۔ بھگوان تمھارے اِن دونوں گلاموں کو جلا دے میرے لیے یہی بہت ہیں''۔

میں موقع اور محل سمجھتا ہوں، اور نفسیات میں بھی دخل رکھتا ہوں، لیکن اس وقت مجھ پر ایسی رقّت طاری ہوئی کہ میں آب دیدہ ہوگیا۔ اور جیب سے پانچ روپے نکال کر اس عورت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوے کہا۔ ''میری طرف سے یہ بچوں کے مٹھائی

کھانے کے لیے لو، مجھے موقع ملا تو پھر کبھی آؤں گا''۔ یہ کہہ کر میں نے بچے کے رخساروں کو انگلی سے چھو دیا۔

ماں ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''نہیں بابو جی، یہ رہنے دیجیے۔ میں غریب ہوں،لیکن بھکارن نہیں ہوں''۔

''یہ بھیک نہیں ہے بچوں کو مٹھائی کھانے کے لیے ہے۔'' نہیں بابو جی۔ ''مجھے اپنا بھائی سمجھ کر لے لو۔''

''نہیں بابو جی۔ جس سے بیاہ ہوا اس کی عزّت تو میرے ہی ہاتھ ہے۔ بھگوان تمھارا بھلا کریں۔ اب چلے جاؤ، نہیں دیر ہوجائے گی''۔

میں دل میں خفیف اتنا کبھی نہ ہوا تھا۔ جنھیں میں جاہل، کورباطن، بے خبر سمجھتا تھا، اسی طبقے کی ایک معمولی عورت میں یہ خودداری، یہ فرض شناسی یہ توکل! اپنے ضعف کے احساس سے میرا دل جیسے پامال ہوگیا۔ اگر تعلیم فی الاصل تہذیب نفس ہے، اور محض اعلیٰ ڈگریاں نہیں، تو یہ عورت تعلیم کی معراج پر پہنچی ہوئی ہے۔

میں نے نادم ہو کر نوٹ جیب میں رکھ لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے پوچھا۔ ''تمھیں اس آندھی میں ذرا بھی ڈر نہ معلوم ہوتا تھا؟''

عورت مسکرائی۔ ''ڈر کس بات کا؟ بھگوان تو سبھی جگہ ہیں۔ اگر وہ مارنا چاہیں، تو کیا یہاں نہیں مار سکتے؟ میرا آدمی تو گھر آکر بیٹھے بیٹھے چل دیا۔ آج وہ ہوتا تو تم اس طرح گجن پور اکیلے نہ جاپاتے۔ جاکر تمھیں پہنچا آتا۔ تمھاری خدمت کرتا''۔

گھوڑا اڑا۔ میرا دل اس سے زیادہ تیزی سے اُڑ رہا تھا۔ جیسے کوئی مفلس سونے کا ڈلا پا کر دل میں ایک طرح پرواز کا احساس کرتا ہے وہی حالت میری تھی۔ اس دہقان عورت نے مجھے وہ تعلیم دی جو فلسفہ اور مابعد الطبیعات کے دفتروں سے بھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ میں مفلس کی طرح اس سونے کے ڈلے کو گرہ میں باندھتا ہوا ایک غیر مترقبہ نعمت کے غرور سے مسرور، اس اندیشے سے خائف کہ کہیں یہ اثر دل سے مٹ نہ جائے، اڑا چلا جاتا تھا۔ بس یہی فکر تھی کہ اس پارۂ زر کو دل کے کسی گوشے میں چھپا لوں، جہاں کسی حریص کی اس پر نگاہ نہ پڑے۔

(3)

گجن پور ابھی پانچ میل سے کم نہ تھا۔ راستہ نہایت پیچیدہ، بیہڑ بے برگ و بار۔ گھوڑے کو روکنا پڑا۔ تیزی میں جان کا خطرہ تھا۔ آہستہ آہستہ سنبھلتا ہوا چلا جاتا تھا کہ آسمان پر ابر گھر آیا۔ کچھ کچھ تو پہلے ہی سے چھایا ہوا تھا۔ پر اب اس نے ایک عجیب صورت اختیار کی۔ برق کی چمک اور رعد کی گرج شروع ہوئی۔ پھر افق مشرق کی طرف سے زرد رنگ کے ابر کی ایک نئی تہہ اس نیلے رنگ پر زرد لیپ کرتی ہوی تیزی سے اوپر کی جانب دوڑتی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا اولے ہیں۔ پھاگن کے مہینے میں اس رنگ کے بادل اور گرج کی یہ مہیب گڑگڑاہٹ ژالہ باری کی علامت ہے۔ گھٹا سر پر بڑھتی چلی جاتی تھی، یکایک سامنے ایک کفِ دست میدان آگیا۔ جس کے پرلے سرے پر گجن پور کے ٹھاکر دوارے کا کلس صاف نظر آرہا تھا۔ کہیں کسی درخت کی بھی آڑ نہ تھی۔ لیکن میرے دل میں مطلق کمزوری نہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مجھ پر کسی کا سایہ ہے، جو مجھے ہر آفت، ہرگز ند سے محفوظ رکھے گا۔

ابر کی زردی ہر لمحہ بڑھتی جاتی تھی۔ شاید گھوڑا اس خطرے کو سمجھ رہا تھا، وہ بار بار ہنہناتا تھا، اور اڑ کر خطرے سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے بھی دیکھا راستہ صاف ہے۔ لگام ڈھیلی کر دی۔ گھوڑا اڑا۔ میں اس کی تیزی کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دل میں خوف کا مطلق احساس نہ تھا۔

ایک میل نکل گیا ہوں گا کہ ایک رپٹ آپڑی۔ پہاڑی ندی تھی، جس کے پیٹے میں کوئی پچاس گز لمبی رپٹ بنی ہوئی تھی۔ پانی کی ہلکی دھار رپٹ پر سے اب بھی بہہ رہی تھی۔ رپٹ کے دونوں طرف پانی جمع تھا۔ میں نے دیکھا ایک اندھا لاٹھی ٹیکتا ہوا رپٹ سے گزر رہا تھا۔ وہ رپٹ کے ایک کنارے سے اتنا قریب تھا کہ مں ڈر رہا تھا، کہیں گر نہ پڑے۔ اگر پانی میں گرا تو مشکل ہوگی۔ کیونکہ وہاں پانی گہرا تھا۔ میں نے چلا کر کہا۔ ''بڈھے اور داہنے کو ہو جا''۔

بڈھا چونکا، اور گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سن کر شاید ڈر گیا۔ داہنے تو نہیں ہوا اور بائیں طرف ہو لیا، اور پھسل کر پانی میں گر پڑا۔ اسی وقت ایک ننھا سا اولا میرے سامنے

گرا۔ دونوں مصیبتیں ایک ساتھ نازل ہوئیں۔

ندی کے اس پار ایک مندر تھا۔ اس میں بیٹھنے کی جگہ کافی تھی۔ میں ایک منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن یہ نیا عقیدہ سامنے آ گیا۔ کیا اس اندھے کو مرنے کے لیے چھوڑ کر اپنی جان بچانے لیے بھاگوں؟ حمیت نے اسے گوارا نہ کیا زیادہ پس و پیش کا موقع نہ تھا، میں فوراً گھوڑے سے کودا اور کئی اولے میرے چاروں طرف گرے۔ میں پانی میں کود پڑا۔ ہاتھی ڈباؤ پانی تھا۔ رپٹ کے لیے جو بنیاد کھودی گئی تھی وہ ضرورت سے زیادہ چوڑی تھی۔ ٹھیکے دار نے دس فیٹ چوڑی رپٹ تو بنا دی، مگر کھدی ہوئی مٹی برابر نہ کی۔ بڈھا اسی گڈھے میں گرا تھا۔ میں بھی ایک غوطہ کھا گیا، لیکن تیرنا جانتا تھا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ میں نے دوسری ڈبکی لگائی، اور اندھے کو باہر نکالا۔ اتنی دیر میں وہ سیروں پانی پی چکا تھا۔ جسم بے جان ہو رہا تھا۔ میں اس لیے بڑی مشکل سے باہر نکلا، دیکھا تو گھوڑا بھاگ کر مندر میں جا پہنچا ہے۔ اس نیم جان لاش کو لیے ہوئے ایک فرلانگ چلنا آسان نہ تھا۔ اوپر اولے تیزی سے گرنے لگے تھے۔ کبھی سر پر، کبھی شانے پر، کبھی پیٹھ میں گولی سی لگ جاتی تھی۔ میں تلملا اٹھا تھا، لیکن اس لاش کو سینے سے لگائے مندر کی طرف لپکا جاتا تھا۔ میں اگر اس وقت اپنے دل کے جذبات بیان کروں تو شاید خیال ہو، میں خواہ مخواہ تعلّی کر رہا ہوں۔ اچھے کام کرنے میں ایک خاص مسرّت ہوتی ہے، مگر میری خوشی ایک دوسری ہی قسم کی تھی۔ وہ فاتحانہ مسرّت تھی۔ میں نے اپنے اوپر فتح پائی تھی۔ آج سے پہلے غالبًا میں اس اندھے کو پانی میں ڈوبتے دیکھ کر، یا تو اپنی راہ چلا جاتا یا پولیس کو رپورٹ کرتا۔ خاص کر ایسی حالت میں جبکہ سر پر اولے پڑ رہے ہوں، میں کبھی پانی میں نہ گھستا۔ ہر لحظہ خطرہ تھا کہ کوئی بڑا سا اولا سر پر گر کر عزیز جان کا خاتمہ نہ کر دے، مگر میں خوش تھا۔ کیوں کہ آج میری زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

میں مندر میں پہنچا تو سارا جسم زخمی ہو رہا تھا، مجھے اپنی فکر نہ تھی۔ ایک زمانہ ہوا میں نے فوری امداد (فرسٹ ایڈ) کی مشق کی تھی، وہ اس وقت کام آئی۔ میں نے آدھ گھنٹے میں اس اندھے کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ اتنے میں دو آدمی اندھے کو ڈھونڈھتے ہوئے مندر میں آ پہنچے۔ مجھے اس کی تیمارداری سے نجات ملی۔ اولے نکل گئے تھے۔ میں نے گھوڑے کی پیٹھ ٹھونکی۔ رومال سے ساز کو صاف کیا اور گجن پور چلا۔ بے خوف، بے خطر،

دل میں ایک غیبی طاقت محسوس کرتا ہوا۔ اسی وقت اندھے نے پوچھا۔ ''تم کون ہو بھائی، مجھے تو کوئی مہاتما معلوم ہوتے ہو''۔

میں نے کہا۔ ''تمھارا خادم ہوں''۔

''تمھارے سر پر کسی دیوتا کا سایہ معلوم ہوتا ہے''۔

''ہاں ایک دیوی کا سایہ ہے''

''وہ کون دیوی ہے؟''

''وہ دیوی پیچھے کے گاؤں میں رہتی ہے''۔

''تو کیا وہ عورت ہے؟''

''نہیں میرے لیے تو وہ دیوی ہے''۔

(یہ افسانہ پہلی بار 'ادبی دنیا' کے نومبر 1932 کے شمارے میں شائع ہوا۔ 'واردات' میں شامل ہے۔ ہندی میں یہ 'ایراپیہ ساہتیہ' میں شائع ہوا۔)

حقیقت

وہ راز امرت کے دل میں سر بستہ ہی رہا۔ پورنما کو اس کی نظروں سے باتوں سے یا قیافے سے کبھی یہ وہم بھی نہ ہوا کہ امرت کو اس سے معمولی ہمسائیگی اور بچپن کی دوستی کے سوا اور کوئی تعلق بھی ہے یا ہو سکتا ہے، بے شک جب وہ گھڑا لے کر کنویں پر پانی کھینچنے جاتی تو امرت خدا جانے کہاں سے آجاتا اور گھڑا اس کے ہاتھ سے بزور لے کر پانی کھینچ دیتا جب وہ اپنی گائے کو سانی دینے لگتی تو وہ اس کے ہاتھ سے بھوسے کی ٹوکریاں لیتا اور گائے کی ناند میں سانی ڈال دیتا۔ بنئے کی دکان پر کوئی چیز لینے جاتی تو امرت اکثر مل جاتا اور اس کا کام کر دیتا۔

پورنما کے گھر میں کوئی دوسرا لڑکا یا آدمی نہ تھا، اس کے باپ کا کئی سال پہلے انتقال ہو چکا تھا اور ماں پردے میں رہتی تھی، امرت پڑھنے جانے لگتا تو پورنما کے گھر جا کر پوچھ لیا کرتا، بازار سے کچھ منگوانا تو نہیں ہے اس کے گھر میں کھیتی باڑی ہوتی تھی بھینسیں تھیں، باغ بغیچے تھے۔ گھر والوں کی نظر بچا کر وہ فصل کی چیزیں سوغات کے طور پر پورنما کے گھر دے آتا مگر پورنما ان خاطرداریوں کو اس کی شرافت اور سیر حتمی کے سوا اور کیا سمجھے اور کیوں سمجھے، ایک گاؤں میں رہنے والے چاہے خونی تعلق نہ رکھتے ہوں مگر گاؤں کے رشتے سے بہن بھائی تو ہوتے ہی ہیں۔ ان خاطر داریوں میں کوئی خاص بات نہ تھی۔

ایک دن پورنما نے اس سے کہا بھی، ''تم دن پر مدرسے رہتے ہو، میرا جی گھبراتا ہے۔'' امرت نے سادگی سے کہا۔ ''کیا کروں امتحان قریب ہے۔''

''میں سوچا کرتی ہوں جب میں چلی جاؤں گی تو تمھیں کیسے دیکھوں گی اور تم کیوں میرے گھر آؤ گے۔''

امرت نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کہاں چلی جاؤ گی تم؟''

پورنما لجا گئی۔ پھر بولی۔ ''جہاں تمھاری بہنیں چلی گئیں، جہاں لڑکیاں چلی جاتی ہیں۔''
امرت نے حسرت کے ساتھ کہا۔ ''اچھا وہ بات'' اور خاموش ہوگیا۔ اس وقت تک یہ بات اس کے ذہن میں نہ آئی تھی کہ پورنما کہیں چلی جائے گی۔ اتنی دور تک سوچنے کی اسے مہلت ہی نہ تھی، مسرت تو حال ہی میں مست رہتی ہے، آئندہ سوچنے لگی تو مسرت ہی کیوں رہے۔

اور یہ سانحہ اس سے جلد رونما ہوگیا۔ جس کا امرت کو گمان ہوسکتا، پورنما کے لیے ایک پیغام آگیا۔ متمول خاندان تھا اور ذی عزت پورنما کی ماں نے اسے بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔ عسرت کی اس حالت میں اس کی نظروں میں دنیا کی جو چیز سب سے زیادہ تھی وہ دولت تھی اور یہاں پورنما کے لیے فارغ البال زندگی کے لیے سارے سامان موجود تھے، اسے جیسے منہ مانگی مراد مل گئی، فکروں سے گھلی جاتی تھی، لڑکی کی شادی کا خیال آتے ہی اختلاج قلب ہونے لگتا تھا، گویا غیب نے ابرو کی ایک جنبش سے اس کی ساری فکروں اور پریشانیوں کا خاتمہ کر دیا۔

امرت نے سنا تو دیوانہ ہو گیا۔ بے تحاشا پورنما کے گھر کی طرف دوڑا۔ مگر پھر لوٹ پڑا، ہوش نے پاؤں روک دیے، کیا فائدہ، اس کی کیا خطا؟ کسی کی بھی کیا خطا؟ اپنے گھر آیا اور منہ ڈھانپ کر لیٹ رہا، پورنما چلی جائے گی۔ پھر وہ کیسے رہے گا، ہیجان سا ہونے لگا، وہ زندہ ہی کیوں رہے، زندگی میں رکھا ہی کیا ہے، مگر یہ ہیجان تھا فرو ہوگیا، اور اس کی جگہ لی اس سکون نے جو طوفان کے بعد آتا ہے وہ بے نیاز ہو گیا، جب پورنما جاتی ہے تو وہ اب اس سے کیوں کوئی تعلق رکھے کیوں ملے جلے، اور اب پورنما کو اس کی پرواہ ہی کیوں ہونے لگی اور پرواہ تھی ہی کب، وہ خود ہی کتوں کی طرح اس کے پیچھے دم ہلاتا رہتا تھا، پورنما نے تو کبھی بات بھی نہیں پوچھی اور اب اسے کیوں نہ غرور ہو، ایک لکھ پتی کی بیوی بننے جا رہی ہے، شوق سے بنے، امرت بھی زندہ رہے گا، مرے گا نہیں یہی اس زمانے کی رسمِ وفا ہے۔

مگر یہ ساری شورش دل کی اندر تھی، بے عمل، اس میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ جا کر پورنما کی ماں سے کہہ دے ''پورنما میری ہے اور میری رہے گی۔'' غضب ہو جائے گا، گاؤں میں کہرام مچ جائے گا، ایسا واقعہ گاؤں کی روایتوں نے کبھی سنا ہے اور نواحات

نے کبھی دیکھا ہے؟

اور پورنما کا یہ حال تھا کہ دن بھر اس کی راہ دیکھا کرتی، وہ کیوں اس کے دروازہ سے ہو کر نکل جاتا ہے اور اندر نہیں آتا، کبھی راستہ میں ملاقات ہو جاتی ہے تو جیسے اس کے سائے سے بھاگتا ہے، وہ کاسا لے کر کنوئیں پر کھڑی رہتی ہے کہ وہ آتا ہوگا، مگر وہ نظر نہیں آتا۔

ایک دن وہ اس کے گھر گئی اور اس کے پاس جا کر جواب طلب کیا۔ ''تم آج کل آتے کیوں نہیں،'' اور اس کا گلا بھر آیا، اسے یاد آیا کہ اب وہ اس گاؤں میں چند دنوں کی مہمان ہے۔

مگر امرت بے حس بیٹھا رہا، بے اعتنائی سے صرف اتنا بولا۔ ''امتحان قریب ہے فرصت نہیں ملتی۔''

''سوچتا ہوں جب تم جا رہی ہو''...

وہ کہنا چاہتا تھا۔ ''تو اب محبت کیوں بڑھاؤں۔'' مگر خیال آگیا کتنی احمقانہ گفتگو ہے کوئی مریض مرنے جا رہا ہو کیا اس خیال سے اس کا معالجہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جوں جوں اس کی حالت دگرگوں ہوتی ہے لوگ اور بھی زیادہ انہماک یاس کے ساتھ دوا دوش کرتے ہیں اور نزع کی حالت میں جدو جہد کی انتہا ہی نہیں رہتی۔ گفتگو کا پہلو بدل کر بولا۔ ''سنا وہ لوگ بھی بڑے مالدار ہے۔''

پورنما نے یہ آخری الفاظ شاید سنے ہی نہیں یا ان کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی، اس کے کانوں میں تو جواب کا پہلا حصہ ہی گونج رہا تھا۔

دردناک لہجہ میں بولی۔ اس میں میری کیا خطا، میں اپنی خوشی سے تو نہیں جا رہی ہوں۔ جانا پڑتا ہے اس لیے جا رہی ہوں۔''

یہ کہتے کہتے شرم سے اس کا چہرہ گلنار ہوگیا، جتنا اسے کہنا چاہیے تھا شاید اس سے زیادہ کہہ گئی، محبت میں بھی شطرنج کی سی چالیں ہوتی ہیں۔

امرت نے اس کی طرف اس طرح دیکھا، گویا تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ ان لفظوں میں کچھ معنی بھی ہیں یا نہیں، کاش ان آنکھوں میں وار پار دیکھنے کی طاقت ہوتی اس طرح تو سبھی لڑکیاں مایوسانہ گفتگو کرتی ہیں، گویا شادی ہوتے ہی ان کی جان پر بن جائے گی مگر

سبھی ایک دن اچھے اچھے گہنے پہن کر اور پالکی میں چلی جاتی ہیں۔ ان الفاظ سے اس کی کچھ تشفی نہ ہوئی، پھر ڈرتے ڈرتے بولا۔ ''تب تمھیں میری یاد کیوں آئے گی۔''

اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا، ایسی وحشت خیز ندامت ہوئی کہ کمرہ سے باہر بھاگ جائے، پورنما کی طرف تاکنے کی بھی جرأت نہ ہوئی کہیں وہ یہ نہ سمجھ گئی ہو۔

پورنما نے سر جھکا کر جیسے اپنے دل سے کہا، ''تم مجھے اتنی نوموہنی سمجھتے ہو، تم جو مجھ سے بے قصور روٹھتے ہو، تمھیں اس وقت مجھ سے ہمدری کرنا چاہیے، مجھے تشفی دینا چاہیے اور مجھ سے تتنے بیٹھے ہو، تمھیں بتاؤ میرے لیے دوسرا کون سا راستہ ہے اپنے مجھے غیروں کے گھر بھیجے دے رہے ہیں وہاں مجھ پر کیا گزرے گی، میری کیا حالت ہوگی، یہ غم میری جان لینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ تم اس میں غصہ بھی حل کردو۔''

اس کا گلا بھر بھر آیا۔ آج امرت کو اس ملامت میں پورنما کے سوز نہاں کا یقین ہوا اور اپنی کم ظرفی اور نفس پروری گویا کالکھ بن کر اس کے چہرے پر چمکنے لگی، پورنما کے ان الفاظ میں پوری صداقت اور کتنی سرزنش اور کتنا اپنا پن تھا، غیروں سے کوئی، کیوں شکوہ کرے بے شک اس حالت میں اسے پورنما کی دلجوئی کرنی چاہیے تھی، یہ اس کا فرض تھا اور اسے یہ فرض خندہ پیشانی سے پورا کرنا چاہیے تھا، پورنما نے محبت کا ایک نیا معیار اس کے سامنے رکھ دیا اور اس کا ضمیر اس معیار سے انحراف نہ کر سکتا تھا۔ بے شک محبت ایک بے نفس قربانی ہے طویل اور جگر دوز اس نے پشیمان ہو کر کہا، مجھے معاف کرو پورنما میری غلطی تھی، بلکہ حماقت۔''

(3)

پورنما کی شادی ہوگئی۔ امرت جان و دل سے اس کے اہتمام میں مصروف رہا دولہا ادھیڑ، تو ندل، کمرو، اور اس کے ساتھ ہی بڑا مغرور اور بدمزاج لیکن امرت اس انہماک سے اس کی خاطر داری کر رہا تھا۔ گویا وہ کوئی دیوتا ہے اور اس ایک تبسم اسے جنت میں پہنچا دے گا، پورنما سے بات چیت کرنے کا امرت کو موقع نہ ملا۔ اور نہ اس نے موقع پیدا کرنے کی کوشش کی، وہ پورنما کو جب دیکھتا روتے ہی دیکھتا اور آنکھوں کی زبان خاموش سے جتنی دلجوئی ہمدردی اور تشفی ممکن تھی وہ کرتا رہتا تھا۔

تیسرے دن پورنما رودھو کر رخصت ہوگئی، امرت نے اس دن شیو مندر میں جا کر سچی عبودیت سے بھرے ہوئے دل سے دعا کی کہ پورنما ہمیشہ سکھی رہے۔ غم کی تازگی میں فاسد خیالات کا کہاں گزر، غم تو روحانی امراض کا ازالہ ہے مگر دل کے اندر اسے ایک ہمہ گیر سونے پن اور خلا کا احساس ہو رہا تھا۔ گویا اب زندگی ویران ہے، اس کا کوئی مقصد اور مدعا نہیں۔

تین سال کے بعد پورنما پھر میکے آئی۔ اس دوران میں امرت کی بھی شادی ہو چکی تھی اور وہ زندگی کا جوا گردن پر رکھے لکیر پیٹتا چلا جا رہا تھا، مگر ایک موہوم سی تمنا جس کی کوئی واضح صورت وہ نہ بنا سکتا تھا۔ تھرما میٹر کے پارے کی طرح اس کے اندر محفوظ تھی۔ پورنما نے آکر اس میں حرارت ڈال دی اور پارہ چڑھ کر سرسام کی حد تک جا پہنچا۔ اس کی گود میں ایک دو سال کا پیارا بچہ تھا۔ امرت اس بچہ کو سارے دن گلے باندھے رہتا، صبح و شام اسے گود میں لے کر ٹہلانے لے جاتا اور اس کے لیے بازار سے طرح طرح کے کھلونے اور مٹھائیاں لاتا، صبح ہوتے ہی اس کے ناشتے کے لیے حلوا اور دودھ لے کر پہنچ جاتا، اسے نہلاتا، دھلاتا، اس کے بال صاف کرتا اس کے پھوڑے پھنسیوں کو دھوتا، مرہم رکھتا، یہ ساری خدمت اس نے اپنے ذمہ لے لی، بچہ بھی اس سے اتنا ہل گیا کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا گھر نہ چھوڑتا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اس کے ساتھ سو جاتا اور پورنما کے بلانے پر بھی اس کے ساتھ نہ جاتا۔

امرت پوچھتا۔ ''تم کس کے بیٹے ہو۔''

بچہ کہتا۔ ''تمالے۔''

اور امرت سے متوالا ہو کر اسے جگر سے چمٹا لیتا۔

پورنما کا حسن اور بھی نکھر آیا تھا۔ کلی کھل کر پھول ہوگئی تھی، اب اس کے مزاج میں خودداری اور تمکنت تھی اور سنگار سے عشق، طلائی زیوروں سے سج کر اور ریشمی ساڑی پہن کر اب وہ پہلے سے کہیں جاذب نظر ہوگئی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا، امرت سے احتراز کرنا چاہتی ہے۔ بلا کسی خاص ضرورت کے اس سے بہت کم بولتی اور وہ اس انداز سے گویا اس پر کوئی احسان کر رہی ہو، امرت اس کے بچہ پر کس قدر جان دیتا ہے اور اس کی فرمائشوں کی کتنی تندہی سے تعمیل کرتا ہے۔ بظاہر اس کی نگاہوں میں ان باتوں کی

کوئی وقعت نہ تھی، گویا امرت کا فرض ہے اور اسے ادا کرنا چاہیے۔ اس کے لیے وہ کسی شکریے اور احسان کا حقدار نہیں۔

بچہ روتا تو دھمکا دیتی۔ ''خبردار رونا نہیں ورنہ ماموں تم سے کبھی نہ بولیں گے'' اور بچہ خاموش ہو جاتا۔

اسے جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ امرت کو بلا کر تحکمانہ انداز سے کہہ دیتی ہے اور امرت فوراً تعمیل کرتا ہے، گویا اس کا غلام ہو۔ وہ بھی شاید سمجھتی ہے کہ اس نے امرت سے غلامی لکھائی ہے۔

چھ مہینے میکے رہ کر پورنما سسرال چلی گئی۔ امرت اسے پہنچانے اسٹیشن تک آیا۔ جب وہ گاڑی میں بیٹھ گئی تو امرت نے بچہ کو اس کی گود میں دے دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو کی بوند ٹپک پڑی۔ اس نے منھ پھیر لیا اور آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر آنسو پونچھ ڈالے۔ پورنما کو اپنے آنسو کیسے دکھائے کیونکہ اس کی آنکھیں خشک تھیں، مگر دل نہ مانتا تھا نہ جانے پھر کب ملاقات ہو۔

پورنما نے تمکنت کے ساتھ کہا۔ ''بچہ کئی دن تک تمھارے لیے بہت ہڑکے گا۔''

امرت نے بھرے ہوئے گلے سے کہا۔ ''مجھے تو عمر بھر بھی اس کی صورت نہ بھولے گی۔''

''کبھی کبھی ایک آدھ خط تو بھیج دیا کرو۔''

''بھیجوں گا۔''

''مگر میں جواب نہ دوں گی، یہ سمجھ لو۔''

''مت دینا میں مانگتا تو نہیں، مگر یاد رکھنا۔''

گاڑی روانہ ہوگئی اور امرت اس کی طرف تاکتا رہا۔ ایک فرلانگ کے بعد اس نے دیکھا کہ پورنما نے کھڑکی سے سر نکال کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر بچہ کو گود میں لے کر کھڑکی سے ذرا دکھا دیا۔

امرت کا دل اس وقت اڑ کر اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ اتنا خوش تھا جیسے اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا ہو۔

(4)

اس سال پورنما کی ماں کا انتقال ہوگیا، پورنما اس وقت زچہ خانے میں تھی۔ ماں کا آخری دیدار نہ کرسکی۔ امرت نے علاج معالجہ میں جتنی دوا دوش ہوسکی کی، کریا کرم کیا۔ براہمنوں کو کھلایا، برادری کی دعوت کی، جیسے اس کی اپنی ماں مرگئی ہو۔ اس کے باپ انتقال کر چکے تھے وہ اپنے گھر کا مالک تھا۔ کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا۔

پورنما اب کس ناتے سے میکے آتی، اور اسے اب فرصت بھی کہاں تھی، اپنے گھر کی مالکن تھی کس پر گھر چھوڑ آتی، اس کے دو بچے اور بھی ہوئے، بڑا لڑکا بڑا ہوا اور اسکول میں پڑھنے لگا چھوٹا دیہات کے مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ امرت سال میں ایک بار نائی کو بھیج کر خرسلاً منگا لیا کرتا تھا، پورنما فارغ البال ہے خوش ہے۔ اس کی تشفی کے لیے اتنا کافی تھا۔ امرت کے لڑکے بھی اب سیانے ہوگئے تھے، خانہ داری کی فکروں میں پریشان رہتا تھا اور عمر بھی چالیس سال سے آگے نکل گئی تھی۔ مگر پورنما کی یاد ابھی تک اس کے جگر کے عمیق ترین حصہ میں محفوظ تھی۔

دفعتاً ایک دن امرت نے سنا کہ پورنما کے شوہر نے دنیا عدم کی راہ لی۔ مگر تعجب یہ تھا کہ اسے رنج نہ ہوا۔ وہ خواہ مخواہ اپنے دل میں یہ طے کر بیٹھا تھا کہ اس خبیث شوہر کے ساتھ پورنما ہوسکتی، فرض کی مجبوری اور عصمت پروری کے لحاظ سے پورنما نے کبھی اپنے سوز جگر کا اظہار نہ کیا۔ مگر یہ غیر ممکن ہے کہ آرام اور فارغ البال کے باوجود اسے اس مکروہ صورت انسان سے کوئی خاص محبت رہی ہو، یہ تو ہندوستان ہی ہے جہاں ایسی اپسرائیں ایسے نااہلوں کے گلے باندھ دی جاتی ہیں ورنہ کسی دوسرے ملک میں تو پورنما جیسی عورت پر ملک کے نوجوان نثار ہوجاتے اس کی کی مری ہوئی تمنائیں پھر زندہ ہوگئیں۔ اب اس میں وہ پہلے کی جھلک نہیں ہے، اس کی زبان پر نہ وہ مہر خاموشی ہے، اور پورنما بھی اب آزاد ہے، تقاضائے حسن نے یقیناً اسے زیادہ مہر پرور بنا دیا ہوگا۔ وہ شوخی اور الھڑپن اور بے نیازی تو کب کی رخصت ہو چکی ہوگی، اس دوشیزگی کی جگہ اب آزردہ کار نسائیت ہوگی جو محبت کی قدر کرتی ہے، اور اس کی طلبگار رہتی ہے۔ وہ پورنما کے گھر ماتم پرستی کرنے جائے گا، اور اسے اپنے ساتھ لائے گا، اور اس کے مکان میں

اس کی جو کچھ خدمت ہو سکے گی وہ کرے گا۔ اب اسے پورنما کے محض قریب سے تشفی ہو جائے گی۔ وہ محض اس کے منہ سے یہ سن کر روحانی تشفی پائے گا کہ وہ اب بھی اُسے یاد کرتی ہے۔ اب بھی اس سے وہی بچپن کی سی محبت کرتی ہے، بیس سال پہلے اس نے پورنما کی جو صورت دیکھی تھی، وہ بھرا ہوا جسم وہ رخساروں کی سرخی، وہ ملاحت، وہ اس کھچی ہوئی ٹھڈی جس میں امرت سے بھرا ہوا مرض تھا، وہ اس کی نشہ خیز مسکراہٹ، وہی صورت بہت خفیف تغیر کے ساتھ ابھی تک اس کی آنکھوں میں تھی، اور وہ تغیر تخیل کی آنکھوں میں اب اسے اور بھی خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ ضرور زمانہ کی بیداریوں کا اس کے اوپر کچھ نہ کچھ اثر ہوگا۔ لیکن پورنما کے جسم میں کسی ایسی تبدیلی کا وہ گمان بھی نہ کر سکتا تھا، جس سے اس کی دلفریبی میں فرق آجائے، اب وہ ماہر کا اتنا گرویدہ بھی نہ تھا، جتنا اس کی سخن ہائے شیریں کا، اس کی نگاہِ محبت کا، اس کے اعتماد کا، وہ مردانہ خود پروری کے زعم میں شاید یہ بھی نہ سمجھتا تھا کہ وہ پورنما کے ناآسودہ ذوق محبت کو اپنی نازبرداریوں اور گرمجوشیوں سے محفوظ کرے گا اور اپنی پچھلی فروگذاشتوں کی تلافی کر دے گا۔

حسن اتفاق سے ایک دن پورنما خود اپنے چھوٹے لڑکے کے ساتھ اپنے گھر آگئی۔ اس کی ایک بیوہ موسی جو اس کی ماں کے ساتھ ہی اپنی بیوگی کے دن کاٹ رہی تھی ابھی موجود تھی، وہ سونا گھر آباد ہوگیا۔

امرت نے اس کی خبر سنی تو اشتیاق سے مخمور ہو کر دوڑا، بچپن اور شباب کی شیریں اور پرحسرت اور پرشوق یادگاروں کو دل کے دامن میں سنبھالتا ہوا، جیسے کوئی بچہ اپنے ہمجولی کو دیکھ کر اپنے ٹوٹے پھوٹے کھلونے لے کر دوڑے۔

مگر اس کی صورت دیکھتے ہی اس کا اشتیاق اور ولولہ جیسے بجھ گیا، سکتے کا عالم میں کھڑا رہ گیا۔ پورنما اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہوگئی، سفید ساڑھی کے گھونگھٹ سے آدھا منہ چھپا ہوا تھا، مگر کمر جھک گئی تھی، بانہیں سوت سی پتلی، پشت پا کی رگیں ابھری ہوئی، آنکھوں سے آنسو جاری اور رخسارے زرد، جیسے کفن میں لپٹی ہوئی لاش کھڑی ہو۔

پورنما کی موسی نے آکر کہا۔ ”بیٹھو بیٹا دیکھتے ہو اس کی حالت سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے۔ چھن کو بھی آنسو نہیں تھمتے، صرف ایک وقت سوکھی روٹیاں کھاتی ہے اور کسی چیز سے مطلب نہیں۔ نمک چھوڑ دیا ہے، گھی دودھ سب تیاگ دیا، بس روکھی روٹیوں سے کام۔

اس پر آئے دن برت رکھتی ہے، کبھی ایکادش، کبھی اتوار، کبھی منگل، زمین پر سوتی ہے ایک چٹائی بچھا کر، گھڑی رات سے پوجا پاٹ کرنے لگتی ہے، لڑکے سمجھاتے ہیں مگر کسی کی نہیں سنتی، کہتی ہے جب بھگوان نے سہاگ اٹھا لیا سب کچھ متھیا (باطل) ہے۔ جی بہلانے کے لیے یہاں آئی تھی، مگر یہاں بھی رونے کے سوا اور دوسرا کام نہیں، کتنا سمجھاتی ہوں، بیٹی بھاگ میں جو کچھ لکھا تھا وہ ہوا۔ اب صبر سے کام لو۔ بھگوان نے تمھیں بال بچے دیے ہیں، ان کو پالو، گھر میں بھگوان کا دیا سب کچھ ہے، چار کو کھلا کر کھا سکتی ہو، من پوتر چاہیے۔ بدن کو دکھ دینے سے کیا فائدہ ہے، مگر سنتی ہی نہیں۔ تم سمجھاؤ تو شاید مانے۔''

اور امرت بظاہر بے حس اور باطن میں روح فرسا درد چھپائے کھڑا تھا۔ گویا جس بنیاد پر زندگی کی عمارت کھڑی تھی، وہ ہل گئی ہو، آج اسے معلوم ہوا کہ زندگی بھر اس نے جس چیز کو حقیقت سمجھا تھا وہ محض سراب تھا، محض خواب نفس کی اس کامل تسخیر اور عمل کے اس زائدانہ اجتہاد میں اس کی وہ پر ارمان اور پر اشتیاق محبت فنا ہو گئی، اور اس کے سامنے یہ نئی حقیقت جلوہ افروز ہوئی کہ دل میں اگر مٹی کو دیوتا بنانے کی قدرت ہے تو انسان کو دیوتا بنانے کی بھی قدرت ہے پورنما اسی مکروہ انسان کو دیوتا بنا کر اس کی پرستش کر رہی تھی۔

اس نے احترام کے لہجہ میں کہا۔ ''پسوئی کو ہم جیسے غرض کے بندے کیا سمجھ سکتے ہیں، موسی ہمارا فرض اس کے قدموں پر سر جھکانا ہے، سمجھانا نہیں۔''

اور پورنما نے منھ پر کا گھونگھٹ ہٹاتے ہوئے کہا، تمھارا بچہ تمھیں ابھی تک پوچھا کرتا ہے۔''

(یہ افسانہ پہلی بار لاہور کے اردو ماہنامہ 'ادبی دنیا' کے دسمبر 1935 کے شمارے میں شائع ہوا۔ بنارس کے ہندی ماہنامہ 'ہنس' کے فروری 1937 کے شمارے میں شائع ہوا، عنوان تھا 'تتھ'۔ یہ 'کفن' میں شامل ہے۔)

یہ بھی نشہ وہ بھی نشہ

ہولی کے دن رائے صاحب پنڈت گھسیٹے لال کی بارہ دری میں بھنگ چھن رہی تھی کہ سہسا معلوم ہوا، ضلع دھیش مسٹر بُل آر ہے ہیں۔ بل صاحب بہت ہی ملنسار آدمی تھے اور ابھی حال ہی میں ولایت سے آئے تھے۔ بھارتیہ رتی ہتی کے جگیاسو تھے۔ بہودھا (اکثر) میلے ٹھیلوں میں جاتے تھے۔ شاید اس وشے پر کوئی بڑی کتاب لکھ رہے تھے، ان کی خبر پاتے ہی یہاں بڑی کھلبلی مچ گئی۔ سب کے سب ننگ دھڑنگ، موسر چند بنے بھنگ چھان رہے تھے۔ کون جانتا تھا کہ اس وقت صاحب آئیں گے۔ پھر سے بھاگے، کوئی اوپر جا چھپا، کوئی گھر میں بھاگا، بیچارے رائے صاحب جہاں کے تہاں نشچیہ بیٹھے رہ گئے۔ آدھا گھنٹے میں تو آپ کانکھ کر اٹھتے تھے اور گھنٹے بھر میں ایک قدم رکھتے تھے، اس بھگدڑ میں کیسے بھاگتے۔ جب دیکھا کہ اب پران بچنے کا کوئی اُپائے نہیں ہے تو ایسا منہ بنا لیا مانو وہ جان بوجھ کر اس سودیشی ٹھاٹھ سے صاحب کا سواگت کرنے کو بیٹھے ہیں۔

صاحب نے برآمدے میں آتے ہی کہا : ہلو رائے صاحب، آج تو آپ کا ہولی ہے؟

رائے صاحب نے ہاتھ باندھ کر کہا: 'ہاں سرکار، ہولی ہے۔'

بُل : 'خوب لال رنگ کھیلتا ہے؟'

رائے صاحب : 'ہاں سرکار، آج کے دن کی یہی بہار ہے۔'

صاحب نے پچکاری اٹھا لی۔ سامنے مٹکوں میں گلال رکھا ہوا تھا۔ بُل نے پچکاری بھر کر پنڈت جی کے منہ پر چھوڑ دی تو پنڈت جی نہیں اٹھے۔ دھنیہ بھاگ۔ کیسے یہ سوبھاگیہ پراپت ہو سکتا ہے۔ واہ رے حاکم۔ اسے پرجاواتسلیہ کہتے ہیں۔ آہ۔ اس وقت سیٹھ جوکھن رام ہوتے تو دکھا دیتا کہ یہاں ضلع میں افسر اتنی کرپا کرتے ہیں، بتائیں آکر کی ان پر کسی گورے نے پچکاری چھوڑی ہے، ضلع دِھیش کا کہنا ہی کیا۔ یہ پُورو تپّسیا کا

پھل ہے، اور کچھ نہیں۔ کوئی پہلے ایک سہسر (1000) ورش تپسیا کرے۔ تب یہ پرم پد پا سکتا ہے۔ ہاتھ جوڑ کر بولے۔ دھرماوتار! (انصاف پسند) آج جیون سپھل ہوگیا۔ جب سرکار نے ہولی کھیلی ہے تو مجھے بھی حکم ملے کہ اپنے ہردے کی ابھیلاشا پوری کر لوں۔'

یہ کہہ کر رائے صاحب نے گلال کا ایک ٹیکہ صاحب کے ماتھے پر لگا دیا۔

بُل : 'اس بڑے برتن میں کیا رکھا ہے، رائے صاحب؟'

رائے : 'سرکار، یہ بھنگ ہے۔ بہت ودھی پوروک بنائی گئی ہے حضور۔

بُل : 'اس کے پینے سے کیا ہوگا؟'

رائے : 'حضور کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ بری وِشن وستو ہے سرکار۔'

بُل : 'ہم بھی پیئے گا۔'

رائے صاحب کو جان پڑا مانو سورگ کے دوار کھل گئے ہیں اور وہ پشپک وِمان پر بیٹھے اوپر اڑے چلے جا رہے ہیں۔ گلاس تو صاحب کو دینا اُچت نہ تھا پر کلہڑ میں دیتے سنکوچ ہوتا تھا۔ آخر بہت اونچ نیچ سوچ کر گلاس میں بھنگ انڈیلی اور صاحب کو دی۔ صاحب پی گئے۔ مارے سُوگندھ کے چت پرسنّ ہوگیا۔

(2)

دوسرے دن رائے صاحب اس ملاقات کا جواب دینے چلے۔ پراتہ کال جیوتشی سے مہورت پوچھا۔ پہر رات گئے ساعت بنتی تھی۔ اَت اَیو (چنانچہ) دِن بھر خوب تیاریاں کی۔ ٹھیک سمے پر چلے۔ صاحب اس سمے بھوجن کر رہے تھے۔ خبر پاتے ہی سلام دیا۔ رائے صاحب اندر گئے تو شراب کی دُرگندھ سے ناک پھٹنے لگی۔ بے چارے انگریزی دوا نہ پیتے تھے۔ اپنی عمر میں شراب کبھی نہ چھوئی تھی۔ جی میں آیا کہ ناک بند کر لیں، مگر ڈرے کہ صاحب برا نہ مان جائیں۔ جی مچلا رہا تھا، پر سانس روکے بیٹھے ہوئے تھے۔ صاحب نے ایک چسکی لی اور گلاس میز پر رکھتے ہوئے بولے۔ 'رائے صاب ہم کل آپ کا بھنگ پی گیا، آج آپ کو ہمارا بنگ پینا پڑے گا۔ آپ کا بنگ بہت اچھا تھا۔ ہم بہت سا کھانا کھا گیا۔'

رائے : 'حضور، ہم لوگ مدِرا ہاتھ سے بھی نہیں چھوتے۔ ہمارے شاستروں میں اس کو چھونا پاپ کہا گیا ہے۔'

بُل : (ہنس کر) 'نہیں، نہیں، آپ کو پینا پڑے گا رائے صاحب۔ پاپ پُن کچھ نہیں ہے۔ یہ ہمارا بنگ ہے ، وہ آپ کا بنگ ہے کوئی فرق نہیں ہے۔ اس سے بھی نشہ ہوتا ہے، اس سے بھی نشہ ہوتا پھر فرق کیسا؟'

رائے : نہیں۔ دھرماوتار سدیرا کو ہمارے یہاں ورجت کیا گیا ہے۔'

بُل : 'ایسا کبھی ہونے نہیں سکتا۔ شاستر منع کرے گا تو اِس کو بھی منع کرے گا۔ اس کو بھی منع کرے گا، افیم کو بھی منع کرے گا، آپ اس کو پئیں، ڈریں نہیں۔ بہت اچھا ہے۔'

یہ کہتے ہوئے صاحب نے ایک گلاس میں شراب انڈیل کر رائے صاحب کے منہ میں لگا ہی تو دی۔ رائے صاحب نے منھ پھیر لیا اور آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھوں سے صاحب کا ہاتھ ہٹانے لگے۔ صاحب کی سمجھ میں یہ رہسیہ نہ آتا تھا۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ ڈر کے مارے نہیں پی رہے ہیں۔ اپنے مضبوط ہاتھوں سے رائے صاحب کی گردن پکڑی اور گلاس منہ کی طرف بڑھایا۔ رائے صاحب کو اب کرُودھ آ گیا۔ صاحب خاطر سے سب کچھ کر سکتے تھے، پر دھرم نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ذرا کٹھور سوَر میں بولے۔ 'حضور ہم وَیشنو ہیں۔ ہم اسے چھونا بھی پاپ سمجھتے ہیں۔'

رائے صاحب اس کے آگے اور کچھ نہ کہہ سکے۔مارے آوِیش کے کنٹھا وِرودھ ہوگیا۔ ایک چھن بعد ذرا سُور سَئیت کر کے پھر بولے۔ حضور بھنگ پوتروستو ہے۔ رِشی، منی، سادھو، مہاتما، دیوی، دیوتا، سب اس کا سیون کرتے ہیں۔ سرکار، ہمارے یہاں اس کی بڑی مہیما لکھی ہے۔ کون ایسا پنڈت ہے جو بوٹی نہ چھانتا ہو۔ لیکن مدرا کا تو سرکار، ہم نام لینا بھی پاپ سمجھتے ہیں۔'

بُل نے گلاس ہٹا لیا اور کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ 'تم پاگل کا مافق بات کرتا ہے۔' دھرم کا کتاب بنگ اور شراب دونوں کو برا کہتا ہے۔ تم اس کو ٹھیک نہیں سمجھتا نشہ کو اس لیے سارا دنیا برا کہتا ہے کہ اس سے آدمی کا عقل ختم ہوجاتا ہے۔تو بنگ پینے سے پنڈت اور

دیوتا لوگ کا عقل کیسے ختم نہیں ہوگا۔ یہ ہم نہیں سمجھ سکتا۔ تمھارا پنڈت لوگ بنگ پی کر راکشش کیوں نہیں ہوتا۔ ہم سمجھتا ہے کہ تمھارا پنڈت لوگ بنگ پی کر چپت ہوگیا ہے، تبھی تو وہ کہتا ہے، یہ اچھوت ہے، یہ ناپاک ہے، روٹی نہیں کھائے گا، مٹھائی کھائے گا۔ ہم چھو لیں تو تم پانی نہیں پیئے گا۔ یہ سب چپت لوگوں کا بات ہے۔ اچھا سلام۔'

رائے صاحب کی جان میں جان آئی۔ گرتے پڑتے برآمدے میں آئے۔ گاڑی پر بیٹھے اور گھر کی راہ لی۔

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی مجموعے 'کفن' میں شائع ہوا ہے۔ اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔)

لاٹری

(1)

جلدی سے مالدار بن جانے کی ہوس کسے نہیں ہوتی۔ ان دنوں جب فرنچ لاٹری کے ٹکٹ آئے تو میرے عزیز دوست بکرم کے والد، چچا، بھائی، ماں سبھی نے ایک ایک ٹکٹ خرید لیا۔ کون جانے کس کی تقدیر زور کرے۔ روپے رہیں گے، تو گھر ہی میں کسی کے نام آجائیں۔

مجھے بھی اپنی تقدیر آزمانے کی سوجھی۔ اس وقت تک زندگی کا مجھے جو تھوڑا بہت تجربہ ہوا تھا، وہ بہت ہمّت افزا نہ تھا۔ لیکن بھئی! تقدیر کا حال کون جانے گاہ باشد کہ کودک ناداں۔ ایک بار اپنی تقدیر آزمانے کو دل بے تاب ہو گیا۔ اور بکرم بھی دوسروں کا دستِ نگر نہ بننا چاہتا تھا۔ جس کے نام روپے آئیں گے، وہ خوب موج اڑائے گا۔ اسے کون پوچھتا ہے، بہت ہوگا دس پانچ ہزار اس کے حصہ میں آجائیں گے مگر اس سے کیا ہوگا۔ اس کی زندگی میں بڑے بڑے منصوبے تھے۔ پہلے اسے ساری دنیا کی سیاحت کرنی تھی۔ ایک ایک کونے کی۔ عام سیاحوں کی طرح نہیں کہ تین ہفتہ میں ساری دنیا میں آندھی کی طرح اڑ کر گھر آ پہونچے۔ وہ ایک ایک خطہ میں کافی عرصہ تک رہ کر، وہاں کے باشندوں کی معاشرت کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ پھر اسے ایک بہت بڑا کتب خانہ تیار کرنا تھا۔ جس میں ساری دنیا کی کتابیں رکھی جائیں۔ اس کے لیے دو لاکھ تک خرچ کرنے کے لیے تیار تھا۔ والد یا چچا کے ہاتھ روپے آئے تو شاید دو چار ہزار مل جائیں۔ بڑے بھائی کے نام آئے تو دھیلا بھی نہ ملے گا۔ ہاں اماں کے ہاتھ آئے تو بیس ہزار یقینی ہیں، مگر اس سے کہیں پیاس بجھتی ہے۔ منصوبے تو اتنے اونچے تھے، لیکن روپے نہ ان کے پاس تھے، نہ میرے گھر میں۔ روپے ملنے کی اسے امید نہ تھی۔ ممکن تھا بہت ضد

کرتا تو مل بھی جاتے۔ مگر وہ اس امر کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔

میرے پاس بھی روپے تھے، میں اسکول میں ماسٹر تھا۔ بیس روپے ملتے تھے۔ دس گھر بھیج دیتا تھا۔ دس میں لشٹم پشٹم اپنا گزارہ کرتا تھا۔ ایسی حالت میں پانچ روپے کے ٹکٹ خریدنا میرے لیے مشکل ہی نہیں محال تھا۔

بکرم نے کہا۔ ''کہو تو میں اپنی انگوٹھی بیچ دوں، کہہ دوں گا اُنگلی سے پھسل پڑی۔ میں نے منع کیا نہیں چوری فوراً کھل جائے گی، اور مفت میں شرمندگی ہوگی۔ ایسا کام نہ کرو کہ بعد کو خفت ہو۔ یہ تجویز ہوئی کہ ہم دونوں اپنی اپنی پُرانی کتابیں کسی سکنڈ ہینڈ کتابوں کے دوکاندار کے بیچ ڈالیں، اور اس روپے سے ٹکٹ خریدیں۔ ہم دونوں کے پاس اسکول کی کتابیں ارتھمیٹک، الجبرا، جیا میٹری، جاگرفی کی موجود تھیں۔ میں تو ماسٹر تھا، کسی بک سیلر کی دوکان پر جاتے جھینپتا تھا۔ قریب قریب سبھی مجھے پہچانتے تھے۔ اس لیے یہ خدمت بکرم کے سپرد ہوئی، اور وہ آدھ گھنٹے میں پانچ روپے کا ایک نوٹ لیے آپہونچا۔ کتابیں پچیس سے کم نہ تھیں، مگر یہ پانچ اس وقت میرے لیے پانچ ہزار کے برابر تھے۔ فیصلہ ہو گیا، ہم دونوں ساجھے میں ایک ٹکٹ لیں گے۔ آدھا میرا ہوگا آدھا بکرم کا۔ دس لاکھ میں پانچ لاکھ میرے حصہ میں آئیں گے، پانچ لاکھ بکرم کے۔ ہم اسی میں خوش تھے۔ ہاں بکرم کو اپنی سیاحت والی اسکیم میں کچھ ترمیم کرنی پڑی۔ کتب خانہ کی تجویز میں کسی قسم کا قطع؟ ممکن تھی۔ یہ بکرم کی زندگی کا مقصد دلی تھا۔

میں نے اعتراض کیا۔ ''یہ لازمی نہیں کہ تمھارا کتب خانہ شہر میں سب سے زیادہ شاندار ہو، ایک لاکھ بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔

بکرم مستقل تھا۔ ''ہرگز نہیں۔ کتب خانہ تو شہر میں لاثانی ہوگا۔ کیوں تم کچھ مدد نہ کرو گے''۔

میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ ''بھئی! میری ضرورتیں مقابلتاً کہیں زیادہ ہیں۔ تمھارے گھر میں کافی جائداد موقود ہے، والدین بھی زندہ ہیں۔ کسی قسم کا بار تمھارے اوپر نہیں، میرے سر پر تو ساری گرہستی کا بوجھ ہے۔ دو بہنوں کی شادیاں ہے، دو بھائیوں کی تعلیم ہے۔ نیا مکان بنوانا ہی پڑے گا۔ میں تو ایسا انتظام کروں گا کہ سارے مصارف سود سے نکل آئیں، اور اصل کو داغ نہ لگنے پائے۔ کچھ ایسی قیدیں

لگادوں گا کہ میرے بعد کوئی اصل کو نہ نکال سکے''۔

''تم نے سوچی تو بہت دور کی ہے لیکن بینکوں کا شرح سود بہت گرا ہوا ہے''۔

''پانچ لاکھ کی رقم بھی تو کچھ کم نہیں، اگر پانچ فیصدی بھی ملے 25 ہزار سالانہ ہوئے تھوڑے ہیں''۔

ہم نے کئی بینکوں کا شرح سود دیکھا۔ واقعی بہت کم تھا۔ خیال آیا، کیوں نہ لین دین کا کاروبار شروع کردیا جائے۔ بکرم اور میں دونوں کی مشترکہ کمپنی ہو۔ لین دین میں سود بھی اچھا ملے گا، اور اپنا رعب داب بھی رہے گا۔ اچھے اچھے گھٹنے ٹیکیں گے۔ ہاں جب تک اچھی جائیداد نہ ہو، کسی کو روپیہ نہ دیا جائے چاہے کتنا ہی معتبر آسامی ہو، مجبوری معتبروں کو بھی غیرمعتبر بنا دیتی ہے۔ جائداد کی کفالت پر رہن نامہ لکھا کر روپیہ دینے میں کوئی اندیشہ نہیں رہتا، روپے نہ وصول ہوں تو جائداد تو مل جاتی ہے۔

مگر لاٹری کے ٹکٹ پر دو نام نہیں رہ سکتے، کس کا نام دیا جائے؟

بکرم نے کہا۔ ''میرا نام رہے''۔

''کیوں میرا کیوں نہ رہے گا''؟

''تمھارا ہی نام سہی لیکن میری بہت دل شکنی ہوگی۔ اگر روپے مل گئے، تو میں گھر والوں پر بم گولا چھوڑوں گا۔ اور لوگوں کو خوب چڑاؤں گا۔ بالکل طفلانہ خواہش ہے''۔

میں مجبور ہو گیا۔ بکرم کے نام سے ٹکٹ لیا گیا۔

(2)

ایک ایک کرکے انتظار کے دن کٹنے لگے، صبح ہوتے ہی میری نگاہ کیلنڈر پر جاتی۔ میرا مکان بکرم کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ اسکول جانے سے قبل اور اسکول سے آنے کے بعد ہم دونوں ساتھ بیٹھے اپنے اپنے منصوبے باندھا کرتے، اور سرگوشیوں میں کہ کوئی سن نہ لے، ایک دن شادی کا تذکرہ چھڑ گیا۔

بکرم نے فلسفیانہ انداز سے کہا۔ ''بھئی میں شادی وادی کا خلجان نہیں پالنا چاہتا۔ خواہ مخواہ کی کوفت اور پریشانی، بیوی کی نازبرداری ہی میں بہت سے روپے اڑ جائیں گے۔ ہم بقائے نسل کے کوئی ٹھیکہ دار ہیں۔''؟

میں نے شادی کے دوسرے پہلوؤں پر غور کیا۔ ''ہاں یہ تو درست ہے مگر جب تک شادی و غم میں کوئی رفیق نہ ہو، دولت کا لطف ہی کیا۔ تنہا خوری سے انسان کی طبیعت خود نفرت کرتی ہے، میں تو بھئی عیالداری سے اتنا بیزار نہیں، یہاں رفیق ایسا چاہتا ہوں جو سچے معنوں میں رفیق ہو، اور وہ بیوی کے سوا دوسرا کون ہو سکتا ہے۔

بکرم کی پیشانی پر بل پڑ گئے، بولا۔ ''خیر اپنا اپنا نقطۂ نظر ہے، آپ کو عیالداری مبارک بندہ تو آزاد رہے گا۔ اپنے مزے سے جہاں چاہا اُڑ گئے۔ اور جب جی چاہا سو گئے۔ یہ نہیں کہ ہر وقت ایک پاسبان آپ کی ہر ایک حرکت پر آنکھیں لگائے بیٹھا رہے۔ ذرا سی دیر ہوئی اور فوراً جواب طلب، آپ کہیں چلے اور فوراً سوال کہاں جاتے ہو؟ کیوں کسی کو مجھ سے یہ سوال کرنے کا حق ہو؟ میں نہ کسی سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں، اور نہ چاہتا مجھ سے کوئی یہ سوال کرے۔ نا بابا آپ کو شادی مبارک! بچے کو ذرا سا زکام ہوا اور آپ اڑے چلے جا رہے ہیں۔ ہومیوپیتھک ڈاکٹر کے پاس ذرا عمر کھسکی اور لونڈے منتیں مانگنے لگے کہ کب آپ راہئ عدم ہوں، اور وہ گلچھرے اڑائیں۔ نہ نہ میں اس وبال میں...''

بکرم کی بہن کانتی نے اتنے دھماکے سے دروازہ کھولا کہ ہم دونوں چونک پڑے، کوئی تیرہ چودہ سال کی تھی مگر بڑی خوش مزاج اور انتہا درجہ کی شوخ۔ بکرم نے ڈانٹا۔ ''تو بڑی شیطان ہے کانتی، میں تو ڈر گیا۔ کس نے بلایا تجھے یہاں۔''

کانتی نے مشتبہ نظروں سے بکرم کو دیکھا۔ جیسے کوئی تحقیق کر رہی ہو، اور بولی۔

''تم لوگ ہر دم یہاں بیٹھے کیا باتیں کرتے ہوے، جب دیکھو یہیں جمے ہو، نہ کوئی کام نہ دھندا۔ کہیں گھومنے بھی نہیں جاتے۔ ایسے اچھے اچھے تماشے آئے اور چلے گئے، تم گئے ہی نہیں۔ آخر میں کس کے ساتھ جاؤں۔ کوئی جادو منتر جگا رہے ہو''۔

''ہاں! جادو جگا رہے ہیں''۔ بکرم ہنس کر بولا۔ ''جس سے تجھے ایسا دولہا ملے جو گن گن کر روز پانچ ہنٹر لگائے۔

کانتی پیٹھ کی طرف سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بولی۔ ''مجھے اپنا بیاہ نہیں کرنا ہے۔ اماں سے پچاس ہزار روپے لے لوں گی۔ اور مزے سے عیش کروں گی۔ کیوں کسی مرد کی غلامی کروں۔ کھلائے گا تو دو روٹیاں، اور حکومت ایسی جتائے گا گویا اس

کی زر خریدی لونڈی ہوں۔ بندی باز آئی ایسی شادی سے۔ میں روز اماں کے ٹکٹ کے لیے ایشور سے پرارتھنا کرتی ہوں۔ اماں کہتی ہیں، کنواری لڑکیوں کی دعا میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ میرا تو دل کہتا ہے، اماں کو ضرور روپے ملیں گے"۔

مجھے اپنی ننہیال کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک بار دیہات میں بارش نہ ہوئی تھی۔ بھادوں کا مہینہ آگیا، اور پانی کی ایک بوند نہیں۔ تب گاؤں والوں نے چندہ کرکے گاؤں کی سب کنواری لڑکیوں کی دعوت کی تھی، اور دوسرے ہی دن موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی، ضرور کنواریوں کی دعا میں تاثیر ہوتی ہے۔

میں نے بکرم کو پر معنی نظروں سے دیکھا، بکرم نے مجھے۔ نظروں ہی نظروں میں ہم نے فیصلہ کر لیا۔ ایسا شفیع پا کر کیوں چوکئے۔

بکرم بولا۔ "اچھا بیٹی! تجھ سے ایک بات کہیں، کسی سے کہے گی تو نہیں۔ اگر کہا تو حلال ہی کر دوں گا۔ اب کے میں تجھے خوب دل لگا کر پڑھاؤں گا، اور پاس کرا دوں گا، ہم دونوں نے لاٹری کا ٹکٹ لیا ہے۔ ہم لوگوں کے لیے بھی ایشور سے دعا کر، اگر روپے ملے تو تجھے ہیرے جواہرات سے مڑھ دیں گے۔ سچ، مگر خبردار کسی سے کہنا مت"!

مگر کانتی کا ہاضمہ اتنا مضبوط نہ تھا۔ یہاں سے تو وعدہ کر گئی مگر اندر جاتے ہی بھانڈا پھوڑ دیا۔ ایک لمحہ میں سارے گھر میں خبر پھیل گئی۔ اب جسے دیکھیے ہم دونوں کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔ پانچ روپے لے کر پانی میں ڈال دیے۔ گھر میں چار ٹکٹ تو تھے ہی، پانچویں کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ماسٹر اسے خراب کر رہا ہے۔ نہ کسی سے پوچھا، نہ گچھا، لے کے روپے پھینک دیے۔ خود را فضیحت والی کہاوت سامنے آئی۔ گھر کے بزرگ چاہے گھر میں آگ لگا دیں۔ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بیچارے چھوٹے ان کی مرضی کے خلاف آواز بھی نکالیں تو کہرام مچ جاتا ہے۔

(3)

بکرم کے والد "بڑے ٹھاکر" کہلاتے تھے، چچا "چھوٹے ٹھاکر تھے، دونوں ہی ملحد تھے، پکے ناستک، دیوتاؤں کے دشمن، پوجا پاٹ کا مزاق اڑانے والے گنگا کو پانی کی دھارا اور تیرتھوں کو سیر کے مقامات سمجھنے والے، مگر آج کل دونوں ہی معتقد ہو گئے تھے۔ بڑے

ٹھاکر صاحب علی الصبح ننگے پاؤں گنگا اشنان کرنے جاتے، اور ادھر سے سارے شہر کے دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہوئے کوئی گیارہ بجے گھر لوٹتے تھے۔ چھوٹے ٹھاکر گھر ہی میں بیٹھے ہوئے روز ایک لاکھ نام لکھ کر تب جل چان کرتے۔ دونوں صاحب شام ہوتے ہی ٹھاکر دوارے میں جا بیٹھتے، اور بارہ بجے رات تک بھگوت گیتا کی کتھا سنا کرتے۔ بکرم کے بڑے بھائی صاحب کا نام تھا پرکاش۔ انھیں سادھو سنتوں سے عقیدت ہو گئی تھی۔ انھیں کی خدمت میں دوڑتے رہتے۔ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ جہاں کسی مہاتما نے آشیرباد دیا اور ان کا نام آیا۔ رہیں بکرم کی اماں جی۔ ان میں کوئی خاص تغیّر تو نہ تھا۔ ہاں آج کل خیرات زیادہ کرتی تھیں اور برت بھی زیادہ رکھتی تھیں، درگا پاٹھ کا بھی انتظام کیا تھا۔ لوگ ناحق کہتے ہیں کہ مادہ پرستوں میں اعتقاد نہیں ہوتا۔ میں تو سمجھتا ہوں، ہم میں جو اعتقاد اور پرستش اور دین داری ہے۔ وہ ہماری مادہ پرستی کے طفیل ہے۔ ہمارا دین اور مذہب ہماری دنیاری کے بل پر ٹکا ہوا ہے۔ ہوس انسان کی رائے اور دماغ میں اتنی روحانیت پیدا کر سکتی ہے، یہ میری لیے پہلا تجربہ تھا، اور محض روحانیت کا ملمع نہ تھا۔ وہی خلوص، وہی نشہ، وہی انہماک گویا طبیعت ہی بدل گئی ہو۔ رہے ہم دونوں ساجھے دار، ہمارے پاس روپے نہ تھے۔ نہ اتنا وقت تھا۔ مجھے نوکری بجانی تھی۔ بکرم کو کالج جانا تھا۔ ہم دونوں ہاتھ مل کر رہ جاتے۔ ہاں جوتشیوں کی تلاش میں رہتے تھے مگر ان کے لیے بھی ہمارے پاس نیازمندی اور خدمت گزاری کے سوا اور کیا تھا۔

جوں جوں ''قتل کی رات'' قریب آتی جاتی تھی، ہمارا سکونِ خاطر غائب ہوتا جاتا تھا۔ ہمیشہ اسی طرف دھیان لگا رہتا۔ میرے دل میں خواہ مخواہ یہ شبہ ہونے لگا کہ اگر بکرم نے مجھے حصّہ دینے سے انکار کر دیا تو کیا کروں گا، صاف انکار کر جائے کہ تم نے ٹکٹ میں ساجھا ہی نہیں کیا، نہ کوئی تحریر ہے، نہ کوئی دوسرا ثبوت، سارا دارو مدار بکرم کی نیت پر ہے۔ اس کی نیت میں ذرا بھی خلل آیا اور میرا کام تمام۔ نہیں فریاد نہیں کر سکتا، زبان تک نہیں کھول سکتا۔ اب اگر تحریر کے لیے کہوں تو بدمزگی کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں۔ اگر اس کی نیت بگڑ گئی ہے، تب تو وہ ابھی سے انکار کر دے گا اور اگر درست ہے تو اس شبہ سے اسے روحانی صدمہ ہوگا۔ آدمی تو ایسا نہیں ہے، لیکن بھئی دولت پاکر ایمان سلامت رکھنا مشکل ہے، ابھی تو روپے نہیں ملے ہیں۔ اس وقت ایماندار بننے میں کچھ

حرج نہیں ہوتا۔ آزمائش کا وقت تو جب آئے گا جب روپے مل جائیں گے۔ میں نے اپنے باطن کا جائزہ لیا۔ اگر ٹکٹ میرے نام کا ہوتا، اور حسنِ اتفاق سے میرا نام آجاتا تو کیا میں نصف رقم بے چون و چرا بکرم کے حوالے کر دیتا؟ کہتا۔ تم نے مجھے ڈھائی روپے قرض دیے تھے، ان کے بدلے پانچ لیلو، دس لے لو، سو لے لو اور کیا کروگے؟ مگر نہیں، شاید اتنی بددیانتی کرنے کی مجھ میں جرأت نہ تھی۔ اگر دیتا بھی تو خوش معاملگی سے نہیں۔ بلکہ بدنامی اور تشہیر کے خوف سے۔ ایک دن ہم دونوں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ یکا یک بکرم نے کہا۔ ''ہمارا ٹکٹ اگر نکل آئے تو مجھے دل میں یہ افسوس ضرور ہوگا کہ ناحق تم سے ساجھا کیا۔

میں نے چونک کر کہا۔ ''اچھا! مگر اسی طرح کیا مجھے افسوس نہیں ہو سکتا''؟

''لیکن ٹکٹ تو میرے نام کا ہے''۔

''اس سے کیا ہوتا ہے''۔

''اچھا مان لو، میں کہہ دوں تم نے ٹکٹ میں ساجھا ہی نہیں کیا۔

میرے خون کی حرکت بند ہوگئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

''میں تمھیں اتنا بدنیت نہیں سمجھتا''۔

''مگر ہے بہت ممکن، پانچ لاکھ، سوچو''۔

''تو آؤ لکھا پڑھی کر لیں، جھگڑا کیوں کر رہے ہو''۔

بکرم نے ہنس کر کہا۔ ''تم بڑے شکّی ہو یار! میں تمھارا امتحان لے رہا تھا۔ بھلا ایسا کہیں ہو سکتا ہے۔ پانچ لاکھ نہیں پانچ کروڑ کا معاملہ ہو تب بھی ایشور چاہے گا تو نیت میں فتور نہ آنے دوں گا''۔

مگر مجھے ان اعتماد انگیز باتوں سے تشفّی نہ ہوئی۔ دل میں ایک تشویش آگ کی چنگاری کی طرح سلگنے لگی۔ ''کہیں سچ مچ انکار کر جائے تو کہیں کا نہ رہوں گا''۔

میں نے کہا۔ ''یہ تو میں جانتا ہوں کہ تمھاری نیت میں فتور نہیں آسکتا، لیکن تحریر سے پابند ہو جانے میں کیا حرج ہے''۔

''فضول ہے''۔

''فضول ہی سہی''۔

''تو پکّے کاغذ پر لکھنا پڑے گا، دس لاکھ کی کورٹ فیس ہی دس ہزار ہو جائے گی۔ کس خیال میں ہو آپ''۔

میں نے تامل کر کے کہا۔ ''مجھے سادے کاغذ ہی سے اطمینان ہو جائے گا''۔

جس معاہدے کی کوئی قانونی اہمیت نہ ہو، اسے لکھ کر کیوں وقت ضائع کریں؟

''قانونی اہمیت نہ ہو، اخلاقی اہمیت تو ہے''۔

''اچھا لکھ دوں گا، جلدی کیا ہے''۔

مجھے دال میں کچھ کالا نظر آیا، بگڑ کر بولا۔ ''تمھاری نیت تو ابھی سے بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے''۔

''تو کیا تم ثابت کرنا چاہتے ہو کہ ایسی حالت میں تمھاری نیت فاسد ہو جاتی''۔

''میری نیت اتنی کمزور نہیں''۔

''اجی رہنے بھی دو بڑے نیت والے دیکھے ہیں''۔

''مجھے اب تمھارے اوپر اعتبار نہیں رہا۔ میں تم سے معاہدہ لکھوا کر چھوڑوں گا، چاہے دوستی کا خاتمہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔

بڑے نشست خانے میں جہاں دونوں ٹھاکر بیٹھا کرتے تھے، اسی طرح کا مناظرہ چھڑا ہوا تھا۔ جھڑپ کی آواز سن کر ہمارا دھیان ادھر لگا۔ دیکھا تو دونوں بھائیوں میں ہاتھا پائی ہو رہی ہے۔ سچ مچ دونوں اپنی کرسیوں سے اُٹھ کر پینترے بدل رہے تھے۔

چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ ''مشترکہ خاندان میں کسی کے نام سے روپے آئیں، ان پر سب کا مساوی حق ہے''۔

بڑے ٹھاکر بگڑ کر جوب دیا۔ ''ہرگز نہیں، جاکر قانون دیکھو، اگر میں کوئی جرم کروں تو مجھے سزا ہوگی۔ مشترکہ خاندان کو نہیں، یہ افرادی معاملہ ہے''۔

''اس کا فیصلہ عدالت کرے گی''۔

''شوق سے عدالت جایئے، اگر میرے لڑکے کی بیوی یا خود میرے نام لاٹری نکلی تو آپ کو اس سے اسی طرح کوئی تعلق نہ ہوگا، جیسے آپ کے نام لاٹری نکلے تو مجھ سے یا میرے لڑکے سے یا میری بیوی سے''۔

''اگر میں جانتا، آپ یہ پہلو اختیار کریں گے تو اپنی بیوی بچوں کے نام ٹکٹ

لے لیتا''۔

''تو یہ آپ کا قصور ہے''۔

''اسی لیے کہ مجھے خیال تھا کہ آپ میرے حقیقی بھائی ہیں، اور یک جا معاملہ ہے''۔

''یہ جوا ہے، یہ آپ کو سمجھ لینا چاہیے''۔

بکرم کی ماں نے دونوں بھائیوں کو شمشیر بکف دیکھا تو دوڑی ہوئی باہر آئیں، اور دونوں کو سمجھانے لگیں۔

چھوٹے ٹھاکر صاحب بھرّائی ہوئی آواز میں بولے، ''آپ مجھے کیا سمجھاتی ہیں۔ انھیں سمجھایئے جو بھائی کی گردن پر چھری پھیر رہے ہیں۔ آپ کے پاس چار ٹکٹ ہیں، میرے پاس صرف ایک۔ میرے مقابلے آپ لوگوں کو روپے ملنے کا چوگنا چانس ہے''۔

بڑے ٹھاکر سے نہ رہا گیا۔ بولے، ''ہم نے بیس روپے نہیں دیے ٹھنا ٹھن''۔

اماں نے انھیں ملامت کے انداز میں دیکھا، اور چھوٹے ٹھاکر صاحب کو ٹھنڈا کیا۔ بولیں، ''تم میرے روپے سے آدھے لینا۔ میں اپنے بیٹے....''۔

بڑے ٹھاکر نے زبان پکڑلی۔ ''کیوں واہیات قسم کھا رہی ہو، وہ کیوں آدھا لے لیں گے۔ میں ایک دھیلہ نہ چھونے دوں گا۔ اگر ہم انسانیت سے کام لیں تو بھی انھیں پانچویں حصّے سے زائد کسی طرح نہ ملے گا۔ آدھے کا دعویٰ کس بنا پر ہو سکتا ہے۔

چھوٹے ٹھاکر نے خونی نظروں سے دیکھا۔ ''ساری دنیا کا قانون آپ ہی جانتے ہیں''۔

''جانتے ہیں بیس سال تک وکالت نہیں کی ہے''؟

یہ وکالت نکل جائے گی، جب سامنے کلکتہ کا بیرسٹر کھڑا کر دوں گا''؟

''بیرسٹر کی ایسی تیسی''؟

اچھا زبان سنبھالیے، میں نصف لوں گا۔ اسی طرح جیسے گھر کی جائیداد میں میرا نصف ہے''۔

بڑے ٹھاکر صاحب کوئی توپ چھوڑنے والے ہی تھے کہ مسٹر پر کاش سر اور ہاتھ میں پٹی باندھے، خوش خوش لنگڑاتے ہوئے آکر کھڑے ہو گئے۔ بڑے ٹھاکر صاحب نے

گھبرا کر پوچھا۔ ''یہ تمھیں کیا ہو گیا، ارے، یہ چوٹ کیسی، کسی سے جھگڑا ہو گیا یا گر پڑے۔ ارے مہنگو! جا ذرا ڈاکٹر کو بلا لا''۔

اماں جی نے پر کاش کو ایک آرام کرسی پر لٹا دیا۔ اور وفور اشک سے کچھ پوچھ نہ سکتی تھیں۔

پرکاش نے کراہ کر حسرت ناک لہجے میں کہا۔ ''کچھ نہیں، ایسی کچھ چوٹ نہیں لگی''۔

بڑے ٹھاکر صاحب نے جو غم و غصّے سے کانپ رہے تھے کہا۔ ''کیسے کہتے ہو چوٹ نہیں لگی، سارا ہاتھ اور سر سوج گیا ہے۔ کہتے ہو چوٹ نہیں لگی۔ کس سے جھگڑا ہوا۔ کیا معاملہ ہے۔ بتلاتے کیوں نہیں۔ میں جا کر تھانے میں رپٹ کرتا ہوں''۔

''آپ ناحق گھبراتے ہیں، بہت معمولی چوٹ ہے۔ دو چار روز میں اچھی ہو جائے گی''۔

اس کے چہرے پر اب بھی ایک مسرت آمیز امید جھلک رہی تھی۔ ندامت، غصّہ یا انتقام کی خواہش کا نام تک نہ تھا۔

اماں نے آواز کو سنبھال کر پوچھا۔ ''بھگوا ن کریں، جلد اچھے ہو جاؤ۔ لیکن چوٹ لگی کیسے، کیا کسی تانگے سے گر پڑے''؟

پرکاش نے درد سے ناک سکوڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں، نہ کسی تانگے سے گرا نہ کسی سے جھگڑ ہوا، ذرا جھکڑ بابا کے پاس چلا گیا تھا۔ یہ ان ہی کی دعا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں۔ وہ آدمیوں کی صورت سے بھاگتے ہیں، اور پتھر لے کر مارنے دوڑتے ہیں، جو ڈر کر بھاگا وہ نامراد رہ جاتا ہے۔ جو پتھر کی چوٹیں کھا کر بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اس کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ بس یہی سمجھ لیجیے کہ چوٹ کھائی اور پاس ہوئے۔ آج میں وہاں پہنچا تو ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ کوئی مٹھائیاں لیے، کوئی پھولوں کی مالا کوئی شال دو شالے لیے۔ جھکڑیا بابا استغراق کی حالت میں بیٹھے تھے۔ یکا یک انھوں نے آنکھیں کھولیں اور یہ مجمع دیکھا تو گالیاں بکتے ہوئے کئی پتھر اٹھا کر دوڑے، مجمع میں بھگدڑ پڑ گئی، لوگ گرتے پڑتے بھاگے۔ لیکن بندہ وہا ں قطب مینار کی طرح ڈٹا رہا۔ بس وہیں ڈھیر ہو گیا۔ بابا گالیاں بکتے ہوئے لوٹ گئے۔ ادھر گھنٹہ بھر تک مجھ سے اٹھا

ہی نہ گیا، آخر ہمت باندھ کر اٹھا، اور ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا۔ انھیں نے کہا۔ فریکچر ہو گیا ہے، پٹی باندھ دی، بڑی شدت کا درد ہے مگر مراد پوری ہو گئی۔ اب لاٹری میرے نام آئی رکھی ہے، مطلق شبہ نہیں، سب سے پہلے جھکڑ بابا کی کٹی بناؤں گا۔ ان کی مار کھا کر آج تک کوئی نا مراد نہیں لوٹا''۔

بڑے ٹھاکر صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اماں جی کا اندیشہ بھی دور ہو گیا۔ سر پھٹا تو کیا ہوا۔ ہاتھ بھی ٹوٹا۔ کیا غم ہے۔ لاٹری تو اپنی ہوگئی۔

شام ہو گئی تھی، بڑے ٹھاکر صاحب مندر کی طرف چلے گئے، بھگوت سننے کا وقت آ گیا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر صاحب وہیں بیٹھے رہے۔ ان کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے بولے۔ ''جھکڑ بابا تو وہیں رہتے ہیں۔ ندی کے کنارے باغیچے میں''۔

پرکاش نے بے اعتنائی سے کہا۔ ''جی ہاں''۔

''کیا بہت زور سے مارتے ہیں''؟

پرکاش نے ان کا عندیہ سمجھ لیا۔

''آپ زور سے کہتے ہیں۔ ارے صاحب ایسا پتھر مارتے ہیں کہ بم گولے سا لگتا ہے۔ دیو ساقد ہے، اور شہ زور اتنے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ شیروں کو گھونسے میں مار ڈالتے ہیں۔ اُف سر پھٹا جاتا ہے۔ ان کا نشانہ ایسا بے خطا ہوتا ہے کہ آدمی بچ نہیں سکتا ہے ایک دو پتھر سے زیادہ کھانے کی کسی میں تاب ہی نہیں اور یہ نہیں کہ ایک دو پتھر مار کر رہ جائیں۔ جب تک آپ دوڑتے جائیں گے مارتے جائیں گے۔ جب تک گر نہ پڑیں۔ مگر راز یہی ہے کہ آپ جتنے زیادہ پتھر کھائیں گے، اتنا ہی اپنے مقصد سے قریب پہنچیں گے۔ ایک چوٹ کھا کر جان بچانے کے لیے کوئی بہانہ کر کے گر پڑے تو اس کا پھل بھی اتنا ہی ملتا ہے۔ آدھا یا اس سے بھی کم میں نے تو ٹھان لیا تھا کہ چاہے مر ہی جاؤں، لیکن جب تک نہ گر پڑوں پیچھا نہ چھوڑوں گا۔

پرکاش نے ایسا ہیبت ناک مرقع کھینچا کہ چھوٹے ٹھاکر صاحب کانپ گئے۔ جھکڑ بابا کی خدمت میں جانے کی ہمت نہ پڑی۔

(4)

آخر جولائی کی بیسیویں تاریخ آئی۔ سویرے ہی سے ڈاک خانے کے سامنے کئی ہزار آدمیوں کا مجمع ہو گیا۔ تار کا انتظار ہونے لگا۔ دونوں ٹھاکروں نے گھڑی رات رہے، گنگا اشنان کیا۔ اور مندر میں بیٹھ کر پوجا کرنے لگے۔ ہم دونوں ساجھے داروں نے اپنا کام تقسیم کر لیا۔ بکرم تو ڈاک خانہ گیا۔ میں مندر میں دیوتاؤں کے قدموں میں جا بیٹھا۔ دونوں ٹھاکر بھی بیٹھے پوجا کر رہے تھے۔ ان کے چہروں پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ بالکل بچوں کی سی کیفیت تھی، جو ذرا سی بات میں ہنس دیتے ہیں، اور ذرا سی بات میں رو دیتے ہیں۔

بڑے ٹھاکر نے پوچھا۔ ''بھگوان تو اپنے بھگتوں پر بڑی دیا رکھتے ہیں، کیوں پجاری جی''؟ پجاری جی نے فرمایا۔ ''ہاں سرکار! گج (روایت ہے کہ ایک بار ہاتھی (گج) ندی میں پانی پینے گیا۔ ندی میں ایک مگر تھا اس نے ہاتھی کی ٹانگ کھینچ لی۔ ہاتھی نے تب بھگوان کی یاد کی اور بھگوان اپنی جائے قیام چھیر ساگر اودھ کے سمندر سے ہاتھی کی مدد کو دوڑے) کو کراہ کے منہ سے بچانے کے لیے بھگوان چھیر ساگر سے دوڑے تھے''۔

چھوٹے ٹھاکر نے پوچھا۔ ''بھگوان تو انتر جامی (عالم الغیب) ہیں کس میں کتنی بھگتی ہے، یہ کیا ان سے چھپا رہتا ہو گا''۔

پجاری نے فرمایا۔ ''نہیں سرکار ان سے کیا چھپا ہے''۔ ادھر پوجا ہو رہی تھی۔ ادھر مندر کے باہر مساکین کو غلّہ تقسیم کیا جا رہا تھا۔

بڑے ٹھاکر نے پھر پوچھا۔ ''تمھارا دل کیا کہتا ہے پجاری جی''۔

پجاری نے فرمایا۔ ''آپ کی پھتے (فتح) ہوگی سرکار''۔

چھوٹے سرکار نے پوچھا۔ ''اور میری''۔

پجاری نے بے تکلف کہا۔ ''آپ کی بھی پھتے ہوگی''۔

دونوں آدمیوں کی فتح کیسے ہوگی، اس پر غور کرنے کی وہاں کسے فرصت تھی۔

کتھا ختم ہو گئی تو بڑے ٹھاکر صاحب نشہ عقیدت سے سرشار مندر سے نکلے، بھجن گاتے ہوئے۔

پربھو میں تو تیری چرنوں میں آیا۔
چھوٹے ٹھاکر صاحب بھبھوت لپیٹے حمد و ثنا میں مصروف تھے۔
پیروں تلے بچھایا کیا خوب فرش خاکی
اور سر پہ لاجوردی کیا آسمان بنایا
زندگی میں جب ترا ہم کو ہمشہ تھا خیال
بعد مردن بھی ہوس دل میں وہی لے جائیں گے
پرکاس بابو پٹیاں باندھے غریبوں کو غلّہ بانٹ رہے تھے، او ر بار بار فون پر جا کر پوچھتے تھے، کیا خبر ہے۔
ہر شخص کے چہرے پر امید و بیم کا رنگ تھا۔ امید رگوں میں، آنکھوں میں، ہونٹوں میں اُڈی پڑتی تھی، اور بیم دل میں،دماغ میں، جگر میں رعشہ پیدا کر رہا تھا۔
ٹیلیفون کی گھنٹی زور سے بجی، سب کے سب دوڑے، رسیور پرکاش بابو کے ہاتھ لگا۔
''کون ہے''؟
''میں ہوں بکرم''۔
''کیا خوش خبری ہے''۔
''اس شہر کا صفایا ہے۔ شہر ہی کافی نہیں، سارے ہندوستان کا۔ امریکہ کے ایک آدمی کا نام آیا ہے''۔
پرکاش بابو زمین پرگر پڑے۔ بڑے ٹھاکر صاحب پر جیسے فالج گر گیا ہو۔ بے حس و حرکت نقش دیوار کی طرح کھڑے رہ گئے۔ چھوٹے ٹھاکر صاحب سر پیٹ کر رونے لگے۔
رہا میں، مجھے مایوسی کے ساتھ ایک حاسدانہ مسرت ہو رہی تھی کہ مجھے بکرم کی خوشامد کرنے کی ذلّت نہیں اٹھانی پڑی۔ اماں جان باہر نکل آئیں اور کہہ رہی تھیں۔ ''سبھوں نے بے ایمانی کی، کون وہاں دیکھنے گیا تھا''۔
اس روز رات کو کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ بڑے ٹھاکر صاحب نے پجاری جی پر غصّہ اُتارا اور اُنھیں برخاست کر دیا۔ ''اسی لیے تمھیں اتنے دنوں سے پال رکھا ہے،

حرام کا مال کھاتے ہو اور چین کرتے ہو"۔

اتنے میں بکرم روحانی صورت لیے آکر بیٹھ گیا۔

میں نے پوچھا۔ "اب تو معاملہ ختم ہو گیا۔ مگر سچ کہنا، تمھاری نیت فاسد تھی یا نہیں"؟

بکرم بے غیرتی کے ساتھ مسکرا پڑا۔

"اب کیا کرو گے پوچھ کر، پردہ ڈھکا رہنے دو"۔

(یہ افسانہ 'ہنس' اکتوبر 1935 میں شائع ہوا۔ 'مان سرور 2' اور 'زادِ راہ' میں شامل ہے۔)

سِدھانت کا سب سے بڑا دشمن ہے مرّوت۔ کٹھنائیوں، بادھاؤں، پرلوبھنوں کا سامنا آپ کرسکتے ہیں دِرڑھ سنکلپ اور آتم بل سے۔ لیکن ایک دِلی دوست سے بے مرّوتی تو نہیں کی جاتی، سِدّھانت رہے یاجائے۔ کئی سال پہلے میں نے جنیو ہاتھ میں لے کر پرتِگیا کی تھی کہ اب کبھی کسی کی بارات میں نہ جاؤں گا چاہیے اِدھر کی دنیا اُدھر ہوجائے۔ ایسی وِکٹ پرتِگیا کرنے کی ضرورت کیوں پڑی، اس کی کتھا لمبی ہے اور آج بھی اُسے یاد کرکے میری پرتِگیا کو جیون مِل جاتاہے۔ بارات تھی کائستھوں کی۔ سمدھی تھے میرے پُرانے مِتر۔ باراتیوں میں ادھیکانش جان پہچان کے لوگ تھے۔دیہات میں جاناتھا۔ میں نے سوچا، چلو دو تین دن دیہات کی سیر رہے گی، چل پڑا۔لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ باراتیوں کی وہاں جاکر بُدّھی ہی کچھ بھرشٹ ہوگئی ہے۔ بات بات پر جھگڑا تکرار۔ سبھی کنیا پکش والوں سے مانو لڑنے کو تیار۔ یہ چیز نہیں آئی، وہ چیز نہیں بھیجی، یہ آدمی ہے یا جانور، پانی بنا برف کے کون پیے گا۔ گدھے نے برف بھیجی بھی تو دس سیر۔ پوچھو دس سیر برف لے کر آنکھوں میں لگائیں یا کسی دیوتا کو چڑھاویں۔ عجب چل پوں مچی ہوئی تھی۔ کوئی کسی کی نہ سنتا تھا۔ سمدھی صاحب سر پیٹ رہے تھے کہ یہاں ان کے متروں کی جتنی دُرگتی ہوئی، اس کا انھیں عمر بھر کھید رہے گا۔ وہ کیا جانتے تھے کہ لڑکی والے اتنے گنوار ہیں۔ گنوار، کیوں مطلبی کہیے۔ کہنے کو شِکچھت ہیں، سبھیہ ہیں، دَھن بھی بھگوان کی دَیا سے کم نہیں،مگر دل کے اتنے چھوٹے۔ دس سیر برف بھیجتے ہیں۔ سِگریٹ کی ایک ڈبیا بھی نہیں۔پھنس گیا اور کیا۔

میں نے ان سے بِنا سَہانوبھوتی دکھائے کہا۔ سگریٹ نہیں بھیجے تو کون سا بڑا انرتھ ہوگیا خمیرہ تمباکو تو دس سیر بھیج دیا ہے، پیتے کیوں نہیں گھول، گھول کر۔

میرے سمدھی مِترنے وِسمے بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا، مانو انھیں اپنے کانوں پر

وشواس نہ ہو۔ ایسی انیتی۔

بولے: آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ خمیرہ یہاں کون پیتا ہے، مدّت ہوئی لوگوں نے گڑگڑیاں اور فرشیاں گدڑی بازارمیں بیچ ڈالیں۔ تھوڑے سے دقیانوسی اب بھی حقہ گڑگڑاتے ہیں لیکن بہت کم۔ یہاں تو ایشور کی کرپا سے سبھی نئی روشنی، نئے وچار، نئے زمانے کے لوگ ہیں اور کنّیا والے یہ بات جانتے ہیں ،پھر بھی سگریٹ نہیں بھیجی۔ یہاں کئی سجّن آٹھ دس ڈبیا روز پی جاتے ہیں، ایک صاحب تو بارہ تک پہنچ جاتے ہیں اور چار پانچ ڈبیاں تو عام بات ہے۔ اتنے آدمیوں کے بیچ میں سو ڈبیا بھی نہ ہو تو کیا ہو اور برف دیکھی آپ نے، جیسے دوا کے لیے بھیجی ہے۔ یہاں اتنی برف گھرگھر آتی ہے۔ میں تو اکیلاہی دس سیر پی جاتا ہوں۔ دیہاتیوں کو کبھی عقل نہ آئے گی۔ پڑھ لکھ کتنے ہی جائیں۔

میں نے کہا 'تو آپ کو اپنے ساتھ ایک گاڑی سگریٹ اور ٹن بھربرف لیتے آنا چاہیے تھا۔'

وہ اَستمبھت ہوگئے۔ 'آپ بھنگ تو نہیں کھاگئے؟

جی نہیں، کبھی عمر بھرنہیں کھائی۔'

تو پھر ایسی اُول جلول باتیں کیوں کرتے ہو؟

میں تو سمپورتہہ اپنے ہوش میں ہوں۔ ہوش میں رہنے والا آدمی ایسی بات نہیں کر سکتا۔ ہم یہاں لڑکا بیاہنے آئے ہیں، لڑکی والوں کو ہماری ساری فرمائشیں پوری کرنی پڑیں گی، ساری! ہم جو کچھ مانگیں گے، انھیں دینا پڑے گا، رُو رُو کر دینا پڑے گا۔ دل لگی نہیں ہے۔ ناکوں چنے نہ چبوادیں تو کہیے گا یہ ہمارا کھُلا ایمان ہے۔ دوار پر بلاکر ذلیل کرنا میرے ساتھ جو لوگ آئے ہیں وے نائی کہارنہیں ہیں، بڑے آدمی ہیں، میں ان کی توہین نہیں دیکھ سکتا۔ اگر ان لوگوں کی یہ ضد ہے تو بارات لوٹ جائے گی۔

میں نے دیکھا یہ اس وقت تاؤمیں ہیں۔ ان سے بحث کرنا اُچت نہیں، آج جیون میں پہلی بار کیول دو دن کے لیے، انھیں ایک آدمی پر اُدھیکار مِل گیاہے۔ اس کی گردن اِن کے پاؤں کے نیچے ہے۔ پھر انھیں کیوں نہ نشہ ہو آئے، کیوں نہ سر پھر جائے، کیوں نہ اس پر دل کھول کر رعب جمائیں۔ وَرپکش والے کنّیا پکش والوں پر مدتوں سے حکومت

کرتے چلے آئے ہیں اور اس اَدھیکار کو تیاگ دینا آسان نہیں۔ ان لوگوں کے دماغ میں اس وقت بات کیسے آئے گی کہ تم کنّیا پکش والوں کے مہمان ہو اور وہ تمھیں جس طرح رکھنا چاہیں، تمھیں رہنا پڑے گا۔ مہمان کو جو آدرسَتکار، چُنی چوکر، روکھا سوکھا ملے، اس پر اسے سنتُشٹ ہونا چاہیے۔ شِشٹتا یہ کبھی گوارا نہیں کرسکتی کہ وہ جن کا مہمان ہے۔ ان سے اپنی خاطرداری کا ٹیکس وصول کریں۔ میں نے وہاں سے ٹل جانا ہی مناسب سمجھا۔ لیکن جب وِواہ کا مہورت آیا۔ اِدھر سے ایک درجن وہسکی کی بوتلوں کی فرمائش ہوئی اور کہا گیا کہ جب تک بوتلیں نہ آجائیں گی۔ وِواہ سنسکار کے لیے منڈپ میں نہیں جائیں گے، تب مجھ سے نہ دیکھا گیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ سب پَشو ہیں، انسانیت سے خالی، ان کے ساتھ ایک چھَن (لمحہ) رہنا بھی اپنی آتما کا خون کرنا ہے۔ میں نے اسی وقت پرتگیا کی کہ اب کبھی کسی بارات میں نہ جاؤں گا اور اپنا بوریا بقچہ لے کر اسی چھَن (لمحہ) وہاں سے چل دیا۔

اس لیے جب گت منگل وار کو میرے پَرَمَ مِتر سریش بابو نے مجھے اپنے لڑکے کے وِواہ کا نِمنترن دیا تو میں نے ساہس کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر کہا، جی نہیں، مجھے چھما کیجیے، میں نہ جاؤں گا۔

انھوں نے کھِنّ ہوکر کہا۔ آخر کیوں؟

میں نے پرتگیا کرلی ہے کہ اب کسی بارات میں نہ جاؤں گا۔

اپنے بیٹے کی بارات میں بھی نہیں؟

بیٹے کی بارات میں خود اپنا سوامی رہوں گا۔

'تو سمجھ لیجیے یہ آپ ہی کا پُتر ہے اور آپ یہاں اپنے سوامی ہیں، میں نِیروتّر ہو گیا۔ پھر بھی میں نے اپنا پکش نہ چھوڑا۔

'آپ لوگ وہاں کنّیا پکش والوں سے سِگریٹ، برف، تیل، شراب آدِ آدِ (وغیرہ وغیرہ) چیزوں کے لیے آگرّہ تو نہ کریں گے؟'

'بھول کر بھی نہیں، اس وِشے میں میرے وِچار وہی ہیں جو آپ کے ہیں۔'

'ایسا تو نہ ہوگا کہ میرے جیسے وِچار رکھتے ہوئے بھی آپ وہاں ذرا گراہیوں کی باتوں میں آجائیں اور وے اپنے ہتھکنڈے شروع کردیں؟'

'میں آپ ہی کو اپنا پرتی ندھی بناتا ہوں۔ آپ کے فیصلے کو وہاں کہیں اپیل نہ ہوگی۔'

دل میں تو میرے اب بھی کچھ سنشے تھا، لیکن اتنا آشواسن ملنے پر اور زیادہ اڑنا اَنچتا تھی۔ آخر میرے وہاں جانے سے یہ بے چارے تَر تو نہیں جائیں گے، کیول مجھ سے سنیہ رکھنے کے کارن ہی تو سب کچھ میرے ہاتھوں میں سونپ رہے ہیں ۔میں نے چلنے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن جب سُریش بابو وداع ہونے لگے تو میں نے گھڑے کو ذرا اور ٹھوکا۔

''لین دین کا تو کوئی جھگڑا نہیں ہے؟''

'نام کو نہیں۔' وہ لوگ اپنی خوشی سے جو کچھ دیں گے، وہ ہم لے لیں گے۔ مانگنے نہ مانگنے کا اُدھیکار آپ کو رہے گا۔''

''اچھی بات ہے میں چلوں گا۔''

شکروار کو بارات چلی کیول ریل کا سفر تھا اور وہ بھی پچاس میل کا، تیسرے پہر کے ایکسپریس سے چلے اور شام کو کنیا کے دوار پر پہنچ گئے ۔وہاں ہر طرح کا سامان موجود تھا۔ کسی چیز کے مانگنے کی ضرورت نہ تھی۔ باراتیوں کی اتنی خاطرداری بھی ہوسکتی ہے، اس کی مجھے کلپنا بھی نہ تھی۔ گھراتی اِتنے وِنیت ہوسکتے ہیں، کوئی بات منھ سے نکلی نہیں کہ ایک کی جگہ چار آدمی ہاتھ باندھے حاضر۔

لگن کا مہورت آیا۔ ہم سبھی منڈپ میں پہنچے، وہاں تل رکھنے کی جگہ بھی نہ تھی۔ کسی طرح دھنس دھنسا کر اپنے لیے جگہ نکالی سُریش بابو میرے پیچھے کھڑے تھے، بیٹھنے کو وہاں جگہ نہ تھی۔

کنیّادان سنسکار شروع ہوا۔ کنّیا کا پتا، ایک پیتامبر پہنے آکر وَر کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کے چرنوں کو دھوکر ان پراچھت پھول آدِ چڑھانے لگا۔ میں اب تک سیکڑوں باراتوں میں جا چکا تھا، لیکن، وِواہ سنسکار دیکھنے کا مجھے کبھی اَوسر نہ ملا تھا۔ اس سے وَر کے سگے سمبندھی ہی جاتے ہیں۔ اَنئے باراتی جنماسے میں پڑے سوتے ہیں یا ناچ دیکھتے ہیں۔ یا گراموفون کے رکارڈ سنتے ہیں اور کچھ نہ ہوا تو کئی ٹولیوں میں تاش کھیلتے ہیں۔ اپنے وِواہ کی مجھے یاد نہیں۔ اس وقت کنّیا کے وِردّھ (بزرگ) پتا کو ایک یوَک

کے چرن کی پوجا کرتے دیکھ کر میری آتما کو چوٹ لگی۔ یہ ہندو وِواہ کا آدرش ہے یا اس کا پریہاس؟ جماتا ایک پرکار سے اپنا پُتر ہے، اس کا دھرم ہے کہ اپنے دھرم پتا کے چرن دھوئے، اس پر پان پھول چڑھائے۔ یہ تو نیتی سنگت معلوم ہوتا ہے۔ کنّیا کا پِتا وَر کے پاؤں پوجے یہ تو نہ شِشٹتا ہے، نہ دھرم، نہ مریادا۔ میری وِدُروہی آتما کسی طرح شانت نہ رہ سکی۔ میں نے جھلّائے ہوئے سُور میں کہا۔ 'یہ کیا انرتھ ہو رہا ہے، بھائیوں! کنّیا کے پِتا کا یہ اپمان! کیا آپ لوگوں میں آدمیت رہی ہی نہیں؟'

منڈپ میں سنّاٹا چھا گیا۔ میں سبھی آنکھوں کا کیندر بن گیا۔ میرا کیا آشے ہے، یہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔

آخر سُریش بابو نے پوچھا۔ 'کیسا اپمان اور کس کا اپمان؟یہاں تو کسی کا اپمان نہیں ہو رہا ہے۔'

'کنّیا کا پِتا وَر کے پاؤں پوجے، یہ اپمان نہیں تو کیا ہے؟'

'یہ اپمان نہیں ہے بھائی صاحب، پراچین پرتھا ہے۔'

کنّیا کے پِتا مہودے بولے۔ یہ میرا اپمان نہیں ہے مانیے وَر، میرا اہوبھاگیہ کہ آج یہ شبھ اَوسر آیا۔ آپ اتنے ہی سے گھبرا گئے۔ ابھی تو کم سے کم ایک سو آدمی پے پجی کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کتنے ہی ترستے ہیں کہ کنّیا ہوتی تو وَر کے پاؤں پوج کر اپنا جنم سپھل کرتے۔'

میں لاجواب ہوگیا۔ سمدھی صاحب پاؤں پوج چکے تو استریوں اور پرشوں کا ایک سموہ وَر کی طرف امنڈ پڑا۔ پرتیک پرانی لگا اُس کے پاؤں پوجنے، جو آتا تھا اپنی حیثیت کے انوسار کچھ نہ کچھ چڑھا جاتا تھا۔ سب لوگ پرسّن چت اور گدگد نیتروں سے یہ ناٹک دیکھ رہے تھے اور میں من میں سوچ رہا تھا۔ جب سماج میں اوچِتیہ گیان کا اتنا لوپ ہوگیا ہے اور لوگ اپنے اپمان کو اپنا سمّان سمجھتے ہیں تو پھر کیوں نہ استریوں کی سماج میں یہ دُردشا ہو، کیوں نہ وے اپنے کو پُرش کے پاؤں کی جوتی سمجھیں، کیوں نہ ان کے آتم سّمان کا سرَوناش ہوجائے۔

جب وِواہ سنسکار سماپت ہوگیا اور وَر وَدھو منڈپ سے نکلے تو میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسی تھال سے تھوڑے سے پھول چن لیے اور ایک اَرْدھ چیتنا کی دشا

میں، نہ جانے کن بھاؤں سے پریت ہوکر ،ان پھولوں کو وِدُھو کے چرنوں پر رکھ دیا،اور
اسی وقت وہاں سے گھر چل دیا۔

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی ماہنامہ 'مادھوری' اکتوبر 1935 میں شائع ہوا۔ 'گپت دھن'
حصہ دوم میں شامل ہے۔ اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔)

دو بہنیں

دو بہنیں دو سال کے بعد ایک تیسرے عزیز کے گھر ملیں، اور خوب رو دھو کر خاموش ہوئیں تو بڑی بہن روپ کماری نے دیکھا کہ چھوٹی بہن رام دُلاری سر سے پاؤں تک گہنوں سے لدی ہوئی ہے۔ کچھ اس کا رنگ کھِل گیا ہے۔ مزاج میں کچھ تمکنت آگئی ہے۔ اور بات چیت کرنے میں کچھ زیادہ مشاق ہو گئی ہے۔ بیش قیمت ساری اور ...... عنابی مخمل کے جمپر نے اس کے حُسن کو اور بھی چمکا دیا ہے۔ وہی رام دُلاری جو لڑکپن میں سر کے بال کھولے پھوہڑ سی ادھر ادھر کھیلا کرتی تھی۔ آخری بار روپ کماری نے اسے اس کی شادی میں دیکھا تھا۔ دو سال قبل تک بھی اس کی شکل و صورت میں کچھ زیادہ تغیر نہ ہوا تھا۔ لمبی تو ہو گئی تھی، مگر تھی اتنی ہی دُبلی۔ اتنی ہی بدتمیز۔ ذرا ذرا سی بات پر روٹھنے والی۔ مگر آج تو کچھ حالت ہی اور تھی، جیسے کلی کھل گئی ہو، اور حُسن اس نے کہاں چھپا رکھا تھا۔ نہیں نظروں کو دھوکا ہو رہا ہے۔ یہ حُسن نہیں محض دیدہ زیبی ہے۔ ریشم، مخمل اور سونے کی بدولت نقشہ تھوڑا ہی بدل جائے گا۔ پھر بھی وہ آنکھوں میں سمائی جاتی ہے۔ پچاسوں عورتیں جمع ہیں، مگر یہ سحر، یہ کشش اور کسی میں نہیں۔

اور اس کے دل میں حسد کا ایک شعلہ سا دہک اُٹھا۔

کہیں آئینہ ملتا تو وہ ذرا اپنی صورت بھی دیکھتی۔ گھر سے چلتے وقت اس نے اپنی صورت دیکھی تھی۔ اسے چمکانے کے لیے جتنا صیقل کر سکتی تھی، وہ کیا تھا۔ لیکن اب وہ صورت جیسے یاد داشت سے مٹ گئی ہے۔ اس کی محض ایک دھندلی سی پر چھائیں ذہن میں ہے۔ اسے پھر سے دیکھنے کے لیے وہ بے قرار ہو رہی ہے۔ یوں تو اس کے ساتھ میک اَپ کے لوازمات کے ساتھ آئینہ بھی ہے۔ لیکن مجمع میں وہ آئینہ دیکھنے یا بناؤ سنگار کرنے کی عادی نہیں ہے۔ یہ عورتیں دل میں خدا جانے کیا سمجھیں۔ یہاں کوئی آئینہ تو ہوگا ہی۔

ڈرائنگ روم میں تو ضرور ہوگا۔ وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں گئی۔ اور قدآدم شیشہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس کے خدو خال بے عیب ہیں۔ مگر وہ تازگی، وہ شگفتگی، وہ نظر فریبی نہیں ہے۔ رام دُلاری آج کھِلی ہے۔ اور اِسے کھِلے زمانہ ہو گیا۔ لیکن اس خیال سے اسے تسکین نہیں ہوئی۔ وہ رام دُلاری سے ہیٹی بن کر نہیں رہ سکتی یہ مرد بھی کتنے احمق ہوتے ہیں۔ کسی میں اصلی حُسن کی پرکھ نہیں۔ انھیں تو جوانی، شوخی اور نفاست چاہیے۔ آنکھیں رکھ کر بھی اندھے بنتے ہیں۔ میرے کپڑوں میں تم دُلاری کو کھڑا کر دو۔ پھر دیکھو یہ سارا جادو کہاں اُڑگیا ہے۔ چڑیل سی نظر آئے گی، ان احمقوں کو کون سمجھائے۔

رام دُلاری کے گھر والے تو اتنے خوش حال نہ تھے۔ شادی میں جو جوڑے اور زیور آئے تھے، وہ بہت ہی دل شِکن تھے۔ امارت کا کوئی دوسرا سامان ہی نہ تھا، اس کے سُسر ایک ریاست کے مختار عام تھے۔ اور شوہر کالج میں پڑھتا تھا۔ اس دو سال میں کیسے ہُن برس گیا۔ کون جانے زیور کسی سے مانگ کر لائی ہو۔ کپڑے بھی دو چار دن کے لیے مانگ لیے ہوں۔ اسے یہ سوانگ مبارک رہے۔ میں جیسی ہوں ویسی ہی اچھی ہوں۔ اپنی حیثیت کو بڑھا کر دکھانے کا مرض کتنا بڑھتا جاتا ہے۔ گھر میں روٹیوں کا ٹھکانا نہیں ہے۔ لیکن اس طرح بن ٹھن کر نکلیں گی، گویا کہیں کی راجکماری ہیں۔ بساطیوں کے، درزی کے اور بزاز کے تقاضے سہیں گی، شوہر کی گھڑ کیاں کھائیں گی روئیں گی۔ روٹھیں گی مگر نمائش کے جُنون کو نہیں روک سکتیں۔ گھر والے بھی سوچتے ہوں گے، کتنی چھچھوری طبیعت ہے اس کی۔ مگر یہاں تو بے حیائی پر کمر باندھ لی ہے۔ کوئی کتنا ہی ہنسے بے حیا کی بلا دور۔ بس یہی دُھن سوار ہے کہ جدھر سے نکل جائیں اُدھر اس کی خوب تعریفیں کی جائیں۔ رام دُلاری نے ضرور کسی سے زیور اور کپڑے مانگ لی ہیں بے شرم جو ہے۔

اس کے چہرے پر غرور کی سُرخی جھلک پڑی۔

نہ سہی اس کے پاس زیور اور کپڑے۔ کسی کے سامنے شرمندہ تو نہیں ہونا پڑتا۔ ایک ایک لاکھ کے تو اس کے دو لڑکے ہیں۔ بھگوان انھیں زندہ اور سلامت رکھے۔ وہ اسی میں خوش ہے۔ خود اچھا پہن لینے اور اچھا کھا لینے ہی سے تو زندگی کا مقصد پورا

نہیں ہو جاتا۔ اس کے گھر والے غریب ہیں۔ پر عزت تو ہے۔ کسی کا گلا تو نہیں دباتے۔ کِسی کی بد دعا تو نہیں لیتے۔

اس طرح اپنا دل مضبوط کر کے وہ پھر برآمدے میں آئی، تو رام دُلاری نے جیسے رحم کی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔

''جیجا جی کی کچھ ترقّی ہوئی کہ نہیں بہن۔ یا ابھی تک وہی پچھتّر پر قلم گھِس رہے ہیں''۔

روپ کماری کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ افوہ رے دماغ۔ گویا اس کا شوہر ...... ہی تو ہے۔ اکڑ کر بولی۔ ''ترقی کیوں نہیں ہوئی۔ اب سَو کے گریڈ میں ہیں۔ آج کل یہ بھی غنیمت ہے۔ میں تو اچھے اچھے ایم، اے پاسوں کو دیکھتی ہوں کہ کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا۔ تیرا شوہر اب بی۔ اے میں ہوگا''۔

''انھوں نے تو پڑھنا چھوڑ دیا بہن! پڑھ کر اوقات خراب کرنا تھا۔ اور ...... ایک کمپنی کے ایجنٹ ہوگئے ہیں۔ اب ڈھائی سو روپیہ ماہوار پاتے ہیں۔ کمیشن اوپر سے، پانچ روپیہ روز سفر خرچ کے بھی ملتے ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ پانچ سو کا اوسَط پڑجاتا ہے۔ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تو ان کا ذاتی خرچ ہے بہن! اونچے عہدہ پر ہیں، تو اچھی حیثیت بھی بنائے رکھنی لازم ہے۔ ساڑھے تین سو روپیہ بے داغ گھر دے دیتے ہیں۔ اس میں سو روپے مجھے ملتے ہیں۔ ڈھائی سو میں گھر کا خرچ خوش فعلی سے چل جاتا ہے۔ ایم، اے پاس کر کے کیا کرتے''۔

روپ کماری اسے شیخ چلّی کی داستان سے زیادہ وقعت نہیں دینا چاہتی تھی۔ مگر رام دُلاری کے لہجے میں اتنی صداقت ہے کہ تحت الشعور میں اس سے متاثر ہو رہی ہے۔ اور اس کے چہرے پر خفت اور شکست کی بدمزگی صاف جھلک رہی ہے، مگر اسے اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھنا ہے تو اس اثر کو دل سے مٹا دینا پڑے گا، اسے جرحوں سے اپنے دل کو یقین کرا دینا پڑے گا کہ اس میں ایک چوتھائی زیادہ حقیقت نہیں ہے۔ وہاں تک وہ برداشت کر لے گی۔ اس سے زیادہ وہ کیسے برداشت کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں دھڑکن بھی ہے کہ کہیں یہ روداد سچ نکلی تو وہ کیسے رام دلاری کو منہ دکھا سکے گی۔ اسے اندیشہ ہے کہ کہیں اس کی آنکھوں سے آنسو نہ نکل پڑیں۔ کہاں پچھتّر اور کہاں

پانچ سو۔ اتنی بڑی رقم ضمیر کا خون کر کے بھی کیوں نہ ملے۔ پھر بھی روپ کماری اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ضمیر کی قیمت زیادہ سے زیادہ سو روپیہ ہو سکتی ہے۔ پانچ سو کسی حالت میں نہیں۔

اس نے تمسخر کے انداز سے پوچھا۔ ''جب ایجنٹی میں اتنی تنخواہ اور بھتّے ملتے ہیں، تو کالج بند کیوں نہیں ہو جاتے؟ ہزاروں لڑکے کیوں اپنی زندگی خراب کرتے ہیں''؟

رام دُلاری بہن کی خفّت کا مزا اُٹھاتی ہوئی بولی۔ ''بہن تم یہاں غلطی کر رہی ہو ایم۔ اے تو سب ہی پاس ہو سکتے ہیں، مگر ایجنٹی کرنی کس کو آتی ہے۔ یہ خدا داد ملکہ ہے۔ کوئی زندگی بھر پڑھتا رہے، مگر ضروری نہیں کہ وہ اچھا ایجنٹ ہو جائے۔ روپیہ پیدا کرنا دوسری چیز ہے۔ علمی فضیلت حاصل کرنا دوسری چیز۔ اپنے مال کی خوبی کا یقین پیدا کر دینا، یہ ذہن نشیں کرا دینا کہ اس سے ارزاں اور دیر پا چیز بازار میں مل ہی نہیں سکتی۔ آسان کام نہیں ہے۔ ایک سے ایک گاہکوں سے ان کا سابقہ پڑتا ہے۔ بڑے بڑے راجاؤں اور رئیسوں کی تالیف قلب کرنی پڑتی ہے۔ اوروں کی تو اُن راجاؤں اور نوابوں کے سامنے جانے کی ہمت بھی نہ پڑے۔ اور کسی طرح پہنچ جائیں تو زبان نہ نکلے۔ شروع شروع میں انھیں بھی جھجک ہوئی تھی۔ مگر اب تو اس دریا کے مگر ہیں۔ اگلے سال ترقی ہونے والی ہے''۔

روپ کماری کی رگوں میں جیسے خون کی حرکت بند ہوئی جارہی ہے۔ ظالم آسمان کیوں نہیں گر پڑتا۔ بے رحم زمین کیوں نہیں پھٹ جاتی۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ روپ کماری جو حسین ہے، تمیزدار ہے، کفایت شعار ہے۔ اپنے شوہر پر جان دیتی ہے، بچّوں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ اس کی اس خستہ حالی میں بسر ہو۔ اور یہ بدتمیز تن پرور، چنچل چھوکری رانی بن جائے۔ مگر اب بھی کچھ امید باقی تھی۔ شاید اس کی تسکین قلب کا کوئی راستہ نکل آئے۔

اسی تمسخر کے انداز سے بولی۔ ''تب تو شاید ایک ہزار ملنے لگیں''۔

''ایک ہزار تو نہیں مگر چھ سو میں شبہ نہیں''۔

''کوئی آنکھ کا اندھا مالک بن گیا ہوگا''۔

''بیوپاری آنکھ کے اندھے نہیں ہوتے۔ جب تم انھیں چھ ہزار کما کر دو تب کہیں

چھ سو ملیں۔ جو ساری دنیا کو چرائے اسے کوئی کیا بیوقوف بنائے گا''۔

تمسخر سے کام چلتے نہ دیکھ کر، روپ کماری نے تحقیر شروع کی۔ میں تو اس کو بہت معزز پیشہ نہیں سمجھتی، سارے دن جھوٹ کے طومار باندھو۔ یہ تو ٹھگ بدّیا ہے''۔

رام دُلاری زور سے ہنسی۔ روپ کماری پر اس نے کامل فتح پائی تھی۔ ''اس طرح تو جتنے وکیل بیرسٹر ہیں، سب ہی ٹھگ بدّیا کرتے ہیں۔ اپنے مؤکل کے فائدے کے لیے انھیں جھوٹی شہادتیں تک بنانی بڑتی ہیں۔ مگر ان ہی وکیلوں کو ہم اپنا لیڈر کہتے ہیں۔ انھیں اپنی قومی سبھاؤں کا صدر بناتے ہیں۔ ان کی گاڑیاں کھینچتے ہیں۔ ان پر پھولوں کی اور زرو جواہر کی برکھا کرتے ہیں۔ آج کل دنیا پیسہ دیکھتی ہے۔ پیسے کیسے آئے یہ کوئی نہیں دیکھتا۔ جس کے پاس پیسہ ہو اس کی پوجا ہوتی ہے۔ جو بدنصیب ہیں، ناقابل، پست ہمّت ہیں، ضمیر اور اخلاق کی دُہائی دے کر اپنے آنسو پونچھ لیتے ہیں۔ ورنہ ضمیر اور اخلاق کو کون پوچھتا ہے۔

روپ کماری خاموش ہوگئی۔ اب اسے یہ حقیقت اس کی ساری تلخیوں کے ساتھ تسلیم کرنی پڑے گی کہ رام دُلاری اس سے زیادہ خوش نصیب ہے۔ اس سے مفر نہیں تمسخر یا تحقیر سے وہ اپنی تنگ دلی کے اظہار کے سوا اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتی۔ اسے کسی بہانہ رام دلاری کے گھر جاکر اصلیت کی چھان بین کرنی پڑے گی۔ اگر رام دلاری واقعی لکشمی کا بردان پا گئی ہے، تو وہ اپنی قسمت ٹھونک کر بیٹھ رہے گی۔ سمجھ لے گی کہ دنیا میں کہیں انصاف نہیں ہے۔ کہیں ایمانداری کی قدر نہیں ہے۔ مگر کیا سچ مچ اس خیال سے اسے تسکین ہوگی۔ یہاں کون ایماندار ہے؟ وہی جسے بے ایمانی کا موقعہ نہیں ہے۔ اور نہ اتنی ہمّت ہے کہ وہ موقع پیدا کر لے۔ اس کے شوہر پچھتّر روپے ماہوار پاتے ہیں۔ مگر کیا دس بیس روپے اور اوپر سے مل جائیں، تو وہ خوش ہو کر نہ لے لیں گے؟ ان کی ایمان داری اور اصول پروری اس وقت تک ہے۔ جب تک موقعہ نہیں ملتا۔ جس دن موقعہ ملا۔ ساری اصول پر وری دھری رہ جائے گی۔ اور تب کیا روپ کماری میں اتنی اخلاقی قوت ہے کہ وہ اپنے شوہر کو نا جائز آمدنی سے روک دے۔ روکنا تو درکنار۔ وہ خوش ہوگی۔ شاید اپنے شوہر کی پیٹھ ٹھونکے ابھی ان کے دفتر سے واپسی کے وقت من مارے بیٹھی رہتی ہے۔ تب دروازے پر کھڑی ہو کر ان کا انتظار کرے گی۔ اور جوں ہی وہ گھر میں آئیں

گے، ان کی جیبوں کی تلاشی لے گی۔

آنگن میں گانا بجانا ہو رہا تھا۔ رام دلاری اُمنگ کے ساتھ گا رہی تھی۔ اور روپ کماری وہیں پر آمدے میں اُداس بیٹھی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ کوئی گائے، کوئی ناچے اُسے کوئی سروکار نہیں۔ وہ تو بدنصیب ہے رونے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

نو بجے رات کے مہمان رخصت ہونے لگے۔ روپ کماری بھی اُٹھی۔ یکّہ منگوانے جارہی تھی کہ رام دُلاری نے کہا۔

''یکّہ منگوا کر کیا کرو گی بہن! مجھے لینے کے لیے ابھی کار آتی ہوگی، دو چار دن میرے یہاں رہو پھر چلی جانا، میں جیجا جی کو کہلا بھیجوں گی''۔

روپ کماری کا آخری حربہ بھی بیکار ہو گیا۔ رام دلاری کے گھر جا کر دریافت حال کی خواہش یکا یک فنا ہوگئی۔ وہ اب اپنے گھر جائے گی۔ اور منہ ڈھانپ کر پڑ رہے گی۔ ان پھٹے حالوں میں کیوں کسی کے گھر جائے۔ بولی ''بہن ابھی تو مجھے فرصت نہیں ہے۔ پھر کبھی آؤں گی''۔

''کیا رات بھر بھی نہ ٹھہرو گی''؟

''نہیں میرے سر میں زور سے درد ہو رہا ہے''۔

''اچھا بتاؤ۔ کب آؤ گی میں سواری بھیج دوں گی''۔

''میں خود کہلا بھیجوں گی''۔

''تمھیں یاد نہ رہے گی۔ سال بھر ہو گیا۔ بھول کر بھی نہ یاد کیا۔ میں اسی انتظار میں تھی کہ دیدی بلائیں تو چلوں۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہیں، پھر بھی اتنی دور کہ سال سال بھر گزر جائے اور ملاقات نہ ہو''۔

''گھر کی فکروں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ کئی بار ارادہ کیا کہ تجھے بلا بھیجوں۔ مگر موقعہ ہی نہ ملا''۔

اتنے میں رام دُلاری کے شوہر مسٹر گرو سیوک نے آکر بڑی سالی کو سلام کیا۔ بالکل انگریزی وضع تھی۔ کلائی پر سونے کی گھڑی۔ آنکھوں پر سنہری عینک۔ بالکل اپٹو ڈیٹ جیسے کوئی تازہ وارد سویلین ہو۔ چہرے سے ذہانت، متانت اور شرافت برس رہی تھی۔ وہ

اتنا خوش رو اور جامہ زیب ہے۔ روپ کماری کو اس بات کا گمان بھی نہ تھا۔
دعا دے کر بولی۔ ''آج یہاں نہ آتی تو تم سے ملاقات کیوں ہوتی''؟
گرو سیوک ہنس کر بولا۔ ''بجا فرماتی ہیں۔ اُلٹی شکایت۔ کبھی آپ نے بلایا، اور میں نہ گیا''۔
''میں نہیں جانتی تھی کہ تم اپنے کو مہمان سمجھتے ہو۔ وہ بھی تمھارا ہی گھر ہے''۔
''اب مان گیا بھابی صاحب۔ بے شک میری غلطی ہے۔ انشاء اللہ اس کی تلافی کروں گا۔ مگر آج ہمارے گھر رہیے''۔
''نہیں آج بالکل فرصت نہیں ہے۔ پھر آؤں گی۔ لڑکے گھر پر گھبرا رہے ہوں گے''۔
رام دلاری بولی۔ ''میں کتنا کہہ کے ہار گئی۔ مانتی ہی نہیں''۔
دونوں بہنیں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ گرو سیوک ڈرائیو کرتا ہوا چلا۔ ذرا دیر میں اس کا مکان آ گیا۔ رام دلاری نے پھر روپ کماری سے چلنے کے لیے اصرار کیا۔ مگر وہ نہ مانی۔ لڑکے گھبرا رہے ہوں گے۔ آخر رام دلاری اس سے گلے مل کر اندر چلی گئی۔ گرو سیوک نے کار بڑھائی۔ روپ کماری نے اڑتی ہوئی نگاہ سے رام دلاری کا مکان دیکھا۔ اور ٹھوس حقیقت سلاخ کی طرح اس کے جگر میں چُبھ گئی۔ کچھ دور چل کر گرو سیوک بولا۔
''بھابی! میں نے اپنے لیے کیسا اچھا راستہ نکال لیا۔ اگر دو چار سال کام چل گیا تو آدمی بن جاؤں گا''۔
روپ کماری نے ہمدر دانہ لہجہ میں کہا۔ ''رام دُلاری نے مجھ سے کہا۔ بھگوان کرے جہاں رہو خوش رہو، ذرا ہاتھ پیر سنبھال کر رہنا''۔
''میں مالک کی آنکھ بچا کر ایک پیسہ لینا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ دولت کا مزا تو جب ہے کہ ایمان سلامت رہے۔ ایمان کھو کے پیسے ملے تو کیا۔ میں ایسی دولت پر لعنت بھیجتا ہوں۔ اور آنکھ کس کی بچاؤں سب سیاہ سفید تو میری ہاتھ میں ہے۔ مالک تو کوئی ہے نہیں۔ اس کی بیوہ ہے۔ اس نے سب کچھ میرے ہاتھ میں چھوڑ رکھا ہے۔ میں نے اس کا کاروبار نہ سنبھال لیا ہوتا تو سب کچھ چوپٹ ہو جاتا، میرے سامنے تو مالک صرف تین

مہینے زندہ رہے۔ مگر بڑا مردم شناس آدمی تھا۔ مجھے سو پر رکھا اور ایک ہی مہینے میں ڈھائی سو کردیے۔ آپ لوگوں کی دعا سے میں نے پہلے ہی مہینے میں بارہ ہزار کا کام کیا''۔

''کام کیا کرنا پڑتا ہے''؟

''وہی مشینوں کی ایجنسی۔ طرح طرح کی مشینیں منگانا اور بیچنا''۔

روپ کماری کا منحوس گھر آگیا۔ دروازے پر ایک لال ٹین ٹمٹما رہی تھی۔ اس کے شوہر بابو اُما ناتھ دروازے پر ٹہل رہے تھے۔ روپ کماری اُتری۔ مگر اس نے گرو سیوک سے آنے کے لیے اصرار نہ کیا۔ بے دلی سے کہا ضرور، مگر زور نہ دیا۔ اور اُما ناتھ تو مخاطب ہی نہ ہوئے۔

روپ کماری کو وہ گھر اب قبرستان سا لگ رہا تھا۔ جیسے پھوٹا ہوا نصیب ہو۔ نہ کہیں فرش، نہ فرنیچر، نہ گھملے۔ دو چار ٹوٹی ٹاٹی کرسیاں، ایک لنگڑی میز، چار پانچ پُرانی دُھرانی کھاٹیں۔ یہی اس گھر کی بساط تھی۔ آج صبح تک روپ کماری اس گھر میں خوش تھی۔ لیکن اب اس گھر سے اسے مطلق دلچسپی نہ رہی۔ لڑکے اماں اماں کرکے دوڑے۔ مگر اس نے دونوں کو جھڑک دیا۔ سر میں درد ہے۔ وہ کسی سے نہ بولے گی۔ ابھی تک کھانا نہیں پکّا۔ پکاتا کون؟ لڑکوں نے تو دودھ پی لیا ہے۔ مگر اُما ناتھ نے کچھ نہیں کھایا۔ اسی انتظار میں تھے کہ روپ کماری آئے تو پکائے۔ مگر روپ کماری کے سر میں درد ہے۔ مجبوراً بازار سے پوریاں لانی پڑیں گی۔

روپ کماری نے ملامت آمیز انداز سے کہا۔ ''تم اب تک میرا انتظار کیوں کرتے رہے۔ میں نے کھانا پکانے کا ٹھیکہ تو نہیں لیا ہے۔ اور جو رات بھر وہیں رہ جاتی؟ آخر تم ایک مہاراجن کیوں نہیں رکھ لیتے۔ یا زندگی بھر مجھے کو پیستے رہو گے''؟

اُما ناتھ نے اس کی طرف مظلوم اور پر سوال حیرت کی نگاہ ڈالی۔ اس کی برہمی کا کوئی سبب ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ روپ کماری سے انھوں نے ہمیشہ بے عذر اطاعت پائی ہے۔ بے عذر ہی نہیں۔ خوش دلانہ بھی۔ انھوں نے کئی بار اس سے مہراجن رکھ لینے کی تجویز اور خواہش کی تھی۔ مگر اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ آخر میں بیٹھے بیٹھے کیا کروں گی۔ چار پانچ روپیہ کا خرچ بڑھانے سے کیا فائدہ۔ یہ رقم تو بچ رہے گی، تو بچو کے لیے مکھن آجائے گا۔ اور آج وہ اتنی بے دردی سے شکایت کر رہی ہے۔

اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولے۔ ''مہراجن رکھنے کے لیے میں نے تم سے کئی بار کہا''۔

''تو لاکر کیوں نے دیا۔ میں اسے نکال دیتی تو کہتے''۔

''ہاں یہ غلطی ہوئی''۔

''تم نے کبھی سچے دل سے نہیں کہا۔ محض مہراجن لینے کے لیے کہا۔ تمھارے دل میں کبھی میرے آرام کا خیال آیا ہی نہیں۔ تم تو خوش تھے کہ اچھی لونڈی مل گئی ہے، ایک روٹی کھاتی ہے، اور چپ چاپ پڑی رہتی ہے۔ اتنی سَستی لونڈی اور کہاں ملتی۔ محض کھانے اور کپڑے پر۔ وہ بھی جب گھر بھر کی ضرورتوں سے بچے۔ پچھتّر روپلّیاں لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دیتے ہو، اور ساری دنیا کا خرچ۔ میرا ہی دل جانتا ہے کہ مجھے کتنی کتر بیونت کرنی پڑتی ہے۔ کیا پہنوں اور کیا اوڑھوں، تمھارے ساتھ زندگی خراب ہوگئی۔ وہ مرد ہی ہوتے ہیں، جو بیویوں کے لیے آسمان کے تارے توڑ لاتے ہیں۔ گرو سیوک ہی کو دیکھو تم سے کم پڑھا ہے۔ عمر میں تم سے کہیں کم ہے۔ مگر پانچ سو روپیہ مہینہ لاتا ہے، اور رام دلاری رانی بنی بیٹھی رہتی ہے۔ تمھارے لیے یہ ہی پچھتّر بہت ہے۔ رانڈ مانڈ میں ہی خوش۔ تم ناحق مرد ہوئے، تمھیں تو عورت ہونا چاہیے تھا۔ اوروں کے دل میں کیسے کیسے ارمان ہوتے ہیں، مگر میں تو تمھارے لیے گھر کی مرغی باسی ساگ ہوں۔ تمھیں تو کوئی تکلیف ہوتی نہیں۔ تمھیں تو کپڑے بھی اچھے چاہئیں، کھانا بھی اچھا چاہیے۔ کیونکہ تم مرد ہو۔ باہر سے کما کر لاتے ہو۔ میں چاہے جیسے رہوں تمھاری بلا سے...''

یہ سلسلہ کئی منٹ تک جاری رہا۔ اور بے چارے اماناتھ خاموش سنتے رہے۔ اپنی دانست میں انھوں نے روپ کماری کو شکایت کا کوئی موقعہ نہیں دیا۔ ان کی تنخواہ کم ہے ضرور، مگر یہ ان کے بس کی بات تو نہیں۔ وہ دل لگا کر اپنا کام کرتے ہیں۔ افسروں کو خوش رکھنے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں۔ اس سال بڑے بابو کے چھوٹے صاحبزادے کو چھ مہینہ تک بلا ناغہ پڑھایا۔ اسی لیے تو کہ وہ خوش رہیں۔ اب اور کیا کریں۔ روپ کماری کی برہمی کا راز تو انھیں معلوم ہو گیا۔ اگر گرو سیوک واقعی پانچ سو روپیہ لاتا ہے، تو بے شک خوش نصیب ہے۔ لیکن دوسروں کی اونچی پیشانی دیکھ کر اپنا ماتھا تو نہیں پھوڑا جاتا۔ اسے یہ موقعہ مل گیا۔ دوسروں کو ایسے موقعے کہاں ملتے ہیں۔ وہ تحقیق کریں گے کہ واقعی

اسے پانچ سو ملتے ہیں، یا محض گپ ہے۔ اور بالفرض ملتے ہی ہوں، تو اس سے کیا روپ کماری کو یہ حق ہے کہ وہ انھیں نشانۂ ملامت بنائے۔ اگر اسی طرح روپ کماری سے زیادہ حسین، زیادہ خوش سلیقہ عورت دیکھ کر اسے کوسنا شروع کر دیں تو کیسا ہو۔ روپ کماری حسین ہے، شیریں زبان ہے۔ خوش مزاق ہے۔ بے شک! لیکن اس سے زیادہ حسین، زیادہ شیریں زبان، زیادہ خوش مذاق عورت دنیا میں معدوم نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا۔ جب ان کی نظروں میں روپ کماری سے زیادہ حسین عورت دنیا میں نہ تھی۔ لیکن وہ جنون اب باقی نہیں رہا۔ جذبات کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آئے نہیں۔ ایک مدّت گزر گئی۔ اب تو انھیں ازدواجی زندگی کا کافی تجربہ ہے۔ ایک دوسرے کے عیب و ہنر معلوم ہو گئے ہیں۔ اب تو صابر و شاکر رہ کر ہی ان کی زندگی عافیت سے کٹ سکتی ہے۔ روپ کماری اتنی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھتی۔

پھر بھی انھیں روپ کماری سے ہمدردی ہوئی۔ اس کی سخت کلامیوں کا انھوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ شربت کی طرح پی گئے۔ اپنی بہن کا ٹھاٹ دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے روپ کماری کے دل میں ایسے دل شکن، مایوس کن، غیر منصفانہ خیالات کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ وہ کوئی فلا سفر نہیں۔ تارک الدنیا نہیں کہ ہر حال میں اپنے طبعی سکون کو قائم رکھے۔ اس طرح اپنے دل کو سمجھا کر اماناتھ دریافت حال کی مہم کے لیے آمادہ ہو گئے۔

(2)

ایک ہفتہ تک روپ کماری ہیجان کی حالت میں رہی۔ بات بات پر جھنجلاتی، لڑکوں کو ڈانٹتی، شوہر کو کوستی۔ اپنی تقدیر کو روتی۔ گھر کا کام تو کرنا ہی پڑتا تھا، ورنہ نئی آفت آجاتی۔ لیکن اب کسی کام سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ گھر کی جن پُرانی دُھرانی چیزوں سے اسے دلی تعلّق ہو گیا تھا، جن کی صفائی اور سجاوٹ میں وہ منہمک رہا کرتی تھی۔ ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ گھر میں ایک ہی خدمت گار تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ بہو جی گھر کی طرف سے خود ہی لاپرواہ ہیں، تو اسے کیا غرض تھی کہ صفائی کرتا۔ دونوں بچے بھی ماں سے بولتے ڈرتے تھے۔ اور اما ناتھ تو اس کے سایہ سے بھاگتے تھے۔ جو کچھ سامنے آجاتا۔ زہر مار کر کھا لیتے اور دفتر چلے جاتے۔ دفتر سے لوٹ کر

دونوں بچوں کو ساتھ لے لیتے اور کہیں گھومنے نکل جاتے۔ روپ کماری سے کچھ بولتے روح فنا ہوتی تھی۔ ہاں ان کی تفتیش جاری تھی۔

ایک دن اما ناتھ دفتر سے لوٹے تو ان کے ساتھ گر سیوک بھی تھے۔ روپ کماری نے آج کئی دن کے بعد زمانہ سے مصالحت کر لی تھی۔ اور اس وقت سے جھاڑن لیے کرسیاں اور تپائیاں صاف کر رہی تھی کہ گرو سیوک نے اسے اندر پہنچ کر سلام کیا۔ روپ کماری دل میں کٹ گئی۔ اماناتھ پر بے حد غصہ آیا۔ انھیں لاکر یہاں کیوں کھڑا کر دیا۔ نہ کہنا نہ سننا۔ بس بلا لائے اسے، اس حالت میں دیکھ کر گرو سیوک نے دل میں کیا سمجھا ہوگا۔ مگر انھیں عقل آئی ہی کب تھی۔ وہ اپنا پردہ ڈھانکتی پھرتی ہے۔ اور آپ اسے کھولتے پھرتے ہیں۔ ذرا بھی شرم نہیں۔ جیسے بے حیائی کا جامہ پہن لیا ہے۔ خواہ مخواہ سے ذلیل کرتے ہیں۔

دعا دے کر عافیت پوچھی اور کرسی رکھ دی۔ گرو سیوک نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ آج بھائی صاحب نے میری دعوت کی ہے۔ میں ان کی دعوت پر تو نہ آتا لیکن انھوں نے کہا کہ تمھاری بھابی کا سخت تقاضا ہے۔ تب مجھے وقت نکالنا پڑا۔

روپ کماری نے بات بنائی۔ ''تم سے اس دن رواروی میں ملاقات ہوئی، دیکھنے کو جی لگا ہوا تھا''۔

گروسیوک نے درو دیوار پر نظر ڈال کر کہا۔ ''اس پنجرے میں تو آپ لوگوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی''۔

روپ کماری کواب معلوم ہوا کہ یہ کتنا بد مذاق ہے۔ دوسروں کے جذبات کی اسے بالکل پرواہ نہیں۔ یہ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتا کہ دنیا میں سبھی تقدیر والے نہیں ہوتے۔ لاکھوں میں کہیں ایک ایسا ہی بھگوان نکلتا ہے۔ کسی قدر ترش ہو کر بولی ''پنجرے میں رہنا کٹگھرے میں رہنے سے اچھا ہے۔ پنجرے میں معصوم چڑیاں رہتی ہیں۔ کٹگھرے تو درندوں کا مسکن ہوتا ہے''۔

گرو سیوک کنا یہ نہ سمجھ سکا بولا۔ مجھے تو اس گھر میں حبس ہو جائے۔ دَم گھٹ جائے۔ میں آپ کے لیے اپنے گھر کے پاس ایک گھر طے کر دوں گا، خوب لمبا چوڑا۔ آپ سے کچھ کرایہ نہ لیا جائے گا۔ مکان ہماری مالکن کا ہے۔ میں بھی تو اسی کے مکان

میں رہتا ہوں۔ سینکڑوں مکان ہیں اس کے پاس سینکڑوں۔ سب میرے اختیار میں ہیں۔ جس کو جو مکان چاہوں دے دوں، میرے اختیار میں ہے، کرایہ لوں یا نہ لوں۔ میں آپ کے لیے اچھا سا مکان ٹھیک کر دوں گا۔ جو سب سے اچھا ہے۔ میں آپ کا بہت ادب کرتا ہوں....''

روپ کماری سمجھ گئی، حضرت اس وقت نشہ میں ہیں، جب ہی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں سکڑ گییں۔ رخسار سے کچھ پھول گئے تھے۔ زبان میں ہلکی سی لغزش تھی۔ جو ہر لمحہ نمایاں ہوتی جاتی تھی۔ ایک جوان، خوبصورت، شریف چہرہ رکیک اور بے غیرت بن گیا تھا۔ جسے دیکھ کر نفرت ہوتی تھی۔

اس نے ایک لمحہ بعد پھر بہکنا شروع کیا۔ ''میں آپ کا بہت ادب کرتا ہوں۔ آپ میری بڑی بھابی ہیں۔ آپ کے لیے میری جان حاضر ہے۔ آپ کے لیے مکان کا انتظام کرنا میرے لیے کچھ مشکل نہیں۔ میں مسز لوہیا کا مختار ہوں۔ سب کچھ میرے اختیار میں ہے۔ سب کچھ جو کچھ کہتا ہوں، وہ آنکھیں بند کرکے منظور کر لیتی ہے۔ مجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہے۔ میں اس کی ساری جائداد کا مالک ہوں۔ مسٹر لوہیا نے مجھے بیس روپیہ کا نوکر رکھا تھا۔ بڑا مالدار آدمی تھا۔ مگر یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کی دولت کہاں سے آتی تھی۔ کسی کو معلوم نہیں۔ میرے سوا کوئی جانتا نہیں، وہ خفیہ فروش تھا۔ کسی سے کہنا نہیں۔ وہ خفیہ فروش تھا۔ کوکین بیچتا تھا۔ لاکھوں کی آمدنی تھی اس کی۔ میں اب بھی وہی کام کرتا ہوں۔ ہر شہر میں ہمارے ایجنٹ ہیں۔ مسٹر لوہیا نے مجھے اس فن میں یکتا کر دیا۔ جی ہاں مجال نہیں کہ کوئی مجھے گرفتار کر لے بڑے بڑے افسروں سے میرا یا رانہ ہے۔ ان کے منہ میں نوٹوں کے پلندے ٹھونس ٹھونس کر ان کی آواز بند کر دیتا ہوں۔ کوئی چوں نہیں کر سکتا۔ حساب میں لکھتا ہوں ایک ہزار، دیتا ہوں پانچ سو، باقی یاروں کا ہے۔ بے دریغ روپے آتے ہیں اور بیدریغ خرچ کرتا ہوں۔ بڑھیا کو تو رام نام سے مطلب ہے، سادھو سنتوں کی سیوا میں لگی رہتی ہے۔ اور بندہ چین کرتا ہے۔ جتنا چاہوں خرچ کروں، کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں، کوئی بولنے والا نہیں۔ (جیب سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر) یہ آپ کے قدموں کا صدقہ ہے۔ مجھے دعا دیجیے جو ایمان اور اصول کے اپاسک ہیں، انھیں دولت لات مارتی ہے۔ دولت تو انھیں پکڑتی ہے جو اس کے لیے اپنا دین اور

ایمان سب کچھ نثار کرنے کو تیار ہیں۔ مجھے بُرا نہ کہیے۔ جتنے دولت مند ہیں، سب لُٹیرے ہیں۔ میں بھی انھیں میں ایک ہوں۔ کل میرے پاس روپے ہو جائیں، اور میں ایک دھر مسالہ بنوادوں پھر دیکھیے میری کتنی واہ وا ہوتی ہے۔ کون پوچھتا ہے۔ کون پوچھتا ہے مجھے یہ دولت کہاں سے ملی۔ ایک وکیل گھنٹہ بھر بحث کر کے ایک ہزار سیدھا کر لیتا ہے۔ ایک ڈاکٹر ذرا سانشتر لگا کر پانچسو روپیہ مار لیتا ہے۔ اگر ان کی آمدنی جائز ہے، تو میری آمدنی بھی جائز ہے۔ جی ہاں جائز ہے۔ ضرورت مندوں کو لوٹ کر مالدار ہو جانا ہماری سوسائٹی کا پُرانا دستور ہے۔ میں بھی وہی کرتا ہوں، جو دوسرے کرتے ہیں۔ زندگی کا مقصد ہے، عیش کرنا۔ میں بھی لُوٹوں گا، عیش کروں گا اور خیرات کروں گا۔ اور ایک دن لیڈر بن جاؤں گا۔ کہئے تو گنوادوں، یہاں کتنے لوگ جوا کھیل کر کروڑ پتی ہو گئے۔ کتنے عورتوں کا بازار لگا کر کروڑ پتی ہو گئے...''

اماناتھ نے آکر کہا۔ ''مسٹر گرو سیوک کیا کر رہے ہو چلو، چائے پی لو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے''۔

گرو سیوک اٹھا۔ پیر لڑکھڑائے۔ اور زمین پر گر پڑا۔ پھر سنبھل کر اٹھا، اور جھومتا جھامتا ٹھوکریں کھاتا باہر چلا گیا۔ روپ کماری نے آزادی کا سانس لیا۔ یہاں بیٹھے بیٹھے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ کمرہ کی ہوا جیسے کچھ بھاری ہو گئی تھی۔ جو ترغیبیں کئی دن سے اچھے اچھے دل آویز روپ بھر کر اس کے سامنے آرہی تھیں۔ آج اسے ان کی اصلی مکر وہ گھناؤنی صورت نظر آئی۔ جس سادگی، خلوص اور ایثار کی فضا میں اب تک زندگی گزری تھی۔ اس میں حرا مکاری اور ابلہ فریبی کا گزر نہ تھا۔ ان داموں وہ دنیا کی ساری دولت اور سارا عیش بھی خریدنے کو آمادہ نہ ہو سکتی تھی۔ اب وہ رام دُلاری کی تقدیر سے اپنی تقدیر کا بدلہ نہ کرے گی۔ وہ اپنے حال میں خوش ہے۔ رام دُلاری پر اسے رحم آیا، جو نمود و نمائش کے لیے اپنے ضمیر کا خون کر رہی ہے۔ مگر ایک ہی لمحہ میں گرو سیوک کی طرف سے اس کا دل نرم پڑ گیا۔ جس سوسائٹی میں دولت پجتی ہے، جہاں انسان کی قیمت اس کے بینک اکاؤنٹ اور اس کا شان و شوکت سے آنکی جاتی ہے، جہاں قدم قدم پر ترغیبوں کا جال بچھا ہوا ہے اور سوسائٹی کا نظام اتنا بے ڈھنگا ہے کہ انسان میں حسد، غصب اور فرومائے گی کے جذبات کو اُکساتا رہتا ہے۔ وہاں گرو سیوک اگر رَو میں

بہ جائے تو تعجب کا مقام نہیں۔

اس وقت اُماناتھ نے آکر کہا۔ ''یہاں بیٹھا بیٹھا کیا بک رہا تھا۔ میں نے تو اسے رخصت کر دیا۔ جی ڈرتا تھا، کہیں اس کے پیچھے پولیس نہ لگی ہو۔ کہیں میں ناکردہ گناہ پکڑا نہ جاؤں''۔

روپ کماری نے اس کی طرف معذرت خواہانہ نظر سے دیکھ کر جواب دیا۔ ''وہی اپنی خفیہ فروشی کا ذکر کر رہا تھا''۔

''مجھے بھی مسز لوہیا سے ملنے کی دعوت دے گیا ہے، شاید کوئی اچھی جگہ مل جائے''۔

''جی نہیں! آپ اپنی کلرکی کیے جائے۔ اسی میں آپ کی خیریت ہے''۔

''مگر کلرکی میں عیش کہاں؟ کیوں نہ سال بھر کی رخصت لے کر، ذرا ادھر کا بھی لطف اٹھاؤں''۔

''مجھے اب وہ ہوس نہیں رہی''۔

''میں تم سے آکر یہ قصہ کہتا تو تمھیں یقین نہ آتا''۔

''ہاں یقین تو نہ آتا۔ میں تو قیاس بھی نہ کرسکتی کہ اپنے فائدے کے لیے کوئی آدمی دنیا کو زہر کھلا سکتا ہے''۔

''مجھے سارا قصّہ معلوم ہو گیا تھا۔ میں نے اسے خوب شراب پلادی کہ نشہ میں بہکے گا اور سب کچھ خود قبول کرے گا''۔

''للچائی تو تمھاری طبیعت بھی تھی''؟

''ہاں للچاتی تو ہے۔ مگر عیب کرنے کے لیے جس ہنر کی ضرورت ہے وہ کہاں سے لاؤں گا؟''

''ایشور نہ کرے وہ ہنر تم میں آئے۔ مجھے تو اس بے چارے پر ترس آتا ہے۔ معلوم نہیں راستہ میں اس پر کیا گزری۔''؟

''نہیں۔ وہ تو اپنی کار پر تھے''۔

روپ کماری ایک منٹ تک زمین کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

''تم مجھے دلاری کے گھر پہنچا دو۔ ابھی شاید میں اس کی مدد کرسکوں۔ جس باغ

کی وہ سیر کر رہی ہے۔ اس کے چاروں طرف درندے گھات لگائے بیٹھے ہوئے ہیں، شاید میں اسے بچا سکوں''۔

(یہ افسانہ 'عصمت' میں ستمبر، اکتوبر 1935 میں شائع ہوا پھر لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ 'مادھوری' کے اگست 1936 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مجموعہ 'کفن' میں شامل ہے اور میں یہ 'دودھ کی قیمت' میں شائع ہوا۔)

میری، پہلی رچنا

اس وقت میری عمر کوئی ۱۳ سال کی رہی ہوگی۔ ہندی بالکل نہ جانتا تھا۔ اردو کے ناول پڑھنے کا انماد تھا۔ مولانا شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا رسوا، مولوی محمد علی ہردوئی نواسی اس وقت کے مقبول ناول نگار تھے۔ ان کی کتابیں مل جاتی تھیں، اسکول کی یاد بھول جاتی تھی، اور کتاب ختم کرکے ہی دم لیتا تھا۔ اس زمانے میں رینالڈ کے ناولوں کی دھوم تھی۔ اردو میں ان کے تراجم دھڑا دھڑ نکل رہے تھے اور ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے۔ میں بھی ان کا عاشق تھا۔ حضرت ریاض مرحوم نے (جو اردو کے مشہور شاعر تھے اور جن کا حال میں انتقال ہوا ہے) رینالڈ کی ایک کتاب کا ترجمہ 'حرم سرا' کے نام سے کیا تھا۔ اُس زمانے میں لکھنؤ کے ہفتہ وار اودھ پنچ کے ایڈیٹر مولانا سجاد حسین مرحوم نے، جو طنز ومزاح کے مشہور فنکار تھے، رینالڈ کے دوسرے ناول کا ترجمہ 'دھوکا' یا 'طلسمی فانوس' کے نام سے کیا تھا۔ یہ ساری کتابیں میں نے اسی زمانے میں پڑھیں اور پنڈت رتن ناتھ سرشار سے تو میری پیاس ہی نہ بجھتی تھی۔ ان کی ساری تصانیف میں نے پڑھ ڈالیں۔ ان دنوں میرے والد گورکھپور میں رہتے تھے اور میں بھی گورکھپور ہی کے مشن اسکول میں آٹھویں میں پڑھتا تھا، جو تیسرا درجہ کہلاتا تھا۔ ریتی پر ایک بک سیلر بُدھی لال نام کا رہتا تھا۔ میں اس کی دوکان پر جا بیٹھتا تھا اور اس کے اسٹاک سے ناول لے لے کر پڑھتا تھا۔ مگر دوکان پر سارا دن تو بیٹھ نہ سکتا تھا، اس لیے میں اس کی دوکان سے انگریزی کتابوں کی کنجیاں اور نوٹس لے کر اپنے اسکول کے لڑکوں کے ہاتھ بیچا کرتا تھا اور اس کے معاوضے میں دکان سے ناول گھر لاکر پڑھتا تھا۔ دو تین برسوں میں میں نے سیکڑوں ناول پڑھ ڈالے ہوں گے۔ جب ناول کا اسٹاک ختم ہوگیا تو میں نے نول کشور پریس سے نکلے ہوئے پرانوں کے اردو ترجمے بھی پڑھے اور طلسم ہوش ربا کی کئی جلدیں پڑھیں۔ اس ضخیم طلسمی کتاب کی 17 جلدیں اس وقت نکل چکی تھیں اور ایک جلد بڑے

سپر رائل سائز کے دو دو ہزار صفحوں سے کم نہ ہوں گی اور ان ۱۷ جلدوں کے علاوہ اسی کتاب کی 25 جلدیں اور چھپ چکی تھیں، ان میں سے بھی میں نے پڑھیں۔ جس نے اتنی بڑی ضخیم کتاب تخلیق کی اُس کا تخیل کتنا بلند ہوگا۔ اس کا صرف اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کہتے ہیں یہ داستانیں مولانا فیضی نے اکبر کی فرمائش پر فارسی میں لکھی تھیں۔ اس میں کتنی صداقت ہے، کہہ نہیں سکتا۔ لیکن اتنی ضخیم داستان شاید ہی دنیا کی کسی دوسری زبان میں ہو۔ پوری انسائیکلوپیڈیا سمجھ لیجیے۔ ایک آدمی تو اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں انھیں نقل کرنا چاہیے تو نہیں کرسکتا تخلیق کرنا تو دور کی بات ہے۔

میرے ناطے کے ایک ماموں ،کبھی کبھی ہمارے یہاں آیا کرتے تھے۔ ادھیڑ ہوگئے تھے، لیکن ابھی تک غیر شادی شدہ تھے۔ پاس میں تھوڑی سی زمین تھی ،مکان تھا،لیکن بیوی کے بغیر سب کچھ سُونا سُونا تھا۔ اس لیے گھر پر دَل نہ لگتا تھا، ناتے داروں میں گھوُما کرتے تھے،اور سب سے یہی اُمید رکھتے تھے کہ اُن کی شادی کرادیں۔اس کے لیے سَو دوسَو خرچ کرنے کو بھی تیار تھے۔ اُن کی شادی کیوں نہیں ہوئی؟ یہ تعجب کی بات تھی ،اچھے خاصے تندرُست وتوانا آدمی تھے، بڑی بڑی مونچھیں، اوسط قد، سانولا رنگ، گانجا پیتے تھے، اس سے آنکھیں لال رہتی تھیں۔ اپنے ڈھنگ کے مذہبی آدمی تھے، شیو جی کو روزانہ جل چڑھاتے تھے اور مانس مچھلی نہیں کھاتے تھے۔

آخر ایک بار اُنھوں نے بھی وہی کیا، جوغیر شادی شدہ لوگ اکثر کیا کرتے ہیں! ایک چمارن کی نظروں کے تیروں سے گھائل ہوگئے، وہ اُن کے یہاں گوبر پاتھنے، بیلوں کو سانی پانی دینے اور اسی طرح کے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے نوکر تھی، جوان تھی چھبیلی تھی، ماموں صاحب کا پیاسا دل میٹھے جل کی دھار دیکھتے ہی پھسل گیا۔ باتوں باتوں میں اُس سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ وہ اِن کے دِل کی بات تاڑ گئی، ایسی الھڑ نہ تھی ،اَور نخرے کرنے لگی۔ بالوں میں تیل بھی پڑنے لگا چاہے سرسوں ہی کا کیوں نہ ہو۔ آنکھوں میں کاجل بھی چمکا ،ہونٹوں پر مسّی بھی آئی اور کام میں ڈِھلائی بھی شروع ہوئی،کبھی دوپہر کوآئی اور جھلک دِکھا کر چلی گئی،کبھی شام کوآئی اور ایک تیر چلا کر چلی گئی۔ بیلوں کو سانی پانی ماموں صاحب خود دے دیتے تھے۔ گوبر دوسرے اُٹھالے جاتے تھے،جوان عورت سے بگوتے کیوں کر؟ وہاں تو اب محبت طلوع ہوگئی تھی۔ ہولی میں

اُسے روایت کے مُطابق ایک ساڑی دی مگر اب کے گزی کی ساڑی نہ تھی، خوب خوب سی سوا دو روپے کی چُندری تھی۔ ہولی کی تیوہاری بھی معمول سے چوگنی کردی اور یہ سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ وہ چمارن ہی گھر کی مالکن ہوگئی۔

ایک دن شام کو چماروں نے آپس میں پنچایت کی۔ بڑے آدمی ہیں، تو ہوا کریں، کیا کسی کی عزت لیں گے؟ ایک اِن لالا کے باپ تھے کہ کبھی کسی عورت کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا (حالاں کہ یہ سراسر غلط تھا) اور ایک یہ ہیں کہ نیچ ذات کی بہو بیٹیوں پر ڈورے ڈالتے ہَیں، سمجھانے بُجھانے کا موقع نہ تھا۔سمجھانے سے لالامانیں گے تو نہیں، اُلٹے اور کوئی مُعاملہ کھڑا کردیں گے۔اِن کے قلم گھُمانے کی دیر ہَے،اِس لیے فیصلہ ہوا کہ لالاصاحب کو ایسا سبق دینا چاہیے کہ ہمیشہ کے لیے یاد ہوجائے۔عزت کا بدلہ خوُن ہی سے چُکتا ہَے۔لیکن مرمّت سے بھی اس کی کُچھ تلافی ہوسکتی ہے۔

دوسرے دِن شام کو چمپا ماموں صاحب کے گھر آئی، تو انھوں نے اندر کا دروازہ بند کر دیا۔مہینوں کی اُدھیڑ بن ہچکچاہٹ اَور مذہبی کش مکش کے بعد آج ماموٗں صاحب نے اپنی محبت کو عملی شکل دینے کا فیصلہ کیا تھا۔چاہے کُچھ ہوجائے، خاندان کی عزت رہے یاجائے،باپ دادا کا نام ڈوبے یاترے!

چماروں کا جتھا تاک میں تھا ہی۔ اُدھر کواڑ بند ہوئے،اُدھر انھوں نے کھٹکھٹانا شُروع کیا۔ پہلے ماموٗں صاحب نے سمجھا، کوئی اسامی ملنے آیا ہوگا، کِواڑ بند پاکر لوٹ جائے گا۔ لیکن جب آدمیوں کا شور و غل سنا تو گھبرائے جاکر کِواڑوں کی دراز سے جھانکا،کوئی بیس پچیس چمار لاٹھیاں لیے ،دروازہ روکے کھڑے کِواڑکو توڑنے کی کوشش کررہے تھے، اب کریں تو کیا کریں؟ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں، چمپا کو چھپانہیں سکتے سمجھ گئے کہ شامت آگئی۔ عاشقی اتنی جلدی گُل کھلائے گی،یہ کیاجانتے تھے، ورنہ اِس چمارن پر دِل آنے ہی کیوں دیتے۔ اُدھر چمپا اِنھیں کوکوس رہی تھی!تُمھارا کیا بگڑے گا، میری تو عزت لُٹ گئی۔ گھروالے سر ہی کاٹ کر چھوڑیں گے۔ کہتی تھی، ابھی کِواڑ بند نہ کرو، ہاتھ پانو جوڑتی تھی، مگر تُمھارے سر پر تو بھوت سوار تھا۔ لگی مُنھ میں کالک کہ نہیں؟

ماموٗں صاحب بے چارے اِس کوچے میں کبھی نہ آئے تھے۔ کوئی پکا کھلاڑی ہوتا،

تو سوطریقے نکال لیتا، لیکن اُن کی تو جیسے سِٹّی پِٹّی بھول گئی۔ برامدے میں تھر تھر کانپتے ہنومان چالیسا کا پاٹھ کرتے ہوئے کھڑے تھے۔ کُچھ نہ سوجھتا تھا اور ادھر دروازے پر شور بڑھتا جارہا تھا۔ یہاں تک کہ سارا گاؤں جمع ہوگیا۔ برہمن، ٹھاکر، کائستھ، سبھی تماشا دیکھنے اور ہاتھ کی کُھجلی مِٹانے آپہنچے۔ اِس سے زیادہ دِل کش اور زندگی افروز تماشا اَور کیا ہوگا کہ ایک مرد اور ایک عورت کو ساتھ ساتھ گھر میں بند پایا جائے۔ بڑھئی بُلایا گیا، کِواڑ پھاڑے گئے اور ماموں صاحب بھوسے کی کوٹھری میں چھپے ہوئے ملے۔ چمپا آنگن میں کھڑی رو رہی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی بھاگی۔ اُس سے کوئی نہیں بولا۔ ماموں صاحب بھاگ کر کہاں جاتے؟...... وہ جانتے تھے کہ اُن کے لیے بھاگنے کا راستہ نہیں ہے۔ مار کھانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ مار پڑنے لگی اور بے بھاؤ کی پڑنے لگی۔ جس کے ہاتھ جو کچھ لگا جوتا، چھڑی، چھاتا، لات، گھونسا، سبھی ہتھیار چلے۔ یہاں تک کہ ماموں صاحب بے ہوش ہوگئے اور لوگوں نے انھیں مُردہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اب اِتنی دُرگت کے بعد وہ بچ بھی گئے، تو گاؤں میں نہیں رہ سکتے اور ان کی زمین پٹّی داروں کے ہاتھ آئے گی۔

ایک مہینے تک تو وہ ہلدی اور گُڑ پیتے رہے۔ جوں ہی چلنے پھرنے کے لائق ہوئے، ہمارے یہاں آگئے۔ اپنے گاؤں والوں پر ڈاکے کا استغاثہ دائر کرنا چاہتے تھے۔

اگر انھوں نے کچھ انکساری دکھائی ہوتی، تو شاید مجھے ہمدردی ہوجاتی، لیکن اُن کا وہی دم خم تھا۔ مجھے کھیلتے یا ناول پڑھتے دیکھ کر بگڑنا اور رُعب جمانا اور والدِ صاحب سے شکایت کرنے کی دھمکی دینا، یہ اب میں کیوں سہنے لگا؟ اب تو اُنھیں نیچا دکھانے کے لیے میرے پاس کافی مسالا تھا۔

آخر ایک دن میں نے یہ سارا حادثہ ایک ڈرامے کی شکل میں لِکھ دیا اور اپنے دوستوں کو سُنایا۔ سب کے سب خوب ہنسے۔ میرا حوصلہ بڑھا۔ میں نے اسے صاف صاف لِکھ کر وہ کاپی ماموں صاحب کے سرہانے رکھ دی اور اِسکول چلا گیا۔

دل میں کچھ ڈر بھی تھا۔ کچھ خوش بھی تھا اور کچھ گھبرایا ہوا بھی تھا۔ سب سے بڑا اچنبھا یہ تھا کہ ڈرامہ پڑھ کر ماموں صاحب کیا کہتے ہیں۔ اسکول میں جی نہ لگتا تھا۔ دل اِدھر ہی ٹنگا ہوا تھا۔ چھٹی ہوتے ہی گھر چلا گیا۔ مگر دروازے کے پاس آکر پاؤں رُک

گئے۔ ڈر لگا کہیں ماموں صاحب مجھے مار نہ بیٹھیں، لیکن اتنا جانتا تھا کہ وہ اکادھ تھپڑ سے زیادہ نہیں مار سکیں گے، کیوں کہ میں مار کھانے والے لڑکوں میں نہ تھا۔

مگر یہ معاملہ کیا ہے۔ ماموں صاحب چارپائی پر نہیں ہیں۔ جہاں وہ روز لیٹے ہوئے ملتے تھے کیا گھر چلے گئے؟ آکر کمرا دیکھا وہاں بھی سناٹا، ماموں صاحب کے جوتے، کپڑے گٹھری سب لا پتہ ۔اندر جاکر پوچھا معلوم ہوا کہ ماموں صاحب کسی ضروری کام سے گھر چلے گئے ہیں۔بھوجن تک نہیں کیا۔ میں نے باہر آکر سارا کمرا چھان مارا، مگر میرا ڈرامہ، میری وہ پہلی تخلیق کہیں نہ ملی۔ معلوم نہیں۔ ماموں صاحب نے اسے چراغ علی کے سپرد کردیا یا اپنے ساتھ سورگ لے گئے۔

(یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ 'ہنس' کے دسمبر 1935 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مجموعہ 'کفن' میں شامل ہے۔ اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔)

کفن

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نو جوان بیوی بدھیا دروازہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دلخراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی، فضا سناٹے میں غرق۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔ جا دیکھ تو آ۔

مادھودرد ناک لہجہ میں بولا مرنا ہی ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا کروں۔''

''تو بڑا بے درد ہے بے۔ سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اُسی کے ساتھ اتنی بیو پھائی''۔

''تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا''۔

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو پھر چلم پیتا۔ اس لیے انھیں کوئی رکھتا ہی نہ تھا۔ گھر میں مُٹھی بھر اناج بھی موجود ہو تو ان کے لیے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار سے بیچ لاتا۔ اور جب تک وہ پیسے رہتے دونوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آجاتی پھر لکڑیاں توڑتے، یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لیے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بُلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پاکر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انھیں قناعت اور توکل کے لیے ضبط نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی ان کی۔ گھر

میں مٹی کے دو چار برتوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی کو ڈھانکے ہوئے دنیا کی فکروں سے آزاد۔ قرض سے لدے ہوئے۔ گالیاں بھی کھاتے، مار بھی کھاتے۔ مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر لوگ انھیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اُکھاڑ لاتے اور بھون کر کھا لیتے۔ یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور رات کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی۔ اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھود لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا۔ مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اُس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے، گھاس چھیل کر، وہ سیر بھر آٹے کا انتظام کر لیتی تھی۔ اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی۔ یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے۔ بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ سے مر رہی تھی۔ اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ وہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا۔ ''جا کر دیکھ تو۔ کیا حالت ہے اُس کی۔ چڑیل کا پھساد ہوگا اور کیا۔ یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے۔''

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ بولا ''مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔''

''ڈر کس بات کا ہے میں تو یہاں ہوں ہی''

''تو تمھیں جا کر دیکھو نہ''

''میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اُس کے پاس سے ہلا بھی نہیں۔ اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں۔ کبھی اُس کا منہ نہیں دیکھا۔ آج اس کا اُگھرا ہوا بدن دیکھوں! اسے تن کی سدُھ بھی تو نہ ہوگی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ

پٹک سکے گی''۔

''میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ سونٹھ، گڑ، تیل، کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں''

''سب کچھ آجائے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو۔ جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بُلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے۔ گھر میں کبھی کچھ نہ تھا۔ مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا''۔

جس سماج میں رات دن محنت کرنے والوں کی حالت اُن کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی، اور کسانوں کے مقابلہ میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے، وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلہ میں زیادہ باریک بیں تھا۔ اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و آداب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لیے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے، اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اُسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم سے کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی، اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بیجا فائدہ تو نہیں اُٹھاتے۔

دونوں آلو نکال نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انھیں ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور حلق اور تالو کو جلا دیتا تھا اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی سامان تھے۔ اس لیے دونوں جلد جلد نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اُس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اُسے جو سیری نصیب ہوئی تھی، وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی۔ اور آج بھی اُس کی یاد تازہ تھی۔ بولا وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا

اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں۔ سب کو۔ چھوٹے بڑے، سب نے پوڑیاں کھائیں۔ اور اصلی گھی کی۔ چٹنی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ، ایک اسے دار ترکاری، چٹنی مٹھائی۔ اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو مانگو۔ اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے ایسا کھایا، ایسا کھایا، کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم، گول گول، مہکتی ہوئی کچوڑیاں ڈالے دیتے ہیں، منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے۔ پتّل کو ہاتھ سے روکے ہوئے ہیں۔ مگر وہ ہیں کہ دیے جاتے ہیں۔ اور جب سب نے منہ دھولیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا، مگر مجھے پان لینے کی کہاں سُدھ تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔''

''اب کوئی کیا کھلائے گا۔ وہ جمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے۔ سادی میں مت کھرچ کرو۔ کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھوگے! بٹورنے میں کوئی کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے''۔

''تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی!''۔

''بیس سے جیادہ کھائی تھیں''۔

''میں پچاس کھا جاتا''۔

''پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔ اچھا پٹھا تھا۔ تو اُس کا آدھا بھی نہیں ہے''۔ آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے، جیسے دو بڑے بڑے گینڈلیاں مارے پڑے ہوں۔

اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

(2)

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جاکر دیکھا تو اُس کی بیوی ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ اُس کے منہ پر بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس آیا۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والو ں نے یہ آہ وزاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا۔ کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اس طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں مانس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انھیں اپنے ہاتھوں پیٹ چکے تھے، چوری کی علت میں۔ وعدہ پر کام پر نہ آنے کی علت میں۔ پوچھا۔ کیا ہے بے گھسوا۔ روتا کیوں ہے۔ اب تو تیری صورت ہی نہیں نظر آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔

گھیسو نے زمین پر سر رکھ کر، آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا۔ ''سرکار، بڑی بپت میں ہوں۔ مادھوں کی گھر والی رات گجر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرھانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا سب کیا۔ آپ مُدا وہ ہمیں دگادے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا مالک، تباہ ہوگئے۔ گھر اُجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں۔ اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگا ئے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا وہ سب دوا دارو میں اُٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہوگی تو اس کی مٹی اٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں۔

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے۔ مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں ''چل دور ہو یہاں سے۔ لاش گھر میں رکھ کر سڑا۔ یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آکر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا۔ بدمعاش''۔ مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقعہ نہ تھا۔ طوعاً و کرہاً دو روپئے نکال کر پھینک دیے۔ مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں۔ گویا سر کا بوجھ اُتاراہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دیے تو گاؤں کے بنئے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیوں کر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام کا ڈھنڈھورا پیٹنا جانتا تھا۔ کسی نے دو آنے دیے، کسی نے چار آنے۔ ایک گھنٹہ میں گھیسو کے پاس پانچ روپیہ کی معقول رقم جمع ہو

گئی۔ کسی نے غلہ دے دیا، کسی نے لکڑی۔ اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے۔ ادھرلوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں آ آ کر لاش دیکھتی تھیں، اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

(3)

بازار میں پہونچ کر گھیسو بولا۔ ''لکڑی تو اُسے جلانے بھر کوئل گئی ہے۔ کیوں مادھو!''

مادھو بولا۔ ''ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کپھن چاہیے۔''

''تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں''

''ہاں اور کیا۔ لاس اُٹھتے اُٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کپھن کون دیکھتا ہے''۔

''کیسا بُرا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہیے''۔

''کپھن لاس کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے''۔

''اور کیا رکھا رہتا ہے۔ یہی پانچ روپیہ پہلے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے''۔

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آپہونچے۔ اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب لی۔ کچھ گزک۔ اور دونوں برامدہ میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کُجیاں پیم پینے کے بعد دونوں سرور میں آگئے۔

گھیسو بولا: ''کپھن لگانے سے کیا ملتا۔ آکھر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا''

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا: ''گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔ دنیا کا

دستور ہے یہیں لوگ بامہنوں کو ہجاروں روپئے کیوں دے دیتے ہیں۔ کون دیکھتا

ہے پر لوک میں ملتا ہے یا نہیں۔

''بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھنکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے''۔

''لیکن لوگوں کو جواب کیا دو گے! لوگ پوچھیں گے نہیں کپھن کہاں ہے''!

گھیسو ہنسا۔ کہہ دیں گے روپئے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے نہیں۔

مادھو بھی ہنسا اس غیر متوقعہ خوش نصیبی پر، قدرت کو اس طرح شکست دینے پر۔ بولا۔ بڑی اچھی تھی۔ بچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہوگئی۔ گھیسو نے دوسیر پوریاں منگوائیں، گوشت اور سالن۔ اور چٹ پٹی کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپئے خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے۔

دونوں اس وقت اِس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اُڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا، نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انھوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔ ''ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اُسے پُن نہ ہوگا؟''

مادھو نے فرق عقیدت جھکا کر تصدیق کی۔ جرور سے جرور ہوگا۔ بھگوان، تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اُسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہر دے سے اُسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔ بولا۔ ''کیوں دادا، ہم لوگ بھی تو وہاں ایک نہ ایک دن جائیں گے ہی۔''

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پر ملامت انداز سے دیکھا۔

''جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟''

''کہیں گے تمھارا سر''

''پوچھے گی تو جرور''

''تو کیسے جانتا ہے اُسے کپھن نہ ملے گا؟ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے! میں ساٹھ سال دنیا۔''

میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اُس کو کپھن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے''۔

مادھو کو یقین نہ آیا۔ ''بولا۔ کون دے گا؟روپئے تو تم نے چٹ کردیے؟''

گھیسو تیز ہو گیا۔ ''میں کہتا ہوں اُسے کپھن ملے گا۔ تو مانتا کیوں نہیں؟''

''کون دے گا۔ بتاتے کیوں نہیں''؟

''وہی لوگ دیں گے جنھوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپئے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے۔ اور اگر کسی طرح آجائیں تو پھر ہم اِسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے۔ اور کپھن تیسری بار ملے گا''۔

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی، مے خانے کی رونق بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا، کوئی بہکتا تھا، کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا۔ کوئی اپنے دوست کے منہ میں ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا۔ ہوا میں نشہ۔ کتنے تو چلّو میں اُلّو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آتے تھے صرف خود فرا موشی کا مزہ لینے کے لیے، شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی۔ اور کچھ دیر کے لیے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں، یا مُردہ ہیں، یا زندہ در گور ہیں۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزے لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں اِن کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہوکر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتّل اُٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا جو کھڑا اِن کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور ''دینے'' کے غرور اور مسرت اور ولولہ کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا۔ ''لے جا۔ کھوب کھا اور اسیر باد دے۔ جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی۔ مگر تیرا اسیر باد اُسے جرور پہونچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے اسیر باد دے۔ بڑی

گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ بیکنٹھ میں جائے گی دادا! بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔

گھیسو کھڑا ہو گیا او رجیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔ ''ہاں بیٹا، بیکنٹھ میں جائے گی۔ کسی کو ستایا نہیں۔ کسی کو دبایا نہیں۔ مرتے مرتے ہماری جندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں۔ اور اپنے پاپ کو دھونے کے لیے گنگا میں جاتے ہیں اور مندروں میں جل چڑھاتے ہیں۔''

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بھی بدلا۔ تلون نشہ کی خاصیت ہے۔ یاس اور غم کا دورہ ہوا۔ مادھو بولا۔ ''مگر دادا بچاری نے جندگی میں بڑا دُکھ بھوگا۔ مری بھی کتنا دُکھ جھیل کر۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔''

گھیسو نے سمجھایا۔ ''کیوں روتا ہے بیٹا۔ کھُس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہوگئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلد مایا موہ کے بندھن توڑ دیے۔

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔

ٹھگنی کیوں نینا جھمکاوے۔ ٹھگنی۔

سارا میخانہ محو تماشہ تھا اور یہ دونوں مکش مخمور محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اُچھلے بھی، کودے بھی، مٹکے بھی۔ بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

(یہ افسانہ دلّی کے رسالہ 'جامعہ' کے دسمبر 1935 شمارے میں شائع ہوا۔ کسی اردو کے مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ ہندی میں اسی نام کے مجموعہ میں شامل ہے۔)

ہولی کی چھٹی

ورنیکلر فائنل پاس کرنے کے بعد مجھے ایک پرائمری مدرسہ میں جگہ مل گئی تھی جو میرے گھر سے گیارہ میل پر تھا۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کو تعطیلوں میں بھی لڑکوں کو پڑھانے کا خبط تھا۔ رات کو لڑکے کھانا کھا کر مدرسہ میں آجاتے اور ہیڈ ماسٹر صاحب چار پائی پر لیٹ کر اپنے خراٹوں سے انھیں پڑھایا کرتے تھے۔ جب لڑکوں میں دھول دھپہ شروع ہو جاتا اور شور و غل مچنے لگتا، تب یکا یک خواب خرگوش سے چونک پڑتے، اور لڑکوں کو دو چار طمانچے لگاکر پھر خواب نوشی کے مزے لینے لگتے، گیارہ بارہ بجے رات تک یہی ڈرامہ ہوتا رہتا، یہاں تک کہ لڑکے نیند سے بیقرار ہو کر وہیں ٹاٹ پر سو جاتے، اپریل میں سالانہ امتحان ہونے والا تھا۔ اس لیے جنوری ہی سے ہائے توبہ مچی ہوئی تھی۔ نائٹ مدرسوں پر اتنی رعائت تھی کہ رات کی کلاسوں میں انھیں نہ طلب کیا جاتا تھا۔ مگر تعطیلیں بالکل نہ ملتی تھی، ہومہوتی آماوس آیا اور نکل گیا۔ بسنت آیا اور چلا گیا۔ شیوراتری آئی اور چلی گئی، اور اتواروں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ایک دن کے لیے کوئی اتنا بڑا سفر کرتا۔ اس لیے کئی مہینوں سے مجھے گھر جانے کا موقع نہ ملا تھا۔ مگر اب کے میں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا، کہ ہولی پر ضرور گھر جاؤں گا۔ چاہے نوکری سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونا پڑے۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے ہی سے ہیڈ ماسٹر صاحب کو الٹی میٹم دے دیا کہ 20 مارچ کو ہولی کی تعطیل شروع ہو گی۔ اور بندہ 19 کی شام کو رخصت ہو جائے گا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے سمجھایا کہ ابھی لڑکے ہو، تمھیں کیا معلوم نوکری کتنی مشکل سے ملتی ہے اور کتنی مشکلوں سے نبھتی ہے۔ نوکری پانا اتنا مشکل نہیں جتنا اس کا نبھانا۔ 8 اپریل میں امتحان ہونے والا ہے، تین چار دن مدرسہ بند رہا تو بتاؤ کتنے لڑکے پاس ہوں گے۔ سال بھر کی محنت پر پانی پھر جائے گا کہ نہیں، میرا کہنا مانو، اس تعطیل میں نہ جاؤ۔ امتحان کے بعد تعطیل پڑے اس میں ایسٹر کی چار دن تعطیل ہوگی، میں ایک دن کے

لیے بھی نہ روکوں گا۔

میں اپنے مورچہ پر قائم رہا۔ فہمائش اور تخویف اور جواب طلبی کسی اسلحہ کا مجھ پر اثر نہ ہو۔ 19 کو جوں ہی مدرسہ بند ہوا، میں نے ہیڈ ماسٹر کو سلام بھی نہ کیا اور چپکے سے اپنی جائے قیام پر چلا آیا انھیں سلام کرنے جاتا تو وہ ایک نہ ایک کام نکال کر مجھے روک لیتے، رجسٹر میں فیس کی میزان لگاتے جاؤ اوسط حاضری لگاتے جاؤ۔ لڑکوں کی مشقی کاپیاں جمع کرکے ان پر اصلاح اور تاریخ سب مکمل کر دو۔ گویا یہ میرا آخری سفر ہے اور مجھے زندگی کے سارے کام بھی ختم کر دینے چاہئیں۔

مکان پر آکر ہم نے جھٹ پٹ اپنی کتابوں کا بقچہ اٹھایا، اپنا ہلکا سا لحاف کندھے پر رکھا اور اسٹیشن پر چل پڑے گاڑی پانچ بج کر پانچ منٹ پر جاتی تھی۔ مدرسہ کی گھڑی حاضری کے وقت ہمیشہ آدھ گھنٹہ تیز اور روانگی کے وقت آدھ گھنٹہ سست رہتی تھی۔ چار بجے مدرسہ بند ہوا تھا، میرے خیال میں اسٹیشن پر پہنچنے میں کافی وقت تھا۔ پھر بھی مسافروں کو گاڑی کی طرف سے عام طور پر جو اندیشہ لگا رہتا ہے۔ اور جو گھڑی ہاتھ میں ہو جانے پر بھی اور گاڑی کا وقت صحیح معلوم ہونے پر دور سے کسی گاڑی کی گڑگڑاہٹ یا سیٹی سن کر قدموں کو تیز اور دل منتشر کر دیا کرتا ہے۔ وہ مجھے بھی لگا ہوا تھا۔ کتابوں کا بقچہ وزنی تھا۔ اس پر کندھے پر لحاف بار بار ہاتھ بدلتا تھا اور لپکا چلا جاتا تھا۔ یہاں تک اسٹشن دو فرلانگ سے نظر آیا۔ سگنل ڈاؤن تھا۔ میری ہمت بھی اس سگنل کی طرف پست ہوگئی، تقاضا عمر سے ایک سو قدم آگے دوڑا ضرور مگر یہ اس کی ہمت تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے گاڑی آئی ایک منٹ ٹھہری اور روانہ ہوگئی۔ مدرسہ کی گھڑی یقیناً آج معمول سے بھی زیادہ سست تھی۔

اب اسٹیشن پر جانا بے سود تھا۔ دوسری گاڑی گیارہ بجے رات کو آئے گی۔ میرے گھر والے اسٹیشن پر کوئی بارہ بجے پہنچے گی، اور وہاں سے مکان پر جاتے جاتے ایک بج جائے گا۔ اس سناٹے میں راستہ چلنا بھی ایک مہم تھی جسے سر کرنے کی مجھ میں جرأت نہ تھی، جی میں تو آیا کہ چل کر ہیڈ ماسٹر کو آڑے ہاتھوں لوں،مگر ضبط کیا اور پیدل چلنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ کل بارہ میل ہی تو ہیں۔ اگر دو میل فی گھنٹہ بھی چلوں تو چھ گھنٹہ میں گھر پہونچ سکتا ہوں، ابھی پانچ بجے ہیں،ذرا قدم بڑھاتا جاؤں تو دس بجے یقیناً پہنچ

جاؤں گا۔ اماں اور منو میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ پہنچتے ہی گرما گرم کھانا ملے گا۔ کولھواڑے میں گڑ پک رہا ہوگا۔ وہاں سے گرم گرم رس پینے کو آجائے گا۔ اور جب سنیں گے۔ میں اتنی دور سے پیدل چلا آیا ہوں تو انھیں کتنا تعجب ہوگا۔ میں نے فوراً گنگا کی طرف قدم بڑھایا۔ یہ قصبہ ندی کے کنارے واقع تھا، اور میرے گاؤں کی سڑک ندی کے اس پار سے تھی۔ مجھے اس راستے سے جانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا، مگر اتنا سنا تھا کہ کچی سڑک سیدھی چلی جاتی ہے تردد کی کوئی بات نہ تھی۔ دس منٹ میں ناؤ اس پار پہنچ جائے گی، اور بس فراٹے بھرتا ہوا چل دوں گا۔ بارہ میل کہنے کو تو ہوتے ہیں، تو ہیں کل چھ کوس۔

مگر گھاٹ پر پہنچا تو ناؤ میں آدھے مسافر بھی نہ بیٹھے تھے، میں کود کر جا بیٹھا کھیوے کے پیسہ بھی نکال کر دے دیے مگر ناؤ ہے کہ وہیں قطب بنی ہوئی ہے۔ مسافروں کی تعداد کافی نہیں ہے۔ کیسے کھلے لوگ تحصیل اور کچہری سے آتے جاتے ہیں، اور بیٹھتے جاتے ہیں، اور میں ہوں کہ اندر ہی اندر بھنا جاتا ہوں۔ سورج نیچے دوڑا چلا جا رہا ہے۔ گویا مجھ سے بازی لگائے ہوئے ہے۔ ابھی سفید تھا، پھر زرد ہونا شروع ہوا، اور دیکھتے دیکھتے سرخ ہو گیا۔ دریا کے اس پار افق پر لٹکا ہوا تھا۔ گویا کوئی ڈول کنویں میں لٹک رہا ہو۔ ہوا میں کچھ خنکی بھی آگئی اور بھوک بھی معلوم ہونے لگی۔ میں نے آج گھر جانے کی خوشی اور ولولے میں روٹیاں نہ پکائی تھیں، سوچا تھا کہ شام تو گھر پہنچ جاؤں گا۔ لاؤ ایک پیسہ کے چنے لے کر کھالوں، ان دانوں نے اتنی دیر تک تو رفاقت کی، اب پیٹ کی پیچیدگیوں میں جاکر نہ جانے کہاں غائب ہوگئے، مگر کیا غم ہے رستہ میں کیا دوکانیں نہ ہوں گی۔ دو چار پیسہ کی مٹھائی لے کر کھالوں گا۔

جب ناؤ اس کنارے پر پہنچی، تو سورج کی صرف آخری سانس باقی تھی۔ حالانکہ ندی کا پاٹ بالکل پینڈے میں چمٹ کر رہ گیا تھا۔

میں نے بقچہ اٹھایا اور تیزی سے چلا، دونوں طرف چنے کے کھیت تھے، جن کے اودے پھولوں پر شبنم کا ہلکا سا پردہ پڑ گیا تھا۔ بے اختیار ایک کھیت میں گھس کر بوٹ اُکھاڑ لیے، اور ٹونگتا ہوا بھاگا۔

(2)

سامنے بارہ میل کی منزل ہے، کچا، سنسان راستہ، شام ہو گئی ہے، مجھے پہلی بار اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مگر جوش طفلی نے کہا کیا مضائقہ ایک دو میل تو دوڑ ہی سکتے ہیں۔ بارہ کو دل میں 1760 سے ضرب دیا۔ بیس ہزار گز ہی تو ہوتے ہیں۔ بارہ میل کے مقابلہ 20 ہزار گز کچھ ہلکے اور آسان معلوم ہوئے، اور جب دو تین میل رہ جائے گا، تب تو ایک طرح سے اپنے گاؤں میں ہی ہوں گا۔ اس کا کیا شمار ہمت بندھ گئی اکے دکے مسافر بھی پیچھے چلے آرہے تھے، اور بھی اطمینان ہوا۔

اندھیرا ہو گیا تھا۔ میں لپکا جا رہا ہوں، سڑک کے کنارے دور سے ایک جھونپڑی نظر آتی ہے، ایک کپی جل رہی ہے۔ ضرور کسی بنیے کی دوکان ہو گی۔ اور کچھ نہ ہوگا تو گڑ اور چنے تو مل ہی جائیں گے۔ قدم اور تیز کرتا ہوں، جھونپڑی آئی ہے، اس کے سامنے ایک لمحہ کے لیے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ چار پانچ آدمی اکڑوں بیٹھے ہیں۔ بیچ میں ایک بوتل ہے، ہر ایک کے سامنے ایک ایک کلہڑادیوار سے ملی ہوئی اونچی گدی ہے۔ اس پر ساہو جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے کئی بوتلیں رکھی ہوئی ہیں۔ ذرا اور پیچھے ہٹ کر ایک آدمی کڑھائی میں سوکھے مٹر بھون رہا ہے۔ اس کی رغبت افزا سوندھی خوشبو میرے جسم میں برقی رفتار سے دوڑ جاتی ہے۔ اضطراری طور پر جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں۔ اور ایک پیسہ نکال کر اس کی طرف چلتا ہوں۔

لیکن آپ ہی قدم رُک جاتے ہیں۔

خونچے والا پوچھتا ہے کیا لوگے؟

میں کہتا ہوں، کچھ نہیں۔

اور آگے بڑھ جاتا ہوں، دوکان بھی ملی تو شراب کی، گویا دنیا میں انسان کے لیے شراب ہی سب سے ضروری چیز ہے، یہ سب آدمی دھوبی اور چمار ہوں گے، دوسرا کون شراب پیتا ہے۔ دیہات میں، مگر وہ مٹر کا دل آویز سوندھا پن میرا پیچھا کر رہا ہے، اور میں بھاگا جا رہا ہوں۔

کتابوں کا بقچہ جی کا جنجال ہو رہا ہے۔ ایسی خواہش ہوتی ہے، کہ اسے یہیں سڑک

پر پٹک دوں، اس کا وزن مشکل سے پانچ سیر ہوگا۔ مگر اس وقت وہ مجھے من بھر سے زیادہ معلوم ہو رہا ہے، جسم میں کمزوری محسوس ہو رہی ہے، پور نماشی کا چاند درختوں کے اوپر جا بیٹھا ہے۔ اور پتوں سے زمین کی طرف جھانک رہا ہے۔ میں بالکل اکیلا چلا جا رہا ہوں، مگر خوف بالکل نہیں ہے، بھوک نے ساری حسیات کو دبا کر رکھا ہے، خود ان پر حاوی ہو گئی ہے۔

آہا یہ گڑ کی خوشبو کہاں سے آئی۔ کہیں تازہ گڑ پک رہا ہے، کوئی گاؤں قریب ہی ہوگا، ہاں وہ آموں کی جھرمٹ میں رشنی نظر آ رہی ہے، لیکن وہاں پیسے وو پسے کا گڑ کون بیچے گا، اور یوں مجھ سے مانگا نہ جائے گا۔ معلوم نہیں لوگ کیا سمجھیں۔ آگے بڑھتا ہوں مگر زبان سے رال ٹپک رہی ہے، گڑ سے مجھے بڑی رغبت ہے۔ جب کبھی کسی چیز کی دوکان کھولنے کی سوچتا تھا، تو وہ حلوائی کی دوکان ہوتی تھی، بکری ہو یا نہ ہو، مٹھائیاں تو کھانے کو ملیں گی۔ حلوائیوں کو دیکھوں مارے مٹاپے کے ہل نہیں سکتے۔ لیکن یہ بیوقوف ہوتے ہیں، آرام طلبی کے باعث تو ند نکال لیتے ہیں۔

میں ورزش کرتا رہوں گا۔ مگر گڑ کی وہ صبر آزما اور اشتہاانگیز خوشبو برابر آرہی ہے، مجھے وہ واقعہ یاد آتا ہے۔ جب اماں تین ماہ کے لیے اپنے میکے یا میری ننہال گئی تھیں۔ اور میں نے تین مہینے میں ایک من گڑ کا صفایا کر دیا تھا، یہی گڑ کے دن تھے۔ نانا بیمار تھے اماں کو بلا بھیجا تھا۔ میرا امتحان قریب تھا، اس لیے میں ان کے ساتھ نہ جا سکا تھا۔ منو کو وہ لیتی گئیں، جاتے وقت انھوں نے ایک من گڑ لے کر ایک مٹکے میں رکھا، اور اس کے منہ پر ایک سکورا راکھ کو مٹی سے بند کر دیا، مجھے سخت تاکید کر دی کہ مٹکا نہ کھولنا، میرے لیے تھوڑا سا گڑ ایک ہانڈی میں رکھ دیا تھا، وہ ہانڈی میں نے ایک ہفتہ میں صفاچٹ کر دی، صبح کو دودھ کے ساتھ گڑ، دوپہر کو روٹیوں کے ساتھ گڑ، تیسرے پہر دانوں کے ساتھ گڑ، رات کو پھر دودھ کے ساتھ گڑ، یہاں تک جائز خرچ تھا۔ جس پر اماں کو بھی کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا، مگر مدرسہ سے بار بار پانی پینے کے بہانے گھر آتا اور دو ایک پنڈیاں نکال کر کھا لیتا۔ اس کی بجٹ میں کہاں گنجائش تھی، اور مجھے گڑ کا کچھ ایسا چسکا پڑ گیا، کہ ہر وقت وہی نشہ سوار رہتا۔ میرا گھر میں آنا گڑ کے سر شامت آنا تھا۔ ایک ہفتہ میں ہانڈی نے جواب دے دیا، مگر مٹکا کھولنے کی سخت ممانعت تھی۔ اور اماں

کے گھر آنے میں ابھی پورے تین مہینے باقی تھے، ایک دن تو میں نے طوعاً وکرہاً صبر کیا، لیکن دوسرے دن ایک آہ کے ساتھ صبر جاتا رہا، اور شکے کی ایک نگاہ شیریں کے ساتھ ہوش رخصت ہو گیا۔ میں نے کسی گناہ کبیرہ کے احساس کے ساتھ مٹکے کو کھول کر اور ہانڈی بھر کر نکال کر اس طرح مٹکے کو بند کر دیا۔ اور عہد کر لیا کہ اس ہانڈی کو تین مہینے چلاؤں گا۔ چلے یا نہ چلے مگر میں چلائے جاؤں گا۔ مٹکے کو منزل ہفت خواں سمجھوں گا۔ جسے رستم بھی نہ کھول سکا تھا، میں نے مٹکے کی پنڈلیوں کو کچھ اس طرح قینچی لگا کر رکھا، جیسے بعض دوکاندار دیا سلائی کی ڈبیاں کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ ایک ہانڈی گڑ خالی ہو جانے پر بھی مٹکا لبریز تھا۔ اماں کو پتہ ہی نہ چلے گا، مواخذہ کی نوبت کیسے آئے گی۔ مگر دل اور زبان میں کشمکش شروع ہوئی کہ کیا کہوں، اور ہر بار فتح زبان ہی کے ہاتھ رہتی۔ یہ دو انگل زبان دل جیسے شہزور پہلوان کو نچا رہی تھی، جیسے مداری بندر کو نچائے اس کو جو آسمان میں اڑتا ہے اور فلک الافلاک کے منصوبے باندھتا ہے۔ اور اپنے زعم میں فرعون کو بھی کچھ نہیں سمجھتا۔ باربار ارادہ کرتا دن بھر میں پانچ پنڈیوں سے زیادہ نہ کھاؤں گا۔ لیکن یہ ارادہ خرابیوں کی توجہ سے زیادہ دیر پا نہ ہوتا تھا، گھنٹہ دو گھنٹہ سے زیادہ نہ ٹکتا، اپنے آہ پر ہنستا، نفرین کرتا، گڑ کو تو کھا رہے ہو، مگر برسات میں سارا جسم سڑ جائے گا۔ گندھک کا مرہم لگائے گھومو گے ہر کوئی تمھارے ساتھ بیٹھنا بھی پسند نہ کرے گا۔ قسمیں کھانا، علم کی، ماں کی، مرحوم باپ کی، گئو کی، ایشور کی، مگر ان کا وہی حشر ہوتا، دوسرا ہفتہ ختم ہوتے ہوتے ہانڈی ختم ہو گئی، اس دن میں نے بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ ایشور سے پرارتھنا کی، بھگوان یہ میرا چنچل من مجھے پریشان کر رہا ہے، مجھے شکتی دو کہ اس کو قابو میں رکھ سکوں۔ مجھے ہشت دہات کا لگام دو جو اس کے منہ میں ڈال دوں، یہ کمبخت مجھے اماں سے پٹوانے اور گھڑکیاں سنوانے پر تلا ہوا ہے، تم ہی میری رکشا کرو تو بچ سکتا ہوں۔ میری آنکھوں سے اس ذوقِ عبودیت میں دو چار بوندیں آنسوؤں کی بھی گریں، لیکن ایشور نے بھی کچھ سماعت نہ کی، اور گڑ کی خواہش مجھ پر غالب رہی، یہاں تک کہ دوسری ہانڈی کی مرثیہ خوانی کی نوبت آپہنچی۔ حسن اتفاق سے انھیں دنوں تین دن کی تعطیل ہوئی، اور میں اماں سے ملنے نہال گیا۔ اماں نے پوچھا، گڑ کا مٹکا دیکھا ہے۔ چیونٹے تو نہیں لگے، سیل تو نہیں پہنچی، میں نے مٹکے کو دیکھنے کی بھی قسم کھا کر اپنی

سخاوت مندی کی ثبوت دیا، اماں نے مجھے غرور کی نظروں سے دیکھا، اور میری حکم پروری کے صلے میں مجھے ایک ہانڈی نکال لینے کی اجازت دے دی، ہاں تاکید بھی کر دی کہ منہ اچھی طرح بند کر دینا۔ اب تو وہاں مجھے ایک دن ایک ایک جگ معلوم ہونے لگا۔ چوتھے دن گھر آتے ہی میں نے پہلا کام جو کیا وہ مٹکے کو کھول کر ہانڈی بھر گڑ نکال لینا تھا۔ یک بار گی پانچ پنڈیاں اڑا گیا۔ پھر وہی ہکو بازی شروع ہوئی۔ اب کیا غم ہے، اماں کی اجازت مل گئی تھی، میّاں بھئے کوتوال اور ہانڈہ غائب، آخر میں نے اپنے دل کی کمزوری سے مجبور ہو کر مٹکے کی کوٹھری کے دورواذہ پر قفل ڈالا نہ اور اس کی کنجی دیوار کے ایک موٹے شگاف میں ڈال دی۔ اب دیکھیں تم کیسے گڑ کھاتے ہو۔ اس شگاف میں کنجی نکالنے کے یہ مستی تھی، کہ تین ہاتھ دیوار کھود ڈالی جائے۔ اور ہمت مجھ میں نہ تھی، مگر تین دن میں ہی صبر کا پیمانہ چھلک اُٹھا، اور ان تین دنوں میں بھی دل کی جو حالت تھی وہ بیان سے باہر ہے، حجرۂ شیرین کے طرف بار بار گرتا اور بے صبر نگاہوں سے دیکھتا اور ہاتھ مل کر رہ جاتا، کئی بار قفل کھٹکھٹایا کھینچا، جھٹکے دیے مگر ظالم خود بھی نہ ہمسا یہ کئی بار اس شگاف کا جائزہ لیا۔ اس میں جھانک کر دیکھا۔ ایک لکڑی سے اس کی گہرائی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی، مگر اس کی تہہ نہ ملی طبیعت کھوئی ہوئی سی رہتی، نہ کھانے پینے میں کچھ مزا تھا۔ نہ کھیلنے کودنے میں، نفس بار بار منطق کے ذور سے دل کو قائل کرنے کی کوشش کرتا۔ آخر گڑ اور کس مرض کی دوا ہے، میں اسے پھینک تو دیتا نہیں کھاتا ہی تو ہوں، کیا آج کھایا کیا ایک ماہ بعد، اس میں کیا فرق ہے، اماں جان نے ممانعت کی ہے، بے شک، لیکن انھیں مجھے ایک جائز کام سے باز رکھنے کا کیا حق ہے۔ اگر وہ آج کہیں کھیلنے مت جاؤ، یا درختوں پر مت چڑھو، یا تالاب میں تیرنے مت جاؤ، یا چڑیوں کے لیے کمپا مت لگاؤ، تتلیاں مت پکڑو۔ تو کیا میں مانے لیتا ہوں، آخر میرے بھی کچھ حقوق ہیں یا نہیں، تو پھر اس ایک معاملے میں کیوں اماں کی ممانعت پر اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو قربان کر دوں۔ آخر چوتھے دن نفس نے فتح پائی، میں نے علی الصباح ایک کدال لے کر دیوار کھودنا شروع کیا۔ شیگاف تھا ہی کھودنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی۔ آدھ گھنٹے کی محنت شاقہ کے بعد دیوار سے کوئی گز بھر لمبا اور تین انچ موٹا چپڑ چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ اور شگاف کی تہہ میں وہ کلید کامیابی پڑی ہوئی تھی، جسے سمندر کی تہہ میں

موتی کی سیپ پڑی ہو۔ میں نے جھٹ پٹ اسے نکالی اور فوراً دروازہ کھولا۔ مٹکے سے گڑ نکال کر ہانڈی میں بھرا اور دروازہ بند کر دیا۔ مٹکے میں اس دست برد سے قابل احساس کی واقع ہو گئی تھی۔ ہزار ترکیبیں آزمانے پر بھی اس کا خلا پر نہ ہو سکا۔ مگر اب کی بار میں نے اس چٹورے پن کا اماں جان کی واپسی تک خاتمہ کر دینے کے لیے کنجی کو کنوئیں میں ڈا ل دیا، قصہ طویل ہے، میں نے کیسے قفل توڑا۔ کیسے گڑ نکالا۔ اور مٹکا خالی ہو جانے پر کیسے اسے چھوڑا، اور اس کے ٹکڑے رات کو کنوئیں میں پھینکے، اور اماں آئیں تو میں نے کیسے رو رو کر اس سے مٹکے کے چوری جانے کی داستان کہی، یہ کرنے لگا۔ تو یہ واقعہ جو میں آج لکھنے بیٹھا ہوں نا تمام رہ جائے گا۔

چنانچہ اس وقت گڑ کی اس میٹھی اور مرغوب خوشبو نے مجھے از خود رفتہ بنا دیا گیا، مگر صبر کر کے آگے بڑھا۔

جوں جوں رات گزرتی تھی۔ جسم تکان سے چور ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ پاؤں میں لغزش ہونے لگی، کچی سڑک پر گاڑیوں کے پہیوں کی لیک پڑ گئی تھی، جب کبھی لیک میں پیر پھسلا جاتا تو معلوم ہوتا کسی گہرے گڈھے میں گر پڑا ہوں، بار بار جی میں آتا، یہیں سڑک کے کنارے لیٹ جاؤں، کتابوں کا مختصر سا بقچہ من بھر کا لگتا تھا۔ اپنے کو کوستا تھا کہ کتابیں لے کر کیوں چلا، دوسری زبان کا امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا۔ مگر چھٹیوں میں ایک دن بھی تو کتاب کھولنے کی نوبت نہ آئے گی۔ خواہ مخواہ یہ پشتارہ اٹھائے چلا آتا ہوں، ایسا جی جھنجھلاتا تھا کہ اس بار حماقت کو وہیں پٹک دوں۔

آخر ٹانگوں نے چلنے سے انکار کر دیا، ایک بار میں گر پڑا، اور سنبھل کر اٹھا تو پاؤں تھر تھرا رہے تھے، اب بغیر کچھ کھائے قدم اٹھا نا دشوارار تھا، مگر یہاں کیا کھاؤں، بار بار رونے کو جی چاہتا تھا، اتفاق سے ایک ایکھ کا کھیت نظر آیا، اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، چاہتا تھا کہ کھیت میں گھس کر چار پانچ ایکھ توڑ لوں۔ اور مزے سے رس چوستا ہوا چلوں، راستہ بھی کٹ جائے گا اور پیٹ میں کچھ پڑ بھی جائے گا۔ مگر مینڈ پر پیر رکھا ہی تھا کہ کانٹوں میں الجھ گیا، کسان نے شاید مینڈ پر کانٹے بکھیر دیے تھے، شاید بیر کی جھاڑی تھی، دھوتی کرتا سب کانٹوں میں پھنسا ہوا پیچھے ہٹا تو کانٹوں کی جھاڑی ساتھ ساتھ چلی، کپڑے چھڑانے لگا تو ہاتھ میں کانٹے چبھنے لگے، زور سے کھینچا تو دھوتی پھٹ

گئی، بھوک غائب ہو گئی، فکر ہوئی اس نئی مصیبت سے کیوں کر نجات ہو، کانٹوں کو ایک جگہ سے الگ کرتا تو دوسرے چمٹ جاتے، جھکتا تو جسم میں چبھتے۔ کسی کو پکاروں تو چوری کھل جاتی ہے، عجیب مخمصے میں پڑا ہوا تھا، اس وقت مجھے اپنی حالت پر رونا آگیا، کوئی صحرا نورد عاشق بھی اس طرح کانٹوں میں نہ پھنسا ہو گا۔ بڑی مشکل سے آدھ گھنٹے میں گنا چھوٹا، مگر دھوتی اور کرتے کے ماتھے گئی، اور ہاتھ اور پاؤں چھلنی ہو گئے وہ گھاٹے میں، اب ایک قدم آگے رکھنا محال تھا۔ معلوم نہیں کتنا راستہ طے ہوا۔ کتنا باقی ہے، نہ کوئی آدمی نہ آدم زاد کس سے پوچھوں، اپنی حالت پرروتا ہوا جا رہا تھا، ایک بڑا گاؤں نظر آیا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ کوئی نہ کوئی دکان مل ہی جائے گی، کچھ کھالوں گا اور کسی کے سائبان میں پڑا رہوں گا۔ صبح دیکھی جائے گی۔

مگر دیہاتوں میں لوگ سر شام سونے کے عادی ہوتے ہیں، ایک آدمی کنوئیں پر پانی بھر رہا تھا، اس سے پوچھا تو اس نے نہایت یاس انگیز جواب دیا، اب یہاں کچھ نہ ملے گا بنیے نمک تیل رکھتے ہیں۔ حلوائی کی دوکان ایک بھی نہیں۔ کوئی شہر تھوڑا ہی ہے، اتنی رات تک دکان کھولے کون بیٹھا رہے۔

میں نے اس سے نہایت منت آمیز لہجہ میں کہا، کہیں سونے کو جگہ مل جائے گی؟

اس نے پوچھا کون ہو تم؟

"تمھاری جان پہچان کا کوئی ہے"؟

"جان پہچان کا کوئی ہوتا تو تم سے سوال کرتا"؟

"تو بھئی انجان آدمی کو یہاں نہیں ٹھہرنے دیں گے، اسی طرح کل ایک مسافر آکر ٹھہرا تھا۔ رات کو ایک گھر میں سیند پڑگئی، صبح کو مسافر کا پتہ نہ تھا۔

"تو کیا تم سمجھتے ہو، میں چور ہوں"۔

"کسی کے ماتھے پر تو لکھا نہیں ہوتا، اندر کا حال کون جانے"۔

"نہیں ٹھہرانا چاہتے نہ سہی مگر چور نہ بناؤ۔ میں جانتا یہ اتنا منحوس گاؤں ہے تو ادھر آتا ہی کیوں"؟

میں نے زیادہ خوشامد نہ کی۔ جی جل گیا، سڑک پر آکر پھر آگے چلا۔ اس وقت میرے ہوش بجانہ تھے۔ کچھ خبر نہیں کس راستے سے گاؤں میں آیا تھا اور کدھر چلا جا رہا

تھا۔ اب مجھے اپنے گھر پہنچنے کی امید نہ تھی۔ رات یوں ہی بھٹکتے ہوے گزرے گی، پھر اس کا کیا غم کہ کہاں جا رہا ہوں، معلوم نہیں کتنی دیر تک مجھ پر یہ کیفیت طاری رہی، دفعتاً ایک کھیت میں آگ جلتی ہوئی نظر آئی گویا شمع امید ہو۔ ضرور وہاں کوئی آدمی ہوگا، شاید رات کاٹنے کو جگہ مل جائے، تیز قدم کیے اور قریب پہنچا، کہ یکا یک ایک بڑا سا کتا بھونکتا ہوا میری طرف دوڑا، اتنی خوفناک آواز تھی کہ میں کانپ اُٹھا ایک لمحہ میں وہ میرے سامنے آ گیا، اور میری طرف لپک لپک کر بھونکنے لگا۔ میرے ہاتھوں میں کتابوں کے بقچہ کے سوا اور کیا تھا۔ نہ کوئی لکڑی نہ کوئی پتھر، کیسے بھگاؤں، کہیں بدمعاش میری ٹانگ پکڑ لے کیا کروں، تازی نسل کا شکاری کتا معلوم ہوتا تھا، میں جتنا ہی دھت دھت کرتا تھا اتنا ہی وہ گرجتا تھا۔ میں خاموش کھڑا ہو گیا۔ اور بقچہ زمین پر رکھ کر پاؤں سے جوتے نکال لیے اپنی حفاظت کے لیے کوئی حربہ تو ہاتھ میں ہو، اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا کہ خوفناک حد تک قریب آئے تو اس کے سر پر اتنے زور سے نعل دار جوتا ماردوں کہ یاد ہی تو کرے۔ لیکن اس نے شاید میری نیت تاڑ لی، اور اس طرح میری طرف جھپٹا کہ مجھے رعشہ آ گیا، اور جوتے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑے۔ اور اسی وقت میں نے ہیبت زدہ آواز میں پکارا، ارے کھیت میں کوئی ہے۔ دیکھو یہ کتا مجھے کاٹ رہا ہے، او مہتو دیکھو تمھارا کتا مجھے کاٹ رہا ہے۔

جواب ملا کون ہے ؟

''میں ہوں راہ گیر، تمھارا کتا مجھے کاٹ رہا ہے''۔

''نہیں کاٹے گا نہیں، ڈرومت کہاں جانا ہے''۔

''محمود نگر''۔

''محمود نگر کا راستہ تو تم پیچھے چھوڑ آئے، آگے تو ندی ہے''۔

''میرا کلیجہ بیٹھ گیا، رونا سا ہو کر۔ بولا؟ محمود نگر کا راستہ کتنی دور چھوٹ گیا ہوگا''؟

''یہی کوئی تین میل''۔

اور ایک قدآور انسان ہاتھ میں لالٹین لیے ہوے آکر میرے سامنے کھڑا ہو گیا، سر پر ہیٹ تھا، ایک موٹا فوجی اوور کوٹ پہنے ہوے، نیچے نیکر پاؤں میں فل بوٹ بڑا قوی ہیکل بڑی مونچھیں، گورا رنگ مردانہ چاہت کا مجسمہ۔ بولا تم تو کوئی اسکول کے لڑکے معلوم

ہوتے ہو۔

''لڑکا تو نہیں ہوں، لڑکوں کا مدرس ہوں، گھر جا رہا ہوں، آج سے تین دن کی تعطیل ہے''

''تو ریل سے کیوں نہیں گئے''؟

''ریل چھوٹ گئی اور دوسری ایک بجے چھوٹتی ہے''۔

وہ ابھی تمھیں مل جائے گی، بارہ کا عمل ہے، چلو میں اسٹیشن کا راستہ دکھا دوں''۔

''کون سے اسٹیشن کا''۔

''بھگوت پور کا''۔

''بھگوت پور سے تو میں چلا ہوں، وہ بہت پیچھے چھوٹ گیا ہوگا''۔

''بالکل نہیں، تم بھگوت پر اسٹیشن سے ایک میل کے اندر کھڑے ہو، چلو میں تمھیں اسٹیشن کا راستہ دکھا دوں، ابھی گاڑی مل جائے گی۔ لیکن رہنا چاہو تو میرے جھونپڑے میں لیٹ رہو۔ کل چلے جانا''۔

اپنے اوپر غصہ آیا کہ سر پیٹ لوں۔ پانچ بجے سے تیلی کے بیل کی طرح گھوم رہا ہوں۔ اور ابھی بھگوت پور سے کل ایک میل آیا ہوں، راستہ بھول گیا، یہ واقعہ بھی یاد رہے گا کہ چلا چھ گھنٹے اور طے کیا ایک میل، گھر پہنچنے کی دھن جیسے اور بھی دہک اٹھی۔

بولا نہیں۔ کل تو ہولی ہے مجھے رات کو پہنچ جانا چاہیے۔

مگر راستہ پہاڑی ہے، ایسا نہ ہو کوئی جانور مل جائے اچھا چلو میں تمھیں پہنچائے دیتا ہوں، مگر تم نے بڑی غلطی کی انجان راستے میں رات کو پیدل چلنا کتنا خطرناک ہے، اچھا چلو پہنچائے دیتا ہوں۔ خیر یہیں کھڑے رہو۔ میں ابھی آتا ہوں۔

کتّا دم ہلانے لگا۔ اور مجھ سے دوستی کرنے کا خواہش مند معلوم ہوا، دم ہلاتا ہوا سر جھکائے عذر تقصیر کے طور پر میرے سامنے آکر کھڑا ہوا۔ میں نے بھی فیاضی سے اس کا قصور معاف کر دیا۔ اور اس کے سر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ایک لمحہ میں وہ شخص بندوق کندھے پر رکھے آ گیا، اور بولا چلو مگر اب ایسی نادانی نہ کرنا، خیریت ہوئی کہ میں تمھیں مل گیا۔ ندی پر پہنچ جاتے ضرور کسی جانور سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔

میں نے پوچھا۔ آپ تو کوئی انگریز معلوم ہوتے ہیں۔ مگر آپ کا لہجہ بالکل ہمارے

جیسا ہے۔

اس نے ہنس کر کہا۔ ہاں میرا باپ انگریز تھا۔ فوجی افسر، میری عمر یہیں گزری ہے، میری ماں اس کا کھانا پکاتی تھی۔ میں بھی فوج میں رہ چکا ہوں، یورپ کی لڑائی میں گیا تھا۔ اب پنشن پاتا ہوں۔ لڑائی میں میں نے جو نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھے، اور جن حالات میں مجھے زندگی بسر کرنا پڑی، اور مجھے اپنے انسانی جذبات کا جس حد تک خون پڑا اور ان سے اس پیشہ سے مجھے نفرت ہوگئی، اور میں پنشن لے کر یہاں چلا آیا، میرے پاپا نے یہیں ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا۔ میں یہیں رہتا ہوں۔ اور آس پاس کے کھیتوں کی رکھوالی کرتا ہوں۔ یہ گنگا کی گھاٹی ہے چاروں طرف پہاڑیاں ہیں۔ جنگلی جانور بہت لگتے ہیں۔ سور نیل گائے، ہرن ساری کھیتی برباد کر دیتے ہیں۔ میرا کام ہے جانوروں سے کھیتی کی حفاظت کرنا، کسانوں سے مجھے ہل پیچھے ایک من غلہ مل جاتا ہے۔ وہ میرے گزر بسر کے لیے کافی ہوتا ہے۔ میری بڑھیا ماں ابھی زندہ ہے۔ جس طرح پاپا کا کھانا پکاتی تھی، اسی طرح اب میرا کھانا پکاتی ہے۔ کبھی کبھی میرے پاس آیا کرو میں تمھیں کسرت کرنا سکھا دوں گا۔ سال بھر میں پہلوان ہو جاؤگے۔ میں نے پوچھا آپ ابھی تک کسرت کرتے ہیں۔

وہ بولا، ہاں دو گھنٹہ روزانہ کثرت کرتا ہوں۔ مگدر اور کیزم کا بہت شوق ہے۔ میرا پانچواں سال ہے، اگر ایک سانس میں پانچ میل دوڑ سکتا ہوں۔ کسرت نہ کروں تو اس جنگل میں رہوں کیسے۔ میں نے خوب کشتیاں لڑی ہیں۔ اپنی رجمنٹ میں مضبوط آدمی تھا۔ مگر اب اس فوجی زندگی کے حالات پر غور کرتا ہوں، تو شرم اور افسوس سے میرا سر جھک جاتا ہے، کتنے ہی بے گناہ میری رائفل کے شکار ہوے۔ میرا انھوں نے کیا نقصان کیا تھا، میری ان سے کون سی عداوت تھی، مجھے تو جرمن اور آسٹرین سپاہی بھی ویسے ہی خلیق، ویسے ہی بہادر، ویسے ہی خوش مزاج، ویسے ہی ہمدرد معلوم ہوئے۔ جیسے فرانس یا انگلینڈ کے ہماری ان سے خوب بے تکلفی ہوگئی تھی۔ ساتھ کھیلتے تھے، ساتھ بیٹھتے تھے۔ خیال ہی نہ آتا تھا کہ یہ لوگ ہمارے اپنے نہیں ہیں۔ مگر پھر بھی ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ کس لیے؟ اس لیے کہ بڑے بڑے انگریزوں سودا گروں کو خطرہ تھا کہ کہیں جرمنی ان کا روزگار نہ چھین لے، یہ سودا گروں کا راج ہے، ہماری فوجیں انھیں

کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلیاں ہیں۔ جان ہم غریبوں کی گئی، جیبیں گرم ہوئیں موٹے موٹے سوداگروں کی، اس وقت ہماری ایسی خاطر ہوتی تھی۔ ایسی پیٹھ ٹھونکی جاتی تھی، گویا ہم سلطنت کے داماد ہیں۔ ہمارے اوپر پھولوں کی بارش ہوتی تھی، ہمیں گارڈن پاٹیاں دی جاتی تھیں۔ ہماری جانبازیوں کی داستانیں روزانہ اخباروں میں تصویروں کے ساتھ چھپتی تھیں۔ نازک بدن لڑکیاں اور شہزادیاں ہمارے لیے کپڑے سیتی تھیں، طرح طرح کے مربّے اور آچار بنا بنا کر بھیجتیں، لیکن جب صلح ہو گئی تو انھیں جانبازوں کو کوئی ٹکے کو بھی نہ پوچھتا تھا۔ کتنوں ہی کے انگ بھنگ ہو گئے تھے، کوئی بولا ہو گیا تھا، کوئی لنگڑا، کوئی اندھا، انھیں ایک ٹکڑا روٹی دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ میں نے کتنوں کو ہی سڑک پر بھیک مانگتے دیکھا، تب سے مجھے اس پیشہ سے نفرت ہو گئی، میں نے یہاں آکر یہ کام اپنے ذمہ لے لیا اور خوش ہوں۔ سپہ گری کا یہی منشا ہے کہ اس سے غریبوں کی جان و مال کی حفاظت ہو۔ یہ نہیں کہ کروڑ پتیوں کی بے شمار دولت میں اضافہ ہو۔ یہاں میری جان ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے، کئی بار مرتے مرتے بچا ہوں۔ لیکن میں مر بھی جاؤں تو اس کا مجھے افسوس نہ ہوگا۔ کیونکہ مجھے یہ تسکین ہوگی، کہ میری زندگی غریبوں کے کام آئی۔ اور یہ بچارے کسان میری کتنی خاطر کرتے ہیں کہ تم سے کیا کہوں۔ اگر میں بیمار پڑ جاؤں اور انھیں معلوم ہو جائے کہ میں ان کے جسم کے تازہ خون سے اچھا ہو جاؤں گا۔ تو بے دریغ اپنا خون دے دیں گے، پہلے میں شراب پیتا تھا۔ میری برادری کو تو تم جانتے ہوگے، ہم میں بہت زیادہ لوگ ایسے ہیں جن کو کھانا میسر ہو یا نہ ہو مگر شراب ضرور چاہیے۔ میں بھی ایک بوتل شراب روز پی جاتا تھا۔ باپ نے کافی پیسے چھوڑے تھے۔ اگر کفایت سے رہنا جانتا تو زندگی بھر آرام سے پڑا رہتا۔ مگر شراب نے ستیاناس کر دیا۔ ان دنوں میں بڑے ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ کالر ٹائی لگائے، چھیلا بنا ہوا، نو جوان چھوکریوں سے آنکھیں لڑایا کرتا تھا، گھوڑ دوڑ میں جوا کھیلنا، شراب پینا، کلب میں تاش کھیلنا، اور عورتوں سے دل بہلانا، یہی زندگی کا مشغلہ تھا۔ تین چار سال میں میں نے پچیس تیس ہزار روپے اڑا دیے کوڑی کفن کو نہ رکھی، جب پیسے ختم ہو گئے تو روزی کی فکر ہوئی، فوج میں بھرتی ہو گیا، مگر خدا کا شکر ہے کہ وہاں سے کچھ سیکھ کر لوٹا۔ یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ بہادر کا کام جان لینا نہیں۔ بلکہ جان کی حفاظت کرنا ہے۔

یورپ سے آکر ایک دن میں شکار کھیلنے لگا اور ادھر آگیا، دیکھا کئی کسان اپنے کھیتوں کے کنارے اداس کھڑے ہیں، میں نے پوچھا کیا بات ہے تم لوگ کیوں اس طرح اداس کھڑے ہو۔

ایک آدمی نے کہا کیا کریں صاحب زندگی سے تنگ ہیں۔ نہ موت آتی ہے نہ پیداوار ہوتی ہے، سارے جانور آکر کھیت چر جاتے ہیں، کس کے گھر سے لگان چکائیں، کیا مہاجن کو دیں، کیا عملوں کو دیں، اور کیا خود کھائیں۔ کل انھیں کھیتوں کو دیکھ کر دل کا غنچہ کھل جاتا تھا، آج انھیں دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ جانوروں نے سفایا کر دیا۔

معلوم نہیں اس وقت میرے دل پر کس دیوتا یا بنی کا سایہ تھا کہ مجھے ان پر رحم آگیا، میں نے کہا۔ آج سے میں تمھارے کھیتوں کی رکھوالی کروں گا۔ کیا مجال کہ کوئی جانور بھٹک سکے ایک دانہ جو جائے تو جرمانہ دوں۔ بس اس دن سے آج تک میرا یہی کام ہے۔ آج دس سال ہو گئے، میں نے کبھی ناغہ نہیں کیا۔ اپنا گزر بھی ہوتا ہے، اور احسان مفت ملتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے، کہ اس کام سے دل کو خوشی ہوتی ہے۔

''ندی آگئی میں نے دیکھا وہی گھاٹ ہے جہاں شام کو کشتی پر بیٹھا تھا۔ اس چاندنی میں ندی مرصع زیورات پہنے جیسے کوئی سنہرا خواب دیکھ رہی ہو''۔

میں نے پوچھا آپ کا نام کیا ہے، کبھی کبھی آپ کی زیارت کو آیا کروں گا۔

اس نے لالٹین اٹھا کر میرا چہرہ دیکھا، اور بولا جیکسن ہے۔ دل جیکسن، ضرور آنا اسٹیشن کے پاس، جس سے میرا نام پوچھوگے، میرا پتہ بتلا دے گا۔

یہ کہہ کر وہ پیچھے کی طرف مڑا، مگر یکایک لوٹ پڑا اور بولا، مگر تمھیں یہاں ساری رات بیٹھنا پڑے گا، اور تمھاری اماں گھبرا رہی ہوں گی۔ تم میرے کندھے پر بیٹھ جاؤ، تو میں تمھیں اس پر پہنچادوں، آج کل پانی بہت کم ہے۔ میں تو اکثر تیر آتا ہوں۔

میں نے احسان سے دب کر کہا، آپ نے یہی کیا کم عنایت کی ہے، کہ مجھے یہاں تک پہنچا دیا، ورنہ شاید گھر پہنچنا نصیب نہ ہوتا۔ میں یہاں بیٹھا رہوں گا۔ اور صبح کو کشتی سے پار اتر جاؤں گا۔

''واہ تمھاری اماں روتی ہوں گی، کہ میرے لاڈلے پر جانے کیا گزری''۔

یہ کہہ کر مسٹر جیکسن نے مجھے جھٹ اٹھا کر کندھے پر بٹھا لیا، اور اس طرح بے خوف پانی میں گھسے، گویا سوکھی زمین ہے میں دونوں ہاتھوں سے ان کی گردن پکڑے ہوں اور کچھ ہنس بھی رہا ہوں، پھر بھی سینہ دھڑک رہا ہے، اور رگوں میں سنسنی سی ہو رہی ہے، مگر جیکسن صاحب اطمینان سے چلے جا رہے ہیں، پانی گھٹنے تک آیا۔ پھر کمر تک پہنچا۔ اف سینہ تک پہنچ گیا، اب صاحب کو ایک ایک قدم مشکل ہو رہا ہے۔ میری جان نکل رہی ہے، لہریں ان کے گلے لپٹ رہی ہیں، میرے پاؤں بھی چومنے لگیں، میرا جی چاہتا تھا ان سے کہوں خدا را واپس چلیے۔ مگر زبان نہیں کھلتی حواس نے جیسے اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے سب دروازے بند کر لیے ہیں۔ ڈرتا ہوں کہیں جیکسن صاحب پھسلے تو اپنا کام تمام ہے، یہ تو تیراک ہیں نکل جائیں گے، میں لہروں کی خوراک بن جاؤں گا۔ افسوس آتا ہے اپنی حماقت پر کہ تیرنا کیوں نہ سیکھ لیا۔ یکا یک جیکسن نے مجھے دونوں ہاتھوں سے کندھے کے اوپر اٹھا لیا۔ ہم دہار میں پہنچ گئے تھے، بہاؤ میں اتنی تیزی تھی کہ ایک ایک قدم آگے رکھنے میں ایک ایک منٹ لگ جاتا تھا۔ دن کو اس ندی میں بارہا آچکا تھا۔ لیکن رات کو اور اس منجدھار میں وہ مرگ رواں معلوم ہوتی تھی، دس بارہ قدم تک میں جیکسن کے دونوں ہاتھوں پر ٹنگا رہاپھر پانی اترنے لگا۔ میں دیکھ نہ سکا۔ مگر شاید پانی جیکسن کے سر کے اوپر تک آگیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے مجھے ہاتھوں پر اٹھا لیا تھا، جب ان کی گردن باہر نکل آئی، تو زور سے ہنس کر بولے لو اب پہنچ گئے۔ میں نے کہا، ''آپ کو آج میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی''۔

جیکسن نے مجھے ہاتھوں سے اتار کر پھر کندھے پر بٹھاتے ہوئے کہا، اور مجھے آج جتنی مسرت ہوئی، اتنی آج تک کبھی نہ ہوئی تھی۔ جرمن کپتان کو قتل کر کے بھی نہیں، اپنی ماں سے کہنا مجھے دعا دیں۔

گھاٹ پر پہنچ کر میں صاحب سے رخصت ہوا، شرافت، بے غرض خدمت اور جانبازانہ سرفروشی کا نہ مٹنے والا نقش دل پر لیے ہوئے، میرے جی میں آیا کاش میں بھی اسی طرح لوگوں کے کام آسکتا۔

تین بجے رات کو جب میں گھر پہنچا، تو ہولی میں آگ لگ رہی تھی، میں اسٹیشن

سے دو میل سرپٹ دوڑتا ہوا گیا۔ معلوم نہیں بھوکے جسم میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔

اماں میری آواز سنتے ہی آنگن میں نکل آئیں، اور مجھے سینہ سے لگا لیا، اور بولیں اتنی رات کہاں کر دی۔ میں تو سانجھ سے تمھاری رہ دیکھ رہی تھی۔ چلو کھانا کھا لو، کچھ کھایا پیا ہے کہ نہیں۔

وہ اب جنت میں ہیں۔ لیکن ان کا وہ محبت بھرا چہرہ میری نظروں میں ہے، اور وہ پیار بھری آواز کانوں میں گونج رہی ہے؟

مسٹر جیکسن سے کئی بار مل چکا ہوں۔ اس کی شرافت نے مجھے اس کا عقیدت مند بنا دیا ہے۔ میں اسے انسان نہیں، دیوتا سمجھتا ہوں۔

(یہ افسانہ جولائی 1936 میں شائع ہوا۔ 'زادِ راہ' میں شامل ہے۔ 'گپت دھن' 2 میں شامل ہے۔)

رہسیہ

وِمل پرکاش نے سیوا شرم کے دُوار پر پہنچ کر جیب سے رومال نکالا اور بالوں پر پڑی ہوئی گرد صاف کی۔ پھر اسی رومال سے جوتوں کی گرد جھاڑی اور اندر داخل ہوا۔ صبح کو وہ روز ٹہلنے جاتا ہے اور لوٹتی بار سیوا شرم کی دیکھ بھال بھی کر لیتا ہے۔ وہ اس آشرم کا بانی بھی ہے اور سنچالک بھی۔

سیوا شرم کا کام شروع ہوگیا تھا۔ ادھیاپکائیں لڑکیوں کو پڑھا رہی تھیں، مالی پھولوں کی کیاریوں میں پانی دے رہا تھا اور ایک درجے کی لڑکیاں ہری ہری گھاس پر دوڑ لگا رہی تھی وِمل کو لڑکیوں کی صحت کا بڑا خیال ہے۔

وِمل ایک چھن وہی کھڑا پرسن من سے لڑکیوں کی بال کریڑا دیکھتا رہا، پھر آکر دفتر میں بیٹھ گیا۔ کلرک نے کل کی آتی ہوئی ڈاک اس کے سامنے رکھ دی۔ وِمل نے سارے پتر ایک ایک کر کے کھولے اور سرسری طور پر پڑھ کر رکھ دیئے۔ اس کے مُکھ پر چنتا اور نراشا کا دھومل رنگ دوڑ گیا۔ اس نے دھن کے لیے سماچار پتروں میں جو اپیل نکالی تھی اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کیسے یہ سنستھا چلے گی، لوگ کیا اتنے انودار ہیں؟ وہ تن من سے اس کام میں لگا ہوا ہے۔ اس کے پاس جو کچھ تھا وہ سب اس نے اس آشرم کو بھینٹ کر دی۔ اب لوگ اس سے اور کیا چاہتے ہیں؟ کیا اب بھی وہ ان کی دَیا اور وشواس کے یوگیہ نہیں ہے؟وہ اسی چنتا میں ڈوبا ہوا اٹھا اور گھر پر آکر سوچنے لگا۔ یہ سنکٹ کیسے ٹالے؟ ابھی سال کا آدھا بھی نہیں گذرا اور آشرم پر بارہ ہزار کا قرض ہو گیا تھا۔ سال پورا ہوتے ہوتے تو وہ بیس ہزار تک پہنچے گا۔ اگر وہ لڑکیوں کی فیس ایک ایک روپیہ بڑھا دے تو پانچ سو روپیہ کی آمدنی بڑھ سکتی ہے۔ ہوسٹل کی فیس دو دو روپے بڑھا دے تو پانچ سو روپۓ اور آسکتے ہیں۔ اس طرح وہ آشرم کی آمدنی میں بارہ ہزار سالانہ کی بڑھتی کر سکتا ہے، لیکن پھر اس کا وہ آدرش کہاں رہے گا کہ غریبوں کی لڑکیوں کو نام

ماتر فیس لے کر اونچی شکشا دی جائے۔ کاش اسے ایسی ادھیاپکاؤں کی کافی تعداد مل جاتی جو کیول گذارے پر کام کرتیں۔ کیا اتنے بڑے دیش میں ایسی دس بیس پڑھی لکھی دیویاں بھی نہیں ہیں؟ اس نے کئی بار اخباروں میں یہ ضرورت چھپوائی تھی، مگر آج تک کسی نے جواب نہ دیا۔ اب فیس بڑھانے کے سوا اس کے لیے اور کون سا راستہ ہے؟

اسی وقت اس کے دوار کے سامنے ایک تانگا آکر رکا اور ایک مہیلا اتر کر برآمدے میں آئی۔ ومل نے کمرے سے باہر نکل کر ان کا سواگت کیا اور انھیں اندر لے جاکر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ دیوی جی روپ وتی تو نہ تھیں پر ان کے مکھ پر شششٹتا اور کُلینتا کی آبھا ضرور تھی۔ اوسط قد کومل گات چمپئی رنگ پرسنّ مکھ خوب بنی سنوری ہوئی، مگر اس بناؤ سنوار میں ہی جیسے ابھاؤ کی جھلک تھی۔ ومل کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ جب سے اس نے سیوا آشرم کھولا تھا۔ بھلے گھروں کی دیویاں اکثر اس سے ملنے آتی رہتی تھیں۔

دیوی جی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پہلے اپنا نام بتا دوں۔ مجھے منجلا کہتے ہیں۔ میں نے کچھ دن ہوئے 'لیڈر' میں آپ کی نوٹس دیکھی تھی اور اسی پریوجن سے آپ کی سیوا میں آئی ہوں۔ یوں تو آپ سے ملنے کا شوق بہت دنوں سے تھا، پر کوئی اوسر نہ نکال پاتی تھی، اور بربس آکر آپ کا قیمتی سمے نشٹ نہ کرنا چاہتی تھی۔ آپ نے جس تیاگ اور تنمیتا سے ناریوں کی سیوا کی ہے۔ اس نے آپ کے پرتی میرے من میں اتنی شرّدھا پیدا کر دی ہے کہ میں اسے پرکٹ کروں تو شاید آپ خوشامد سمجھیں۔ میرے من میں بھی اسی طرح کی سیوا کی اِچھا بہت دنوں سے ہے، پر جتنا سوچتی ہوں، اتنا کر نہیں سکتی۔ آپ کے پروتساہن سے سمبھو ہے، میں بھی کچھ کرسکوں۔

وِمل مون سیوکوں میں تھا۔ اپنی پرشنسا اس کے لیے سب سے کٹھن پریکشا تھی۔ اس کی ٹھیک وہی دشا ہوجاتی تھی جیسے کوئی پانی میں ڈبکیاں کھا رہا ہو۔ وہ خود کسی کے منہ پر اس کی تعریف نہ کرتا تھا۔ اس لیے تعریف کے بھوکے اسے تنگ دل سمجھتے تھے وہ پیٹھ کے پیچھے تعریف کرتا تھا۔ ہاں برائیاں وہ منہ پر کرتا تھا اور دوسروں سے بھی یہی آشا رکھتا تھا۔

اس نے اپنا اکھڑا ہوا پاؤں جماتے ہوئے کہا۔ یہ تو بہت اچھی بات ہوگی۔ آپ شوق سے آئیں۔ سیوا آشرم کی آرتھک دشا تو آپ کو معلوم ہوگی۔

'میں اس ارادے سے یہاں نہیں آئی ہوں۔'

'یہ میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ میری یہ آشا نہ تھی۔ یوں ہی کہہ دیا۔ اچھا آپ کا مکان یہیں ہے؟'

منجلا دیوی کا گھر لکھنؤ میں ہے۔ جالندھر کے کنّیا وِدّیالیہ میں شکشا پائی ہے۔ انگریزی میں اچھی لیاقت ہے۔ گھر کے کام دھندے میں بھی کوشل ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے ہردے میں سیوا کا اُتساہ ہے۔ اگر ایسی استری سیوا آشرم کا بھار اپنے اوپر لے لے تو کیا کہنا۔

مگر وِمل کے من میں ایک پرشن اٹھا۔ پوچھا 'آپ کے پتی بھی آپ کے ساتھ رہیں گے۔'

سادھارن سا سوال تھا مگر منجلا کو ناگوار لگا۔ بولی 'جی نہیں' وہ اپنے گھر رہیں گے۔ وہ ایک بینک میں نوکر ہیں اور اچھا ویتن پاتے ہیں۔'

وِمل کے من کا پرشن اور بھی جٹل ہوگیا۔ جو آدمی اچھا ویتن پاتا ہے، اس کی پتنی کیوں اس سے الگ کاشی میں رہنا چاہتی ہے؟

کیول اتنا منہ سے نکلا: اچھا!

منجلا نے شاید ان کے من کا بھاؤ تاڑ کر کہا۔ 'آپ کو یہ کچھ انوکھی سی بات لگتی ہوگی۔ لیکن کیا آپ کے خیال میں شادی کا آشے یہ ہے کہ استری کو پُروش کے دامن میں چھپا رہنا چاہیے۔

وِمل نے جوش کے ساتھ کہا۔ 'ہرگز نہیں۔'

'جب میں اپنی ضرورتوں کو گھٹا کر صفر تک پہنچ سکتی ہوں تو کسی پر بھار کیوں بنوں؟'

'بے شک!'

ہم دونوں میں مت بھید ہے اور اس کے انیک کارن ہیں۔ میں بھکتی اور پوجا کو مانو۔ جیون کا ستیہ سمجھتی ہوں۔ وہ اسے لچر سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ ایشور میں بھی ان کا وشواس نہیں ہے۔ میں ہندو سنسکرتی کو سب سے اونچا سمجھتی ہوں۔ انھیں ہماری سنسکرتی میں عیب ہی عیب نظر آتے ہیں۔ ایسے آدمی کے ساتھ میرا نباہ کیسے ہوسکتا ہے۔

وِمل خود بھکتی اور پوجا کو ڈھونگ سمجھتے تھے اور اتنی سی بات پر کسی استری کا پُروش سے الگ ہوجانا، اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ انھیں اپنی کئی مثالیں یاد تھیں۔ جہاں استریوں نے پتی ودھرمی ہوجانے پر بھی اپنے برت کا پالن کیا۔ اس سمسّیا کا ویوہارک انگ ہی ان کے سامنے تھا۔ پوچھا، لیکن انھیں کوئی آپتی تو نہ ہوگی؟

منجلا نے گرو کے ساتھ کہا۔ 'میں ایسی آپتیوں کی پرواہ نہیں کرتی۔ اگر پُروش سوتنتر ہے تو استری بھی سوتنتر ہے۔'

پھر اس نے نرم ہو کر کرون سور میں کہا۔ 'یوں کہیے کہ ہم اور وہ تین سال سے الگ ہی رہتے ہیں۔ ایک ہی مکان میں لیکن بولتے نہیں۔ جب کبھی وہ بیمار پڑے ہیں، میں نے ان کی تیمار داری کی ہے، ان پر کوئی سنکٹ آیا ہے تو میں نے ان سے سچی سہانوبھوتی کی ہے لیکن میں مر بھی جاؤں تو انھیں دکھ نہ ہوگا۔وہ خوش ہوں گے کہ گلا چھوٹ گیا۔ وہ میرا پالن پوشن کرتے ہیں اس لیے...'

اس کا گلا بھر آیا تھا۔ ایک چھن تک وہ چپ چاپ زمین کی اُور تاکتی رہی۔ پھر اسے بھے ہوا کہ کہیں وِمل اسے ہلکا اور اوچھی نہ سمجھ رہا ہو جو اپنے جیون کے گپت رہسیوں کا ڈھنڈھورا پیٹتی پھرتی ہے۔ اس بھرم کو وِمل کے من سے نکالنا ضروری تھا۔ اس نے انھیں یقین دلایا کہ آج تک کسی نے اس کے منہ سے یہ شبد نہیں سنے، یہاں تک کہ اس نے اپنے من کی ویتھا، کبھی اپنی ماتا سے بھی نہیں کہی۔ وِمل وہ پہلے ویکتی ہیں جن سے اس نے یہ باتیں کہنے کا ساہس کیاہے اور اس کا کارن یہی ہے کہ وہ جانتی ہے ان کے دل میں درد ہے، اور ایک استری کی وِوَشتا کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

وِمل نے لجاتے ہوئے کہا: 'یہ آپ کی کرپا ہے جو میرے بارے میں ایسا خیال کرتی ہیں۔'

اور ان کے من میں منجلا کے پرتی شردّھا اُتپنّ (پیدا) ہوئی۔ بہت دنوں کے بعد اسے ایک دیوی نظرآئی جو سدّھانت کے لیے اتنا ساہس کرسکتی ہے۔ وہ خودمن ہی من سماج سے وِدروہ کرتا رہتا تھا۔ سیوا آشرم بھی ان کے مانسک وِدروہ کا ہی پھل تھا۔ ایسی استری کے ہاتھوں میں وہ سیوا آشرم بڑی خوشی سے سونپ دے گا۔ منجلا اس کے لیے تیار ہو کر آگئی تھی۔

(2)

منجُلا کے جیون میں آتم دان کی، ماترا ہی زیادہ تھی۔ دیہہ کو وہ اس بھاؤنا کی پورتی کا سادھن ماتر سمجھتی تھی۔ دنیا کی بڑی، سے بڑی وبھوتی بھی اسے شانتی نہ دے سکتی تھی۔ مسٹر مہرا سے اسے کیول اس لیے اروچی تھی کہ وہ سادھارن پرانیوں کی بھانتی بھوگ ولاس کے پریمی تھے۔ جیون ان کے لیے اِچھاؤں میں بہنے کا نام تھا۔ سوارتھ کی سدّھی میں نیتی یا دھرم کی بادھا ان کے لیے اَسہیہ تھی۔ اگر ان میں کچھ اُدارتا ہوتی اور منجُلا سے مت بھید ہونے پر بھی وہ اس کی بھاؤناؤں کا آدر کرتے اور کم سے کم مکھ سے ہی اس میں سہیوگ کرتے ، تو منجُلا کا جیون سکھی ہوتا۔ پر اس بھلے آدمی کی پتنی سے ذرا بھی سہانوبھوتی (ہمدردی) نہ تھی اور وہ ہر ایک اوسر پر اس کے مارگ میں آکر کھڑے ہوجاتے تھے اور منجُلا من ہی من میں سمٹ کر رہ جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی بھاؤنائیں وکاس کا مارگ نہ پاکر ٹیڑھے میڑھے راستوں پر جانے لگیں۔ اگر وہ اس ابھاؤ کو کلا کا روپ دے سکتی تو اس کی آتما کو اس میں شانتی ملتی۔ جیون میں جو کچھ نہ ملا، اسے کلا میں پاکر وہ پرسنّ ہوتی، مگر اس میں وہ پرتبھا (صلاحیت) وہ رچنا شکتی نہ تھی اور اس کی آتما پنجڑے میں بند پکشی (چڑیا) کی بھانتی ہمیشہ بے چین رہتی تھی۔ اس کا اہم بھاؤ اتنا پرچھنّ ہوگیا تھا کہ وہ جیون سے وِرکت ہوکر بیٹھ سکتی تھی۔ وہ اپنے ویکتّو کو سوتنتر اور پرتھک رکھنا چاہتی تھی۔ اسے اس میں گرو اور الّاس ہوتا تھا کہ وہ بھی کچھ ہے۔ وہ کیول ورکش (درخت) پر پھیلنے والی اور اس کے سہارے جینے والی بیل نہیں ہے۔ اس کی اپنی الگ ہستی ہے، اپنا الگ کاریہ شیتر ہے۔

لیکن یتھارتھتاؤں کے اس سنسار میں آکر اسے معلوم ہوا کہ آتم دان کا جو آشے اس نے سمجھ رکھا تھا، وہ سراسر غلط تھا۔

سیوا آشرم میں ایسے لوگ اکثر آتے رہتے تھے جن سے تھوڑی سی خوشامد کر کے بہت کچھ سہایتا لی جاسکتی تھی۔ لیکن منجُلا کا آتم ابھیمان خوشامد پر کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ ان کے لیش گان سے بھرے ہوئے ابھی نندن پتر پڑھنا، ان کے بھونوں پر جاکر انھیں سیوا آشرم کے معائنے کا نیوتہ دینا یا ریلوے اسٹیشن پر جاکر ان کا سواگت کرنا، یہ

ایسے کام تھے جن سے اسے ہاردک گھرنا ہوتی تھی۔ لیکن سیوا آشرم کے سنچالن کا بھار اس پر تھا اور اسے اپنے من کو دبا کر اور کرتویہ کا آدرش سامنے رکھ کر یہ ساری نازبرداریاں کرنی پڑتی تھیں۔ یدّپی وہ ان وِدروہی بھاؤوں کو مقدور بھر چھپاتی تھی۔ پر جس کام میں من ہو، وہاں اُلاّس اور اُتساہ کہاں سے آئے؟ جن سمجھوتوں سے گھبرا کر وہ بھاگی تھی۔ وہ یہاں اور بھی وکرت روپ میں اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ اس کے من میں کٹوتا آتی جاتی تھی اور ایکاگر سیوا کی دھن مٹتی جاتی تھی۔

اس کے وِردھ وہ وِل کو دیکھتی تھی کہ اس کے چہرے پر کبھی شکن نہیں آتی۔ وہی سہاسیہ مکھ، وہی اُت سرگ سے بھرا ہوا اُدبھاؤ، وہی کریاشیل تمیتا۔ چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے ہمیشہ حاضر، سیوا آشرم کی کوئی کنّیا یا اَدھیاپکا بیمار پڑجائے۔ وِل اس کی تیمار داری کے لیے موجود ہے۔ سہانوبھوتی کا نہ جانے کتنا بڑا کوش اس کے پاس ہے کہ اس میں ذرا بھی چھتی نہیں آتی۔ اس کے من میں کسی پرکار کا سندیہہ یا سنشے نہیں ہے۔ اس نے ایک راستہ پکڑ لیاہے، اور اس پر قدم بڑھاتا چلا جارہا ہے۔ اسے وشواس ہے، اسی راستے سے وہ اپنے دھیے پر پہنچے گا۔ راہ میں جو یاتری مل جاتے ہیں، انھیں اپنا سنگی بنا لیتا ہے۔ جو کلیوا لے کر چلا ہے، وہ سنگیوں کو بانٹ کر کھانے میں آنند پاتا ہے۔ اسے نتیہ پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں، خوشامدیں کرنی پڑتی ہیں، اپمان سہنے پڑتے ہیں۔ اَیوگیہ ویکتیوں کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے، بھیک مانگنی پڑتی ہے مگر اسے غم نہیں۔ وہ کبھی نراش نہیں ہوتا۔ کبھی برا نہیں مانتا۔ اس کے اندر کوئی ایسی چیز ہے، جو ہزاروں ٹھوکریں کھانے پر بھی جیوں کی تیوں اچھلتی اور دوڑتی رہتی ہے۔ ادھیاپکائیں اکثر سادھارن سی باتوں پر شکایتیں کرنے لگتی ہیں، کبھی کبھی روٹھ جاتی ہے اور سیوا آشرم سے وِداع ہوجانا چاہتی ہیں۔ اگر دھوبن نے کپڑے خراب دھوئے یا کہارِن نے ان کی ساڑی میں داغ ڈال دیے یا چوکی دار نے ان کے کتے کو دھتکار دیا، یا ان کے کمرے میں جھاڑو نہیں لگی، یا گوالے نے دودھ میں پانی ملا دیا تو اس میں سیوا آشرم کے ادھیکاریوں کا کیا دوش؟ مگر انھی باتوں پر یہاں رونا گانا مچ جاتا ہے، دنیا سر پر اٹھالی جاتی ہے، اور وِل سیوک کی بھانتی انونے وِنے کر کے ان کا غصہ ٹھنڈا کرتا ہے۔ ان کی گھڑکیاں سنتا ہے اور ہنس کر رہ جاتا ہے۔ پھل یہ ہے کہ ادھیاپکاؤں کی اس پر شرّدھا ہوتی جاتی ہے۔ وہ اسے اپنا

افسر نہیں اپنا متر اور بندھو سمجھتی ہیں۔
مگر منجلا وِپل سے کچھ کھنچی رہتی ہے۔ کبھی اس سے کوئی شکایت نہیں کرتی، کبھی اس سے کسی معاملے میں صلاح نہیں لیتی۔ یدّ ہی وہ دل میں سمجھتی ہے کہ جس دنیا داری کو وہ آتما کا پتن کہہ کر اسے ہے سمجھتی ہے وہ واستو میں وکست مانوتا کا ہی روپ ہے، پھر بھی اپنے سدّھانت پریم کے ابھیمان کو توڑ ڈالنا اس کے لیے کٹھن ہے اور اس ابھیمان کے ہوتے ہوئے بھی وِپل کی وشُدّھہ نِسّوارتھ ویوہار کتا اسے زبردستی اپنی اور کھینچتی ہے۔ اس نے سادھارن منشیوں کے وِشے میں انوبھو سے من میں جو سیمائیں کھینچ لی تھیں، وِپل ان سے اوپر تھا۔ اس میں سوارتھ کا لیش بھی نہیں ہے۔ ابھیمان اسے چھو بھی نہیں گیا ہے۔ اس کے تیاگ کی کوئی سیما نہیں ہے۔ منجلا کے آدھیاتمک جیون میں منشیہ کا یہی سب سے اونچا آدرش تھا، لیکن وِپل کو اس آدرش کے سمیپ دیکھ کر اسے ایک پرکار کا ہار کا بودھ ہوتا تھا۔ آدرش کا مہتو اسی میں ہے کہ وہ پہنچ کے باہر ہو۔ اگر وہ سادھیہ ہو جائے تو آدرش ہی کیوں رہے؟ منجلا اپنی آدرش بھاؤنا کو اور اونچا بنا کر اس وچار میں سنتوش پانا چاہتی ہے کہ وپل ابھی اس آدرش سے بہت دور ہے، لیکن وِپل جیسے جبراً ان کا شرڈّھا پاتر بنتا جاتا ہے، وہ اپنے کو پرواہ میں بہنے سے روکنے کے لیے لکڑی کا سہارا لیتی ہے، پر اس کے پیروں کے ساتھ وہ لکڑی بھی اکھڑ جاتی ہے، اور وہ کسی دوسری روک کی تلاش کرنے لگتی ہے اور انتِ میں اسے یہ سہارا مل جاتا ہے۔
اس نے اپنی تِور درشٹی میں دیکھ لیا ہے کہ وپل اس کی کارگزاریوں سے سنتشٹ نہیں ہے۔ پھر وہ اس سے شکایت کیوں نہیں کرتا، اس سے جواب کیوں نہیں مانگتا؟ اسی تِور درشٹی سے اس نے یہ بھی تاڑ لیا ہے کہ وپل اس کے روپ رنگ سے اپربھاوت نہیں ہے پھر آشیتلتا ہے؟ اور اداسینتا کیوں؟ کیا اس سے یہ سدھ نہیں ہوتا کہ وہ کپٹی یا کائر اوروں سے وہ کتنا کھل کر ملتا ہے، کتنی ہمدردی سے پیش آتا ہے تو منجلا سے وہ کیوں دور دور رہتا ہے؟ کیوں اس سے اوپری من سے باتیں کرتا ہے؟ وہ پہلے دن کا نشپکٹ ویوہار کہاں گیا؟ کیا وہ یہ دکھانا چاہتا ہے کہ منجلا کی اسے بالکل پرواہ نہیں ہے یا اس سے کیول اس لیے ناراض ہے کہ دھنیوں کی چوکھٹ پر سر نہیں جھکاتی؟ یہ خوشامد اسے مبارک رہے۔ منجلا سیوا کرے گی، پر اپنے آتم ابھیمان کو اچھوتا رکھ کر۔

ایک دن پراتہ کال منجلا باغیچے میں ٹہل رہی تھی کہ ولی نے آکر اسے پرنام کیا اور اسے سوچنا دی کہ سیوا آشرم کا وارشک اتسو نکٹ آرہا ہے۔ اس کے لیے تیاری کرنی چاہیے۔

منجلا نے اداسین بھاؤ سے پوچھا۔ 'یہ جلسہ تو ہر سال ہی ہوتا ہے۔'

ولی نے کہا۔ 'جی ہاں ہرسال، مگر اب کی زیادہ سماروہ سے کرنے کا وچار ہے۔'

میرے کیے جو کچھ ہوسکتا ہے، وہ میں بھی کروں گی، حالانکہ آپ جانتے ہیں، میں اس وشے میں زیادہ نپن نہیں ہوں۔'

'اس کی سپھلتا کا سارا بھار آپ ہی کے اوپر ہے۔'

'میرے اوپر؟'

'جی ہاں، آپ چاہیں تو یہ آشرم کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔'

'میرے وشے میں آپ کا انومان غلط ہے۔'

ولی نے وشواس بھرے سور میں کہا۔ میرا انومان غلط ہے۔ یا آپ کا انومان غلط ہے، یہ تو جلد ہی معلوم ہوا جاتا ہے۔

آج یہ پہلی پریرنا تھی، جو ولی نے منجلا سے کی۔ جس دن سے اس نے سیوا آشرم اس کے ہاتھ میں سونپا تھا، اس دن سے کبھی اس وشے میں کوئی آدیش نہ دیا تھا۔ اسے کبھی اس کا ساہس ہی نہ ہوا۔ ملاقاتوں میں ادھر ادھر کی باتیں ہوکر رہ جاتیں۔ شاید ولی سمجھتا تھا کہ منجلا نے جو تیاگ کیا ہے، وہ کافی زیادہ ہے اور اس پر اب اور بوجھ ڈالنا ظلم ہوگا۔ یا شاید وہ دیکھ رہا تھا کہ منجلا کا من اس سنستھا میں رَم جائے تو کچھ کہے۔ آج جو اس نے وِنے اور آگرہ سے بھرا ہوا یہ آدیش دیا تو منجلا میں ایک نئی اسپھورتی دوڑ گئی۔ سیوا آشرم سے ایسا نجتو اسے کبھی نہ ہوا تھا۔ ولی سے اسے جو دربھاؤنائیں تھیں، سب جیسے کائی کی طرح پھٹ گئیں اور وہ پورن تن میتا کے ساتھ تیاریوں میں لگ گئی۔ اب تک وہ کیوں آشرم سے اتنی اداسین تھی، اس پر اسے آشچریہ (حیرت زدہ) ہونے لگا۔ ایک سپتاہ تک وہ رات دن مہمانوں کے آدر ستکار میں ویست رہی، کھانے تک کی فرصت نہ ملتی، دوپہر کا کھانا تیسرے پہر ملتا۔ کوئی مہمان کسی گاڑی سے آتا، کوئی کسی گاڑی سے، اکثر اسے رات کو بھی اسٹیشن جانا پڑتا۔ اس پر طرح طرح کے کرتبوں کا ریہرسل بھی کرانا

پڑتا، اپنے بھاشن کی تیاری الگ۔ اس سادھنا کا پرسکار تو ملا کہ جلسہ ہر ایک درشٹی سے سپھل رہا، اور کئی ہزار کی رقم چندے میں مل گئی۔ مگر جس دن مہمان رخصت ہوئے۔ اسی دن منجلا کو نئے مہمان کا سواگت کرنا پڑا، جس نے تین دن تک اسے سر نہ اٹھانے دیا۔ ایسا بخار اسے کبھی نہ آیا تھا۔ تین ہی دن میں ایسی ہو گئی، جیسے برسوں کی بیمار ہو۔

وِل بھی دوڑ دھوپ میں لگا ہوا تھا۔ پہلے تو کئی دن پنڈال بنوانے اور مہمانوں کی دعوت کا انتظام کرنے میں لگا رہا۔ جلسہ ختم ہوجانے پر جہاں جہاں سے جو سامان آئے تھے۔ انھیں سہیج سہیج کر لوٹانے کی پڑ گئی۔ منجلا کو دھنیہ واد دینے بھی نہ آسکا۔ کسی نے کہا ضرور کہ دیوی جی بیمار ہیں، مگر اس نے سمجھا، تھکن سے کچھ حرارت ہو آئی ہوگی، زیادہ پرواہ نہ کی۔ لیکن چوتھے دن خبر ملی کہ بخار ابھی تک نہیں اترا اور بڑے زور کا ہے، تو وہ بدحواس دوڑا ہوا آیا اور اپرادھی بھاؤ سے اس کے سامنے کھڑا ہو کر بولا۔ اب کیسی طبیعت ہے؟ آپ نے مجھے بلا کیوں نہ لیا؟

منجلا کو ایسا جان پڑا جیسے ایکا یک اس کا بخار ہلکا ہوگیا ہے۔ سر کا درد بھی کچھ شانت ہوتا ہوا جان پڑا۔ لیٹے لیٹے وِوِش آنکھوں سے تاکتی ہوئی بولی۔ بیٹھ جایئے، آپ کھڑے کیوں ہیں؟ پھر مجھے بھی اٹھنا پڑے گا۔

وِل نے اس بھاؤ سے دیکھا، مانو اس کا بس ہوتا تو یہ سارا تاپ اور درد خود لے لیتا۔ پھر آگرّہ سے بولا۔ نہیں نہیں آپ لیٹی رہیں، میں بیٹھ جاتاہوں۔ اس کا اپرادھی میں ہوں۔ میں نے ہی آپ کو اس زحمت میں ڈالا۔ مجھے چھما کیجیے۔ میں نے آپ سے وہ کام لیا جو مجھے خود کرنا چاہیے تھا۔ مگر ابھی جاکر ڈاکٹر کو بلا لاتا ہوں۔ کیا کہوں مجھے ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ فضول کے کاموں میں ایسا پھنسا رہا۔ ......

اور اس نے پیٹھ پھیری ہی تھی کہ منجلا نے ہاتھ اٹھا کر منع کرتے ہوئے کہا۔ نہیں نہیں، ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ ذرا بھی پریشان نہ ہوں۔ میں بالکل اچھی ہوں۔ کل تک اٹھ بیٹھوں گی۔

اس کے من میں اور کتنی ہی باتیں اٹھیں مگر اس نے ہونٹ بند کر لیے۔ اس آویش میں وہ نہ جانے کیا کیا بک جائے گی۔ ابھی تک وِل نے شاید اسے دیوی سمجھ کر اس کے سامنے سر جھکایا ہے۔ اس سے دور اوشیہ رہا ہے۔ مگر اس لیے نہیں کہ وہ سمیپ آنا

نہیں چاہتا، بلکہ اس لیے کہ اپنی سرلتا میں اپنی سادھن میں، اس کے سمیپ آنے میں جھجھکتا ہے کہ کہیں دیوی کو ناگوار نہ گزرے۔ وِل نے اپنے من میں اسے جس اونچے آسن پر بیٹھا دیا ہے، اس سے نیچے وہ نہ آئے گی۔ وِل کو معلوم نہیں، وہ کتنا ساتوک، کتنا وشالاتما پرش ہے۔ ایسے آدمی کی اِسمرت میں ہمیشہ کے لیے ایک آکاش میں اڑنے والی نِش کلنک، نِشپکٹ (کشادہ دل) ستی کی دھندلی چھایا چھوڑ جانا کتنا بڑا موہ ہے۔

اس نے ونود بھاؤ سے کہا۔ ہاں، کیوں نہیں، کیوں کہ آپ منشیہ ہیں اور میں کاٹھ کی پتلی۔

'نہیں آپ دیوی ہیں۔'

'نہیں ایک نادان عورت۔'

'آپ نے جو کچھ کر دکھایا وہ میں سو جنم لے کر بھی نہ کر سکتا تھا۔' اس کا کارن بھی آپ نے سوچا؟ یہ استری کی وجے نہیں۔ اس کی ہار ہے۔ اگر ان دوشوں کے ساتھ میں استری نہ ہو کر پرش ہوتی۔ تو شاید اس کی چوتھائی سپھلتا بھی نہ ملتی۔ یہ میری جیت نہیں۔ میرے نارِتو کی جیت ہے۔ روپ تو اَسار وستو ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ دھوکا ہے، فریب ہے، دربلتاؤں کے چھپانے کا پردہ ماتر۔'

وِل نے آویش میں کہا۔ 'یہ آپ کہتی ہیں منجُلا دیوی؟' روپ سنسار کا سب سے بڑا ستّیہ ہے۔ روپ کو بھینکر (ڈراونا) سمجھ کر ہمارے مہاتماؤں اور پنڈتوں نے دنیا کے ساتھ گھور انیائے کیا ہے۔'

منجُلا کی سندر چھوی گرو کے پرکاش سے چمک اٹھی۔ روپ کو استیہ سمجھنے کے پریاس میں سدیو اسپھل رہی تھی اور اپنی نشٹھا اور بھکتی سے مانو اپنے روپ کا پرائشچت (کفارہ) کر رہی تھی۔ اسی روپ کے اس سمرتھن نے ایک چھن (لمحہ) کے لیے اسے مُگدھ کر دیا۔ مگر وہ سنبھل کر بولی۔ آپ دھوکے میں ہیں۔ وِل بابو مجھے چھما (معاف) کیجیے گا۔ مگر یہ روپ کی اُپاسنا آپ میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مردوں نے ہمیشہ روپ کی اُپاسنا کی ہے۔ تھورے سے پنڈتوں یا مہاتماؤں نے چاہے روپ کی نندا کی ہو پر مردوں نے پرایہ روپ آسکتِ ہی کا پرمان دیا ہے۔ یہاں تک کہ روپ کے لیے دھرم کی پرواہ نہیں کی اور ان پنڈتوں اور مہاتماؤں نے بھی زبان یا قلم سے چاہے روپ کے وردھ وش اگلا ہو،

لیکن انتہ کرن سے وے بھی اس کی پوجا کرتے ہیں۔ جب کبھی روپ نے ان کی پریکشا کی ہے۔ ان کی تپسّیا (عبادت) پر وجے پائی ہے۔ پھر بھی جو استیہ ہے وہ استیہ ہی رہے گا۔ روپ کا آکرشن کیول باہری آنکھوں کے لیے ہے۔ گیانیوں کی نگاہ میں اس کا کوئی مولیہ (قیمت) نہیں۔ کم سے کم آپ کے مکھ سے میں روپ کا بکھان (تعریف) نہیں سننا چاہتی، کیوں کہ میں آپ کو دیوتلّیہ (دیوتا کے برابر) سمجھتی ہوں اور دل سے آپ پر شردھا رکھتی ہوں۔ وِل وکشِپت سا زمین کی طرف تاکتا رہا اور برابر تاکتا ہی چلا گیا۔ جیسے وہ مورچھا وستھا میں ہو۔ پھر چونک کر اٹھا اور اپرادھیوں کی بھانتی سر جھکائے سندگھد (مشکوک) بھاؤ سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

اور منجلا نشچنت بیٹھی رہی۔

(3)

اس دن سے ایکا یک وِل کا سارا اُتساہ اور کرمنّیتا جیسے ٹھنڈی پڑ گئی۔ جیسے اس میں اب اپنا منہ دکھلانے کی ہمت نہیں ہے۔ مانو اس رہسّیہ کا پردہ کھل گیا ہے اور چاروں طرف اس کی ہنسی اڑ رہی ہے۔ وہ اب سیوا آشرم میں بہت کم آتا ہے اور آتا بھی ہے تو اڈھیاپیکاؤں سے کچھ بات چیت نہیں کرتا۔ سب سے جیسے منہ چراتا پھرتا ہے۔ منجلا کو ملنے کا کوئی اوسر نہیں دیتا اور جب منجلا ہار کر اس کے گھر جاتی ہے تو کہلا دیتا ہے، گھر میں نہیں ہے۔ حالانکہ وہ گھر میں چھپا بیٹھا رہتا ہے۔

اور منجلا اس کے منو رہسّیہ کو سمجھنے میں اسمرتھ ہے۔ وِل نے اپنی سادھنا اور سدبھاؤنا سے اسے اپنی اور آکرشت کر لیا ہے۔ اس میں سندیہہ نہیں ہے وہ ایک ناری کی گہری انتردرشٹی (باطنی نظر) سے دیکھ رہی ہے کہ وِل بھی اس کا اُپاسک بن بیٹھا ہے اور ذرا بھی پروتساہن پانے پر اپنے کو اس کے چرنوں پر ڈال دے گا۔ اس نے برسوں سے جو زندگی بسر کی ہے۔ اس میں پریم نہیں ہے، سیوا اور کرتویہ کا دامن پکڑ کر بھی اسے اپنی اپورنتا کا گیان ہوتا رہتا ہے۔ جس پرش میں اس کا پریم نہیں نہ وشواس ہے اس کے پرتی وہ کسی طرح کا نیتک یا دھارمک بندھن نہیں سویکار (منظور) کرتی۔ وہ اپنے کو سوچھند سمجھتی ہے چاہے سماج اس کی سوچھندتا (ظالمانہ) نہ مانے پر اس کی آتما اس وشے

میں اپنے کو آزاد سمجھتی ہے۔ مگر وِل کی نظروں میں آدر اور بھگتی پانے کا موہ اس میں اتنا پربل ہے کہ وہ اس سوچھندتا کی بھاؤنا کو سر نہیں اٹھانے دیتی۔ وہ وِل سے سنسرگ کی گھنِشٹھتا تو چاہتی ہے پر اپنے آتما بھیمان کی رکچھا کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہی وِل کے پوتر اور نرمل جیون میں وہ داغ نہیں لگانا چاہتی۔ اس نے سوچا تھا وِل کو دوا کا ہلکا سا گھونٹ پلا کر وہ سوستھ کر دے گی۔ وہ سوستھ ہو کر اس کے منودیان میں آئے گا۔ پھولوں کو دیکھ کر پرسن ہوگا۔ ہری ہری دوب پر لیٹے گا۔ پکشیوں کا گانا سنے گا۔ اس سے وہ اتنا ہی سنسرگ چاہتی تھی۔ دیپک کے پرکاش کا آنند تو دیپک سے دور رہ کر ہی لیا جا سکتا ہے۔ اسے اسپرش کر کے تو وہ اپنے کو جلا سکتا ہے، مگر اب اسے معلوم ہوا کہ دوا کی وہ گھونٹ بادھا کو ہرنے کے بدلے ایک دوسرا روگ پیدا کر گئی۔ وِل میں نرلیپ ہو کر رہنے کی شکتی نہ تھی۔ وہ جس چیز کی اور جھکتا تھا تن من میں اسی کا ہو جاتا تھا اور جب کھنچتا تھا تو مانو ناطہ ہی توڑ لیتا تھا۔ اس کے اس نئے ویوہار کو منجلا اپنا اپمان سمجھتی ہے اور من یہاں سے اچاٹ ہوتا جاتا ہے۔

آخر ایک دن اس نے وِل کو پکڑ ہی لیا تھا۔ منجلا جانتی تھی، وِل روز دریا کنارے سیر کرنے جاتا ہے۔ ایک دن اس نے وہیں جا گھیرا اور اپنا استعفیٰ اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

وِل کے گلے میں جیسے پھانسی پڑ گئی۔ زمین کی اُور تاکتا ہوا بولا۔ 'ایسا کیوں،؟ 'اس لیے کہ میں اپنے کو اس کام کے یوگیہ نہیں پاتی۔'

'سنستھا تو خوب چل رہی ہے؟'

'پھر بھی میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔'

'مجھ سے کوئی اپرادھ ہوا ہے؟'

'آپ اپنے دل سے پوچھیے۔'

وِل نے اس واکیہ کا وہ آشے سمجھ لیا جو منجلا کی کلپنا سے بھی کوسوں دور تھا۔ اس کے مکھ کا رنگ اڑ گیا۔ جیسے رَکت کی گتی بند ہوگئی ہو۔ اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ ایسا فیصلہ تھا جس کی کہیں اپیل نہ تھی۔

آہت سور میں بولا۔ جیسی آپ کی اِچّھا۔ مجھ پر دیا کیجیے۔ منجلا نے آردر ہو کر کہا۔

'تو میں چلی جاؤں؟'

'جیسی آپ کی اچھا'

اور وہ جیسے گلے کا پھندا چھڑا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ منجلا کرُن نیتروں سے اسے دیکھتی رہی۔ مانو سامنے کوئی نوکا ڈوبی جا رہی ہو۔

چابک کھا کر ومل پھر سیوا شرم کی گاڑی میں جت گیا۔

کہہ دیا گیا منجلا دیوی کے پتی بیمار تھے۔ چلی گئی۔ کام کاجی آدمی پریم کا روگ نہیں پالتا، اسے کویتا کرنے اور پریم پتر لکھنے اور ٹھنڈی آہیں بھرنے کی کہاں فرصت؟ اس کے سامنے تو کرتویہ ہے، پرگتی کی اچھا ہے، آدرش ہے، ومل بھی کام دھندے میں لگ گیا۔ ہاں کبھی کبھی ایکانت میں منجلا کی یاد آجاتی تھی اور لجّا سے اس کا مستک آپ ہی آپ جھک جاتا تھا۔ اسے ہمیشہ کے لیے سبق مل گیا تھا۔ ایسی ستی۔ سادھوی کے پرتی اس نے کتنی بے ہودگی کی۔

تین سال گذر گئے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ومل اب کی سفری کی سیر کرنے گیا ہوا تھا اور ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ ایک دن بینڈ اسٹینڈ کے سمیپ کھڑا بینڈ سن رہا تھا کہ بغل کی ایک بنچ پر منجلا بیٹھی نظر آئی۔ آبھوشنوں اور رنگوں سے جگمگاتی ہوئی۔ اس کے پاس ہی ایک یووک کوٹ پینٹ پہنے بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ دونوں کے چہرے کھلے ہوئے، دونوں پریم کے نشے میں مست۔ ومل کے من میں سوال اٹھا۔ یہ یووک کون ہے؟ منجلا کا پتی تو نہیں ہوسکتا یا سمبھو ہے، اس کا پتی ہی ہو، دمپتی میں اب میل ہوگیا ہو۔ اسے منجلا کے سامنے جانے کا ساہس نہ ہوا۔

دوسرے دن وہ ایک انگریزی تماشا دیکھنے سنیما ہال گیا تھا۔ انٹرول میں باہر نکلا تو کیفے میں پھر منجلا دکھائی دی۔ سر سے پاؤں تک انگریزی پہناوے میں، وہی کل والا یووک آج بھی اس کے ساتھ تھا۔ آج ومل سے ضبط نہ ہوسکا۔ اس کے پہلے کہ وہ من میں کچھ نشچے کر سکے، وہ منجلا کے سامنے کھڑا تھا۔

منجلا اسے دیکھتے ہی سناٹے میں آگئی۔ منھ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ مگر ایک ہی چھن (لمحہ) میں اس نے اپنے کو سنبھال لیا اور مسکرا کر بولی۔ ہیلو ومل بابو۔ آپ یہاں کیسے؟ اور اس نے اس نویووک سے ومل کا پریچے کرایا۔ آپ مہاتما پرش ہیں کاشی کے

سیوا آشرم کے سنچالک اور یہ میرے متر مسٹر کھنا ہیں۔ جو ابھی حال میں انگلینڈ سے آئی سی ایس ہو کر آئے ہیں۔ دونوں آدمیوں نے ہاتھ ملائے۔

منجلا نے پوچھا۔ سیوا آشرم تو خوب چل رہا ہے؟ میں نے اس کی وارشک رپورٹ پتروں میں پڑھی تھی۔ آپ یہاں کہاں ٹھرے ہوئے ہیں۔ وِل نے اپنے ہوٹل کا نام بتلایا۔

کھیل پھر شروع ہوگیا۔ کھنا نے کہا۔ 'کھیل شروع ہوگیا۔ چلو اندر چلیں۔'

منجلا نے کہا۔ 'تم جا کر دیکھو۔ میں ذرا مسٹر وِل سے باتیں کروں گی۔ کھنا نے وِل کو جلتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور اکڑتا ہوا اندر چلا گیا۔ منجلا اور وِل باہر آکر ہری ہری گھاس پر بیٹھ گئے۔ وِل کا ہردے گرو سے پھولا ہوا تھا۔ آشا میں اُلاس کی چاندنی سی ہردے پر چھٹکی ہوئی تھی۔

منجلا نے گمبھیر سور میں پوچھا۔ 'آپ کو میری یاد کاہے کو آئی ہوگی؟ کئی بار اِچھا ہوئی کہ آپ کو پتر لکھوں، لیکن سنکوچ کے مارے نہ لکھ سکی۔ آپ مزے میں تو تھے۔

وِل کو اس کا یہ الاہنا بُرا لگا۔ کہاں ابھی ہاسیہ ونود میں مگن تھے۔ کہاں اسے دیکھتے ہی گمبھیرتا کی پتلی بن گئی۔ روکھے سوَر میں بولا۔ 'ہاں بہت اچھی طرح تھا۔ آپ تو آرام سے تھیں؟' منجلا آردر کنٹھ سے بولی۔ 'میرے بھاگیہ میں تو آرام لکھا ہی نہیں ہے۔ مسٹر وِل پچھلے سال پتی کا دیہانت ہوگیا۔ انھوں نے جتنی جائداد چھوڑی اس سے زیادہ قرض چھوڑا۔ انھیں الجھنوں میں پڑی رہی۔ سواستھ بھی بگڑ گیا۔ ڈاکٹروں نے پہاڑ پر رہنے کی صلاح دی۔ تب سے یہیں پڑی ہوئی ہوں۔ آپ نے مجھے خط تک نہ لکھا۔'

'آپ کے سر یوں ہی کیا کم بوجھ ہے کہ میں اپنی چنتاؤں کا بھار بھی رکھ دیتی؟'

پھر بھی ایک متر کے ناطے مجھے خبر تو دینی ہی تھی۔ منجلا نے سور میں شرڈھا بھر کر کہا۔ آپ کا کام ان جھگڑوں میں پڑنا نہیں ہے، وِل بابو۔ آپ کو ایشور نے سیوا اور تیاگ کے لیے رچا ہے۔ وہی آپ کا چھیتر ہے۔ میں جانتی ہوں آپ کی مجھ پر دیادرشٹی ہے۔ میں کہہ نہیں سکتی میری نظروں میں اس کا کتنا مولیہ ہے۔ جیسے کبھی دیا اور پریم نہ ملا ہو، وہ ان کی اُور لپکے تو چھما (معافی) کے یوگیہ (قابل) ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں، ان کا پرتیاگ کر کے میں نے کتنی بڑی قربانی کی ہے۔ مگر میں نے اسی کو اپنا کرتویہ سمجھا۔

میں سب کچھ سہہ لوں گی، پر آپ کو دیوتو کے اونچے آسن سے نیچے نہ گراؤں گی۔ آپ گیانی ہیں، سنسکار کے سکھ کتنے اَنتیہ ہیں، آپ خوب جانتے ہیں، ان کے پرلوبھن میں نہ آییۓ۔ آپ منشیہ ہیں، آپ میں بھی اِچھائیں ہیں، واسنائیں ہیں، لیکن اِچھاؤں پر وجے پاکر ہی آپ نے یہ اونچا پد پایا ہے۔ اس کی رکشا کیجیے اور ادھیاتم ہی آپ کی مدد کرسکتا ہے۔ اسی سادھنا سے آپ کا جیون ساتوک ہوگا اور من پوتر ہوگا۔'

وِمل نے ابھی ابھی منجلا کو آمود پرمود میں کرینا کرتے دیکھا تھا۔ کھنّا سے اس کا سمبندھ کس طرح کا ہے، یہ بھی وہ سمجھ رہا تھا۔ پھر بھی اس اپدیش میں اسے سچی سہانوبھوتی کا سندیش ملا۔ ولاسنی منجلا اسے دیوی کے روپ میں نظر آئی۔ اس کے بھیتر کا اہنکار اس کی لولپتا سے بلوان تھا۔ سدبھاؤنا سے بھر کر بولا۔ 'دیوی جی آپ نے جن شبدوں میں میرا سمان کیا ہے۔ ان کے لیے آپ کا احسان مند ہوں۔ کہیے، میں آپ کی کیا سیوا کرسکتا ہوں۔'

منجلا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ 'آپ کی کرپا دِرشٹ کافی ہے۔'

اسی وقت کھنّا سنیما ہال سے باہر آتا دکھائی دیا۔

(یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں ماہنامہ 'ہنس' ستمبر 1936 میں شائع ہوا۔ 'کفن' میں شامل ہے، اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔)

کشمیری سیب

کل شام کو چوک میں دوچار ضروری چیزیں خریدنے گیا تھا۔ پنجابی میوہ فروشوں کی دُکانیں راستے میں پڑتی ہیں۔ ایک دُکان پر بہت اچھے رنگ دار، گلابی سیب سجے ہوئے نظر آئے۔ جی للچا اٹھا۔ آج کل شِکشِت (تعلیم یافتہ) سماج میں وِٹامن اور پُروٹین کے شبدوں میں وِچار کرنے کی پرَوِرتی ہوگئی ہے۔ ٹماٹو کو پہلے کوئی سینت میں بھی نہ پوچھتا تھا۔ اب ٹماٹو بھوجن کا آوشیک انگ بن گیا ہے۔ گاجر بھی پہلے غریبوں کے پیٹ بھرنے کی چیز تھی۔ اَمیر لوگ تو اُس کا حَلْوہ ہی کھاتے تھے۔ مگر اب پتا چلا ہے کہ گاجر میں بھی بہت وِٹامن ہے، اس لیے گاجر کو بھی میزوں پر استھان ملنے لگا ہے اور سیب کے وِشے میں تو یہ کہا جانے لگا ہے کہ ایک سیب روز کھایئے تو آپ کو ڈاکٹروں کی ضرورت نہ رہے گی۔ ڈاکٹر سے بچنے کے لیے نمکوڑی تک کھانے کو تیار ہوسکتے ہیں۔ سیب تو رَس اور سواد میں اگر آم سے بڑھ کر نہیں ہے تو گھٹ کر بھی نہیں۔ ہاں، بنارس کے لنگڑے اور لکھنؤ کے دَسہری اور بمبئی کے الفاسوں کی بات دوسری ہے۔ اُن کے ٹکر کا پھل سنسار میں دوسرا نہیں ہے، مگر ان میں وِٹامن اور پروٹین ہے یا نہیں، ہے تو کافی ہے یا نہیں، ان وِشیوں پر ابھی کسی پچھمی ڈاکٹر کی ویوستھا دیکھنے میں نہیں آئی۔ سیب کو یہ وِیوَستھا مل چکی ہے۔ اب وہ کیول سواد کی چیز نہیں ہے، اُس میں گُن بھی ہے۔ ہم نے دُکان دار سے مول بھاؤ کیا اور آدھ سَیر سیب مانگے۔

دُکان دار نے کہا۔ 'بابو جی بڑے مزے دار سیب آئے ہیں۔ خاص کشمیر کے۔ آپ لے جائیں، کھا کر طبیعت خوش ہوجائے گی۔'

میں نے رومال نکال کر اُسے دیتے ہوئے کہا۔ 'چُن چُن کر رکھنا' دُکان دار نے ترازو اُٹھائی اور اپنے نوکر سے بولا۔ لُونڈے! آدھ سیر کشمیری سیب نکال لا۔ چُن کر لانا۔'

لونڈا چار سیب لایا۔ دُکان دار نے تولا، ایک لِفافے میں اُنھیں رکھا اور رومال میں باندھ کر مجھے دے دیا۔ میں نے چار آنے اُس کے ہاتھ میں رکھے۔

گھر آکر لفافہ جیوں کا تیوں رکھ دیا۔ رات کو سیب یا کوئی دوسرا پھل کھانے کا قاعدہ نہیں ہے۔ پھل کھانے کا سمے تو پراتہ کال ہے۔ آج صبح منہ ہاتھ دُھو کر جو ناشتہ کرنے کے لیے ایک سیب نکالا ،تو سڑا ہوا تھا۔ ایک روپئے کے آکار کا چھلکا گل گیا تھا۔ سمجھا، رات کو دُکان دار نے دیکھا نہ ہوگا۔ دوسرا نکالا ۔مگر یہ آدھا سڑا ہوا تھا۔ اب سندیہہ ہوا، دُوکان دار نے مجھے دُھوکا تو نہیں دیا ہے۔ ایک طرف دب کر بالکل پچک گیا تھا۔ چوتھا دیکھا۔ وہ یوں تو بے داغ تھا۔ مگر اُس میں ایک کالا سوراخ تھا جیسا اکثر بیروں میں ہوتا ہے۔ کاٹا تو بھیتر وِیسے ہی دھبّے، جیسے کیڑے بیر میں ہوتے ہیں۔ ایک سیب بھی کھانے لائق نہیں۔ چار آنے پیسوں کا اِتنا غم نہ ہوا جتنا سماج کے اس چارِترِک پتَن کا۔ دکان دار نے جان بوجھ کر میرے ساتھ دھوکے بازی کا وِیوہار کیا۔ ایک سیب سڑا ہوا ہوتا تو اُن کو چھما کے یوگیہ سمجھتا۔ سوچتا، اس کی نگاہ نہ پڑی ہوگی۔ مگر چار کے چاروں خراب نکل جائیں ،یہ تو صاف دھوکا ہے۔ مگر اس دھوکے میں میرا بھی سہیوگ تھا۔ میرا اُس کے ہاتھ میں رومال رکھ دینا۔ مانواُسے دھوکا دینے کی پریرنا تھی۔ اُس نے بھانپ لیا کہ یہ مہاشے اپنی آنکھوں سے کام لینے والے جیو نہیں ہیں اور نہ اتنے چوکس ہیں کہ گھر سے لوٹانے آئیں۔ آدمی بے ایمانی تبھی کرتا ہے جب اُسے اَوسر ملتا ہے۔ بے ایمانی کا اَوسر دینا، چاہے وہ اپنے ڈھیلے پن سے ہو یا سہج وشواس سے، بے ایمانی میں سہیوگ دینا ہے۔ پڑھے لکھے بابوؤں اور کرمچاریوں پر تو اب کوئی وشواس نہیں کرتا۔ کسی تھانے یا کچہری یا میونسپلٹی میں چلے جایئے، آپ کی ایسی دُرگتی ہوگی کہ آپ بڑی سے بڑی ہانی اُٹھا کر بھی اُدھر نہ جائیں گے۔ بیوپاریوں کی ساتھ ابھی تک بنی ہوئی تھی۔ یوں تول میں چاہے چھٹانک آدھ چھٹانک کس لیں۔ لیکن آپ انھیں پانچ کی جگہ بھول سے دس کے نوٹ دے آتے تھے تو آپ کو گھبرانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ آپ کے روپئے سورکشِت (محفوظ) تھے۔ مجھے یاد ہے، ایک بار میں نے محرم کے میلے میں ایک کھونچے والے سے ایک پیسے کی رِیوڑیاں لی تھیں اور پیسے کی جگہ اُٹھنّی دے آیا تھا۔ گھر آکر جب اپنی بھول

معلوم ہوئی تو کھونچے والے کے پاس دوڑا گیا۔ آشا نہیں تھی کہ وہ اُٹھنی لوٹائے گا، لیکن اس نے پرسن چِت سے اُٹھنی لوٹادی اور اُلٹے مجھ سے چھما مانگی اور یہاں کشمیری سیب کے نام سے سڑے ہوئے سیب بیچے جاتے ہیں۔ مجھے آشا ہے، پاٹھک بازار میں جاکر میری طرح آنکھیں نہ بند کرلیا کریں گے۔نہیں اُنھیں بھی کشمیری سیب ہی ملیں گے۔

(یہ کہانی بنارس کے ہندی ماہنامہ 'ہنس' میں اکتوبر 1936 میں شائع ہوئی۔ مجموعہ 'کفن' میں شامل ہے۔ اُردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔)

ایک اپُورن کہانی

بابو سیوا رام نے بڑے بڑے فلاسفروں کا مطالعہ کیا تھا۔ فلسفہ میں ایم.اے. تھے، مگر زندگی کے راستہ میں بی وتی مرائن سے زیادہ بہتر کوئی رہنما نہ ملا تھا۔ استدلال کی دنیا میں تو وہ برگسن اور دانتے کئی کئی فلاسفروں کے معتقد تھے، مگر دنیائے عمل میں وہ لجاوتی کے پیرو تھے۔ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرکے کہ وہ فلسفیانہ حملوں کا نشانہ نہ بننا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ گھر میں لجُاوتی کا راج تھا۔ سیوا رام اپنی چارپائی آپ بچھا لیں، نوکر بیٹھا رہتا تھا، لیکن لجاوتی کے اشارے پر کام کرتا تھا۔ وہ کہیں باہر سے گھر میں آتی تو گھر میں ہلچل مچ جاتی۔ مگر سیوا رام گھر میں آئے تو کسی کو گھر میں خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ وہ کالج سے لوٹ کر اپنے کمرے میں جاتے، کپڑے اتارتے، تب کچھ ناشتہ کرنے خود آتے تھے۔ آج وہ اپنے کمرے میں نہ جا کر سیدھے لجُاوتی کے پاس آئے۔ لجّا نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا، بولی، ''کپڑے تو اتار دیتے۔ چہرا کچھ اترا ہوا ہے۔''

سیوا رام نے کتابوں کا بنڈل چارپائی پر پٹک دیا اور کھڑے کھڑے بولے، ''ایک نئی مصیبت آ کھڑی ہوئی ہے۔ موہنی کو کسی طرح سمجھا بجھا کر یہاں سے روانہ کرنا چاہیے۔ پرنسپل صاحب نے آج مجھے بری طرح ڈانٹا۔''

سیوا رام کا چہرہ دیکھ کر ان کے فلسفی ہونے کا وہم بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ موٹے موٹے ہونٹ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بڑی بڑی مونچھیں، فربہ جسم اور تارکول کا سا رنگ، اونچی اچکن پہنتے تھے اور پاجامہ بھی اونچا ہی پہنتے تھے۔

(یہ کسی افسانہ کا جز ہے جو غیر مکمل ہے۔ 'اپراہیہ ساھتیہ' میں شائع ہوا ہے۔)

کرکٹ میچ

یکم جنوری 1935

آج کرکٹ میچ میں مجھے مایوسی ہوئی اس کا اظہار نہیں کرسکتا۔ ہماری ٹیم حریفوں سے کہیں زیادہ مستحکم تھی۔ مگر ہمیں ہار ہوئی اور وہ لوگ فتح و نصرت کا ڈنکا بجاتے ہوئے ٹرافی اُڑالے گئے۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ ہمارے یہاں قیادت کے لیے لیاقت شرط نہیں۔ ہم قیادت کے لیے ثروت اور دولت لازمی سمجھتے ہیں۔ ہز ہائنس کپتان منتخب ہوئے۔ کرکٹ بورڈ کا فیصلہ سب کو ماننا پڑا۔ مگر کتنے دلوں میں آگ لگی؟ کتنے لوگوں نے حکمِ حاکم سمجھ کر اس فیصلہ کو منظور کیا؟ وہ کھیلنے والوں سے پوچھئے۔ اور جہاں محض منہ دیکھی ہے وہاں اُمنگ کہاں؟ ولولہ کہاں؟ عزم کہاں؟ آخری قطرۂ خون گرا دینے کا جوش کہاں؟ ہم کھیلے اور بظاہر دل سے کھیلے۔ مگر یہ حق کے لیے جان دینے والے سرفروشوں کی فوج نہ تھی۔ پیٹ اور لوٹ کے لیے لڑنے والی فوج نہ تھی۔ کھیل میں کسی کا دل نہ تھا۔

میں اسٹیشن پر کھڑا اپنا تیسرے درجہ کا ٹکٹ لینے کی فکر میں تھا کہ ایک نازنین نے جو ابھی کار سے آتری تھی، آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور بولی۔ ''آپ بھی تو اسی گاڑی سے چل رہے ہیں مسٹر ظفر''؟

مجھے حیرت ہوئی! یہ کون نازنین ہے؟ اور اسے میرا نام کیونکر معلوم ہو گیا؟ مجھے ایک لمحہ کے لیے سکتہ سا ہو گیا۔ گویا سارے آداب اور اخلاق کی رسمیں دماغ سے محو ہو گئی ہوں۔ حسن میں ایک سطوت ہے۔ جو بڑوں بڑوں کے سر جھکا دیتی ہے۔ مجھے اپنے عجز کا ایسا احساس کبھی نہ ہوا تھا۔ میں نے نظام حیدآباد سے۔ ہزایکسانی وائسرائے سے۔ مہاراجہ میسور سے ہاتھ ملایا ہے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھایا ہے۔ مگر یہ افتادگی اور یہ فروتنی مجھ پر کبھی طاری نہ ہوئی تھی۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ اپنی پلکوں سے اس کے قدموں کا بوسہ لے لوں۔ وہ ملاحت نہ تھی جس پر ہم جان دیتے ہیں۔ نہ وہ نزاکت جس کی شعرا

قسمیں کھاتے ہیں۔ اس کی جگہ ذہانت تھی، متانت تھی، وقار تھا، زندہ دلی تھی اور شوق اظہار تھا۔ ''بے نقاب'' میں نے پر سوں انداز سے کہا۔ ''جی ہاں''۔

یہ کیسے پوچھوں کہ مجھے آپ سے کسب نیاز حاصل ہوا۔ اس کی بے تکلفی کہہ رہی تھی کہ وہ مجھ سے متعارف ہے۔ میں بیگانہ کیسے بنوں۔ اسی سلسلہ میں میں نے اپنی مروّت کا فرض بھی ادا کردیا۔ ''میرے لیے کوئی خدمت''۔

اُس نے مسکرا کر کہا۔ ''جی ہاں! آپ سے بہت سے کام لوں گی چلیے اندر ویٹنگ روم میں بیٹھیں۔ لکھنؤ کا قصد ہوگا۔ میں بھی وہیں چل رہی ہوں''۔

ویٹنگ روم میں آکر اس نے مجھے آرام کرسی پر بٹھایا اور خود ایک معمولی کرسی پر بیٹھ کر سگرٹ کیس میری طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔ ''آج تو آپ کی بولنگ بڑی مہلک تھی۔ ورنہ ہم لوگ پوری اننگ سے ہارتے''۔

میری حیرت اور زیادہ ہوئی۔ اس حسینہ کو کیا کریکٹ سے بھی شوق ہے۔ مجھے اُس کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے تکلف ہو رہا تھا۔ ایسی اداب شکن حرکت مجھ سے کبھی سرزد نہ ہوئی تھی۔ توجہ اُسی طرف تھی۔ طبیعت میں کچھ انقباض سا ہو رہا تھا۔ رگوں میں وہ سرعت اور طبیعت میں وہ گلابی بشاشت نہ تھی جو ایسے موقع پر فطرتاً مجھ میں ہونی چاہیے تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ وہیں تشریف رکھتی تھیں''؟

اس نے اپنا سگرٹ جلاتے ہوے کہا۔ جی ہاں اول سے آخر تک۔ مجھے تو صرف آپ کا کھیل جنچا اور لوگ تو کچھ بیدل سے ہو رہے تھے اور میں اس کا راز سمجھ رہی ہوں۔ ہمارے یہاں لوگوں میں صحیح مقام پرکھنے کا مادہ ہی نہیں۔ جسے اس سیاسی پستی نے ہمارے سبھی اوصاف کو کچل ڈالا ہو۔ جس کے پاس ثروت ہے، وہ قادر بہ مطلق ہے۔ وہ کسی علمی، ادبی اور معاشرتی جلسے کا صدر ہو سکتا ہے۔ اہل ہو یا نہ ہو، نئی عمارتوں کا افتتاح اس کے ہاتھوں کرایا جاتا ہے۔ بنیادیں اس کے ہاتھوں رکھوائی جاتی ہیں۔ تہذیبی تحریکوں کی قیادت اُسے دی جاتی ہے۔ وہ کانووکیشن کے خطبے پڑھے گا۔ لڑکوں کو انعام تقسیم کرے گا۔ یہ سب ہماری غلامانہ ذہنیت کی برکت ہے۔ کوئی تعجب نہیں ہم اس قدر ذلیل اور پست ہیں۔ جہاں حکم اور اختیار کا معاملہ وہاں تو خیر مجبوری ہے۔ ہمیں پابوسی

کرنی ہی پڑتی ہے۔ مگر جہاں ہم اپنی آزاد خیالی اور آزاد علمی سے کام لے سکتے ہیں، وہاں بھی ہماری رسوم طلبی اور منعم پرستی ہمارا گلا نہیں چھوڑتی۔ اس ٹیم کا کپتان آپ کو ہوناچاہیے تھا۔ تب دیکھتی حریف کیونکر بازی لے جاتا۔ مہاراجہ صاحب میں اس ٹیم کے کپتان بننے کی اتنی ہی صلاحیت ہے جتنی آپ میں اسمبلی کی صدارت کی۔ یا مجھ میں سنیما ایکٹنگ کی۔

بالکل وہی جذبات جو میرے دل میں تھے۔ مگر اس کی زبان سے نکل کر کتنے پُر اثر اور کتنے بصیرت افروز ہوگئے تھے۔ میں نے کہا: ''آپ بجا فرماتی ہیں۔ واقعی یہ ہماری کمزوری ہے۔''

''آپ کو اس ٹیم میں شریک نہ ہوناچاہیے تھا''۔

''میں مجبور تھا''۔

اس حسینہ کانام مس ہیلن مکر جی ہے۔ ابھی انگلینڈ سے آرہی ہے۔ یہی کریکٹ میچ دیکھنے کے لیے بمبئی ٹھہر گئی تھی۔ انگلینڈ میں اس نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی ہے۔ اور خدمت خلق اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ وہاں اُس نے ایک اخبار میں میری تصویر دیکھی تھی۔ اور میرا ذکر بھی پڑھا تھا۔ تب سے اُسے میری جانب سے حُسنِ ظن ہو گیا ہے۔ یہاں مجھے کھیلتے دیکھ کر وہ اور بھی زیادہ متاثر ہوئی۔ اس کا ارادہ ہے کہ ہندوستان کی ایک نئی ٹیم مرتب کی جائے اور اس میں وہی لوگ لیے جائیں جو قوم کی نیابت کرنے کے مستحق ہیں۔ اس کی تجویز ہے کہ میں اس ٹیم کا کپتان بنایا جاؤں۔ اسی ارادہ سے وہ سارے ہندوستان کا دَورہ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے والد مرحوم ڈاکٹر این مکر جی نے بہت کافی دولت چھوڑی ہے۔ اور وہ اس کی بلا شرکت غیرے وارث ہے۔ اس کی تجویزیں سن کر میرا دماغ آسمان میں اُڑنے لگا۔ میری زندگی کا سنہرا خواب اس غیر متوقعہ انداز سے حقیقت بن سکے گا۔ اس کا کسے گمان تھا۔ مشیت غیب میں میرا اعتقاد نہیں۔ مگر آج میرے وجود کا ایک ایک ذرّہ تشکّر اور عقیدت کے جذبات سے لبریز تھا۔ میں نے مناسب اور منکسر الفاظ میں مس ہیلن کا شکریہ ادا کیا۔

گاڑی کی گھنٹی ہوئی۔ مس مکر جی نے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ منگوائے۔ میں احتجاج نہ کر سکا۔ اس نے میرا سامان اٹھوایا۔ میرا ہیٹ خود اُٹھا لیا اور بیباکانہ انداز سے ایک

کمرہ میں جابیٹھی اور مجھے بھی اندر بلا لیا۔ اس کا خانساماں تیسرے درجے میں بیٹھا۔ میری قوتِ عمل جیسے سلب ہو گئی تھی۔ میں خدا جانے اِن سب معاملات میں کیوں اسے پیش قدمی کرنے دیتا تھا۔ جو مرد کی حیثیت سے میرے فرائض میں شامل تھے۔ شاید اس کے حسن، اس کے ذہنی وقار او راس کی علو ہمتی نے مجھے مرعوب کر دیا تھا۔ گویا اس نے کامروپ کے جادو طرازوں کی طرح مجھے بھیڑا بنا لیا ہو اور مجھ میں قوت ارادہ غائب ہو گئی ہو۔ اتنی ہی دیر میں میری ہستی اس کی رضا میں جذب ہوگئی تھی۔ میری خودداری کا یہ تقاضا تھا کہ میں اسے اپنے لیے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ نہ منگوانے دیتا اور تیسرے ہی درجہ میں آرام سے بیٹھتا۔ اور اگر اول درجہ میں بیٹھنا تھا تو اتنی ہی فیاضی سے دونوں کے لیے خود اول درجہ کے ٹکٹ لاتا لیکن فی الواقع میری قوتِ عمل سلب ہو گئی تھی۔

2 جنوری۔ میں حیران ہوں ہیلن کو مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟ اور یہ محض دوستانہ ہمدردی نہیں ہے۔ اس میں محبت کا خلوص ہے۔ رحم تو اتنا مہماں نواز نہیں ہوا کرتا اور میرے کمال کا اعتراف! میں اتنا عقل سے عاری نہیں ہوں کہ اس مغالطے میں پڑوں۔ کمال کا اعتراف زیادہ سے زیادہ ایک سگریٹ اور ایک پیالہ چائے پاسکتا ہے۔ یہ خاطر و مدارات تو وہیں پاتا ہوں جہاں کسی میچ میں کھیلنے کے لیے مدعو ہوتا ہوں۔ تاہم وہاں یہ دلنوازی نہیں ہوتی۔ محض رسمی خاطرداری برتی جاتی ہے۔ اس نے تو جیسے میری آسائش کے لیے اپنے کو وقف کر دیا ہو۔ میں تو شاید اپنی معشوقہ کے سوا اور کسی کے ساتھ اس خلوص کا برتاؤ نہ کرسکتا۔ یاد رہے میں نے معشوقہ کہا ہے۔ بیوی نہیں کہا۔ بیوی کی ہم خاطر داری نہیں کرتے۔ اس سے تو خاطرداری کروانا ہی ہمارا وطیرہ ہو گیا ہے۔ اور شاید حق بھی یہی ہے۔ مگر فی الحال تو میں ان دونوں نعمتوں میں ایک سے بھی بہرہ ورنہیں۔ اس کے ناشتے، ڈنر، لنچ میں تو میں شریک تھا ہی۔ ہر اسٹیشن پر (وہ ڈاک تھی اور خاص خاص اسٹیشنوں پر ہی رُکتی تھی) میوے اور پھل منگواتی اور مجھے بہ اصرار کھلاتی۔ کہاں کی کیا چیز مشہور ہے۔ اس کا اسے خوب علم ہے۔ میرے عزیزوں کے لیے طرح طرح کے تحائف خریدے، مگر حیرت یہ ہے کہ میں نے ایک بار بھی اسے منع نہ کیا۔ منع کیونکر کرتا۔ مجھ سے پوچھ کر تو لائی نہیں۔ جب وہ ایک چیز لاکر محبت کے ساتھ میری نذر کرتی ہے تو میں کیسے انکار کروں۔ خدا جانے کیوں میں مرد ہو کر بھی اس کے روبرو

عورت کی طرح شرمیلا، کم گو، بستہ دہن ہو جاتا ہوں۔

دن کی تکان کی وجہ سے رات بھر مجھے بے چینی رہی۔ سر میں خفیف سا درد تھا۔ مگر میں نے اس درد میں مبالغہ کیا۔ تنہا ہوتا تو اس درد کی شاید مطلق پروا نہ کرتا۔ مگر آج اس کی موجودگی میں مجھے اس کے اظہار میں مزہ آرہا تھا۔ وہ میرے سر میں تیل کی مالش کرنے لگی۔ اور میں خواہ مخواہ نڈھال ہوا جاتا تھا۔ میرے اضطراب کے ساتھ اس کی وحشت بڑھتی جاتی تھی۔ مجھ سے بار بار پوچھتی اب درد کیسا ہے اور میں توکلانہ انداز سے کہتا اچھا ہوں۔ اس کی نازک ہتھیلیوں کے احساس سے میری روح میں گدگدی ہوتی تھی۔ اس کا وہ دلکش چہرہ میرے سر پر جھکا ہوا ہے۔ اس کی گرم سانسیں میری پیشانی کے بوسے لے رہی ہیں اور میں گویا جنت کے مزے لے رہا ہوں۔ میرے دل میں اب اس پر فتح پانے کی خواہش چٹکیاں لے رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ میری ناز برداری کرے۔ میری طرف سے کوئی ایسی پیش قدمی نہ ہونی چاہیے جس سے اس پر فریفتگی کا اظہار ہو۔ چوبیس گھنٹے کے اندر میری ذہنیت میں کیونکر یہ انقلاب ہو جاتا ہے۔ میں کیونکر طالب سے مطلوب بن جاتا ہوں۔ یہ میں نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے نہ جانے کب نیند آجاتی ہے۔ مگر جب آنکھ کھلتی ہے تو دیکھتا ہوں وہ بدستور اسی محویت کے ساتھ میرے سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہوئی ہے۔ تب مجھے اس پر رحم آجاتا ہے۔ اور میں کہتا ہوں۔ آپ اب تکلیف نہ کریں۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ عاشقی کا تھوڑا تجربہ کسے نہیں ہوتا۔ میں بھی مستثنیٰ نہیں ہوں۔ مگر اس معشوقی میں آج جو لطف آیا اس پر عاشقی صدمے۔ عاشقی غلامی ہے۔ معشوقی بادشاہت۔

میں نے ترحم کے انداز سے کہا۔ آپ کو میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی۔

''اس نے دلسوزی کی۔ مجھے کیا تکلیف ہوئی۔ آپ درد سے بے چین تھے اور میں بیٹھی رہتی۔ کاش یہ درد میرے ہوتا''

میں عرش معلیٰ پر اُڑا جا رہا تھا۔

5جنوری۔ کل شام کو ہم لکھنؤ پہونچ گیے۔ راستے میں ہیلن سے تمدنی، سیاسی اور ادبی مسائل پر خوب باتیں ہوئیں۔ گریجویٹ تو خدا کے فضل سے میں بھی ہوں۔ اور تب سے فرصت کے اوقات میں کتب بینی بھی کرتا رہا ہوں۔ علما کی صحبت میں بھی بیٹھا ہوں۔

لیکن اس کی وسعت معلومات کے سامنے قدم قدم پر مجھے اپنی بے بضاعتی کا علم ہوتا ہے۔ ہر ایک مسئلہ پر اس کی اپنی رائے ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس نے خوب تحقیق کے بعد وہ رائے قائم کی ہے۔ اس کے برعکس میں ان لوگوں میں ہوں جو ہوا کے ساتھ اڑتے ہیں۔ جنھیں وقتی تحریکیں زیر و زبر کر دیتی ہیں۔ میں کوشش کرتا تھا کہ کسی طرح اس پر اپنا ذہنی وقار قائم کردوں۔ مگر اس کے نظریات مجھے بے زبان کر دیتے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ علمی مسائل میں اس سے پیش نہ پا سکوں گا تو میں نے ابی سینیا اور اٹلی کے معرکے کا ذکر چھیڑ دیا۔ جس پر میں نے اپنی دانست میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ انگلینڈ اور فرانس نے اٹلی پر جو دباؤ ڈالا ہے اس کی تعریف میں اپنا سارا زور بیان صرف کر ڈالا۔ اس نے ایک تبسم کے ساتھ کہا۔ ''اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ انگلینڈ اور فرانس محض انسانیت یا زبردست پروری کے جذبات سے متحرک ہو رہے ہیں تو آپ کی غلطی ہے۔ ان کی ملوکیت پرستی یہ نہیں برداشت کر سکتی کہ دنیا کی کوئی دوسری طاقت پھیلے اور سرسبز ہو۔ مسولینی وہی کر رہا ہے جو انگلینڈ نے بارہا کیا۔ اور آج بھی کر رہا ہے۔ یہ سارا بہروپیاپن محض ابی سینیا سے سیاسی اور تجارتی مراعات حاصل کرنے کے لیے ہے۔ اگر انگلینڈ کو اپنی تجارت کے لیے بازاروں کی ضرورت ہے۔ اپنی زائد آبادی کے لیے قطعات زمین کی ضرورت ہے۔ اپنے تعلیم یافتوں کے لیے موٹے منصوبوں کی ضرورت ہے۔ تو اٹلی کو کیوں نہ ہو۔ اٹلی جو کچھ کر رہا ہے ایمانداری کے ساتھ اعلانیہ کر رہا ہے۔ اس نے کبھی عالمگیر اخوت کا ڈنکا نہیں پیٹا۔ کبھی امن کا راگ نہیں الاپا۔ وہ تو صاف کہتا ہے۔ جنگ وجدل ہی زندگی کی علامت ہے۔ انسانیت کا ارتقا جنگ ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ انسان کے ملکوتی اوصاف میدان جنگ میں ہی نشوونما پاتے ہیں۔ مساوات کے نظریئے کو وہ جنون کہتا ہے۔ وہ اپنا شمار بھی انھیں برگزیدہ اقوام میں کرتا ہے۔ جنھیں رنگین آبادیوں پر حکومت کرنے کا حق ہے۔ اس لیے ہم اس کے طرز عمل کو سمجھ سکتے ہیں۔ انگلینڈ نے ہمیشہ روباہ بازی سے کام لیا ہے۔ ہمیشہ ایک قوم کے مختلف عناصر میں تفرقے ڈال کر، یا ان کے اختلافات کو سیاسیات کا مدار بنا کر انھیں اپنا حلقہ بگوش بنایا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ دنیا میں اٹلی جاپان اور جرمنی خوب فروغ حاصل کریں۔ اور انگلینڈ کا تسلط ٹوٹے۔ تب ہی دنیا میں اصلی جمہوریت، اصلی امن پیدا ہوگا۔ موجودہ تہذیب جب تک مٹ نہ

جائے گی دنیا میں امن کا راج نہ ہوگا۔ کمزور قوموں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اُسی طرح جس طرح کمزور پودوں کو۔ صرف اس لیے نہیں کہ ان کا وجود انھیں کے لیے عذاب کا باعث ہے۔ بلکہ اس لیے کہ وہی دنیا کی اس کشمکش اور خونریزیوں کی ذمہ دار ہیں۔

مجھے بھلا اس رائے سے کیوں اتفاق ہونے لگا۔ میں نے جواب تو دیا اور ان خیالات کی اتنی ہی زور دار الفاظ میں تردید بھی کی۔ مگر میں نے دیکھااس معاملہ میں وہ عقل سلیم سے کام نہیں لینا چاہتی یا نہیں لے سکتی۔

اسٹیشن پر اترتے ہی مجھے یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ ہیلن کو اپنا مہمان کیسے بناؤں۔ اگر ہوٹل میں ٹھہراؤں تو خدا جانے اپنے دل میں کیا کہے۔ اگر اپنے گھر لے جاؤں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے۔ وہاں ایسی خوش مذاق اور امیرا نہ مزاج نازنین کے لیے آسائش کے کیا سامان ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ میں کرکٹ اچھا کھیلنے لگا۔ اور پڑھنا لکھنا چھوڑ چھاڑ کر اسی کا ہو رہا اور ایک اسکول میں ماسٹر ہوں۔ مگر گھر کی حالت بدستور ہے۔ وہی پُرانا اندھیرا بوسیدہ مکان، تنگ گلی میں، وہی پرانی روش، وہی پرانا ڈھچر، اماں تو شاید ہیلن کو گھر میں قدم ہی نہ رکھنے دیں اور یہاں تک نوبت ہی کیوں آنے لگی۔ ہیلن خود دروازے ہی سے بھاگے گی۔ کاش آج اپنا مکان ہوتا۔ آراستہ پیراستہ۔ میں اس قابل ہوتا کہ ہیلن کی مہمانداری کر سکتا۔ اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہوسکتی تھی۔ لیکن بے سرو سامانی کا برا ہو۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ ہیلن نے قلی سے اسباب اٹھوایا اور باہر آکر ایک ٹیکسی بلائی۔ میرے لیے اس ٹیکسی میں بیٹھ جانے کے سوا دوسرا چارہ کیا باقی رہ گیا تھا۔ مجھے یقین ہے اگر میں اسے اپنے گھر لے جاتا تو اس بے سروسامانی کے باوجود خوش ہوتی۔ ہیلن خوش مذاق ہے، مگر نازک دماغ نہیں ہے۔ وہ ہر ایک قسم کی آزمائش اور تجربہ کے لیے تیار رہتی ہے۔ ہیلن شاید آزمائشوں اور ناگوار تجربوں کو بلاتی ہے۔ مگر مجھ میں نہ یہ تخیل ہے، نہ وہ جرأت۔

اس نے اگر ذرا غور سے میرا چہرہ دیکھا ہوتا تو اسے معلوم ہوتا اس پر کتنی ندامت اور کتنی بیکسی جھلک رہی تھی۔ مگر ظاہر داری نباہ تو ضروری تھا۔ میں نے احتجاج کیا۔ میں تو آپ کو بھی اپنا مہمان بنانا چاہتا تھا۔ آپ الٹا مجھے ہوٹل لے جارہی ہیں۔

اس نے شرارت کے انداز سے کہا۔ ''اس لیے کہ آپ میرے قابو سے باہر نہ ہو جائیں۔ میرے لیے اس سے زیادہ مسرت کی بات کیا ہوتی کہ آپ کی مہماں نوازی کا لطف اٹھاؤں۔ لیکن محبت حاسد ہوتی ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہے۔ وہاں آپ کے احباب آپ کے وقت کا بڑا حصہ لے لیں گے۔ آپ کو مجھ سے بات کرنے کا وقت ہی نہ ملے گا۔ اور مرد بالعموم کتنے بے مروت اور زود فراموش ہوتے ہیں۔ اس کا مجھے تجربہ ہو چکا ہے۔ میں آپ کو ایک لمحہ کے لیے بھی الگ نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر تم مجھے بھولنا بھی چاہو تو نہیں بھول سکتے۔

مجھے اپنی اس خوش نصیبی پر حیرت ہی نہیں خواب کا گمان ہونے لگا۔ جس حسینہ کی ایک نظر پر میں اپنے کو قربان کر دیتا وہ یوں مجھ سے اظہارِ محبت کرے۔ میرا تو جی چاہتا تھا کہ اسی بات پر اس کے قدموں کو پکڑ کر سینے سے لگا لوں اور آنسوؤں سے تر کردوں۔

ہوٹل میں پہونچے۔ میرا کمرہ الگ تھا۔ کھانا ہم نے ساتھ کھایا۔ اور تھوڑی دیر تک وہیں ہری ہری گھاس پر ٹہلتے رہے۔ کھلاڑیوں کا کیسے انتخاب کیا جائے یہی مرحلہ تھا۔ میرا جی تو یہی چاہتا تھا کہ ساری رات ٹہلتا رہوں۔ لیکن اس نے کہا آپ اب آرام کریں۔ صبح بہت کام کرنا ہے۔ میں اپنے کمرے میں جاکر لیٹ رہا۔ مگر ساری رات نیند نہیں آئی۔ ہیلن کا باطن ابھی تک میری نظر سے چھپا ہوا ہے۔ ہر لمحہ وہ میرے لیے معمہ ہوتی جارہی ہے۔

12 جنوری۔ آج دن بھر لکھنو کے کریکٹروں کا مجمع رہا۔ ہیلن شمع تھی اور پروانے اس کے گرد منڈلا رہے تھے۔ یہاں سے میرے علاوہ دو صاحبوں کا کھیل ہیلن کو بہت پسند آیا۔ برجندر اور صادق۔ ہیلن اُنھیں آل انڈیا ٹیم میں رکھنا چاہتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں اس فن کے اُستاد ہیں۔ لیکن انھوں نے جس طرح آغاز کیا ہے، اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کریکٹ کھیلنے نہیں اپنی قسمت کی بازی کھیلنے آئے ہیں۔ ہیلن کس مزاج کی عورت ہے۔ یہ سمجھنا دشوار ہے۔ برجندر مجھ سے زیادہ قبول صورت ہے۔ یہ مجھے تسلیم ہے۔ وضع قطع سے پورا صاحب ہے۔ لیکن پکّا شہدا۔ لوفر۔ میں نہیں چاہتا کہ ہیلن اس سے کسی قسم کا تعلق رکھے۔ آداب تو اسے چھو نہیں گیا۔ بد زبان پرلے سرے کا۔ بیہودہ فحش مزاق۔ گفتگو کا سلیقہ نہیں۔ محل وقوع کی تمیز نہیں۔ بعض اوقات

ہیلن سے ایسے پر معنی کنائے کر جاتا ہے کہ میں شرم سے سر جھکا لیتا ہوں۔ لیکن ہیلن کو شاید اس کا بازاری پن اس کا ابتذال محسوس نہیں ہوتا۔ نہیں وہ شاید اس کے فحش کنایوں کا مزہ لیتی ہے۔ میں نے اسے کبھی چیں بہ جبیں نہیں دیکھا۔ یہ میں نہیں کہتا کہ شگفتہ طبعی کوئی بری چیز ہے، نہ زندہ دلی کا میں دشمن ہوں۔ لیکن ایک لیڈی کے ساتھ تو ادب قاعدے کا لحاظ رکھنا ہی چاہیے۔

صادق ایک مغرز خاندان کا چراغ ہے۔ بہت ہی ثقہ بلکہ سرد مزاج، نہایت مغرور۔ بہ ظاہر ترش رُو لیکن اب وہ بھی شہدوں میں داخل ہو گیا ہے۔ کل آپ ہیلن کو اپنے اشعار سناتے رہے۔ اور وہ خوش ہوتی رہی۔ مجھے تو ان اشعار میں کوئی مزہ نہ آیا۔ اس کے پہلے میں نے ان حضرت کو کبھی شاعری کرتے نہیں دیکھا۔ یہ کیفیت کہاں سے پھٹ پڑی ہے؟ حسن میں اعجاز کی قوت ہے، اور کیا کہوں۔ اتنا بھی نہ سوجھا کہ اسے اشعار ہی سنانا ہے تو حسرتؔ یا جگرؔ یا جوشؔ کے کلام سے دوچار شعر یاد کر لیتا۔ ہیلن سب کا کلام پڑھے تھوڑا ہی بیٹھی ہے۔ آپ کو شعر گفتن چہ ضرور۔ مگر یہی بات ان سے کہہ دوں تو بگڑ جائیں گے۔ سمجھیں گے مجھے رشک آرہا ہے۔ مجھے کیوں رشک آنے لگا۔ ہیلن کے پرستاروں میں ایک میں بھی ہوں۔ ہاں اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ وہ اچھے برے کی تمیز کر سکے۔ ہر شخص سے بے تکلفی مجھے پسند نہیں۔ مگر ہیلن کی نظروں میں سب برابر ہیں۔ وہ باری باری سے سب سے محترز رہے، اور سب سے ملتفت۔ کس کی جانب زیادہ مائل ہے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ صادق کی دولت و ثروت سے وہ مطلق متاثر نہیں معلوم ہوتی۔ کل شام کو ہم لوگ سنیما دیکھنے گئے تھے۔ صادق نے آج غیر معمولی فیاضی دکھائی۔ جیب سے روپئے نکال کر سب کے لیے ٹکٹ لینے چلے۔ میاں صادق جو اس تمول کے باوجود بھی تنگدل واقع ہوئے ہیں۔ میں تو خسیس کہوں گا۔ ہیلن نے ان کی فیاضی کو بیدار کر دیا ہے۔ مگر ہیلن نے ان کو روک لیا اور خود اندر جاکر سب کے لیے ٹکٹ لائی اور یوں بھی وہ اتنی بے دردی سے روپئے خرچ کرتی ہے کہ میاں صادقؔ کے چھکّے چھوٹ جاتے ہیں۔ جب ان کا ہاتھ جیب میں جاتا ہے۔ ہیلن کے روپئے کاؤنٹر پر جا پہونچتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، میں تو ہیلن کی مزاج شناسی پر فدا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ ہماری فرمائشوں کی منتظر رہتی ہے اور ان کی تعمیل میں اسے خاص لطف آتا ہے۔ صادق صاحب

کو اس نے اپنا البم نذر کر دیا۔ جو یورپ کی نایاب تصاویر کی نقلوں کا مجموعہ ہے اور جو اس نے یورپ کے سارے نگار خانوں میں جا کر خود مرتب کیا ہے۔ اس کی نظریں کتنی حسن پسند ہیں۔ برجندر جب شام کو اپنا نیا سوٹ پہن کر آیا جو اس نے ابھی سلایا ہے تو ہیلن نے مسکرا کر کہا۔ چشم بددور۔ آج تو تم یوسفِ ثانی بنے ہوئے ہو۔ برجندر باغ باغ ہو گیا۔ میں نے جب ذرالحن کے ساتھ اپنی تازہ غزل سنائی تو وہ ایک ایک شعر پر اُچھل اُچھل پڑی۔ بلا کی سخن فہم ہے۔ مجھے اپنے ذوقِ سخن پر اتنی مسرت کبھی نہ ہوئی تھی۔ مگر تحسین جب صلائے عام ہو جاتی ہے تو اس کی کیا وقعت۔ میاں صادق کو کبھی اپنی وجاہت کا دعویٰ نہیں ہوا۔ معنوی حسن سے آپ جتنے ہی بہرہ ور ہیں۔ حسنِ ظاہر سے اتنے ہی بے فیض۔ مگر آج ساغر کے دَور میں جوں ہی ان کی آنکھوں میں سرخی آئی ہیلن نے والہانہ انداز سے کہا بھئی تمھاری یہ آنکھیں تو جگر کے پار ہوئی جاتی ہیں، اور صادق صاحب اس وقت اس کے قدموں پر جبہہ سائی کرتے کرتے رُک گئے شرم مانع ہوئی۔ ان کی آنکھوں کی اتنی قدر افزائی شاید ہی کسی نے کی ہو۔ مجھے کبھی اپنی وضع قطع کی تعریف سننے کی تمنا نہیں ہوئی۔ میں جو کچھ ہوں جانتا ہوں۔ مجھے یہ مغالطہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ میں خوش رو ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ہیلن کی یہ نوازشیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ لیکن اب مجھے بھی یہ اضطراب ہونے لگا کہ دیکھوں مجھ پر کیا عنایت ہوتی ہے۔ کوئی بات نہ تھی مگر میں بے چین رہا۔ جب میں شام کو یونیورسٹی گراؤنڈ سے مشق کر کے آرہا تھا تو میرے یہ پریشان بال کچھ اور زیادہ پریشان ہو گئے تھے۔ اس نے گرویدہ نظروں سے دیکھ کر فوراً کہا۔ ”تمھاری اس زلفِ پریشان پر نثار ہو جانے کو جی چاہتا ہے“۔ میں نہال ہو گیا۔ دل میں کیا کیا طوفان اُٹھے کہہ نہیں سکتا۔

مگر خدا جانے کیوں ہم تینوں میں سے ایک بھی اس کی کسی ادا یا انداز یا حسن کی الفاظ میں داد نہیں دے۔ ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمیں موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں اس سے کہیں زیادہ متاثر ہیں۔ کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔

یکم فروری۔ ہم دہلی آ گئے۔ اس اثنا میں مرادآباد، نینی تال، دہرہ دون وغیرہ مقامات کے دَورے کیے۔ مگر کہیں کوئی کھلاڑی نہ ملا۔ علی گڑھ اور دہلی سے کئی اچھے کھلاڑیوں کے ملنے کی امید ہے۔ اس لیے ہمارا قیام یہاں کئی دن رہے گا۔ الیون پوری

ہوتے ہی سب لوگ ممبئی آجائیں گے اور وہاں ایک مہینہ مشق کریں گے۔ مارچ میں آسٹریلین ٹیم یہاں سے رخصت ہوگی۔ تب تک وہ ہندوستان میں سارے موعودہ میچیز کھیل چکی ہوگی۔ ہم اس سے آخری میچ کھیلیں گے اور خدا نے چاہا تو ہندوستان کی ساری شکستوں کی تلافی کردیں گے۔ صادق اور برجندر بھی ہمارے ساتھ گھومتے رہے۔ میں تو نہ چاہتا تھا کہ یہ لوگ آئیں۔ مگر ہیلن کو شاید عشاق کے مجمع میں لطف آتا ہے۔ ہم سب کے سب ایک ہی ہوٹل میں مقیم ہیں اور سب ہیلن کے مہمان ہیں۔ اسٹیشن پر پہونچے تو صدہا آدمی ہمارا استقبال کرنے کے لیے موجود تھے۔ کئی عورتیں بھی تھیں۔ لیکن ہیلن کو نہ معلوم کیوں عورتوں سے احتراز ہے۔ اُن کے صحبت سے بھاگتی ہے۔ خاص کر حسین عورتوں کے سائے سے بھی گریز کرتی ہے حالانکہ اُسے کسی حسینہ سے بدظن ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ مانتے ہوئے بھی کہ حسن اُس پر ختم نہیں ہو گیا ہے۔ اُس میں جاذبیت کے ایسے عناصر موجود ہیں کہ کوئی حُور بھی اس کے مقابلہ میں نہیں کھڑی ہو سکتی۔ نک سک ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ حسن مذاق، حسن گفتار، حسن ادا بھی تو کوئی چیز ہے۔ محبت اس کے دل میں ہے یا نہیں خدا جانے۔ لیکن محبت کے اظہار میں اُسے یدطولےٰ ہے۔ دلجوئی اور ناز برداری کے فن میں ہم جیسے دلداروں کو بھی اس سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ شام کو ہم لوگ نئی دہلی کی سیر کو گئے۔ پر فضا مقام ہے۔ کشادہ سڑکیں۔ خوبصورت مربعے دلفریب روشیں۔ اس کی تعمیر میں سرکار نے بے دریغ روپیہ صرف کیا ہے اور بے ضرورت۔ یہ رقم رعایا کی فلاحی تجاویز میں صرف کی جاسکتی تھی۔ مگر اس کو کیا کیجیے کہ عوام اس کی تعمیر سے جتنے متاثر ہیں اتنی کی فلاحی تجویز سے نہ ہوتے۔ آپ دس پانچ مدرسے زیادہ کھول دیتے یا سڑکوں کی مرمت میں یا زراعتی تحقیقاتوں میں اس روپیہ کو صرف کر دیتے۔ مگر عوام کو تزک و احتشام اور شان و شکوہ سے آج بھی جتنی رغبت ہے اتنی آپ کے تعمیری کاموں سے نہیں ہے۔ فرماں روا کا جو تخیل اس کے وجود کے ذرّے ذرّے میں سرایت کر گیا ہے۔ وہ ابھی صدیوں تک نہ مٹے گا۔ فرماں روا کے لیے شان و شکوہ ضروری ہے۔ بے دریغ روپیہ خرچ کرنا ضروری ہے۔ کفایت شعار یا بخیل فرماں روا چاہے وہ ایک ایک پیسہ رعایا کے فلاح کے لیے خرچ کرے اتنا مقبول اور ہردلعزیز نہیں ہوسکتا۔ انگریز نفسیات کے ماہر ہیں۔ انگریز ہی کیوں۔ ہر ایک فرماں روا جس نے اپنے زور بازو

اور قوتِ فکر سے یہ درجہ حاصل کیا ہے۔ فطرتاً نفسیات کا ماہر ہوتا ہے۔ اس کے بغیر عوام پر اُسے اقتدار کیونکر حاصل ہوتا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ مجھے ایسا اندیشہ ہورہا ہے کہ شاید ہماری ٹیم خواب ہی بن جائے۔ ابھی سے ہم لوگوں میں چشمک رہنے لگی ہے۔ برجندر قدم قدم پر میری مخالف کرتا ہے۔ میں آم کہوں تو وہ یقیناً املی کہے گا۔ اور ہیلن اس کی جانب ملتفت ہے۔ زندگی کے کیسے کیسے میٹھے خواب دیکھنے لگا تھا۔ مگر برجندر احسان فراموش، خودغرض۔ برجندر میری زندگی تباہ کیے ڈالتا ہے۔ ہم دونوں ہیلن کے منظورِنظر نہیں رہ سکتے۔ یہ طے شدہ بات ہے۔ ایک کو میدان سے ہٹنا پڑے گا۔

7 فروری۔ شکر ہے دہلی میں ہماری کوشش بار آور ہوئی۔ ہماری ٹیم میں تین نئے کھلاڑیوں کا اضافہ ہوا۔ جعفر، مہرا اور ارجن سنگھ۔ آج ان کے کمال دیکھ کر آسٹریلین کریکٹروں کی دھاک میرے دل سے جاتی رہی۔ تینوں گیند پھینکتے ہیں۔ جعفر قادر انداز ہے۔ مہرا صبرآزما اور ارجن شاطر۔ تینوں مستقل مزاج، نگاہ کے سچے اور اَتھک۔ اگر کوئی انصاف سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ ارجن مجھ سے بہتر کھیلتا ہے۔ وہ دو بار انگلینڈ ہو آیا ہے۔ انگریزی معاشرت سے واقف ہے۔ اور مزاج شناس بھی اول درجہ کا، تہذیب اور اخلاق کا پُتلا۔ برجندر کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اب ارجن پر خاص نظرِعنایت ہے۔ اور ارجن پر فتح پانا میرے لیے آسان نہیں ہے۔ مجھے تو خوف ہے کہیں وہ میرا رقیب نہ بن جائے۔

25 فروری۔ ہماری ٹیم پوری ہوگئی۔ دو پلیئر ہمیں علی گڑھ سے ملے، تین لاہور سے اور ایک اجمیر سے، اور کل ہم بمبئی آ گئے۔ ہم نے اجمیر، لاہور اور دہلی میں وہاں کی ٹیموں سے میچ کھیلے اور ان پر بڑی شاندار فتح پائی۔ آج بمبئی کی ہندو ٹیم سے ہمارا مقابلہ ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میدان ہمارے ہاتھ رہے گا۔ ارجن ہماری ٹیم کا سب سے اچھا کھلاڑی ہے۔ اور ہیلن اس کی اتنی خاطر داری کرتی ہے کہ مجھے رشک نہیں آتا۔ اتنی خاطرداری تو مہمان کی ہی کی جاسکتی ہے۔ مہمان سے کیا خوف۔ لطف یہ ہے کہ ہر ایک شخص اپنے کو ہیلن کا منظور نظر سمجھتا ہے اور اس سے ناز برداریاں کرواتا ہے۔ اگر کسی کے سر میں درد ہے تو ہیلن کا فرض ہے کہ اُس کی مزاج پرُسی کرے۔ اُس کے سر میں صندل تک گھِس کر لگائے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اُس کا رعب ہر ایک کے دل پر اتنا چھایا ہوا ہے کہ کوئی اُس کے کسی فعل کی تنقید کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ سب کے

41

سب اُس کی مرضی کے غلام ہیں۔ وہ اگر سب کی ناز برداری کرتی ہے تو حکومت بھی ہر ایک پر کرتی ہے۔ شامیانہ میں ایک سے ایک حسین عورتوں کا جمگھٹ ہوتا ہے۔ مگر ہیلن کے قیدیوں کی مجال نہیں کہ کسی کی طرف دیکھ کر مسکرا بھی سکیں۔ ہر ایک کے دل پر ایسا خوف طاری رہتا ہے گویا وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ ارجن نے ایک مس پر یوں ہی کچھ نظر ڈالی تھی۔ ہیلن نے ایسی قہر کی آنکھ سے اُسے دیکھا کہ سردار صاحب کا رنگ اُڑ گیا۔ ہر ایک سمجھتا ہے کہ وہ اس کی تقدیر کی خالق ہے۔ اور اُسے اپنی جانب سے بدظن کر کے وہ شاید زندہ نہ رہ سکے گا۔ اَوروں کی تو میں کیا کہوں۔ میں نے بھی گویا اپنے کو اس کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ مجھے تو اب یہ احساس ہورہا ہے کہ مجھ میں کوئی ایسی چیز فنا ہوگئی ہے جو پہلے میرے دل میں حسد کی آگ سی جلا دیا کرتی تھی۔ ہیلن اب کسی سے بولے۔ کسی سے راز و نیاز کی باتیں کرے۔ مجھے اشتعال نہیں آتا۔ دل پر چوٹ لگتی ضرور ہے۔ مگر اس کا اظہار تخلیہ میں آنسو بہا کر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ خود داری کہاں غائب ہوگئی۔ نہیں کہہ سکتا۔ ابھی اس کی خفگی سے دل کے ٹکڑے ہوگئے تھے کہ یکایک اس کی ایک نگاہ غلط انداز نے یا ایک تبسم نے گدگدی پیدا کردی۔ معلوم نہیں اس میں وہ کون سی طاقت ہے جو اتنے حوصلہ مند نوجوان دلوں پر حکومت کر رہی ہے۔ اسے جسارت کہوں۔ مباورت کہوں۔ یا کیا کہوں۔ ہم سب جیسے اُس کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں ہیں۔ ہم میں اپنی کوئی شخصیت، کوئی انفرادیت، کوئی ہستی نہیں ہے۔ اُس نے اپنے حسن سے، اپنی فراست سے، اپنی دولت سے اور سب سے زیادہ اپنی ہمہ گیری سے ہمارے دلوں پر تسلط قائم کر لیا ہے۔

یکم مارچ۔ کل آسٹریلین ٹیم سے ہمارا میچ ختم ہوگیا۔ پچاس ہزار سے کم تماشائیوں کا ہجوم نہ تھا۔ ہم نے پورے اننگس سے شکست دی اور دیوتاؤں کی طرح پُجے۔ ہم میں سے ہر ایک نے دل وجان سے کام کیا اور سبھی یکساں طور پر پھولے ہوئے تھے۔ میچ ختم ہوتے ہی اہلِ شہر کی جانب سے ہمیں ایک شاندار پارٹی دی گئی۔ ایسی پارٹی تو شاید وائسرائے کے اعزاز میں نہ دی جاتی ہوگی۔ میں تو تعریفوں اور مبارک بادوں کے بوجھ سے دب گیا۔ میں نے چوالیس رنوں میں پانچ کھلاڑیوں کا صفایا کر دیا تھا۔ مجھے خود اپنی ہلاکت آفرینی پر حیرت ہورہی تھی۔ ضرور کوئی غیبی طاقت ہماری پشت پر تھی۔ اس مجمع میں

بمبئی کا حسن اپنی پوری شان اور رنگینی کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ اور مجھے دعویٰ ہے کہ حسن کے اعتبار سے یہ شہر جتنا خوش نصیب واقع ہوا ہے دنیا کا کوئی دوسرا شہر شاید ہی۔ مگر ہیلن اس مجمع میں بھی مرگز نگاہ بنی ہوئی تھی۔ یہ ظالم محض حسین نہیں ہے۔ شیریں بیان بھی ہے اور شیریں ادا بھی۔ سارے نوجوان پروانوں کی طرح اُس پر منڈلا رہے تھے۔ ایک سے ایک قبول صورت۔ منچلے۔ اورہیلن ان کے جذبات سے کھیل رہی تھی۔ اُسی طرح جیسے وہ ہم لوگوں کے جذبات سے کھیلا کرتی تھی۔ مہاراجکمار جیسا شکیل جوان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ صورت سے رُعب ٹپکتا ہے۔ اُن کے عشق نے کتنے حسینوں کو دلفگار کیا ہے۔ کون جانے مردانہ دل کشی کا جادو سا بکھیر تا چلتا ہے۔ ہیلن اُن سے بھی اُسی آزادانہ بے تکلفی سے ملی جیسے دوسرے ہزاروں نوجوانوں سے۔ اُن کے حُسن کا، اُن کی دولت کا، اس پر مطلق کوئی اثر نہ تھا۔ نہ جانے اتنا غرور، اتنی خودداری اس میں کہاں سے آگئی ہے۔ کبھی نہیں ڈگمگاتی۔ کہیں مرعوب نہیں ہوتی، کبھی مائل نہیں ہوتی۔ وہی بذلہ سنجی ہے۔ وہی اظہارِ محبت۔ کسی کے ساتھ خصوصیت نہیں۔ دلجوئی سب کی مگر اسی استغنا کی شان کے ساتھ۔

ہم لوگ سیر کر کے کوئی دس بجے رات کو ہوٹل پہونچے تو سبھی زندگی کے نئے خواب دیکھ رہے تھے۔ سبھی کے دلوں میں ایک دھک دھکی سی ہورہی تھی کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ اُمید و بیم نے سبھی کے دلوں میں طوفان برپا کر رکھا تھا۔ گویا آج ہر ایک کی زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہونے والا ہے۔ اب کیا پروگرام ہے۔ اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ ہر ایک نے اپنے دل میں سودائے خام پکا رکھا تھا۔ ہر ایک کو یقین تھا کہ ہیلن کی خصوصی نگاہ اس پر ہے۔ مگر یہ اندیشہ بھی ہر ایک کے دل میں تھا کہ خدانخواستہ کہیں ہیلن نے بیوفائی کی تو یہ جان اس کے قدموں پر رکھ دے گا۔ یہاں سے زندہ گھر جانا قیامت تھا۔

اُسی وقت ہیلن نے مجھے اپنے کمرہ میں بلا بھیجا۔ جاکر دیکھتا ہوں تو سبھی کھلاڑی جمع ہیں۔ ہیلن اس وقت اپنی شربتی بیلدار ساڑی میں آنکھوں میں چکا چوند پیدا کررہی تھی۔ مجھے اس پر جھنجلاہٹ ہوئی۔ اس مجمع عام میں مجھے بلاکر قواعد کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو خاص برتاؤ کا مستحق تھا۔ میں بھول رہا تھا کہ شاید اسی طرح ان میں سے، ایک اپنے کو خاص برتاؤ کا مستحق سمجھتا ہو۔

ہیلن نے کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔ ''دوستوں میں کہہ نہیں سکتی کہ میں آپ لوگوں کی کتنی مشکور ہوں۔ اور آپ نے میری زندگی کی کتنی بڑی آرزو پوری کردی۔ آپ میں سے کسی کو مسٹر رتن لال کی یاد آتی ہے؟''

رتن لال! اُسے بھی کوئی بھول سکتا ہے۔ وہ جس نے پہلی بار ہندوستان کی کرکٹ ٹیم کو انگلینڈ کی سرزمین پر اپنے کارہائے نمایاں دکھانے کا موقع عطا کیا۔ جس نے اپنے لاکھوں روپئے اس مہم کی نذر کئے اور آخر متواتر شکستوں سے مایوس ہو کر وہیں انگلینڈ میں خودکشی کرلی۔ اس کی وہ صورت اب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔''

سب نے کہا۔ ''خوب اچھی طرح۔ ابھی بات ہی گے دن کی ہے۔''

''آج اس شاندار کامیابی پر میں آپ کو مبارک باد دیتی ہوں۔ انشاء اللہ آئندہ سال ہم انگلینڈ کا دورہ کریں گے۔ آپ لوگ ابھی سے اس مہم کے لیے تیاریاں کیجیے۔ لطف تو جب ہے کہ ہم وہاں ایک میچ بھی نہ ہاریں۔ متواتر ہمارے ہاتھ میدان رہے۔ دوستو! یہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ کسی مقصد کی تکمیل کا عمل ہی زندگی ہے۔ ہمیں کامیابی وہیں ہوتی ہے۔ جہاں ہم اپنے پورے حوصلے سے سرگرم عمل ہوں۔ وہی مقصد ہمارا خواب ہو۔ ہمارا عشق ہو۔ ہمارا مرکزِ حیات ہو۔ ہم میں اور اس مقصد کے بیچ میں اور کوئی خواہش، کوئی آرزو حائل نہ ہو۔ معاف کیجیے گا۔ آپ نے اپنے مقصد کے لیے جینا نہیں سیکھا۔ آپ کے لیے کرکیٹ محض ایک مشغلۂ تفریح ہے۔ آپ کو اس سے عشق نہیں۔ اسی طرح ہمارے صدہا دوست ہیں۔ جن کا دل کہیں اور ہوتا ہے۔ دماغ کہیں اور۔ اور وہ ساری زندگی ناکام رہتے ہیں۔ آپ کے لیے میں زیادہ دلچسپی کی چیز تھی۔ کریکٹ تو محض مجھے خوش کرنے کا ذریعہ تھا۔ پھر بھی آپ کامیاب ہوئے۔ ملک میں آپ جیسے ہزار ہا نوجوان ہیں جو اگر کسی مقصد کی تکمیل کے لیے جینا اور مرنا سیکھ جائیں تو معجزے کر دکھائیں۔''

جائیے اور وہ کمال حاصل کیجیے۔ میرا حُسن اور میری راتیں بازیچۂ نفس بننے کے لیے نہیں ہیں۔ نوجوانوں کی آنکھوں کو خوش کرنے اور ان کے دلوں میں سُرور پیدا کرنے کے لیے جینا میں شرمناک سمجھتی ہوں۔ حیات کا مقصد اس سے کہیں اونچا ہے۔ سچی زندگی وہی ہے جہاں ہم اپنے لیے نہیں سب کے لیے جیتے ہیں''۔

ہم سب سر جھکائے سنتے رہے اور جھٹلاتے رہے۔ اور ہیلن کمرہ سے نکل کر کار پر جابیٹھی۔ اُس نے اپنی روانگی کا انتظام پہلے ہی کرلیا تھا۔ قبل اس کے کہ ہمارے ہوش و حواس صحیح ہوں اور ہم صورتِ حال سمجھیں وہ رخصت ہوچکی تھی۔

ہم سب ہفتے بھر تک بمبئی کی گلیوں، ہوٹلوں، بنگلوں کی خاک چھانتے رہتے۔ ہیلن کہیں نہ تھی اور زیادہ افسوس یہ ہے کہ اُس نے ہماری زندگی کا جو آئیڈیل رکھا وہ ہماری پہونچ سے اونچا ہے۔ ہیلن کے ساتھ ہماری زندگی کا سارا جوش اور ولولہ غائب ہوگیا ہے۔

(یہ افسانہ زمانہ جولائی 1937 میں شائع ہوا۔ 'گپت دھن' نمبر 2 میں شامل ہے۔)

پریم چند کے ادبی کارناموں پر تحقیقی کام کرنے والوں میں مدن گوپال کی اہمیت مسلم ہے پریم چند کے خطوط کے حوالے سے بھی انھیں اولیت حاصل ہے۔ ان کی پہلی کتاب انگریزی میں بہ عنوان "پریم چند" 1944 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اسی کتاب کی وجہ سے غیر ممالک میں بھی پریم چند کے بارے میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ "ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ لندن" نے لکھا ہے کہ مدن گوپال وہ شخصیت ہے جس نے مغربی دنیا کو پریم چند سے روشناس کرایا۔ اردو، ہندی ادیبوں کو غیر اردو ہندی حلقے سے متعارف کرانے میں مدن گوپال نے تقریباً نصف صدی صرف کی ہے۔

مدن گوپال کی پیدائش اگست 1919 میں (ہانسی) ہریانہ میں ہوئی۔ 1938 میں سینٹ اسٹیفن کالج سے گریجویشن کیا۔ انھوں نے تمام زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری۔ انگریزی، اردو اور ہندی میں تقریباً 60 کتابوں کے مصنف ہیں۔ پریم چند پر اکسپرٹ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ویسے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے ماہر ہیں۔ مختلف اخبارات، سول ملیٹری گزٹ لاہور، اسٹیٹس مین اور جن ستہ میں بھی کام کیا۔ بعدازاں حکومتِ ہند کے پبلکیشن ڈویژن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے 1977 میں ریٹائر ہوئے اس کے علاوہ دینک ٹریبون چنڈی گڈھ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے 1982 میں سبکدوش ہوئے۔

ISBN 81-7587-002-8